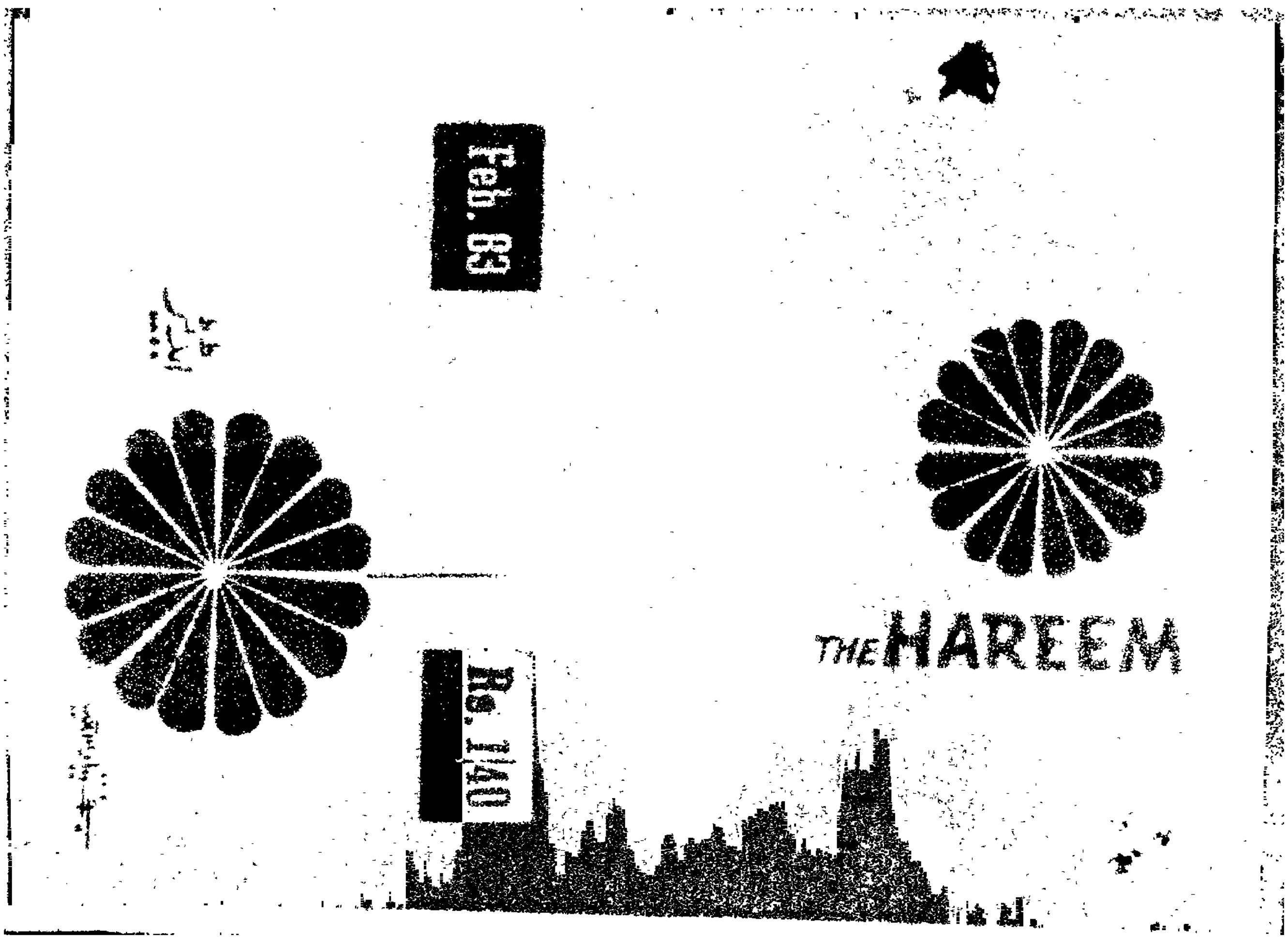

THE HAREEM
Feb. 83
Rs. 1/40

گذشتہ ۵۳ سال سے مشرقی خواتین کی رہبری کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

لکھنؤ کا سب سے قدیم رسالہ

ماہنامہ حریم

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

اڈیٹر نگراں

نسیمہ انہونوی

معاون

شوکت جہاں بیگم غزالہ

و

جانی بیگم ردولوی

جلد (۵۳)	فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۸۳ء	نمبر (۲)

قیمت۔ فی پرچہ :۔ ایک روپیہ چالیس پیسے

قیمت۔ سالانہ۔ منی آرڈر سے ۲۲/- روپیہ

قیمت۔ مخصوص " " " ۲۵/- روپیہ

قیمت۔ اعزازی " " " ۳۷/- روپیہ

وی۔پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد

غیر ممالک سے " " ۶۵/- روپیہ

یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی۔میل۔ ایرمیل میں مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

دارالاشاعت .... نسیم بک ڈپو

۴۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

آفس و ترسیل زر کا پتہ :۔ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس۔ ۴۴۵۵۹ رہائش :۔ ۴۴۳۳۵۳

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے .... پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

میں نے جنات سے باتیں کی ہیں

بخشی جنتری ۱۹۸۳ء

میں یہ اور دوسرے محیر العقول مضامین ملاحظہ کیجئے۔
اپنی مسلسل اشاعت کے ۸۴ ویں سال میں بخشی جنتری
نے عمدہ طباعت اور بہترین مضامین کی انوکھی مثال پیش
کی ہے۔ سب سے عمدہ، معیاری اور کم قیمت پر بخشی جنتری
آج ہی قریبی اسٹاکسٹ سے حاصل کریں۔

نمونہ کی کاپی ۵۰ پیسے

شائع کردہ

مینیجر بخشی جنتری

۲/۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

مقامی اسٹاکسٹ:- ۱- اسلامی بک ہاؤس
مسجد پرانی امین الدولہ پارک لکھنؤ
۲- اسلامیہ بکڈپو طلاق محل کان پور
۳- نیئر اینڈ برادرس شہ ماس کٹرہ الہ آباد

لمعات

ایک خبر پڑھ لیجئے جو ہم روزنامہ انقلاب بمبئی مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۲ء سے نقل کر رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے۔

"ایشیاڈ ولیج میں اجتماعی عصمت دری کا حادثہ"۔

نئی دہلی۔ ۳۰ دسمبر۔ ایشیاڈ گیمس ولیج کا دوستانہ اور خوشگوار ماحول گذشتہ منگل کو اس وقت پراگندہ ہو گیا جبکہ ایک فلیٹ میں ایک ۲۲ سالہ عورت اجتماعی عصمت دری کے بعد بیہوش پائی گئی۔

سفارتی شعبے سے تعلق رکھنے والی اس عورت کو جو مشرقی ایشیا کے دستے کے لئے ترجمان کے فرائض انجام دیتی تھی ایشیاڈ اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی دیکھ بھال جاری ہے۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے اسپتال کے ایک ذرائع نے "انقلاب" کو بتایا کہ حملے کا شکار عورت کی ساڑھی پھٹی ہوئی تھی اور اس کے سر پر زخموں کے نشانات تھے۔

ذرائع نے کہا کہ عورت تمام دن روتی رہی اور کسی سے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

رات کی ڈیوٹی پر متعین دو سیکیورٹی گارڈس نے اسپتال کو مطلع کیا۔ اسپتال کے حکام نے اس فلیٹ پر ایک ایمبولینس روانہ کی جہاں کہ عورت بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ گارڈس میں سے ایک نے اخبار کے نمائندے کو بتایا کہ کم از کم ۸ افراد نے اس کی عصمت دری کی ہے۔

گارڈ کے مطابق اس عورت نے بظاہر رات میں کسی وقت مردوں کے فلیٹس کا رخ کیا تھا اسے صبح تقریباً ۴ بجے بیہوشی کی حالت میں پایا گیا تھا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رات دیر گئے وہ مردوں کے فلیٹس کی جانب کیوں گئی تھی۔"

ایشیاڈ اسپتال کے ذرائع نے کہا کہ نومبر میں ایشیاڈ گیمس کے آغاز کے بعد سے اب تک عصمت دری کے کم از کم ۱۵ تا ۲۰ واقعات ہو چکے ہیں۔ ان میں سے صرف دو عورتوں کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔

ایک اور واقعے میں جس کی اطلاع چند روز قبل ملی ہے ایک گورنمنٹ آفیسر کی لڑکی پر جو گائیڈ کی حیثیت سے کام کرتی تھی مجرمانہ حملہ کیا گیا۔ اسے ایک پرائیوٹ اسپتال میں داخل کیا گیا کیونکہ اس کے جسم سے خون جاری تھا۔

غیر ملکی ایتھلیٹس کی جانب سے ہندوستانی لڑکیوں پر مجرمانہ حملوں کے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ حکام نے ایشیاڈ ولیج میں کام کرنے والی عورتوں کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا ہے

تقریباً ۵۰۰ لڑکیاں جو یہاں گائیڈ یا ترجمان کی حیثیت سے کام کرتی تھیں ایشیاڈ ختم ہونے کی بے چینی سے منتظر ہیں۔ ایک گائیڈ کے مطابق ان میں سے کچھ لڑکیوں نے اپنی اس ملازمت کو خیرباد کہہ دیا ہے۔

یہ خبر ترتیب دی گئی ہے صرف ان خواتین کے سلسلے میں جنہوں نے اپنی بے آبروئی کو چھپانا نہیں چاہا، لیکن ایسی عورتیں کمتر ہی دیکھی جاتی ہیں جو اپنی آبروریزی کی داستان فریادی بن کر پولیس اسٹیشن میں بیان کریں یا متعلقین تک اپنی مظلومیت پہنچائیں۔ عام طور پر شریف عورتیں، ایسے حادثات پر پردہ ڈالدیتی ہیں، اس لئے کہ ان کے ساتھ زبردستی ہی کیوں نہ کی گئی ہو اور وہ کتنی ہی بے قصور کیوں نہ ہوں سماج میں اپنی عزت کھو دیتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آج مردوں کے فریب میں آکر آزاد قسم کی لڑکیاں اپنا سب کچھ کھو دیتی ہیں، لیکن اگر ان کی لوٹ عیاں نہیں ہوتی، لوٹنے والے کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں ہوتی تو وہ سماج میں پاک، وصاف سمجھی جاتی ہیں اور ان کی شادی بیاہ میں

کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن اگر بات اڑ کر پھیل جائے تو نہ پوچھئے۔ ایک کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ ہندوپاک کی تقسیم کے بعد جو نہ جانے کتنے واقعات ہوئے، ان سے سب ہی واقف ہیں نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اور پاکباز بیویاں انسانی درندگی کا شکار ہوئیں ان میں ان کا کوئی قصور نہ تھا لیکن ان کا جو حشر ہوا وہ عبرتناک ہے۔ اگر آپ نے فلم امراؤ جان دیکھا ہے تو سوچئے کہ بیچاری امراؤ جان کا کیا قصور تھا کہ اس کے بھائی نے اسے نہیں اپنایا۔ ذلیل کر کے بھگا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ امراؤ جان کی کہانی فرضی ہو لیکن ایسے واقعات روزانہ ہی ہوتے رہتے ہیں کہ بچیوں کو اغوا کر کے فروخت کر دیا جاتا ہے کسی پیشہ ور طوائفوں کے ہاتھ یا کسی ایسے گروہ کے ہاتھ جو انھیں پال کر جوان کرتا اور بوالہوسوں کے ہاتھ شادی کرنے کے لئے بیچ دیتا ہے۔ ایسی بچیاں اگر کبھی اپنے گھروں تک واپس آ بھی جاتیں تو انھیں عزت کے ساتھ کوئی بھی اپنانا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے سماج کی بے راہ روی کا شکار ہونے والی لڑکیاں اکثر اپنے محبوبوں کا جو ان کی اپنی غلطی سے ہوا ہو یا انھیں بہلا پھسلا کر دھوکے سے کیا گیا ہو پردہ فاش نہیں کرتیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہے، جہاں ہزاروں خواتین اور لڑکیاں قانوناً یا شوقیہ حصہ لینے گئی تھیں۔ صرف یہی چند مردوں کی زیادتیوں کا مرکز نہ بنی ہوں گی جنھوں نے فریاد کی یا جنھیں اسپتال تک جانا پڑا۔ بہتوں نے اپنی عزت کھو کر ظاہری عزت بچانے کے لئے کچھ کہا ہی نہ ہوگا۔

اسلام نے اسی لئے اختلاط مرد و زن کو روکا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کی ہے جس سے وہ خلط ملط نہ ہوں تاکہ ایسے واقعات رونما نہ ہوں۔ اسلام ایک نہایت پاک صاف معاشرہ چاہتا ہے اور وہ اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آگ اور پھوس کو یکجا نہ ہونے دیا جائے۔ کوئی ایسی مثال تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے نبی صلعم نے کسی بھی مجلس شوریٰ میں خواتین کو بھی مردوں کے ساتھ ساتھ بٹھایا ہو۔ کیوں؟ کیا حضرت محمد صلعم عورتوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ کیا ان کا رتبہ اور درجہ مردوں سے کم تھا حضور صلعم کی نظروں میں — ہرگز نہیں۔ ہمارے پیغمبر صلعم نے عورتوں کو مردوں سے کبھی کمتر نہیں سمجھا۔ یہ صرف دو جداگانہ فرائض کی تقسیم جدا جدا رکھی۔ جہاں ایک شوہر کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی بیوی کے نان نفقے کا ذمہ دار ہو۔ اس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائے۔ وہیں بیوی کو یہ بتایا کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اس کے احکام کی پابندی کرے۔ اس کے آرام کا خیال رکھے۔ لیکن اس نظریہ کے باوجود حضور صلعم نے مردوں اور عورتوں کا خلط ملط ہونا پسند نہیں فرمایا۔ حد یہ ہے کہ نماز جیسے مقدس فریضہ کی ادائی میں بھی نہیں۔ بلکہ یہی ہے کہ اگر خواتین اپنے گھروں میں اور تخلیہ میں نماز پڑھیں تو افضل ہے۔

جاتے جاتے اور آتے ہی آتے

۱۹۸۲ء اردو کے لئے منحوس ترین سال تھا جس میں شفیق پروفیسر عبدالاحد خاں خلیل، مولانا محمد ثانی حسنی ایڈیٹر رضوان۔ شاعر بے مثال جوش ملیح آبادی فراق گورکھپوری جیسے باکمال شاعر کو اپنے آغاز ہی میں ہم سے جدا کر گیا تھا اس منحوس سال نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ چلتے چلتے عبدالحمید بوبیرے ایڈیٹر صبح امید جیسے محسن اردو اور شاہنامہ کے خالق شاعر بے ہمتا حضرت حفیظ جالندھری کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ ۱۹۸۳ء شروع ہی ہوا تھا کہ یہ اندوہناک خبر آئی کہ اردو کے مشہور اور ہردلعزیز شاعر جناب نشور واحدی بھی داغ مفارقت دے گئے — اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ بڑے ہی خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔

عبدالحمید بوبیرے

صبح نو بمبئی کے مالک و ایڈیٹر جناب عبدالحمید بوبیرے کے انتقال پر ملال کی خبر حریم نومبر ۱۹۸۲ء میں مختصراً شائع ہو چکی ہے لیکن خبر سے عبدالحمید بوبیرے مرحوم کی شخصیت واضح نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ہم ان کے متعلق تاثرات ناظرین حریم کو بتانا چاہتے ہیں بوبیرے صاحب آندھرا پردیش کے بہت ہی قدیم اور قابل صحافی تھے۔ مرحوم کی عمر ۷۰۔ ۷۴ کے درمیان تھی۔ ان کا زمانہ صحافت پچیس سال تک جگ رہا ہے ۱۹۳۷ء میں آپ نے اقبال ۱۹۳۳ء میں نادر اور پھر ۱۹۵۲ء میں امید نام کے ماہناموں کی اشاعت شروع کی تھی۔ اول الذکر دونوں ماہناموں کی زندگی بہت ہی شاندار خاص نمبر بھی شائع کئے — جو بیشتر آندھرا پردیش کی شخصیتوں وغیرہ سے متعلق تھے۔

حریم کے بعد غالباً سب سے پرانا ماہنامہ ہے جو اردو میں چھپ رہا ہے۔ اسی ماہنامے کی مقبولیت کے باعث بوبیرے صاحب سیاست دانوں، منسٹروں اور سماجی کارکنوں کے پسندیدہ ایڈیٹر تھے۔

انھوں نے ہمیشہ پاک و صاف زندگی گذاری۔ اردو کی فلاح و بہبود کے ساتھ ہی انھیں ملک و ملت کا بھی ہمیشہ خیال رہا۔

عبدالحمید صاحب علاقہ کوکن سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے کوکنوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی بہت کچھ کرتے رہے ہیں۔ ایک کتابچہ مرحوم نے شراب نوشی کے لئے لکھا تھا، وہ متعدد زبانوں میں چھپا۔ شراب پینا لوگوں نے بند کیا ہو یا نہیں لیکن بوہیرے صاحب بہرحال اس کے لئے اسی طرح کوشاں رہے، جس طرح میں پردہ پوشی کے لئے حریم کے ذریعہ ۲۵ سال سے جدوجہد کر رہا ہوں اور نتیجہ یہ ہے کہ بے پردگی بڑھتی جا رہی ہے۔

عبدالحمید بوہیرے صاحب سے میرے تعلقات کافی دیرینہ تھے۔ وہ کبھی لکھنؤ نہیں آئے تھے، لیکن میں پچاسوں بار بمبئی گیا۔ میرا معمول تھا کہ جب کبھی جاتا مرحوم سے ضرور ملتا تھا۔ وہ ایسے خوش اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے کہ بمبئی جا کر ان سے ملے بغیر میں کبھی واپس نہیں ہوتا تھا، صرف ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا تھا، اس کا افسوس مدت تک رہا۔ اور بڑا افسوس اس لئے ہوا کہ مل سکتا تو شاید وہی ان سے آخری ملاقات ہوتی۔

میری ہی طرح عبدالحمید صاحب نے بھی تنہا صبح امید نکال کر اسے ترقی دی۔ کاش میری ہی طرح انھوں نے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی قائم کر لیا ہوتا تو شاید انھیں صبح امید کو اور زیادہ شاندار بنانے کا موقع مل جاتا۔

گذشتہ نومبر میں بمبئی گیا تو راستہ ہی سے میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اس لئے میں بمبئی پہنچتے ہی ان کی شریک حیات اور ان کے فرزند دلبند عبدالسمیع سلمہ کے پاس تعزیت کے لئے نہ جا سکا۔ حالانکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ بمبئی جا کر پہلا فرض یہی ادا کروں گا۔ جس روز مجھے کچھ سکون ہوا تو میں نے فون پر تعزیت کرنا چاہی، معلوم ہوا کہ اس وقت قرآن خوانی ہو رہی تھی [illegible] کا تھا اور دیر ہو چکی تھی، اس لئے میں شریک نہ ہو سکا۔ البتہ دوسرے روز سب سے پہلا کام یہی کیا کہ مرحوم کے گھر جا کر تعزیت کی۔

ان کے بیٹے عبدالسمیع بوہیرے موجود تھے۔ وہ بھی اپنے والد مرحوم [illegible] خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ انتظامی امور صبح امید [illegible] انجام دیتے تھے۔ میں نے اظہار افسوس وغیرہ کرنے کے بعد ان سے درخواست کی کہ باپ سے محبت کرنے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہوگا کہ تم صبح امید کی اشاعت کو جاری رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ مرحوم بوہیرے صاحب کی یہی دلی تمنا بھی رہی ہوگی۔ جیسا کہ میری دلی خواہش ہے کہ میرے بعد حریم و نسیم بک ڈپو کا وجود قائم رہے۔

مرحوم بوہیرے صاحب کے لئے دعائے مغفرت کے ساتھ ہی میں نے یہ دعا بھی کی کہ اللہ پاک ان کی بیوہ اور بچوں کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے۔

نسیم انہونوی

لکھنے کا شوق رکھنے والی بہنوں اور بھابھیوں سے

حریم کے دفتر میں روزانہ دو چار افسانے حریم کی خریدار بہنوں اور بھابھیوں کے وصول ہوتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تعلیم نے انہیں مضمون نویسی کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ لیکن انھیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ شاعری، مضمون نویسی، افسانہ اور ناول نگاری وغیرہ فطرت کی دین ہوا کرتے ہیں۔ ہر پڑھا لکھا، مرد ہو یا عورت ان کا اہل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ قدرت سے یہ قابلیت سب کو عطا نہیں ہوتی۔ ہم ان مضامین کو اگر شائع کرنے لگیں تو پھر حریم کا کوئی معیار ہی نہ رہ جائے گا۔ ویسے بھی ایک ماہ میں وصول ہونے والے مضامین اگر شائع کیے جائیں تو ایک سال کے حریم چھپ سکیں گے اس لئے ہم صرف انھیں مضامین کو درست کر کے شائع کرتے ہیں، جو کسی حد تک اچھے ہوتے ہیں۔ عبارت نہ سہی اگر آئیڈیا بھی ہمیں پسند آ جاتا ہے تو ہم اس کی اصلاح کر کے حریم میں جگہ دیدیتے ہیں۔ ہر مضمون نگار بہن یا بھابھی کو یہی انتظار رہتا ہے کہ کب اس کا مضمون چھپے گا۔ اس سلسلہ میں خط و کتابت بھی ہمارے لئے آسان نہیں ہوتی۔ مضامین بھی ہم مہینوں اور کبھی برسوں کے بعد ہی دیکھ پاتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ واپسی کے لئے ٹکٹ بھی شاید ہی کوئی بہن بھیجتی ہوں، اس لئے ہم مضامین تلف کر دیتے ہیں۔

جواب طلب باتوں کے لئے

اگر آپ چاہتی ہیں کہ کسی بات کا آپ کو جواب ملے تو جواب

کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔ دفتر جواب کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ سوچتی ہوں گی کہ صرف آپ کا ہی ایک خط گیا ہے۔ نہیں دفتر میں ایسے دس بیس خط روزانہ وصول ہوتے ہیں، جن کے جواب طلب جاتے ہیں ہم اس گرانی میں ان اخراجات کو کیسے برداشت کریں۔ ہمدردانہ غور فرمائیں۔

لڑکیاں کہاں جارہی ہیں

اس عنوان سے ایک مضمون اردو بلٹز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم نقل کرتے ہیں۔ ترقی پسندی، فیشن اور آزادی پسند لڑکیوں کو خواتین کو اسے پڑھتے وقت یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ مضمون مجھ دقیانوسی کا لکھا ہوا نہیں بلکہ بہت ہی روشن خیال ادیب و مفکر جناب خواجہ احمد عباس کا لکھا ہوا ہے۔ خواتین جو اس راہ پر گامزن ہیں اس سے عبرت حاصل کریں۔

"ایک زمانے میں کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی عورت ہندو، مسلم، سکھ، اور عیسائی، عصمت اور عفت کی دیوی ہوتی ہے۔ کوئی اس کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

وہ تو تھا اب کیا ہو رہا ہے۔ یہ تفصیلات دلّی کی ایک رپورٹ سے معلوم ہو جائیں گی۔ لگتا ہے کہ ہندوستان ایک لمبا چوڑا چکلا بن گیا ہے۔ جہاں عصمت فروشی کا ایک نیا دھندا شروع ہوا ہے۔ ابھی تو اس کی شروعات ہی ہے۔ مگر اب بھی اس دھندے کی زد میں ہزاروں نوجوان ... عورتیں اور کالج اور اسکولوں میں پڑھنے والی لڑکیاں شامل ہو گئی ہیں۔

کیوں انھوں نے یہ گناہ کا راستہ اختیار کیا ہے؟ اس کی وجہ ہے جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتی ہیں۔ فیشن ایبل سلک کی ساڑیاں، پیرس سے آئے ہوئے جینز، شرٹ اور طرح طرح کی انگیاں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کی چمک دمک اور وہ سب جو ایک خاص طبقے کو حاصل ہے۔ ہم میں کیا کمی ہے جو ہمیں یہ چیزیں نہیں مل سکتیں۔ جو دکانوں کی شیشے کی دیواروں کے پیچھے سجی ہوتی ہیں؟ ان متوسط گھرانوں کی لڑکیاں اپنے آپ سے سوال کرتی ہیں۔ اور اس کا جواب ملتا ہے۔ صرف ایک پتلا سا شیشہ جو تمہارے اور ان کے درمیان ہے۔

تمہاری شرافت کا شیشہ۔ تمہاری عصمت اور عفت کا شیشہ۔ اس شیشے کو توڑ ڈالو۔ اور تمہیں بھی یہ سب سامان حاصل ہو سکتا ہے"۔

دلال چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی لڑکیوں کی تلاش میں جو ایسی لڑکی ملی اس کو ہزاروں روپے روز کمانے کا لالچ دیا۔ اور ضمیر کی چکا چوند ہوئی یہ لڑکیاں دس میں سے آٹھ تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں ہم شریف خاندان سے ہیں۔ ہم رات کو گھر سے نہیں نکل سکتیں"۔

"دن میں بھی انتظام ہو سکتا ہے" دلال جواب دیتا ہے: "فقط تین چار گھنٹے ہی تو چاہیئے"۔

سو ہوٹلوں میں رکھے جاتے ہیں۔ سہمی ہوئی یہ لڑکیاں گھر سے جھوٹ بول کر کہ کسی سہیلی کے گھر جا رہی ہیں یا اسکول جانے کا بہانہ کر کے جو جگہ انھیں بتائی گئی ہے اس جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ عورت کی زندگی کا سب سے بھیانک سبق پڑھنے کے لئے۔

استحصال ہوتا تو ضروری ہے۔ اگر خریدار ایک ہزار روپے دیتا ہے تو دلال اس میں سے پانچ سو روپے اپنی کمیشن لے لیتا ہے۔ دو سو روپے اس مکان والے کو دیئے جاتے ہیں جس نے انھیں جگہ دی۔

یہ لڑکیاں کون ہوتی ہیں؟

شرم کی بات ہے کہ اس میں کالج اور اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں نوجوان شادی شدہ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ سرکاری نوکروں کی بیویاں بھی ہوتی ہیں جن کے شوہروں کی تنخواہ ان کے ساز و سامان کے لئے کافی نہیں ہوتی۔

رات کے وقت استعمال کرنے کے لئے قریبی قصبے اور گاؤں سے ان کے والدین کو پانچ سو روپے دے کر لڑکیاں حاصل کی جاتی ہیں۔

اور ان کے خریدار کون ہیں؟

لڑکیوں کے نام تو روز اخباروں میں چھپتے ہیں۔ کوئی شہزادی ہے تو کوئی ..., کوئی میناکشی تو کوئی سلویا جوزف۔

مگر ان کے خریدار کون ہیں؟ باہر سے آئے ہوئے سیاح (ٹورسٹ) تو ہوتے ہی ہیں۔ مگر ان کے خریداروں میں بڑے بڑے بزنس مین اور سیاست داں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے نام اگر پولیس ایک بار چھاپ دے تو بڑا کام ہوگا۔

سلام بحضور خیر الانامؐ

لائی مجھے ادب میری شکستہ پائی
اس بختِ نارسا کی اللہ رے رسائی
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو
داتا سلام لے لو شاہا سلام لے لو

اس آستاں کے قابل میری جبیں نہیں ہے
میں اور یہ حضوری دل کو یقیں نہیں ہے
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

ہستی مٹا کے آئی دنیا لٹا کے آئی
داغوں سے اپنے دل کی محفل سجا کے آئی
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

منہ میں زباں نہیں ہے لب پہ فغاں نہیں ہے
کیا حالِ دل سناؤں تابِ بیاں نہیں ہے
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

دل صورتِ گلِ تر روضے پہ ہے نچھاور
جاگا مرا مقدر کہتا ہے دل تڑپ کر
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

میں اپنے داغِ عصیاں اشکوں سے دھو رہی ہوں
پلکوں سے موتیوں کی لڑیاں پرو رہی ہوں
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

اس مشتِ خاک پر ہیں کیا کیا کرم تمہارے
مٹی بنا ہے سونا چھو کر قدم تمہارے
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

تم سب سے محترم ہو تم صاحبِ حشم ہو
تم شافعِ امم ہو مجھ پر بھی کچھ کرم ہو
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

اے ہادیِ مکرم اے رہبرِ دو عالم
اے بے کسوں کے ہمدم اے زخمِ دل کے مرہم
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

کشتی ہے بے سہارا اور دور ہے کنارا
مایوس ہو کے میرے دل نے تمہیں پکارا
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

میری نوا بھی سن لو میری صدا بھی سن لو
تم سب کی سن رہے ہو میری دعا بھی سن لو
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

آلائشِ جہاں سے اس دل کو صاف کر دو
میری خطائیں آقا ساری معاف کر دو
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

ایماں کو تازگی دو دل کو شگفتگی دو
پھر ذوقِ بندگی دو ظلمت میں روشنی دو
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو

لطف و کرم کے مخزن تم پر نثار تن من
میں ہوں نسیمِ گلشن پھولوں سے بھر دو دامن
حاضر ہوں دست بستہ لے کر دلِ شکستہ
آقا سلام لے لو مولا سلام لے لو
شاہا سلام لے لو داتا سلام لے لو

وحیدہ نسیم

نصیحت آمیز باتیں

امام غزالی کی مجلس میں لوگ انسانی کارناموں پر بحث کر رہے تھے۔ کوئی فاتحین اور مفکرین کے کارناموں کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی دانائی اور حکمت کو انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ثابت کرنے کی فکر میں تھا۔ کافی دیر بعد امام صاحب نے مداخلت کی اور کہا "تم لوگ بحث کے صحیح جواب کی تلاش میں بہت دور نکل گئے ہو حالانکہ انسان جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے وہ بالکل سامنے کی بات ہے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں "کون سی چیز؟" امام غزالیؒ نے جواب دیا "انسان کا اگر کوئی سب سے بڑا کارنامہ ہو سکتا ہے تو یہ کہ انسان اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے اور یہ کارنامہ بہت کم لوگ انجام دے سکتے ہیں۔"

• ایک شیر، بھیڑیا اور لومڑی ساتھی بن گئے اور شکار کے لئے نکلے۔ انھوں نے ہرن، گدھے اور خرگوش کا شکار کیا۔ شیر نے بھیڑیئے سے کہا "ذرا ایمان داری کے ساتھ شکار تقسیم کر دو۔" بھیڑیئے نے کہا "یہ تو بہت آسان کام ہے۔ ہرن تمہارا، گدھا میرا اور خرگوش لومڑی کا۔" [illegible] شیر نے پنجہ مارا اور بھیڑیئے کا سر تن سے الگ کر دیا اور لومڑی سے بولا "چلو اب تم شکار تقسیم کرو۔" لومڑی نے کہا "گدھا آپ کے ناشتے کے لئے ہے، ہرن آپ رات کے کھانے پر تناول فرمائیں اور رہ گیا خرگوش تو وہ جب درمیان میں بھوک لگے تو منہ کا مزا بدلنے کے لئے کھا لیجئے۔" شیر نے خوش ہو کر کہا "بھیڑیا تو جاہل تھا اور بے ایمان [illegible] تم بہت سمجھدار ہو، اتنا اچھا فیصلہ کرنا کس نے سکھایا؟" وہ بولی "جی ابھی بے ایمان بھیڑیئے کی گردن [illegible]"

• [illegible]
[illegible]

ملا نے جب خط کھولا تو وہ ارمنی زبان میں لکھا تھا۔ ملا نے کہا "میں اس زبان سے ناواقف ہوں، یہ خط نہیں پڑھ سکتا۔"

ارمنی نے ملا کو سر سے پیر تک دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا "اگر یہ خط نہیں پڑھ سکتے ہو تو پھر اتنا بڑا عمامہ سر پر کیوں رکھ چھوڑا ہے؟"

ملا نے جلدی سے پگڑی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور کہا "اگر عمامے کی وجہ سے خط پڑھا جا سکتا ہے تو پھر تو خود اسے پڑھ لے۔"

• ایک پادری گرجا گھر میں کہہ رہا تھا "خدا کی بنائی ہوئی کسی بھی شے میں کوئی کمی یا عیب نہیں ہے۔ اس کی بنائی ہوئی ہر شے مکمل ہے۔"

وعظ سننے والوں میں سے ایک کبڑے نے اٹھ کر کہا "جناب، میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" پادری نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں سمجھتا ہوں خدا نے آپ کو مکمل کبڑا بنایا ہے۔ آپ میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔"

• ایک کھلی محفل وعظ و تلقین کے دوران ایک دہریئے نے بشپ سے سوال کیا کہ آیا وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ حضرت یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا تھا!

"جب میں جنت میں جاؤں گا تو حضرت یونسؑ سے اس کی تصدیق کروں گا۔" بشپ نے جواب دیا۔

"لیکن فرض کریں کہ یونسؑ وہاں نہ ہوئے تو پھر؟"

"تو پھر آپ کو ان سے پوچھنا پڑے گا۔" بشپ نے جواب دیا۔

دولت

• نرم بستر دے سکتی ہے لیکن سکون کی نیند نہیں دے سکتی۔
• چشمہ خرید سکتی ہے مگر بینائی نہیں دے سکتی۔
• کتابیں فراہم کر سکتی ہے، لیکن علم نہیں دے سکتی۔
• غذا مہیا کر سکتی ہے تندرستی نہیں دے سکتی۔

مرسلہ:- شاہدہ تبسم (بنگلور)

اندھیرا اُجالا

ایس۔ اے۔ شیما

پورے ایک ہفتہ سے مطلع ابر آلود تھا۔ دھند اور کُہر نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ دن اور رات کو کسی نہ کسی وقت بارش بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت بھی شدید بارش ہو رہی تھی۔ اور وہ گھر کے دروازے پر شیڈ کے نیچے کھڑا گلی میں ٹخنوں سے اوپر اوپر بہنے والے پانی کو اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کا خالی خالی نصیب بھی بارش کے پانی کے ساتھ نالی میں بہہ گیا ہو۔ اس کی نگاہیں ایک ٹک نیچے کو جمی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔

قدرت کا کوئی ایسا دستور بھی ہوتا کہ جہاں نصیب سو جاتا تو بالکل وہیں پر انسان کو بھی ابدی نیند آجاتی تاکہ احساس کے گھاٹ اتر کر یہ تو نہ سوچنا پڑتا کہ میرے اختیار سے میرا ہی جینا مرنا، میرا ہی ہنسنا رونا چھین لیا گیا ہے۔ میں اپنا ہو کر بھی اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں زندہ ہو کر بھی زندگی کے لئے بیکار ہوں۔ کتنا جان لیوا احساس ہے یہ۔ انسان کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ بس روحوں کا بے نام سا سفر ہے۔ جہاں مجھ جیسا نادار شخص تاریکیوں میں سانس لیتا ہے۔ جینے کے لئے مرتا ہے۔ اور مرنے کے لئے جیتا ہے۔

پھر اچانک ہی اس کی مایوس کن سوچوں کے تانے بانے ادھڑتے چلے گئے۔ اندر سے بیمار ماں کی کھانسی کی آواز سن کر اس کے سینے کے اندر آتشی پھرکی جیسی کوئی چیز پوری رفتار سے گھوم گئی۔ اس کی ماں پچھلے کئی دنوں سے بیمار تھی اور وہ تنگ دستی کے باعث اس کا خاطر خواہ علاج نہ کرا سکا تھا۔ اس قدر جوان ہو کر بھی کتنا بے بس تھا۔ وہ غریبی کے [illegible] تھا۔ اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی پلٹ کر اندر کمرے میں جانا ہی چاہتا تھا کہ سامنے نظر جا پڑی۔ دو تین مکان چھوڑ کر دائیں جانب ایک گھر کے بند دروازے پر ایک لڑکی کتابوں کو سینے سے لگائے سمٹی کھڑی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سردی کی شدت اور باد و باراں میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہ دیا۔ وہی ایک لڑکی گلی میں [illegible] کے نیچے [illegible] کی طرح کھڑی تھی۔ شاید بارش رکنے کا انتظار کر رہی تھی۔

بارش رکنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور گلی پانی سے بھرتی جا رہی تھی۔ بیچاری لڑکی۔ اس نے سوچا کب تک ٹھٹھرتی رہے گی۔

چندا! اس نے کمرے کی طرف منہ پھیر کر آواز دی۔ جی بھیا جان۔ اندر سے نو دس سال کی گڑیا سی بچی لپک کر اس کی طرف آئی۔

چندا وہ دیکھو سامنے جس مکان کے بند دروازے پر وہ کھڑی ہے ان کمینوں کے دل بارش کے قطرے کو بھی گھر میں جگہ نہیں دیتے۔ اس بھیگتی ہوئی لڑکی کو کیا دیں گے۔ بارش اور تیز ہو گئی ہے چندا۔ اسے یہاں گھر لے آؤ۔"

بچی بوری سر پر رکھے پانی میں شڑاپ کرتی اس کے پاس جا پہنچی۔ وہ اندر چلا گیا۔ ذرا توقف بعد بچی واپس آگئی۔ بھیا جان وہ نہیں آرہی ہیں۔ کہتی ہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔

چندا اس سے کہو یہ گھر اکیلا نہیں، اس میں ماں بھی ہے۔ آجاؤ ادھر یہاں بخت گری تو زندگی کی علامت ہو سکتی ہے۔ سردی نہیں۔ ٹھٹھر جاؤ گی وہاں۔ اس نے ماں کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بچی پھر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے ہمراہ چلی آئی۔ چندا نے اس کی کتابیں پکڑ رکھی تھیں۔ اور وہ خود کو سنبھالے اندر داخل ہوئی۔ موسم کی اذیت اس کے لرزتے سراپے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

بھیا جان بڑی مشکل سے آئی ہیں باجی چندا نے کہا۔

تشریف رکھئے خاتون۔ باہر بڑی ٹھنڈ ہے۔ اس نے ٹھنڈ کا ذکر کر کے بارش کو اس طرح حذف کر دیا تھا جیسے اس کے اندر چلے آنے سے مطلع بالکل صاف ہو گیا تھا۔ طوفان باد و باراں تھم گیا تھا۔ اس کے دل کے اندر سکون کی ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہونے لگیں۔

چندا نے کوئلے کی جلتی ہوئی انگیٹھی کرسی کے قریب کر دی۔

"آداب ماں جی" لڑکی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو بیٹی" ماں نے کانپتی آواز میں کہا۔ باہر نکلتے وقت حالات دیکھ لیا کرتے ہیں بیٹی۔ ورنہ بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔

موسم تو کئی دنوں سے خراب ہے ماں جی۔ کب تک اسے دیکھتے رہیں۔ لڑکی نے جواب دیا۔

اچھا اللہ تمہیں ہمت دے بیٹی۔ پھر چندا اور میں چائے بنا کر کمرے میں لے آئے۔ ماحول میں قدرے اپنائیت سی آگئی۔ کچھ دیر بعد بارش تھم گئی۔ پانی بھی نالیوں میں بہہ گیا تو وہ چلی گئی۔

بعض لوگ نام پتہ بتائے بغیر گھر میں آتے ہیں۔ لیکن ازل کے گمنام راستوں کو منزلوں کے نام بخش کر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح آئی تھی۔ اور ایک اسی کو نہیں ماں اور چندا کو بھی محسوس ہوا تھا کہ اس نے جو وقت یہاں گذارا تھا تو اپنوں سے بھی اپنی لگی تھی۔ کتنی پُرخلوص اور سادہ تھی وہ...... اس کے بعد وہاں سے آتے جاتے گاہے گاہے ماں جی کی عیادت کو آنے لگی۔ یہ اس کا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ اخلاقی فرض اس کے لئے لازمی امر ہوتا چلا گیا۔ تکلفات کی ساری دیواریں گرتی چلی گئیں۔ شام کو تھکی ہاری جب وہ وہاں سے گذرتی تو بے اختیار اس کے قدم اس گھر کی طرف اٹھ جاتے۔ جہاں ماں اور چندا تو تھے ہی لیکن وہ ان سے جدا صحرا جیسی تپتی آنکھوں میں گھر کر بیٹھ جاتا۔ اور جب وہ آجاتی تو ساری تھکن ختم ہو جاتی آنکھوں کے صحراؤں میں رم جھم سی چاندنی بکھر سی جاتی۔ دل کا آئینہ پتھروں کو جھٹلا دیتا ہے۔ اور وہ تو انسان تھے۔ چپکے سے ایک دوسرے کے ہوگئے۔ دونوں ہی ایک طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں ہی معاشی دکھوں کو سینے سے لگائے جی رہے تھے۔ معاشی دکھ جو زندگی کی ہر راحت کو چاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی راحتوں کو گنوائے محنت کی چکی میں پس رہے تھے۔

وہ جس نے محنت مزدوری کر کے ایم اے کیا تھا ایک ٹائپسٹ تھا اور ایک ورائٹی سنٹر میں سیلزمین کے طور پر پارٹ ٹائم کام بھی کرتا تھا۔ اسی طرح وہ بھی والد کی وفات کے بعد نامساعد حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ باپ کی پس انداز کی ہوئی قلیل رقم اور ماں کی سلائی کڑھائی کی معمولی آمدنی سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ وہ بھی بی اے کی طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھا کر حالات کا بھرم رکھ رہی تھی۔ ایسے میں دونوں کا سنجوگ کوئی انہونا نہیں تھا۔ دونوں اس ملاپ پر خوش تھے۔ گھریلو امور میں تنگ وقت میں ایک دوسرے کی مدد کر کے روحانی خوشی محسوس کرتے۔ پھر ان کے درمیان روحانی خوشی کا کوئی یہی ایک پہلو تو نہ تھا —— وہ تو ایسے بندھن میں بندھ چکے تھے جس میں یہ روحانی خوشی بھوک پیاس امیری غریبی کے ہر فرق کو مٹا دیتی ہے۔ دل کے اندر کے سارے جذبے کو نکھار کر دیتی ہے۔ یہ خوشی یہ سرخوشی مستقبل کے کسی خطرے کسی اندیشے کو نہیں دیکھتی۔

ایک دن وہ اس سے کہنے لگا "تم کتنی اچھی اور ہمدرد ہو۔ اتنی اچھی کہ میں نے پل بھر میں تمہارے سنگ صدیوں کے فاصلے طے کر لئے ہیں۔ خود بخود ہی، حالانکہ تم نے ایک مرتبہ بھی نہیں کہا کہ...... کہ"

"شہاب میں اتنی اچھی ہوں اور میرے جیسا اس شہر بھر میں کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ بس رہنے ہی دو یہ باتیں شہر بھر میں میرے جیسی ہزاروں لڑکیاں ہیں یہ جھوٹ تم بول سکتے ہو، میں نہیں۔ طاہرہ۔" اس کی آواز کی وارفتگی نے سرگوشی کی۔

"مگر طاہرہ وہ میرے دل میں کہاں۔ میری آنکھوں میں کہاں۔ دل و نگاہ میں تو ایک تم ہو۔ میرے لئے ساری دنیا سے ارفع ہو۔ تم مجھے اس وقت ملی تھیں طاہرہ جب میری تقدیر کے سائبان بھری برسات میں جل رہے تھے۔ اور میں اپنے دکھوں کی آگ میں جب جاپ جل چکا تھا تم نے مجھے زندگی کی حقیقی خوشی بخشی ہے جانم۔ کہہ دو۔ کہ یہ خوشیاں اور تیرا میرا سنجوگ ابد تک قائم رہے گا۔ کبھی نہ ٹوٹنے پائے گا۔"

وہ سنتی رہی۔ چپ رہی اور ہنس پڑی۔ کہتی بھی کیا۔ اسے تو ایسی باتیں کرنے کا شعور کبھی حالات نے نہیں لینے دیا تھا۔ اس کی ہنسی دیکھ کر بولا۔

"یہ گھر بھی تمہارے گھر جیسا ہے جانم۔ اس میں بھی اداس اور تنہا لوگ رہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہمیشہ کے لئے اس گھر میں میرے سنگ آن بسو۔ یہ میری ماں کی بھی مرضی ہے۔ چندا کی بھی۔ اگر ہاں کہہ دیتی ہو تو قسم سے دونوں جہاں آباد ہو جائیں گے۔ کیا کچھ نہیں ہو جائے گا طاہرہ۔ یہ کائنات ہماری ہو جائے گی۔" وہ خاموش رہی۔ سر جھکائے کہیں کھوئی رہی۔ "طاہرہ بولو نا۔"

"جو چاہتے ہو کرو شہاب۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ میرے لئے تم پوچھنے کی حد سے بلند ہو۔ بہت بلند" دوسرے ہی دن ماں جی اس کے گھر گئیں۔ ہزاروں ارمان ہزاروں مرادیں لئے۔ شہاب کے لئے اسے مانگنے اور جلد ہی واپس بھی آگئیں۔ صورت حال سے شہاب کو آگاہ کیا۔ مانگنے سے کبھی خوشیاں ملی ہیں۔ دے تو قدرت اپنے گھر کی خوشیاں دے۔ یا پھر اتنا پیسہ ہوتا کہ خوشیاں خریدی جاسکتیں۔ آج کل تو دنیا نے

بستیوں کی بھی قیمت لگا رکھی ہے۔ وہ انھیں سوچوں میں نجانے
سب سے گم تھا کہ اس کا انہماک طاہرہ نے توڑا۔

"ہیلو شہاب اس نے اپنی کتابیں زور سے میز پر پٹخ دیں۔
بھی ہوش کی دنیا میں بھی رہ کر دیکھ لو، بڑا مزہ آتا ہے سچ"
تم لوگوں نے ہوش کی دنیا میں رہنے ہی کب دیا ہے وہ دھیرے
سے بولا۔

تم لوگوں سے..... طاہرہ نے اس کا فقرہ زیرلب دہرایا۔
گویا آج ہم سب لوگوں سے لڑائی ہوگئی ہے۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔
لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔
پورے بارہ بجائے ہوئے ہیں ماتھے پر۔ کچھ تو بولو۔ ہوا کیا ہے۔
وہ چلائی۔

تو واقعی تمہیں کوئی پتہ نہیں صورت حال کا۔
میں تو سیدھی کالج سے یہاں آرہی ہوں بھئی۔ کچھ تو بتاؤ ہوا
کیا ہے۔

اور کیا ہوتا تھا طاہرہ۔ امی آج تمہارے گھر گئی تھیں رشتے
کی بات لے کر لیکن تمہاری امی نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ ہم غریب
لوگ ہیں اور وہ تمہیں کسی اونچے گھرانے میں بیاہنے کا ارادہ رکھتی
ہیں مجھے اس ناکامی کی امید نہیں تھی طاہرہ، میں بھول گیا تھا
کہ ناکامیوں نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔

جذبات کی تلخیوں سے کانپ گئی۔ وہ جلدی سے کرسی پر گرنے
کے سے انداز میں بیٹھ گئی کچھ توقف کے بعد آواز میں قابو پاتے ہوئے
شہاب اس ناکامی کی تو مجھے بھی امید نہیں تھی۔ میں سمجھتی تھی، امی
بلا پس و پیش یہ رشتہ قبول کرلیں گی۔ یا کم از کم میری مرضی ضرور
پوچھیں گی۔ وہ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔

آخر انھوں نے ایسا کیوں کیا طاہرہ؟ مجھے تو اس انکار کی کوئی
وجہ نظر نہیں آتی۔ وہ بولا۔

وجہ یہ ہے شہاب کہ دولت کی تمنا نے شخصی محبت کو تباہ کر دیا
ہے۔ ہمارے طبقے کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ بہت اونچے اونچے
خواب دیکھتا ہے اور ہمیشہ یہ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ اپنے جیسے
لوگوں کو یہ قبول نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ آپس میں طبقاتی

امتیاز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ فاصلے بڑھ رہے ہیں اور ہم دوراہوں
میں پھنس گئے ہیں۔ میری ماں کی سوچیں بھی یہی ہیں شہاب ان
کی ساری زندگی تنگی میں گزری ہے لیکن وہ اپنی بیٹیوں کو بہت
اونچا دیکھنا چاہتی ہیں۔ پھر سانحہ یہ بھی ہے کہ ایک تم ہی نہیں
ٹھکرائے گئے۔ میں بھی ٹھکرائی گئی ہوں۔ میرے کزن نے مجھ سے
بچپن کا رشتہ صرف اس لئے توڑ کر دوسری جگہ شادی کرلی ہے کہ میں
مالی طور پر اس سے کم تر ہوں اور تم لوگوں کے گھروں میں جا کر
ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ لیکن خیر چند سالوں بعد جب میری ماں دیکھیں
گی کہ چھوٹی بیٹیاں بھی جوان ہوگئی ہیں۔ اور بڑی بیٹی
کی عمر بھی اونچے رشتے کی آس میں ڈھلنے لگی ہیں تو خود بخود اونچے
خواب دیکھنا چھوڑ دیں گی۔ یقیناً وہ اپنے ماحول کی طرف لوٹیں گی۔
شہاب۔ تھوڑا سا انتظار تو کرو۔

لیکن طاہرہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہارا کہیں بڑے گھر میں
رشتہ نہ ہو۔ وہ بولا آخر تم میں کیا کمی ہے۔ صورت سیرت۔ رکھ
رکھاؤ۔ علم و ادب۔

ان باتوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سکون کی چاک دمک سب
کچھ ہے آج کل۔ صورت، سیرت کا قائل میرا کزن بھی تھا لیکن
پھر بھی ناطہ توڑ گیا۔ یہ اخلاقی جراتیں صرف ہمارے تمہارے
جیسے لوگوں کے لئے رہ گئی ہیں۔

فرض کرو کوئی بڑا رشتہ کر بھی گیا تو وہ بہت مایوس تھا۔
تو رشتہ تمہارا ہوگا۔ وہ بڑا رشتہ تمہارا ہی ہوگا۔
شہاب میری عزت تمہیں ہی قبول کر سکتی ہے ـــــ اور
شہاب تم ایک بڑا انسان بن کر میرے پاس آؤگے تم نے
جو یہ سمجھ لیا ہے کہ میں کوئی بہتر مقام نہیں پا سکتا گھریلو مجبوریاں
میں پس کر تم نے اسی ایک ہی معمولی نوکری میں اکتفا کر لیا
ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ اس سوچ کو بدلو میں دراصل ہماری
سوچیں حالات کی شکستگی میں محصور ہوگئی ہیں۔ ہم نے یہ سمجھ لیا
ہے کہ ہم کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ وہ مقام جس کو پانے کے ہم
خواب دیکھتے ہیں۔ حقیقت میں نہیں پاسکتے۔ یہ غلط ہے شہاب۔
تم ہمت نہ ہارو۔ اور کہیں جاب کرو یا کوئی دوسری ٹریننگ کرو۔
کوشش کرو۔ اپنا مستقبل بناؤ شہاب۔ میں تمہارے ساتھ

ہوں تمہاری کوششیں رنگ لائیں گی۔ ایک دن تم ضرور بڑے انسان بنو گے جس کے تمہاری امی خواب دیکھتی ہیں۔ میری ماں خواب دیکھتی ہیں۔ تدبیر تقدیر کو بدل دیتی ہے۔ مشکلیں تمہاری راہ میں بھی ہیں اور میری راہ میں بھی ہم دونوں اپنے ماحول کو سنواریں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ساتھ رہوں گی شہاب۔ تم ہمت نہ ہارو۔

یہ سیدھی اور معصوم سی لڑکی اتنی باہمت اور اعلیٰ بھی ہو سکتی ہے وہ اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی باتیں سن کر اسے ڈھارس بھی بندھ گئی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا

ظاہرہ۔ اس کی آواز میں زمانے کی امنگوں اور محبتوں کا وقار تھا۔ تم میرے سنگ رہو۔ میرے ساتھ ساتھ رہونا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر یقین دلا دو۔

میں زندگی کے آخری لمحے تک تمہارے ساتھ ہوں شہاب۔ چڑیا نہیں ہوں کہ پھُر سے اُڑ جاؤں گی۔ وہ دھیرے سے ہنس دی تھی۔ اس کی ہنسی میں ہمالیہ سر کرنے کا عزم پوشیدہ تھا۔

تب شہاب نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو تھام کر والہانہ انداز میں چوم لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی کرنیں روشن تھیں۔ اس نے حیادار نگاہوں سے اس کے بیتاب انداز کو دیکھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ چھڑا کر ماں جی کے پاس کچن میں چلی گئی۔ جیسے اس نے گھر اور کچن کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔

اقوالِ زرّیں

۱۔ دنیا میں سب سے آسان کام دوسروں کے عیب نکالنا ہے۔
۲۔ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنی اصلاح کرنا ہے۔
۳۔ غصّہ دنیا کے ہر زہر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
۴۔ اچھی کتابیں انسانی ذہن کی تعمیر کرتی ہیں اور خراب تخریب
۵۔ سچائی کی تلاش کے لئے علم کی روشنی ضروری ہے
۶۔ غصّہ ہمیشہ حماقت سے شروع اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔
۷۔ احسان جتانے سے احسان کی قدر جاتی رہتی ہے۔
۸۔ ظالم کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔

مرسلہ:۔ مس عطیرہ کرن (دامنباڑی)

نامِ گُل اور مقدّر خار

ــــــــــ ناز انصاریہ

برف سے ڈھکی وادی نہایت پرسکون تھی۔ پھولوں سے گھرا ریسٹ ہاؤس اور ڈھلوان کو جاتی سڑک بڑا خاموش نظارہ پیش کر رہی تھی۔ فطرت کے حسن کو سراہتا وہ ٹہلتا ہوا دور نکل آیا۔ سامنے سرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ گیٹ پر بیلیں چڑھی تھیں۔ خوبانی اور سیب کے اونچے اونچے درختوں کے ننھے ننھے پھول دھیرے دھیرے گر رہے تھے۔ اتنی خاموشی تھی کہ پھولوں کی چٹک اور ان کے گرنے کی آوازیں بھی فضا میں محسوس ہو رہی تھی گرتی کلیوں کے نیچے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

سرخ اسکارف باندھے وہ پھول چننے میں مصروف تھی۔ بالوں کی شریر لٹ ماتھے پر جھول رہی تھی جسے ہٹانے کے لئے وہ بار بار ہاتھ اٹھاتی تو چوڑیاں چھنک اٹھتیں۔ وہ محویت سے اسے پھول چننے اور بالوں کی اس شریر لٹ سے الجھتے دیکھتا رہا۔

پھول چن کر اس نے سر اٹھایا تو اسے سامنے کھڑا پایا۔ شریر مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی "تم یہاں کیسے آگئے" خوبصورت نگاہوں میں اجنبیت کی لکیر تھی،

اس پوری وادی میں ایک تم ہی نظر آئی تھیں اس لئے ادھر آگیا۔

"بھول گیا اجنبی ہو۔ کب آئے یہاں"

"آج شام ہی پہنچا ہوں"

"شہری ہو"

"ہاں"

"مگر شہری لوگ تو یہاں آتے ہیں چلے جاتے ہیں"

اس نے اداسی سے کہا۔

"یہاں کے اتنے حسن کو چھوڑ کر"؟ اس نے گہری نظر ا،

سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"جب برف پگھل جاتی ہے۔ پھولوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ تو سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ اور لوگ واپس چلے جاتے ہیں"
"لیکن اگر کوئی پھر بھی واپس نہ جانا چاہے تو"
آنے والوں کو جانا ہی پڑتا ہے"
"اچھا تم یہ سب جانتی ہو"
"ہاں۔ یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے"
"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ سیر کو چلیں"
"مگر میں تو تم کو جانتی نہیں۔ پھر تمہارے ساتھ کیوں جاؤں"
بہت خوب۔ اور جو یہ تم اتنی دیر سے میرے ساتھ باتیں کر رہی ہو"
مگر مجھے کیا پتہ، تم کون ہو"
میں بھئی میں ایک پردیسی ہوں۔ شہری ہوں اور اب یہاں آگیا ہوں۔ کیا یہ سب کافی نہیں ہے۔ مگر تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ نا!"
"میں۔ میں کیا بتاؤں۔ اچھا تم چائے پیو گے؟"
"ضرور!"
"تو پھر آؤ" وہ اسے گھر کے اندر لے آئی۔ آتش دان میں آگ روشن تھی۔ ڈرائنگ روم بڑی نفاست سے سجا تھا۔
"تم یہاں اکیلی رہتی ہو"؟
"نہیں میرے بابا رہتے ہیں میرے ساتھ"
پھر ان دونوں نے ساتھ چائے پی اور باہر آگئے۔ گھومتے گھومتے اندھیرا ہو گیا تھا" آؤ اب لوٹ چلیں۔ اور وہ واپس آگئے۔ اسے چھوڑ کر وہ ریسٹ ہاؤس آگیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ آخر وہ اسے مل گئی تھی۔ کتنی خوشی کی بات تھی۔

دوسرے دن وہ وہاں پہنچا تو وہ نیلے رنگ کے پل اوور میں اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھی۔ اس کے سرخ سرخ گال دہک رہے تھے۔ نیلی آنکھوں کا رنگ پل اوور کے شیڈ سے اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ سرخ اسکارف کے بکھرے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سرخ اور نیلے رنگ کے امتزاج نے اسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔

"ہیلو" اس نے اپنی آمد کا احساس دلا دیا۔
"تم آج بھی آگئے۔ کل تو تم پہلی دفعہ آئے تھے۔ اس لئے تمہیں چائے پلا دی تھی۔ آج کس لئے آئے ہو"؟
اس نے شرارت سے پوچھا۔
"کل ہمارا تعارف ہوا تھا نا۔ اس خوشی میں"
"ہوں۔ بڑے چالاک ہو" وہ ہنس دی اور فضا میں اس کی ہنسی کے جلترنگ بج اٹھے۔
ٹہلنے چلتی ہو" اس نے پوچھا۔
"ضرور۔ مگر چائے پینے کے بعد۔ میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک چائے نہیں پی" اس نے سادگی سے کہا۔
"ہوں تو چالاک تو تم بھی ہوئیں" اور دونوں ہنس پڑے۔
لمبے خوبصورت برف سے ڈھکے راستوں پر برف پھینکتے پھینکتے اچانک اس نے پوچھا۔
تمہیں خوبصورت راستوں پر دیر تک گھومنا بہت اچھا لگتا ہے"
ہاں۔ اور تمہیں؟"
"مجھے بھی۔ مگر کیا اکیلے ہی؟"
اکیلے بھی۔ مگر کوئی ساتھی ہو تو..."
"تو دل چاہتا ہے یونہی بہت دیر تک گھومتے رہیں۔ ہیں نا!"
"ہاں" اور اونچے نیچے راستوں پر وہ دیر تک گھومتے رہے۔
اب اسے کوئٹہ اور بھی زیادہ حسین نظر آنے لگا تھا۔ ایک کوئٹہ ہی کیا ہر پل ہر ساعت ساری زندگی حسین ہو گئی تھی۔
"یہ وادی کتنی خوبصورت ہے!" اس نے کہا
"ہاں۔ بہار میں یہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے"
"اچھا۔ جب ہر طرف پھول کھلتے ہیں تب!"
"ہاں۔ تب تک تم رکو گے نا؟"
"اب تو رکنا ہی پڑے گا۔ اور وہ دونوں مسکرا دیئے
پھر برف پگھلنے لگی۔ تمام درختوں سے پتے جھڑنے لگے۔
"پت جھڑ کا موسم بھی خوب ہوتا ہے" اس نے کہا۔
"ہاں۔ درخت بالکل پتوں سے خالی ہو جاتے ہیں"
نئے نئے تازہ پتے۔ پھر پھول نکلتے ہیں اور ہر طرف پھول ہی پھول ہو جاتے ہیں"

خوبصورت خوبصورت رنگین۔ بہت سارے پھول"

پت جھڑ کا موسم بھی گزر گیا اور بہار کی آمد شروع ہوئی۔

شانوں پر بال بکھیرے، عنابی رنگ کی میکسی پہنے وہ کیاری میں سے پھول چن رہی تھی۔ "ارے ارے پھول چرانا بری بات ہے" اس نے کہا۔

"مگر پھولوں کی چوری تو جائز ہوتی ہے"

"اچھا مگر تم ان کو توڑ کیوں لیتی ہو۔ کیا پودوں میں لگے اچھے نہیں لگتے"

"بہت اچھے لگتے ہیں بلکہ اتنے زیادہ اچھے لگتے ہیں کہ دل چاہتا ہے ان کو فوراً توڑ لوں"

"تم پھولوں سے اتنا پیار کرتی ہو۔ مگر لوگ تو کہتے ہیں کانٹوں سے محبت کرنی چاہیئے"

"کانٹے تو درد کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتے جبکہ پھول تو اتنی خوبصورت خوشبو دیتے ہیں اتنے خوبصورت رنگ دیتے ہیں۔ خوشبو اور رنگ کا اتنا حسین ملاپ کہیں اور دیکھا ہے تم نے"

"ہاں دیکھا ہے۔ وہ شرارت سے مسکرایا

"کہاں؟" اس نے پوچھا

"تمہیں دیکھا ہے" وہ شرما کر مسکرا دی۔

خوبانی کے درخت سے ننھے ننھے سفید پھول ان پر گرتے رہے اور وہ خوشبو اور رنگوں کے درمیان دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"سنو" اس نے کہا

"سناؤ" اس نے پوچھا

"تم میرے ساتھ چلوگی"؟

"کہاں؟"

"میرے شہر—!" وہ خاموش رہی

"تمہیں انکار ہے!" "نہیں تو!"

"تو تم تیار ہو" وہ خاموش رہی

"بولو نا!" اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ ہتھیلی پر کانٹوں سے اس کا نام لکھ رہی تھی۔ "اب تو مہندی سے لکھا جائے گا یہ نام۔ کانٹوں سے نہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ لان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کیاریوں میں کتنے پھول، کھلے تھے۔ وہ بکھر جانے کے لئے بے چین تھے۔ مگر انھیں توڑنے والا کوئی نہ تھا۔ "آخر وہ کیوں نہیں آئی۔ کہیں میرے سوال پر تو ناراض نہیں لیکن ایک نہ ایک دن تو لے جانا ہے۔ پھر ناراضگی کیسی میں اسے منالوں گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نقرئی ہنسی کی آواز فضا میں ابھری۔

"تم آگئیں" وہ خوش ہو گیا۔

"میں تو کب سے یہاں کھڑی تھی۔ تم نہ جانے کہاں گم تھے"

"ہاں۔ اب میں ان راہوں میں کھو گیا ہوں۔ حالانکہ مجھے گھر واپس بھی جانا ہے"

"کیا تمہارا جانا ضروری ہے" وہ اداس ہو گئی۔

"جانا تو ضروری ہے۔ مگر ہم سفر کو ساتھ لے جانا بھی ضروری ہے"

"اگر" اس نے اٹھ کر کہا "وہ نہ جا سکے تو!"

"یہ جو پھول تمہارے ہاتھ میں ہے نا۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے اس شاخ پر تھا مگر جب یہ تمہارے ہاتھ میں آیا مہک اٹھا ہے۔ اس مہکار کے لئے اسے شاخ کو چھوڑنا پڑا ہے۔ بس اسی طرح تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ منزل کو پانے کے لئے"

"مگر میرے ہاتھ میں آنے کے بعد اس کی زندگی کتنی مختصر ہو گئی ہے۔ منزل کو پانے کی آرزو کسی چیز کے حصول سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔

"مگر اب میں مزید آرزو نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے حصول کے لئے بے چین ہوں۔ کتنا حسین ہوگا ہمارا ملاپ"

"مگر شاید یہ ممکن نہ ہو!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"ہے"

"پھر کیا تمہیں میری محبت کا اعتبار نہیں؟"

"وہ بھی ہے"

"پھر جب اقرار بھی ہے اور اعتبار بھی۔ اور پھر اس انکار کی وجہ؟"

"اس سے پہلے کہ تم وجہ جان کر خود انکار کر دو۔ یہ خیال دل سے نکال دو!"

"یہ ناممکن ہے۔ میں تمہیں اپنے خیالوں اور اپنے دل میں بسا چکا ہوں"

"ضد نہ کرو۔ مان جاؤ!"

"جب میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو تم نے تھام لیا اور اب جب میں اسے ساری زندگی کے لئے تھامنا چاہتا ہوں تو تم ہاتھ چھڑا رہی ہو۔ کیوں؟"

"پھول اور کانٹے کی بھی دوستی ہوتی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں مگر ایک نہیں ہو سکتے۔"

"مگر ہماری دوستی پھول اور کانٹے کی نہیں۔ پھول اور خوشبو کی ہے جو ایک ساتھ رہتے ہیں۔"

"مگر جب پھول سوکھ جاتا ہے تو خوشبو اڑ جاتی ہے۔ اور اب ہماری دوستی بھی ایسے ہی موڑ پر آ گئی ہے جہاں سے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔"

"تم میرے احساسات کی توہین کر رہی ہو۔ اگر تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں تو کل میرے گھر آنا!"

خوبصورت کاٹیج کا گیٹ پھولوں کی جھکی جھکی ڈالیوں سے لدا ہوا تھا۔ وہ وہیں اس کی منتظر تھی۔ "تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"

"یہ آنسو تو میرا مقدر بن گئے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے۔"

"ایسا نہ کہو۔ میں ان ستارہ سی آنکھوں کے سارے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لوں گا۔"

"میں نے بہت چاہا کہ تم حقیقت نہ جان سکو۔ مگر تم باز نہ آئے۔ کاش تم نے مجھ سے اظہارِ الفت نہ کیا ہوتا اور میں نے اقرار نہ کر لیا ہوتا!"

"ہم اس اظہار اور اقرار کو پائدار بنائیں گے۔"

"نہ تم میرے آنسو سمیٹ سکتے ہو نہ اسے پائدار بنا سکتے ہو! آؤ میرے ساتھ!" اور پھر وہ پھولوں کی ڈالیوں سے گذرتی کانٹوں سے بچتی بچاتی اسے اپنے گھر لے آئی۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئیں۔ یہ تو سرونٹ کوارٹرز ہیں۔"

"ہاں۔ یہی میرا گھر ہے۔"

"مگر وہ خوبصورت بنگلہ اور وہ خوبصورت ڈرائنگ روم؟"

"وہ تو میرے مالک کا ہے۔ میرا بابا وہاں کام کرتا ہے۔ مالک تو بس گرمی میں آتا ہے۔ ورنہ تو وہ کام کے سلسلے میں شہر میں ہی رہتا ہے۔ تمہارے شہر میں۔ مگر مالک بہت اچھا ہے۔ مجھ سے تو وہ بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھے پڑھایا بھی ہے۔ وہ جاتا ہے تو اپنا پورا بنگلہ میرے بابا کے حوالے کر جاتا ہے اور ہم وہیں رہتے ہیں۔ اب بہار آ گئی ہے۔ وہ گرمیوں میں یہاں آ جائے گا۔ اس لئے ہم یہاں اپنے کوارٹر میں آ گئے ہیں۔"

"ہوں! تو یہ تھی تمہاری بات۔" وہ اٹھ کر جانے لگا۔

"مگر سنو تو! تم میرے مہمان ہو۔ کچھ خاطر!"

اس نے روکنا چاہا۔ مگر وہ جا چکا تھا۔

آنسو اس کی جھلملاتی آنکھوں سے رخسار پر بہتے رہے۔ مگر انھیں دامن میں سمیٹنے والا کوئی نہ آ سکا۔ اس لئے کہ وہ ایک "مالی" کی بیٹی تھی اور گل اس کا نام تھا۔

پھولوں کے درمیان کانٹوں کا مقدر لئے وہ یوں ہی مسکراتی رہی۔ لیکن وہ لوٹ کر نہ آیا۔

لطیفے مسکرانے کے لئے

• مرد اور عورت کی نفسیات میں فرق یہ ہے کہ مرد کی نفسیات پانچ منٹ پر بدلتی ہے اور عورت کی ہر منٹ میں پانچ بار

• بیوی سے اس کے شوہر نے پوچھا کیا تم نسرین کے شوہر کے چالیسویں میں آج نہ جاؤ گی۔

بیوی نے کہا۔ نہیں، مجھے شرم آئے گی۔ ان کے دو شوہروں کے چالیسویں میں جا چکی ہیں، وہ سوچیں گی کہ وہ تو میرے یہاں ایک بار بھی نہیں آئیں اور میں تیسری مرتبہ بھی جا پہنچی۔

• ایک لڑکی کی رخصتی ہو رہی تھی۔ اس کی عزیز عورتیں اور لڑکی رو رہی تھی۔

ایک معصوم بچی نے اپنی ماں سے پوچھا "امی دلہن کیوں رو رہی ہے۔ دولہا تو ہنس رہا ہے۔"

ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹی وہ بعد میں روئے گا۔"

• ایک امیر شخص نے اپنے وکیل کو فون کیا "آپ جلد آ جائیے میں نے غصے میں اپنے ایک نوکر کا خون کر دیا ہے۔"

وکیل نے کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو خود چشم دید گواہوں کے ساتھ پہنچ رہا ہوں۔"

مجھے تم سے پیار ہے

روبی جبیں

رحمان ولا میں آج غیر معمولی طور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جہاں ہر وقت گڑیا اور نیلم کی ہنسی کھنکتی رہتی۔ آج وہی گھر ویران ہو گیا تھا۔ پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا۔ رحمان صاحب فیملی کے ساتھ ایک شادی اٹینڈ کر کے واپس آ رہے تھے کہ ان کی کار سامنے آتی ہوئی ٹرک سے ٹکرا گئی اور جب ان کو ہوش آیا تو ان کی شریک حیات اُن سے بچھڑ چکی تھی۔ گڑیا جو صرف دس سال کی تھی اور جس کو ماں کی زیادہ ضرورت تھی۔ ماں کی ممتا سے محروم ہو گئی تھی۔ رحمان صاحب کو اب تنہا ہی اپنی دونوں بیٹیوں کی پرورش کرنی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ ڈاکٹروں نے نیلم کے پیروں کا آپریشن کرنے کو کہا تھا۔ آج نیلم کے جسم کا ایک حصہ اس سے جدا کیا جا رہا تھا۔ وہ جو کبھی کسی کا سہارا لینا گوارہ نہیں کرتی تھی۔ اسی خیال سے ہی خوف زدہ تھی کہ اب اس کو دوسروں کے سہارے کا محتاج ہونا پڑے گا۔ نیلم کو آپریشن تھیٹر لے جا رہا تھا۔ پورا ہاسپٹل نیلم کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ "ڈاکٹر خدا کے لیے میری ٹانگیں نہ کاٹیں۔ مجھے زہر دے دیجئے مگر مجھ کو کسی کا محتاج مت بنایئے لیکن ڈاکٹر بھی اپنے فرض سے مجبور تھے۔ ان کا کام تو جان بچانا ہے جان لینا نہیں۔

نیلم کا ان دنوں میڈیکل کا پہلا سال تھا۔ اور گڑیا میٹرک میں تھی۔ نیلم نے اپنی معذوری کی پروا کئے بغیر تعلیم جاری رکھی۔

باجی، باجی آپ کہاں ہیں؟

کیا بات ہے گڑیا سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔

باجی، میں، میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گئی ہوں گڑیا نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بتایا۔

سچ، اوہ خدا تیرا شکر ہے ویسے گڑیا سچی بات بتاؤ کہیں تم نے بھی تو کاروں وغیرہ نقل کرنے کے لئے استعمال نہیں کئے تھے۔۔ نیلم نے اس کو چھیڑا اور گڑیا سچ مچ ناراض ہو گئی۔

"باجی آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے نا۔"

ارے نہیں گڑیا میں تو مذاق کر رہی تھی" نیلم نے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھ کر کہا۔ اچھا اب یہ بتاؤ کیا ارادے ہیں؟

"میں نے سوچا ہے کہ یونی ورسٹی میں سائیکولوجی میں داخلہ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے، ویسے ابو سے بھی مشورہ کر لینا، تم نے ابو کو یہ خوشخبری سنائی بھی ہے۔ نیلم نے۔ اس کو یاد دلایا ورنہ گڑیا تو باتوں میں بھول ہی گئی تھی۔ رحمان صاحب کو یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر اس خوشی کے موقع پر وہ اپنی بیگم کو یاد کر کے دکھی ہو گئے۔

نیلم کا میڈیکل کا تیسرا سال تھا۔ کالج میں جو بھی اس سے ہمدردی کرتا اس کا دل چاہتا ان لوگوں کو منع کر دے کہ خدا کے لئے مجھ سے ہمدردی مت کیا کرو۔ ان تین سالوں میں نومی اس کے کافی قریب آ گیا تھا۔ وہ اس کا کلاس فیلو تھا اور بالکل اچھے دوستوں کی طرح اس سے ملتا تھا۔ لیکن نیلم نے محسوس کیا تھا کہ نومی کچھ دن نہ آئے تو وہ بہت اداس ہو جاتی ہے نجانے ایسا کیوں تھا۔

"ہیلو، آداب عرض، کیا حال ہیں بھئی" وہ لان میں بیٹھی تھی کہ نومی اچانک آ گیا

"ارے آج آپ کیسے آ گئے۔؟ مجھے تو امید نہیں تھی کیونکہ آپ جمعہ کو ذرا کم ہی آتے ہیں۔ نیلم اس کی غیر متوقع آمد سے حیران تھی۔

"آج تو میرا آنا بہت اہم تھا۔ نومی نے کہا۔

"تم کہیں اپنی یادداشت تو نہیں کھو بیٹھی ہو۔ آج آپ کی سالگرہ ہے اور محترمہ کو یاد ہی نہیں" نومی نے غصہ سے کہا۔

اوہ، واقعی مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ آج ۲۰ مارچ ہے نومی۔ تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ کبھی میں سوچتی ہوں اگر مجھے تم جیسا دوست نہ ملتا تو اب تک میں اپنی زندگی سے بیزار ہو چکی ہوتی۔

بس آیا اور کچھ کہنا ہے آج پتہ چلا کہ تم اچھے خاصے ڈائیلاگ بول لیتی ہو، اب کچھ پیٹ کی پوجا کرانے کا بھی ارادہ ہے یا نہیں۔ یا خالی باتوں سے پیٹ بھرنے کا ارادہ ہے۔ نومی نے اس کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

نیلم کو خیال آیا کہ واقعی اس نے اب تک خانساماں کو چائے کے لئے نہیں کہا اور وہ اٹھ کر آواز دینے ہی والی تھی کہ گڑیا ٹرالی مع لوازمات کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔

"شاباش گڑیا! مجھے آج پتہ چلا تم بڑے کام کی لڑکی ہو" نومی نے کہا۔

جب ہی میں سوچ رہی تھی آج یہ چاند کدھر سے نکلا ہے کہ گڑیا صبح سے کچن میں گھسی ہوئی ہے۔ اور مجھ کو بھی منع کر دیا تھا کہ کچن میں نہ آئیں" نیلم کو یاد آیا کہ آج جتنی بار وہ کچن کا رخ کرتی گڑیا اس کو باہر ہی سے واپس لے آتی تھی۔

"دراصل باجی میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی، گڑیا نے جواب دیا۔

"السلام علیکم بچو! میرے بغیر ہی چائے پینے کا ارادہ ہے کیا۔؟ ابو نے لان میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ابو ابھی میں آپ کو بلانے جا رہی تھی" گڑیا نے بتایا۔

ان سب کی کمپنی میں نیلم نے کیک کاٹا۔ ابو نے اس کو ایک خوبصورت گھڑی، گڑیا نے ٹیپ ریکارڈ اور نومی نے بہت ہی پیارا سا لاکٹ اس کو تحفہ میں دیا۔

نعمان کا تعلق دولت مند طبقہ سے تھا۔ اس کے والد عثمان علی نہایت سخت قسم کے آدمی تھے۔ نومی کی ایک بہن بھی تھی جو اپنی شادی کے بعد کویت میں مقیم ہو گئی تھی۔ بہن کی کمی نومی کو بہت محسوس ہوتی کیونکہ وہ اپنی ہر بات اپنی بہن حنا کو بتا دینے کا عادی تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر حنا پر پڑی اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی "آداب بجا لاتا ہوں باجی حضور" اس نے نہایت خوشی سے کہا۔

"کیا بات ہے آج بہت جلدی گھر آ گئے ہو" حنا نے پوچھا

"دراصل مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج میری بہت ہی پیاری سی بہن آنے والی ہیں۔ لیکن آپ بغیر اطلاع دیئے کیسے پہنچ گئیں۔؟

"آصف آ رہے تھے یہاں اپنے کام کے سلسلے میں تو میں نے سوچا کہ میں بھی آ جاؤں"

اچھا تو اپنے میاں جی کے ساتھ آئی ہیں۔ کبھی ان کے بغیر بھی رہ لیا کریں۔ نومی نے شرارت سے کہا۔

اس دفعہ تو میں تم کو ٹھکانے لگانے آئی ہوں۔ بہت تنگ کر رکھا ہے تم نے امی کو" حنا نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

ہیں! یہ آپ کو کیا ہو گیا کیا ابھی تو میرا یہ فائنل ایئر ہے۔ اس کو تو ختم ہو لینے دیں۔ نومی نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

حنا ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹے تمہارے امتحانوں میں ابھی دو تین مہینے ہیں۔ اتنے عرصہ میں ہم لوگ کوئی اچھی لڑکی تلاش کر لیں گے" امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اُفوہ، یہ تو سارا گھر میرے خلاف محاذ بنا کر بیٹھا ہے لیکن آپ.......؟

اچھا اب زیادہ بکواس مت کرو اور سیدھی طرح چلو کھانا لگ گیا ہے۔ حنا نے ڈانٹتے ہوئے کہا اور نومی کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

آج نیلم بہت خاموش خاموش تھی۔ لیکن نومی نے اس سے کالج میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور شام کو وہ اس کے گھر پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے نیلم آج تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟

ہاں نومی۔ اچھا ہوا تم آ گئے میں آج بہت اپ سیٹ ہوں۔

اب کچھ بتاؤ بھی آخر ہوا کیا ہے" نومی سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔

تم کو کچھ پتہ ہے گڑیا کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ اور ابو نے پہلے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور اب پھر ایک بہت ہی اچھا رشتہ آیا ہے۔ مگر ابو کہتے ہیں جب تک میری شادی نہیں ہوگی۔ وہ گڑیا کی شادی بھی نہیں کریں گے۔ نومی مجھے بتاؤ ابو اس حقیقت کو کیوں نہیں تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ ان کی بیٹی اپاہج ہے میں کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی پلیز نومی تم ابو کو سمجھاؤ۔ میری وجہ سے گڑیا کی زندگی نہ برباد کریں" نیلم کی آواز ہچکیوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور نومی سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

نیلم میں نے تم کو کئی بار سمجھایا ہے کہ کوئی خامی نہیں، تم اس قسم کی باتیں مت سوچا کرو۔ ویسے میں کوشش کروں گا انکل کو سمجھانے کی۔ لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ اب تم ایسی کوئی بات نہیں سوچو گی جس سے تم کو تکلیف پہنچے۔ ارے ہاں تم کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آج کل حنا باجی آئی ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ کل ملوانے لاؤں گا۔ اب

میں چلتا ہوں تم مطمئن ہوجاؤ میں انکل کو راضی کرلوں گا۔ ذوی چلا گیا تو اس نے سوچا کاش تم ابو کو راضی کرلو۔ تو یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ کاش تم میرے ہوسکتے ذوی مگر نہیں میں تم کو اپنی وجہ سے برباد نہیں کرنا چاہتی۔

اور پھر ابو راضی ہوگئے۔ مگر انھوں نے عامر کے گھر والوں سے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ اور عامر کے گھر والے راضی ہوگئے کیونکہ ان کو شادی کی اتنی جلدی نہیں تھی۔

کال بیل کی آواز پر وہ چونکی۔ ملازم نے آکر بتایا کہ ذوی صاحب آئے ہیں۔ وہ ان کو ڈرائینگ روم میں بٹھانے کا کہہ کر کپڑے بدلنے چلی آئی تو ذوی حیران رہ گیا۔ آج وہ ملٹین گلابی رنگ کے شلوار قمیض میں روز سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ حنا کو بھی نیلم بہت پسند آئی۔ اور جب وہ گھر واپس آئے تو ذوی سے مزید صبر نہ ہوا۔ باجی آپ کو میری دوست کیسی لگی۔؟

" ماشاءاللہ بہت پیاری لڑکی ہے مگر نجانے کیوں یہ سزا بھگت رہی ہے۔ کاش وہ معذور نہ ہوتی "

باجی پلیز آپ اس کو معذور نہ کہیں، وہ ہم سب سے زیادہ ذہین اور قابل لڑکی ہے۔ اور سب سے بڑی بات وہ مجھے پسند ہے۔ اور میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے " ذوی جانے کیا کیا کہہ گیا۔ اور پھر اس کو احساس ہوا کہ جس بات کو اتنے دنوں سے بتانا چاہ رہا تھا۔ آج بے خیالی میں اس کے منہ سے آخر نکل گئی۔

ذوی تم ہوش میں تو ہو۔ ابو کبھی بھی تم کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو۔ وہ کبھی یہ برداشت نہیں کریں گے کہ ان کی اکلوتی بہو اپاہج ہو " حنا اس کا فیصلہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

" آپ کو اگر میری خوشی منظور ہے تو آپ کو امی کو راضی کرنا ہوگا اور میں ابو کو راضی کرلوں گا "

" اچھا جیسے تمہاری مرضی، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں " حنا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور پھر آصف اور ذوی کی مستقل بحث اور حنا کی ضد سے امی تو راضی ہوگئیں مگر اب سارا مسئلہ عثمان صاحب کو راضی کرنے کا تھا۔ آج سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ عثمان صاحب ذوی سے مخاطب ہوئے۔

" ذوی یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم ایک اپاہج لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو "

" جی ابو آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے، وہ رجحان انکل کی بیٹی ہے اور میرے ساتھ فائنل ایئر میں پڑھتی ہے۔

" تم کو اگر کسی ڈاکٹر لڑکی سے شادی کرنی ہے تو بہت سی لڑکیاں ایسی ہیں جو ڈاکٹر ہیں ـــــ مگر تمہارے اپاہج لڑکی سے شادی کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے تم نے کبھی سوچا ہے کہ سماج میں لوگ تمہارا کتنا مذاق اڑائیں گے۔ مجھ کو کتنے طعنے ملیں گے کہ اتنے بڑے آدمی کی بہو اپاہج ہے " عثمان صاحب کا غصّہ بڑھتا جا رہا ہے "

" گستاخی معاف ابو! میں نے فیصلہ کرلیا ہے اس سے شادی کروں گا۔ اور جہاں تک آپ کو لوگوں کے مذاق اڑانے کا ڈر ہے تو میں آپ کو یہ بتادوں کہ لوگوں کے دل میں اس سے آپ کی عزّت اور بڑھ جائے گی ـــ اور اگر آپ کو اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی منظور نہیں تو آپ مجھے کل تک بتادیں میں یہ گھر چھوڑنے کے لئے تیار ہوں " ذوی یہ کہتا ہوا چلا گیا اور سب حیران رہ گئے تھے

آخر کار ابو راضی ہی ہو گئے ذوی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ۔ وہ نیلم پر بھی یہ انکشاف کردے کہ وہ اس کو پسند ہے۔ لیکن امتحان میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ اس لئے کچھ دن انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

آج وہ آخری پرچہ دے کر آئی تو ایسے سوئی کہ جب شام سات بجے گڑیا نے آکر جگا دیا تو اس کو خیال آیا کہ وہ بہت دیر سے سورہی ہے وہ منہ ہاتھ دھو کر ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کچھ گنگنا رہی تھی کہ ذوی کے آنے کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

" آداب عرض " ذوی نے کہا تو وہ چونک گئی۔

" ارے آپ کب آئے ؟ " نیلم نے حیرانی سے کہا

" جناب میں تو اتنی دیر سے کھڑا ہوں مگر آپ گنگنانے میں مگن تھیں اچھا یہ تو بتاؤ یہ کون ہے جس کے بغیر جینا مشکل ہوگیا ہے ؟ " ذوی نے پوچھا۔

" وہ، وہ، کوئی بھی نہیں میں تو ویسے ہی گا رہی تھی " نیلم نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو معاف کیا۔ تم کو یاد ہے آج مجھے تم کو ایک بات بتانی ہے"۔

جی ہاں مجھ کو یاد ہے آپ امتحانوں سے پہلے کچھ بتانے والے تھے۔ مگر آپ نے کہا تھا امتحانوں کے بعد بتائیں گے۔

"در اصل تم میری سب سے اچھی اور بہترین دوست ہو اس لئے میں یہ بات تم کو بتانا چاہتا ہوں"۔

"اچھا اب بتا بھی چکیں زیادہ الجھن نہ لگائیں"۔ نیلم نے بے صبری سے کہا۔

آج کل باجی اور امی کو میری شادی کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور وہ لڑکیاں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں"۔ نیلم کو اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

انھوں نے میری پسند بھی پوچھی تھی اور میں نے ان کو اپنی پسند بتا کر بڑی مشکلوں سے راضی کیا ہے۔ اب صرف تمہاری رائے کی ضرورت ہے۔ تم کو وہ لڑکی پسند ہے یا نہیں۔

آپ نام تو بتائیں اس کا۔ اور آپ نے اس کو مجھ سے اب تک ملوایا کیوں نہیں ہے۔ ویسے ظاہر ہے آپ کی پسند اچھی ہی ہوگی"۔ نیلم نے اپنی دھڑکنیں سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

ہاں اچھی تو ہے ہی بہت پیاری بھی ہے

اُفوہ، آپ کو بتانا ہے تو بتائیں ورنہ.. نیلم کو اب سچ مچ غصہ آ گیا۔

"اچھا بھئی ناراض مت ہو میں بتاتا ہوں۔ اس کو نیلم رحمان کہتے ہیں اور اس وقت میرے سامنے ہے"۔

نیلم حیران رہ گئی۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ جو چاہتی تھی کتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔

نہیں، نہیں نومی تم مذاق کر رہے ہو۔ اتنا مذاق سنگین نہیں کرنا چاہیے۔

میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اسی دن کے لئے تو میں نے انتظار کیا ہے۔ پلیز اپنا فیصلہ مجھے کل بتا دینا۔ میں تم پر زبردستی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم کو کوئی اور پسند ہو تو مجھے بتا دو"۔

تم کو ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے تھی۔ تم کو پتہ ہے میں اپاہج ہوں اور اپاہج سے لوگ ہمدردی تو کر سکتے ہیں مگر اس کو اپنے گھر کی زینت نہیں بنا سکتے ہیں۔ یہ تمہارا جذباتی فیصلہ ہے تم بعد میں پچھتاؤ گے۔

یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم مجھے کل تک اپنا فیصلہ بتا دینا۔ میں کل آؤں گا"۔

نومی چلا گیا۔ نیلم کو یہ سب خواب لگ رہا تھا جس چیز کی تمنا اس نے کی تھی وہ اتنی آسانی سے اس کو مل جائے گی۔ یہ کیا کہہ گئے ہو نومی، اگر میں یہ خوشیاں اپنے دامن میں بھر لوں یہ خود غرضی ہوگی۔ مجھ اپاہج کے ساتھ تم کیسے زندگی گزار سکتے ہو۔ لوگ تم کو اپاہج بیوی کا طعنہ دیں گے۔ نہیں نومی نہیں تم واپس جاؤ۔ تم کو مجھ سے بہتر لڑکیاں مل جائیں گی۔ اس کو اس وقت اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اور صبر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

باجی نومی بھائی کہاں گئے؟" گڑیا کمرے میں داخل ہوئی تو نیلم کو روتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

کیا ہو گیا باجی آپ کیوں رو رہی ہیں۔ نومی بھائی نے کچھ کہہ دیا ان کی تو عادت ہی مذاق کرنے کی ہے"۔

"کاش انھوں نے یہ بات مذاق ہی میں کہی ہوتی"۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اچھا چلیں ابو کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں۔

اوہو، ہاں چلو، اس کو بھوک تو بالکل نہیں تھی مگر ابو کے خیال سے جانا پڑا۔

ساری رات اس نے سوچ سوچ کر گزار دی۔ مگر وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہی تھی۔ دل کہتا تھا کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش پوری ہونے والی ہے انکار مت کرو مگر ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ یہ خود غرضی ہوگی۔

دالان میں بیٹھی تھی کہ نومی آ گیا "کیا بات ہے میرا انتظار ہو رہا ہے"۔

جی، جی نہیں تو۔ آپ بیٹھیں"۔ وہ اپنی چوری پکڑے جانے سے گھبرا گئی۔

"ہوں تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم رات بھر جاگتی رہی ہو یقیناً کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہوگی"۔

نیلم اپنے خیالوں میں گم تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

نیلم پلیز کچھ تو کہو، مجھ سے اب مزید صبر نہیں ہوگا۔

"نومی میں...." اس کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے

سکتے۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی، مجھے افسوس ہے" اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یونہی سہی، ورنہ میں تو بہت امید لے کر آیا تھا۔ نومی تیزی سے غصہ میں بھرا چلا گیا۔

نومی پلیز مجھ سے خفا ہو کر مت جاؤ تم کو اندازہ نہیں میں تم کو کتنا چاہتی ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں اداس لیٹی تھی گڑیا گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"باجی آپ نے کچھ سنا ہے"؟

"کیا ہوا گڑیا" وہ اس کو پریشان دیکھ کر گھبرا گئی

"باجی نومی بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا" نیلم نے غصہ میں کہا۔

باجی یہ صحیح ہے، ابھی حنا باجی کا فون آیا تھا انھوں نے بتایا کہ وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ گڑیا نے تفصیل بتائی۔

وہ لوگ جلدی سے ہاسپٹل کی طرف روانہ ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک سیکنڈ میں ہاسپٹل پہنچ جائے۔ نرس اس کو وہیل چیئر پر بٹھا کر نومی کے وارڈ میں لے جا رہی تھی تو اس کو خیال آیا کہ گڑیا کہیں چلی گئی ہے" نرس یہ گڑیا کہاں غائب ہوگئی ہے"؟ جی وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس کچھ پوچھنے گئی ہیں۔

نومی شاید سو رہا تھا یا بے ہوش تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نومی کے سر اور ہاتھ پر چوٹوں کی وجہ سے پٹی بندھی تھی۔ نیلم کو یہ سب اپنا تصور لگ رہا تھا۔ نیلم نے اس کی پیشانی کو چھوا، نومی۔ پلیز آنکھیں کھولو، اس نے دو تین مرتبہ آواز دی لیکن وہ بالکل خاموش پڑا تھا۔

"نومی یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ لیکن میں بھی تو مجبور ہوں — میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں اپاہج ہونے کا طعنہ دیں۔ ورنہ یہ تو میری اولین خواہش تھی تم تو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو اگر تم کو کچھ ہوگیا تو میں......

"ارے مجھے کچھ نہیں ہوتا" اس نے اچانک نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"مگر آپ تو بے ہوش تھے"!

"تمہاری باتیں سن کر ہوش میں آگیا" نومی نے اپنی پٹیاں کھولتے ہوئے کہا۔

آپ تو بالکل ہشاش بشاش لگ رہے ہیں۔ اور وہ سب تو کہہ رہے تھے کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے" نیلم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کیونکہ نومی کے ہاتھ یا سر کہیں پر بھی چوٹ کا نشان نہیں تھا۔

محترمہ وہ سب ڈرامہ تو آپ کو راہ راست پر لانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ویسے تم ابھی کیا کہہ رہی تھیں " نومی تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو" نومی نے اس کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

نیلم سے نظر تک نہیں ملائی جا رہی تھی وہ خاموش نظریں جھکائے بیٹھی تھی کہ گڑیا تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

" نومی بھائی اب نکالیں ہمارا انعام"

"اچھا بھئی اتنی جلدی کیا ہے۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا، فی الحال یہاں سے جاؤ بعد میں دے دوں گا نومی نے ڈانٹا۔

اب کام نکل گیا تو کیسے اکڑ رہے ہیں۔ پہلے کتنی منتیں کر رہے تھے۔ گڑیا نے ناراضگی سے کہا۔

"اچھا میری پیاری سالی! معاف کردو اور یہ لو اپنا انعام اور دفع ہو جاؤ" نومی نے اس کو ایک بہت ہی خوبصورت گھڑی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ" اور ہاں وہ ایک بات......

اب زیادہ پیر نہ پھیلاؤ اور سیدھی طرح باہر نکلو۔ عامر انتظار کر رہا ہوگا۔ گڑیا کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب آگیا۔

کیا مصیبت ہے تمہاری زبان کہاں غائب ہوگئی ہے۔ اس نے نیلم کو خاموش دیکھ کر کہا۔

اچھا اب بالکل سچ سچ بتاؤ تم مجھے کتنا چاہتی ہو" اس نے نیلم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔

جتنی آپ کو مجھ سے محبت ہے نا اس سے دگنی محبت مجھ کو آپ سے ہے۔

اچھا یہ بات ہے تو سنو اور نومی نے نہایت بھونڈے انداز سے گانا شروع کر دیا" مجھے تم سے پیار ہے ــــ"

اور نیلم نے شرما کر اپنا سر اس کے کاندھوں پر رکھ دیا آج وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی جیسے بہت لمبا سفر طے کر کے آئی ہو۔

لائٹ آف کردو

سحر انیس

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ

فرینڈز اینڈ فرینڈز کی اسٹینو ٹائپسٹ سینڈل کی ایڑی بجاتی ہوئی اسٹاف روم میں داخل ہوئی۔ جب اپنی سیٹ کی طرف بڑھی تو قریب جوار کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں اور گھٹی گھٹی آہوں سے اس کا استقبال کیا اور وہ ان کے بچکانہ خیالات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ دنیا میں صنف نازک کی حیثیت ایک خوبصورت کھیل ایک حسین تماشے سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا کہ بیچارے لوگوں کے سوچنے کا وہ انداز کیا ہوا جو عورت کو مریم اور سیتا کی صفوں میں لا کھڑا کرتا ہے۔

لیکن اچانک ہی اس لمحے سوچنے کا انداز بدل گیا۔

کیونکہ یہ کلرک تو بہرحال قابل رحم ہیں۔ یہ مفلوک الحال کلرک۔ یہ ننگے بھوکے کلرک۔ کبھی جنھوں نے خوبصورت عورتوں اور اچھے دنوں کے خواب دیکھے تھے آج اپنے مرجھائے ہوئے چہرے لئے اپنے تاریک مکانوں، بدصورت عورتوں گندے میلے بچوں سے دور اپنے اپنے آئیڈیل خواب، سپنوں اور آشاؤں کی لاش اپنے کندھوں پر بڑی بے دلی سے اٹھائے اس کی صرف ایک مسکراہٹ پر مرمٹنے کو تیار بیٹھے تھے....

ان بے چاروں میں حرص وہوس کا مادّہ دراصل ان کی وہ محرومیاں ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر انھیں دکھی، مضمحل اور پریشان کیا ہے اب اگر چند لمحوں کے لئے اس کی مسکراہٹ ان کو دکھوں سے دور لیجاتی ہے تو اس کا کیا بگڑتا ہے وہ ان کی خوشی کے لئے ایسی لاکھوں مسکراہٹیں ان پر نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ایسے ماحول میں تو فرشتے بھی شیطان بن جائیں یہ لوگ تو پھر انسان ہیں مٹی کے بت نہیں۔ ان کے پاس دل ہے۔ دھڑکن ہے۔ اور وہ جذبہ ہے جو زندگی کی علامت کہا جاتا ہے اور صرف اس بنا پر ان سے نفرت کرنا کہ وہ اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہیں کسی طرح بھی مناسب نہیں! کوئی کسی کے احساسات پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتا پھر وہ بھی تو ان ہی کے طبقہ کی فرد ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ ٹائپ رائٹر کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ اور وہ فرض کی دہلیز پر بیٹھی کاربن پیپر اور ٹائپ رائٹر کو ایک دوسرے سے الجھاتی رہی تب ہی بڑے سے سر پر بکھرے ہوئے بال لئے ایک کلرک اس کی میز کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"اوہ! جمال بابو"

وہ بہت دیر بعد چونکی۔ جیسے گہرے کنوئیں کے اندر سے بول رہی ہو۔

"ہاں مس نسیم میں ہی ہوں۔ سوچتا ہوں کہ آپ کو اپنے فرض سے بڑی محبت ہے۔ ورنہ اتنی سی تنخواہ اور فرض کی یہ تپتی ہوئی لمبی سڑک۔ کہاں تک چلیں گی آپ!

"جمال بابو۔ نروس نہ کیجیے تو۔"

مس نسیم! جیون کی دھوپ بہت کڑی ہے.......

سوچتا ہوں کہیں آپ کے چہرے کے پھول مرجھا نہ جائیں۔"

فرض کی سڑک پر چلنے والے ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے جمال بابو۔"

"آپ سے پہلے اس سیٹ پر بیٹھنے والی کئی لڑکیاں ٹی بی کا شکار ہو چکی ہیں۔"

"ٹی بی"

اس کے چہرے کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔

"ہاں۔ فرض۔ سوچ۔ جیون۔ دکھ۔ یہ سب ٹی بی کے جراثیم ہی تو ہیں مس نسیم"۔ وہ تلخی سے مسکرایا۔

نسیم یہ سب کچھ سن کر ایک دم سے سہم گئی۔

"یہ جمال بابو آج نجانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ جمال بابو اپنے بکھرے بالوں کو برابر کرتا ہوا دبلے پتلے جسم کو ناپتا تولتا ہوا اپنی سیٹ پر جا چکا تھا۔

اس نے سوچا۔ جمال بابو عجیب سرپھرا آدمی ہے زخموں پر مرہم رکھنے آتا ہے ان کو ناسور بناکر چلا جاتا ہے۔

دفعتاً منیجر کے کمرے کی گھنٹی زور سے بجی۔ دوسرے ہی لمحہ

چپراسی اس کے سامنے کھڑا تھا وہ ہاتھ میں چند ٹائپ کئے ہوئے کاغذات لے کر اندر کمرے میں داخل ہوگئی مینجر سرخ رنگ کی فائل سامنے رکھے کسی لارڈ کے سے انداز میں بیٹھا تھا ہونٹوں میں پلیرز نمبر تھری کا سگریٹ بڑے انداز سے دبا ہوا تھا اس کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں اور آنکھوں میں خاص قسم کی مخصوص چمک جو اس کے چہرے پر پڑی ہوئی چند لکیروں کو اور زیادہ پراسرار بنا رہی تھی۔

"آپ کے کام کی رفتار اطمینان بخش ہے مس نسیم"

اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ دی۔

"شکریہ!"

"آپ اتنی زیادہ خاموش کیوں رہتی ہیں۔"

"پتہ نہیں سر"

"آپ تنہائی پسند ہیں"

"شاید"

"سوشل ہونے کی کوشش کیجئے۔"

"مجھے زیادہ سوشل ہونا پسند نہیں"

وہ اپنے ناخنوں کو بغور دیکھتی ہوئی بولی۔

"میں تین مہینے میں بھی آپ کو سمجھ نہیں سکا۔"

"آپ میری ڈیوٹی کو سمجھئے جناب"

"آل رائٹ — ڈکٹیشن پلیز۔"

"آئی ایم ریڈی سر"

ایک گھنٹے تک مختلف کاروباری فرموں کے نام وہ ڈکٹیشن لیتی رہی اس وقفے میں مینجر دس سگریٹ پی گیا۔

اور وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ ان دس سگریٹوں نے ملک دس ہزار افراد کو متاثر کیا ہے۔

جب وہ ڈکٹیشن لے کر باہر آئی تو ایک بار پھر کئی شعلے اس کی طرف لپکے جیسے وہ ڈکٹیشن لینے نہ گئی ہو کسی طوائف کے کوٹھے پر جا بیٹھی ہو۔ اپنا طبقہ بھی کس قدر جاہل ہے سب کچھ جاننے کے [illegible]

لنچ کا وقت ہوا تو تمام لوگ لنچ لینے چلے گئے۔

وہ بھی اٹھی تو اس نے دیکھا کہ جمال بابو اپنی سیٹ پر بجھا بجھا سا بیٹھا ہے۔

اسے اس طرح دیکھ کر جانے کیوں اس کے احساس کا پردہ ایک دم تھرتھرا اٹھا۔

"جمال بابو۔"

وہ بہت ہی دھیرے سے بولی۔

"جی"

وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

"زندگی اتنی بری بھی نہیں"

"جس نے ایک دن خوابوں کے کھنڈر میں آشاؤں کے چند دیپ جلائے تھے آج میں انھیں آخری ہچکی لیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔"

"بیتے ہوئے دنوں کی یاد — آپ کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی جمال بابو"

"پیٹ کے بھر جانے سے جیون کا دکھ تو کم نہیں ہو جائے گا مس نسیم لوگ تو چائے اور سگریٹوں کے سہارے جی لیتے ہیں اور آپ لنچ کی بات کر رہی ہیں۔ ویسے بھی میں ایک ہی وقت کھانا کھاتا ہوں کیونکہ بھوکا آدمی زیادہ اچھی طرح سوچ سکتا ہے اور پیٹ بھر کر کھانے والے ڈرائنگ روم کے اندر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ باہر سڑکوں پر پیدل چل کر دھوپ اور گرد سے کھیلنا ان کے بس کی بات نہیں۔"

"چھوڑیے بھی جمال بابو۔ میں آج آپ کو اپنے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گی۔"

جمال بابو کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ آفس کے [illegible] ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا کھانے کے دوران جمال بابو زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ اور گرد کے لوگوں کو دیکھتا رہا جو اسے اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے واقعی خلائی جہاز چاند پر اتر گیا ہو۔ مس نسیم کھاتی رہی۔ باتیں کرتی رہی اور اسے کوفت ہوتی رہی ان لوگوں پر اس کا دل روتا رہا جو اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی غلط سمجھ رہے تھے۔

کھانا ختم کر کے وہ دونوں [illegible] چائے پی اور اس کے بعد وہ اپنی میز کی طرف [illegible]

اس نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھاتے ہوئے سوچا [illegible]

اس کی زندگی صرف ٹائپ رائٹر، کاربن پیپر، ربن اور ڈکٹیشن تک محدود ہو کر رہ گئی ہے حالانکہ باہر کی زندگی کتنی حسین تھی۔ اس کی سہیلیاں کتنی رومینٹک زندگی گزار رہی تھیں۔ چاند تاروں پھولوں اور بہاروں کی زندگی۔ امنگوں، آرزوؤں۔ خوابوں کا دلوں کی زندگی۔

لیکن وہ کتنی ڈراؤنی، بوجھل اور خشک زندگی گزار رہی تھی۔ جیسے زندگی نہ ہو سندھ کا تپتا ہوا ریگستان ہو۔

بس میں کھڑے کھڑے آفس آنا، پورے آٹھ گھنٹے گزارنے کے بعد پھر بس میں کھڑے کھڑے واپس جانا۔ بھلا زندگی میں کیا کوئی نئی اور خوشگوار تبدیلی لا سکتا ہے۔ پھر گھر پہنچ کر بھی چین کہاں نصیب ہوتا باورچی خانہ سے لے کر چھوٹی بہنوں تک کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی اسے ہی سونپ دی گئی تھی۔ والد صاحب تو کینسر کے پرانے مریض تھے لہٰذا ان سے کچھ کرانے کی توقع رکھنا ایسا ہی تھا جیسے بغیر تیل کے دیپ جلنے کی امید رکھنا کسی بھائی کی تمنا ہوش سنبھالنے سے اب تک تمنا ہی بنی ہوئی تھی۔ ایک تعلیم یافتہ بڑی بہن تھی اس کی شادی کی ذمہ داری بھی اس کے سر تھی اور چھوٹی بہنیں وہ بھی تو کچھ عرصہ پہلے تک اپنی تعداد اسی طرح بڑھاتی رہی تھیں جیسے اپنے ملک کی آبادی گویا کہ گھر کے تمام افراد فرض بن کر اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور وہ اسے ہر لمحے، ہر پل پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی۔

آفس سے پارٹ ٹائم اور اوور ٹائم مل ملا کر کوئی ساڑھے تین سو مل جاتے تھے۔ گزر بسر کی واحد صورت یہی قلیل رقم تھی وہ تو خدا بھلا کرے ایک چھوٹا سا آبائی مکان تھا ورنہ مکان کے کرائے پر بھی ایک سو ڈیڑھ سو روپئے اٹھ جاتے گویا کہ زندگی کیا تھی ہیروشیما کا المیہ تھی جو جلد ہی کسی نئے اور خوشگوار انقلاب کی تمنائی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی اور گھر والوں کی زندگی پر غور کرتی تو یوں لگتا جیسے وہ قرۃ العین کا کوئی نہایت ہی روکھا پھیکا بوجھل اور خشک سا افسانہ پڑھ رہی ہو۔ چند منٹ اسی کرب ناک سوچ میں گزر گئے۔ پھر گھر گھراہٹ کے آغاز کے ساتھ ہی کام کا بھی آغاز ہوا اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف کام کرنے کے [illegible] ایک [illegible] کی طرف دیکھا وہ اسی حالت میں ایسے ہی [illegible] جیسے [illegible] کے [illegible]

اسی طرح دیکھتے سنتے کام کرتے شام ہو گئی۔ لوگ باگ دفتر چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگے اور پھر چند ہی لمحوں بعد مس نسیم کو وہ یوں لگا جیسے جیلر نے بہت سارے قیدیوں کی ایک ساتھ چھٹی کر دی ہو تھکے تھکے سے گھائل زخمی لوگ اپنی آرزوؤں کی لاش کاندھے پر اٹھائے کس بے ترتیبی کے ساتھ نیچے اتر رہے تھے اس نے جمال بابو کی طرف دیکھا اسے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

خوابوں کی چتا تو اسی طرح جلا کرتی ہے مس نسیم۔

وہ گھبرا کر ایک دم کئی زینے نیچے اتر گئی۔ بس اسٹاپ پر بڑی ریل پیل تھی قسم قسم بھانت بھانت کے لوگ اونٹ کی طرح منہ اٹھائے اپنے اپنے روٹ کی بسوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس طرح جھنجھلاتے بل کھاتے جیسے اب کے اگر بس آئی اور اس نے انھیں نہ بٹھایا تو وہ دھڑا دھڑ بس میں آگ لگا دیں گے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا بھری ہوئی بسیں آتیں دھواں اڑاتی شور مچاتی گزر جاتیں اور لوگ پہلے کی طرح ہونٹ کاٹ کر پیچ و تاب کر رہ جاتے۔

اس روٹ کی کئی بسیں آئیں۔ مخصوص آواز پیدا کرتی ہوئی گزر گئیں لوگ زیادہ تھے جگہ کم تھی۔

بالکل ایسے ہی جیسے دل چھوٹا سا ہے دکھ زیادہ ہیں۔

وہ کم و بیش آدھ گھنٹے اسٹاپ پر کھڑی رہی۔ لیکن جگہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔ آخر کار جھنجھلاہٹ میں اس نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔

کئی چوراہے کئی کراسنگ آئے

وہ پیدل چلتے چلتے رک گئی۔

ایک جگہ کھڑی ہو کر جلتی بجھتی روشنیاں دیکھنے لگی دفعتاً ٹھیک اس کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر فٹ پاتھ کے ساتھ ایک سفید رنگ کی کار دلہن رکی اور اس کے اندر سے نکلنے والا شخص کم از کم اس کے لئے تو اجنبی نہ تھا وہ اس کی فرم کا منیجر تھا اس نے کار سے نکلتے ہی سگریٹ سلگائی اور پھر تیزی سے دکان کے اندر جانے لگا جس کے سامنے وہ کھڑی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھ کر اس نے سگریٹ پینے کے ڈرامائی انداز کو محسوس کرنے لگی اور پھر منیجر کی نظر ایک دم اس پر پڑ گئی۔

[illegible] مس نسیم

[illegible] وہ مسکرایا۔

"آج گھر جانے کے بجائے اس طرف کیسے؟"
"سوشل بننے کی کوشش کر رہی تھی"
"بس نہیں ملی شاید" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"ہاں"

"تو پھر آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں"
"نہیں۔ آپ کو زحمت ہوگی" وہ کسی قدر جھجکی۔
"زندگی باہمی تعاون کا نام ہے مس نسیم"
"ہمارے ماحول میں اس قسم کے تعاون کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"اوہ! آپ لوگ ابھی تک غیر ترقی یافتہ طبقے سے وابستہ ہیں۔"

وہ چالیس سالہ مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔
"آپ جو سمجھیں۔ ویسے میں پیدل ہی جاؤں گی"
"یہ برنس روڈ ہے اور یہاں سے پیر کالونی یقیناً کافی دور ہے آیئے ضد نہ کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کافی خود دار ہیں۔"

وہ کار میں بیٹھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔
وہ بڑی مشکلوں سے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتی ہوئی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی وہ سگریٹ ہونٹوں میں دبائے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ ادھر ادھر کی۔ دنیا جہان کی الٹی سیدھی ہانکتا رہا وہ زیادہ تر خاموش رہی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کار پیر کالونی کے بس اسٹاپ کے قریب رک گئی۔

"شکریہ"

وہ نیچے اترتی ہوئی بولی۔
"شکریہ تو میں جب قبول کروں گا جب تم اپنے ہاتھ کی چائے پلاؤ گی" وہ بے تکلفی پر اتر آیا۔

"چائے" اس کی آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی اور چہرے کا رنگ ایک دم اڑ گیا۔ بہرحال اس کے گھر والوں کو یہ بات کسی طرح بھی پسند نہیں آئی کہ وہ کسی غیر آدمی کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائے۔

سروس اسے مجبور کر رہی تھی اور مجبوری تو خودکشی بھی کروا دیتی ہے۔ وہ اس کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا بات پھر کسی اور دن پر ٹال کر کار میں بیٹھ گیا اور کار جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کی جان میں جان آئی اور اس بلا کے ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

گھر میں چھوٹی بہنوں نے اسے خوش خبری سنائی کہ باجی کی بات طے پا گئی ہے۔

اور اس کی ساری تھکن ایک دم سے دور ہوگئی۔ وہ دیر تک باجی کو چھیڑتی رہی اور جب سب لوگ سو گئے تو وہ بھی ابھی آنے والی حسین ساعت کے خیال کو گلے سے لگا کر سو گئی۔

☆

دوسرے دن آفس میں جمال بابو پھر کھویا کھویا سا تھا۔
اس نے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولا۔
"میں اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں مس نسیم"
"تو کیا آپ نے اپنے آپ کو کہیں گم کر دیا ہے جمال بابو"
"نہیں مس نسیم! میں تو اپنے آپ کو آج تک پا ہی نہیں سکا ہوں تو خود اپنے لئے اجنبی ہوں۔ سوچتا ہوں خود کو کہاں کہاں تلاش کرتا پھروں۔ کیوں کہ آفس! گھر اور بس اسٹاپ تک تو میں اپنے آپ کو پا نہیں سکا — اب ایک جگہ رہ گئی ہے جہاں میں اپنے آپ کو پانے کی کچھ امید رکھتا ہوں۔"
"کون سی جگہ جمال بابو" وہ دھیرے سے بولی۔
"قبر"
"قبر" وہ ایک دم چلائی۔
"ہاں مس نسیم! کچھ لوگ مرنے کے بعد خود کو پاتے ہیں۔ شاید میں ان ہی لوگوں میں سے ہوں۔"
"زندگی سے اس قدر مایوس کیوں ہیں آپ؟"
"اس لئے کہ اپنے اطراف کا ہر فرد تھکا تھکا سا لگتا ہے مجھ سے نجانے کیوں ان کا دکھ نہیں دیکھا جا سکتا"

وہ کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے میز کا کونا کریدنے لگی۔ کئی لمحے گزر گئے جب سر اٹھایا تو جمال بابو اپنی میز کی فائلوں پر جھکا شاید خود کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کئی دن اسی طرح جمال بابو سے قریب ہوتے اس کو کچھ

پڑھنے اور پکنے میں گزر گئے۔

ایک دن آفس آتے ہوئے بس اسٹاپ پر جمال بابو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ بولی۔

"جمال بابو۔ آپ نے کسی کو چاہا ہے ؟"

"دنیا میں کوئی شے چاہنے والی ہے بھی۔ مس نسیم:"

"کیوں نہیں۔ یہ چاند ستارے۔ پھول، غنچے اور افق کے اس پار آرزوؤں کا جو دیس ہے۔ سپنوں کا جو شہر ہے۔ دھڑکنوں کا جو ساز ہے اپنے شہر کی جو روشنیاں ہیں۔ گھر والوں کی جو معصوم خوشیاں ہیں وہ سب تو پیار کرنے اور چاہنے ہی کے لئے ہیں نا جمال بابو:"

"میں تو صرف مشین ہوں مس نسیم، اور مشین صرف اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ پیار نہیں کرتی۔ پیار کرتی تو ملک کے اتنے سارے انسان بیکار کیسے رہتے مس نسیم:"

"پھر وہی فلسفیانہ گفتگو:"

"میں اپنی عادت سے مجبور ہوں:" وہ آہستہ سے بولا۔

"ایک بات اور کہوں جمال بابو:"

"کہیئے۔"

"آپ برا تو نہیں مان جائیں گے۔"

"میں کسی بات کا برا نہیں مانتا ہوں:"

"اگر کوئی آپ کو چپکے چپکے دھیرے دھیرے چاہنے لگے تو:"

"تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنی آگ میں چپ چاپ جل جائے۔ کیونکہ محبت نام ہے جل جانے کا۔ اب چاہے شمع جلے یا پروانہ بات ایک ہی ہے۔ اور ویسے بھی میرے اوپر بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں۔ پانچ بہنوں کی ذمہ داریاں پھر بھلا میں کیسے چاندنی راتوں کے حسن کو محسوس کر سکتا ہوں:"

تو جمال بابو بھی اس کے ساتھ ذمہ داریوں کی آگ میں جل رہا ہے۔ اس نے بڑی بے چارگی سے جمال بابو کی آنکھوں میں جھانکا جمال بابو بڑی تلخی سے مسکرا دیا اور اس کے ساتھ ہی آفس کے بڑے ہال میں داخل ہو گیا۔

اس شام سے پھر بس نہیں ملی اور وہ اسے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر پیدل ہی چلنے لگی تھوڑی دور چلنے کے بعد پھر ایک کار اس کے سامنے رکی۔ گوری گوری۔ اجلی اجلی سفید سفید سی کار

اور اس کے دل کی دھڑکن ایک دم سے تیز ہو گئی۔

منیجر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ "آئیے" وہ دروازہ کھولتا ہوا بولا۔

اور وہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی کار میں بیٹھ گئی کار قائد اعظم روڈ سے ہوتی ہوئی سوسائٹی کے ایک شاندار بنگلے کے سامنے ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

"یہ آپ مجھے کہاں لے آئے" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی

"میری کالونی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میرا گھر دیکھ لو پھر چلی جانا:" اس نے بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور وہ اس کی تقلید کرتی ہوئی بنگلے میں داخل ہو گئی۔ بنگلہ اچھا خاصا تھا وہ اسے ڈرائینگ روم میں لیتا چلا گیا۔

ڈرائینگ روم بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا اسے دیکھنے کے بعد منیجر کے ستھرے ذوق کا پتہ چلتا تھا وہ اسے بٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔

اور وہ چائے بنانے لگا۔

"مس نسیم! مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ دراصل مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"اگر آپ پیدل جاتیں تو ــــ" اس نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتی رہی۔

"مس نسیم بات یہ ہے کہ تم مجھے پسند آگئی ہو۔ اور میں اپنی پسند کی چیز ہر قیمت پر حاصل کر لیتا ہوں:"

"مطلب ؟"

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

"میں شادی وادی کا تو قائل نہیں ہاں اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں اچھے داموں خرید سکتا ہوں۔ چیک بک تمہارے سامنے ہے ــــ"

مسٹر منیجر! ابھی وہ چیک بک تیار نہیں ہوئی جس کے ذریعے عورت کا تقدس خریدا جا سکے۔ تم بات کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ عورت سیتا بھی ہے۔ عورت مریم بھی ہے:"

"مس نسیم!" وہ آہستہ سے بولا،

"تمہاری یہ سوسائٹی بظاہر جتنی حسین ہے اندر سے اتنی ہی گھناؤنی اور کریہہ المنظر ہے کاش شیب یہ معلوم ہوتا کہ عورت خود کبھی نہیں بکتی اس کی مجبوری بکتی ہے۔"

"میں وہی مجبوری خریدنا چاہتا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم گھر بلا کر اس طرح میرے احساسات زخمی کرو گے۔" وہ اٹھی اور بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح لپک کر کمرے سے نکل گئی۔

اور منیجر صرف سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہ گیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ باجی کی شادی جہاں سے چلی تھی وہیں ٹھہر گئی ہے لڑکے والوں نے جہیز زیورات کے علاوہ پانچ ہزار نقد کا مطالبہ بھی کر دیا تھا گھر کی فضا بڑی اداس اداس سی ہو کر رہ گئی تھی۔

تمام لوگ چھوٹی بہنوں سمیت پریشان پریشان سے دکھائی دے رہے تھے اسے گھر ایسا لگا جیسے کوئی قبرستان ہو کھانا میز پر پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا کسی کے منہ میں ایک نوالہ بھی اڑ کر نہ پڑی تھی۔ رات اپنے ساتھ محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان لے کر آ گئی تھی وہ سوچنے لگی کہ باجی بھی کتنی بدقسمت ہیں۔

ان کی عمر کی تمام لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں مگر ان پر تو جیسے اللہ میاں نے خوشیوں کے سارے دروازے بند کر دیئے تھے کئی بار مسرت نے دستک دی مگر گھر پر افلاس کی حکمرانی دیکھ کر ٹل گئی

اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کاش باجی بہت بڑے گھرانے میں پیدا ہوتیں۔ مگر باجی کو شاید اسی لئے ٹھکرایا جا رہا تھا کہ ان کے والدین مفلس تھے۔

ہائے رے سماج اور اس کی بنائی ہوئی رسمیں۔

رات اکیلی تھی۔

وہ بھی اکیلی تھی۔

دونوں جاگ رہی تھیں۔ لیے اپنے دکھوں کو [illegible] ہوئے [illegible] ایک دم [illegible] کی سسکیوں نے [illegible] دیا۔ وہ ایک دم اٹھی۔ باجی رو رہی تھیں جیسے [illegible] کے کنارے وہ ان کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"باجی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

باجی ایک دم چپ ہو گئیں۔ "کیا بات ہے نسیم؟"

"شبنم تو ہمیشہ روتی رہتی ہے باجی کبھی کبھی تو اسے ہنسنا بھی چاہیئے۔"

"نہیں نسیم۔ ایک ناول پڑھا تھا اس کا دکھی ماحول یاد آ گیا تھا۔"

"باجی آپ مجھ سے نہ چھپائیں۔"

"تم سے چھپا کر کیا کروں گی۔" وہ ایک دم باجی سے لپٹ گئیں اور رات اپنی بھیگی ہوئی پلکیں لئے گزر گئی۔

دوسرے دن دل پر بوجھ لئے وہ دفتر پہنچی جمال بابو اس کی میز کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے جمال بابو؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ کس دنیا میں ہیں آج کل؟"

وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "چاند کی دنیا میں۔"

وہ تلخی سے مسکرا دی۔

"چاند پر جا کر کیا کیجئے گا۔ پہلے اپنی دنیا کی فکر کیجئے۔"

"فکر کرنے سے دل کا بوجھ تو ہلکا نہیں ہوگا جمال بابو۔"

"ماحول پر انگارے نہ برسائیں ہم لوگ تو پہلے ہی جیون کی آگ سے جھلس رہے ہیں۔" وہ کچھ نہ بولی۔ جمال بابو اس کو خاموش دیکھ اپنی میز کی طرف چلا گیا

کئی دن بیت گئے۔ دکھ درد کی آگ میں جلتے سلگتے گزر گئے باجی کی بات آج تک آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ پرسوں لڑکے والوں نے صاف صاف جواب دیا تھا...

وہ رات معمول سے زیادہ سرد تھی۔ تیز ہوا کی یورش اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ فضا میں عجب دکھی دکھی سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ منیجر سوتے سوتے ایک دم چونک پڑا۔ کسی کے جسم کی مانوس خوشبو اسے اپنی روح میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ زیرو پاور کے نیلے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا وہ لڑکی اسی کے سرہانے کھڑی تھی ___ وہ اسے بڑی عجیب سی لگی۔

"میں اپنے آپ کو بیچنے آئی ہوں مسٹر منیجر۔" وہ ہارے ہوئے جواری کی

طرح بولی۔

"سیتا نے تو کبھی اپنے آپ کو نہیں بیچا نسیم" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔"

اس لئے کہ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے میں اپنی بہن کے لئے اپنے کو فروخت کرنے آئی ہوں۔ اس کی شادی نہ ہو سکے گی۔ آج کے مرد عورت کی عزت لوٹنا یا خریدنا نہیں چاہتے وہ اس سے دولت بھی لینا چاہتے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم منیجر کہ آج کتنی ہی شریف لڑکیاں گھروں میں بیٹھی بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں صرف اس لئے کہ ان کے پاس روپیہ نہیں ہے کہ وہ منھ مانگے دام دے کر ان کو اپنا شوہر بنا سکیں ان کے گھر بسا سکیں۔ انھیں زندگی کی مسرتوں سے دو چار کر سکیں۔ سب ہی کے پاس آپ کی طرح اتھاہ دولت نہیں ہے کہ اس سے عصمتیں خریدتے رہیں ایسے بھی مرد ہیں جو اس طرح عورتوں کو حاصل کرنا پسند نہیں کرتے۔ یا کر نہیں سکتے۔ لیکن عورت کی ضرورت انھیں بھی ہوتی ہے وہ عورتوں کو خریدتے نہیں۔ عورتوں کے ہاتھوں بکنے کی کوشش کرتے ہیں معاف کیجئے گا بے شرم اور بے غیرت آپ کی قسم کے مرد بھی ہیں اور اس دوسری قسم کے بھی۔ خیر۔ چھوڑیئے ان باتوں سے کیا حاصل لائٹ آف کر دیجئے روشنی میں لٹنا میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوگا۔"

"نہیں مس نسیم لائٹ آف نہ ہوگی۔ تمھیں کتنے روپے درکار ہیں۔ کتنی رقم مل جائے تو تم اپنی بہن کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤگی۔"

"پانچ ہزار۔ صرف پانچ ہزار۔" مس نسیم نے اپنے تھرتھراتے ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

منیجر اٹھا۔ اس نے سیف کھولا۔ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے رکھ دی اور بولا۔ "انھیں شمار کر لیجئے!"

"پورے ہی ہوں گے۔" مس نسیم نے کہا۔ "بہت بہت شکریہ منیجر صاحب۔ اب مجھے اپنی عزت کا سودا کرنے کی تکلیف نہ ہوگی، اس لئے کہ اس طرح میری بہن کو ایسا نہ کرنا پڑے گا ورنہ شاید کسی روز اسے بھی اسی طرح اپنی عصمت فروخت کرنا پڑتی۔"

"نہیں مس نسیم۔" منیجر نے بڑے پرتاثر لہجے میں کہا۔ "اب تمھیں بھی [illegible] کرنا پڑے گا۔ یہ رقم میری جانب سے [illegible] قبول کرو چونکہ دل میں تمھارے لئے ایسی جگہ بن گئی ہے کہ اگر تم پسند کرو گی تو میں تم سے شادی کر لوں گا۔ تم جانتی ہو کہ میری شادی نہیں ہوئی۔"

بیوی بہتر یا کنیز

زبیدہ خاتون صدیقی

پہلے زمانے میں یہ کہاوت تھی کہ ہاتھی پالنا آسان ہے لیکن بیوی کا خرچ برداشت کرنا مشکل ہے۔۔۔ مگر اب بیسویں صدی میں یہ کہاوت الٹی ہو گئی۔۔۔ اب تو نوکرانی کے مقابلہ میں بیوی کا خرچ یوں سمجھئے کچھ بھی نہیں اس لئے کہ اب تو پچاس روپیہ سے لے کر ڈیڑھ سو روپے ماہوار تک نوکرانی ملتی ہے کھانا کپڑا مزید۔ اس کے بعد بھی دل کو یہ خدشے گھیرے رہتے ہیں۔ کہیں چور نہ ہو جو دوسرے ہی دن گھر صاف کر دے۔ یا پھر لگائی بجھائی نہ کرتی ہو۔ چال چلن کی خراب نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ مگر بیوی کے لئے اس قسم کی کسی فکر کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ اگر کسی صاحب کی پہلی دوسری۔ تیسری اور پھر بدقسمتی سے چوتھی بیوی بھی داغ مفارقت دے جائے تو انھیں چاہیئے کہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے نوکرانی نہیں بلکہ پھر بیوی ہی کی فکر کریں۔ اول تو نوکرانی کا جلد ملنا ہی مشکل ہے اور پھر اس کے نخرے۔۔۔ اللہ تیری پناہ۔۔۔۔ ماہ بماہ تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ۔ کھانا تیج تہوار بخشش۔۔۔ سال میں دو جوڑے کپڑے۔ اور پھر اتنے خرچ کے باوجود وہ نوکرانی ہی رہے گی جسے آپ کے گھر سے کوئی ہمدردی نہ ہوگی۔ پھر یہ کھٹک کہ نہ جانے کب تنخواہ لے کر کسی اور کے گھر چلی جائے۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ تھوڑے شیرینی چھوہارے کا انتظام کریں۔ ایک جوڑا کپڑا بنوائیں۔ اور کوئی اللہ کی بندی، قسمت کی ماری کسی کی ماں، اتنی بھاوج یا بیٹی ہو تو اس سے نکاح پڑھوا کر خوش خوش گھر لے آئیں۔ چلئے بیوی بھی مل گئی اور کنیز بھی۔ جو شوہر نامدار ذرا بھی سمجھدار ہیں وہ بیوی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ سب گھر بار، مال دولت، کاٹ کباڑ سب تمہارا اور ہم بھی تمہارے [illegible] ہوئی۔ مجال ہے جو کبھی بیچ تک کسی تکلیف پر اف کرے وہ [illegible] اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتی ہے [illegible] آج کے زمانے میں ملازمہ رکھنے سے بہتر ہے کہ بیوی لے آئے۔

خون کے دباؤ پر اقتدار

بلڈ پریشر ہمارے زمانے کی ایک عام اور مہلک بیماری ہے، مگر یہ بات نہیں کہ ہم بلڈ پریشر پر قابو نہ پا سکیں. طبی تحقیقات

سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ بے چینی، خوف اور بہت زیادہ کام کرنے کی بنا پر جسمانی خلیوں کو مضرت پہنچ سکتی ہے۔ دماغ اور جسم کو الگ الگ کرنے کی کوشش اس دور میں کامیاب نہیں ہو سکتی، جسم اور دماغ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ دماغ کی تھکن اور ماندگی سے جسم اور جسمانی تھکن سے دماغ لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ جذباتی تصادم کا بھی جسمانی افعال اور سرگرمیوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جذباتی ہیجان دوران خون میں داخل ہو جاتا ہے تو [illegible] سے اس کا نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس صورت میں آدمی شدید قسم کے بلڈ پریشر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اکثر امراض میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن کا شمار مہذب انسانوں میں ہوتا ہے اور جو اس بات سے [illegible] کہ ان سے بچنے کے بہتر طریقے جانتے ہیں۔

بلڈ پریشر بھی تہذیب ہی کی دین ہے۔ وحشی اور جنگلی آدمیوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ انھیں زندگی کے کسی دور میں اس قسم کی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور وہ ایک بالکل نارمل زندگی گزارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے طرز بود و باش پر تہذیب جدید کی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔ ان کی جسمانی اور ذہنی طاقتیں کسی غیر ضروری چیز یا مقصد کے لئے ضائع نہیں ہوتیں، وہ خوش اور مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں اور مہذب آدمی کے ہاتھ سے خوشی اور اطمینان کی دولت چھن گئی ہے۔ یہی اس کی وجہ ہے کہ وہ بیماریوں کا شکار ہو گیا ہے۔ بلڈ پریشر بھی انھیں بیماریوں میں [illegible] [illegible] اور جو بات [illegible] آپ کے ذہنی دماغی اور [illegible] کی صحت پر غالب [illegible] آپ کو ان تاثرات سے محفوظ رکھنے [illegible] [illegible] اگر یہ بات آسانی [illegible] آدمی [illegible]

کوششوں میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ کبھی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ ہمارے بس کا نہیں اور ہم اپنے مسائل کو حل نہیں کر سکتے، حالانکہ بیشتر مسائل ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کو جس خوبی اور کامیابی سے ہم حل کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

آپ اگر اپنے دماغ کو تمام معاملات میں پرسکون بنا لیں تو آپ کی روزمرہ کی زندگی کی خارجی لڑائی آپ کے دماغ کو خراب اور پریشان نہیں کر سکتی۔ ہر مسئلے پر آپ کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہیئے، کسی ناگوار بات پر برہم اور کبیدہ نہیں ہونا چاہیئے، نہ گھبرا کر کسی معاملے پر غور کرنا چاہیئے۔

اکثر لوگ وقت پر کھانا یا چائے وغیرہ نہ ملنے اور گاڑی چھوٹ جانے ہی سے گھبرا کر اپنا جذباتی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کی معمولی باتوں سے جذبات میں برہمی کی جو لہریں پیدا ہوتی ہیں، وہی بلڈ پریشر کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی ناگوار کیفیات سے بچنے کا دانشمندانہ طریقہ یہ ہے کہ ذہن کو پریشان اور متفکر نہ ہونے دیا جائے۔ یہ سوچنا کہ ہم تفکرات سے کیوں نجات حاصل کریں، در اصل ایک احساس شکست خوردگی کا نتیجہ ہے۔ لندن کے نامور سرجن جیمز ہارپول نے اپنی ایک کتاب "سرجن کا ورثہ" میں ایک ایسے سرجن کا واقعہ بیان کیا ہے، جو ہمیشہ فکرمند رہتا تھا اور زخم معدہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دو تین بار شدید بیمار پڑنے کے بعد اس نے طے کر لیا کہ آئندہ کسی قسم کی فکر نہ کروں گا اور اپنے دماغ کو یہ موقع ہی نہیں دوں گا، وہ میرا پیٹ خراب کر سکے۔ سرجن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو ہر طرح پرسکون رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے افکار کا علاج آپ ہی کر سکتا ہے۔ جسم کو آرام پہنچانا صحیح نقطۂ نظر سے آپ کا پہلا اور خوشگوار فریضہ ہے۔ جب آدمی آرام کرتا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ [illegible] کم ہونے لگتا ہے۔ دماغ بھی آرام کرتا [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] آرام کرنے کے ارادے میں [illegible] کی ضرورت ہے۔ اگر یہ [illegible] حاصل نہیں ہے تو آرام کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو جائے گی۔ در اصل آرام کرنا [illegible] یہ ارادہ کر لینا کہ ہم کوئی بات نہیں

سوچیں گے اور اتنی دیر تک کسی قسم کا کام نہیں کریں گے۔ یہی ارادہ آرام حاصل کرنے اور تفکرات سے نجات پانے کے لئے کافی ہے۔ آرام کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بستر پر دراز ہو جائے۔ حقیقی آرام جسم کی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں تمام عضلات اور اعصاب ڈھیلے ہو جائیں اور آہستہ آہستہ جسم تھکن کی تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا حاصل کرلے۔

اگر ایک شخص بستر پر لیٹنے کے بعد بھی کسی بات سے ڈر رہا ہے اور اضطراب و بے چینی میں مبتلا ہے تو اس کو آرام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ فکر سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اس سے الٹا نقصان پہنچتا ہے تو محض اس بات سے بہت سی باتیں طے ہو جاتی ہیں۔

جو لوگ ہر قسم کے خیالات اور افکار سے دامن بچا کر آرام اور سکون سے لیٹ جاتے ہیں، وہ سست اور کاہل نہیں ہوتے، بلکہ دراصل وہ تر و تازہ ہو کر حالات کا پوری سرگرمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوتے رہتے ہیں۔

اپنے کاموں کو نوعیت کے مطابق تقسیم کر دینا چاہیئے۔ فاضل وقت کو سکون کے ساتھ گزارنے کی غرض سے عمدہ دوست تلاش کر لینے چاہئیں۔

ماں کی دُعا

(بہ سلسلۂ رخصتی آنسہ اسما، چودھری)

— مجاہد لکھنوی

سب سے پہلے شکر اپنے رب کا میں کرلوں ادا
نعمتِ اولاد سے جس نے کہ دامن بھر دیا
پھر کروں میں اپنی پیاری بیٹی اسمار سے خطاب
اور حبیب حق کے صدقہ میں اسے دوں میں دعا
اے تمنائے دلی، نورِ نظر اے جان و دل
تجھ پہ اپنا سایۂ رحمت سدا رکھے خدا
گلشنِ ہستی میں تو پھولے پھلے آباد ہو
مسکرائے آرزو کی ہر کلی مہکے سدا
یہ حقیقت ہے کہ یہ تیری جدائی شاق ہے
بعد تیرے ہوگا اک تنہائی کا احساس سا
مجھ بتا سکتی نہیں ہوں کیا گزرے گی
ہوگا یہ محسوس جیسے پاس سے کچھ کھو گیا
زندگی سنسان سی محسوس ہوگی تیرے بعد
عارضی صدمہ ہے یہ دل پر گزر ہی جائے گا
یہ خوشی کچھ کم نہیں تجھ کو ملی راہِ حیات
مقصدِ ہستی یہی ہے، ہے یہ حاصل زیست کا
دوسروں کے کام جو آئے وہی ہے زندگی
ہے اسی میں درحقیقت اپنے جینے کا مزہ
ہو کسی کی آرزو اور تم اسے پورا کرو
بات اب اس سے زیادہ فخر کی ہے اور کیا
دل میں شوہر کی محبت اور خدمت کی لگن
ہر مسرت، ہر خوشی کا ہے یہی تو راستہ
ہے تمہارا ہر سکوں وابستہ اس کی ذات سے
اور اس کی ہر خوشی کا ہے تمہیں سے واسطہ
ازدواجی زندگی کی کامیابی کا یہ راز
رکھنا اپنے دل میں پوشیدہ مری بیٹی سدا
اچھا رخصت زندگی بھر خوش رہو دلشاد ہو
تا دمِ آخر کرے گی ماں تمہاری یہ دعا
باپ کے دل کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں
تھا تمہاری تربیت میں ان کا حصہ بھی سوا

• خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں • جواب طلب باتوں کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کرنا نہ بھولیں • پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہر ماہ ۲۰ سے ۳۰ تاریخ کے اندر ہی کریں، اس کے بعد شکایت کرنے پر پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا ——— منیجر

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی رسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ چھپ سکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور پچاس پیسہ کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ نمبر خریداری لکھکر بھیجی جائے۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں، وہ ایک ماہ کی تاخیر سے چھپتی ہیں۔ خبروں کی اشاعت کے سلسلہ میں کسی غلطی ہوجانے کا ذمہ دار دفتر نہ ہوگا البتہ اطلاع ملنے پر اس کی صحت شائع کردی جائے گی ـــــــ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• میرے محترم دوست اسرار مسعود صاحب (بھوپال) کے فرزند شکیل سلمہ کو اللہ پاک نے ۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔ اس سلسلہ میں اسرار مسعود صاحب اور برادر عزیز وجاہت علی سندیلوی، ایڈوکیٹ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(نسیم انہونوی)

• حریم کی قدیم پرستار بہن فاطمہ ملک صاحبہ (وارویک شائر انگلینڈ) کی صاحبزادی عذرا پروین سلمہا مسز خلیق زماں سلمہ کو اللہ پاک نے ۹ر دسمبر ۱۹۸۲ء ایک اور بچی عطا فرمائی۔ نام فرزانہ رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔ (نسیم انہونوی)

• عظمیٰ مسلم الحسن (بھوپال) میری خالہ محترمہ ثریا بارہ بنکوی کو اللہ پاک نے لاڈلی، عاشی اور رضا الدسلمہ اللہ تعالیٰ کے بعد ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو ۱۰ بجے دن میں ایک اور چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• عزہ نجم قادر (کالم پٹی) میری بھابھی خورشیدہ اقبال فرمان زوجہ سید مزمل شاہ قادری کو اللہ تعالیٰ نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام سید میر شاہ عطا قرار پایا۔ خدا مبارک کرے۔

• ۹ ۷ ۶ ۹ نمبر بٹا شگفتہ علی۔

• رخسانہ یاسمین (اورنگ آباد) میری پیاری آپی کنیز فاطمہ اور بہنوئی جاوید ثاقب کو اللہ تعالیٰ نے ایک بچی کے بعد ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بوقت ایک بجے دن ایک فرزند سے نوازا۔ اللہ پاک انہیں عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغامات نشاط

• شمس النساء محسن (مدراس) میرے بھیا الیس محمد بادشاہ صاحب کی دختر نیک اختر ناہید کا نکاح میری ماؤسی جمیلہ عمرہ صاحبہ (کلکتہ) کے صاحبزادے سید وسیم کے ساتھ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ، تاج کارو منڈل ہوٹل۔ مدراس میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• عبدالعزیز خاں صاحب (کھدوہی) کی صاحبزادی عصمت آراسلمہا کی شادی ڈاکٹر طارق صدیقی سلمہ (فرزند جناب اسعد صدیقی۔ بلرامپور) کے ہمراہ عزیز بلڈنگ کھدوہی میں دوسری جنوری ۱۹۸۳ء کی شام کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ خصوصیت کے ساتھ محترم بہن بیگم صاحبہ، عبدالعزیز خاں صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• حمیرہ تسنیم سلمہا (دختر نیک اختر پیش امام عبدالماجد صاحب جامع مسجد امبور) کی شادی کمال پاشا سلمہ (فرزند جناب پروفیسر عبدالرشید صاحب) کے ہمراہ ۲ر جنوری ۱۹۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• سید مظاہر حسین صاحب ایڈوکیٹ (وارانسی) کی دختر نیک اختر برجیس فاطمہ سلمہا کی شادی سید علی امام سلمہ (ابن سید ضیا حسین ہاشمی صاحب۔ وکھرولی بمبئی) کے ہمراہ ۳ر جنوری ۱۹۸۳ء بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• احمد حسن صاحب (نیشنل پرفیومری ہاؤس۔ جونپور) کے فرزند دلبند ابوبکر محمد صدیق سلمہ کی شادی انجیدہ تبسم عرف شبنم سلمہا (بنت جناب محمد شائق عرف ننھے صاحب) کے ہمراہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۲ر جنوری ۱۹۸۳ء کو اسی سلسلہ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• الحاج منیر احمد صاحب مرحوم کے فرزند اصغر احمد سلمہ کا عقد مسعودہ بیگم بی بی (دختر جناب سید احمد) کے ہمراہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء کی شب میں بمقام ایوان نصیر بماعت خانہ سلیمانی جمعہ آباد بخیر و خوبی

انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سید اشتیاق حسین مرحوم (پاٹانالا لکھنؤ) کے فرزند دلبند اقبال حسین سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو پروین بانو سلمہا (دختر واجد علی صاحب۔ جھوائی ٹولہ لکھنؤ) کے ہمراہ عمل میں آئی ایک شاندار دعوت ولیمہ ۲ر جنوری ۸۳ء کو دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• سید شاہد علی صاحب ڈپٹی رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، کی دختر نیک اختر سیما سلمہ کی شادی ہمراہ عابد سلمہ (فرزند جناب عظیم الدین) ۸ر جنوری ۸۳ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (عزالدین اعظمی ونسیم انہونوی)

• سی آر محمد ظہیر الدین ایڈوکیٹ کے بھائی سی آر محمد سیف الدین سابق ایم ایل۔ اے۔ چترا درگا) کی صاحبزادی عطیہ ممتاز سلمہا بی۔ اے کا نکاح مسنون ہمراہ ڈاکٹر محمد خلیل اللہ شکیل سلمہ (ابن جناب محمد صبغت اللہ چترا درگا) ۹ر جنوری ۸۳ء بمقام جامع مسجد چترا درگا، بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• نسیم احمد صاحب مالک دانش محل لکھنؤ کی صاحبزادی رعنا سلمہا کا عقد نکاح ہمراہ ابرار احمد سلمہ خلف جناب عمران احمد (مرحوم) ۱۲ر جنوری ۸۳ء عرب ہاؤس مولوی گنج میں بعد نماز مغرب وقت کی پابندی اور سادگی کے ساتھ انجام پایا۔ تقریب میں بیشتر ادبا اور شعرا نے بھی شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• میرے کرمفرما محترم محمد انوار الدین صاحب سکریٹری ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کا عقد ثانی ہمراہ سعیدہ بیگم صاحبہ (دختر نیک اختر جناب محمد مجید صاحب) ۱۱ر جنوری ۸۳ء کو نہایت سادگی کے ساتھ عمل میں آیا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• ڈاکٹر ہاشم قدوائی صاحب کے فرزند دلبند عزیزی ڈاکٹر عبدالرب محمد سلیم قدوائی سلمہ کے عقد سعید کے سلسلہ میں جو سلمٰی سلمہا دختر نیک اختر سید سعید مرتضیٰ صاحب، سابق ممبر پارلی منٹ) کے ہمراہ ہو چکا تھا، ایک شاندار دعوت ولیمہ ۱ر جنوری کی سہ پہر کو کوٹھی بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ لکھنؤ میں دی، جس میں معززین شہر نے شرکت فرمائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• [illegible] (ترماتو) [illegible] میری بھتیجی عشرت جہاں (دختر نیک اختر ایم۔ ایس سردار صاحب) کا عقد سعید ہمراہ ڈی۔ ایس صادق پاشا (ابن ڈی۔ آر ستار صاحب) بتاریخ ۴ر جنوری ۸۳ء بروز اتوار بمقام ترپاتور بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔

• امینہ دلشاد (سکندرآباد) میری دختر نیک اختر عزیزی فرحانہ سلمہا کی شادی بنگلور والے سیٹھ عبدالحمید صاحب کے فرزند فرید احمد سلمہ کے ساتھ ۱۲ر دسمبر ۸۲ء کو کچھی میمن جماعت خانہ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• ایگل پریس لکھنؤ کے فورمین جناب محمد ہاشم صاحب کی صاحبزادی ریشما سلمہا کی شادی ہمراہ محمد احتشام سلمہ (فرزند محمد عظیم خاں صاحب ملیح آبادی) ۳۰ر جنوری ۸۳ء کو دن میں نشاط گنج لکھنؤ میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پرملال کی خبریں

• حریم کی قدیم پرستار بہن شمس النساء محسن (مدراس) کے والد محترم شاہ بندری حسین صاحب (فرزند جناب شاہ بندری محمد میران) یکم جنوری ۸۳ء بروز سنیچر بوقت ۲ بجے دن رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ۹۰ سال تھی۔ بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ان کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

شریک غم۔ (نسیم انہونوی)

• مسز کلیمہ قادر (بلاری) افسوس صد افسوس کہ ۹ر اور ۱۰ر نومبر ۸۲ء کی درمیانی شب میں بارہ ایک بجے میری بیٹی فرزانہ کی ویدانی الکبری بیگم کا بہ سلسلہ زچگی انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کی شادی ۲۵ر جنوری ۸۲ء میں ہوئی تھی۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (ایسی جوانا موت پر کون ہے جس کا دل نہ بھر آئے میں بھی شریک غم ہوں)

• سلطانہ شبانہ سردمانہ نازلی (پرنام بٹ) افسوس صد افسوس کہ ہماری نانی جان صاحبہ ۲۳ر نومبر ۸۲ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی نیک پارسا اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• زبیدہ بتول۔ سعیدہ یاسمین (آنبور) افسوس کہ ہماری پڑوسی بہن الیہ مالک احمد یہ دھمیدیہ ہوٹلس، سفر حج سے واپسی پر ممبئی میں انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی خدا ترس، اقربا پرور اور صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ مغفرت کرے (آپ نے نہ مرحومہ کا نام لکھا، نہ ہی ان کے شوہر صاحب)

• رابعہ لطیف (کٹک) افسوس صد افسوس میری پھوپھی حلیمہ بانو صاحبہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲ء بروز جمعہ نماز ظہر ادا کرتے ہوئے اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئیں۔ حالت استقبال ہی سے مرحومہ کی خوش بختی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ کے حضور میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• خورشید عباس (الہ در) افسوس صد افسوس کہ میری والدہ محترمہ زہرہ بی صاحبہ بعمر ستر سال ۲۹ دسمبر ۲۰۰۲ء کی شب میں ساڑھے بارہ بجے اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی خوبیوں کی بزرگ تھیں، کبھی کوئی سائل ان کے در سے خالی نہ جاتا تھا۔ اللہ مغفرت کرے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سمی۔ امتیاز احمد آمبوری (آمبور) افسوس صد افسوس کہ میری بڑی امی زہرہ بتول (بنت جناب توبے عبدالشکور) ۲۱ دسمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• جید عالم اور بلند پایہ خطیب مولانا سید دلبر حسن نونہروی کا لکھنؤ میڈیکل کالج میں ۲۲ جنوری کو صبح ۹ بجے دماغی فالج سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی۔ وہ ایک عظیم علمی خانوادے کے مشہور فرد تھے۔ مولانا ابن حسن نونہروی آپ کے بڑے بھائی بھی تھے اور استاد بھی۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی آپ کے سگے بھتیجے ہیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے وطن ہی میں حاصل کر کے مرحوم نے مدرسہ سلطان المدارس لکھنؤ سے صدر الافاضل کی سند حاصل کی تھی۔ ساری زندگی دینی تعلیم کے لیے وقف کر دی۔ [illegible] [illegible] [illegible] شبیہ حسن صاحب [illegible] اللہ مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• نسیم بجنور کے کارکن محمد وسیم صاحب کی ہمشیرہ خاتون صاحبہ زوجہ شبیر احمد صاحب کا انتقال ۲۰ دسمبر ۲۰۰۲ء بروز منگل ہو گیا۔ مرحومہ عرصہ سے علیل تھیں۔ خدا مرحومہ کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• حریم کی آخری کاپی پریس جا چکی تھی کہ بہن شاہدہ بلگرامی صاحبہ کے خط سے یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ حریم کی قدیم ترین سرپرست اور میری محسن بہن طاہرہ تھانوی صاحبہ کے شوہر محترم سید علی العابدین صاحب ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر ۲ جنوری ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم سراپا شرافت تھے۔ خاکسار کو بارہا مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا۔ اس دور میں ایسی شخصیتیں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں میری دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بہن طاہرہ تھانوی اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بہن طاہرہ تھانوی صاحبہ سے مجھے شکوہ ہے کہ اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع اب تک نہیں دی تھی۔ ساتھ ہی میں بہن شاہدہ بلگرامی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ دلخراش خبر مجھ تک پہنچائی۔ (نسیم انہونوی)

• میرے دفتر کے منیجر جمیل الحسن صاحب کے بہنوئی قاضی سید منظور حسن صاحب کا بروز سہ شنبہ دن گزر کر شب میں تقریباً ۹ بجے بتاریخ ۵ جنوری ۲۰۰۳ء مختصر علالت کے بعد بمقام قصبہ ردولی میں انتقال ہو گیا۔ پروردگار عالم مرحوم کو غریق رحمت فرماتے ہوئے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم نہایت نیک خصلت، پاک سیرت، پابند صوم و صلوٰۃ اور عاشق اہلبیت اطہار تھے۔ منیجر موصوف کی بڑی بہن جو قاضی صاحب مرحوم کو منسوب تھیں چار ماہ قبل داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکی تھیں۔ استدعا ہے کہ ایک سورۂ فاتحہ سے ایصال ثواب فرمانے کی زحمت فرمائیں۔ (نسیم انہونوی)

پسندیدہ اشعار

(مارچ کے لئے عنوان ہے — "آزادی" اور اپریل کے لئے "عاقبت")

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

[illegible]
کبھی کبھی [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

اٹھاتی۔ جس پر چاہتی حکم چلاتی۔ اپنے جابرانہ سلوک سے اس نے سب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ گویا ایک بار پھر اُن کنیز فاطمہ کا سکّہ رائج ہو گیا تھا جن سے سب پناہ مانگتے تھے۔!

سیما کے اب دو لڑکے تھے۔ نوید اور رشید۔ ماں بننے کے بعد بھی اُن کے مزاج میں ماں کی نرمی اور محبت کی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ ظلم وہ بے چارے جمشید پر ڈھا رکھتی۔ شروع ہی سے اس سے خار کھاتی تھی۔ اسے ایک پل برداشت نہ کرتی۔ معصوم بچہ عجیب سے حالات سے گزر رہا تھا جب تک مصطفےٰ گھر میں رہتے۔ وہ بچہ کھیل کود لیتا اور ان کے جاتے ہی اس پر افسردگی طاری ہو جاتی۔!

نبیلہ کو جمشید سے قدرتی محبت تھی۔ حالانکہ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ اسی کا خون تھا۔ لیکن وہ خون کی غائبانہ کشش ہی تھی۔ جمشید بھی اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا۔ اس سیما نبیلہ کو ہزاروں باتیں سنا کر رکھ دیتی۔!

"بھائی کے بچوں کو لینے سے تمہارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں۔ ان کی طرف مسکرا کر دیکھتیں تک نہیں۔ پرائے لاوارث چھوکرے پر کیوں محبت ٹوٹ پڑی ہے۔ خدا ہی جانے کہاں سے آیا ہے۔ ہمارا ہی گھر ملا تھا اسے بھی مرنے کے لیے میرا بس چلتا تو کان پکڑ کے نکال باہر کر دیتی۔!"

"یہ آپ کا کیا بگاڑتا ہے۔ بھائی۔" سیما کو رونا آ جاتا۔ "میں تو اسے آپ کے پاس تک نہیں جانے دیتی۔ وہ تو نوید کے ساتھ بھی نہیں کھیلتا۔ بیچارہ خود ہی سب سے الگ الگ رہتا ہے۔ پھر آپ اسے برا بھلا کیوں کہتی ہیں۔؟!"

"میں کہتی ہوں۔ تم سب کیوں مرے جاتے ہو اس پر۔" سیما چیخنے لگی۔

وہ بے شک اسے اپنے ساتھ لے کے چلے جاتے اور جمشید انہی کی اولاد بن کر بڑا ہوتا۔ لیکن یہ بات غضنفر کو گوارہ نہ تھی۔ جمشید ان کا بچہ تھا۔ اس سے انہیں بے حد محبت تھی۔ وہ اسے خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جمشید سے جدائی کا مطلب تھا۔ ہمیشہ کی مفارقت۔ وہ اگر دس بیس سال بعد جوان ہو کر وطن واپس بھی ہوتا تو غضنفر کو اپنے باپ کی حیثیت سے کیا پہچان سکتا؟ اسے کیسے یقین دلایا جاتا کہ وہ غضنفر کا بیٹا ہے۔ اور تب اس کے محسوسات کیا ہوتے!

اس کا باپ اتنا بزدل تھا کہ اپنے جائز بیٹے کو اس نے دوسروں کے حوالے کر دیا تھا کیوں کہ وہ ماں باپ سے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ تب۔ کیا وہ اپنے جوان بیٹے سے نظریں چار کر سکتے؟ جوانی میں ماں باپ سے ڈرتا۔ بڑھاپے میں بیٹے سے ڈرتا۔ بس یہی تھا مقدر میں۔؟!

نہیں۔ اب انہیں مقابلہ کرنا ہے۔ سب سے۔ خود سے۔ ہمت کرنی چاہیے انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن ان کی تقدیر کہ ان کی نیکیاں بھی برائیوں کے روپ میں سامنے آ رہی ہیں۔

انہیں فی الحال والدین کا خیال نہ تھا مگر خوف سیما کا تھا۔ وہ اچھی عورت نہیں تھی۔ اپنے گھر کے افراد ہی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ بھلا دوسرے بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتی؟۔

اور پھر سے غضنفر کے شب و روز کا چین اڑنے لگا۔

فرشتہ نے مشورہ دیا تھا کہ ہر چہ بادا باد کہہ کر امی سے سب کچھ کہہ دینا چاہیے وہ آخر ایک ماں ہیں۔ ان کے صرف قدموں ہی تلے جنت نہیں ہے بلکہ وہ مجسم جنت ہیں۔ ان کا دل آسمان سے زیادہ وسیع ہے۔ وہ حالات سنبھال لیں گی۔:

ہوا تھا۔ وہ بہر حال گھر گرہستی میں لگ کر غم ہلکا کر لیتی تھی۔ لیکن وہ لوگ پھر سنبھل نہ سکے۔ !

مظفر کا جی اچاٹ تھا۔ وہ جلد از جلد باہر جانے کی کارروائیاں کر رہا تھا۔ دادا اسے لکھ بھی رہے تھے کہ وہ فوری چلا آئے۔ عرب ممالک میں کئی جگہیں اکاؤنٹنٹ کی خالی تھیں! دادا ہر طرح اس کی مدد کرنے کو تیار تھے۔ اور پھر ایک روز وہ بھی جنرل اسٹور مظفر کے سپرد کر کے غیر معینہ مدت کے لیے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے وقت ابا جان بہت روئے تھے اور غضنفر کو ایسا لگ رہا تھا۔ ان کے دونوں بازو کوئی چھینے لیے جا رہا ہے۔ البتہ مظفر اس کال کوٹھری سے رہائی پر ضرور خوش تھا۔ !

وقت کا چکر کبھی رکتا نہیں۔ اور ایک مرتبہ اگر کسی کا ستارہ گردش میں آیا تو آیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے اس گھر کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ امی کی موت کے بعد مسلسل تباہ حالی پھیلتی چلی گئی۔ ابا جان نے کاروبار حیات سے دلچسپی لینی تقریباً چھوڑ دی۔ مظفر سے جنرل اسٹور اور اپنی تعلیم سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ دکان پر بھی آہستہ آہستہ زوال آ رہا تھا۔ !

غضنفر کو اپنی ملازمت سے فرصت نہ ملتی۔ جعفر بہت چھوٹا تھا! وہ کوئی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ بہرحال تھوڑی بہت مدد اس سے مل ہی جاتی تھی کو چھٹی دے کر وہ دکان پر آ بیٹھتا۔ غرض کہ گھر کے اندر اور گھر کے باہر تباہی ہی تباہی کارفرما تھی۔ ان بدترین حالات میں ستیا کا سلوک سونے پر سہاگہ تھا۔ اس نے کبھی کسی انقلاب سے اثر نہیں لیا۔ وہ بدستور پر غم تھی۔ اب سارے گھر پر اس کی حکومت تھی۔ جیسا چاہتی تھی

چنانچہ وہ امی کی خدمت میں پہنچے۔ ان دنوں وہ کچھ بیمار تھیں۔ غضنفر کو یونہی معلوم تھا کہ امی یا تو کبھی بیمار ہی نہیں پڑتیں۔ یا پھر برسوں کی کسر یکبارگی نکال لیتی ہیں۔ !

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں مسہری پر پڑی تھیں۔ ہلکی سی فرد پیروں پر ڈال رکھی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھیں۔ قریب ہی پاس بیٹھی تھی کہ کندھے اور بازو دبا رہی تھی۔ غضنفر کا دل بیٹھ گیا۔! انہیں دیکھ کر امی نے کراہنا بند کر دیا۔ اور ہولے سے مسکرائیں۔

"آپ کے جسم کا درد کچھ بڑھ گیا ہے امی؟" غضنفر نے کہا اور کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گئے۔

"چلا جائے گا بیٹے۔ تم پریشان مت ہو۔" امی نے کہا۔ ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ نرم گھلا ہوا۔ جیسے انہوں نے بدلتے ہوئے وقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ مکمل طور پر اپنی شکست قبول کر لی تھی۔ !

"سکینہ صاحب کے علاج سے آپ کو فائدہ نہیں ہوا۔ آج میں دوسرے ڈاکٹر کو لاؤں گا۔" غضنفر نے کہا۔ "آپ کا چہرہ بہت ناتواں لگ رہا ہے۔ امی۔ میں آپ کے پاؤں دبا دوں؟"

"نہیں میرے بچے۔" امی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تم فکر مت کرو سردیوں کا اثر ہے۔ طبیعت گری گری ہے۔ تم کھاؤ پیو۔ اپنے کام سے جاؤ میں بالکل اچھی ہوں" وہ چپ ہو گئے۔

امی نے دفعتاً ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "کیا بات ہے تم مجھے پہلے سے زیادہ اداس اور پریشان لگ رہے ہو۔ آہ۔ میرے بچے۔ یہ میاں نے

ڈر تھا۔ آپ بھائی سے بھی اتنا ہی خوف کھاتے ہیں۔ کیسے مرد ہوئے ہیں آپ؟

امی کی بیماری بالآخر رنگ لائی۔ انہوں نے ہلکی ہلکی حرارت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اعضا شکنی کو بھی بڑھاپے کی عام کمزوری سمجھا کیں۔ کبھی دوا پی کبھی نہ پی بھول گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکبارگی بخار بڑھ گیا۔ اور اس قدر بڑھا کہ وہ ہوش و حواس بھول گئیں۔ ان کی سوء مزاجی نے گھر بھر کو قلابازی کھلا دی تھی۔ پھر دوڑ دھوپ بھی ہوئی۔ ڈاکٹروں کا تار بندھا۔ دوا علاج ہوا۔ مگر ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مرض سے غفلت اور لاپروائی نے انہیں موت کے منہ میں پہنچا دیا۔!

اور پھر بہت عرصہ تک وہ لوگ سنبھل نہ سکے۔ ابا جان کے ہاتھ سے گویا عصائے پیری چھوٹ گیا۔ وہ بے حد گم صم ہو کر رہ گئے۔ ان کی ساری ذمہ داری سیما پر آ پڑی۔ لیکن اس نے کبھی بزرگ خسر کا خیال نہ کیا۔ نبیلہ پر حالانکہ مصائب کا پہاڑ بن کر ٹوٹا تھا۔ وہ ابھی اتنی سمجھ دار نہ تھی کہ گرہستی سنبھال سکتی۔ اسے تو شب و روز گریہ و زاری ہی سے فرصت نہ ملتی۔ کبھی کبھی تو باپ بیٹی پاس پاس بیٹھے روتے رہتے۔ اور کوئی کسی کو منانا نہیں تھا دونوں ہی کا سہارا جاتا رہا تھا۔ ابا جان پہلے سے بڑھ کر ضعیف ہو گئے تھے۔!

نوشینہ تڑپتی تھی میکے کی بدحالی پر۔ لیکن وہ پرائے گھر کی بہو تھی۔ آنا جانا اپنی مرضی کا نہیں تھا۔ ان ہی دنوں اس کے یہاں تیسرا بیٹا پیدا

تمہاری قسمت پھوڑ دی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں تمہارے لیے عذاب مول رہی ہوں میں نے تمہاری زندگی بنانے کی کوشش کی تھی۔ کون ماں ہو گی جو اپنے ہونہار بیٹے کا برا چاہے گی۔ مگر ۔۔۔!"

"گئی گزری باتیں تو امی زمین پر بہا ہوا دودھ ہیں۔ جو پھر سے برتن میں نہیں ڈالا جا سکتا۔" غضنفر نے خالی الذہنی کے انداز میں کہا۔ "میں۔ اس وقت آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ ۔۔۔ مجھے نوشینہ نے مشورہ دیا تھا کہ ۔۔۔!" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"کہو۔ کیا کہہ رہے تھے۔" امی نے فرد پیروں پر سے ہٹائی اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ اور نہ اسی کا اندازہ ہے کہ آپ کیا سوچیں گی۔ کیا کہیں گی۔"

امی کے چہرے پر حیرت و کرب کے ملے جلے آثار ابھرے۔

"نوبی۔ تم جا کے جلدی سے چائے بنا لاؤ۔" غضنفر نے کہا اور نبیلہ اٹھ کر چلی گئی۔

"امی۔ میں بہت پریشان ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ مجھ ناخلف کو ہمیشہ کی طرح اب بھی معاف کر دیں گی۔ امی۔ آپ ہی کی ذات ہے جو میرے لیے باعث طمانیت ہے۔ میں چاروں طرف کے دھکے کھا کر آپ کے پاس چلا آتا ہوں۔ مجھے سکون مل جاتا ہے۔ آپ کا خیال آپ کی محبت میرے جلے دل پر تسکین کے ٹھنڈے پھاہے رکھ دیتی ہے امی۔ میں نے ایک غلطی کی۔ امی۔ میں مسلسل ڈھائی تین سال سے ایک کرب جھیل رہا ہوں۔ امی اب کوئی اور چھور مجھے نظر نہیں

آنکھ۔ آپ مجھے پناہ دیجئے۔ ورنہ میں بالکل جھلس جاؤں گا۔ امی۔ پہلے آپ وعدہ کیجئے۔"

امی کے چہرے پر بے پناہ حیرت کے آثار طاری ہو گئے۔ آنکھیں کھولے۔ وہ تعجب سے غضنفر کو تک رہی تھیں۔ ان کے دل کی دھڑکن لباس پر سے عیاں تھی۔ لب خشک ہو چلے تھے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے حلق تر کر کے کہا۔

"کیا کیا تم نے، غضنفر، کسی کی جان لے لی ہے۔ کسی کی زندگی ختم کر آئے ہو۔ جلدی سے بولو۔ نوشینہ نے تمہیں کس بات کا مشورہ دیا ہے۔ یا الٰہی رحم کر کیا؟ یہ میاں کی کوئی بات ہے؟"

"نہیں امی۔ یہ صرف میری بات ہے۔ لیکن آپ اس قدر گھبرا کیوں رہی ہیں۔ خدانخواستہ میں نے کسی کی جان وان نہیں لی ہے۔ کمال کرتی ہیں آپ امی۔"

"لیکچر تم نے دیا تھا۔ اوپر سے کمال بھی میں ہی کرتی ہوں۔"

خود کو اور ماں کو سنبھالنے کے لیے غضنفر نے اوپری دل سے قہقہہ لگایا اتنے میں نبیلہ چائے لے آئی۔ چائے سے فارغ ہو کر غضنفر اٹھے اور دروازہ بند کر دیا۔

"آپ داور کو تو جانتی ہیں"

"ہاں۔"

"اس نے ایک غلطی کی ہے۔ اب وہ آپ سے مدد کا طالب ہے۔"

"کیا کیا ہے اس نے؟"

غضنفر نے داور کے پردے میں اپنی زندگی کی رام کہانی کہہ سنائی۔ امی سکون سے سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "تو اس کی ماں اپنے پوتے کو ساتھ رکھنے پر تیار نہیں ہیں۔"

تم پر کیا آفت آئی ہے بھئی" عاجز آ کر غضنفر نے کہا۔ "خواہ مخواہ تم کیوں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہو۔ کیا میں تم سے اس غریب کی خدمت لینا چاہتا ہوں۔ اسے امی اور لوبی رکھیں گے۔ تم پر تو کوئی بوجھ نہیں ہے نا۔؟"

"اس طرف آئے گا بھی نہیں۔ یاد رکھیے —!"

"ہرگز نہیں آئے گا؟ —" غضنفر نے قہقہہ لگایا اور نظر دل جیسے اسے گھورا پھر جوتوں سمیت مسہری پر لیٹ کر دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ ان کا دل اندر اندر کسی غار میں اترا جا رہا تھا۔ اب دیکھیئے ان کی یہ بری محبت کیا گل کھلاتی ہے۔ یہی مناسب تھا کہ داور اپنے ساتھ لے جاتے۔ کم از کم وہ اطمینان سے محبت کے گہوارے میں پل تو جاتا۔ وہ سوچتے رہے — سیما گال پھلائے پھرتی رہی۔

دوسرے ہی روز نوشینہ گھر آئی۔ بچے کو دیکھا۔ وہ سامنے [illegible] بر آمدے میں جعفر اور لوبی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اسے بچے پر بے حد پیار آیا لیکن ایک بھابی کے ڈر کے مارے وہ اسے گود میں بھی نہ لے سکی۔ پھر اس نے تنہا پا کر غضنفر سے کہا۔ "بڑے بھیا! آپ نے اندازہ لگایا ... آپ کیا [illegible] لے آیا ہے۔"

"نہیں تو۔"

"نہیں تو کیا۔ [illegible] آنکھیں ہیں آپ کی [illegible]"

"وہ بچہ کہاں ہیں اس کے؟" غضنفر نے پوچھا۔

نوشینہ حسب عادت جلدی سے بول گئی۔ "... آپ بھابی سے اس قدر کیوں ڈرتے ہیں۔ پھر دیکھیے صاف صاف کہ آپ کا بچہ ہے [illegible]"

وعدہ کرکے آیا ہوں کہ اس کے بچے کو اپنا بچہ سمجھوں گا۔ اور میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔!"

"آپ کے پاس اتنا خزانہ کہاں سے آیا جو اس کی پرورش بھی آپ ہی کریں گے۔!" سیما نے پوچھا۔

"تمھارا اور تمہاری اولاد کا حق نہیں چھینوں گا۔ بس۔؟"

"آج چھوٹا ہے۔ کل بڑا ہوگا۔ ہزاروں ذمہ داریاں ہیں۔ کھانا کپڑا۔ دکھ بیماری۔ تعلیم۔ اور ــــ!"

"ان سب کا بار ہرگز ہرگز تمہارے سر نہیں پڑے گا۔ مطمئن ہو جاؤ۔!"

"آپ جانیں آپ کا کام۔ نجانے کس حسب نسب کا ہے۔ میں اپنے نوید کو اس کے ساتھ نہیں کھیلنے دوں گی۔"

"حسب نسب؟ ــــ" غضنفر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "وہی اس کا بھی حسب نسب ہے۔ جو میرا ہے۔"

"اتنی محبت ہو گئی ہے۔ گلی کوچوں کے کیڑے سے۔" سیما استہزائیہ انداز میں بولی۔ "ارے تو پھر پردہ کاہے کا۔ کہہ دیجئے نا صاف صاف کہ وہ آپ ہی کی کسی کرنی کا پھل ہے۔"

غضنفر بوکھلا گئے۔ کہیں امی نے کچھ کہہ تو نہیں دیا۔ مگر دوسرے لمحہ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ سیما بڑبڑا رہی تھی۔

"کریم الدین صاحب بھی پورے بنجارے تھے۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ کوئی خاندان بھی نہیں اجڑا تھا کہ اپنی اولاد ان ہی کو سونپ جاتے ہمی نصیب ہوئے تھے۔ ایسے پاگل بھلا اور کہاں ملتے ہیں۔

"نہیں۔"

"بڑی بے درد معلوم ہوتی ہیں۔" انہوں نے فوراً کہا۔ "لوگ کھلے دل سے ناجائز بچے کو بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ غلطی مرد عورت کرتے ہیں۔ بچے کی کیا خطا ہے۔"

"فرض کیجئے امی۔ کہ آپ اگر اس موقف میں ہوتیں۔ تب۔؟"

"ارے میں تو اپنے بیٹے کی فراخ دلی، وسیع النظری اور انسانی ہمدردی پر پھولی نہ سماتی۔ میں سمجھتی کہ میری تربیت اس پر بے کار نہ گئی۔ میں تو خوشی خوشی اپنے پوتے کو سینے سے لگا لیتی۔"

اور تب غضنفر نے امی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اور انہیں اپنے آنسوؤں سے بھگوتے ہوئے بولے:

"تو پھر لگا لیجئے اس بچے کو اپنے سینے سے میری امی۔ یہ ساری کہانی میری ہے۔ داور کی نہیں۔"

"تمہاری کہانی ــــ" امی کا دل حلق میں آگیا۔ "اسی لیے تم نے پہلے درد کے معافیاں مانگی تھیں۔"

"ہاں امی۔ میں شروع میں آپ سے کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔!" وہ نادم اور پشیمان سے سیدھے ہو بیٹھے۔

"ہائے تمہاری نادانی۔ غضنفر، اگر تم مجھ سے سارے حالات کہہ دیتے مجھے اونچ نیچ سمجھاتے تو میں اُسی نصیبوں ماری بچی کو اپنی بہو بنا کے لے آتی آپا سے کہہ دیتی کہ ان کی لڑکی سے بیاہ ہمیں منظور نہیں۔ تب تو یہ دوزخ گھر میں نہ آتی۔! ہماری سب کی زندگیاں سنور جاتیں۔ ارے کیا پڑھے لکھے

لڑکے اپنی من مانی شادی نہیں کر لیتے ؟ کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ ہائے غضنفر تم نے منھ پر تالے ڈالے رکھے۔ تم نے کیا غضب کیا ؟ ۔"

غضنفر کو امی کی قلب ماہیت پر حیرت سی ہو گئی۔ اتنی حیرت کہ ناگہانی مسرت بھی حیرت سے مغلوب ہو گئی ۔ !

پھر امی نے ان پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ بچہ کیسا ہے۔ کس پر پڑا ہے۔ کیا باتیں کرتا ہے۔ چلتا پھرتا ہے کہ نہیں ؟ غضنفر جواب دیتے رہے۔ اور سوچتے رہے کہ ممتا بھی کیا چیز ہے۔ خدا نے اپنی محبت کو ماں کی محبت سے تشبیہ دی ہے تشبیہ کی مثال میں شدت پیدا کرنے کے لیے خدا کو بھی یاد آئی تو ماں یاد آئی۔ جو ساری خطاؤں کو ممتا کی چادر تلے ڈھانپ کر محبت و الفت، رحم و کرم، ہمدردی اور خلوص کی بارش برسا دیتی ہے۔

پھر وہ مصر ہوئیں کہ غضنفر جلد از جلد جمشید کو لے آئیں۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" امی نے کہا۔

"نہیں امی۔ یہ مناسب نہیں۔ آپ صبر کیجئے۔ یہ بات آپ کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو۔ کیا فائدہ کہ میں شرمندگی محسوس کروں۔ اور سیما کو تو قطعی اس کا علم نہ ہونا چاہئے۔ تنگ دل عورت ہے۔ وہ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ لیکن فضول باتوں سے جگر چھلنی کر دے گی۔"

"اچھا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر میں بے چین بہت ہوں۔ تمہارے اس بچے نوید کو تو سیما چھونے نہیں دیتی۔ میں اپنے اُس پوتے کو ہی سینے سے لگا کے دل ٹھنڈا کر لوں ۔"

"اچھا امی اچھا۔"

دینے سے قطعی عار و انکار نہ تھا۔ ! وہ تو بے حد مسرور ہوئے تھے۔ خداوند کریم نے اتنی بڑی نیکی غضنفر کے دل میں ڈال دی تھی۔ انہوں نے تو پیش کش کی تھی بچے کے لیے اگر کچھ ضرورت پڑے تو انہیں اس سے لاعلم نہ رکھا جائے ۔ ... "

گھر میں ایک ننھا منا خوبصورت بچہ کیا آیا۔ نوبی، جعفر اور ننھے نوید کے لیے بے تحاشہ دلچسپیوں کے سامان پیدا ہو گئے۔ انہی تینوں نے اسے بہلا بھی لیا نوید کم و بیش اسی عمر کا تھا۔ سال ڈیڑھ سال کا خاصہ صحت مند۔ جمشید دو سال یا کچھ زائد تھا! نوبی اسے لے کر چلی آئی تھی !

اکیلے میں غضنفر نے امی سے کہا۔ "میں ذرا نوشی کو سارے حالات سے مطلع کر آؤں۔ وہ اس سلسلے میں پریشان رہتی تھی۔ !"

میں کہتی ہوں۔ یہ بالشت بھر کی لڑکی بڑی کٹنی ہے۔ کبھی منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔ تمہاری باتیں ہضم کئے رہی۔" امی نے تعجب سے کہا

شام ڈھل چکی تھی۔ جب وہ نوشینہ سے مل کے آئے۔ تنہائی میں اتنے دنوں بعد پہلی مرتبہ سیما سے گفتگو کی نوبت آئی تھی۔ خیریت پرسی کی بجائے اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی ادھر ادھر کی آخر کی بھرتی سمیٹتے پھرنے کی۔ ؟ مجھ سے اس کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ سنا آپ نے۔ یہاں اپنے ہی بچے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ کبھی اپنے لڑکے کو آپ نے گود میں نہیں لیا۔ پرائے بچے کو سینے سے لگائے کھڑے تھے ! ۔"

"دیکھو بھئی میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں کرتا۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ سمجھیں !" غضنفر نے تیوری بدلی۔ "میں اپنے دوست سے

دوران اتفاق سے ابا جان موجود تھے۔ انہوں نے بھی حیرانہ نگاہ زنان پر ڈالی۔! ان کے استفسار سے قبل غضنفر نے کہا:

"کیا بتاؤں ابا جان۔ وہ جو میرے بے چارے دوست کریم الدین صاحب تھے۔ ان کا چند روز قبل دق کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بچے کو میں لے آیا ہوں۔"

"لل۔ لیکن۔ اس بے چارے کی ماں تو ہو گی۔" ابا جان نے پوچھا۔

"ماں غریب اس کی پیدائش ہی میں مر گئی تھی۔" فی البدیہہ غضنفر نے کہا۔

"افسوس افسوس۔ تبھی تو اس معصوم کے چہرے پر یتیمی، یسیری منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔" ابا جان نے کہا۔

"اے خدا نہ کرے۔ یتیمی کیوں۔" تڑپ کر امی بولیں۔

"کیا مطلب؟" چونک کر ابا جان نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اللہ رکھے جب غزل نے اسے اپنا لیا ہے تو خدانخواستہ یہ یتیم کیوں ہونے لگا!" امی بولیں۔ انھیں اپنی کھلی ہوئی باچھیں سکوڑنے میں بڑا دقت لگا۔ ان کے لئے یہ کام دشوار بھی تھا۔

"خیر بھئی۔ ثواب کا کام ہے۔ لیکن خیال رہے۔ اس کی خدمت میں کوئی کوتاہی کسی گناہِ کبیرہ کا سبب نہ بن جائے۔" ابا جان یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے ثواب کے کام انجام دیئے تھے۔ بیگم کو پتہ نہ تھا۔ کتنے یتیم لڑکے اپنی تعلیمی فیس دکان پر آ کر لے جاتے تھے۔ کتنی نادار عورتیں روزمرہ کے خرچ کے لیے سعید الرحمن صاحب سے رقم مانگ لیتی تھیں۔ لہٰذا ایک لاوارث بچے کی تربیت اور پرورش اتنا نیک کام تھا کہ سعید الرحمن صاحب کو اس کے انجام

امی ہنوز بیمار ہی تھیں۔ لیکن نادیدہ پوتے نے ان میں ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ وہ چاق چوبند ہو کر اٹھیں۔ اور روزمرہ کی طرح باورچی خانے میں جا بیٹھیں۔! تھنوری بوا اپنی ڈورے بندھی عینک ناک کی پھننگ پر اٹکائے سر جھکائے ساگ بین رہی تھیں۔ امی نے ٹوکری ان کے سامنے سے کھسکائی اور خواہ مخواہ ہنس کے بولیں:

"بوا جی تم چاول دھولاؤ۔ میں ساگ بناتی ہوں۔ شام ہو رہی ہے ابھی روٹیاں بھی پکیں گی۔ اکیلی تم کیا کیا کرو گی۔"

"ہم دھیرے دھیرے سب کام نپٹا لیتے۔ بٹیا۔ تمہارا جی ماندہ ہے۔ تم کاہے چلی آئی ہو۔ جاؤ۔ آرام کرو۔ تنک اچھی ہو جاؤ تو چولھا چوکی دور کتنا ہے۔"

"اے بوا اماں نہیں"۔ امی ہنس پڑیں۔ "میں اب اچھی ہوں۔ آج میرے غضنفر نے مجھے ایک نئی دوا پلا دی ہے۔"

"جگ جگ جئیں غضنفر میاں۔" بوا بولیں۔ امی کا حال وفورِ مسرت سے ابتر تھا۔ ایک بڑا راز سینے میں سما نہیں رہا تھا۔ تھنورن بوا ان کے بچپن کی خادمہ تھیں۔ اور اب گھر کی ایک فرد بن گئی تھیں۔ لہٰذا امی آگے سرکیں اور بوا کے سر سے سر جوڑ کر غضنفر کی ساری باتیں ان سے من وعن کہہ دیں۔ بوا کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو چشمے کے اوپر سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ تارہ بن کر امی کے چہرے پر لگ گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر وہ گلا صاف کر کے بولیں:

"اتی بڑی بات غضنفر میاں چھپا لیہن تم سے۔"

"اے بوا۔ تم بھی نہ کہنا کسی سے۔ دلہن قیامت جوت دے گی!"

"کا بٹیا۔ تم جہیٹو لڑکے کا لائی کے لیے۔" بوا نے ٹھیٹھ پوربی میں پوچھا۔

"کہا تو ہے۔ عزنی ہے۔ اب اس کی مرضی۔"

"پھر۔ بچے کے لیے کہا کا چاہیئے۔ ؟!"

"دوست کا لڑکا ہے۔ باپ پرائے ملک جا رہا ہے۔ لڑکا ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"اچھا۔ اچھا۔" بوا نے بھی جامے سے باہر ہو کر پان زدہ ٹوٹے پھوٹے
نت نکال دیئے۔

غضنفر کے تو دل سے لگی تھی۔ وہ اپنا اہم راز ماں سے کہہ کر ہلکے پھلکے ہو گئے
ے۔ وہ چوتھے روز کسی بہانے سے گئے اور جمشید کو لے آئے!۔ داور کے پورے
ہ سے اس کی جدائی بڑی دردناک تھی! اسے اپنے حقیقی باپ سے اتنا لگاؤ
تھا۔ وہ ان کا زیادہ صورت آشنا بھی نہ تھا!۔ داور، نشاط اور داور کی
ں بے حد متاثر تھیں۔ رہ رہ کر جمشید کو سینے سے لگا کر پیشانی چومتیں۔ وہ
ی رو رہا تھا۔! اور بار بار ان سے چمٹ جاتا۔ نشاط یہ دیکھ کر بولی۔

"داور بھائی۔ اب اسے ہمارے ہی پاس رہنے دیجئے۔ مجھے یقین ہے
ہم سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اور ہمیں بھی اس کی فرقت بے چین رکھے گی۔"

"ہاں یار۔ کیا اب تک اسے اپنے آفتاب کے ساتھ میں نے اس کی پرورش
بیٹا سمجھ کر نہیں کی۔" داور نے بھی اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ملتے ہوئے کہا
میرے اگر جڑواں بچے ہوتے تو کیا ایک میں کسی کو دے ڈالتا۔ نہیں غضنفر
اسے ہم سے جدا مت کرو۔!"

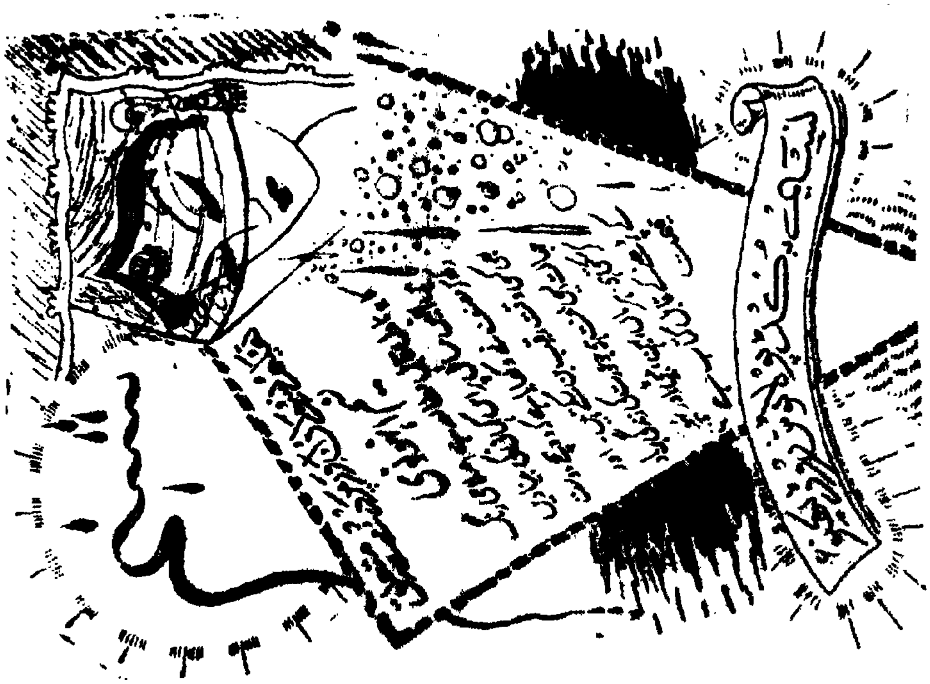
"یہ سب ٹھیک ہے۔ تمہاری محبت پر مجھے کیا شک ہے۔ بھائی!" غضنفر
ان سب کی محبت پر رو دیئے تھے۔! "میں اسے قطعاً تمہارے ساتھ کر دیتا
اسے اپنا ہی سمجھو لو۔ لیکن۔ میں۔ میں اس کے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مجھے تو یہ

سے اتنی محبت نہیں ہے۔ جتنی جمشید سے ہے۔ یہ تین ماں کا ہے۔"

"واہ غضنفر بھائی۔ کیا اس کی ماں میں نہیں ہوں۔" نشاط بولی۔
یہ بھی تو سچ ہے کہ پھر بے چارے دکھیا کا کلیجہ کیسے ٹھنڈا ہوگا؟۔" داور کی
امی نے کہا۔ "خیر۔ یہ تمہارے پاس خوش رہے۔ بس یہی ہمارے لیے کافی ہے۔"
بالآخر روتے دھوتے وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ جمشید کی گریہ وزاری
دیکھی نہ جاتی۔ وہ اپنے ننھے ننھے بازو بڑی بی کی طرف پھیلا کر رو رہا تھا۔ "دادی
دادی۔" پھر نشاط کی طرف مڑتا۔ "ممی ممی۔" اور کبھی رحم طلب انداز میں
داور کو دیکھتا۔ "پاپا۔ پاپا۔ ہم نہیں جاتے۔ ہم نہیں جاتے۔"
خدا کی پناہ۔" داور نے اسے سینے سے کھینچ لیا۔ بڑی بی آہیں بھر اگئیں۔
نشاط سسکتی رہ گئی۔ اور ان سب سے جدا کر کے غضنفر اپنے بچے کو لے کر چلے آئے۔
تیسرے چوتھے روز غضنفر کو خط ملا۔ داور بھی انگولا کے لیے پرواز کر گئے تھے۔
بارشوں کا موسم تھا۔ صبح سے ناگوار ترشح ہو رہا تھا۔ ہر طرف ایک بجھی بجھی
بھیگی اداسی برس رہی تھی!۔ آسمان کے چہرے کو نقاب ابر نے چھپا رکھا
تھا۔! ایسے افسردہ کن گیلے گیلے موسم میں سہ پہر ڈھل جانے کے بعد جب آسمان کی
وسعتوں میں پرواز کرنے والے طیور اپنے پروں سے پانی کے موتی جھٹک رہے
اور خود کو پھر پرواز کے لیے تیار کر رہے تھے۔ غضنفر، جمشید کو گود میں لیے ہوئے گھر
میں داخل ہوئے۔!
صحن ہی میں سیما سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر
انھیں دیکھا۔ اور قبل اس کے کہ کچھ پوچھتی۔ وہ لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے اپنی ماں
کے کمرے میں چلے گئے۔!

The Hareem, Lucknow February 19[illegible] (Phones : 44559, 45335) Regd. No. LW/NP 32

786



THE HAREEM

Mar. 83

Rs. 1.40

ایڈیٹر

گذشتہ ... سال سے ... ہندوستان میں اردو کا ...

یادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر و مالک

نسیم انہونوی

معاون

شوکت جہاں بیگم غزالہ

و

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ چالیس پیسے

قیمت سالانہ منی آرڈر سے ۱۲/- روپیہ

قیمت خصوصی ۱۴/- روپیہ

قیمت ... ۱۶/- روپیہ

وی پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد خرچ ہوتا ہے

۲۵/- روپیہ

نمبر ۳	فہرست مضامین	جلد ...

میک اپ انگریزی لفظ ہے، لیکن آج کل یہ لفظ اتنا عام ہو چکا ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اور کوئی بھی زبان کیوں نہ بولتا ہو "میک اپ" کے معنی ضرور جانتا ہے۔

میک اپ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی چہرے کو جس طرح کا چہرہ چاہے بنا دیا جائے۔ بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانا میک اپ سے بہت آسان ہو گیا ہے۔ میک اپ کالے کو گورا اور گورے کو کالا بنا سکتا ہے۔ حسین کو بدصورت اور بدصورت کو حسین کر دینا دشوار نہیں رہا۔ فلموں میں میک اپ کے کمالات سب ہی دیکھتے ہیں۔ اس سے چہرے کی جھریاں مٹائی جا سکتی ہیں۔ کلین شیو کو داڑھی مونچھوں والا اور گنجے کو بالوں والا بنانا عام بات ہے۔

میک اپ کا رواج اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب یہ اسٹیج اور فلموں کی دنیا سے نکل کر گھروں تک پہنچ گیا ہے اور بیشتر خواتین اس سے مستفید ہونے لگی ہیں۔ چنانچہ اب اکثر گھروں میں میک اپ باکس دیکھے جا سکتے ہیں۔ لڑکوں کو جہیز میں دیگر اشیا کے ساتھ ہی حسین بنانے والا یہ بکس اب عموماً دیا جانے لگا ہے۔ اور اس کا استعمال نئی دلہنیں بھی کرتی ہیں۔ حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عام طور پر دلہنوں کی عمریں ایسی ہوتی ہیں، جن میں حسن افزا اشیا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں تو ان خواتین کے لئے ہوتی ہیں جن کی عمریں ڈھلنے لگی ہوں اور وہ اپنے شوہروں کو خوش رکھنے کے لئے ان کا استعمال کریں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اب حسن افزا اشیا چھوٹی بچیاں بھی استعمال کرتی ہیں کسی شادی کی محفل کا جائزہ لیجئے لڑکیاں آپ کو پاؤڈر، غازہ اور لپ اسٹک لگائے نظر آئیں گی۔

کیا زمانہ تھا جب غیر شادی شدہ لڑکیوں کو بناؤ سنگار تو دور کی بات بھی، بھڑکیلے کپڑے بھی پہننے کی اجازت نہ تھی تاکہ وہ ساری سوسائٹی میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہ بن جائیں۔ آج کے ترقی پسند زمانے میں اسے ایک طرح کا ظلم ہی سمجھا جائے گا لیکن پڑھے لکھے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ اس ظلم میں لڑکیوں کے ساتھ کیسی بھلائیاں شامل تھیں۔ انھیں بری نگاہوں سے بچایا جاتا تھا ـــ اور آج انھیں اس طرح باہر نکالا جاتا ہے کہ جدھر جائیں مبتلا ہیوں کا مرکز بن جائیں اور یہی وجہ ہے کہ گردار بگڑنے لگے ہیں اور مردوں کے لڑکیوں پر جبری حملوں کا شرمناک سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ بے پردگی کے ساتھ ہی زیب و زینت اور دلکشی کے ساتھ نکلنا سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔

آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ابٹن کے سوا کوئی حسن افزا چیز نہ تھی، نہ استعمال کی جاتی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان کو دوسرے طریقوں سے لوٹا۔ تہذیب و تمدن کا بیڑا بھی غرق کر دیا۔ فیشن اور بے پردگی پھیلائی، جسے انگریزی کے رسائل ہوا دیتے رہے اور یہ چیزیں وبائی شکل اختیار کر گئی ہیں اور ان سے نہ صرف یہ کہ ہمارا پاک و صاف معاشرہ دن بدن گندا ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری اقتصادیات کی بھی کمر ٹوٹ رہی ہے۔ گھروں کے اخراجات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک معتدبہ حصہ آمدنی کا ان پر صرف ہو رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و رسائل میں جو اشتہارات آتے ہیں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ان چیزوں میں کوئی اثر ہو یا نہ ہو، وہ فائدہ مند ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے اشتہار جس انداز سے نکلتے ہیں، لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حسن افزا اشیا حسن کو بڑھاتی نہیں بلکہ اس کا ستیاناس کرتی ہیں۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ میرے بچپن میں جو حسن نظر آتا تھا اب وہ بہت گھٹ گیا ہے۔ اس وقت بھی بناؤ سنگار کیا جاتا تھا، اس وقت بھی جلد کی حفاظت اور رنگ روپ کے نکھار کا خیال رکھا جاتا تھا، لیکن اس وقت ہندوستانی مصنوعات استعمال کی جاتی تھیں۔ میں آج بھی دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی خاتون ابٹن کا استعمال کر کے دیکھیں کتنے کم خرچ میں اثرات کتنے معجزنما ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کا استعمال تھوڑی محنت لیتا ہے اور یہ مشہور کریمیں وغیرہ اسی طرح آسانی سے استعمال کر لی جاتی ہیں جس طرح سگریٹ۔ حالانکہ انتہائی مضر ہے۔ اور حقہ تمباکو کے مضر اثرات ختم کر دیتا ہے، لیکن اب حقہ صرف دیہات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں پہلی بار پوری کی تھی۔

قابلِ ستائش اقدام

[illegible]

جرأت مندی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

اقوالِ زریں

[illegible]

[illegible]

کِن حالات میں

مردوں کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے

(از۔ [illegible] الدین احمد خاں)

ہمارے معاشرے میں تعدد ازدواج کے بارے میں بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک مسلمان مرد جب جی چاہے چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔ یہ تصور قرآن مجید کے خلاف ہے۔

بہتر ہے کہ اس مسئلے کو قرآن حکیم کی روشنی میں دیکھا جائے مناسب ہوگا کہ شریعت کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ شرع کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کھل گیا۔ واضح ہو گیا۔ ظاہر ہو گیا اس اعتبار سے الشریع اور الشارع اس کھلے اور واضح راستے کو کہتے ہیں جس پر عام لوگ چل پھر سکیں۔ اسی طرح الشریعۃ اور الشرعۃ بھی سیدھے اور واضح راستے کو کہتے ہیں اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے ایک چیز ہے الدین اور دوسری چیز ہے الشریعۃ الدین۔ ان غیر متبدل اصولوں اور مستقل اقدار کو کہیں گے جو ضابطہ خداوندی کی اساس ہیں۔ اور شریعت ان جزوی اور تفصیلی احکام کو جو ان اصولوں کے تابع وضع کئے جائیں۔ اصول دین ہمیشہ سے ایک رہے ہیں وہ ہر نبی کی وساطت سے ہر قوم کو دیے جاتے رہے ان میں شروع سے آخر تک کوئی فرق نہیں ہوا۔ لیکن الدین پر چلنے کے طور طریقے مختلف زمانوں میں اور مختلف اقوام وملل کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوتے رہے۔ اب جو کچھ قرآن حکیم میں آ گیا ہے خواہ وہ اصول دین ہوں یا احکام وہ سب غیر متبدل ہیں لیکن جن اصولوں کی جزئیات قرآن حکیم نے خود متعین نہیں کیں اور جیسا اللہ نے وضاحت نہیں کیا ان جزئیات کو غیر متبدل رکھنا مقصود نہیں تھا۔ انہیں اسلامی حکومت خود متعین کرے گی انہیں احکام شریعت کہا جائے گا۔

[illegible] احکامات [illegible] قرآن حکیم کی [illegible] ہیں اور [illegible] نہیں ہو سکتے۔ قرآن حکیم میں [illegible] چند احکام [illegible] قانون کی شکل [illegible] گئے ہیں [illegible] اس کے متعلق اصولی ہدایات دی گئی ہیں۔ آیئے دیکھیں تعدد ازدواج کے بارے میں ہمیں قرآن حکیم سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔

قرآن کریم میں وحدت زوج (یعنی ایک وقت میں ایک بیوی) کو اصول بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھئے ۴: ۲۰ یعنی سورہ النساء کی آیت نمبر ۲۰) اگر بیوی سے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اسے طلاق دے کر دوسری بیوی لائی جا سکتی ہے اس کی موجودگی میں نہیں۔ سورہ النساء میں

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ

(اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرو تو پہلی بیوی کا مہر پورا ادا کرو اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لاؤ..... ۴: ۲۰) اس سے بالکل واضح ہے کہ ایک بیوی کی جگہ ہی دوسری بیوی آ سکتی ہے اس کی معیت میں نہیں۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ تم جب جی چاہے ایک بیوی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ۔ طلاق کن صورتوں میں دی جا سکتی ہے ان کے بارے میں قرآن حکیم نے واضح احکام دیئے ہیں ان میں کہیں اجازت نہیں دی گئی کہ تم نئی شادی کرنے کے لئے اپنی سابقہ بیوی کو طلاق دے دو۔ قرآن کی رو سے عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے لیکن اگر کبھی معاشرے میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں (مثلاً جنگ کی وجہ سے) کہ بیوہ عورتوں اور جوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور ان کا اور کوئی اطمینان بخش حل نہ مل سکتا ہو تو اسلامی حکومت وحدت زوج کے اصولی قانون میں استثناء کر کے اس کی اجازت دے سکتی ہے کہ ایک وقت ایک سے زیادہ (چار تک) شادیاں کی جائیں۔ قرآن حکیم نے ان حالات کو خود بتا دیا ہے۔ سورۃ النساء (۴) آیت نمبر ۳ (۴: ۳) میں ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا

قرآن حکیم میں تعدد ازدواج کے متعلق صرف یہی ایک آیت ہے بعض ایسی مشکلات کے حل کے لئے نازل ہوئی تھی جو جنگ [illegible] کے سلسلے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ عہد اسلام کے مسلمانوں کو [illegible] لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں [illegible] بہت سی [illegible] لڑکیاں [illegible] تھا۔ یہ ایک ہنگامی [illegible] اجتماعی حل [illegible] فرد کا [illegible] تھا۔ یہ حل [illegible] قرآن کریم کا [illegible] ایک سے شادی کرنے کا تھا (دیکھئے ۴: ۳)

(۲) مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں نہ مشرکین سے۔ نہ اہل کتاب سے انہیں بہرحال مسلمانوں ہی سے شادی کرنی تھی اور مسلمان مردوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی تھی۔ اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن حکیم نے وحدت زوج (MONOGAMY) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (النساء ۴: ۳) جو اس طرح بے شوہر رہ گئی تھیں (خواہ بیوہ ہو کر اور نا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) حسب پسند ایک سے زیادہ نکاح کر کے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو۔

آیئے اوپر دی گئی ہوئی آیت (۴: ۳) کا تفصیلی جائزہ لیں تاکہ بات صاف ہو جائے۔ اس آیت کے چار ٹکڑے ہیں۔ ان چاروں کا ترجمہ اور مفہوم حسب ذیل ہے۔

(الف) پہلا ٹکڑا ہے وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ عربی زبان میں یتامیٰ کے معنی وہ بچے ہیں جن کے باپ مر جائیں اور وہ جوان عورتیں بھی جو بلا خاوند کے ہوں۔ خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ غیر شادی شدہ جوان لڑکیاں جنہیں خاوند نہ مل سکے ہوں۔ (قرآن حکیم نے یتامی النساء (۴: ۱۲۷) خود انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے مسئلے کا منصفانہ حل نہیں کر سکو گے یعنی جو ان کے تقاضے ہیں انہیں منصفانہ طور پر (جیسا کہ ان کا حق ہے) پورا نہیں کر سکو گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ہنگامی حالت (مثلاً جنگ کے بعد جب جوان مرد بڑی تعداد میں ضائع ہو چکے ہوں) میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور لاوارث جوان عورتیں بغیر شوہروں کے رہ جائیں اس کا کیا علاج کیا جائے۔ اس ہنگامی صورت سے عہدہ برا ہونے کے لئے اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ (تعدد ازدواج یعنی ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر (RELAXATIONS) پیدا کر لے۔

(ب) اب دوسرا ٹکڑا ہے۔ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ان میں سے ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو اور اس طرح انہیں اور ان کی سرپرستی میں ان کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی خاندان کے اندر جذب کر لو۔ یہ اللہ سے منسلک ہے بشرطیکہ اگر دو دو بیویاں رکھنے سے حل ہو جائے تو دو دو کر لو۔ تین تین اور چار چار سے ہو تو چار چار۔

(ج) تیسرا ٹکڑا ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً یہ قرار دیا جا چکا کہ فیصلہ انفرادی طور پر اس کی اجازت بھی ان کے لئے ہے جو بیویوں میں عدل کر سکے۔ اگر عدل نہ کر سکے تو ان ہنگامی حالات کے وہ صرف ایک ہی بیوی رکھے جو عام قانون ہے البتہ غلام اور لونڈی کے سلسلے کو ختم کر دینے کے حکم سے پہلے جو لونڈیاں تمہارے ہاں آ چکی تھیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ عدل کی شرط کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تو طور پر ناممکن ہے کہ تم ہر بیوی کو یکساں چاہو۔ ایسا عدل تم کر ہی نہ سکو گے خواہ تم کتنا ہی چاہو (۴: ۱۲۹) لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نہ ہو کہ تم بالکل ایک ہی کی طرف جھک جاؤ اور دوسری کو ادھر لٹکی ہوئی چھوڑ دو۔ (۴: ۱۲۹)

(د) چوتھا ٹکڑا ہے۔ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (۴: ۳) تَعُولُوا کے معنی بے انصافی کے بھی ہوتے ہیں اور عیال داری کے نیچے دب جانے کے بھی ہیں۔ لہٰذا قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ اگر تم عدل نہ کر سکو تو ایک بیوی والے قانون پر کاربند رہو۔ تو اس سے ایک مقصد تو یہ کہ تم ناانصافی نہ کر سکو اور دوسرے یہ بھی کہ تم عیال داری کے بوجھ تلے دب نہ جاؤ کہ دو خاندانوں کی پرورش ہی نہ کر سکو۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے قانون ایک ایک ہی بیوی کا ہے ایک سے زائد بیویوں کی اجازت عدل عمرانی کے پیش نظر دی گئی تھی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب قرآن حکیم نے ایک اجازت کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تو اس شرط کی عدم موجودگی میں اجازت باقی ہی نہیں رہ سکتی لہٰذا جہاں یتامیٰ (بے شوہر عورتیں، یتیم بچے سب شامل ہیں) کی حفاظت کا سوال درپیش نہ ہو وہاں قرآن کی رو سے تعداد ازدواج کی اجازت ہی نہیں۔ اس لئے اس کا عمل قرار دینا ضروری ہے یہی موجودہ عائلی قوانین کا مقصد ہے۔ رہے یہ کہ حفاظت یتامیٰ کا سوال اجتماعی ہو گا یعنی ملک میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بے شوہر عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلے کا کوئی حل تو اس وقت مملکت کو اس کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازدواج کی صورت ناگزیر ہو گئی ہے لیکن یہاں ہو یہ رہا ہے کہ عدل کی شرط کو تو ہر شخص انفرادی طور پر اٹھاتا ہے لیکن (یعنی یتیم لڑکیوں اور بے شوہر عورتوں کا مسئلہ) کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا اور چار بیویوں تک کی اجازت کو تمام حالات میں عام

نعت رسول

[illegible]

مقام اشاعت [illegible]

طابع کا نام [illegible]

قومیت [illegible]

پتہ [illegible]

ناشر کا نام [illegible]

قومیت [illegible]

[illegible]

ایک بات

[illegible]

نول محبت

ذکیہ بلگرامی

سائنس نت نئی اور بہوؤں کے تعلقات پر صدہا افسانے شائع ہو چکے
کا بحث طرنا آوییں رنجش اور چپقلش ہوا کرتی ہے لیکن بین ذکیہ صاحبہ
سا نہ ایک ایسے گھر کی عکاسی کرتا ہے جہاں کی فضا ان روایتی
ن کے برخلاف بے حد خوش گوار اور پر محبت ہے ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی
یاد نہ ہو لیکن کاش ایسے گھرانے ہو سکتے۔

(ادارہ)

ف۔ اللہ آج تو بہت تھک گئی ہیں۔

ثریا نے پلنگ پلنگ پر بیٹھ اور کرسی پر سر ٹکا کر آنکھیں موند کر
یا۔

عذرا نے بھابی جان کو یوں نڈھال دیکھا تو لپک کر قریب پہنچ
ارے اللہ بھابی کیا ہوا آپ کو؟ کیا طبیعت خراب ہو گئی۔۔

نہیں عذرا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے بس بہت تھک گئی ہوں آج۔
... چیک کرتے کرتے سر بھاری ہو گیا۔

تو ابھی گرم گرم چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ ہاتھ منہ دھو لیجئے۔
عذرا کہتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ابھی عذرا نکلی تھی کہ عابدہ دوڑتی ہوئی آئی۔ باجی تیاری ہی
ہے ... بھول ... دن آپ کا سر۔

... بہت ... بھی تھک گئی تھی ابھی ہاتھ
... گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ثریا نے پیار
مسکراہٹ سے کہا۔

[illegible]

امی جان۔ اس وقت مجھے بھوک نہیں ہے جلدی کھا لوں گی۔
ثریا نے نرمی سے جواب دیا۔

" اچھا تم لیٹ کر آرام کرو۔ عارف اٹھے گا تو عذرا اور عابدہ
دیکھ لیں گی۔" امی جان نے کہا اور واپس لوٹ گئیں۔

" اف کس قدر خیال ہے ان سب کو میرا۔" ثریا نے دل ہی دل
میں سوچا۔ " ذرا سا سر میں درد ہی تو ہو گیا تھا۔ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی
مگر یہ سب کیسے پریشان ہو گئے۔ میں بھی کتنی خوش نصیب ہوں ایسے
گھر میں آئی جہاں محبت کرنے والا شوہر۔ جان چھڑکنے والی دو پیاری
سی نندیں ۔۔ اور محبت نچھاور کرنے والی ساس ہے۔ میں تو اپنی ماں
کی محبت کو بھول گئی یہاں آ کر۔"

ثریا نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔۔

ثریا کی طبیعت میں خلوص تھا، محبت تھی۔ قسمت سے اسے ایسا ہی
گھرانہ مل گیا تھا جہاں سب ایک دوسرے کے لئے جان چھڑکنے کو
ہر وقت تیار رہتے تھے۔

ثریا تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ
تھا۔ تینوں بھائی اچھی پوسٹ پر لگے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی کی شادی
ہو چکی تھی ماں باپ دونوں زندہ تھے۔ ہر طرح کا سکھ اور چین تھا۔
ثریا نے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا تو اسے جلد ہی ایک اسکول میں
جگہ مل گئی۔ اب گھر والوں کو اس کے بیاہ کی فکر تھی۔ ثریا کے گھر والے
بہت شریف لوگ تھے وہ آج کل کی طرح دولت کو دیکھنے والوں میں
سے نہیں تھے انہیں مخلص گھرانے کے شریف لڑکے کی تلاش تھی چنانچہ
بہت جلد ہی ثریا کی قسمت سے راشد کا رشتہ آ گیا۔

راشد کے خاندان سے ثریا کے گھر والے واقف تھے کیونکہ
گھروں میں آنا جانا نہ تھا مگر راشد کے باپ دادا کی روایات ان
لوگوں کے سامنے تھیں۔ راشد نے بی کام کیا تھا۔ ایک کمپنی میں
ملازم تھا اس کی تنخواہ صرف بارہ سو روپے تھی مگر وہ خوش شکل،
صحت مند اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر بھی تھا جو اس کے
مرحوم والد نے بنوایا تھا۔ گھر میں ان کے علاوہ دو چھوٹی بہنیں تھیں سب
کے سب اچھے اخلاق والے مخلص لوگ تھے۔ ثریا کی ماں نے رشتے
منظور کر لیا۔ خاندان میں جس نے سنا اس رشتے کو بہترین ... کہا
سب کا ایک ہی خیال تھا۔ ثریا ... اور ... حقیقت کا انسان

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو جانے [illegible]

[illegible]

[illegible] ثریا [illegible]

[illegible]

[illegible] ہر طرح گھر کے اخراجات سنبھال رکھے گی۔

اس کے بعد اس نے گھر کے [illegible]

[illegible] کبھی کا [illegible] اٹھانے لگے ہیں کبھی وقت بہتری سے

[illegible] رہی ہے۔

[illegible] تو وہ پریشان ہو اٹھتا ہے ۔۔۔ دادا امی جان

[illegible] گھر نہیں ہے؟

[illegible] وہ [illegible] ہو جاتی۔

[illegible] مخلص اور محبت کرنے والی بہو کے لئے ان کے دل سے

[illegible] نکلتیں۔

ثریا اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ گھر پر اٹھانے لگی اور گھر کی

[illegible] رکھتی [illegible] شاید وہ [illegible]

[illegible] ثریا کے دل کو اطمینان کی روشنی ملا کر

[illegible] کے علاوہ [illegible] شوہر کے گھر والوں کا [illegible] سکھ

[illegible] ہے۔

[illegible] کے [illegible] ثریا کی [illegible] خواب سجے

[illegible] کے

[illegible] گئے۔

[illegible]

[illegible]

کہ [illegible] اس بات سے [illegible] اچھا لگا [illegible]

[illegible] اس کا دل خوشی اور [illegible] سے بھر گیا۔

پھر اس نے اپنی محنت کی بدولت ایک [illegible]

بچے کی ماں بن گئی۔ عادت کے آ جانے سے [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible]

بھی اضافہ ہو گیا مگر ثریا کو ان باتوں کی کیا پرواہ تھی [illegible]

تنخواہ کے علاوہ ثریا کی تنخواہ بھی تھی اور دونوں کی رقم ملا کر [illegible]

سے گزارہ کر لیتے تھے آہستہ آہستہ [illegible] مگر [illegible]

تھا تعلیم کا کوئی خرچہ نہ تھا اس وجہ سے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا اور اب عادت ایک سال کا ہو گیا تھا۔ ثریا کی شادی کو تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ گھر میں [illegible] خوشحالی اور خلوص تھا۔

[illegible] اسے پہلے سے زیادہ چاہنے لگے تھے۔ امی جان اس کا زیادہ خیال کرنے لگی تھیں اور عذرا اور عابدہ تو جیسے اس کی بہنیں جیسی بن چکی تھیں وہ اب بھی ثریا کو زیادہ سے زیادہ [illegible] کی کوشش کرتیں۔

ثریا کے گھر والے جب ثریا کو اس طرح خوش دیکھتے تو انہیں بھی سکون ملتا۔

ایک دن ثریا اسکول سے واپس آئی تو گھر میں اس کی ایک پرانی دوست [illegible] ثریا کے گھر کا پتہ [illegible] گیا تھا اور وہ اپنی دوست سے ملنے آئی ہوئی تھی۔

ان دونوں نے اسکول اور کالج کی تعلیم ایک ساتھ حاصل کی تھی۔ ثریا نے بی اے کرنے کے بعد [illegible] اور [illegible] کے ساتھ [illegible] چلی گئی تھی اس کے بعد سے پھر ان دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی تھی اور اب اچانک چار سال بعد وہ دونوں مل رہی تھیں۔ ثریا کا جوش [illegible] تھا۔

"تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" ثریا نے خوش [illegible] ہوئے کہا۔

[illegible] تمہارے گھر [illegible]

[illegible]

[illegible]

"اچھا تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔" ثریا نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے اور نفیس ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی گھر والی بن گئی ہوں۔"

"اچھا مبارک ہو۔ کب ہوئی شادی؟"

"ایک سال ہوا ہے۔"

"کوئی بچہ؟"

"نہیں بھئی۔ ابھی سے یہ جھنجھٹ پالنے کے حق میں نہیں ہیں ہم لوگ۔"

ثریا خاموش ہو گئی۔ اسے شہلا کی یہ بات عجیب لگی تھی۔ اتنے میں عذرا چائے لے آئی۔

"مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔" ثریا نے کہا "پہلے کھانا کھا لیں پھر چائے پی جائے گی۔"

"میں نے بھی کھانے کے لئے پوچھا تھا آپ کی دوست نے کھانا ہی کھانے سے منع کر دیا۔"

"کیوں شہلا میرے گھر میں تکلف؟" ثریا نے [illegible] پوچھا۔

"ارے نہیں ثریا تم سے کیا تکلف۔ میں کھا کر گھر سے نکلی تھی۔ بس چائے ضرور پیوں گی۔"

ثریا ایک پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا نکال کر [illegible] اس کے [illegible] چائے پی گئی۔

عذرا اور عابدہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

اچانک عذرا نے ثریا سے پوچھا۔

"یہ بنڈل کیسا ہے بھابی کیا خرید لائی ہیں بازار سے؟"

"ہاں تم لوگوں کا جہیز ہو سکتا ہے۔" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کپڑے ہیں۔ تم سب کے کپڑے وغیرہ ہوں گے؟"

"نہیں [illegible] عابدہ۔ اس بنڈل میں کیا ہے؟"

ثریا نے عابدہ کی طرف [illegible] پوچھا۔

"آپ ہی بتا دیجئے"

"تم کھول کے دیکھو" ثریا نے کہا۔ "اچھا [illegible]"

امی جان سے پوچھئے [illegible]

ثریا جلدی سے کمرے سے نکلی اور آواز دی

"امی جان۔ امی جان۔"

"امی جان جلدی سے ڈرائنگ روم میں آئیے۔ بات ہے دلہن۔"

"آ رہی۔" عابدہ اور عذرا دونوں آ گئیں۔ "آپ اس بنڈل میں کیا ہے؟"

"ارے ہو گا کیا تم پھر اٹھا لائی ہو گی الٹی سیدھی ساڑیاں سوٹ وغیرہ۔ کیا ضرورت کیا ہے سب پیسے ختم کرو۔"

"امی جان رہنے دیجئے" ثریا نے ہنس کر کہا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔ سلے سلائے ہیں۔ ایک عابدہ کا دوسرا عذرا کا اور ایک سفید ساڑی آپ کے لئے۔" یہ کہہ کر ثریا نے بنڈل کھول دیا۔

"ہائے اللہ اتنا پیارا سوٹ۔" عابدہ خوشی سے

"واللہ بھابی آپ کتنا خیال کرتی ہیں ہم لوگوں کا" نئے سوٹ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

امی جان نے بھی اٹھا کر ساڑی دیکھی۔

"یہ تو بہت اچھی ہے۔ نرم۔ مگر دلہن......"

"بس امی جان آپ کچھ نہ کہیں۔ یہ میری اپنی خوشی ہے۔ کسی نے کہا تو نہ تھا مجھ سے۔"

"مگر یہ تو بتاؤ تم اپنے لئے کیا لائیں؟" امی جان نے

"اپنے لئے آ گئے ہیں۔" ثریا نے امی جان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

شہلا حیرت کی تصویر بنی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر میں لوگ اتنی محبت سے بھی رہتے ہوں گے۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں [illegible] کہ ثریا، عذرا اور عابدہ ایک دوسرے کی بہنوں کی مانند ہیں اور امی جان ثریا کو [illegible]

پھر امی جان، عذرا اور عابدہ [illegible] دونوں سہیلیاں اکیلی رہ گئیں۔

ثریا نے اپنے شوہر کے متعلق [illegible]

"تمہارے شوہر کیسے ہیں کیا کرتے ہیں؟"

"پانچ ہزار ماہانہ ملتے ہیں بس ٹھیک ٹھاک کما لیتے ہیں۔"

"پھر تو ان کی بہت تنخواہ ہو گی شہلا اور کون کون ہے ان کے گھر؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

"کیا مطلب تمہارے شوہر تنہا ہیں دنیا میں؟"

"نہیں سب ہیں۔ ماں باپ بہن بھائی مگر ہم نے ان سب کے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اس وجہ سے الگ ہو گئے۔"

"لیکن کیوں شہلا" ثریا متعجب تھی۔

"الگ رہنے سے تعلقات بہتر رہتے ہیں ایک ساتھ رہنے میں ہزار جھگڑے ہیں اب تمہیں کیا تفصیل بتاؤں۔"

"لیکن میں تو اپنے سسرال والوں کے ساتھ بہت خوش ہوں۔"

"تمہاری بات دوسری ہے۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" ثریا نے نہ سمجھتے ہوئے کہا

"تم گاؤدی ہو اور تمہارے میاں کی تنخواہ معمولی وہ لوگ تمہاری قدر کیوں نہ کریں گے۔" شہلا نے پر اسرار مسکراہٹ سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں شہلا تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ان لوگوں نے کبھی میرے پیسے کو ہاتھ نہ لگایا بس خود ہی ہمیشہ خیال کر کے خرچ کرتی رہتی ہوں۔"

"تم بہت بھولی ہو ثریا۔ کیا تم سمجھتی ہو یہ سب واقعی تمہیں چاہتے ہیں؟ کبھی کوئی ساس اپنی بہو کو بیٹی نہیں سمجھتی ورنہ تم نے کیا سمجھا کہ یہ سب تمہاری نوکری کی تنخواہ کی خاطر ہے جو سب تمہارے آگے پیچھے پھرتے ہیں — ثریا میں نے بہت دنیا دیکھی ہے ایک گھنٹے میں تمہارے گھر میں آ کر میں نے تمہارے تمام حالات کا اندازہ لگا لیا۔ تمہارے شوہر کی معمولی تنخواہ، تمہاری فراخ دلی جس کا [illegible] اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جن کا ذکر تمہارے [illegible] [illegible] [illegible] کا جائے۔

"اور عذرا کے لئے شہلا خاموش ہو جاؤ۔ میں اپنے [illegible] کے خلاف ایک حرف سننا پسند نہیں کرتی۔"

"ٹھیک ہے جب خاموش ہوئی جاتی ہوں۔ تم جاؤ کام خرچ کرو اپنی سب رقم۔ جب ضرورت پڑے تو [illegible] مجھ سے کہنا۔"

"خیر چھوڑو اس ٹاپک کو۔ کوئی اور بات کرو۔" [illegible] نے بے زاری سے کہا۔

شہلا کے چہرے پر عجیب و غریب مسکراہٹ بکھر گئی اور پھر وہ اپنی امیرانہ زندگی کے قصے بڑھا چڑھا کر سناتی رہی۔

"ناصر کو پانچ ہزار تنخواہ ملتی ہے سب کے سب میرے ہاتھ لا کر رکھتے ہیں پلٹ کر نہیں پوچھتے کہاں خرچ کی خوب ٹھاٹ سے [illegible] ہیں۔ جب تک ساس کے گھر تھی مصیبت میں پھنسی رہی۔ سب تنخواہ انہیں لوگوں پر خرچ ہو جاتی تھی۔"

ثریا کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا، شہلا ان چار برسوں میں اور شاید شادی کے بعد زیادہ بدل گئی ہے رہن سہن کے لحاظ سے خلوص رخصت ہو چکا تھا اس نے غیر ضروری طور پر بہت زیادہ میک اپ کر رکھا تھا اور ساری پہن کر آئی تھی گویا اپنی امیری کا رعب ڈالنا چاہ رہی ہو۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر شہلا اپنی کار خود ڈرائیو کرتی ہوئی چلی گئی اور آئندہ اپنے شوہر کے ساتھ آنے کا وعدہ کر گئی اور ثریا کو بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی۔ شہلا کے جانے سے ثریا کو بھی ایسا محسوس ہوا گویا سر سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا۔

شہلا کے جاتے ہی عذرا اور عابدہ بھاگ کر بھابھی کے پاس آ گئیں۔ شاید انہیں کچھ تجسس تھا شہلا کے بارے میں۔

ثریا نے مختصر طور پر ان لوگوں کے [illegible] بتا دیا

"شہلا تو بہت بدل گئی ہے پہلے تو اچھی بھلی ہوا کرتی تھی"

"بھابی ان کا میک اپ اور بات کرنے کا انداز مجھے کچھ عجیب سی لگیں وہ۔" عذرا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"خیر ہو گا ہمیں کیا ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔" ثریا نے کہا اور عابدہ کو شام کے کھانے کے لئے کہتی چلی گئی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... تک رہی تھی ...

[illegible]

• [illegible] ایک بار [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... ہوگئی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

... تھے بھی گزرنے لگی تھی۔

• وہ اب [illegible] ہے اسکول [illegible]

بہت تنگ کی [illegible] اب [illegible]

• ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔ ویسے تم [illegible]

اپنا اسکول کبھی نہیں چھوڑ سکتیں۔ بہت دنوں پھر [illegible]

ہے میرا دل بہل جاتا ہے وغیرہ وغیرہ

• ہاں مگر اب تو چھوڑ دوں گی۔ [illegible]

بہت ضروری ہے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔

راشد نے محسوس کیا کہ ثریا نے اتنی بہت باتیں کرنے کے باوجود ایک بار بھی شاہد [illegible] وہ جھوٹ بول رہی ہے [illegible] نہیں [illegible] لیکن آخر ثریا نے ایسا کیوں کیا؟

اس پوری بات چیت کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ہے کوئی سبب ہے [illegible] بات کہہ جانے اور غلط [illegible] کرنے کا وہ [illegible] شروع [illegible]

چنانچہ اس نے پیار سے ثریا کو [illegible] پوچھ لیا۔

• یہ تم نے اچھا ہی کیا ثریا کہ اسکول چھوڑ دیا [illegible] کی ضرورت ہے۔ اب تو [illegible] ہمارے یہاں ایک [illegible] جائے گا۔ تم کس طرح [illegible] اسکول کی [illegible] تا [illegible] خوش [illegible] ہم سب بھی خوش رہیں گے۔

اپنے شوہر کے منہ سے اس قسم کی باتیں سن کر اسے تعجب بھی ہوا [illegible] بھی [illegible] ندامت بھی کہ اس نے اتنے [illegible] سے جھوٹ بولا ہے۔

مگر ابھی تو دوسرے [illegible] کا [illegible] دیکھنا تھا [illegible] پھر بھی۔

• لیکن [illegible] کا خرچ کیسے چلے گا [illegible] ثریا نے [illegible] پوچھ لیا۔

• [illegible]

[illegible]

[illegible]

گم کہاں؟

وہ ہر روز کی طرح شام سے بے حد اداس تھا کہ [illegible] سو گئے تو ثریا کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اس نے مڑ کے سوتے ہوئے راشد کی طرف دیکھا ـــــ کس قدر معصوم سے پاک فرشتوں جیسا چہرہ کیا اس قابل تھا کہ اس سے محبت نہ کی جائے، مگر اب تو [illegible]

نصیبوں کی بات ہے اور اس نے [illegible] سمجھا لیا تھا۔

دوسری صبح [illegible] اس کے دل پر جو [illegible] گزر رہا تھا ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی ہشاش بشاش اور خوش و خرم تھی۔

ناشتے کے بعد [illegible] نے گھر میں اعلان کیا۔

"امی جان، عذرا، عابدہ، سب لوگ آ جائیں ڈرائنگ روم میں، مجھے آپ سب سے باتیں کرنی ہیں"

"کیا بات ہے؟ امی جان مسکراتی ہوئی آن بیٹھیں۔

"کیا بات ہے بھائی جان" عذرا اور عابدہ بھی کام چھوڑ کر بھائی جان کے پاس آ گئیں۔

"آپ سب لوگ بیٹھیں تو سہی" راشد نے کہا۔

سب بیٹھ گئے۔ ثریا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ خدا معلوم راشد کیا کہیں اور ان کے جواب میں کیا کہنا پڑے۔

"امی جان، ایک خوش خبری ہے۔ ثریا نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی ہے اب یہ گھر پر رہیں گی"

"ہائے اللہ سچ بھائی جان" عذرا نے خوش ہو کر کہا۔ "اب تو بھابی گھر پر رہیں گی تو مزہ آئے گا، ہم سارا دن بیٹھ کر باتیں کریں گے"

"اچھا ہوا بیٹا۔ بہت ہی اچھا کیا تم نے" امی جان [illegible] عذرا اور عابدہ [illegible] کے خوشی دیکھنے۔ وہ بولیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۔۔۔ لیکن بہرام کرنے پر اصرار ہی کر رہی تھیں کہ وہ مستقل وہیں پیدا ہو جائیں گی۔ پانچ یا چھ سال تو مزے سے کٹ جائیں گے۔

"اس بات کی تو مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ دلہن سے سامنے وہ امی جان کا نام لکھا۔ ثریا شکر گزار ہو گئی۔

"جی بیٹے کیا اعتراض ہو سکتا ہے" ثریا نے شستہ آواز نکالی۔

"میری اچھی بھابی میری پیاری بھابی" عابدہ نے جو لپٹ کر شروع کی تو عذرا بھی ان کے اور اور سے لگانے شروع کر دیئے۔

ثریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

اب سوچنے کو کیا رہ گیا تھا جبکہ وہ پہلے ہی چھوٹی تھی، چنانچہ اسکول جانا بند تھا۔

دراصل یہ بات گھر والے پہلے ہی سوچ چکے تھے کہ دوسرے بچے کے بعد اور آئندہ ثریا کے لئے سروس کرنا مشکل ہو گا تو آمد کا کوئی بندوبست کر کے اس سے کہا جائے کہ وہ سروس چھوڑ دے، چنانچہ اس وقت کی بات کسی کے لئے اچنبھے کا باعث نہ بنی۔

ثریا کو گھر بیٹھے ایک ہفتہ گزر گیا۔

امی جان کی محبت اپنی جگہ تھی

عابدہ اور عذرا اسی طرح اس پر نثار ہوتی تھیں اور راشد تو تھا ہی اس کا دیوانہ۔

اسے رہ رہ کر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے پہلے کی باتوں کو دل میں کیوں جگہ دی۔

گو اسے دو روپے کا نقصان بھی ہے۔ آج کل ایک ملازم ہو کر کمائی کی اتنی ضرورت ہے چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے بچے والا ہو اور ایک نے گھر کو اپنے سر لے لیا۔

ثریا کی کمائی کی کوئی بہت زیادہ ضرورت نہ تھی [illegible]

[illegible] ان کے بازو عذرا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

... ہر روز ... اگر تم

... جائے گی۔

دوسرے بچوں کے ... جائے گی تو شاید وہ

... بہت بڑا ... رہی ہوں

... کر جائے گا۔

ثریا ... سے ... تو وہ

ایسی لگ رہی تھی جیسے ... اب وہ ... بتانے کا اس

نے جھوٹ بولا تھا۔

آج ... کل ثریا اسکول جا رہی تھی ...

... نے ایک ... راشدہ سے کہا: "راشدہ

میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"... نے جھوٹ بولا تھا۔"

... راشدہ ...

... بہت ... میں بہت بڑا ...

[illegible]

کرتا ہو تو ہوتا ہے ۔۔۔ راشدہ ... بات ہو سکے تو

... نہیں جا رہا ہے اگر تیرا گھر ... تو اب

دینا۔"

اس کے بعد ... اسے سمجھا دیا۔

"راشدہ جانتی تھی کہ جھوٹ بولا ہے ... بات

نہیں کر سکتی۔ اب میں ... عابدہ کے سامنے ...

کے قابل نہیں رہی وہ مجھے کیا کہیں گی۔ راشدہ۔"

راشدہ نے مسکراتے ہوئے ثریا کو اپنی گود میں بٹھا کر

کہا۔ "ثریا جو لوگ محبت کرتے ہیں ... وہ

غلطی کرتے ہیں۔ محبت اور خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ...

انمول چیزیں ہیں اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ...

... تمہارا یہ جھوٹ اب ... بدل جائے ...

... عابدہ ... جان ... کچھ نہ کہیں گی۔"

"لیکن راشدہ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ... بات ...

تمہاری ... جب تم گھر سے نہیں نکل سکو گی ثریا

سوچو تمہارے بچے ہوں گے۔ انہیں تمہاری ... ضرورت

ہوگی۔ راشدہ ...

... کہ کون سی چیز ہے۔"

"آپ شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میں کل ...

کر دوں گی۔"

دوسرے دن ثریا اسکول جا کر ... آ گئی۔

... عابدہ ... معلوم ہو سکا۔

... جب ... آباد ...

... ثریا ... کی عزت ...

... کے ... دوسرے بچے کے ...

... ہے۔

[illegible]

غلط فہمی

[illegible]

اسے دھکیل دیا۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ [illegible] وہ اپنے [illegible]

[illegible] وہ ایک [illegible] [illegible]

[illegible] ذات سے وہ کسی [illegible]

[illegible]

۔۔۔۔ اب آرام کیجئے نا؟

[illegible]

[illegible]

جیون ساتھی

محمد [illegible] بہاری

[illegible]

پڑھنے لگے تھے [illegible] جیون ساتھی کی تلاش [illegible] ماں باپ [illegible] انھوں نے کئی اچھی لڑکیاں اپنے صاحبزادے کے لئے [illegible] صاحبزادے نے [illegible] کہ وہ اپنا جیون ساتھی خود تلاش کریں گے اور آخر میں انھوں نے اپنے ساتھ [illegible] ایک لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے فیصلے کی اطلاع ماں باپ کو دے دی۔

ماں باپ کی نظر میں اس لڑکی سے کہیں زیادہ اچھی لڑکیاں تھیں لیکن جب لڑکے نے خود ہی اپنے لئے لڑکی پسند کر لی تو انھیں رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔ لڑکی کے ماں باپ کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ [illegible] تاریخ مقرر ہوئی اور شادی ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے اور [illegible] گھر کی گاڑی چلانے لگے۔

ایک دن دونوں میاں بیوی [illegible] ان کے ایک دوست آ گئے [illegible]

[illegible]

قوم

شوکت تھانوی

قوم کے متعلق سے میں کیا عرض کروں، یوں ہی مطلب یہ کہ ہمارے بزرگوں میں ایک صاحب بندر نچاتے تھے مگر اس فن کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ بڑے بڑے مداری ان کا نام لے کر ڈگڈگی بجایا کرتے تھے اور مجیب صاحب جنت مکانی خداوند کریم نے ان کو عطا فرمائی تھی کہ کیا ہی جو وقت تھا ہر وقت بندر کی ماں نچا دیتے۔ چار بجے دن میں ان کی ڈگڈگی ... [illegible] ... آئینہ دکھانا اور پھر بندر سے پوچھ کر ... [illegible] ... دادا جان کی ... [illegible] ... سے بندر ... ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے لیے آیا کرتے تھے اور وہ بندر جوڑ ... [illegible] ... بندر والوں سے ... [illegible] ... ان بندروں کو ... [illegible] ... بزرگ ... [illegible] ... تھے یہ بزرگ ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible] ...

[illegible]

ایک دفعہ ... [illegible] ... کہ کچھ ہو نہ سکی۔ ... [illegible] ... گھنٹی بجنے لگی ... [illegible] ... آپ صاحب آنکھیں لگائے سر پر ... [illegible] ... کی تصویر جس کے متعلق وہ نہایت عبرت انگیز انداز سے فرمایا کرتی تھیں کہ یہ پسند کا بی بی فاطمہ کی شریفوں نے چھوڑ دی۔ ڈومنی، چماروں نے پیروں میں لگائی۔ مہندی کی لالی لگی۔ پھر ان کی باس اڑ گئی۔

ایک تصویر تھی معنی دے کی۔ جی ہاں وٹا۔ یہی لڑکی وہ وٹا جس سے ہم آپ سب ... منہ دھوتے ہیں مگر آج تک کسی کو یہ خیال نہ پیدا ہوا ... کی تصویر بھی کھنچوائیں جس وقت یہ لوٹے ... آتا وہ نہایت ... سے فرماتی تھیں۔ یہ وٹا امام حسین کا کربلا میں قطرے قطرے کو ترسے ... قطرے قطرے کا حساب دے ... قطرے قطرے کا حساب ... کربلا میں پانی نہ پایا۔ جنت میں کوثر بہایا۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی ... اس کتاب میں جو اب تک ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔

بس یہ ذرا سی کروٹ ہمارے خاندان میں چل آ رہی ہے اور قوم کی قسم کے بزرگوں کی وجہ سے ذرا گڑ بڑ ہو گئی ہے ورنہ بعد میں تو ... نے بڑی ترقی کی۔ ہمارے دادا جان رحمۃ اللہ علیہ ایک انگریز نے بندر ... کیا۔ یہ انگریز بندر پکڑ کر ... بھجوایا کرتا تھا ... آتے ہوا کرتا تھا کچھ دنوں کے بعد تو ایک روپیہ ... مقرر ہو گیا ... ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دادا جان ہر روز دس پندرہ ... دس پندرہ روپے کما لیا کرتے۔ آدمی تھے سمجھ بوجھ کے ... چنانچہ ترکیب کچھ میں آ گئی اور دوسرے عزیزوں کو بھی اس کام پر لگا دیا ... بندر پکڑ لاتے آپ اس کو چار آنے فی بندر کے حساب سے ... کر دیں اور انگریز سے ایک روپیہ فی بندر وصول کریں اب تو کبھی ... کی آمدنی ہو گئی یہاں تک کہ اس انگریز نے ان کو ٹھیکہ دے دیا ... چلا گیا۔ دادا جان کو اس کام میں اللہ نے اتنی ترقی دی کہ دو تین سال کے بعد ... ہو چکے تھے۔ ... صاحب کو خاندانی ... سے ... [illegible] ... دادا جان کے ... بعد ... صاحب نے بندروں کا کاروبار ترک کر دیا اور ... [illegible] ... اس کے ... [illegible] ... ایک بہت ... [illegible] ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر اگر ناظرہ تمہارے یہاں:

ناہید نے کہا۔ جی ہاں۔

ہم نے کہا۔ جی ہاں کے بعد بھی تو کچھ ہوتا ہے:

ناہید نے کہا۔ ۔ ۔ اور کیا کہوں میں آپ سے [illegible]

[illegible]

ہم نے کہا۔ [illegible]

[illegible]

ناہید نے کہا۔ [illegible]

[illegible]

ہم نے کہا۔ [illegible]

ناہید نے کہا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

ناہید نے کہا۔ [illegible]

[illegible]

لکیریں مٹ گئیں [illegible]

[illegible]

ارام اپنے خوبصورت ہاتھ کا پنجہ پھیلائے ان کی لکیروں کو [illegible]
دیکھ رہی تھیں۔

یہ لکیریں ہیں ـــــ ان گنت لکیریں ـــــ بے مقصد [illegible]
[illegible] نے ان ہاتھوں کی لکیروں [illegible]
[illegible] ـــــ ان لکیروں کو
پڑھنا بھی [illegible] ہے [illegible]
لکیریں بھی تو لکیریں ہیں [illegible]
[illegible] بے مقصد سی لگتی ہیں۔

[illegible]
اور وہ لکیریں بھی [illegible] ہے۔

ارام نے اپنے [illegible]
[illegible]

ان ہاتھوں کی لکیروں [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

"ادب کیجئے — آپ نے اتنی دیر میں میرے ہاتھوں کی لکیروں سے کیا حاصل کیا۔"

"بہت کچھ حاصل ہوا۔"

"تو پھر کہئے —۔"

"سنجیدہ ہو جاؤ تو میں بتاؤں۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں جلدی کہئے۔"

"تم ایک سنجیدہ دماغ رکھنے والی شوخ طبیعت کی لڑکی ہو — کیوں —۔"

"اور کہئے —" ارم بالکل سنجیدہ تھی۔

"اپنے سینے میں ہمدرد دل رکھتی ہو اور تمہیں غصہ بہت آتا ہے —۔"

"یہ سب تو بظاہر باتیں ہیں — کچھ اور کہئے۔"

"لاؤ پھر سے میں تمہارا ہاتھ دیکھوں۔" ارم نے دوبارہ ہاتھ ندیم کے سامنے کر دیا۔

"لمبی حیات ہے تمہاری۔"

"اور —؟"

"جب تمہاری عمر تیس سال کی ہو گی تو تم ایک بار سخت بیمار پڑو گی۔"

"اور —"

"ابھی تمہاری عمر کیا ہے؟"

"یہی کوئی انیس بیس سال —" ارم نے چہک کر جواب دیا۔

"آنے والے دس برسوں میں تمہارے ساتھ ایک ایسا حادثہ ہو گا جو تمہارے دل کو چھو لے گا۔"

"[illegible] Very Sad ندیم بھائی۔" ندیم ہنسنے لگا۔

"اور ایک بات ہے وہ میں پھر کبھی بتاؤں گا۔"

"کیوں [illegible] اور کہیں گے ان سے؟"

"بات [illegible] ایسی ہے۔"

[illegible]

"تمہارے ہاتھوں کی لکیریں کہتی ہیں کہ تمہاری شادی اس شخص سے ہو گی جسے تم پسند کرو گی۔"

"سچ ندیم بھائی۔" ارم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"بہت خوش ہو۔ اگر کسی چڑیمار کو پسند کر لیا تو ہمارے خاندان کی عزت کہاں جائے گی۔"

"آپ فکر میں کیوں دبلے ہو رہے ہیں۔"

"مجھے اگر بتاؤ گی تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ" — ارم نے ہاتھ ہٹا لیا۔

ندیم نے اپنے فرصت کے لمحوں کو پامسٹری کی کتابیں پڑھنے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ جب بھی اسے فرصت ہوتی وہ یہی کرتا۔ اس نے باقاعدہ اپنے کمرے میں ان کتابوں کی لائبریری بنا رکھی تھی اور خاندان بھر کے جوان بچے بوڑھے سبھوں کے ہاتھ دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی ندیم کی کہی ہوئی باتیں اتنی سچی ہو جاتی تھیں کہ سب کو اس کے اس مشغلے پر تعجب سا ہونے لگتا تھا — وہ صرف ایک بار ہی نہیں جانے ایک ہاتھ کو کتنی کتنی بار پڑھا کرتا تھا کیونکہ ندیم کا کہنا تھا کہ لکیریں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور کبھی مٹ بھی جاتی ہیں۔ ایک بار اس نے نجمی آپا سے کہا تھا۔

"نجمی آپا۔ آپ کی لکیریں بہت خطرناک ہو گئی ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا —"

"آپ کی لکیریں کہتی ہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہونے والا ہے جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے اور یہ حادثہ بہت جلد ہونے والا ہے۔"

اور ندیم کی یہ بات حقیقت ثابت ہوئی۔ کیا جانے یہ کوئی اتفاق تھا یا لکیروں کی پکار۔ دو مہینے بعد ہی نجمی آپا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جس میں ایسی زخمی ہوئیں کہ چھ مہینے تک انہیں ہسپتال میں پڑے رہنا پڑا۔ ندیم نے بہت سی باتیں کہی تھیں جو حقیقت بن کر سامنے آئیں اور نجمی آپا کا واقعہ ایسا تھا کہ لوگ ندیم سے ہاتھ دکھانے کے مشتاق ہونے لگے۔ ندیم نے نہ جانے کتنی بار ارم کی لکیروں کو پڑھا بہت ساری باتیں انہیں کی بتائیں جن کا ارم کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور بہت سی باتیں ایسی بھی بتائیں جو حقیقت تھیں جن کا اسے پتا تھا مگر ایک بات اس نے

[illegible] زندگی [illegible] شخص [illegible]

[illegible] ایک بار [illegible] ہاتھ [illegible]

ندیم [illegible] کی [illegible] لکیریں [illegible]

[illegible] بھی [illegible] جاتی ہیں۔ [illegible] لکیریں [illegible]

[illegible] بہت [illegible] اور [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] پہچانی ہیں۔

[illegible] ایسا ہوگا میں آپ کو [illegible]

[illegible] گا۔

[illegible] نام [illegible]

[illegible] گا۔

[illegible]

باہر کے [illegible] ندیم [illegible] لیا۔ شاید [illegible] گیا۔

[illegible] ندیم [illegible] بہت [illegible] سے تیار ہو جاؤ [illegible] کے لیے۔ باہر [illegible] ہیں۔

ندیم نے آنکھوں سے چہرہ [illegible] تھا کہ ادھر [illegible] چہرہ چھین لیا۔

یہ کیا؟ ندیم [illegible]

[illegible] ندیم کے [illegible] دیکھیے [illegible] ان لکیروں کو [illegible] وہ لکیریں مٹ گئیں شاید [illegible] تھیں۔ ندیم کی نظر [illegible] اور [illegible] چہرے کا [illegible] تھیں اور دوسرے ہی لمحے ندیم [illegible] اپنے [illegible] چہرہ چھپائے باہر جا رہا تھا۔

[illegible]

[illegible]

ساقیِ کوثر

ذکی - بلرام پنکھی

اس وقت سورج کی تمازت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی [illegible] پہاڑوں ... رگستان کے ذرے ننھی ننھی چنگاریوں کی ... چمک رہے تھے - ہوا کے تیز و تند جھونکے اپنے گرم گرم تھپیڑوں سے چہروں کو جھلسائے دے رہے تھے - مگر وہ لوگ شاید عادی تھے

بصرہ کی خانقاہ میں آج غیر معمولی چہل پہل تھی - اس خانقاہ میں نصرانیوں کا ایک بہت بڑا راہب رہا کرتا تھا - جس کے عقیدت مندوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا - صبح سے شام تک آمد و رفت کا ایک سلسلہ تھا جو چلتا رہتا - اکثر لوگوں نے اس کی خدمت کو فرضِ اولین سمجھتے ہوئے وہیں سکونت اختیار [illegible]

[illegible] بوڑھا راہب بڑی شفقت کے ساتھ ان سب کو کتب ... کا درس دیتا ان کے اشارات کی نشاندہی کراتا - مگر ... کے مقامات سب کے فہم و ادراک سے بالاتر تھے - وہ ... دوسرے کو دیکھتے - سر گھسو کرتے اور پھر اپنی اپنی کتابوں پر ... جاتے - بوڑھے راہب کی پیشانی پر پڑی ہوئی سلوٹیں زیادہ ... فکر کی وجہ سے آج اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں -

[illegible] میرا ذہن - مجھے دھوکا نہیں دے سکتا [illegible] مضطرب تھا - انتہائی [illegible] بہت بڑا امتحان [illegible] راہب [illegible]

[illegible]

تمہارا قدرت کی طرف سے وہ رہنما دنیا میں ہو ... [illegible] راہب نے خوش ہوتے ہوئے کہا [illegible] وہ ... جب ایک دن وہ تم سے ... تشنگی ... چند بھاگے جو تھکے ایسے آئے تھے گویا آگ کی بھٹی میں ... وقت میں نے تم سب سے کیا کہا تھا؟

ذہن پر زور دیتے ہی سب یک زبان ہو کر بول پڑے - آپ نے فرمایا تھا شاید آج کوئی ایسا قافلہ گزرنے والا ہے جو دنیا کا عظیم ترین قافلہ ہوگا - پھر وہ لوگ کیسے تھے؟

مشرک، کافر، ذلیل ترین - سب بولے - "اچھا تو پھر [illegible] فرض کر لو ... یقین کیوں نہیں کر لیتے"

آپ پر بالکل اعتماد و یقین ہے مگر عقلیں حیران ہیں اور ... کے حل سے عاجز و مجبور محض!

"اچھا تو پھر آؤ - سب میرے قریب آؤ - وہ سب اٹھے پھر ... اور ایک ایک کر کے کھڑکیوں کے سامنے سب کو کھڑا کر دیا - وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے - جناب ہمیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا - ہمیں بھی کچھ نہیں دکھائی دیتا -

تم اس وقت دیکھنے کا سوال ہی نہیں البتہ جھنجھلا سے ... محسوس کرو - وہ لوگ چپ چاپ کھڑکیوں کے سامنے کھڑے رہے کھڑے رہے! یکایک خوشی سے چلا پڑے - جناب میں نے محسوس کیا ... اور - میں نے بھی - پوری خانقاہ ان سب کی ... سے گونج اٹھی -

"بچو! تمہارے شعور میں یہ بات کیونکر آئی؟" مقدس راہب نے مسرت آمیز نگاہ ڈالی - اتنی شدید اور قیامت خیز تپش اور جھلسا دینے والا گرم ہوا - ان میں بھی کبھی کبھی ایسا جھونکا آتا ... جس کی خنکی و عطر بیزی جسم ہی کو نہیں روح کو بھی تازگی بخشتی ہے -

خدا وند یسوع مسیح! میری محنت رائیگاں نہیں گئی - راہب نے تشکر آمیز نگاہ آسمان پر ڈالی - پھر اطمینان ... آج ... یہاں ... سے گزرنے والا ... [illegible]

[illegible]

جس وقت گزرتا جاتا بوڑھے راہب کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ [illegible] انتظار نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ٹہل رہا تھا۔ ٹہل رہا تھا جیسے ادھر ادھر ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے ان سب کی جانب دیکھ لیتا جو نہایت محویت اور خود فراموشی کے عالم میں کتابوں پر جھکے پڑے تھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چاروں جانب نظریں دوڑائیں ۔۔۔ دور سے، دور بہت دور سے گرد و غبار کے مرغولے دکھائی پڑنے لگے۔ دیکھو، دیکھو ۔۔۔ وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ خوشی سے راہب تقریباً چلا پڑا ۔۔۔ بھئی ۔۔۔ بھئی ۔۔۔ یہ تو قافلہ ہے ۔۔۔ وہی قافلہ ہے۔ اور سب نے عقیدت سے راہب کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ۔۔۔ اچھا بچو اب تم سب جاؤ [illegible] ان لوگوں کے لئے کھانے کا اہتمام کرو۔ وہ یہیں [illegible] ٹھہریں گے۔ یہ جو عجب سا یہ دار درخت ہے اس کے نیچے فروکش ہوں گے۔ یہ قبیلہ معزز و محترم ہے [illegible] دعوت قبول کرے گا۔ وہ خوشی سے [illegible] قافلے والوں کی [illegible] آسمان کی جانب اور یسوع مسیح کی شان [illegible] چٹانوں پر [illegible] ایک [illegible] تازگی و شگفتگی [illegible] پیدا کر دی تھی۔ وہ [illegible] خوش ہوتا۔

[illegible]

[illegible] جاتا تھا۔

بعد فراغت طعام وہ نو وارد [illegible] لے گیا اور کیفیات و اسباب بیداری سے مطلع [illegible] وہ سب باتیں ان صفات سے بالکل مطابقت رکھتی [illegible] وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا پھر اس نے پشت دیکھنے کی خواہش کی۔ بچے نے مسکراتے ہوئے دکھا دی۔ وہ بھاگ کر تاجر کے پاس آیا اور پوچھا یہ بچہ کس کا ہے؟ "میرا ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟ قاعدہ سے اس بچے کے [illegible] زندہ نہیں ہونا چاہیئے۔" راہب خود اعتمادی سے بولا

"دراصل یہ میرا بھتیجا ہے۔ یہ بطن مادر ہی میں تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر اے معزز میزبان آپ کو معلوم ہوا؟"

"وہ تو میں بتا ہی دوں گا لیکن خدارا پہلے اس کی حفاظت کرو۔ تم لوگ اس بچہ کو ساتھ لائے تو بہتر [illegible] اور صفات کو میں نے پہچان لیا اگر یہودیوں نے شناخت کر لیا تو وہ بچے کے دشمن ہو جائیں گے اور ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ بچہ آئندہ چل کر ایک عظیم المرتبت انسان [illegible] جس کے وقار کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ وہ [illegible] ہوں لیکن اے بزرگ میزبان پہلی [illegible] صاف صاف بتا دیں آخر وہ کون سے اسباب ہیں [illegible] پر اسے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ [illegible] اور میں نے دیکھا اس پر تم لوگوں سے [illegible]

[illegible]

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مسرت یا غم کی خبریں شائع کی جاتی ہے۔ جو ولادتِ اطفال، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبریں مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی ہوں اور نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائیں کہ ہر تاریخ سے پہلے وصول ہو جائیں۔ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ بعد شائع ہوتی ہیں۔

(ادارہ)

ولادتِ اطفال کی خبریں

- بہن شمس النساء محسن (مدراس) میرے بہنوئی فہیم بن امین حسین اور میری چھوٹی بھابی مہ جبین سلمہا دختر سید محمد صاحب کو اللہ پاک نے ۱۰ر جنوری کی شب میں دس بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام فاطمہ زہرہ قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور قرۃ العین بنائے۔
- بہن شمیم اشرف (آمبور) "میری محترم باجی فرزانہ پروین اور بھائی جان سی احمد بادشاہ کو اللہ پاک نے ۱۰ر جنوری ۱۹۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فیضان قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب کرے۔
- محترمہ ... (آمین) میرے بیٹے عبد الخالق اور بہو ... کو اللہ پاک نے پہلی مرتبہ ۲۹ر دسمبر بروز بدھ ۱۱ بج کر پانچ منٹ پر ایک دختر عطا فرمائی۔ نام فرحانہ قرار پایا۔ اللہ صاحب نصیب کرے اور عمر طویل عطا فرمائے۔
- ... سلیم (...) میری بھتیجی ... کو خداوند کریم نے ... جنوری ۱۹۸۳ء کو پہلی بار ایک دختر عطا فرما کر میرے بھائی ... کو نانا بننے کا شرف بخشا۔ اللہ پاک ... والدین کے ... جوان کرے۔
- ... ہمارے ... حسین ... صاحب ... کو اللہ ... جنوری ۱۹۸۳ء ... ایک ...

... ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر خضر عطا فرمائے اور صاحب نصیب بنائے۔

پیغاماتِ نشاط

- رضیہ خاتون (بنگلور) "میری نواسی نعیمہ اختری عرف انوری جان سلمہا کی شادی ۹ر جنوری ۱۹۸۳ء بروز اتوار عزیزی محمد جمال الدین عرف انور پاشا سلمہ بن شیخ امام ... صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہمراہ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
- اُمِّ سلمیٰ خلیل (آمبور) میری بھتیجی عامرہ فرحین بنت جناب کرد لیکار، نثار اللہ کی شادی خالد احمد با ... فرزند ابا پلے عبد الرؤف صاحب) کے ہمراہ ۳۰ر جنوری ۱۹۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
- نیاز احمد پاشا (منڈیا) "ہمارے دوست اقبال ... بشیر و ... مقصود کے بڑے بھائی مشتاق احمد، رائل ... منڈیا (فرزند عبد الستار صاحب۔ منڈیا) کی شادی شیریں تاج سلمہا بنت سید کریم صاحب زمیندار گنگا پورہ۔ ... کے ہمراہ ۱۳ فروری ۱۹۸۳ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
- اقبال حسین علوی صاحب نے اپنے فرزند ... سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو عطیہ سلمہا کے ساتھ انجام پائی ۱۳ر فروری ۱۹۸۳ء کو این۔ ای ریلوے انسٹیٹیوٹ بادشاہ باغ لکھنؤ میں اپنے اعزہ اقربا کو دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم (...))
- بیگم بتول احمد (...) مولوی گنج۔ لکھنؤ کے فرزند ... سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو ... سلمہا کے ساتھ عمل میں آئی اپنے اعزہ اقربا کو ... مولوی گنج میں ... ۱۹۸۳ء دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم ...)

انتقال پُر ملال کی خبریں

- ... (...) ... کہ میرے ...

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہر ماہ [illegible]

[illegible]

(ادارہ)

[illegible] آدم کی ترکیب بھی ہے
[illegible] آداب [illegible]

مرسلہ: [illegible]

[illegible] ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

مرسلہ: [illegible]

مرسلہ: [illegible]

مرسلہ: [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

مرسلہ: [illegible]

مرسلہ: [illegible]

[illegible]

مرسلہ: [illegible]

[illegible]

مرسلہ: [illegible]

[illegible]

[illegible]

سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کی ترقی

خوشحالی کی جانب گامزن
زندگی کے مختلف روپ
کا آئینہ دار ۔ اترپردیش

کسی بھی حکومت کی سرگرمیوں کا تجزیہ کرتے وقت یہ ایک قدرتی امر ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ سماج کے کمزور طبقوں کے لئے کیا کچھ کیا گیا ہے۔

اترپردیش میں کمزور طبقوں کے ۳۶،۱۸ لاکھ سے زیادہ افراد کو گاؤں سبھا کی ۴۰ء۳ لاکھ ہیکڑ سے کچھ زیادہ زمین گزشتہ اکتوبر تک الاٹ کی جا چکی ہے اور [illegible] سے زیادہ خاندانوں کو مکانات کے لئے زمین دے دی گئی ہے۔

اسپیشل کمپوننٹ پلان کے تحت ہریجنوں کی ترقی سے متعلق کاموں کے سلسلہ میں گزشتہ دو برسوں میں [illegible] کروڑ روپئے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ ۱۹۱۴۴ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری اور ۴۵۰۰۰ سے زیادہ کنوؤں، ۱۰۰۰۰ ہینڈ پمپوں اور ۲۳۴۰ ڈگیوں کی تعمیر پینے کے پانی کی بہم رسانی فراہم کرنے کی غرض سے کی جا چکی ہے۔

اس کے علاوہ دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت [illegible] سے زیادہ مکانات کی تعمیر ہو چکی ہے اور ۱۲۰۰ سے زیادہ دکانیں اقوام مندرجہ فہرست کے لوگوں کو الاٹ کی گئی ہیں۔ اسی طبقہ کی مزید ترقی کے پیش نظر ۱۲۱۲ ایکڑ زمین ان میں تقسیم کرنے کے لئے خریدی گئی ہے۔ اس زمین میں سے ۸۰۶ ایکڑ الاٹ بھی کی جا چکی ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا

۲۰ نکاتی پروگرام • ہمہ گیر ترقی کا ضامن

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش

دیہاتوں کی مربوط ترقی

خوشحالی کی جانب گامزن
زندگی کے مختلف روپ کا
آئینہ دار ــــ اتر پردیش

مربوط دیہی ترقی اور قومی روزگار پروگرام کی تیز رفتار عمل آوری کے لئے ۰۰ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی ہے اور ریاست کے تمام ۸۰۵ ترقیاتی بلاکوں میں سے ہر ایک میں کمزور ترین ۰۰ خاندان خاص طور سے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے خاندان منتخب کرلئے گئے ہیں اور ۱۳۱ء۵ لاکھ خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے کے لئے بھرپور کوشش کی جارہی ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم ریاست کے تمام ترقیاتی بلاکوں میں نافذ کی جاچکی ہے۔ اس اسکیم سے اب تک ۱۳ء۴ لاکھ خاندان مستفید ہوچکے ہیں، جن میں ۲۰ ہزار خاندان اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ہیں۔

تمام ریاست میں گاؤں سبھاؤں کے انتخابات مکمل ہوگئے ہیں اور نئے پنچایتوں کی تشکیل کا کام شروع ہوچکا ہے۔

قومی دیہی روزگار اسکیم کے تحت گذشتہ سال ۵۳ء ۱۳ لاکھ روپئے کے اخراجات سے ۰۲ء ۱ لاکھ [illegible] روزگار کے مواقع پیدا کئے گئے۔

بائیو گیس پروگرام کے تحت ۵۰۳۲ بائیو گیس پلانٹ گذشتہ سال لگائے گئے اور ۱۲۰۱۳ [illegible] کام جاری ہے۔

محکمہ دیہی ترقی نے پینے کے پانی کی سہولت مہیا کرنے کی غرض سے ہریجن بستیوں میں [illegible] کنوؤں کی تعمیر کی ہے اور ہینڈ پمپ لگائے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری [illegible] کا

۲۰ نکاتی پروگرام۔ ہمہ گیر ترقی کا ضامن

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

لے جلیں میں غضنفر اس کے سامنے آگئے۔ سیما نے انہیں باغ کا الزام دکھایا۔ اور نامعلوم انداز سے ان کی طرف تکنے لگی۔

ابھی جمشید اور شہابی اسی کی سیج پر بیٹھے تھے۔ اور جو گفتگو ہو رہی تھی وہ برآمدے میں بھی سنائی دے رہی تھی۔

"کچھ دنوں کی بات ہے ڈیڈی کا سے پھر وہ آپ کی گندی کریں گے تو شکایت دیکھئے گا۔ شہابی آپ نے لڑائی بھائی کیوں کی۔ سمجھے۔؟"

"لیکن جو تادلیں میں نے پیش کی ہیں۔ کیا وہ تمہارے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہیں۔" جمشید نے کہا۔

"یہ سب ہیر پھیر کی باتیں میں نہیں جانتی!" اس کی آواز زیادہ بلند تھی۔

"تمہیں میری کیا حیثیت پسند ہے شہابی؟"

"کیوں۔ آپ کی حیثیت کو خدانخواستہ کیا ہوا ہے؟" شہابی بولی "یہ کہئے کہ اب آپ کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ یہ گھر آپ کو کاٹنے کھاتا ہے۔ اور بہانے بنا رہے ہیں آپ حیثیت کے۔ میں پوچھتی ہوں کیا آپ کو ڈیڈی کی محبت کا اندازہ بھی نہیں ہے؟"

"بس شہابی۔ ڈیڈی کو بیچ میں نہ لاؤ۔"

"کیوں۔ کیوں نہ لاؤں؟"

"اس لئے کہ صرف ان ہی کی محبت نے مجھے یہاں باندھ رکھا ہے میں ان کے قدموں پر جان دے سکتا ہوں۔ وہ میرا آئیڈیل ہیں!!"

"زبانی باتیں۔"

"کیا مطلب؟"

کیا کریں۔ اسے نکال دیں گھر سے باہر؟" سیما بھی آگئی۔

"زبان کھینچ لوں گی بڑے سے۔ جو میرے مقابلے میں زبان چلائی۔" سیما پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

"بھابی۔ میں لاوارث نہیں ہوں۔ ذرا مجھے ہاتھ لگا کے تو دیکھئے۔"

"کس کے بھرم پر اس قدر اترائی ہے کم بخت؟" سیما نے کہا۔ زوبی بڑی لاڈلی بچی تھی۔ اسے سب چاہتے تھے۔ وہ برداشت نہ کر سکی رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر چار سال کا بھولا بھالا جمشید بھی رونے لگا۔ سیما کو تاب کہاں تھی جھپٹ کر آئی اور سیما کو تو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ کر سکی مگر تڑاتڑ جمشید کے تین چار مارے اور ہاتھ پکڑ کر یوں جھنجھوڑا کہ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دہلیز کے پاس گر پڑا۔ دالان میں قیامت مچ گئی۔ ابا جان اپنے دیوان خانے سے اٹھ کر آئے۔ زوبی ان سے لپٹ گئی۔ شدتِ گریہ سے اس کی زبان بند ہو گئی اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے جمشید کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔

"اسے کیوں مارا ہے۔ بہن؟" ابا جان نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ "تم کو اس بے زبان معصوم سے خدا واسطے کی دشمنی کیوں ہو گئی ہے؟"

"ابا جان آپ کو کیا معلوم یہ کتنا ابلیس کی کا نٹھ ہے؟" سیما نے کہا۔ "جا جا کر ان کے سامنے اُلٹی گھاتیاں کرتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ان پر ظلم کرتی ہوں۔"

"تعجب ہے کہ اس کو بھی تم ہی سے بیر ہے۔" ابا جان نے کہا۔ بچے کو اٹھا لیا سینے سے لگا کر اس کے آنسو پونچھے۔ اور منانے چمکارتے باہر لے کے چلے گئے۔ رات زوبی نے غضنفر سے سیما کی شکایت کی۔ ان کا خون کھول اٹھا۔

"تم نے زوبی سے کہا تھا کہ اس کی زبان کھینچ لو گی۔" غضنفر کو اب سیما سے کلام نہ تھا

[illegible] انہوں نے نہایت [illegible] لہجے میں اس سے
[illegible] اور بڑا اچھا لگا تھا۔ "تم بہت [illegible] سب کی [illegible]
[illegible] پر قادر ہو۔ سمجھیں۔ آئندہ اگر میں
[illegible] کے ساتھ [illegible] جب [illegible]
[illegible]

"[illegible] بہت [illegible] بڑی ہے آپ کو [illegible]
[illegible]"

"[illegible] انسان کا [illegible] بتاؤ۔ تم اس سے
[illegible]"

"آپ [illegible] لگتا ہے کہ یہ آپ ہی کا ہے؟"
"[illegible] بات کرو۔"
"[illegible] کیا میں اندھی ہوں [illegible] دیکھ نہیں رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس کی [illegible] ہوں۔" وہ اسے
[illegible] مجھے بہت [illegible]
[illegible] اچھے [illegible]
[illegible] بہت اچھے ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] اور [illegible] میں [illegible]
"مبارک ہو۔ [illegible]
[illegible] آپ نے [illegible]
[illegible]
اور سو جاؤں گی۔"

[illegible] نے سر جھکا کر [illegible]
چہرہ پھیر کر [illegible] لینے لگے۔

"اچھی بات ہے۔ اب [illegible] کا فیصلہ۔" [illegible]
سے [illegible]
آپ کا [illegible] آپ [illegible]
کا [illegible]
[illegible]

"کیا [illegible]" [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
"[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

"ارے [illegible] ہاں سے" وہ ہنسے گا۔
[illegible] پر ذرا بھی رحم نہ کر سکیں گے۔ بلکہ
[illegible] ذرا بھی پرواہ نہیں۔" اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ "بیگانہ سو
[illegible] پیاری بہن کے آنچل میں ڈال دیا کروں گا۔"

دالان سے گئے۔

بالکونی سے سیما نے دیکھا اور اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں۔ [illegible] اور فقرہ چست کیا اس لڑکی کو۔ اس طرح لے گئے [illegible] نام کو منہ نہ لگایا کر۔ مگر اسے [illegible] لیے بغیر اس بے جگہ کی چھوکری کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ جیسے بھائی بے غیرت ڈھیٹ ہیں ویسے ہی بے حیا بے غیرت بہن بھی ہے۔ یہ جنم جلے میری کوکھ سے نہ پیدا ہوتے۔ بس بے اولادی کا ایک ہی دکھ ہوتا۔ اولاد رکھ کے دکھ اٹھانا کون سے نسخے میں لکھا ہے۔ بابا جان نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اسی وقت ہوش آئے گا جب کوئی اونچ نیچ ہو جائے گی۔ تب ڈوب مرنے کو چلو بھر پانی نہ ملے گا۔ جوان لڑکی ہر فرد سے دلار کرتی ہے۔ بابا جان کی جیسی شکل آتی ہے۔ بھائی نامراد بھی ہوا نہیں سمجھتے۔ ایسے اکیلے جوان لڑکی اور جوان لڑکے کا ہنسنا بولنا کتنا خطرناک ہے۔!!

کی للک پر کیوں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ کیا خوبی ہے مجھ میں [illegible] جب کوئی [illegible] تمہارے سامنے کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزری۔"

"تو پھر دے دیجیے مجھے طلاق۔" سیما چیخ کر بولی۔ "میں [illegible] آپ کے ساتھ [illegible] دوزخ میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ رکھ دیجیے میرا مہر اور سامان جہیز۔ میں [illegible] بچوں سمیت میکے جاؤں گی۔!"

"اس بھرم میں بھی نہ رہنا۔" منصور سیدھے ہو کر بیٹھے اور اس کی طرف کروٹ لے کر دل جلانے کے انداز میں مسکرانے لگے۔ "میں تو تمہاری وہ [illegible] خود گھر سے بھاگ [illegible] دیکھیں۔ اور بچوں کے خواب نہ دیکھو سیما بیگم۔ بچوں پر شرعی حق ہے۔ تم انہیں ہرگز نہیں لے جا سکتیں۔ [illegible] وقت چلی جاؤ۔ اگر میں چھوٹوں بھی تمہیں روک لوں تو مجھے سیما کی اولاد [illegible]

"یہ سب کس لیے۔ کس لیے۔ اس انگلی بھر کے بچے کے لیے۔" سیما [illegible]

"ہاں سیما اسی کے لیے۔" ٹھنڈے لہجے میں منصور نے جواب دیا۔ "صرف اسی کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا کہ [illegible] اور سعدیہ کے ساتھ کرتی ہو۔ اس سے محبت سے پیش آؤ۔ اسے اپنا سمجھو۔ تمہیں میرا خیال ہے۔ تو میری مرضی پوری کر دو۔ تب میں ہمیشہ کا سا موم اور [illegible] ہو جاؤں گا۔ ورنہ پھر میں بھی اپنا سلوک بدلنے پر مجبور ہوں گا۔ اس [illegible] دے اس ہاتھ لے۔ تم اگر اس معصوم کے لیے بہتر ہو سکتی ہو تو میں بھی [illegible] لیے فولاد ہو سکتا ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا مجھ سے۔ آپ بن جائیے میرے حق میں فولاد [illegible]" سیما نے دو ٹوک جواب دیا۔ اور اب بھی آواز میں [illegible]

[illegible] سکورا لاکے ان کے سامنے رکھ دیا۔
"نہیں ابا جی۔ لے جائیے۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔"
"اتنا غصہ نہیں کرتے بیٹا۔ کیا فائدہ جی خراب کرنے سے۔ یہ سوچ لو وہ اپنی روش بدلنے والی نہیں ہیں۔"
"کاش اماں جان مرحومہ نے یہ پھندہ میرے گلے میں نہ ڈالا ہوتا۔ کاش میرے پاس اس وقت پندرہ ہزار روپے ہوتے۔ میں اسی وقت منہ پر دے مارتا۔" غضنفر نے اپنی جلتی ہوئی کنپٹیاں دبائیں۔ "ابا جی اب مجھ میں تاب نہیں رہی۔ ایک دن یا تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی یا ہارٹ فیل ہو جائے گا!"
"دور پار دشمن۔ میاں۔ بڑے گلے منہ سے کاہے نکالتے ہو۔ اچھا تم ذرا یہ ٹھنڈی ٹھنڈی کیوڑہ پڑی فرنی چکھ لو۔ ذرا دل سنبھلے۔"
انہوں نے چمچ بھر فرنی سکورہ سے لے کر غضنفر کی طرف بڑھائی۔ طوعاً کرہاً غضنفر نے فرنی کھائی۔ سینے کی جلن قدرے کم ہو گئی۔
"کھانا بنا دوں؟" بُوا نے پوچھا
"جی نہیں۔ اب رات کو کھانا کھاؤں گا۔" غضنفر نے کہا۔ "بُوا اماں سچ بتائیے۔ جب میں گھر سے چلا جاتا ہوں۔ تو کیا ہوتا ہے۔؟"
"بیٹے۔ تمہاری اماں اللہ بخشے مجھے اپنی ماں یا بڑی بہن کے سمان سمجھتی تھیں۔" بوا حضورن نے ٹھنڈی سانس بھر کے اور آب دیدہ ہو کے کہا۔ "انہوں نے تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپائی نہیں۔ میں نے کبھی سوچا جب تم نے مجھے نہیں بتایا تو انہیں خود سے کیا کہوں۔ مگر میں خود سے ان کا [illegible]

کروں۔ اس طرح میری ساری توانائی پامال ہو جائے گی۔ ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ آگے بڑھنے کی امنگ مر جائے گی۔ میں ایک مٹھی گوشت بن کر رہ جاؤں گا۔ مجھے اس گھر سے الگ رہ کر اپنے لیے کچھ کرنا ہے۔!
دفعتاً اس کے چہرے پر کوئی ٹھنڈی سی اور گیلی گیلی چیز گری۔
"سانپ ہے!" اس کے دماغ میں بجلی کا کوندا لپکا اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ مگر وہ سانپ کہاں تھا۔ اس کے چہرے سے پھسل کر پھولوں کا ہار اس کے سینہ پر آ گرا تھا! ساتھ ہی ایک شریر قہقہہ اس کے کانوں میں گونجا۔
"اف فوہ۔" وہ جھینپ کر ہنسنے لگا۔ "یہ تمہاری شرارت تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ نیم پر سے کوئی سانپ ٹپک پڑا ہے۔"
شہلا ہنستی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔
"واہ بھیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنے ڈرپوک ہیں۔ اور پھر کس بری طرح آپ اچھلے ہیں!"
"لیکن یہ ہار۔ یہ ہار کس خوشی میں ہے۔؟"
"ہائے آپ کو خوشی کا پتہ بھی نہیں۔!" شہلا نے بڑی بڑی معصوم آنکھیں پھیلائیں۔ "آج کا اخبار آپ نے نہیں دیکھا؟"
"نہیں۔ کیا چھپا ہے؟"
"میرٹ ہولڈرز میں آپ کا نام آیا ہے۔"
"اچھا۔!"

[illegible] سوندھی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی۔ چنبیلی کے منڈوے پر کھلی ہوئی کلیاں ہواؤں کی اٹھکیلیوں سے شرما شرما کر [illegible] آسمان پہ بادلوں کے پرے اڑتے پھر رہے تھے [illegible] مسکرا رہی تھی۔!

[illegible] بنا کر چھتر کی بیچ پر لیٹ گیا۔ اور ذرا سی دیر میں دکھ سکھ کے ملے جلے جذبات کسی اور دنیا میں اڑا لے گئے۔!

اچھا نمایاں کامیابی بھی اس کے مرجھائے ہوئے دل کو شگفتہ نہ کر سکی تھی! تمام خوش رنگ محسوسات پہ نام نہاد چچی جان کا روح فرسا سلوک ایک دبیز کہرے کی طرح منڈھا ہوا تھا۔!

اب مسلسل نفرت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

وہ ناسمجھ بچہ نہیں تھا۔ انیس تیئیس سال کا باشعور نوجوان تھا۔

اگر اس نے گھر سے بھاگ کر کہیں اور قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا اسی عزم کے ساتھ چل بھی کھڑا ہوا تھا۔ لیکن پھر کوئی اَن دیکھی طاقت اس کا رخ گھر کی طرف پھیر دیتی تھی۔ اس نے بارہا محسوس کیا تھا کہ لاکھ چچی جان اس سے نفرت کریں۔ مگر وہ چچا جان سے جدا نہیں رہ سکتا! ان کی محبت کا جذبہ بہت طاقتور تھا۔ ان کا پیار تمام نفرتوں کو کالعدم کر دیتا تھا! پھر بھی۔ اس گھر میں تلخیوں کا زہر پینا اور جینا اب اس کے لیے قابل برداشت نہ رہا تھا۔!

اس نے آنکھوں پہ کہنی ڈھک لی۔!

میں تعلیم یافتہ ہوں۔ کہیں ملازمت تلاش کر سکتا ہوں۔ آخر
[illegible]

نظر رکھنے لگی ہوں۔ تمہاری اماں نے آخری دنوں پر کہا بھی تھا کہ بوا جی ہم چلے۔ ہمارا اپنا کیا اور تمہارا کیا۔ غضنفر ڈرتا ہے۔ تم اسے کلیجے سے لگا رکھنا۔ سو بھیا۔ ہم ہی اسے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اُدھر جانے نہیں دیتے مگر وہ تو ناسمجھ ہے۔ تمہارے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی چاہت میں اُدھر ہی جاتا ہے۔ دلہن بٹیا کو یہ پسند نہیں۔ اب میں بچوں کو کیسے روکوں انہیں دنیا کی اونچ نیچ، اچھا برا کیا معلوم؟ میاں تمہیں خوف کس کا ہے کہہ دو علی الاعلان۔ کوئی تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟

غضنفر کا چہرہ ندامت اور شرمندگی کے مارے لال ہو گیا۔ انہوں نے سوچا تک نہ تھا کہ امی حضور ان بوا کو بھی رازدار بنا لیں گی۔ کھنکھار کر بولے

" شروع ہی سے میں نے بڑی بھاری بھول کی بوا جی۔ اب اسے لیتا ہوں تو بے ہی۔ مجھے سیا کا خوف نہیں۔ لیکن ابا جان۔ مجھے ابا جان سے ڈر لگتا ہے۔ حالاں کہ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن دل ہی دل میں کیا سمجھیں گے بوا جی۔ جب تک یہ کارخانہ چلے چلنے دیجئے۔ اب مجھ میں ابا جان سے سب کچھ کہنے کی ہمت نہیں۔ آپ بس بچے کو اپنی طرف رکھیے۔ اسے اپنا بیٹا ہی سمجھئے۔ یہ مہربانی آپ میرے حال پر کیجئے بوا جی۔ تاکہ مجھے گھر سے باہر رہنے تک اتنا تو سکون رہے کہ میرے پیچھے اس پر ظلم نہیں ہو رہے ہیں۔"

بوا جی آہ سرد بھر کر آب دیدہ ہو گئیں۔!

[illegible] اور اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اگر وہ [illegible] اس کے پاس چلا جاتا تو بڑی
[illegible] سیما کے [illegible] یہ بات [illegible] کہ وہ مظفر کا
[illegible] ہے۔ [illegible] اور ایک [illegible] روشنی [illegible]
[illegible] ان کے دلوں کا بھید معلوم کرنا چاہتا [illegible] سیما کی طرف
[illegible] دل [illegible] ہو جاتی۔
[illegible] خیال [illegible] جائے جیسے
[illegible] بات کا یقین نہیں آتا تھا۔ مظفر کی بے رخی
[illegible] کی وجہ سے اس نے [illegible] نہیں تھا [illegible] کے
متعلق اس کے خیالات [illegible] لیکن دل [illegible]
[illegible] اب مظفر [illegible] ہو گی [illegible] سیما کا
[illegible] نہیں کریں گے۔ [illegible] ایک بڑی [illegible]
ہو گئی۔ روز بروز [illegible]
[illegible] ایک خوبصورت بچی [illegible] کے بعد
سیما بری طرح بیمار [illegible] بچے کی کوئی امید نہیں [illegible] لیکن مظفر نے
[illegible] علاج [illegible]
[illegible] پوچھا۔ سیما کی والدہ [illegible]
[illegible] بہت دنوں [illegible] مظفر نے
[illegible] ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ [illegible]
[illegible] دیئے۔
[illegible]

[illegible] محبت [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں دے سکتا [illegible]
[illegible] گرفتار [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] محبت [illegible]
[illegible] نہیں ہے [illegible]
[illegible] سکتی۔
[illegible]
[illegible] ساتھ کہا۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] غضنفر نے شکوہ کیا۔ "سب احترام میری
[illegible]
[illegible] کوئی بولا۔ "کیا تم ادھر ہی کہیں الگ
[illegible]

غضنفر نے بھی موضوع بدل دیا:
"بہت دنوں بعد تمہیں اطمینان نصیب ہوا ہے۔ کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا؟ کیا خیال ہے؟"
"ہم لوگ کشمیر میں دو مہینوں کا پروگرام بنائیں گے۔" فرید نے کہا۔
"دو مہینوں کی طرف سے سب کروا دوں گا۔ فکر مت کرو۔" غضنفر نے کہا۔
پھر دونوں سیما سے ملنے گئے۔ گھر بھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی لیکن سیما کا چہرہ بدستور کھنچا ہوا تھا۔ فرید کو اس نے گلے سے لگا لیا اور جمشید سے صرف اتنا کہا:
"تمہیں بھی مبارک ہو۔" اس کی طرف نظریں تک نہیں اٹھائیں۔ فرید شرمندہ ہو گیا۔
جمشید تھکا ہوا لیے باورچی خانے میں آیا۔ وہی اس کا ایک مامن تھا۔ دادی حضور نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور دعائیں دینے لگیں۔
"کاش آج کے دن دادا جان زندہ ہوتے۔" جمشید نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہ مجھے ہمیشہ دعائیں دیا کرتے تھے۔ میری ترقی سے خوش ہوتے تھے۔ آج ان کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ تو وہی نہیں ہیں۔ جانے [illegible] ادھوری ہوتی ہے۔ دادی اماں۔"

کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ غضنفر کے خون تھے۔ سیما نے چپکے چپکے لڑکی پسند کیا وہ جمشید نے دیکھ لیں۔ اس سے بات کر لی۔ وہ اچھا [illegible]
مگر دونوں نے ماں کی ایک نہ سنی۔ ان میں ذرا سا شعور کیا آیا تھا وہ ہر اچھی بری بات کا تجزیہ کرنے لگے تھے۔ انہیں اپنے بھی اچھا لگے تھے۔ وہ ان کا ساتھ کسی صورت میں بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اگر سیما انہیں ان کے ساتھ مدرسہ جانے سے منع کرتی تو وہ چیخ چلا کے شور مچاتے اور آخر تھک کر سیما کو شکست ماننی پڑتی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے بچوں سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ ایک جان لیوا بیماری کے بعد اس کا مزاج کچھ اور بدل گیا۔
مظفر کا الجیریا میں ایک اعلیٰ عہدہ ملا تھا۔ وہ ہمیشہ سے بھائی بہنوں کا خیال کرتا تھا۔ چوری چھپے ہمیشہ غضنفر کو جمشید کا نام کر کے بڑی رقم بھیجا کرتے۔ غضنفر نے اپنی تمام کہانی بے کم و کاست مظفر کو لکھ بھیجی تھی۔ [illegible] پر انہیں بھی تو اپنے دفاع کے لیے ساتھی چاہیے تھے۔ مظفر نے [illegible] تھی۔ ان کے قدم جم گئے تھے۔ اور وہ مظفر کو بھی اپنے پاس بلا رہے تھے۔
سعید الرحمن صاحب کے نام الگ رقم آتی تھی۔ انہیں عارفہ کے بیاہ کی فکر تھی۔ اور نوشینہ اس کے لیے رشتہ کی تلاش میں سرگرداں بھی رہنے لگی۔
وقت کے قدم مسلسل آگے بڑھتے گئے۔ بچوں نے شباب کی وادی میں گلگشت شروع کی۔ جوان بڑھاپے کی خزاں سے روشناس ہونے لگے۔ انقلاب زمانہ نے دنیا کو ہمیشہ کچھ دیا ہے کچھ اس سے لیا ہے۔ زمانہ یکساں نہیں رہتا وہ اپنی تقدیر میں گردش دوام لکھوا لایا ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں آدمی چاہے جو کر لے چاہے رہے [illegible] ایک مقررہ وقت پر اپنی منزل تک

خوشی اور مسرت کے ساتھ اپنی بی۔ ایس سی اور بی کام کی سندیں رکھ دیں اور جھک کر ان کے پاؤں چھوئے۔ تب۔

تب۔ غضنفر صاحب کو پتہ چلا کہ وقت کتنا آگے بڑھ چکا تھا۔ اب وہ پینتالیس اور پچاس کے درمیان ایک بے حد سنجیدہ، متین، خاموش اور کم گو آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی گیلی گیلی پلکیں جھپکائیں اور سر اٹھائے بغیر اپنے جوان بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیئے!

دونوں ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

"ڈیڈی۔ یہ کوئی ایسی بڑی خوشی نہیں ہے۔" نوید نے کہا۔ "فرطِ مسرت سے آپ کو اس وقت رونا چاہیے تھا۔ جب ہم بھی ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر واپس آجاتے! اتنی معمولی معمولی باتوں پر رونا نہیں چاہیے ڈیڈی!"

"چچا جان ہمارے ساتھ سیکڑوں طالب علموں نے ایسی ڈگریاں لی ہیں۔ ہم نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ آپ اس طرح دل بھاری نہ کیجیے!" جمشید نے کہا۔ وہ شروع سے غضنفر کو چچا جان کہتا تھا۔

"میرے لیے تمہاری معمولی اور موہوم سی کامیابی بھی ایورسٹ کے سر کرنے اور کشمیر فتح کرنے سے زیادہ اہم اور باعثِ مسرت ہے۔" غضنفر نے کہا اور ہنس کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ "خوشی کے موقعہ پر بھی آنسو نکل آتے ہیں!"

"اب آگے کے پروگرام بتائیے۔ ڈیڈی!" نوید نے کہا۔ لیکن جمشید خاموش رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے یہاں تک پہنچا کر اس کے باپ کے دوست "چچا جان" نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ وہ کس زبان سے اپنے

"اب۔" غضنفر نے دو لمحوں تک سوچنے کے بعد کہا۔ "تم دونوں ایل۔ ایل۔ بی کرو گے اور جناب نوید ایم بی اے بھی!"

"آل رائٹ۔ ڈیڈی!" نوید نے ہاتھ کی انگلیاں اٹھائیں اور فوجیوں کے انداز میں سیلیوٹ کیا۔ "تھینک یو۔"

"مم۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ چچا جان۔" جمشید نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اور سر جھکا لیا۔

"تم کچھ اور کرنا چاہتے ہو۔؟" غضنفر نے پوچھا

"جی۔!"

"کیا۔؟"

"اب میں۔ م۔ ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ چچا جان۔!"

"ملازمت!" غضنفر اور نوید نے ہم زبان ہو کر کہا۔ پھر غضنفر نے پوچھا

"یعنی تم آگے پڑھنا نہیں چاہتے ہو۔!"

"چاہتا تو تھا۔ مگر۔!"

"کہو بیٹے۔ صاف صاف کہو۔"

"چچا جان۔ میرا صرف دعا کہیں آپ کو ناگوار گزرے۔" جمشید نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں میاں۔ بالکل نہیں۔ تم بے فکر ہو کر کہو۔"

"آپ نے اپنی عنایات اور محبت سے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔" جمشید نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ آپ۔ آخر کہاں تک۔ میرے لیے۔!"



THE HAREEM

Apr. 83

Rs: 1/40

ایڈیٹر

گذشتہ ۵۰ سال سے خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

سب سے قدیم رسالہ

بانی

ماہنامہ حریم

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۳	فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۸۲ء	نمبر (۴)

ایڈیٹر و پرنٹر

نسیم انہونوی

معاون

شوکت جہاں بیگم عشرت

و

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قیمت سالانہ منی آرڈر سے ۱۸/-

قیمت خصوصی ... ۲۴/-

قیمت اعزازی ... ۳۰/-

وی پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد

غیر ممالک سے ... ۴۰/-

پاکستان کے بقدر غیر ملکی سکہ روانہ کریں۔ دیگر ممالک کے لئے مختلف شرحیں

[illegible] الاشاعت ... نسیم بک ڈپو

[illegible]

[illegible] نسیم انہونوی [illegible] لکھنؤ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا ایک واقعہ جو عجیب و غریب ہے

ایک [illegible] شخص [illegible]

[illegible]

آپ کی ملاقات [illegible]

[illegible]

حضرت یوسف ابن الحسینؒ

— ن۔ الف ابراہیم

اس عالمِ اسباب میں ایسی ایسی برگزیدہ ہستیاں گزری ہیں جنہوں نے اپنے تقویٰ، عبادت، ریاضت اور مجاہدے کی وجہ سے اولیائے کرام اور صوفیوں میں درجاتِ کمال پائے۔ انہی میں سے ایک بزرگ یوسف ابن الحسینؒ ہیں۔ جو جسمانی اور روحانی عبادت اور سخت ترین ریاضت سے اتقا کے اس درجہ پر پہنچ گئے جہاں اسرارِ ربانی اور رموزِ حکمت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے۔ علمِ تصوف میں جیسا کمال حاصل تھا۔ اور ظاہر و باطن کے اسرار ان پر منکشف تھے۔ آپ بڑے پائے کے مجتہد تھے۔ ان کا مرتبہ بڑے بڑے اولیائے کرام جیسا تھا۔ علمِ تصوف کی وجہ سے آپ پر ظاہر و باطن کے حالات کا انکشاف ہوتا تھا۔ آپ [illegible] کے لوگوں کے مرشد تھے جنہیں اوصاف و معارف کی تعلیم بڑے آسان طریقے سے دیا کرتے تھے۔ آپ نے بہت سے مشائخین کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا تھا۔ ابو ترابؒ کے ساتھ آپ کی بہت صحبت تھی اور ابو سعید خرازؒ کے رفیق اور حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید تھے۔ عبادت و ریاضت کے علاوہ آپ کی عمر کا بڑا حصہ ایسا بھی گزرا جس نے بڑی حد تک انہیں [illegible] حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ آپ کا حضرت ذوالنونؒ مصری [illegible] سے حالات [illegible] ابتدائی [illegible] حالات کو عمل کر دکھایا [illegible] حضرت یوسف ابن الحسین ایک [illegible] قبیلہ میں پہنچے۔ آپ صاحب حسن [illegible] عرب کی لڑکی نے جب آپ کو دیکھا [illegible] آپ کی محبت میں [illegible] گئی [illegible] اس لڑکی کو دیکھ کر آپ پریشان

بھاگ گئے۔ باوجود حسنِ شباب کے اس حسینہ کی خواہش سے آپ کانپ اٹھے۔ اور اس سے پیچھا چھڑا کر اس قبیلے سے بھاگ نکلے اور کچھ فاصلے پر جا کے ایک جگہ سر رکھ کر لیٹ گئے۔ بہت رات گئے جب نیند نے غلبہ کیا تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ ایک ایسی جگہ ہے جسے آپ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی جگہ سبز پوش لوگوں کی ایک جماعت ایستادہ ہے اور ان کے سامنے ایک حسین شخص تخت پر بیٹھا ہے۔ یہ دیکھ کر آپ کو اچنبھا ہوا۔ اور آپ نے اس سبز پوش جماعت سے دریافت کیا کہ "آپ لوگ کون ہیں اور جو صاحب تخت پر تشریف رکھے ہیں وہ کون ہیں۔" ان لوگوں نے آپ کو دیکھ کر تعظیم و تکریم سے تخت کی طرف جانے کی جگہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم فرشتے ہیں اور یہ جو تخت پر تشریف فرما ہیں وہ حضرت یوسفؑ ہیں جو آپ کی زیارت کے لیے تشریف لائے ہیں۔" آپ فرماتے ہیں کہ میں یہ بات سن کر رو دیا اور دل میں خیال کیا کہ میں کیا چیز ہوں کہ خداوند تعالیٰ کے پیغمبر مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت یوسفؑ نے تخت سے اتر کر مجھے گلے لگا لیا اور اپنے ساتھ مجھے تخت پر بٹھایا۔ میں نے عرض کیا۔ "یا نبی اللہ میں کیا چیز ہوں جو آپ نے میری اتنی توقیر کی؟" حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ "اس وقت کہ ایک امیرِ عرب کی خوبصورت لڑکی اپنی خواہش سے بے تابانہ آپ کے سامنے حاضر ہوئی تھی تو آپ خدا کے خوف سے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ آپ نے اس کے حسن و جمال اور اپنی نفسانی خواہشات کو خوفِ خدا پر ترجیح دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اور تمام فرشتوں پر آپ کی حالت منکشف فرماتے ہوئے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا: "اے یوسفؑ! دیکھو یہ وہ یوسف ہے جس نے امیرِ عرب کی بیٹی پر میرا خوف غالب رکھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان فرشتوں کے ساتھ آپ کی زیارت کے لیے بھیجا ہے اور بشارت دی ہے کہ آپ اللہ کے برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں۔" پھر یوسفؑ نے فرمایا [illegible] برگزیدہ بزرگ [illegible] حضرت ذوالنون مصریؒ برگزیدہ بزرگ [illegible]

سے واقف ہیں۔ آپ ان کے پاس تشریف لے جائیں۔ لہٰذا حضرت یوسف ابن الحسینؒ فرماتے ہیں کہ جب میں خواب سے بیدار ہوا تو مجھ پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہوگئی۔ اور ذوق و شوق سے بے تاب ہو کر اسی وقت مصر کا رخ کیا۔ چونکہ حضرت یوسف ابن الحسین کو اسم اعظم سیکھنے کا اشتیاق تھا۔ آپ سفر طے کرتے کرتے مصر پہنچے اور حضرت ذوالنونؒ کے حضور پہنچ کر آپ کو سلام کر کے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ آپ میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ حضرت ذوالنونؒ سے کچھ پوچھتے کیونکہ حضرت ذوالنونؒ اپنے مریدوں میں گھرے وعظ و نصیحت میں منہمک رہتے تھے۔ اسی طرح رات دن گزرتے گزرتے ایک سال بیت گیا۔ مگر حضرت یوسف ابن الحسینؒ کو آپ سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب لوگوں نے دریافت کیا "یہ جوان کہاں سے آیا ہے" مریدوں نے کہا رے سے آیا ہے۔ اتنا پوچھ کر حضرت ذوالنونؒ پھر خاموش ہو گئے۔ پھر بھی حضرت یوسف ابن الحسینؒ کی ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہتے۔ اسی طرح دو سال اور گزر گئے۔ پھر حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا۔ "یہ شخص کیوں آیا اور کیا چاہتا ہے" عرض کیا گیا آپ کی زیارت کے لیے آپ سے اسم اعظم سیکھنے کی خواہش لے کر آیا ہے۔ یہ سن کر حسب عادت خاموش ہو گئے۔ مگر حضرت کے رعب نے پوچھنے کی جرأت نہ دی۔ آخر تین سال کی صبر آزما مدت کے بعد آپ نے حضرت یوسف کو ایک لکڑی کا پیالہ جو ڈھکا ہوا تھا دے کر فرمایا۔ اس کو لے کر دریائے نیل کے پار فلاں مقام پر ایک شخص ہوگا اس کو یہ پیالہ دینا اور وہ جو کچھ تم کو کہے اس کو یاد رکھنا۔ حضرت ابن الحسین پیالہ لے کر حسب ہدایت وہاں سے روانہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس شخص کے پاس بھیجا گیا

ذوالنون مصریؒ کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ بالآخر آپ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے اسی شخص کے پاس جانا چاہیے جس کے پاس میں بھیجا گیا ہوں۔ لہٰذا آپ اس شخص کے پاس خالی پیالہ لیے ہوئے پہنچے۔ جب اس شخص نے خالی پیالہ دیکھا تو ہنس کر کہا۔ "شاید تم نے حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ سے اسم اعظم سیکھنے کی خواہش کی ہوگی" آپ نے کہا ہاں یہی بات ہے۔ اس شخص نے کہا جب ہی تمہاری بے صبری کو دیکھ کر ذوالنونؒ نے یہ چوہا بند کر کے مجھے پہنچانے کے لیے دیا اور تمہارے صبر کا امتحان لینا چاہا جس میں یہ مصلحت تھی کہ تم ایک چوہے کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر آپ نہایت شرمندہ ہوئے۔ اور حضرت ذوالنونؒ کی خدمت میں واپس گئے۔ حضرت نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔ میں نے سات دفعہ اللہ تعالیٰ سے تمہیں اسم اعظم سکھانے کی اجازت طلب کی۔ مگر اجازت نہ ملی۔ اور حکم ہوا کہ اسے چوہے سے آزماؤ۔ جب میں نے آزمایا تو ایسا ہی پایا۔ لہٰذا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ اب اپنے ملک کو واپس جاؤ جب تک کہ اس کا وقت آ جائے۔" اس واقعہ نے حضرت یوسف ابن الحسینؒ کے دل پر بہت اثر کیا۔ آپ ان کو اپنا مرشد مان کر ان کے حلقہ مریدی میں شامل ہو گئے۔ اور آپ سے بہت فیض پایا۔ ایک روز اپنے پیر و مرشد سے کہا کہ مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا "میں تمہیں تین وصیتیں کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ جو کچھ تم نے پڑھا لکھا ہے اس کو صفحۂ دل سے دھو ڈالو تاکہ حجاب نہ رہے۔ آپ نے فرمایا مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ دوسری وصیت یہ کہ مجھے فراموش کر دو کسی سے یہ نہ کہنا کہ میرے مرشد نے مجھ سے یہ کہا اور مجھ سے یہ فرمایا۔ کیونکہ یہ سب خودستائی میں داخل ہے۔" آپ نے کہا "میں یہ بھی نہ کر سکوں گا۔ حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا" تیسری یہ کہ لوگوں کو وصیت کرنا اور حق کی طرف بلانا۔" آپ نے کہا "ہاں میں ایسا کر سکوں گا۔" حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا۔ "مگر ایک [illegible] لوگوں کو وصیت کرتے وقت اپنے آپ کو [illegible] سمجھنا چاہیے لوگ آپ کی وصیت کو [illegible] [illegible] وصیت کرنا اور حق کی طرف [illegible]

والا دیا ہے۔" حضرت یوسف ابن الحسین نے ... ایسا ہی کروں گا۔" لہٰذا آپ رے کو واپس ہوئے ... وہاں جا کر وعظ و نصیحت کرنے اور لوگوں کو حقانیت ... میں بتانے لگے۔ رے کے لوگ بالکل جاہل تھے لہٰذا ... باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بعض تو آپ کی مخالفت ... لگے۔ یہ حال دیکھ کر آپ نے خیال کیا کہ یہاں سے ... نا چاہیئے۔ یہ ارادہ کر کے آپ واپسی کے لیے تیار ... گئے کہ اتنے میں کہیں سے ایک بوڑھی عورت آئی اور ... مخاطب کر کے کہا۔ "کیا تم نے ذوالنونؒ سے وعدہ نہیں ... تھا کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلاؤ گے، اور اپنے آپ کو درمیان ... نہ دیکھو گے، اب کیوں واپس جا رہے ہو؟" بڑھیا کی ... ت سن کر آپ حیران رہ گئے۔ دل میں کہا کہ یہ کون عورت ... و میرے اور میرے مرشد کے درمیان ہوئی بات اس کو ... پتہ چلا؟ بہرحال آپ اس کو غیبی تادیب سمجھ کر اپنا ارادے ... از آئے اور اپنے آپ سے کہنے لگے۔ "اے یوسف! تو اپنی ... کہے جا لوگ تیری بات سمجھیں یا نہ سمجھیں۔" آپ پھر وعظ ... نے لگے۔ کچھ عرصہ یہی حالت رہی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ... ایک بات بار بار دہرائی جائے تو دل و دماغ ضرور کچھ نہ ... ہ قبول کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے ان کی طرف رجوع ... ور تھوڑے عرصہ میں تمام لوگ آپ کے معتقد ہو گئے پھر ... حال ہوا کہ دن بھر آپ کے معتقد آپ سے مسائل تصوف ... افت کیا کرتے تھے اور جواب باصواب پاتے تھے ایک ... سی مرید نے دریافت کیا "رجا کیا ہے؟" آپ نے فرمایا ... بھروسا اور امید" اس امید پر کہ میرے مالک سے مجھے ... رہے اور اس پر بھروسہ کر کے ترک عبادت کرنا گمراہی ہے ... کہ خوف و رجا ایمان کے قائم کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اہل ... [illegible] گئے ہے اور اہل رجا امید و بھروسے پر عبادت ... [illegible] جس سے آدمی ضلالت میں پھنس جاتا ہے۔ جب ... [illegible] حاصل ہو جاتا ہے تو خوف و رجا دونوں ... [illegible] کے مصداق ہوتے ہیں۔ الغرض آپ ... [illegible] پایا۔ یہاں پر آپ سے متعلق

ایک دلچسپ واقعہ کا بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

آپ اکثر مراقبہ میں رہتے تھے اور خدا کی طرف رجوع کئے رہتے اس ریاضت و مجاہدہ نے آپ کو تنہائی پسند بنا دیا تھا اس زمانہ میں نیشاپور کے ایک سوداگر نے ایک ترکی کنیز ایک ہزار دینار میں خریدی۔ اس سوداگر کو نیشاپور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانہ میں نیشاپور میں ایک بڑے متقی اور دیانت دار شخص ابوعثمان حیری رہتے تھے۔ سوداگر کنیز کو لے کر عثمان حیری کے یہاں آئے اور آپ سے درخواست کی کہ حضرت مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ میں اس کنیز کو آپ کی تحویل میں دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہاں مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ میرے واپس آنے تک آپ اس کو اپنے پاس رکھئے۔ ابوعثمان نے اس کنیز کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سوداگر نے بہت منت سماجت کی اور کہا کہ آپ کی عورتیں اس کا خیال رکھیں گی اور آپ کی مجھ پر عنایت ہوگی الغرض بہت کچھ اصرار کے بعد حضرت عثمان حیری نے اس کنیز کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ یہ کنیز نہایت حسین تھی۔ اتفاقاً ایک دن حضرت عثمان کی نظر کنیز پر پڑی۔ اسی وقت عثمان کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ آپ بہت پریشان ہوئے۔ ایک طرف اتقا کا تقاضا دوسری طرف نفس کا مطالبہ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ آخر سوچ کر آپ اپنے شیخ ابوحفص کے پاس گئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ شیخ نے کہا تم یوسف ابن الحسین کے پاس جاؤ وہ یہ معاملہ سلجھا دیں گے۔ یہ سن کر عثمان رے کی طرف روانہ ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر لوگوں سے حضرت یوسف ابن الحسین کا پتہ پوچھا۔ لوگوں نے انہیں حیرت سے دیکھا اور کہا "تم صوفی اور روشن دل ہو اور اہل صلاح کا جامہ رکھتے ہو تمہارا اس سے ملنا حیرت اور افسوس کا مقام ہے۔ وہ تو ملحد۔ زندیق۔ بدعتی اور لوطی ہے۔ واپس تشریف لے جائیے ورنہ آپ اس کی صحبت سے نقصان اٹھائیں گے۔" عثمان حیری یہ سن کر بہت پریشان ہوئے اور واپس نیشاپور لوٹ آئے۔ اور اپنے شیخ سے ملاقات کی جب شیخ نے انہیں دیکھا تو پوچھا "کیا تم نے یوسف ابن الحسین

تو دیکھا؟" ابوعثمان نے جواب دیا "نہیں"۔ شیخ نے پوچھا "کیوں؟" ابوعثمان نے جو کچھ حضرت یوسف ابن الحسین کے بارے میں لوگوں سے سنا تھا۔ بلا کم وکاست اپنے شیخ سے بیان کر دیا۔ شیخ یہ سن کر کہا "تم پھر ایک بار جاؤ اور ان سے ملو۔" لہٰذا ابوعثمان بادل ناخواستہ رے جا کر حضرت یوسف ابن الحسین کے گھر پہونچے تو دیکھا کہ گھر کے دروازے کے آگے ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہے اس کے سامنے ایک خوب رو لڑکا بیٹھا ہے اور پاس ہی صراحی اور پیالہ رکھا ہے اور اس شخص کے چہرے پر نور برستا ہے۔ ابوعثمان نے ان بزرگ کو دیکھ کر سلام کیا اور ان کے قریب جا بیٹھے۔ یوسف ابن الحسین پر ابوعثمان کے حالات کا انکشاف ہو گیا تھا اور آپ سمجھ گئے تھے کہ کس لیے ان کے پاس بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا بلا کسی تمہید کے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اور اس قدر بلند وعجیب باتیں بیان کیں کہ ابو عثمان بیخود ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو کہا خواجہ ایسی باتوں اور ایسے مشاہدہ کے باوجود آپ کی یہ کیا حالت ہے اور کیا طریقہ ہے کہ آپ کے پاس شراب اور بے ریش لڑکا موجود ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ بے ریش لڑکا میرا بیٹا ہے جس کو میں قرآن پڑھاتا ہوں اور یہ کسی کو معلوم نہیں اور اس صراحی میں پانی ہے تاکہ کسی کو پانی کی ضرورت ہو تو وہ سیراب ہو۔" ابوعثمان نے کہا "مگر برائے خدا یہ تو بتلایئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ آپ کے متعلق بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ اور آپ سے بدظن ہیں۔" آپ نے فرمایا "اس لیے تاکہ کوئی شخص میرے پاس ترک گینہ کو "امانت" نہ رکھے۔" یہ سن کر ابوعثمان کے ہوش اڑ گئے کہ بغیر کچھ کہے یہ شخص ان کے مافی الضمیر سے کیسے پتہ لگا۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ صوفی باصفا اور بہت بڑے مجتہد ہیں۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے کہا بارخدا! میں نے خلق کو قول سے نصیحت کی اور اپنے نفس کو فعل سے نصیحت کی میری خیانت نفس کو اپنی خلق کی نصیحت کے بدلے بخش دے۔

حریمی دسترخوان

چائنیز پلاؤ

اشیاء۔ چاول پرانے باسمتی یا دہرہ دون آدھا کلو۔ مرغ کا صاف کیا ہوا گوشت ایک کلو۔ گھی ۱۵۰ گرام گوبھی کا پھول تقریباً ۱۰۰ گرام۔ ولایتی گاجر تقریباً ۱۰۰ گرام۔ انڈے دو عدد۔ پیاز سا گے دار ۴ گٹھی ہری مرچ حسب خواہش۔

ترکیب۔ مرغ کے گوشت کے پارچے بنا کر تھوڑے پانی میں ذرا سا نمک ڈال کر ابال لیں۔ گوبھی کے پھول کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ گاجر کی بھی قاشیں کر لیں۔ اور دونوں کو تھوڑا نمک ملا کر ابال لیں۔

چاولوں کو پانی میں ایک گھنٹہ بھیگنے دیں۔ پھر دو لیٹر پانی میں تھوڑا نمک ڈال کر جوش کر کے چاولوں کو اس میں ڈال دیں۔ جب ان میں کنی پیدا ہو جائے تو اتار کر چھان لیں۔

اب گھی کو کڑکڑائیں اور اس میں مرغ کے پارچے اور ابلی ہوئی سبزیاں اور ہری مرچ ٹکڑے کر کے ہلکی آنچ پر بھونیں۔ بھونتے ہی وقت انڈوں کو توڑ کر سفیدی اور زردی ملا کر ڈال دیں اور تیزی سے کفگیر چلائیں۔ بہت زیادہ بھوننے کی ضرورت نہیں۔

اس عمل کے بعد نصف چاول کسی کشادہ بھگونے میں پھیلا کر بھونا ہوا مرغ کا گوشت اور ترکاریاں چاولوں پر پھیلا کر بقیہ چاول ڈال دیں۔ بھگونے کو ڈھانک کر ہلکی آنچ پر دم کریں۔ اگر چاول خشک لگیں تو دو دودھ کا چھینٹا دے کر دم کر لیں۔

ضروری بات یہ ہے کہ چاولوں اور ترکاری وغیرہ میں نمک اس انداز سے ڈالیں کہ زیادہ نہ ہونے پائے۔

تیار ہونے پر اس طرح نکالیں کہ چاول اور گوشت و ترکاریاں مل جائیں۔

کیا چھن گیا

رضیہ بٹ

بچپن ہی سے انتہائی شرمیلی، کم گو اور حساس تھی۔ حویلی میں بچوں میں اس کا وجود الگ تھلگ تھا۔ سرخ و سفید گول مٹول سی کیے بالوں کی رنگت اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ٹوٹتے اندھیروں کی تھیں، جو عام بچوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی، جو کبھی چیخ چیخ نہیں تھی، ضد نہیں کرتی تھی، گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی نہیں تھی ـــ کبھی نہیں رگڑیں۔ کبھی زمین پر لوٹنے نہیں لگے۔ حالانکہ حویلی کے دوسرے بے جانی پہچانی خامیتیں تھیں ـــ بچوں کا کیا دوش، کے فطری تقاضے تھے، لیکن گڈو رانی منفرد تھی، خوش ہوتی تو آنکھوں سیاہیوں میں چاند سورج کی چمک اتر آتی اور اداس ہوتی تو گھنگھور گھٹاؤں کے اندھیروں میں سمٹ آتیں لیکن یہ گھنگھور گھٹائیں کبھی بڑی آنکھوں میں جھلمل جھلمل کرتی رہتیں اور دیکھنے والے کو اس پر پیار آجاتا۔

گھنگھور گھٹائیں سمٹ آنے کے مواقعے اکثر پیدا ہوتے رہتے۔ جب گڈو رانی سے زیادتی کرتا، اس کے حصے کی چیزیں اڑا لیتا، سے نکال دیتا یا اس کی سنبھال سنبھال کر رکھی گڑیا کی الٹ پلٹ کر دیتا، تو وہ بس آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتی۔ ننھی خوبصورت آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو دیکھ کر بڑوں کا جاتا اور پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور پوچھتا۔

"کیا چھن گیا گڈو رانی؟"

اور گڈو رانی آنسو آنکھوں ہی آنکھوں میں پینے کی کوشش ہوئے اتنی پیاری لگتی کہ بے ساختہ اسے دل میں بٹھا لینے خواہش پیدا ہوتی۔ اس کی چیزیں چھیننے والے کی تو بس شامت خاص کر عمو بھیا جب گڈو رانی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ ـــ تو بس بچوں کی خیر نہ ہوتی۔

ان دنوں عمو بھیا ایف اے میں پڑھا کرتے تھے۔ دادی سب سے بڑے پوتے ہونے کے ناطے خیر نہ ہوتی۔

ویسی بھی بچوں کی فوج ظفر موج پر ان کا بڑا رعب تھا۔ اس پر جب گڈو کی طرف داری ہوتی تو خدا جانے انھیں اتنا غصہ کیونکر آجاتا۔ ان کی ایسی ہی حرکات سے تو بچے گڈو کے بیری سے ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے تو گربہ مسکین بنے رہتے لیکن جب وہ کالج جاتے یا کہیں باہر گئے ہوتے تو دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

گڈو رانی بھی نوجوان ہو گئی تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے سامنے آنکھیں بھر بھر لاتی۔ وہ صرف یہی پوچھتے۔

کیا چھن گیا گڈو رانی؟"

اور بس پھر گڈو رانی کے منہ سے الفاظ نکلنے کی دیر ہوتی، کوئی نہ کوئی بچہ ان کے شکنجے میں جکڑا جاتا اور اس وقت تک خلاصی نہ ہوتی جب تک گڈو رانی کی آنکھوں کی گھنگھور گھٹائیں چھٹ نہ جاتیں اور اس کی آنکھوں کے اندھیرے چمک نہ اٹھتے۔

وہ تو بچوں نے اس دن خدا کا شکر کیا جب عمو بھیا نے بی اے کا داخلہ لاہور میں لے لیا۔ اور پھر تعلیمی سلسلوں میں باہر ہی رہنے لگے۔

وقت گزرتا گیا۔ حویلی کی رونقیں سمٹتی گئیں۔ خالد چچا ایران چلے گئے۔ آمنہ پھوپھو کراچی میں آباد ہو گئیں۔ بڑے تایا کا کاروبار پنڈی میں شروع ہو گیا۔ سلیمہ آپا لاہور آگئیں۔ حویلی میں دادی اماں اور بڑی چچی ہی رہ گئیں۔ گڈو رانی بھی اپنے والدین کے ساتھ نوکریوں کے سلسلے میں شہر شہر گھومتی پھری۔ کبھی نہ ہوا کہ سارا کنبہ قبیلہ پہلے کی طرح اکٹھا ہو گیا ہو۔ کبھی ایک آیا اور دوسرا چلا گیا۔ یوں ہی ہوتا رہا۔

اور ـــ!

دس سال گزر گئے۔ ننھے منے بچے جوان ہو گئے۔ چھ سات سال گڈو بھی سولہ سترہ سالہ دوشیزہ کا روپ دھار گئی۔ لیکن عادت اب بھی ویسی تھی۔ خوشی اور غم کا تاثر اس کی آنکھوں ہی سے مترشح ہوتا تھا۔ کبھی چاند سورج چمک جاتے اور کبھی گھنگھور گھٹائیں اتر آتیں۔

ان دنوں وہ پورے دو ماہ کے لئے دادی اماں کے پاس آئی تھی۔ چھٹیاں یہیں گزارنا تھیں۔ پہلے پہل تو دل نہ لگا لیکن جب خالد چچا اپنے بھرے پرے خاندان کے ساتھ آگئے اور سلیمہ آپا بھی اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ پہنچ گئیں تو رفو اور شاداں کی قربت میں وقت خوب گزرنے لگا۔

خالد چچا کا بیٹا عثمان تو اب چھ فٹ کا گرانڈیل آدمی بن گیا
تھا۔ گڑیا رانی کو اب بھی چھیڑتا تھا ویسے ہی جیسے بچپن میں۔
تینوں اکثر بچپن کے ان دنوں کو یاد کرتے تھے جو عمو بھیا سے پٹائی
یاد کر کے عثمان کان پکڑتا۔
"میرے کان ہی پلے کر دیئے عمو بھیا نے کھینچ کھینچ کر۔"
"آپ کون سا باز آ گئے۔"
گڑیا ہنس کر کہتی۔
"اب بھی اسی طرح ستاتے ہو۔"
"عمو بھیا جو نہیں ہیں یہاں۔ بخدا ہم بچپن کا ایسا خوف دل
میں بیٹھا ہے کہ عمو بھیا اب بھی آ جائیں تو ان کے سامنے آپ کو چھیڑنا
ستانا تو رہا ایک طرف، میں آپ کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی
نہ کر سکوں گا۔"
گڑیا رانی جواب میں فخر سے مسکرا دیتی۔
اور اس کی یادوں میں ننھے ننھے چراغ جل اٹھتے۔ دھیمی دھیمی
یہ کتنی فرحت بخش [illegible] ہوتیں۔
عمو بھیا کتنے اچھے تھے، ان کی اچھائی اس کے ذہن کے کسی
گوشے میں چھاپ لگا گئی تھی اور لاشعوری طور پر اسے یوں لگتا،
جیسے وہ اس کے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ گو انہیں دیکھے مدتیں
ہو گئی تھیں۔ دس سالوں میں بمشکل تین چار بار دیکھا ہو گا وہ
بھی تھوڑی دیر کے لئے لیکن وقت اور فاصلے کوئی اہمیت ہی نہ
رکھتے تھے۔
ان دنوں اس کا جی بے طرح چاہتا کہ عمو بھیا آ جائیں عثمان
اسے ستائے اور وہ اسی معصومیت سے پوچھیں۔ "کیا کہہ گیا
گڑیا رانی؟"
اور پھر ... وہ مسکرانے لگی۔
عثمان کے کان پہلے ہی کافی بڑے تھے۔ لیکن اسے یوں
لگتا جیسے عمو بھیا نے واقعی اس کے کان کھینچ کھینچ کر لمبے کر دیئے
ہوں۔
گڑیا رانی [illegible]
[illegible]

یہ کہہ کر اس نے ہنستے ہوئے عثمان کو بتایا۔
"عمو بھیا آ رہے ہیں، ذرا ٹھیک کر بیٹھ جاؤ، کان کھینچیں گے۔"
"اور آپ بھی سن لیجئے ان کے سامنے بہت بنتے تھا کہیں وہ
ان کے جانے کے بعد گن گن کر بدلے اسی طرح لے جائیں گے۔ جیسا
دس بارہ سال پہلے لیتیں؟"
عمو بھیا آ گئے۔
گڑیا تو انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ کچھ یہی حال عمو
کا بھی ہوا۔ چھ سات سال کی بچی سولہ سترہ سال لڑکی کے پیکر میں ڈھل
گئی تھی۔
گڑیا رانی کا جی چاہتا، بچپن کے بیتے دن پھر سے لوٹ آئیں
لیکن اس نے دیکھا، عمو بھیا اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے
اور عثمان بھی اس کے قریب پھٹکتا نہیں تھا۔ وہ تو عمو بھیا سے
ڈرتا لیکن عمو بھیا کس سے ڈرتے تھے؟
بھولی بھالی معصوم سی گڑیا رانی کو بھلا کون سمجھاتا کہ عمو بھیا
تو ان دنوں اپنے آپ سے ڈرنے لگے تھے۔ اسے دیکھ کر تو وہ عجیب
کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہیں تو یوں محسوس ہونے لگا تھا
گڑیا رانی ان کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔
لیکن اس خواہش کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔
اماں اور دادی اماں نے تو ان کی نسبت صوفیہ سے ٹھہرا دی
صوفیہ جس نے اسی سال ایم اے کر لیا تھا۔
اور چوبیس سالہ پختہ شعور والی لڑکی تھی۔
عمر، تعلیم اور ذہنی ہم آہنگی ہی کی بنا پر عمو بھیا نے بھی
اس رشتے کے لئے رضامندی دے دی تھی۔ اب امی مشکل کے
تھیں۔ صوفیہ کے والدین نکاح کے لئے اصرار کر رہے تھے۔
اقرار اور اصرار کا سلسلہ چل رہا تھا۔
عمو بھیا کے اندر کوئی جذبہ چھپا تھا۔
انہیں انکار کے لئے اکسا رہا تھا۔
لیکن یہ جذبہ عمر کی جس منزل میں [illegible]
بھی نہ سکتے تھے۔ گڑیا رانی ان سے دس سال [illegible]
چھ سات سال کی بچی کا احساس اب تک ذہن میں تھا۔
[illegible]

وار کئے کہ وہ بوکھلا گئے۔

گڈ ورانی کی معصومیت اور بھولپن نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شعوری تقاضے کا گلا گھونٹ دیں۔ یہ آسان عمل نہیں تھا پھر بھی وہ اس سے گذر ہی گئے۔ اسی دن انھوں نے اماں سے کہہ دیا۔

"اسی ہفتے نکاح کی تاریخ رکھ لیں اماں، میری چھٹی ختم ہو رہی ہے!"

وقت کم تھا۔ اماں جو دھوم دھام سے بڑے بیٹے کے نکاح کی رسم کرنا چاہتی تھیں، مجبور ہو گئیں۔ گھر کے بڑے بڑے فرد جمع تھے۔

عمو بھیا دولہا بنے اور نکاح کی رسم کے لئے چھ سات مردوں اور پانچ چھ عورتوں کے ساتھ صوفیہ کے ہاں چل دیئے۔

سارا دن گہما گہمی رہی۔ لوگوں کا شور، شہنائیوں کی گونج اور رنگ برنگے لباسوں کی چمک سے عمو بھیا گھبرا گھبرا گئے۔ سارا وقت یہی احساس ڈستا رہا کہ کوئی غلط قدم اٹھا لیا ہے۔ کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ جب شادماں قافلے لئے عمو بھیا کے ساتھ حویلی واپس آیا، مبارک سلامت سے فضا گونج اٹھی تھی۔ کی لڑکیوں نے فرش کیا اور شاداں نے ڈھولک بجائی گیت گائے۔ اماں اور دادی اماں خوشی سے جھوم جھوم گئیں۔

عمو بھیا سارے ہنگامے سے دامن چھڑا کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آگئے۔ ٹلے اور پھولوں کے ہار گلے سے بڑی بے دلی سے اتارتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ لیکن وہ دروازے ہی میں ٹھٹک گئے۔

کمرہ برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور گڈ ورانی ان کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید آہٹ ہوئی، وہ ایک دم پلٹی۔ عمو بھیا کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر جانے کیا ہوا۔ ایک دم ... آنکھوں کے سیاہ اندھیرے میں گم ہو گئے ... بڑا ... میں دس سال ... آگے بڑھے اور بیاہ ... بولے!

لیکن وہ اس سے آگے نہ بول سکے۔ گھنگھور گھٹائیں پھٹ کر برسنے لگیں۔ بھیگا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے گڈ ورانی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

"کیا چھین بھیا گڈ ورانی" عمو بھیا کیسے نقرہ مکمل کرتے، وہاں تو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

عمو بھیا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے کانوں پر رکھ لئے۔ مبادا اپنی ہی چیخ سے کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں۔

اردو میں پتہ لکھنے کی سزا

۹ ستمبر میں حریم کی ایک خریدار بہن شباب آرا صاحبہ پوسٹ کارڈ وصول ہوا جو نسیم انہونوی کے نام بریلی سے ۲۰ ستمبر ۱۹۸۲ء کو حریم نہ ملنے کی شکایت کے سلسلہ میں لکھا گیا۔ آپ کو یہ جان کر یقین ہو جائے گا کہ ہماری حکومت اردو کے لئے کیا کر رہی ہے یہ کارڈ ساڑھے پانچ مہینے تک اس لئے ڈلیور نہ کیا جا سکا کہ اس پر پتہ اردو میں لکھا گیا تھا۔

برقع کا مذاق

لکھنؤ میں حکومت کی جانب سے ہر سال ایک تقریب جشن لکھنؤ کے نام سے منائی جاتی ہے۔ امسال بھی بڑے دھوم دھام سے یہ جشن منایا گیا۔ اس کے کار پردازان قابل مبارک باد ہیں کہ وہ لکھنؤ کی عظمت گذشتہ کی جھلکیاں دکھا کر لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ لکھنؤ کیا تھا، اور کیا ہے۔ لیکن اس جشن میں ہر بتانے والا یہ باہر جانے کا سبب ایک منظر یہ دکھایا گیا کہ سبزی ترکاریوں کی دکان ایک برقع پوش خاتون کے سامنے لگی تھی۔ ہر دیکھنے والا یہی سمجھ سکتا ہے کہ برقع پوش لکھنؤ میں سبزیاں فروخت کیا کرتی ہیں جبکہ میں نے اپنی ۶۰ سالہ ہوشمندی کی زندگی میں لکھنؤ کے کسی بھی حصے میں برقع پوش سبزی فروش نہیں دیکھی۔ یہ منظر دل آزار تھا۔ قومی یکجہتی کی کوشش حکومت کے کسی بھی شعبے کو ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہئے۔

جشن لکھنؤ کے سلسلہ میں ڈولی، الیفیں اور ہوا دار کی نمائش ضروری تھی، جو سماں کے شرفا کی خاص سواریاں تھیں۔

یادوں کا سایہ

ریحانہ مہر

طویل رات دھیرے دھیرے سرک رہی ہے۔ اور اس کی تنہائی اور تاریکی میں ہمیشہ کی طرح میں آج بھی اپنے آپ کو محفوظ تصور کر رہی ہوں۔ رات جو میری واحد پناہ گاہ ہے اور اس کا اندھیرا جو میرا مستقل ساتھی ہے۔ میں نے اندھیروں کو اپنا ساتھی بنا رکھا ہے۔ اور جب شب کا دامن چاک کر کے صبح کے دیوتا کی شعاعیں ہر سمت اپنے اُجالے بکھیرنے لگتی ہیں تو مجھے خوف سا آنے لگتا ہے۔ میں اپنے چہرے کو اندھیرے میں چھپانے کے لئے کبھی آنچل اور کبھی ہتھیلیوں کا سہارا لینے لگتی ہوں۔ دن کی روشنی میں جب ایک ایک گوشے سے انسانوں کے اژدہام اُبلنے لگتے ہیں تو میرا کمزور سا وجود لفظاً کہاں کہیں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور اجالوں کے اس سمندر میں اس چھوٹے سے سیاہ دھبے کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

لگتا ہے شاید اب بہت تھک چکی ہوں۔ وقت کا یہ تسلسل مجھے ہر رات بیقرار کر جاتا ہے۔ ہر لمحہ مجھے اس زخمی پنچھی کی مانند نظر آتا ہے۔ جو آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا اور پر پھڑپھڑاتا ہے۔ ہر رات میرے ماضی کا بھر دکھڑا ہوتا ہے اور ہر رات میری نگاہوں کے آگے تم دونوں آ جاتے ہو۔ تمہارے الفاظ میرے کانوں میں چھید کرنے لگتے ہیں۔

کیپٹن خرم اور پروفیسر حامد آج کی شب بھی تم دونوں مجھے بڑی شدت سے یاد آ رہے ہو۔ یوں تو میری زندگی میں بہت سے لوگوں نے آنے کی کوشش کی۔ لیکن تم دونوں ایسے ہو۔ جو مجھے راہِ راست پر لانا چاہتے تھے۔ مجھے زندگی کا اصل مفہوم سمجھا رہے تھے لیکن میں سمجھتی تھی جو راہ میں نے اختیار کی ہے شاید وہی منزل کی طرف جاتی ہے۔ لیکن آج جب تمام راستے طے کر کے منزل پر پہنچی ہوں تو احساس ہوا ہے۔ کہ یہ تو میری منزل نہیں تھی میں تو اپنی منزل کی راہوں سے بھٹک گئی تھی۔ تم واقعی ہی [illegible] جس میں میری [illegible] تھی [illegible] آج

آج پہلی بار میں نے اپنی کتاب ماضی کو کھولا ہے جس کے صفحات کی گرد نے دبیز تہیں ڈال کر اس کی رنگت بدل دی ہے۔ شاید اس کی رنگت اس لئے بدلی ہے کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں تھی۔ میں نے اپنی نظر ہمیشہ آگے کی طرف رکھی۔ جو لمحہ بیت گیا میں نے سمجھا وہ ختم ہو گیا لیکن یہ میری بھول تھی گذرے ہوئے لمحات نے آج مل کر ایک بھیانک ماضی کا روپ دھار لیا ہے۔ بیتے وقت کا ایک ایک لمحہ بھوت بن کر میرا تعاقب کر رہا ہے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان لمحوں کی گرفت میں آ گئی ہوں۔

آج مجھے پھر وہ خوفناک اور افسردہ رات یاد آ رہی ہے جب میری ماں ہسپتال کے اجلے بستر پر زندگی اور موت کے فاصلے شمار رہی تھیں۔ تب انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے چہرے کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر کپکپاتے لبوں سے یہ الفاظ کہے تھے۔

"حنا میں اپنے گھر کو تمہارے حوالے کر کے جا رہی ہوں۔ اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا تمہارے باپ کے گھر کو میں نے بنایا اب اسے اجڑنے سے تمہیں بچانا ہے" ماں بھیگی آنکھیں لئے مجھ سے وعدہ مانگ رہی تھی۔ اور اس وقت مجھ میں سمجھانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں نے اپنی ماں سے وعدہ کر لیا کہ میں اس گھر کو اجڑنے سے بچاؤں گی۔ میری ماں کو شاید میرے اوپر بہت بھروسہ تھا۔ تب ہی اس نے میرے ناتواں کندھوں پر اتنی بڑی ذمہ داری ڈال دی۔

میں اس وقت جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی اپنا سب کچھ بھول گئی۔ میری ذات میری نہ رہی۔ میرے خیالات میرے نہ رہے۔ اگر کچھ میرا تھا۔ تو وہ اک وعدہ جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا مجھے نبھانا تھا۔ میرے دل و دماغ میں یہی ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ میرا جینا اور مرنا اسی گھر کے لئے ہے۔ میری تمام فکریں صرف اس گھر کے لئے تھیں۔

جب میں سیکنڈ ایئر میں تھی تو کیپٹن خرم تم نے میری زندگی میں آنے کی کوشش کی۔ میرے گردنی مضبوط ہاتھ کو پھیلا کر [illegible] آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں اور فرزانہ ڈرائیو کا آخری [illegible] کرنے کے بعد ہاتھوں میں کپ پکڑے گیٹ کی طرف آ رہے [illegible]

ثمینہ ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ تب ہی ایک اجنبی نے دور ہی سے آواز دی۔ ثمینہ میں ادھر ہوں۔ اور وہ میرا ہاتھ پکڑے ادھر ہی آگئی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ ہو گیا ہے تمہارا انتظار کرتے ہوئے۔ اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوہ ـــ سوری بھیا دراصل آج آخری دن تھا۔ انعامات کی تقریب بھی تھی۔ اس لئے دیر ہوگئی ہے۔ ارے ہاں بھیا ان سے ملیں یہ میری بہت اچھی دوست ہیں حنا اور آج کے ڈرامے میں فرسٹ پرائز انھوں نے ہی حاصل کیا ہے۔"

اجنبی نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور دھیرے سے بولا بڑی خوشی آپ سے مل کر فرسٹ پرائز میری طرف سے بھی مبارک ہو۔

شکریہ میں نے مختصر سا جواب دیا اور اجازت لے کر گھر آگئی لیکن پھر خرم یہ میری تم سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ہماری یہ ملاقات بہت مختصر اور رسمی سی تھی۔ اور سچ پوچھو تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ لیکن لگتا ہے۔ تم نے اس ملاقات کو بہت اہمیت دی تھی۔ اسی لئے تو اب ثمینہ کالج میں تمہارا ذکر بہت زیادہ کرنے لگی تھی۔ میں سمجھتی کہ شاید تم دونوں بہن بھائیوں کا آپس میں پیار زیادہ ہے۔ اسی لئے شاید وہ تمہارا ذکر زیادہ کرتی ہے۔ جب میں اس کا اصل مقصد نہ سمجھ سکی تو ایک دن اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ۔

" حنا! میرے بھیا تجھے اپنانا چاہتے ہیں۔ انھیں میں نے تمہارے متعلق تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ کہتے ہیں مجھے بابخت لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ اور اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میری امی آپ کے گھر پر لیکر درخواست آئیں۔ خرم بھیا کو تو اس روز تم نے دیکھا ہی تھا۔ کتنے ہینڈسم ہیں" ثمینہ باتیں کئے جا رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نے میرے پاس ایٹم بم پھوڑ دیا ہے یہ ایک لمحہ جس کا ہر لڑکی کو بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ میری زندگی میں آیا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ میرے مقصد میں اٹکنے والا پہلا پتھر ہے۔ اور میں جو اپنا مقصد پانا چاہتی تھی راستے کے اس پتھر کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ میں نے ثمینہ سے کھلے لفظوں کہہ دیا کہ تم نے اور تمہارے بھیا نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ میری زندگی کا مقصد اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے۔ اور شادی میری زندگی کے مقصد کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس لئے بہتر ہی ہوگا کہ شادی کے مسئلے سے متعلق دوبارہ تم مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔ میرے انکار پر ثمینہ اور تمہارے سب گھر والوں کو دکھ ہوا۔ وہاں تمہیں بھی بہت دکھ ہوا۔ دوسرے روز تم نے ثمینہ کے ہاتھ مجھے رقعہ بھیجا۔ جس میں لکھا تھا

حنا! عورت ہمیشہ اپنے گھر میں اچھی لگتی ہے۔ اور جسے آپ اپنا گھر سمجھ بیٹھی ہیں حقیقت میں وہ آپ کا نہیں آپ کے والدین کا گھر ہے۔ اپنا گھر وہی ہوتا ہے جو شوہر کا ہو آج تو آپ مجھے یہ کہہ کر ٹھکرا رہی ہیں کہ شادی میرے مقصد کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے لیکن کل ایسا وقت آئے گا جب آپ کو شدت سے احساس ہوگا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ لیکن اس وقت کچھ بھی تو نہیں ہو سکے گا کیونکہ گیا وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ آپ ایک بار پھر سوچیں ہو سکتا ہے۔ آپ کا فیصلہ غلط ہو۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

کیپٹن خرم

خط پڑھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے مختصر خط لکھ کر ثمینہ کو دے دیا۔ میں نے لکھا تھا۔

جناب خرم صاحب۔ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنی سوچ کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہے۔ وہ جس طرح چاہے گزار سکتا ہے اس لئے آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ میری نظر میں وہی ٹھیک ہے۔ اگر یہ فیصلہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ تو اس کا خمیازہ بھی مجھے بھگتنا پڑے گا۔

میرے اس خط کے ساتھ ہی یہ قصہ ختم ہوا۔ نہ کبھی ثمینہ نے دوبارہ اس موضوع پر بات کی نہ ہی میں نے۔ تمہاری شادی کہیں اور ہوگئی۔ اور خطرہ ٹل گیا۔ میں پھر پرسکون ہوگئی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میں قلم اور کاغذ کا سہارا لے کر کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی۔ مختلف میگزین میں لکھ کر میری تسکین ہو جاتی۔ اچھی کتابیں اور معیاری رسالے میری تنہائیوں کے ساتھی تھے۔ ان کی رفاقت میں وقت اچھا گذر جاتا۔ میرے بہن بھائی بھی بڑے ہوتے رہے وقت کے سمندر میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ ہماری کشتی خراماں خراماں منزل کی طرف رواں تھی۔ اور تب اس ٹھہرے سمندر میں ایک پتھر پھر دیکھو ظالم تم نے ہی پھینک دیا۔ میری

پرسکون زندگی میں پھر ہل چل مچ گئی۔ میں اکثر تمہاری تحریریں
مختلف میگزین میں پڑھا کرتی تھی۔ اور کسی حد تک تمہاری تحریر سے
متاثر بھی تھی۔ مگر یہ تعلق صرف نام کی حد تک شناسائی تھی۔
ایک روز تمہاری تحریر کے ایک کارڈ مجھے وصول ہوا جس کے ساتھ
مختصر سا خط تھا۔

میری بہن کی شادی ہے اس میں کافی ادبی لوگ
شرکت کر رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی تشریف لائیں!

پروفیسر حامد رضا

میں چونکہ تمہاری تحریروں سے متاثر تھی اس لئے مجھے تمہیں
دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے لیکن
کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دل بہت چاہا کہ تمہاری اس دعوت کو
قبول کر لوں۔ لیکن پھر نجانے کیا سوچ کر میں نے تمہیں لکھ دیا۔
حامد صاحب۔ دعوت نامہ ارسال کرنے کا بہت بہت شکریہ۔
لیکن معذرت خواہ ہوں کہ اس خوشی کے موقع پر حاضر نہ ہو سکوں گی۔ حنا

ابھی چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ کال بیل بجی۔ میری
چھوٹی بہن نے دروازہ کھولا [illegible] آپ کو پوچھ رہے
ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔
تھوڑی دیر بعد جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں بیٹھے
اجنبی شخص کو میں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ
[illegible] بولے۔ جی ہم آپ کی زبردستی [illegible] آپ کے ابا نے
[illegible] پروفیسر حامد کے گھر سے آئے ہیں
[illegible]

ابھی لوگوں سے مل رہی ہیں۔ [illegible] ان سے ملیں اور وہ
[illegible] سے جانتے ہیں۔ حامد کی بہت تعریف اور ابھی بھی
تمہیں پیار کرتے ہوئے باتیں [illegible] ہم سب گھر والے تمہاری تحریر
پڑھتے ہیں۔ ماشاء اللہ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ ابھی حامد آئے
انہیں بھی تمہارے آنے کی بہت خوشی ہوگی۔ اور تب انھوں نے
پہلے کہا گھر والے سے حامد کو بلا لائے۔
اور حامد اور وہ [illegible] مجھے آج بھی یاد ہیں۔ جب تم گھر میں
ہوئے تو تمہاری سب بہنیں اور کزن زور سے ہنسیں۔ حامد بھائی
بہنیں دیکھیں کون آیا ہے۔ اور تم گھبرائی گھبرائی خوب صورت نظروں سے
مجھے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ لگتا ہے حنا صاحبہ آئی ہیں۔ مگر میری
پہلی ملاقات تھی [illegible] چاہیے کہ تم نے پہلی نظر
میں مجھے پہچان لیا [illegible] میں تم [illegible] خوب صورت
رہے تھے تمہاری شخصیت کافی متاثر کن تھی۔ میں پہلے تو تمہاری
تحریروں سے متاثر تھی جب ہی تمہاری شخصیت سے بھی بہت
ہوئی۔ تمہاری شخصیت میں ایک سحر تھا۔
شادی میں شرکت کرنے کے بعد میں واپس چلی آئی۔ اور یہیں سے ہم
دونوں کے گھر والوں کے درمیان تعلقات پیدا ہوگئے۔ تمہاری بہنیں
جب بھی بازار آتیں میرے گھر ضرور آتیں۔ کبھی کبھار میں بھی تمہارے
ہاں چلی جاتی۔ تم کافی [illegible] شخصیت کے مالک تھے۔ میرے خیال
میں میرے علاوہ اور کوئی بھی ہوتا تو وہ تمہاری شخصیت سے متاثر
ہوتا۔
[illegible]

[illegible] جب دیا اور جواب کر جب دو حصوں میں تقسیم [illegible] ایک طرف [illegible] اور [illegible] دوسری طرف [illegible] اور [illegible] تھے۔ بہت حسرت سے اس کی باتیں سنتی اور تمہیں [illegible] تمہاری شادی کی بات پر آنٹی نے مجھے بتایا کہ خاندان میں تمہارے لئے دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آنٹی کی بات کی تائید کرتے ہوئے تمہیں کہہ دیا۔ ہاں اب آپ شادی کر ہی ڈالیں۔ سر کے سارے بال تو سفید ہو رہے ہیں کیا بوڑھے ہو کر شادی کرنی ہے۔ اور تم ہنس کر بولے تھے مجھ میں ابھی کم از کم بیس سال تک بوڑھا نہیں سکتا۔ اگر چند ایک بال سفید ہو گئے ہیں۔ تو کیا ہوا۔ میں زندہ دل آدمی ہوں اور کہتے ہیں زندہ دل آدمی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ جس کا دل جوان وہ خود بھی جوان۔ بات ہنسی ہنسی میں ختم ہو گئی اور تم گھر لوٹ آئی۔

چند روز گزرے ہوں گے کہ مجھے تمہارا خط وصول ہوا۔ جس میں تم نے لکھا تھا۔

"حنا اس روز تم میری شادی کے بارے میں کہہ رہی تھی تمہارے کہنے پر شادی کرانے پر میں تیار ہو جاتا ہوں۔ مگر میری بھی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ میں شادی تم سے کروں گا کسی اور سے نہیں۔ اگر منظور ہو تو امی کو بھیج دوں۔ (حامد رضا)

تمہارا خط پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تم جاب اچھی بھلی شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ تمہارے پاس دولت شہرت، عزت سب کچھ ہی تو تھا — خاندان کی ہر لڑکی تمہارے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور تم نے کس کا خواب دیکھا۔ جس نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ جس کے اپنے خواب ادھورے تھے۔ وہ بھلا کسی دوسرے کے خواب میں رنگ کیسے بھر تی۔؟ میں بہت پریشان ہوئی۔ تمہارا خط پڑھ کر غصہ بھی بہت آیا۔ تم جو میرے تمام حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور میرے خیالات کو سمجھتے تھے۔ تمہیں یہ بھی علم تھا کہ شادی کا میرا کوئی ارادہ ہی نہیں اور میں نے کبھی اس [illegible] سوچا ہے۔ پھر بھی تم نے ایسا کیا تو مجھے یوں لگا جیسے [illegible] مذاق کر رہے ہو۔ [illegible] میں سوچتی شاید تم نے [illegible] مذاق کیا ہے۔ لیکن یہ مذاق نہیں ایک [illegible] گھر والوں کے

سامنے پیش کر دیا۔ اور جب آنٹی نے مجھ سے میری رائے پوچھی تو میں تڑپ اٹھی۔

"آنٹی آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں شادی کے کتنے خلاف ہوں۔ مجھے شادی وغیرہ نہیں کرنی۔ پھر آپ لوگوں نے یہ سب کیسے سوچ لیا۔ کہ میں ایسا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گی میرا آج بھی وہی جواب ہے جو میں حامد کو دے چکی ہوں۔ آنٹی بھی مایوس ہو کر چلی گئیں۔

حامد گو کہ تم ایک مکمل انسان تھے۔ میں تمہیں پسند بھی کرتی تھی۔ لیکن صرف ایک دوست کی حیثیت سے۔ میرے حالات ہی ایسے تھے کہ میں شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی اگر میں نے شادی کر لی تو ہمارا گھر تباہ ہو جائے گا۔ مجھے اپنے گھر کو تباہی سے بچانا تھا۔ امی ابو سے کیا ہوا وعدہ نبھانا تھا۔ اسی لئے میں نے تم سب کو چاہتے مجھے اتنا پیار دینے والے لوگوں کو مایوس لوٹا دیا۔ میرے انکار کرنے پر پھر تم خود مجھ سے ملے۔ اور افسردہ لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولے۔ حنا ایک بار پھر سوچ لو۔ خوشیاں بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتیں۔ ہماری خوشیاں ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ ہمیں ہاتھ بڑھا کر خود ان بکھری ہوئی خوشیوں کو سمیٹنا چاہیئے۔ تمہیں اپنے در پر آئی ہوئی ان خوشیوں کو ٹھکرانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ہاتھ بڑھا کر وصول کر لینا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ کل تم سارا الزام زندگی پر دھر دو کہ زندگی نے تمہیں کوئی خوشی نہیں دی وہ زندگی تمہیں یہ موقع فراہم کر رہی ہے۔ بس تمہارے ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔"

تم مجھے کتنی ہی دیر سمجھاتے رہے۔ طرح طرح کی مثالیں دیتے رہے لیکن میرا ایک ہی فیصلہ تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنے گھر اور بہن بھائیوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ اپنے نہیں بلکہ ان کے کل کے متعلق سوچنا ہے۔

"لیکن حنا تم اپنی زندگی پر یوں جبر نہیں کر سکتیں، ہماری یہ زندگی ایک مقدس امانت ہے اس زندگی پر ہمارا اپنا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔ تم دوسرے کے پیچھے اپنی ذات کو اس کا حق تو دو۔ تم دوسرے کے پیچھے اپنی ذات کا حق کیوں سلب کرتی ہو۔ میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب تم خود ہی اپنی اس سوچ پر پچھتاؤ گی۔ لیکن اس وقت شاید تمہارے در سے سب خوشیاں مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوں گی۔ تب بیٹھی تم اپنے مقدر کو روتی رہنا" یہ سب

کیونکہ تم غصے میں اٹھ کر چلے گئے اور میں ایک بار پھر سکون ہو گئی۔ اس حالت کبھی کبھی مجھے تم پر بہت ترس آتا۔ لیکن شاید میں ترس کھانے کے سوا اور کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد تمہاری شادی اپنی ایک کزن سے ہو گئی۔ تم نے مجھے اپنی شادی پر بھی بلایا۔

وقت گزرتا رہا اور حالات بھی بدلتے چلے گئے۔ میں نے بڑے بھائی کی شادی کر دی۔ اب گھر میں بھابھی کے آنے سے رونق بڑھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں تبدیلی آنے لگی۔ میں زندگی کے اسٹیج پر قسمت کا کھیل بڑی تیزی سے کھیل رہی تھی اور جب بازی جیتنے کا وقت آیا تو نشانوں سے پہلے سانپ نے مجھے ڈس لیا۔ کھیل کی ساری بساط الٹ گئی۔ میں سب کچھ جیت کر بھی ہار گئی۔ جیت کے کنارے پر پہنچ کر میں پھر ہار کے منجدھار میں گر پڑی۔ میرا بھائی جس کو میں نے اتنے ارمانوں سے پالا تھا۔ اس نے میری محنت اور قربانی کا یہ صلہ دیا کہ میرا وجود اس کے لئے اس گھر میں ناقابل برداشت ہو گیا۔۔۔۔ جس نے اس گھر کو بنانے اور اس میں خوشیاں لانے کے لئے تم جیسے عظیم انسانوں کو ٹھکرا دیا اب بہت ہوں اور میری یہ طویل سیاہ راتیں۔ زندگی کے تمام راستے مسدود لگتے ہیں۔ آج جب وقت مجھے ایک ایسے دوراہے پہ لے آیا ہے جس کا میں نے تصور کبھی نہیں کیا تھا تو یقین مانو۔

پروفیسر حامد اور کیپٹن خرم تم دونوں مجھے بڑی شدت سے یاد آتے ہو۔ تم دونوں کی کہی ہوئی باتیں کتنی سچ نکلیں۔ آج مجھے احساس ہوا ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کے شوہر کا گھر ہے۔ والدین کے گھر تو اس کا عارضی بسیرا ہوتا ہے۔ میں جو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں تھی آج پیچھے کی سمت بڑھ رہی ہوں۔ جیسے لمحوں کا تعاقب کر رہی ہوں جن میں میرے لئے اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آج جب کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ لیکن زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئی ہوں۔ میرا رشتوں پر سے مان ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے رشتوں کی پہچان ہو گئی ہے۔ اپنی جوانی کے دس سال قربان کر کے میں نے اپنی ماں سے کیا وعدہ تو پورا کر دیا ہے لیکن اندر سے میں بالکل کھوکھلی ہو گئی ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اور میں یہ التجا کرتی ہوں کہ ... خوشی کے لمحے ... پچھتاوے اور ندامت کے۔

پیغام برائے خواتین

از اُم ہانی ۔ لکھنؤ

زمانہ نے ہم کو کہاں لا کے ڈالا
کہ ہر آن ہے اپنا شیطاں سے پالا

بصیرت پہ غفلت کے پردے پڑے ہیں
ردا ہم ذلالت کی اوڑھے کھڑے ہیں

مقام ہم نے اپنا نہ دنیا میں پایا!
خود اپنے ہی ہاتھوں ستم ہم نے ڈھایا

بلا زاد راہ عاقبت کا سفر ہے
ہے دل غمزدہ اور پشیماں نظر ہے

سنو غیب سے کیا ندا آ رہی ہے
حقیقت میں ڈوبی صدا آ رہی ہے

تمہارے لئے خود خدا نے کہا ہے
کہ تم پر بھی رحمت کا سایہ کیا ہے

رہِ دینِ حق پر قدم جب اٹھیں گے
تو ہر نقشِ پا پر دیئے جل اٹھیں گے

وہ حامی و ناصر رہے گا ہمیشہ
وہ ہادی و ناظر رہے گا ہمیشہ

رسولِ خدا کی اطاعت کرو تم
توجہ سے ذکرِ خدا کو سنو تم

ہر اک لفظ قرآں میں چھپی شفا ہے
اذانوں میں روحِ پیامِ خدا ہے

رہِ حق میں ہر شئے فدا ہو تمہاری
بس ایمانِ محکم ردا ہو تمہاری

بھی حق جتاؤ گی جنت ... پاؤ
ہو حکمِ خدا اور سنت ... لاؤ

خدایا ہو حاصل ... رحمت
... جائے دل ... کی ظلمت

نیم کا پتّا

آغا بابر

یہ بات تو اس پر واضح تھی کہ عورت کئی تہ در تہ اور پیچ در پیچ گھنڈیوں سے بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ کہ عورت پہلے لڑے، پھر کوسے پر طعنے دے، پھر لڑائی کو جنگ میں تبدیل کر دے۔ اور مرد پر اتنے ستی بم پھینکے کہ اس کی روح کے چیتھڑے اڑا کر ماضی حال اور مستقبل کی کھونٹیوں پر لٹک جائیں۔ اور جب ان میں سے قطرہ قطرہ ہو کر حسرتوں کا خون ٹپکنے لگے تو مجبور و مقہور مرد سے وہ چپت لیٹ کر شروع سے آخر تک پورا پیار کرائے اور پھر اس طرح سکون سے سو جائے جیسے ان دونوں میں تلخی نہ ہو۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔

طوفان گزرنے کے بعد اجڑے ہوئے آشیانے کو بنانا خود اعتمادی کا عنوان ہوتا ہے۔ مگر جب بار بار سیلاب اور آندھیاں در و دیواروں کو گرائیں اور سامان بہا لے جائیں تو آدمی تھک ہار کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے۔ ہویدا کی نہینوں سے عثمان کے پرزے اڑا رہی تھی۔ جنھیں وہ پھر جوڑ لیتا۔ یہ اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ ہویدا کے اندر بیزاری اور غصے کی چنگاریاں بھری رہتیں، مگر عثمان سراسر مفاہمت بنا رہتا۔

وہ اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے ہویدا کو امن اور راحت کی خاطر ملواتا۔ مگر وہ گھر پہنچتے پہنچتے آگ بگولہ ہو جاتی۔ غصے کی چنگاریاں چھپا لیتی جو رات کو انار بن کر پھوٹتی اور خطرناک بارود کے پٹاخے اور ٹھکے بن کر عثمان کے مردانہ وقار اور انا کے لیے خطرہ کھڑا کر دیتیں۔ وہ اس دم بہ دم بھڑکنے والی آگ سے اپنی روح کے جامے کو بچانے کی بار بار کوشش کرتا مگر پے در پے دھماکے اسے عاجز کر دیتے۔ ایک چنگاری ایسی لگتی کہ جامہ جل کر راکھ ہو جاتا۔!

"تمہارا شمشاد کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اس کی شہرت بھی سن لی۔ آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ افضال کی بیوی تمہارے ساتھ اتنی بے تکلف کیوں ہے؟ تم کسی کو تو چھوڑ دو۔ ڈائن بھی چار گھر چھوڑ دیتی ہے۔" عثمان کی روح کے پرزے اڑتے۔ گھر کو آگ دکھا دی جاتی۔ احساسات الجھنے لگتے۔ مجبور اور دیوانی پرچھائیاں روح کے گرد ناچنے لگتیں۔ وہ اپنے مردانہ وقار اور انا پر ان حملوں کی تاب نہ لا سکتا۔ اس کی سوچ جواب دے جاتی۔ اس کا ذہن رک جاتا۔ وہ نڈھال اور بے بس ہو کر کرسی پر گر پڑتا۔ اس کی جھولی میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں کو دیکھتا رات کے سناٹے کو سنتا۔ اس کے اندر زخم کھائے ہوئے سانپ کا انتقام جاگتا۔ پھر اس کا پیچ و تاب اور اضطراب دیکھنے کو کہکشاں کی پرسکون جھلملاہٹ جیسے اس پر جھک جاتی۔

صفائی کی گواہیاں شہادتیں اور بیانات تھکان سے چور چور ہو کر گر پڑتے۔

"تمہیں مجھ سے پیار نہیں رہا۔"

"کون کہتا ہے؟" عثمان ہویدا پر جھک جاتے۔ کہکشاں کھسک کر دور وہیں اپنی جگہ جا کر مسکرانے لگتی

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے بہت گہرا ہو جاتا۔ پھر صبح کا ستارہ نمودار ہوتا تو پھول اور کانٹا ایک جان ہو گئے ہوتے۔ ہویدا عثمان کے بازوؤں میں بڑے سکون سے سوئی پڑی ہوتی۔

جب سے عثمان کی جھولی میں شمشاد اور افضال کی بیویوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ ان عورتوں سے عثمان کے لیے نگاہ ملانا مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کہیں دیکھ لیتا تو نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتا۔ اس نے ہویدا کی خوشی کے لیے شمشاد اور افضال سے ملنا ترک کر دیا۔ مگر ہویدا اب بھی مطمئن نہ تھی۔ ہر عورت اس کی بیرن تھی۔ جس جگہ جاتے وہ عثمان پر نگاہ رکھتی کہ وہ کسی عورت سے دو باتوں سے تیسری بات نہ کرنے پاتے۔ اور اگر کسی سے ذرا لمبی بات ہو جاتی تو عثمان کی شامت آ جاتی۔ کیا کہتی تھی؟ تم نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے بات کرنے کی؟۔

مسز مرزا ہویدا کی نئی دوست بنی تھی۔ ایک پارٹی پر عثمان نے اس سے اتنا پوچھ لیا: "مرزا کہاں ہیں؟"

"کراچی"

"کب آئیں گے کراچی سے؟"

اس دن تاروں بھرے آسمان کے نیچے دونوں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر اس طرح مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ جیسے بڑا سخت

نا پڑنے والا ہو۔

ہویدا نے حملہ کیا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی دخل در معقولات ... مرزا کہاں ہیں اور کراچی کب آئیں گے۔ کیا تم مرزا کی عدم موجودگی میں مسز مرزا کے خاوند بننا چاہتے ہو؟"

عثمان کے اَنا کی گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ حملہ آور خود کرسیوں نہ بیٹھے ہوتے تو کرسیاں چل جاتیں۔

"دیکھو ہویدا زبان قابو میں رکھو۔"

"تم دونوں بھائی حرام زادے ہو۔"

عثمان تڑپ اٹھا اس کا ہاتھ طمانچے کے لیے ہوا میں لہرا کر رک مگر عثمان کا گریبان ہویدا کے ہاتھ میں آکر چڑی بنی ہو گیا۔ وہ عثمان کے کتنی قریب ہو کر کتنی دور ہو گئی تھی۔ عثمان نے ننگے سینے کے ساتھ اسے چمٹا لیا۔ غصے اور زہر کی چنگاری پر ن پڑ گئی ... وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ایکا ایکی چاند دل کی جھالر لٹک گئی۔ نسوانیت کے ابریشمی پرتو کے بند کھل گئے عثمان کی مجروح اور لنگڑی روح اسے ریلنے پیلنے میں لگ گئی۔

وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر جذبات کے اس ژولیدہ و پیچیدہ جزر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جو اس کے فہم و ادراک سے را تھا۔ اس اوپر سے ٹھونسے جانے والے میکانکی انداز محبت اس کی روح کے تمام حظ اور حس کی تمام حلاوت رخصت ہو چکی ۔ مجروح جذبات کے ہوتے ہوئے محبت اُڈکر کیسے آئے ۔ یہ ی آزمائش اس کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھی جیسے شکستہ پا ل سے کوئی شفق الفلب چوکڑیاں بھرنے کو کہے اور غزال کی عول سے بے بسی اور مجبوری جھانکنے لگے۔

وہ سوچنے لگا کتنے خوش نصیب ہوں گے۔ وہ شوہر جن کی بیاں دوسروں سے لڑتی جھگڑتی ہوں گی۔ مگر اپنے خاوندوں کو ملح رکھتی ہوں گی۔

"میں کہتا ہوں یہ صاحب کا حوصلہ ہے۔ اپنی جورو ایسی نوکر دن کاٹ کر رکھ دوں۔ سات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔"

ڈرائیور نے روز کی تناتنی دیکھی تو نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز عثمان باغ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہویدا پاس [illegible] زندگی کتنی اچھی ہے

ہویدا نے نظر گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور بولی:

"اچھا مالن کو دیکھ رہے ہو؟"

"کیا؟" عثمان بھونچکا رہ گیا

"وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے حرامزادی کے لیے جیسے یہی جگہ رہ گئی تھی۔"

عثمان نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ دو پودوں کے پیچھے مالن گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے اب معلوم ہوا تھا۔

ہویدا اٹھ کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل دی۔ عثمان نے دل میں کہا ہویدا کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قدموں کی چاپ سن کر اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو ہویدا اور مالن اس کی طرف چلے آرہے تھے۔ مالن کی قمیص پر جہاں اس کی دودھ سے ابلتی چھاتیوں کی اکڑاہٹ تھی۔ گیلے دودھ کے دھبے تھے۔ جیسے وہ بچہ کو منہ سے دودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔

"میرے میاں تیرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا۔ کرسی پر بیٹھ۔"

ہویدا کی زبان میں سخت زہر بھرا تھا۔

مالن عاجزانہ طور پر عثمان اور ہویدا کی طرف بتر بتر دیکھ رہی تھی عثمان کے جذبات ایک دم بھڑک اٹھے۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر مالن کے سامنے ہویدا کے منہ پر دو تین جڑ دے کہ لو یہ ہوتا ہے نیم مرد کے انا کا بار بار تپتی سیخوں سے داغنے کا۔ مگر اس کا مزاج پھر روح کی دھجیاں جوڑنے اور غصہ پی جانے کا کارنامہ سرانجام دے گیا

اگلے روز صبح صبح مالی اور اس کی بیوی نے کوارٹر خالی کر دیا۔ مالی کے چلے جانے سے ہویدا کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ مگر ڈرائیور کے چلے جانے سے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ پڑوس کی کوٹھی کا ڈرائیور ایک جان پہچان والے کو لے آیا۔ اور بولا:

"بیگم صاحب! دلاور خان ایک انگلش کمپنی میں ملازم تھا بڑی اچھی گاڑی چلاتا ہے۔ مگر اب برے دن آپڑے ہیں۔ آپ جو تنخواہ دیں گی منظور ہوگی۔"

ہویدا نے پہلے گاڑی چلوا کر دیکھی — پھر تنخواہ مقرر ہو گئی لانے والے نے کہا: اس کی بیوی بچے کسی پرانے گھر میں پڑے ہیں اگر ملازموں کے کوارٹروں میں جگہ مل جائے تو بے فکری ہو جائے گی

"ہاں کیوں نہیں۔"

دلاور خان بیوی اور چار بچوں کے ساتھ کوارٹر دل میں رہنے لگا۔ کپڑے بچوں کے تن پر کہاں تھے۔ دو بڑے گندے سے چیتھڑے پہنے پھرتے۔ دو چھوٹے ننگ دھڑنگ پھرا کرتے۔ بیوی برقع پہنتی در سخت پردہ کرتی۔ عثمان دورے سے آیا تو اس نے کوٹھی کے احاطے سے گزرنے والے ان گورے گورے مگر میلے سے اُٹے بچوں کو دیکھ کر پوچھا:

"یہ کون ہیں؟"

"ڈرائیور کے بچے ہیں۔ آپ کے پیچھے میں نے ڈرائیور رکھ لیا۔"

"گاڑی ٹھیک چلاتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

ڈرائیور نے آکر سلام کیا۔ عثمان نے اس کی پہلی نوکریوں کا اتا پتا پوچھا۔ پھر لائسنس دیکھ کر بولا:

"تمہارے بچے بہت ہیں۔ انھیں صاف رکھا کرو۔ کیا تمہارا بچہ کوئی منہ نہیں دھوتا۔ بڑے گندے رہتے ہیں۔"

"نہیں صاحب، اب صاف رہیں گے۔ اصل میں غربت بڑی رہی ہے سرکار۔ بڑا لڑکا گیارہ بارہ برس کا ہے اگر اسے کہیں نوکری دلا دیں تو دعائیں دوں گا۔"

"کرا دیں گے۔ جاؤ گاڑی صاف کرو۔"

دلاور خان کے کوارٹر کی کھڑکی ہویدا کے سونے کے کمرے کے رُخ تھی۔ جب عثمان کے دفتر جانے کے بعد کھلتی تو گوری چٹی عورت نظر آتی جس کا لباس اکثر سرخ ہوتا۔ جس میں وہ سونے کی طرح دمکتی رہتی۔

ایک دن کار میں ہویدا نے دلاور خان سے کہا۔ "ڈرائیور تمہاری بیوی بڑی خوب صورت ہے۔"

"جی ہاں۔ پانچ بچے پیدا کرنے پر بھی اس کی کاٹھی بڑی مضبوط رہی ہے۔"

"تمہارے چار بچے ہیں یا پانچ؟"

"جی ایک مر گیا تھا۔"

دھوپ کا رنگ اب زرد ہو گیا اور تیزی بھی کم ہونے لگی۔ [illegible] رات کو خنکی ہو جاتی۔ کوّے درختوں اور منڈیروں پر کائیں کائیں کرتے پھرتے۔ ایک دن عثمان اور ہویدا برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ہویدا ٹرنکوں میں سے گرم کپڑے نکال کر دیوان پر رکھ رہی تھی۔ جن میں اِکّا دُکّا نیفتالین کی گولیاں بچی رہ گئی تھیں اور بچے سال بھر آنکھوں سے اوجھل بند رہنے والے کپڑوں کو دیکھ دیکھ اٹھا اٹھا کر خوش ہو رہے تھے۔!

کچھ پھٹکل مال ہویدا نے ایک طرف ڈھیر کر دیا۔ عثمان کا ایک پرانا کوٹ جسے پہننا وہ ترک کر چکا تھا۔ اس نے اٹھا کر پوچھا:

"یہ تو آپ نہیں پہنتے۔ ڈرائیور کو دے دوں؟"

"دے دو۔"

اس نے ڈرائیور کو بلا کر کہا: "ڈرائیور! یہ ہمارے بچوں کے کپڑے ہیں۔ تمہارے بچوں کو آجائیں گے۔ یہ کوٹ تمہارے لیے ہے۔"

ڈرائیور گٹھڑ اٹھا کر دعائیں دیتا چلا گیا۔ کوارٹر کی طرف سے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جو خوشی سے بے چین تھے۔ پھر ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ "او کمینو! ابھی رہنے دو جب سردی شروع ہو گی پھر پہننا۔"

گھٹنیوں چلتا گود کا بچہ پردوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تو اسے اٹھانے کو جب لپکتی تو ڈرائیور کی بیوی کی جھلک دکھائی دیتی۔ ایک روز ہویدا نے دیکھا۔ کار میں بیٹھتے وقت عثمان کی نگاہیں کوارٹر کی طرف اٹھی تھیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ عثمان دفتر جانے کے لئے کپڑے بدل رہا تھا کہ ادھر کھڑکی کا پردہ اٹھا ہوا تھا ادھر دلاور خان کے کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔

"میں اس حرام زادی کو تو آج ہی نکال باہر کرتی ہوں۔"

"کس کو۔" عثمان نے شیشے میں نکٹائی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"جس کو آپ دیکھ رہے ہیں جس نے کھڑکی کھول رکھی ہے۔"

ہویدا ایک دم سے باہر چلی گئی اور اس نے تنک کر آواز دی:

"ڈرائیور ادھر آؤ۔"

دلاور خان جو گاڑی صاف کر رہا تھا۔ "جی" کہہ کر لپکا۔ ہویدا نے اس سے کہا: "میں نے پہلے روز کہہ دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے دفتر جانے کے بعد کھلے گی۔ کہا تھا نا۔ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمہاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔؟"

اس نے جا کر کچھ کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔

عثمان کو جب گاڑی چھوڑ آئی تو ہویدا بازار چلی گئی جب آئی تو سکون کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے اسکول بھیج دیا۔ ملازم کو دلاور خاں کی بیوی کو بلانے بھیجا۔ اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ نوکر نے آ کر کہا۔ وہ کہتی ہیں کہ مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" ہویدا غصہ میں اٹھی اور دو قدموں میں ملازموں کے کوارٹروں تک جا دھمکی۔ دلاور خان کی بیوی برتن دھو رہی تھی۔

"میں نے تمہیں بلا بھیجا تھا۔ تم نے کہا۔ مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی نواب زادی ہو تم۔ مجھے پتہ نہ تھا۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ تم وقت بے وقت کھڑکی کھول کر اپنا جوبن میرے میاں کو دکھاتی رہتی ہو۔ میں نے سوچا تھا... صاحب سے آج تمہاری ملاقات کرا دوں گی۔ دونوں کی بے چینی دور ہو جائے گی۔"

دلاور خان کی بیوی کا رنگ لمحہ بھر کے لیے پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ دھو کر اٹھ بیٹھی اور بولی:

"میرے خاوند کو تو تو جوبن دکھاتی پھرتی ہے۔ تیری بے چینی تو دور ہو جاتی ہے جب کندھے سے کندھا ملا کر میرے خاوند کے ساتھ چڑھ بیٹھتی ہے گاڑی میں اور گھومتی پھرتی ہے اکیلی۔"

ہویدا کو محسوس ہوا جیسے اس نے غلط عورت کو ہاتھ ڈال دیا۔ "زیادہ بات کی تو زبان کھنچوا دوں گی۔"

"پہلے اپنے منہ دھو کے آ۔" دلاور کی بیوی نے ہوا میں ہاتھ نچائے۔

"بڑی احسان فراموش ہو۔ کمینی میں نے رحم کھا کر تیرے بچوں کو کپڑے دیئے۔" ہویدا ذرا نرم ہو کر پینترا بدلنے لگی۔

"میرے بچوں کو! اپنے یار کو کوٹ دینے کی خاطر دیئے ہوں گے۔ پر تمہیں بتا دوں تیرے اوپر تھوکے گا بھی نہیں۔ اپنا سینہ دیکھ ڈلا ہوا لوکڑ مال اور یہ دیکھ روئی کا گالا۔"

[illegible]

کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ بڑی جرأت کر کے کہہ سکی۔

"بے حیا۔"

"بے حیا تم۔ اپنی کھنچی ہوئی کمانیاں دیکھ۔"

ہویدا نے عاجزی سے نظر پھرا کر دیکھا بھنگی اور مشاپکی سب باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہویدا نے مشاپکی سے کہا

"جاؤ پولیس کو بلا لاؤ۔ اس کمینی کا دماغ درست کرا دوں۔"

"بلاؤ جلدی بلاؤ۔ میں کہوں گی میرے خاوند سے تعلق ہے تمہارا اور تمہارا کپڑوں کا احسان ہے۔"

اس نے کپڑوں کو ڈھیر کیا۔ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی خود غصہ میں آگ بگولا بنی پاس یوں کھڑی ہو گئی۔ جیسے بے نیاز ہو۔ "خدا کرے میرے بچے ننگے پھریں۔ پر تم جیسی کا دیا نہ پہنیں۔" کپڑے پھڑپھڑا کر جلتے اور کوک بھرے کھلونے کی طرح بولتی رہی۔

دلاور جب اسکول سے بچوں کو لے کر آیا تو تلنگے میں کٹا خانہ لڑ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے گستاخانہ سلوک کو سن کر بڑے غصہ میں اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ جیسے بیوی کو آج پیٹ ڈالے گا۔ مگر ٹھنڈے قدم واپس آ کر بولا:

"آپ نے میری بیوی کی عزت پر الزام لگایا ہے۔ بیگم صاحب یہاں نہیں رہیں گے۔"

تانگہ ہویدا کے سینے پر مونگ دلتا۔ کوٹھی کی بجری کو چرچراتا نکل گیا۔ بچے ہویدا کا منہ تکنے لگے۔ جیسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس تانگے میں اس کی عزت کا دیوالہ پٹ کر نکل گیا۔

عثمان آیا تو ہویدا چپ چپ بیٹھی تھی۔ عثمان نے ہویدا کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا: "تم اس طرح چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟" ہویدا کی آنکھوں میں نم آ گیا۔ اس نے سارا واقعہ سنا ڈالا۔

"اور یہ نوکر کھڑے اس ذلیل عورت کا منہ دیکھتے رہے۔ انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔"

ہویدا اداس سی ہو کر بولی: "کچھ نہیں۔"

اس نے ہویدا کو سینے سے لگا لیا اور نگاہ اس کی اس راکھ پر جا پڑی جو سے تیتھڑے کے سلگنے سے کالے دھوئیں کے بل کھاتی ہوئی لکیر اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ دیکھ کر عثمان کے پیٹ کی گٹھڑی میں سے خوشی کا ایک میٹھا میٹھا سا بلبلا پھوٹا وہ

[illegible]

رات کا سورج

مریم فہیم (ڈھاکا)

سلمٰی تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ وہ بہت خوش تھی ـــ بہت خوش کہ اس کے امید سے ہونے کی خبر پاتے ہی اکرم بھی خوش ہوگا۔ لیکن اکرم پر اس خبر کا اثر اس کے برعکس ہوا۔ وہ خوش ہونے کے بجائے مرجھا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کئی آڑی ترچھی لکیریں ابھریں اور پھر وہ دندناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ سلمٰی کو اکرم کے اس طرزِ عمل کی قطعی توقع نہیں تھی۔ اکرم کے اس رویے پر وہ سراپا حیرت و استعجاب کا مجسمہ بن گئی۔

سلمٰی ایک خوبصورت لڑکی تھی گول مٹول چہرہ جیسے پورنماشی کا پورا چاند، ستواں ناک پتلے پتلے سرخی مائل ہونٹ جیسے گلاب کی پنکھڑیاں ہلکی اور کالی کالی گھنیری زلفیں اس کے شانوں پر اس طرح لہراتی تھیں جیسے یہ زلفیں نہ ہوں کالی بدلی کے آوارہ بادل ہوں۔ ہرنی جیسی حسین آنکھیں جیسے دو دھاری تلوار، بھرا بھرا جسم سڈول بازو اور درمیانہ قد۔ گویا سراپا حسن کا پیکر تھی۔ جاذبیت سے لبریز سلمٰی کو اکرم نے جب پہلی بار دیکھا تھا تب ہی اس نے اسے پالینے کا خواب دیکھا تھا اور جو خواب شادی کی صورت میں حقیقت کا روپ بن گیا تھا۔

اکرم شادی کے بعد سلمٰی کو لے کر اپنے ایک عزیز دوست شاکر کے یہاں کرائے پر رہنے لگا تھا۔ دونوں کی دوستی ایک مثالی دوستی کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایسی دوستی کہ لوگوں کو دونوں کے آپس میں بھائی ہونے کا گمان ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ گو اکرم ایک کرایہ دار کی حیثیت سے شاکر کے یہاں رہنے لگا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو شاکر کے خاندان کا ہی ایک فرد محسوس کرتا تھا اور شاکر کے گھر والے بھی اس سے اپنوں جیسا سلوک کرتے۔

ادھر شادی کے بعد سلمٰی اور اکرم دونوں بہت خوش تھے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ یعنی ایک جان دو قالب بن چکے تھے۔ سلمٰی کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پر اکرم اپنی جان نچھاور کرتا تھا۔ اور سلمٰی بھی اکرم کی ہر بات پر اپنی جان چھڑکتی تھی۔

شادی کے بعد ہر جوڑے کو عموماً بچے کی خواہش ہوتی ہے۔ لڑکی ماں بننے کی خواہشمند ہوتی ہے تو لڑکا باپ بننے کی سوچتا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اکرم کبھی کبھی سلمٰی کو چھیڑتے ہوئے کہتا کہ تم اتنے بچے جنم دینا کہ میں ایک فٹ بال ٹیم بنا سکوں۔ تب سلمٰی، چھی کہتی ہوئی اکرم کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کرتی اور پھر خود ہی اپنی انگلی دانتوں تلے داب کر یوں مسکرا دیتی جیسے اپنی غلطی کی تلافی کر رہی ہو۔

شادی کے دو تین ماہ بعد جب پہلی بار سلمٰی کو امید سے ہونے کا احساس ہوا تھا تو اکرم کو جیسے کائنات کی تمام تر خوشیاں میسر آگئی تھیں۔ اس نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر سلمٰی کے سرخی مائل پتلے پتلے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے تھے اور سلمٰی جھینپ سی گئی تھی۔

"اونہہ، کوئی دیکھ لے گا۔"

اور تب اکرم مسکراتے ہوئے اس سے کچھ پرے ہٹ گیا اور سلمٰی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹوں کی بجلیاں تڑپ اٹھیں۔

پھر کچھ دنوں بعد ہی اکرم نے سلمٰی کی دیکھ بھال کے لئے لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کر دیا تاکہ سلمٰی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

نو مہینے بعد جب ان کے پیار کے گلشن میں ہنستا مسکراتا گلاب کھلا تو دونوں کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی تھی۔ اس لئے کہ باغباں تو صرف اسی ایک لمحے کے لئے جیتا ہے۔ ڈالیوں پر پھول آئے اور اس کی پوری محنت سنور گئی۔

پہلا بچہ جاوید جب ڈھائی سال کا ہو گیا تو پھر ایک بار سلمٰی نے اکرم کو اپنے بارآور ہونے کی اطلاع دی۔ اس بار اکرم کے چہرے پر پہلے جیسا خوشیوں کا بادل تو نہیں امڈا لیکن وہ پھر بھی بہت خوش تھا کہ ایک سے بھلے دو اور، اور اس خیال کے آتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے سلمٰی سے کہا اس بار انشاءاللہ ایک بیٹی ہوگی۔ ویسے تو بیٹا میرا اور بیٹی تمہاری لیکن بیٹی کے بجائے ایک بیٹا آ دھمکا۔ اور بیٹی کی کمی پھر بھی باقی رہی لیکن وہ مطمئن تھا۔ جاوید کی طرح عابد بھی رفتہ رفتہ بڑا ہوا۔ جوں جوں دوا

بچے بڑے ہو رہے تھے اکرم کو ان دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت نشو و نما کی فکر دامنگیر ہونے لگی۔ وہ مطمئن ہو کر سوچتا کہ دو بچوں کو ہی اچھے طریقے سے تعلیم و تربیت دے کر سلجھا ہوا انسان بنائے۔ مزید ضرورت نہیں۔ بچوں کی تعداد میں گو ناگوں اضافہ معاشی بدحالی کا سبب ہوتا ہے۔ سب کے سب رہ جائیں گے کوئی بھی اچھی تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ریڈیو سے دو ہی بچے اچھے کی آواز اس کی سوچ کے تسلسل کا ساتھ دے کر اسے مزید مطمئن کر گئی

اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس پر ضرور عمل کرے گا۔

اس خیال پر عمل پیرا ہونے کے لئے دوسرے ہی دن سلمیٰ کو اس کے میکے پہنچا کر اکرم سیدھا خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر پہنچ گیا اور ان ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے اپنی نس بندی کروا لی۔ اس نے سلمیٰ کو اس کے میکے اس لئے پہنچا رہا تھا تا کہ اسے یہ علم نہ ہو سکے کہ وہ نس بندی کروا چکا ہے اور آئندہ کبھی باپ بننے کا اہل نہ رہے گا اور اس راز کو سلمیٰ سے اس لئے بھی مخفی رکھنا چاہتا تھا کہ سلمیٰ کی خواہش تھی کہ دو بیٹوں کے بعد ایک بیٹی بھی اس گھر میں آ جائے تو گھر جنت بن جائے لیکن معاشی حالات کے تحت وہ اپنی اس بڑی خواہش کو بھی ختم کر چکا تھا۔ لہٰذا وہ مطمئن تھا کہ سلمیٰ پر یہ راز کبھی بھی عیاں نہیں ہوگا کیونکہ ڈاکٹروں نے مشورہ دیتے وقت کہا تھا کہ اس سے معمولات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا البتہ بچے کی پیدائش ممکن نہ ہوگی۔

تقریباً دو مہینے کے بعد وہ سلمیٰ کو اپنے یہاں لے آیا اور پھر [illegible]ل کے مطابق زندگی گذرنے لگی۔ اکرم خوش تھا۔ سلمیٰ بھی خوش [illegible] دونوں بچے بھی مسرتوں کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ اچانک ایک روز اکرم پر اس وقت جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اکرم سراپا سکتے میں آ گیا جیسے اسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ ایسا خاموش ہو جیسے [illegible] قوت گویائی سلب کر لی گئی ہو۔ شرم و حیا اور غلط فہمی کے ملے جلے تاثرات سے وہ بالکل نڈھال سا ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں برف کے [illegible] کی مانند سرد ہو گئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے شریانوں [illegible]ن کی رفتار تیز ہو گئی۔ پورا جسم تپنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا [illegible] نس بندی کروا چکا ہوں۔ یہ تیسرا بچہ میرا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ [illegible] کا ہے؟ ـــ وہ مزید سوالوں کے مہیب اندھیروں میں بھٹکنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شاکر کی تصویر جھلک اٹھی۔

"لیکن نہیں ــــ شاکر ــــ شاکر کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے شاکر صرف میرا بھائی یا دوست ہی نہیں بلکہ وہ انسان کے بھیس میں فرشتہ ہے۔ لیکن؟ ـــ لیکن؟؟" پھر وہ سوچ نہیں سکا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب سلمیٰ نے ایک خوبصورت سی بچی کو جنم دیا یعنی اس نے اپنے گھر کو ایک جنت کا روپ دے دیا۔ اکرم معصوم اور خوبصورت سی نوزائیدہ بچی کو دیکھ کر دہل گیا "یا خدا، یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہے؟ کیا میں سلمیٰ پر راز افشا کر کے اسے طلاق دے دوں۔ مگر اس بچی کا کیا ہوگا، میرا کیا ہوگا، ان بچوں کا کیا ہوگا، کیا یہ گھر جہنم نہیں بن جائے گا؟ لیکن اس پاپ کی گٹھری کو میں کیسے اٹھا سکوں گا۔ وہ جب بڑی ہوگی اور مجھے توتلی زبان سے ابو کہے گی تو کیا میں اسے وہی پیار دے سکوں گا جو اپنے دونوں بچوں کو دیتا آ رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ اُف میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

پھر وہ بڑی اضطراری حالت میں گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں اس کی شاکر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ شاکر نے اسے اس طرح دیوانگی کی حالت میں دیکھا تو اس نے اسے پکڑ لیا اور اس سے پوچھا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے۔ یہ کیا دیوانوں کی حالت بنائے تم راستے پر بھاگ رہے ہو؟"

شاکر کا یہ پوچھنا تھا کہ اکرم رونے لگا۔ شاکر اس پر مزید پریشان ہو گیا آخر ایک ہوٹل میں بٹھا کر اس سے تمام باتیں پوچھیں اور اکرم نے جب صاف صاف تمام باتیں اس کے سامنے اگل دیں تو شاکر بے ساختہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"ارے بیوقوف، آپریشن ناکام بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ چلو ابھی خاندانی منصوبہ بندی کے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔ جو ہوگا وہ تمہارے سامنے ہی آئے گا۔"

اور پھر ڈاکٹری معائنے کے بعد دونوں دوست ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ دے کر باہر نکل رہے تھے۔ تو اکرم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو رہا ہے اور اس کا دوست واقعی وہ فرشتہ ہے جس کا نام شاکر نہیں بلکہ رضوان ہونا چاہئے تھا۔ اور وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ انکشاف اس پر نہ ہو گیا ہوتا تو زندگی ایک جہنم بن جاتی اور وہ اس میں ہمیشہ جلتا رہتا۔

پہلا افسانہ

شریف لڑکیاں

ایک مصنف کے ایک ہی موضوع پر دو افسانے

عارف قریشی

دس بجے رات ایک ویران اور خاموش بس اسٹاف پر وہ صرف اس خیال سے ٹھہر گیا کہ ممکن ہے کوئی بس آجائے۔ بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے وہ سڑک کے کنارے کھڑے درختوں کو یوں گھور رہا تھا جیسے وہی اس کی بے روزگاری کے ذمہ دار ہوں۔ اچانک اسکی نظر ایک لرزتے ہوئے سائے پر پڑی جو کچھ فاصلے سے اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سلگتے ہوئے آدھے سگریٹ کو کھمبے کے ساتھ مسل کر جیب میں ڈالا اور سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ سیاہ ہیولا بلب کی روشنی میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ سرمئی چست برقعے میں چلتے ہوئے وہ یوں لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی کسی مچھلی کو پانی سے نکالا گیا ہو۔ اس کے ترشے ہوئے جسم کے ارتعاش کے ساتھ اس کی بھوکی جنس کے تار بھی جھنجھنا اٹھے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ----!

لیکن لڑکی اس کے قریب آئی تو وہ اپنے فیصلے پر عمل نہ کر سکا۔ بس اس نے اپنی پُرہوس نظریں اس کے نقاب میں گاڑ دیں۔ نقاب جو چھٹتے ہوئے سرمئی بادل کی طرح اس کے چاند جیسے چہرے کو چھپانے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لڑکی اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو اپنی ترچھی نظروں کا سہارا دیتے ہوئے اس سے چند قدم کے فاصلے پر سکڑ کر ٹھہر گئی۔ وہ مسکرا دیا۔ جواب میں لڑکی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کی کلیاں بکھر گئیں۔ وہ تصور ہی تصور میں بہت دور چلا گیا۔ اچانک اس کی نظروں کے سامنے اپنا سراپا لہرا گیا۔ سات دنوں سے پہنی ہوئی پتلون، بشرٹ اور بوسیدہ چپل، اس کے حسین تصورات پر ہتھوڑے بن کر برسنے لگیں۔ خالی جیب اس کا مذاق اڑانے لگی لیکن اس نے خود کو مجتمع کر کے ایک دفعہ پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور معنی خیز ہنسی ہنس رہی تھی۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود وہ اتنی ہمت نہ کر سکا کہ چند قدم کے اس فاصلے کو آواز یا پاؤں سے طے کر لیتا۔ آج کل کے اکثر نوجوانوں کی طرح وہ بھی بزدلی کے دھاگوں سے بنے ہوئے دبیز جال میں جکڑا ہوا تھا۔ ایسے نوجوان جب بھی خود کو کوئی ایسا کام کرنے پر آمادہ پاتے ہیں تو ان کی خالی جیب ان کی راہ میں دیوار بن جاتی ہے۔

بالآخر اس کی نظریں لڑکی کے نقاب سے ابلتی ہوئی غزالی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جھک گئیں۔ شرافت کے بوجھ سے نہیں، بزدلی کے بار سے۔ لیکن دوسرے لمحے سفلی جذبات کے آہنی ہاتھ نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور ضرب لگائی اور وہ پھر اوپر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ نظروں اور مسکراہٹوں کا تصادم ہوا تو اس نے ہمت کر کے لڑکی سے "کچھ" کہنا چاہا۔ لیکن وہ خود کو اس مشکل ترین کام کے لئے تیار نہ کر سکا۔ اس کے منہ سے ہوس کی ضربوں سے چور صرف یہی آواز نکل سکی "محترمہ! آپ کے پاس گھڑی ہوگی؟"

لیکن لڑکی اسکی آنکھوں سے لپکتے ہوئے شعلوں کی تہہ تک پہنچ چکی تھی اس لئے وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہلکے سے نقرئی قہقہے کے ساتھ اسکی طرف بڑھی اور دوسرے لمحے وہ اس کے اتنا قریب آگئی کہ وہ اپنے سینے پر اس کے گرم سانسوں کی تپش محسوس کرنے لگا اور بے اختیار اس نے اپنے ہاتھ اس کے سرخ گالوں کی آگ میں جھونکنے کے لئے اٹھا دیئے

لیکن ----

اگلے لمحے اس کے دونوں ہاتھ جھٹکے کے ساتھ الگ کر دیئے گئے اور رات کے سناٹے میں "تڑاخ" کی آواز آئی۔ طمانچہ غیر متوقع اور شدید تھا۔ اس نے جذبات سے مخمور نیم وا آنکھوں کو پوری طرح کھولا تو لڑکی شعلہ بار نگاہوں اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس کی جیب سے گرا ہوا ایمپلائمنٹ ایکسچینج کارڈ اور سگریٹ کا آدھ جلا ٹکڑا اپنے پیروں تلے مسل رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلتی چلی گئی "ذلیل، کمینے شرم نہیں آتی راہ چلتی شریف لڑکیوں کو چھیڑتے ہو"

دوسرا افسانہ

کار والا

جونہی میں موٹر مرسڈیز کی بڑی بڑی لائٹیں دور تک پھیلتی

گئیں۔ کشادہ اور سیدھی سڑک فاصلے فاصلے تک میری نظروں میں تھی۔ اچانک بائیں ہاتھ ایک سایہ لہرایا اور اگلے چند لمحوں کی اس کی حقیقت واضح ہوتی گئی۔ سرمئی برقعے میں ملبوس ایک لڑکی مجھے رُکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ گیارہ بجے رات ویران ماحول اور نوجوان لڑکی! میرے ذہن نے ایک ریتہ اس مثلث کے گرد چکر لگایا اور میں نے بریک لگا دیئے۔ وہ ایک م روشنی میں نہا گئی اور مجھ سے مخاطب ہونے کے لئے ار کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں بائیں طرف جھکا اور اس سے پیشتر کہ اس سے اس کی منزل دریافت کروں۔ وہ گاڑی کے کھلے شیشے سے اندر جھانکتے ہوئے کہنے لگی! "اگر آپ مجھے استنبول چوک تک لے چلیں آپ کی بڑی عنایت ہوگی، کتنی دیر سے یہاں کھڑی ہوں، کوئی سواری نا نہیں مل رہی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پچھلا دروازہ کھولنے کے لئے بیٹھے نے پیچھے کی طرف سر گھما یا رہی تھا کہ اس نے کہا! "مجھے تنہا بیٹھتے ہوئے شت ہوتی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اگلا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس کے تھ ہی تیز خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں میں آ گھسا۔ سیٹ پر جمان ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں کر شکریہ ادا کیا اور پھر "اُف کتنی گرمی ہے، یہاں تو سانس لینا مشکل ہا ہے" کہہ کر برقعے کے بٹن کھولنے لگی۔ اس وقت میں نے اس کی بغور سے دیکھا! نوجوان اور بھرا بھرا جسم باریک ریشمی کپڑوں میں مڑھا ہوا تھا جیسے ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان کے شوکیس میں رکھا ہوا مجسمہ۔

جنس مخالف کا اس قدر قریب اور تنہائی میں بیٹھنے کا یہ میرا پہلا تھا۔ دماغ میں عجیب سے خیالات در آئے لیکن میں نے خود پر ل کر کے پریشان کن سوچ کا یہ دروازہ بند کر دیا اور سے پوچھا! "آپ اس وقت یہاں کیسے رہ گئیں؟" غالباً اس کے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ تھا کیونکہ وہ بجائے کچھ کہنے کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور میرے اور قریب ۔ میں نے ایک دفعہ پھر اس کی طرف دیکھا تو میری نظریں اس کے ن پر جا پڑیں اور میں لرز گیا۔ اس کے گریبان کی تراش اس قدر اگر میناے شباب بلاؤز سے باہر الٹ پڑنے کو بے قرار تھیں۔ میرا دل پھر منتشر ہونے لگا اور چند ہی لمحوں میں اس انتشار نے ایک طوفان کی صورت اختیار کرلی۔ ایسا طوفان جس کے سامنے بند باندھنے پر انسان شاذ ہی قادر ہوتا ہے۔ خدا جانے میری اس سوچ کا انجام کیا ہوتا کہ اچانک ایک چوک پر دائیں طرف سے ایک ٹرک نمودار ہوا اور ہماری گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچ کر آگے نکل گیا۔ اس کے منھ سے خوف کی ایک ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور میرے ساتھ جڑ گئی۔ لیکن اس دوران میرے اندر کا طوفان تھم چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ پھر کھل اٹھی اور کہنے لگی! "آپ تو خاصے ایکسپرٹ ڈرائیور ہیں۔"

میں نے اپنی تعریف پر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ اس وقت ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا۔ اس کے جسم کا لمس ایک دفعہ پھر مجھے گمراہ کرنے لگا تھا کہ اچانک اس نے سوال کیا!

"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"میں اپنے صاحب کو ایئرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"جی!" وہ یوں اُچھل کر پرے ہٹی جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔ میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

تو اس نے دوسرا سوال پوچھا! "اس کا مطلب ہے، تم کسی کے ڈرائیور ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوئے کہا تو اس نے چیختے ہوئے مجھے حکم دیا! "مجھے یہیں اُتار دو!"

"مگر آپ نے تو ...." لیکن میرا سوال پورا ہونے سے پہلے اس نے میری بات کاٹ کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا! "مجھے کہیں نہیں جانا، بس مجھے یہیں اتار دو!"

"بہت اچھا!" کہہ کر میں نے بریک لگا دیئے۔ وہاں نہ کوئی بس اسٹاپ تھا اور نہ کسی کا گھر مگر گاڑی رکتے ہی وہ تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور میری طرف دیکھے بغیر اس نے "شکریہ" کا لفظ یوں کہا جس میں اظہار تشکر کے بجائے گہرا طنز تھا میرے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور تھوڑی دور جا کر پیچھے دیکھا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ شاید اسے کسی کار والے کا انتظار تھا۔

• ۲۰ تاریخ تک حریم نہ ملے تو فوراً نمبر خریداری کے ساتھ دفتر کو لکھیے، اگر ۳۰ تاریخ تک آپ نے اطلاع نہ کی تو دوسرا پرچہ قیمتاً ملے گا۔

تنہائی کا درد

از مسرور جہاں

اچانک سورۂ رحمٰن کی آواز گونجی تو وہ تڑپ اٹھیں اور انھوں نے بیٹیوں کے حلقے کو توڑ کر دروازہ کے باہر نکلنا چاہا۔ لیکن کئی ہاتھوں نے بڑھ کر انھیں سنبھال لیا۔ اور پھر بے بس ہو کر انھوں نے پردہ کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ چار آدمیوں نے جنازہ کاندھوں پر اٹھایا اور اسے باہر لے گئے۔ سورۂ رحمٰن کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

"خدا حافظ سرتاج!۔۔۔ اللہ کو سونپا۔۔۔" انھوں نے زیر لب کہا اور روتی سسکتی نڈھال ہو کر وہیں ایک طرف بیٹھ گئیں۔ جنھیں سالہا سال کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ اور وہ جو ایک دن انھی ہونے ۔۔۔ قدموں تک لوٹتا ہوا سہرہ باندھے انھیں بیاہنے آئے تھے۔ آج چپ چاپ ۔۔۔ چار آدمیوں کے کاندھے پر اپنے گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ لیکن ایسی موت کبھی کوئی مرتا ہے۔؟ ایسی بے بسی اور تنہائی کی موت کہ آخری سفر بھی غیروں کے کاندھوں پر کیا جائے۔ اور اپنے جگر کے ٹکڑے ہزاروں میل دور زندگی کی خوشیوں کو گلے سے لگائے والدین کی زندگی اور موت، دکھ سکھ سے بے پروا انھیں بھولے رہیں۔ جن کا والدین سے بس اسی قدر واسطہ ہو کر آمدنی کی زکوٰۃ نکال کر کچھ رقم بھیج دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ اپنی مسرتوں میں ڈوب کر انھیں یہ بھی یاد نہ رہے کہ اس منزل پر وہ محض اپنے والدین کی محنتوں اور محبتوں کے سہارے پہنچے ہیں۔ جن کو اپنے خوش حال یاد بھی نہ آئے ۔۔۔ انھیں دیکھ کر تو عزیز و اقارب، ملنے جلنے والے رشک کرتے تھے۔ چار ہونہار، لائق اور ذہین لڑکوں کے والدین تھے بھی خوش نصیب۔ کہاں لوگ ایک لڑکے کے لئے ترستے ہیں۔ اور کہاں پروردگار نے ایک کے بعد ایک انھیں چار لڑکے عطا کئے ۔۔۔ وہ تو پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔

شادی کے پہلے ہی سال بیٹا پیدا ہوا تو حامد میاں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اور زہرہ سے کہنے لگے "پہلا بیٹا تو باپ کا دایاں ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کی جگہ اگر خدانخواستہ بیٹی ہوتی تو ابھی سے دان جہیز کی فکر سوار ہو جاتی۔" ۔۔۔

زہرہ یہ سن کر مسکرا دیں۔ وہ بھی بہت خوش تھیں شاہد دو سال کا تھا کہ ماجد پیدا ہوا ۔۔۔ حامد میاں کا سینہ فخر سے پھول گیا ۔۔۔ دونوں بیٹوں کو پیار کر کے زہرہ سے کہتے۔

"یہ میرے دو بازو ہیں دیکھنا ان کی بدولت ہمیں کتنا آرام ملے گا۔ بڑھاپے کا تو پتہ ہی نہیں چلے گا۔" ۔۔۔ زہرہ کتنی خوش تھیں کہ چلو ابھی کچھ دن بیٹی کی ۔۔۔ سے نجات مل رہی ہے۔ تیسری ولادت کے قریب آئے تو حامد میاں ہنسی ہنسی میں کہنے لگے۔ ۔۔۔

"اب کی تو اللہ بیٹی دیدے۔ آخر تمہاری خدمت کرنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیئے۔ بیٹے تو مجھ کو ہی زیادہ چاہتے ہیں۔ اس لئے خدمت بھی میری ہی کریں گے۔" لیکن تیسری بار بھی بیٹا ہی ہوا ۔۔۔ بیٹی کی خواہش تو دونوں ہی کو تھی۔ لیکن بیٹا کس کو برا لگتا ہے۔

حامد میاں ستانے کی خاطر بولے۔

"زہرہ تم تو سراسر گھاٹے ہی میں رہیں۔ سچ سچ بڑا افسوس ہوا۔ لیکن بابدولت اب کے بھی فائدے میں رہے۔ اس نے میری کمر مضبوط کر دی ۔۔۔"

"چلیئے مان لیا کہ اوپر والا آپ کے اوپر زیادہ مہربان ہے۔ لیکن اس بھول میں نہ رہیئے گا کہ یہ صرف آپ ہی کے بیٹے ہیں۔ اور ان پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔"

زہرہ کچھ برا مان کر فخر سے کہنے لگیں۔ لیکن جب چوتھی بار بھی لڑکا ہوا تو زہرہ بجھ سی گئیں۔ اس بار تو لڑکی ہونے کا یقین بھی تھا۔ پھر جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی للک پیدا ہونا فطری بات ہے۔ حامد میاں نے بیوی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"واللہ زہرہ ۔۔۔ اس بار تو سراسر آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ اللہ میاں اپنے اوپر زیادہ مہربان معلوم ہوتے ہیں۔ سوچا ہوگا کہ کیوں حامد کو مرتے وقت غیروں کا احسان لینا پڑے۔ چار بیٹے باپ کے جنازے کو کاندھا دیں گے تو کتنا اچھا لگے گا ۔۔۔ میرے ایسے خوش نصیب باپ بھی دنیا میں شاذ ہی ہوں گے" ۔۔۔

"چلیئے بیٹھیئے ۔۔۔ آپ بھی کہاں کی بے تکی باتیں لے بیٹھے ۔۔۔ یہ نہیں کہتے کہ ان چار سے ہمارے چار سو ہوں گے انشاء اللہ ان

کی شادی ہو گی، بچے ہوں گے اور یہ چھوٹا سا گھر بچوں کی کلکاریوں سے گونج اٹھے گا کتنی خوشیاں ملیں گی ہمیں۔ ذرا ان بے پناہ مسرتوں کا تصور تو کیجئے ——"

"ہاں کبھی یہ بھی ہو گا۔ ہم بیٹھے مزے سے اپنے پوتی پوتوں کو کھلایا کریں گے۔"

حامد میاں اور زہرہ بیٹوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔ بچے بھی ذہین تھے۔ ہر کلاس میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے تھے۔ اور والدین کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ رہتا —— اس خوشی میں میلاد شریف کیا جاتا۔ محلے میں مٹھائی بانٹی جاتی تھی اور نئے ولولوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ اگلے پروگرام پر عمل کیا جاتا —— اپنے بچوں کے صرف باپ ہی نہیں دوست بھی تھے۔ وہ فالتو وقت میں ان کے ساتھ کیرم کھیلتے —— کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلتے —— انھیں گھمانے لے جاتے۔ ان کی کامیابی پر تحفے دیتے۔ وہ سب ایک ساتھ کھاتے پیتے۔ ان کا خاندان ایک مثالی خاندان تھا جس کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔ بچوں کے ساتھ والدین کی بھی تعریف ہوتی تھی۔ جن کی اعلیٰ تربیت نے چاروں لڑکوں کو بے پناہ کامیابی اور قابلیت عطا کی تھی —— اور یہی وجہ تھی کہ حامد میاں اور زہرہ کو یقین تھا کہ ان کے لائق و فائق بچے بڑھاپے میں انھیں آرام پہنچائیں گے —— اور مستقبل کے خوش آئند خیالوں میں ڈوب کر وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

بڑے لڑکے شاہد کا رجحان میڈیکل کی طرف تھا۔ ایم بی۔ بی ایس کرنے کے بعد وہ حکومت کے وظیفے پر ایم۔ ڈی کرنے انگلینڈ چلے گئے۔ حامد اور زہرہ کا سر مارے فخر کے عرش سے جا لگا۔ بڑے بڑے اچھے گھرانوں سے ان کے رشتے آنے لگے۔ انھوں نے [illegible] انگلینڈ سے واپس آئے تو انھیں میڈیکل کالج میں ملازمت مل گئی۔ اور ان کے استاد اور محسن پروفیسر ڈاکٹر صدیقی نے انھیں اپنی بیٹی عرشیہ کے لئے پسند کر لیا۔ حامد میاں [illegible] بڑی دھوم دھام سے بیٹے کی شادی کی۔ عرشیہ بیاہ کر آئیں تو اس چھوٹے سے گھر میں ان کا دل نہیں لگا۔ وہ زیادہ تر میکے ہی میں رہتی تھیں۔

شاہد بھی اکثر وہیں رہ جاتے تھے۔ پھر جب خسر کی طرف سے وہ انھیں کی کوٹھی پر پرائیوٹ مطب بھی کرنے لگے تو ان کا زیادہ وقت سسرال ہی میں گذرنے لگا۔ بس اتوار کے دن وہ گھر چلے جاتے تھے۔

بیٹے کی ترقی اور خوشی کی خاطر والدین نے اسے بھی گوارا کیا۔ ان کا بیٹا ایک مشہور ڈاکٹر کا داماد تھا۔ اور خود بھی شہر کا ایک ہردلعزیز ڈاکٹر تھا۔ یہ ان کے لئے کتنے فخر و مسرت کی بات تھی۔ اسی دن کی خاطر تو انھوں نے بیٹے کی تعلیم میں دن رات ایک کر دئے تھے۔ اب ان کی محنتوں کا صلہ ملنے کا وقت آیا تو وہ سجدۂ شکر بجا لائے اور روایتی والدین کی طرح خواہ مخواہ اڑنگے نہیں لگائے۔

دوسرا بیٹا ساجد بچپن ہی سے بہت ذہین اور خاموش طبیعت کا تھا۔ حامد میاں کو اس پر زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑی۔ اور وہ میکینکل انجینئرنگ کا کورس پاس کر کے جدہ چلا گیا —— جاتے ہی اس کی تنخواہ دس ہزار سے شروع ہوئی۔ ایرکنڈیشنڈ بنگلہ، کار سب فری ملا۔ باپ کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہیں رہا —— سعادت مند ایسا کہ والدین کو لکھ دیا کہ اپنی پسند سے لڑکی تلاش کر کے شادی کی تاریخیں طے کر لیجئے۔ آپ کی اطلاع ملے گی تو شادی کے لئے آ جاؤں گا۔

والدین نے ہنسی خوشی لڑکی کی تلاش شروع کر دی —— اب تو لڑکی والے خود ہی ایسے رشتوں کی فکر میں رہتے ہیں کہ لڑکا بیرونی ممالک میں ملازم ہو۔ تاکہ ان کی لڑکی سسرالی جھگڑوں سے دور عیش و آرام اٹھائے —— شادی طے ہو گئی۔ ساجد آ گئے۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ چند ہفتے رہ کر وہ بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ٹکٹ اور ویزا جلدی بھیجنے کا وعدہ کیا —— پاسپورٹ تو بنا بنایا تیار ہی تھا۔ اتنے دن بہو اپنے میکے ہی میں رہیں۔ بس رونق کے لئے ایک دن بیٹے ساس سسر سے ملنے آ گئیں۔ اور پھر [illegible] ان کے دل کی [illegible] بیٹے بہو جہاں رہیں خوش رہیں۔ [illegible] اپنے پاس رکھیں گے۔ شادی [illegible]

ے ابا جی بلائیں گے۔ بڑھاپا کٹ ہی جائے گا۔ تیسرا بیٹا ماجد
ت سے زیادہ ذہین نکلا۔ کم عمری ہی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہو کر
بمبئی چلا گیا۔ حامد میاں ایک بار بمبئی جا کر اس کے پاس کچھ دن رہ
... واپس آ کر بیوی سے خوش خوش بتایا کہ ماجد میاں کے بڑے
ٹھاٹھ ہیں۔ بس [illegible] کا گھر جلد ہی بسانے کی کوشش کرو ——
بچارے کو کھانے پینے کی تکلیف ہے۔ ہوٹل میں کھاتا ہے ——
لڑکی کی تلاش کرنے لگیں۔ لیکن ماجد اس معاملہ میں بھی تیز نکلے۔
پسند سے وہیں شادی کر لی۔ اور والدین کو اپنی شادی کی
اطلاع کر دی۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ دونوں کو اس کی اس حرکت سے
بہت ملال ہوا لیکن سوچا کہ زندگی اس کو بسر کرنا ہے۔ اپنی پسند
سے شادی کر لی تو برا کیا۔ ایک بار ماجد بیوی کو والدین سے ملانے
لائے تو گھر پر نہیں اترے۔ بلکہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ عذر یہ
پیش کیا کہ بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں اسے
تکلیف ہوگی۔ والدین کیا کہتے جب بیٹا ہی گھر پر رہنے کے لئے
تیار نہیں تھا۔ چار دن رک کر دونوں چلے گئے ——

راجو سب سے چھوٹا تھا۔ ماں باپ اس کو بہت چاہتے تھے۔
اور اس چاہت کی وجہ سے انھوں نے اس سے کچھ زیادہ ہی امیدیں
وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس کی تعلیم کے لئے حامد میاں کو کچھ پریشانی
بھی اٹھانا پڑی۔ ایک اچھا خاصہ مکان فروخت کرنا پڑا ——
لیکن مستقبل کے سنہرے خوابوں کا جال بنتے ہوئے وہ ہر تکلیف خندہ
پیشانی سے جھیل لے گئے۔ لیکن راجو نے تو بے خبری میں ان کے
کلیجوں میں خنجر اتار دیا —— اس لے جب چاہتے فوج میں کمیشن
لے لیا۔ ٹریننگ مکمل ہوئی تو اس کی پوسٹنگ لداخ ہو گئی۔ سیکڑوں
ہزاروں میل کے فاصلے ان کے درمیان حائل ہو گئے۔ اور راجو
کی شادی کا ارمان بوڑھے ماں باپ کے دل ہی میں رہ گیا۔

جس گلشن کو حامد میاں اور زہرہ نے اپنے خون سے سینچا
تھا وہ جب پھلا پھولا —— تو ان کا چھوٹا سا صحن نہ مہک سکا۔
ان سے دوسروں کے گھر مہکے۔ ان کا آنگن تو اور بھی سونا ہو گیا۔ ان
بچوں سے بس ان کا واسطہ اتنا ہی رہ گیا کہ کبھی کوئی بینک ڈرافٹ
آ جاتا —— کبھی [illegible] کا منی آرڈر —— اور وہ دونوں حیرت سے
کاغذ کے ان [illegible] کو دیکھ کر رہ جاتے —— کیا ان کی ساری
زندگی کی محنتوں کا ثمر بس کاغذ کے یہ ٹکڑے ہی تھے —— ؟ —— ایسے
کتنے کاغذ کے ٹکڑے انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کر ڈالے
تھے۔ اگر انھیں بس اس کی ضرورت ہوتی —— تو وہ سارے کے
سارے سنبھال کر رکھ لیتے۔ کچھ بھی خرچ نہ کرتے —— تب ——
تب شاید یہ بچے ان کے اس چھوٹے سے گھر میں ہنستے مسکراتے ہوتے۔

اس ویران گھر میں بس وہی دونوں ایک دوسرے کے غمگسار
تھے۔ دونوں کا درد ایک تھا۔ دونوں کا غم ایک تھا۔ تنہائی کا
غم —— یہ ان کا مشترکہ درد تھا۔ جسے وہ بانٹنے کی کوشش
کرتے تھے۔ لیکن ہمدردی پا کر کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ جاتا
تھا۔ اور دونوں اندھیرے کمرے میں آنکھیں پھاڑے چھت کو
گھورتے رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے اپنا دکھ چھپانے
کی کوشش کرتے تھے۔

حامد میاں عرصہ سے تنفس کے مریض تھے۔ بیٹا شہر کا مشہور ڈاکٹر
تھا۔ دن رات اس کے ارد گرد مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ لیکن
اس کے پاس بیمار باپ کو دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

حامد میاں کی طبیعت ان دنوں زیادہ خراب تھی۔ انھوں نے
اپنے سامنے زہرہ سے سب بیٹوں کو خط لکھوائے۔ اور فوراً آنے
کی تاکید کی —— زہرہ نے ان کی حالت لکھ دی اور
ان کی آخری خواہش بھی کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس وقت اپنے
قریب دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاہد تو ان دنوں کسی سیمینار میں شرکت
کرنے یورپ گئے ہوئے تھے۔ راجو کا کوئی جواب نہیں آیا۔ فوجی آدمی
خدا جانے اس وقت کہاں ملک کی حفاظت کے لئے مورچہ پر ڈٹا ہو!
ماجد نے بمبئی سے خط لکھا کہ بیوی اسپتال میں داخل ہے اس کے ہاں
بچی ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں اس کا آنا ناممکن ہے۔ تار کے
ذریعہ دو سو روپیہ البتہ منی آرڈر کر دیے کہ بیمار باپ کو اس وقت
پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اور ساجد نے جدہ سے بینک ڈرافٹ
بھیجنے پر اکتفا کی۔ حامد میاں کا انتظار دم توڑ گیا۔ بیٹوں کے کاندھوں
پر آخری سفر کرنے کی ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی —— بس شریک حیات
نے آنسو بہا کر پینتیس سال کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اور زہرہ سوچ
رہی تھی کہ وہ مرے گی تو اس کی لاش پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ
ہوگا —— کیا اس کے بیٹے اس درد کو سمجھ سکیں گے —— ؟ —— ایسا

بڑی دور کی سوجھی

از سہالوی

شاعر جرأت اندھے تھے مگر بڑے مزے کے اشعار کہتے تھے ایک دن بیٹھے ہوئے گنگنا رہے تھے کہ انشا آگئے اور انھوں نے کہا کیا سوچ رہے ہو جرأت نے کہا بڑی دیر ہوئی ایک مزے دار مصرعہ ذہن میں آیا تھا لیکن دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

انشا نے کہا مصرعہ تو سناؤ ہم بھی کوشش کریں۔ جرأت نے کہا مصرعہ یہ ہے ؎

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

انشا نے مصرعہ سنتے ہی فوراً دوسرا مصرعہ کہا ؎

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔ مصرعہ سن کر جرأت پھڑک اٹھے اور انشا کو گلے سے لگالیا۔

بعض وقت اندھوں کو واقعی بڑی دور کی سوجھتی ہے۔

ایک اندھے کا قصہ ہے شائد آپ نے بھی سنا ہو کہ وہ اندھیری رات میں پانی کا گھڑا سر پہ رکھے اور ہاتھ میں چراغ لئے گلی سے گذر رہا تھا۔ دوسری طرف سے ایک آدمی آرہا تھا جب وہ قریب آیا تو اندھے کے ہاتھ میں چراغ دیکھ کر اپنی ہنسی نہ روک سکا اور کہا کہ اگر خفا نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟ اندھے نے کہا خفا ہونے کی کیا بات ہے آپ پوچھئے اور شوق سے پوچھئے۔

اس آدمی نے کہا آپ کے آنکھیں ہیں نہیں آپ کے لئے روشنی اور اندھیرا دونوں برابر ہیں تو پھر آپ ہاتھ میں چراغ لے کر کیوں چل رہے ہیں؟

یہ سن کر اندھا مسکرایا اور کہا تم دیکھ رہے ہو کہ میرے سر پر پانی سے بھرا گھڑا ہے میں ہاتھ میں چراغ اپنے لئے نہیں لئے ہوں بلکہ یہ چراغ آپ لوگوں کے لئے ہے کہ کہیں آپ اندھیرے میں مجھ سے ٹکرا نہ جائیں اور میرا گھڑا نہ پھوڑ دیں۔

اندھے کا جواب سن کر وہ آدمی بڑا خوش ہوا اور اس اندھے کو پانی سے بھرا گھڑا اور چراغ لے کر اندھے کو گھر تک پہنچا دیا۔

بعض لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہیں اور بعض دل کے اندھے ہوتے ہیں۔ ایک دل کے اندھے کا قصہ یاد آرہا ہے سنتے چلیے۔

ایک شخص کافی غریب تھا بڑی مشکل سے پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کی روٹی مل پاتی تھی اس کا ایک دوست تھا دونوں بچپن میں ساتھ کھیلے کودے تھے بعد کو اس کا دوست بمبئی روزی کی تلاش میں چلا گیا اور وہیں رہ پڑا۔ بہت دنوں کے بعد وہ وطن آیا اس نے سنا کہ اس کا غریب دوست بڑا مالدار ہوگیا ہے اور شہر کے بڑے لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے اسے یہ خبر معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔

ایک دن وہ اپنے دوست سے ملنے اور اسے مبارکباد دینے اس کے گھر گیا بڑی دیر تک اسے انتظار کرنا پڑا لیکن ملاقات نہ ہوسکی، نوکروں چاکروں سے معلوم ہوا کہ مالک آرام کر رہے ہیں۔ کافی دیر کے بعد جب وہ آرام کر کے اٹھے تو یہ ان سے ملنے کے لئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سلام علیک کیا۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے پہچانتے نہ ہوں۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے دوست نے ناگواری سے کہا تم کون ہو۔ جو بے تکلفی سے کمرے میں گھس آئے۔ دوست کی یہ بات سن کر انھیں بڑا رنج ہوا اور انھوں نے کہا میں تمہارا پرانا دوست اور بچپن کا ساتھی ہوں مگر تم نے پہچاننے سے انکار کردیا۔ میں تم سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ پڑوس کے لوگوں سے سنا تھا کہ تم اندھے ہوگئے، ہو اس لئے دوست کے ناتے تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر معلوم ہوا کہ تم آنکھوں ہی کے اندھے نہیں ہوئے ہو بلکہ دل کے بھی اندھے ہو گئے ہو اس لئے میں تمہارے لئے دعائے خیر کرتے ہوئے واپس جا رہا ہوں۔

چند منٹ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں

ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ رشد و ہدایت کی اس سرزمین پر حاضری کا شرف حاصل کروں۔ خدا کا شکر ہے کہ ۲۷ مارچ کو یہ تمنا پوری ہو گئی۔ روداد یوں ہے کہ اپنے کرم فرما ایم۔ اے رحمٰن صاحب رٹائرڈ ایگزیکیوٹیو انجینیر کی نواسی کہکشاں سلمہا۔ (دختر نیک اختر عزیزی ہادی سلمہ و ساجدہ سلمہا) کی شادی میں شرکت کے لئے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ نکاح پڑھانے کے لئے مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری مدظلہ العالی پھلواری سے تشریف لائے تھے۔ موصوف سے متعارف کرایا گیا تو آپ نے دعوت حاضری دی۔ دوسرے ہی دن محترم سراج صاحب اڈیشنل مجسٹریٹ میری یہ تمنا بر لائے۔ اپنی کار پر مجھے درگاہ شریف لے گئے۔ وہاں نہ صرف شاہ عون احمد صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری دی بلکہ آپ کے توسل سے درگاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین حضرت شاہ امان اللہ صاحب کا شرف نیاز بھی حاصل ہوا۔ سجادہ نشین موصوف کے متعلق علم ہوا کہ وہ درگاہ شریف سے باہر کہیں تشریف نہیں لے جاتے۔ حجرے میں داخل ہوتے ہی ایک ایسا چہرہ مجھے نظر آیا جس سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور جس پر تقدس برس رہا تھا۔ ایسی نورانی شکل میں نے کبھی پہلے نہ دیکھی تھی۔ جلال بھی تھا اور جمال بھی ——— دوران گفتگو جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت امان اللہ صاحب کی ذات گرامی میرے نام اور کام سے واقف ہے تو مجھے ایسا فخر حاصل ہوا، جسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ چند ہی منٹ بعد سکون و عافیت محسوس کرتا ہوا میں رخصت ہوا، اس لئے کہ میرے پاس وقت کم تھا۔ شاہ عون احمد صاحب نے مجھے دمہ کی ایک تقیری دوا عنایت فرمائی۔ خدا کرے وہ مجھے فائدہ پہنچائے۔ دارالاشاعت مجیبیہ کی شائع شدہ چند کتب بھی عنایت فرمائیں۔ "نمات اہم مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں" "حج و زیارت" (یہ دونوں موصوف ہی کی تالیفات ہیں) تسلیۃ المصافحہ از زین العابدین صاحب اور عطر الوردین، مجموعہ کلام مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری پھلواروی، مولانا شاہ محمد محی الدین قادری پھلواروی۔ مرثیہ مولانا حکیم سید محمد شعیب صاحب رضوی۔ پھلواری شریف کی اس قدیم ترین خانقاہ کی حاضری کے لئے شاہ عون احمد صاحب قادری اور جناب سراج صاحب کا شکر گزار ہوں، جن کی تحریک اور معاونت نے مجھے یہ شرف بخشا۔

نسیم انہونوی

الیاس سیتاپوری نسیم بکڈپو میں

الیاس سیتاپوری اس دور کے سب سے بڑے مؤرخ کہے جا سکتے ہیں۔ کراچی پاکستان میں الیاس صاحب کا بہت بڑا اشاعتی ادارہ ہے جس سے متعدد ایسے ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں جو وہاں کے بہترین ڈائجسٹ سمجھے جاتے ہیں۔ قابل قدر مضامین کے ساتھ ہی طباعت میں ان کا مماثل ہند و پاک میں نہیں مل سکتا۔ الیاس صاحب کی مشہور و معروف تاریخی کتابیں بھی اسی ادارے سے معیاری حسن طباعت کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی الیاس صاحب کی تاریخی کتابیں بیحد مقبول ہیں۔ الیاس صاحب لکھنؤ میں صرف میرے مہمان رہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ لکھنؤ وہ صرف مجھ سے ملنے کے لئے ہی آئے تھے۔

یہ حقیقت شاید کمتر ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ برصغیر ہند و پاک کے شہرت یافتہ الیاس سیتاپوری کی ادبی زندگی کی ابتدا نسیم بکڈپو ہی سے ہوئی تھی۔ وہ کافی عرصہ تک ہمارے ادارے کے منیجر رہے اور ان کا پہلا تاریخی ناول "فنکار" اور بچوں کے لئے بارہ کہانیوں کے چھاپنے کا فخر نسیم بکڈپو ہی کو حاصل ہے۔ الیاس صاحب صرف مصنف ہی نہیں، بہت بڑے آدمی بھی ہو گئے ہیں لیکن ہمارے یہاں رہ کر وہ اسی طرح نظر آئے، جیسے کہ ۳۰ سال پہلے والے الیاس سیتاپوری ہی ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میرے ادارے سے تعلق رکھنے والے کو اللہ پاک نے اتنا عروج بخشا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں اس سے بھی زیادہ ترقی بخشے۔

الیاس صاحب کے ہمراہ پاکستان کی معزز شخصیت ڈاکٹر سرور صاحب بھی تشریف لائے تھے بڑے دلچسپ انسان ہیں۔ موصوف لکھنؤ کی تہذیب و تمدن دیکھنے آئے تھے جو اب بس کتابوں ہی میں محفوظ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کو یہاں آکر بڑی مایوسی ہوئی۔

کسی ماہ حریم ۳۰ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ اگر ۱۵ تاریخ تک آپ نے اطلاع نہ دی تو دوسرا پرچہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ ہر ماہ ایک خبر شائع ہو سکتی ہے بشرطیکہ خبر ولادت اطفال، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھکر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ہمراہ اس طرح روانہ کی جائے کہ ۱۰ تاریخ تک دفتر پہنچ جائے۔ جو خبریں ۱۰ کے بعد وصول ہوتی ہیں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔ خبر میں کتابت و طباعت کی غلطی کا ادارہ ذمہ دار نہیں ہوتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادتِ اطفال کی خبریں

• تسنیم اختر، نبیرہ و نواسہ (آکیور) ہماری پیاری آپی بچپن کی فرزانہ پروین اور بھائی جان حسن احمد پاشا کو اللہ پاک نے ۱۰ جنوری ۸۳ء کو دن میں پونے سات بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فیضان قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور فخرِ خاندان بنائے۔

• زبیدہ بتول، منظورہ عفت، اسماء ہاجرہ (آکیور) ہماری آپی سیدہ یاسمین و بہنوئی انور سعادت علی کام کو اللہ پاک نے ۱۳ اکتوبر ۸۲ء بروز جمعرات ۸ بجکر دس منٹ پر (صبح یا شام کی تفصیل نہیں) ایک دختر عطا فرمائی۔ نام جویریہ گوہر اور پیار کا نام تمنا قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخرِ خاندان بنے۔

• شگفتہ بانو شیخ (رحیم آباد پور) ہماری ماموں زاد بہن نزہت و بہنوئی نسیم احسن کو اللہ پاک نے دوسری بار ۲۶ فروری ۸۳ء بروز سنیچر رات چار بجے صبح ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور صاحبِ نصیب بنائے۔

• [illegible] (آکیور) میری پیاری آپی نسیمہ اقبال اور بہنوئی سید اقبال احمد (رشید پور) کو اللہ پاک نے ۲۰ دسمبر ۸۲ء کو [illegible] ایک دختر [illegible]۔ نام [illegible] رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور صاحبِ نصیب بنائے۔

• [illegible] (آکیور) میری آپی عشرت جہاں و بھائی [illegible] [illegible] کو اللہ پاک نے [illegible] ۸۳ء کو [illegible]

[illegible]

مبارکباد
پیغاماتِ شادی

• جناب توحید الحق صاحب، سب پوسٹ ماسٹر، یو۔پی گورنرس کیمپ لکھنؤ کی دختر نیک اختر تسنیم رابعہ (دردانہ) سلمہا کی شادی ہمراہ محمد شمس الزماں سلمہ (فرزند الحاج حکیم محمد مسیح الزماں ندوی صاحب) بتاریخ ۱۹ مارچ ۱۹۸۳ء بروز سنیچر بمقام راج بھون بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنوری)

• ایم۔ اے ہادی سلمہٗ ایگزیکیوٹو انجینیر۔ ڈبلیو ڈی کی صاحبزادی اور محترم ایم اے رحمٰن صاحب ریٹائرڈ ایگزیکیوٹو انجینیر کی نواسی کہکشاں سلمہا کا عقد سعید ہمراہ عزیزی غیاث سلمہ (فرزند زکریا صاحب مرحوم)۔ ۲۵ مارچ ۸۳ء بمقام پاٹلی پترا کالونی بوقت شام بخیر و خوبی انجام پایا۔ جس میں معززین شہر اور رحمٰن صاحب کے اعزہ اقربا نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنوری)

• عزیزی محمد عظیم شمسی (پیلی بھیت میڈیکل اسٹور۔ پیلی بھیت) کی دختر نیک اختر نگار فاطمہ سلمہا کا عقد مسنون آفاق سلیم سلمہٗ ایم۔ اے (فرزند غلام مرتضیٰ عرف جمال سلمہا و نواسہ الحاج نواب فخر الزماں صاحب شمسی کے ہمراہ ۳ اپریل ۸۳ء کو دن میں ۱۱ بجے بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنوری)

• دردانہ جمال سلمہا ایم۔ اے (دختر غلام مرتضیٰ عرف جمال سلمہ) کی شادی محمد اختر شمسی سلمہٗ (فرزند محمد فاروق شمسی صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۷ اپریل ۸۳ء بمقام پیلی بھیت بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنوری)

• عزیزی حمزہ سلمہ برادر عزیزی اقبال احمد، بمبئی [illegible] لکھنؤ پسر مرحوم مرزا احمد صاحب، لکھنؤ کی شادی ہمراہ [illegible] سلمہا دختر نیک اختر جناب [illegible] محمد [illegible] صاحب [illegible] کے ہمراہ ۵ مارچ ۸۳ء کو بمقام [illegible] بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی۔ ۷ مارچ کو اس سلسلہ میں ایک شاندار دعوتِ ولیمہ [illegible] عزیزی احمد صاحب مرحوم نے دی، جس میں معززینِ شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنوری)

• ثریا نسیم (و [illegible]) [illegible]

[illegible]

۱۹۸۳ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• الیاس احمد صاحب کے فرزند جاوید اقبال سلمہٗ اور سیما سلمہا دختر ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی شادی کے سلسلہ میں ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء کو جھنجھانا ضلع مظفر نگر میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• میرے کرمفرما حاجی عبدالقیوم صاحب شجاعت منزل نئی سڑک کانپور نے اپنی دختر نیک اختر حنا قیوم سلمہا کی شادی اور اپنے بیٹے عشرت قیوم سلمہٗ کی شادی کے ولیمہ کے سلسلہ میں ۴ مارچ ۱۹۸۳ء کو پرفاٹ گیسٹ ہاؤس کانپور میں ایک شاندار دعوت دی۔ حنا قیوم سلمہا کی شادی زبیر احسن سلمہٗ (فرزند دلبند، حاجی عین الحق صاحب اعظمی۔ جنرل ائیڈ جنرل جاجمؤ۔ کانپور) کے ہمراہ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• افتخار نبی صدیقی صاحب (لکھنؤ) کی صاحبزادی طاہرہ خاتون ننہا کا عقد نکاح ہمراہ سہیل حامد صدیقی (پسر کاظم علی صدیقی کیرانہ) ۶ مارچ ۱۹۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک (نسیم انہونوی)

• محترم امیر احمد قریشی صاحب (بیلی بھیت) کے فرزند دلبند عزیزی جمال سلمہٗ کی شادی فاخرہ سلمہا دختر امداد حسین صاحب مرحوم ایڈوکیٹ گونڈہ) کے ہمراہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ ۱۳ مارچ کو امیر احمد قریشی صاحب نے پیلی بھیت میں اپنے اعزہ اقربا اور معززین کو دعوت ولیمہ دی۔ اللہ پاک مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• سید فضل الحق مظہر الحق العدروسی۔ سجادہ نشین، درگاہ عدروسیہ نخیز کے بھائی سید آصف کی شادی ہمراہ، محمد یقہ بیگم (دختر شریف احمد صاحب سردار پور گجرات، ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء شاہی باغ احمد آباد میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• بیگم صالحہ خاتون صاحبہ (بھیکن پور۔ بھاگلپور) کی صاحبزادی فرحت یاسمین سلمہا کی شادی ہمراہ ربانی سلمہٗ (فرزند جناب نور احمد صاحب بھاگلپور ۹ فروری ۱۹۸۳ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• میرے مرحوم کرمفرما ڈاکٹر ایم اکرام صاحب کی بیگم مظفر اکرام صاحبہ کے فرزند ڈاکٹر محمد الفت۔ ایم۔ بی بی ایس ایم ڈی کی شادی ایم [illegible] سلمہا دختر جناب ایم محمد حسین جمیل بی۔ اے اسسٹنٹ سکریٹری گورنمنٹ تامل ناڈو (ریٹائرڈ) کے ہمراہ ۹ فروری ۱۹۸۳ء کو بمقام سید اسپیٹ مدراس عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• بہن معصومہ یونس (کویت) میری ہمشیرہ محترمہ کے شوہر حامد خورشید صاحب کا ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد دکن میں انتقال ہو گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور میری بہن صاحبہ و دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• افضال [illegible] رضوی (سیتاپور) "میرے والد محترم سید یوسف حسین صاحب عرف [illegible] میاں، بعارضہ کینسر ۳ مارچ ۱۹۸۳ء کو پونے نو بجے شب میں راہی عدم ہوئے، مرحوم متقی پرہیزگار محبّ اہل بیت اور شب بیدار نمازی تھے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور ہم لوگ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• حکومت ہند کی معلومات کے مطابق ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء تک عورتوں کی آبرو ریزی کے ۲، ۱۱۵ واقعات ہوئے جن بدقسمت عورتوں نے شرم وغیرت کے تحت رپورٹ نہ لکھائی ہوگی۔ ان کا شمار آپ اندازے فرمائیں۔

• سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء یعنی تین سال میں بیویوں کو جلا کر مار ڈالنے کی تعداد ۲۸۷۹ ہے۔

• یکم مارچ کو کانپور سے ایک گاؤں میں ایک ماں اور اس کے تمام آٹھ بچوں کو جن کی عمریں ۶ ماہ سے لے کر ۱۲ سال کی تھیں، بے دردی سے قتل کر دیا گیا صرف شوہر بچا ہے۔

• خضاب کی قیمتوں میں سو فیصدی کا اضافہ ہو جانے کے باعث زلفوں اور بالوں کو سیاہ کر کے جوان بننے والے پریشان ہیں۔

• کسی بات کا جواب چاہیں تو ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجیں۔
• کوئی مضمون روانہ کریں تو اس پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ہر ماہ ایک ایسا شعر شائع کیا جا سکتا ہے، جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ شعر کا سنجیدہ اور موزوں ہونا ضروری ہے۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔ مئی کے لئے عنوان ہے "مہتاب" یا "ماہ تاب" اور جون کے لئے "شوق"

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوا

مرسلہ۔ را

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

مرسلہ عصمت آرا (بالاکا)

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

مرسلہ۔ کشور سلطانہ۔ لال باغ لکھنؤ
مرسلہ۔ عطیہ بیگم۔ حیدر آباد
مرسلہ۔ ثریا ناہید۔ کلکتہ

عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

مرسلہ۔ صوفیہ مظفر (ٹاٹا نگر، جمشید پور)

ایک تو حسن بلا اس پہ بناوٹ آفت
عاقبت اپنی بگاڑیں گے سنورنے والے

مرسلہ۔ جمیلہ کاسرگوڈ (منگلور)

جڑی بوٹیوں کے فوائد

پودینہ

اس کے پتے ابال کر پینے سے معدے کی تیزابیت کو آرام ملتا ہے۔

گیندا یا گل مریم

گیندے کے پھول ہمارے گھروں کی کیاریوں میں بکثرت کھلتے ہیں۔ اسے پولٹس کے طور پر جلد کے چھالوں پر لگانے سے آرام ملتا ہے۔ پولٹس بنانے کے لئے آٹے پانی اور سرسوں کا کڑوا تیل ملا کر آگ پر پکائیں پھر اس میں گیندے کے پھول کی تازہ یا سوکھی پتیاں ملا دیں۔ گیندے کی پتیوں کو ابال کر پینے سے السر کی تکلیف میں افاقہ ہوتا ہے۔

صعتر

یہ ایک جراثیم کش پودا ہے۔ اسے ماؤتھ واش کے طور پر استعمال کرنے سے مسوڑوں اور منہ کا انفیکشن دور ہوتا ہے۔ اسے پولٹس کے طور پر زخم پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ریحان یا تلسی کی پتی

اس کی بھاپ لینے سے نزلے کی حالت میں آرام ملتا ہے۔ ابال کر پینے سے اعصاب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اعصابی مریضوں کو دن بھر میں اس کے تین چار پیالے پینے چاہئیں۔

سونف

سونف کی افادیت سے ہم سب واقف ہیں۔ پیٹ میں درد گیس وغیرہ کے لئے فوری آرام چاہیئے تو اسے ابال کر پئیں۔

ساج

ساج کے سوکھے پتوں کو پانی میں ابال کر چھان لیں۔ اس محلول کو بالوں پر لگانے سے سر کی خشکی دور ہوتی ہے۔

بلسان

اسے چائے کی طرح پینے سے سر کا درد، بے خوابی اور معدے کی خرابی دور ہوتی ہے۔

لہسن۔ پیاز

یہ جراثیم کش ہیں۔ پیاز اور لہسن کی ایک پوتھی کو چھیل کر شکر ملا کر شربت بنائیں۔ اس شربت کے تین چائے کے چمچے دن میں تین بار پینے سے نزلہ زکام کو افاقہ ہوتا ہے۔

گلر یندان

اس پودے کی ٹہنی توڑنے سے اس کا رس نکلنے لگتا ہے۔ اس رس کو کیل دانوں پر لگانے سے وہ جلد خشک ہو جاتے ہیں۔ اسے ابال کر چائے کی طرح پینے سے ریاح، ہاضمے کی بدنظمی اور گردوں کی تکلیف وغیرہ رفع ہوتی ہے۔

میں جا رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کو مکمل صحت نصیب ہو جائے

آپ کا

جمشید

اور ادھر ادھر دیکھے بغیر کھلے دروازے سے باہر نکلا چلا گیا۔ اسے اسے خدشہ تھا کہ اگر وہ کچھ دیر تک اور کمرے میں کھڑا رہا تو یقیناً اس کا دل پھٹ جائے گا۔

گیٹ پر کسی نے اسے مخاطب کیا

خواب کی سی کیفیت میں وہ مڑا۔

وہ ایک شریف آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی کوئی خاتون برقعہ میں ملفوف کھڑی نقاب الٹے اسے دیکھ رہی تھیں!

"صاحبزادے۔ معاف کیجئے گا۔ ہمیں محمد غضنفر صاحب نامی ایک شخص کی تلاش ہے۔ ہم اس شہر میں نووارد ہیں۔ اگر آپ کو ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم ہو تو۔ براہ کرم ــــ!"

جمشید نے پلٹ کر اس اجنبی کو دیکھا جیسے تقدیر نے اس پر بند کر دیا تھا۔

اس نے بے حد رکھائی سے کہا

"جی نہیں۔ میں محمد غضنفر نامی کسی صاحب کو نہیں جانتا!" اور ان کے چہروں پر مایوسی کا ردِ عمل دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا!

نوشین کے گھر کے سوا فی الحال وہ اور کہاں جاتا؟

صبح ہی صبح وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ غضنفر کا خیال آیا اور اسکے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دیر تک اس کے منہ سے بات نہ نکلی۔ پھر جمشید کے چہرے پر

دسویں قسط

"مطلب یہ کہ ڈیڈی آپ کو وکالت پڑھوائیں گے۔ جھوٹی سچی لاگ لپیٹ کی باتوں کی پریکٹس آپ ابھی سے کرنے لگے ہیں!"

"خیر شہابی۔ تم نہیں مانتیں نہ سہی۔ پیتا رہوں گا۔ نفرتوں کا زہر تمہاری خاطر!"

"میری خاطر!؟"

"ہاں۔" وہ مسکرایا تھا۔ "تم چچا جان کی بیٹی ہو۔ ان کی محبت کا حصہ تھوڑا سا تمہیں بھی ملا ہے!"

"تو پھر مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ کہیں جانے آنے کا خیال نہ کریں گے!"

جواب میں جمشید خاموش رہا۔ دفعتاً باغ میں نوید اور سعدیہ بھی آ گئے ان میں دوسری باتیں ہونے لگیں اور سیما غضنفر کو وہاں سے ہٹا لے گئی اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ غضنفر بالکل گم سم تھے۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ شہابی اور جمشید کا تعلق خاطر قدرتی تھا۔ ان میں خون کی کشش تھی۔ وہ اس سے لاعلم تھے تو کیا۔

لیکن سیما اس کے دل میں ایک نیا زہر بھر چکی تھی۔ اور وہ اسی بنیاد پر جمشید سے غضنفر کو متنفر کرانا اور اسے دربدر کرنا چاہتی تھی۔

"اب کہئے!" سیما نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ جیسے غضنفر کی خاموشی پر اسے ہنسی ضبط کرنے میں دشواری ہو رہی ہو۔

"کیسا لگا آپ کو یہ تماشہ؟ اور پالئے سانپ کو آستین میں۔ سنا تھا آپ نے بھی۔ وہ خود سر چھوکری اسے کہیں جانے سے روک رہی ہے۔ اچھی بات ہے۔ میں بھی دیکھ لوں گی!"

وہ بڑے طنطنے سے مڑی اور پاؤں پٹختے وہاں سے چلی گئی۔

غضنفر کو بڑے کرب میں مبتلا چھوڑ گئی۔!

ایک دفعہ ان کے لب ہلانے سے سارے معاملات ٹھنڈے پڑ سکتے تھے لیکن ایک طویل عرصہ بعد کسی راز سے پردہ اٹھانے کی ہمت اب بھی غضنفر میں نہیں تھی۔ انھیں کامل اندازہ تھا۔ اب کسی کو ان کی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ لوگ ان سے پوچھیں گے۔ اب تک اس بات کو چھپانے میں کیا مصلحت تھی مردوں کی کوئی جذباتی لغزش کبھی لغزش مانی نہیں گئی۔ ان کا کیا بگڑتا ہے انہوں نے کوئی بڑا گناہ نہیں کیا تھا۔ کوئی چوری نہیں کی تھی۔ اپنی پسند اور مرضی کی شادی معاشرے میں ایک نہایت عام بات ہے۔ پھر۔ اتنی طویل خاموشی کی وجہ ـــــ؟ کیا وہ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور خود جمشید کے سامنے سر اٹھا سکتے ہیں؟ لوگ کتنے تعجب، کتنی حیرت اور کتنے تاسف سے انھیں دیکھنے لگیں گے۔؟ تب کی شرمندگی کیسی ناقابل برداشت، کتنی اذیت ناک ہوگی۔

جمشید کہے گا۔ آپ نے جانتے بوجھتے مجھے اپنی بیوی کی نفرتوں کا زہر پینے پر مجبور کیا۔ میری قلبی تکلیف روحانی کرب و عذاب کا باعث بنے آپ نے جانتے بوجھتے مجھ پر مظالم ہوتے دیکھے۔ اور کچھ نہ بولے۔ کیا آپ اتنے ہی بزدل ہیں۔؟

نوید اور سدید ـــ وہ دونوں نہایت ذہین اور شریف ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو اس انکشاف سے کتنا شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ سوچیں گے۔ ایسی ہی اور کتنی غلطیاں ان کے ڈیڈی کر چکے ہیں۔ انھیں کیسے یقین آئے گا؟ اور شہابی۔ شاید وہ بھی ان سے منحرف ہو جائے۔! ڈیڈی نے یہ بات کیوں چھپائی جب کہ ان کا دل صاف تھا۔؟

ظفر چچا یونیورسٹی لے گئے ہیں میرے ایم ایس سی [illegible] کے لیے۔ جعفر چچا کو حکم مل چکا ہے کہ میرے اور نوید کے لیے نئے ملبوسات لے آئیں۔ یہ سب بیکار ہے۔ آگے تعلیم۔ نئے کپڑے۔ یہ گھر۔ یہ ماحول۔ ا[illegible] سب اجنبی ہو جائے گا۔!

کہاں جاؤں گا میں۔ اس دنیا میں اس گھر کے سوا میرا ٹھکانہ کہاں اتنی بڑی دنیا میں میرا اپنا کون ہے۔

نہ ماں باپ نہ بھائی بہن نہ کوئی دوست۔

اے خدا۔ تو نے مجھ ایسی بے سر و سامان مخلوق بھی پیدا کی ہے۔

لیکن نہیں۔

میں کیوں رو رہا ہوں۔

اپنے چچا جان کی آئندہ معاونت پر۔

کیا کہیں گے وہ۔ جمشید بے وفا نکلا۔ اس نے اتنی ڈھیر سی محبت قدر نہ کی۔ پیار کی مضبوط زنجیریں اسے جکڑ نہ سکیں۔ وہ سب کو ٹھکرا کر چلا گیا۔ کہاں گیا۔ کیا جمشید ایسا ہی کم ظرف کمینہ تھا؟۔ نہیں نہیں ایک بار پھر اسے آنسوؤں کے ریلے بہا لے گئے۔

پھر وہ اٹھا۔

اپنا شب خوابی کا لباس اتارا۔ اور روزمرہ کے کپڑے پہن لے دراز کھول کر دس روپے کا ایک نوٹ جیب میں رکھا۔ تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ اور پھر وہ نوٹ واپس دراز میں رکھ دیا۔

اور کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا۔

میرے چچا جان۔ میرا وجود آپ کی بے آرامی کا باعث تھا۔

لڑکیوں کا کام ہے۔" سیما کا لہجہ اب بھی دھار دار تھا۔" میں کہے دیتی ہوں۔ انہیں کسی بات کی خبر نہ ہو۔ بس۔!"

انہوں نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی اور مڑ کر چلی گئیں۔

جمشید کا سارا بدن پسینے میں ڈوب رہا تھا۔! وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ جاگ رہا یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ خواب نہیں اس کے سامنے بیداری کے سارے سامان موجود تھے۔ ایک دُھلا دھلایا چمکیلا دن کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ تیز دھوپ برآمدے کے فرش کو چمکا رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کا شور تھا۔ اندر شاید جعفر نے ریڈیو آن کر دیا تھا۔ ایک حسین آواز نغمہ سرا تھی ؎

بڑی مشکل سے دل کی بیقراری کو قرار آیا

یہ سب خواب نہیں۔ یہ جیتی جاگتی حقیقت تھی۔! اسے دیس نکالا مل چکا تھا۔!

اس نے دیوار سے پیشانی ٹیک دی اور ایک ایسے بچے کی طرح رونے لگا جسے اس کی ماں چھوڑ کر کہیں دور چلی گئی ہو۔!

دیر تک آنسو بہانے سے طبیعت زیادہ بوجھل ہو گئی۔ اب تو سر میں بھی درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

وہ ایک طویل سانس لے کر مڑا۔ کمرے کی چیزوں پر الوداعی نظریں ڈالیں۔ شاید پھر کبھی یہاں آنا نصیب نہ ہو۔

میرے اللہ۔ آخر کیوں کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ جلاوطنی نصیب ہو رہی ہے؟۔

کیا اب کبھی اپنے پیارے چچا جان کو دیکھ نہ سکوں گا۔!

اور پھر۔ اس راز کی تصدیق کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت کہاں تھا؟—— کہکشاں کی کوئی نشانی، اس کی کوئی تصویر۔ اس کا کوئی خط ان کے پاس نہیں تھا۔ کہکشاں اُن کی زندگی میں آئی، چلی گئی۔ کتنا مختصر سا دَور تھا وہ۔ اپنے گندر نے کا کوئی سا نقش بھی تو نہیں چھوڑا تھا ان لوگوں نے۔! بس ایک یاد کی کسک تھی۔ اور وہ کسی کو دکھائی نہیں جا سکتی تھی۔!

کاش۔ داور۔ نشاط۔ مظفر یہاں ہوتے۔

کاش۔ افشاں کہیں ہوتی۔!

اس کا تو نام و نشان ہی جیسے مٹ چکا تھا۔ بیس بائیس سال پہلے اپنی خالہ کے ساتھ گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی کوئی خیر خبر غضنفر کو نہیں ملی تھی وہ اس دنیا میں تھی کہ اپنی بہن کے پاس پہنچ چکی تھی۔ خدا جانے۔!

ایک حضور ن بوا تھیں۔ انھیں سب کچھ معلوم تھا۔ لیکن ان کے کہے کا بھی کسی کو یقین نہ آتا۔ ان کی عمر تقریباً نوّے سال ہو چکی تھی۔ عمر کی زیادتی نے انہیں قطعی ذاترالعقل کر رکھا تھا۔ سیما نے انہیں خاندانی ملازمہ سے بڑھ کر کبھی کوئی اہمیت نہ دی۔ ان کی بات کیا مانتی؟۔

بس ایک طوفانی بھنور تھا۔ جس میں غضنفر چکرا رہے تھے۔ ڈوب رہے تھے ابھر رہے تھے۔

آج ایک بار پھر انہیں پرانی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیسی عجیب سی اذیت تھی۔! دل ڈوب رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اور خنکی کی ایک لہر سی پاؤں سے اوپر کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ جسم میں ایسی تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی جیسے سارے بدن کی روح آہستہ آہستہ کھنچ کر ایک مرکز پر اکٹھا ہونے لگی ہو۔! پھر ان کے کان آگ کی طرح جلنے لگے۔ سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ

سینے پر آگرا۔ جسے اٹھا کر وہ پھینک نہ سکے! یکبارگی جسم کی ساری طاقت کسی نے سلب کر لی تھی۔ انہوں نے چاہا کسی کو آواز دیں لیکن دل سے اٹھنے والی ایک ٹیس نے لبوں پر آنے والی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔!

نجانے کتنی دیر سے آسمان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بادل اکٹھا ہو رہے تھے۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔!

تھوڑی ہی سی دیر میں ایسا لگنے لگا جیسے زمین و آسمان میں پانی کے تیز جھڑاکے کے سوا دوسری کوئی آواز ہی نہ ہو۔!

بڑے کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ اور ایک [illegible] اسٹینڈ سے اٹیچ برقی لیمپ روشن تھا۔ روشن دان بند تھے اور فراخ کھڑکیوں پر بھی پردے ساکت تھے!۔

باہر برآمدے کے نیچے اگے ہوئے سمبل کے بڑے بڑے پتوں پر پانی کے ریلے بڑی ناگوار آواز پیدا کر رہے تھے۔

بڑے کمرے میں سب اکٹھا تھے!

دیوار سے لگی مسہری پر غضنفر لیٹے تھے۔ ساری رات کی جان گسل تکلیف کے بعد انہیں صبح کے قریب ہوش آیا تھا۔ اختلاج کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ اور رات بھر ان کا فیملی ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ان کے پاس موجود رہا تھا۔

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ تب خدا خدا کر کے غضنفر نے آنکھیں کھولیں اور

جان نثار کر دو میں ان کی جان [illegible]

"میں ابھی تک آپ کی کسی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"جمشید۔ تم نے میرا حکم ماننے کا وعدہ کر لیا ہے۔ لہذا میرا حکم ہے کہ تم اس گھر سے چلے جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے! یہ رات تمہاری اس گھر میں نہ گزرے۔"

"چچی جان؟؟؟" اس نے لڑکھڑا کر کرسی کا ہینڈل تھام لیا۔

"تم پڑھے لکھے ہو۔ تمہیں تمہارے چچا جان نے اس قابل کر دیا ہے کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ تم در در بھٹک نہیں سکتے! جوان ہو۔ تمہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا تم ___!"

"میں گھر سے چلا جاؤں۔ کہاں جاؤں!" وہ پاگل سا ہو کر رہ گیا۔

"میرے اس فرار کا اثر چچا جان پر کیا ہوگا۔ وہ۔ وہ کیا سوچیں گے۔ ان کی طبیعت اچھی نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ۔ خدانخواستہ۔ ان کا مزاج زیادہ ___!"

"تم چلے جاؤ گے۔۔ وہ اچھے ہو جائیں گے۔!"

"چچی جان۔ کیا میرا وجود ہی ان کی بے آرامی کا باعث ہے" جمشید کے دل میں ایک ٹیس سی ہوئی۔

"یہ میں کچھ نہیں جانتی۔ بس تم اپنا انتظام کہیں اور کر لو۔"

"مگر۔ چچا جان ___!"

"ہاں۔ ان سے میں کہہ دوں گی۔ تم اپنی مرضی سے چلے گئے۔"

"کیا میں چچا جان سے مل بھی نہیں سکتا۔!"

"سنو جمشید یہ رونا دھونا اور آہیں بھرنا کمزور لڑکوں اور

تحیر سے جھانکنے لگا !۔
ہکلاتا ہوا وہ بولا :
"ب ۔ بیٹھئے ۔ چچی جان ۔"
اور جلدی سے ان کے لیے کرسی سرکائی ۔!
"جمشید ! ۔"
"جی ۔!"
"میں یہاں بیٹھنے اور تم سے باتیں کرنے نہیں آئی ۔"
"پھر فرمائیے ۔ چچی جان ۔!"
"وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں گی ۔ تم مان لوگے !"
"وعدہ ۔؟" اس نے نچلا لب دانتوں میں جکڑ لیا ۔ "چچی جان آج تک آپ کے کسی حکم سے سرتابی کا گناہ تو سرزد نہیں ہوا ۔"
"ایسی ہی بات ہے ۔" وہ بدستور قہر آلود سرد نظروں سے اسے گھورتی رہیں ! ۔
"فرمائیے ۔ میں آپ کا حکم ضرور مان لوں گا ۔"
"میری ایک بات کا جواب دو ۔ تم اپنے چچا جان سے بہت محبت کرتے ہو ! ۔"
"جان تک دے سکتا ہوں ان کے لیے !"
"تم ان کی بے خبری میں ان کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپ سکتے ؟؟"
"جی ۔" جمشید کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں ۔ اس کے جسم میں سردی سی سمانے لگی ! ۔
سیما نے پھر کہا ۔ "ان کی محبت کا یہی تقاضا ہے کہ تم ان پر ایسی

تیمارداروں کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑا ۔
کمرے میں سبھی موجود تھے ۔ نوشینہ اس کے شوہر حمید ، ان کے چاروں بیٹے گھر کے افراد ۔ اور لوا حقین تک ۔ وہ دہلیز پر بیٹھی تسبیح گود میں رکھے دھندلی آنکھوں سے ایک ایک کو پر امید نظروں سے گھور رہی تھیں !
کیوں بھائی ۔ اب خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو ۔؟ حمید ان پر جھکے اور آہستہ سے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا ۔
ایک ٹھنڈی سانس غضنفر کے سینے سے نکلی ۔
"بڑے بھیا ۔ آپ کی انہی ٹھنڈی آہوں نے آپ کو اس درجہ پر پہونچا دیا ہے ۔" نوشینہ نے کہا ۔ "اب آخر آپ کیا سوچا کرتے ہیں ؟"
"تمھاری یہ غرّاہٹ بھران کا نروس بریک ڈاؤن کر دے گی ۔" حمید نے نوشینہ سے کہا ۔ "فی الحال ان کو کھانے پینے کو پوچھو ۔ کیوں بھائی ۔ کیا کھاؤ گے ؟"
"کچھ نہیں ۔" غضنفر نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں
"بڑے بھیا ۔" نبیلہ نے کہا ۔ وہ اور اس کا شوہر رات ہی کو آ گئے تھے
"کیا آپ ہم سب کو کوئی سزا دے رہے ہیں ۔ آنکھیں کھولیے ۔ انہیں دیکھئے ۔ تنہا بہت پریشان ہے ۔ آپ کو کچھ نہیں ہوا بڑے بھیا ۔ اختلاج تھا ۔ آپ اس قدر گھبرا کیوں گئے ۔؟"
"اٹھ کے بیٹھئے بڑے بھیا ۔" ظفر نے کہا ۔ "آپ کے بیماروں کی طرح لیٹ جانے سے میرا دل گھبرا رہا ہے ۔ !"
"ہاں ہاں ۔ ہمت کیجئے ۔ بڑے بھیا ۔ میں آپ کو اٹھاؤں ؟" جعفر بولا
"ڈیڈی ۔ !" ایک طرف سے شہابی کی روتی آواز آئی ۔

دفعتہً غضنفر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور حمید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سہارا دو بھائی اٹھ کے بیٹھا جاتا ہوں۔!"

حمید اور جمشید وغیرہ نے انہیں اونچے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ نبیلہ جلدی سے بھاگ کے گئی اور ڈاکٹر کی تجویز کردہ غذا لے آئی۔!

"کھا لیجئے کچھ تو طاقت آئے۔!"

اس نے اپنے ہاتھ سے انہیں دلیا کھلانا شروع کیا۔ پھر نوید دوا لے آیا۔ اور جمشید نے جھک کر اگالدان اٹھا لیا۔

غضنفر کی معنی خیز نظریں نوشینہ پر پڑیں۔ اس نے جمشید کے ہاتھ سے اگالدان لے لیا۔ اور پیار سے بولی۔ "اب تم جاؤ۔ ساری رات جاگے ہو۔ تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ کچھ دیر سو رہو۔ شاباش جاؤ۔!"

اس نے یکبارگی اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لئے اور دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ کچھ دیر تک عجیب سی نظروں سے غضنفر کو دیکھتا رہا۔ پھر کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

"اب میں ٹھیک ہوں۔ حمید بھائی۔" غضنفر کی کمزور مضمحل آواز کمرے میں ابھری۔ "تم سب۔ تم لوگ بھی جاؤ آرام کرو۔ میں بھی۔ تھوڑی دیر سوؤں گا!۔"

"ہاں بڑے بھیا۔" نوشینہ نے اپنے آنچل سے ان کی پیشانی پر چمکتا ہوا پسینہ پونچھا۔ اور سرہانے سے تکئے اٹھا کر الگ رکھ دیئے۔ غضنفر کو آرام سے لٹا کر اس نے ان کے سینے تک کمبل اڑھا دیا۔!

"اب آرام سے سوئیے۔ بڑے بھیا۔ کچھ مت سوچئے۔ بیکار کی الجھنوں [illegible]

سیما دکھائی۔

پھر دفعتہً جمشید نے شہابی کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

"جاؤ۔ اب تم جاؤ۔ میں اکیلا کافی ہوں یہاں۔ اب خدا کے فضل سے چچا جان کی طبیعت اچھی ہے۔!"

اس نے مچل کر اپنی بانہہ چھڑالی۔ اور تنک کر بولی۔ "میں بیٹھی ہوں تو آپ کے کہاں جھجھ رہی ہوں۔ نہیں جاؤں گی!۔"

"جاؤ شبو۔ ضد نہ کرو۔ پلیز تمہاری طبیعت خدانخواستہ ـــ!"

"ہش۔ آہستہ بولئے۔!"

جمشید بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔ دفعتہً شہابی ہنس دی اور بولی۔ "اچھا لیجئے۔ جا رہی ہوں۔ رو دیئے نہیں!"

سیما پٹ کر اوٹ میں ہو گئی۔ پردہ آہستہ سے ہٹا اور شہابی اطمینان سے نکلی چلی گئی۔!

ساری رات سیما نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دی۔

غضنفر کو اب سکون تھا مگر وہ اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ بات کرتے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے!۔

انہیں ٹھیک دیکھ کر سب اپنے اپنے کام سے چلے گئے!

ظفر، نوید کو اپنے ساتھ لے گئے۔

جمشید ابھی ابھی غضنفر کی مزاج پرسی کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آیا اور جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا۔ دفعتہً دروازے میں سیما دکھائی دیں۔ ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ یہ پہلی [illegible]

نستانیوں سمیت یہاں سے جا رہا ہوں! ۔"

"میرے پاس کسی کی موجودگی ضروری نہیں۔" غضنفر نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس طرح میں زیادہ بے آرام ہو جاؤں گا۔ تم سب جاؤ مجھے اطمینان سے سونے دو۔ شب بخیر۔!"

طوعاً و کرہاً ان کے ساتھ سیما بھی غضنفر کی خواب گاہ سے نکل آئی۔

نوید نے لائٹ بلب آن کر کے اور پردہ برابر کر کے چلا گیا۔

سیما کے سامنے جمشید اور شہابی بھی چلے گئے! لیکن اسے اطمینان نہیں ہوا۔ رات کا کوئی وقت تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلی اور پیچھے سے غضنفر کے کمرے میں جھانکا۔!

اسے دفعتاً شاک سا لگا۔!

غضنفر بڑے آرام سے بے خبر سو رہے تھے

ان کے پہلو میں بیڈ کے بڑے کوچ پر جمشید اور شہابی پاس پاس بیٹھے تھے۔ اور بہت مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

سیما کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ جلن اور غصہ کے مارے سارے تن بدن سے شعلے سے اٹھتے محسوس ہونے لگے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا نوبت بہت دور تک پہنچ گئی تھی۔!

یہ دونوں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں کیسے آئے۔ یقیناً پہلے سے کچھ بدی ہوگی۔!

یہ زہریلا ناگ ان کی لڑکی کو برباد کر ہی کے چھوڑے گا۔!

اس کا سر کچلنا ضروری ہو گیا تھا۔!

غضنفر بدستور سوتے رہے۔

تھیں۔ لیکن نہ وہ کہہ سکے نہ یہ کہہ سکیں۔

پھر ایک ایک کر کے وہ سب کمرے سے نکل آئے۔ صرف سیما بیٹھی رہ گئی تھی۔ غضنفر نے اس کی موجودگی کو نظرانداز کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اور دعا مانگنے لگے کہ یہ بھی جلد سے جلد کمرے سے جائے۔! لیکن جانے کی بجائے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پہلو میں آ بیٹھی۔

"سنیے۔ کیا آپ سو گئے۔!"

غضنفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آواز زہر لگ رہی تھی۔ اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر پھر کہا۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ میری باتوں کا جواب دینا نہیں چاہتے۔" اس نے ایک سسکی سی لی۔ "لوگ رات ہی سے مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے یہ نوبت آپ کی میری لائی ہوئی ہے..... آپ کو ناگوار ہوتا ہے نا۔ آپ جمشید کے بارے میں کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے نہ سہی میں اب آپ سے کچھ نہ کہوں گی۔!"

"تم کہو گی ضرور کہو گی۔" غضنفر نے پُر تنفر لہجے میں کہا۔ "تمہیں وہ زہر لگتا ہے۔ میں کھٹکتا ہوں۔ تم یہی سمجھتی ہو کہ وہ میرے گناہوں کا ثمرہ ہے۔ میں تمہیں کسی طرح یقین بھی نہیں دلا سکتا۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ مگر تم میرے بچوں پر کوئی پابندی نہ بٹھانا۔ یاد رکھو سیما۔ صرف تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے میری جان جائے گی۔!"

"جب آپ ہی ایسا سمجھتے ہیں تو دوسرے کیوں نہ سمجھیں گے؟"

"باہر جا کے رو۔ میرا دماغ مت خراب کرو۔ میں سو جانا چاہتا ہوں!"

سیما نے ایک حسرت بھری نظر ان پر ڈالی اور شکست خوردہ سی باہر نکل گئی۔ وہ خود کو اس ہجوم میں تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اپنا نہیں۔ کوئی

رازدار غمگسار نہیں۔ بیٹے بیٹی سب مخالف، دیور منہ پر سب درپردہ دشمن۔ کیا قیامت ہے۔ انہیں برائی برائی نظر نہیں آتی۔ نوید تو کئی مرتبہ کہہ چکا تھا آپ کا نامناسب سلوک ڈیڈی کو ذہنی بیمار کر دے گا۔ سدید منہ پھٹ تھا۔ وہ اپنے باپ کو سمجھاتا تھا کہ ممی کی بات پر کان نہ دھریں۔ اور شہابی
شہابی کچھ کم خودسر نہ تھی۔ اپنی ماں کو جاہل کہتی تھی۔

اب زمانہ بدل چکا تھا۔ سیما کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی، اولاد والی ہو کر بے سہارا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے نادار، اور میکے اور سسرال والی ہونے کے باوجود تنہا تھی۔ اولاد کی محبت و التفات کی جویا، شوہر کی توجہ کی آرزومند، لیکن اسے کچھ نہیں ملا۔ اسے شوہر سے نفرت اور بے رخی ملی تھی۔

غضنفر کی سردمہری اور برہمی نے اسے دل شکستہ کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی، اور بستر پر بیٹھ کر رونے لگی۔ دالان میں سب لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سامنے سے گزر کر آئی تھی۔ کسی نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔ دیکھا سب نے تھا! آخر یہ سب سمجھتے کیا ہیں؟ کیا وہ اپنے شوہر اور بچوں کی دشمن ان کی بدخواہ تھی؟

دیر بعد نبیلہ چائے لیے اس کے پاس آئی۔ اور اسے روتے دیکھ کر رسمی سی تسلیاں دینے لگی۔

رات کو غضنفر کی طبیعت ٹھیک تھی۔ نوشینہ اور نبیلہ نے اجازت چاہی ایک شب کے جاگے ہوئے لڑکے سونے چلے گئے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ رات بھر کوئی نہ کوئی غضنفر کے پاس موجود رہے۔ جمشید نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی۔

سوئی تھی اور دوپہر کو بھی ایک نیند کھینچ لی تھی۔ ڈیڈی کے پاس میں اور بھیا جاگیں گے!"

"یہی تو تمہاری چالاکیاں ہیں۔" نوید نے کہا۔ "اس طرح تم دونوں موقع سے فائدہ اٹھا کر ماسٹر آف سچویشن بن جاتے ہو۔ اور ڈیڈی کی محبت لے بھاگتے ہو۔ نان سنس!"

"بھائی جان، آپ کو کس نے منع کیا ہے کہ آپ ماسٹر آف سچویشن نہ بنئے آپ خود ہی نہ جاگیں۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟" شہابی بولی۔

"تم لوگ کیوں تکلیف کرو گے۔" اپنا غصہ ضبط کر کے سیما نے کہا "میں جاگوں گی ان کے پاس۔"

"ممی، آپ کا مطلب ہے کہ ڈیڈی کو آرام کرنے دیا جائے؟" سدید بول پڑا۔ "آپ تو خاموش رہتی نہیں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈیڈی جاگتے رہیں اور آپ سو جائیں!"

"بدتمیزی مت کرو۔" اس نے جھڑک دیا۔ "تم بہت آپے سے باہر ہو گئے ہو۔ باپ کے لاڈ نے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے!"

"اب دیکھئے۔ کیا اس قسم کی باتیں آرام پہنچانے والی ہیں۔" سدید نے احتجاج کیا۔

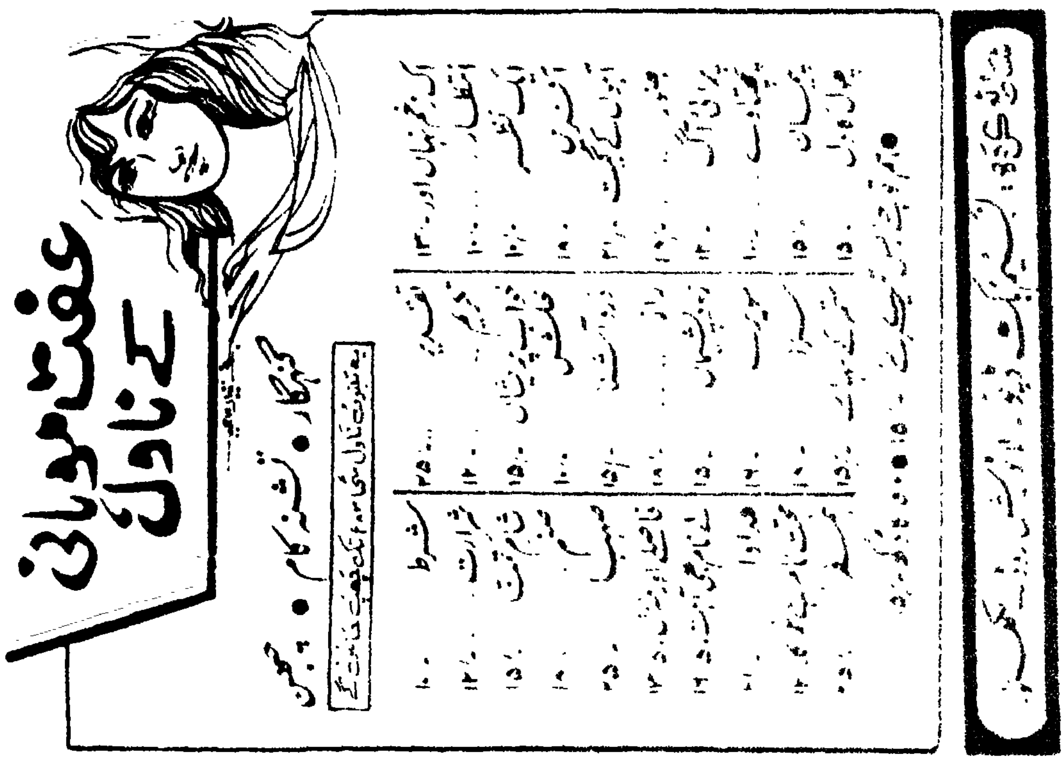
"ہاں، تم سب ان کے دوست ہو۔ ہم دشمن ہیں۔" سیما نے کہا۔

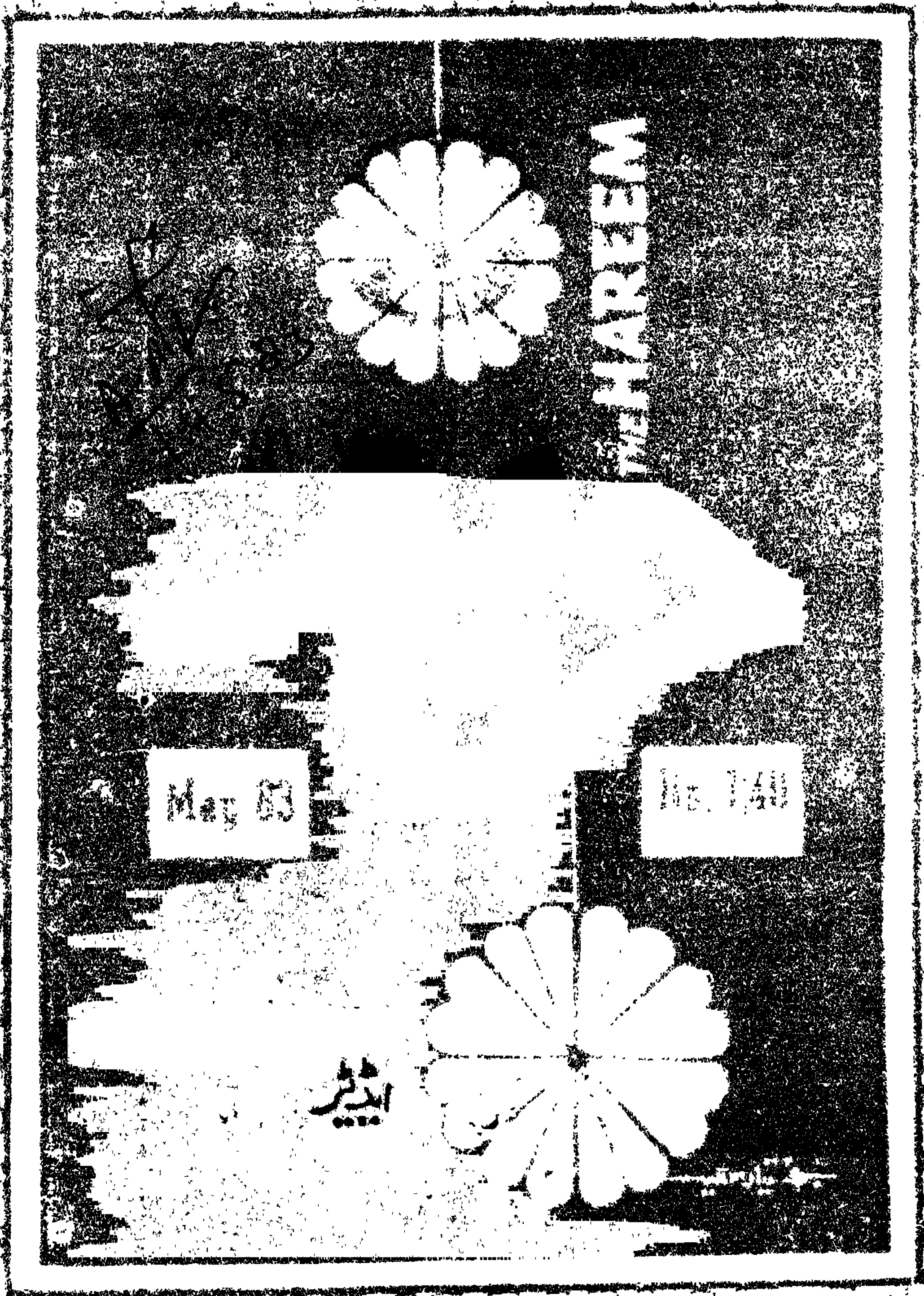
"سدید!" نوید نے اسے ڈانٹ دیا۔ "میں بھی دیکھتا ہوں تم بعض وقت بڑے گستاخ ہو جاتے ہو!"

"اچھا ممی جان، معافی چاہتا ہوں!" سدید بولا۔

The Hareem, Lucknow April 1983 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32

786





THE HAREEM
May 83
No. 140
ایڈیٹر

گذشتہ ۵۳ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

لکھنؤ کا سب سے قدیم رسالہ

ماہنامہ نسیم

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

اڈیٹر نگراں

نسیم انہونوی

معاون

شوکت جہاں بیگم غزالہ

و

جانی بسمل ردولوی

قیمت ۔ فی پرچہ ۔ ایک روپیہ چالیس پیسے

قیمت ۔ سالانہ منی آرڈر سے ۔ ۲۲/- روپیہ

قیمت ۔ مخصوص ۔ ۔ ۔ ۲۵/- روپیہ

قیمت ۔ اعزازی ۔ ۔ ۔ ۲۷/- روپیہ

وی ۔ پی سے منگوانے پر چھ روپے زائد

غیر ممالک سے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی ۔ میل ۔ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

دار الاشاعت ۔ ۔ ۔ نسیم بک ڈپو ۵۰ ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ

جلد (۵۳) | فہرست مضامین ماہ مئی ۸۳ء | نمبر (۵)

آفس و ترسیل زر کا پتہ :- نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ ۔

فون آفس ۔ ۴۴۵۵۹

فون رہائش ۔ ۴۵۲۴۴

نسیم انہونوی ۔ پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا ۔

لمعات

بمبئی کی خبر ہے کہ ۵ اپریل ۸۳ء کو مہاراشٹر اسمبلی کے ایوان میں اس وقت ایک تہلکہ سا مچ گیا، جب جل گاؤں میں پولیس کی تربیت حاصل کرنے والی ایک جوان لڑکی مس الکا وشوا ناتھ نے وزیر اعلیٰ کے نام اپنے خط میں یہ وضاحت کی کہ اسے ملازمت سے صرف اس لئے برطرف کر دیا گیا ہے اس نے ڈسٹرکٹ سپرانٹنڈنٹ کی نفسانی خواہش کی تکمیل سے انکار کیا۔ مس الکا نے لکھا ہے کہ مسٹر سدھاکر امبیدکر نے اسے تین مرتبہ شب میں اپنے گھر پر بلایا، لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ اس طلبی کا مقصد کیا ہے، اس لئے وہ نہیں گئی۔ اور اس جرم کی پاداش میں اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔"

یہ واقعہ پولیس کے محکمہ سے تعلق رکھتا ہے، جو ایسے اور تمام دوسری طرح کے جرائم کی روک تھام کرنے کا فرض ادا کرتا ہے۔ لیکن اب آئے دن اس محکمہ کے کارکنوں کی ایسی زیادتیوں کی خبریں آتی رہتی ہیں —— اور یہ وہ خبریں ہوتی ہیں جو الکا جیسی باہمت، جری اور عفت شعار لڑکیوں یا عورتوں سے متعلق ہوا کرتی ہیں لیکن ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو مرد کے جبر و استبداد کا شکار بنتی ہیں لیکن سماج میں اپنی بے عزتی کے ڈر سے ایسی خبریں اخبار میں نہیں دیتیں۔

اس لئے کہ ہندوستانی سماج میں ہر آزاد خیالی کے باوجود یہ کمزوری ابھی باقی ہے کہ زبردستی بھی اگر کسی عورت کو برباد کیا جائے تو وہ اس قابل نہیں رہتی کہ اسے کوئی اپنا سکے۔ عصمت دری کا داغ ہمیشہ [illegible] کے ماتھے پر چمکتا رہتا ہے اور [illegible] بھی اس پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں، حالانکہ اس [illegible] کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ [illegible] عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ جو ہونا تھا، ہو گیا، لٹی ہوئی عزت واپس نہیں آ سکتی، اس لئے خواہ مخواہ کے لئے بدنام ہونے سے بہتر ہے [illegible]

یہ تو [illegible] مرد کے ظلم و ستم اور عورت کی مظلومیت کا ایک رخ [illegible] جو کرنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی تجربہ کے بغیر [illegible] کا [illegible] کرنا کبھی [illegible] نہیں ہو سکتا۔ میں نے اکثر عورتوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم وہ پہلے والی عورتیں نہیں۔ اس لئے مردوں سے کیا ڈرنا ——

لیکن ایسے جملے صرف شہروں ہی کے لئے صحیح معنوں میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ [illegible] بے خوفی کے اعلان کی تبلیغ صرف شہروں ہی سے ہو سکتا ہے، غیر مردوں کے سامنے فخر و مباہات کی باتیں آج بھی نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں اور اس وقت بھی عورت کی یہی پوزیشن تھی مردوں کے مقابلہ میں، جب وہ گھروں کی چہار دیواریوں میں بند رہتی تھی اور اس کی عفت کا گوہر نایاب زمانہ قدیم میں بھی یہی حیثیت رکھتا تھا۔ زمانہ وسطیٰ میں بھی ایسی ہی صورت تھی اور اب جبکہ عورت سب کچھ کر سکتی یعنی مجسٹریٹی۔ وکالت، کونسل کی ممبری، آفس کی کلرکی، سیل مینی وغیرہ وغیرہ۔ وہ سائیکل و اسکوٹر بھی چلا لیتی ہے، موٹر بھی ڈرائیو کر لیتی ہے۔ [illegible] کی پریڈ میں شرکت کر کے بندوق چلانا بھی جان سکتی ہے —— لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنی عزت آبرو بچا لے جانے پر قادر نہیں۔ [illegible] یہی وہ خطرہ ہے جو کسی بھی مرد کو نہیں ہوتا اور ہر عورت کو لاحق رہتا ہے۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مرد اپنی عزت آبرو خود [illegible] کرنے اور [illegible] کی فکر میں رہتا ہے [illegible] کوئی نہیں پوچھتا، لوٹنا تو درکنار [illegible] بلا جبر و اکراہ بھی کوئی عورت [illegible] خواہش مند نہیں ہوتی، لیکن اس پر ڈاکہ ڈالنے کا موقع مل سکے تو ہر مرد ہی یہ جرم کر سکتا ہے۔ بلکہ کرتا ہی رہتا ہے۔ مرد کے جبر و استبداد کی کہانی بہت پرانی [illegible] ہے۔

کتنا عجیب [illegible] ہے یہ بات کہ [illegible]

[illegible] خاتون کے [illegible] دیکھئے کہ [illegible] حکومت [illegible]

پہلی عورت [illegible] ہوئے تھے۔ جس کے [illegible]

اور بے گناہ [illegible] موت کے گھاٹ اتار [illegible]

[illegible] مکافات [illegible]

آپ پوچھ سکتی ہیں کہ آخر اس کا علاج کیا ہے ؟ تو میں یہی کہوں گا کہ اسلامی معاشرے کی پیروی کیجئے۔ پردہ کیجئے اور پردہ نہ بھی کیجئے تو مردوں کی صحبت سے دور دور رہیں۔ پردہ کا اولین مقصد یہی تھا اور ہے کہ اختلاط مرد و زن نہ ہو۔ آگ کو پھوس سے دور رکھا جائے تو آگ لگنے اور پھوس کے جل جانے کا امکان بہت ہی کم ہو سکتا ہے۔ خواہ مخواہ ملازمت نہ کیجئے کہ یہی اختلاط مرد و زن کا راستہ ہے اور اس کے بعد بہت سی ناگفتہ بہ صورتیں پیدا ہونے کا امکان ہو جایا کرتا ہے۔

محکمۂ ڈاک کی بدنظمی

بار بار حریم میں محکمۂ ڈاک کی بدنظمی کے سلسلہ میں لکھا گیا لیکن اکثر بہنیں اس کے باوجود ہمارے ادارے ہی کو قصوروار گردانتی ہیں حالانکہ ہم خود اتنا پریشان ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ [illegible] کے کھونے اور تاخیر سے پہنچنے کی بات تو الگ رہی۔ جو وی۔ پی ہم روانہ کرتے ہیں ان کی رقمیں مہینوں بعد ملتی ہیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ مہینے میں دو چار بار اکٹھا رقم آجاتی ہے۔ روزانہ ڈاک تقسیم نہیں ہوتی لطف کی بات یہ ہے کہ محکمے کے ارباب حل و عقد اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کر رہے ہیں۔ شکایتوں کا جواب نہیں ملتا۔ منی آرڈر ۱۵۔۱۵، ۲۰۔۲۰ دن بعد ملتے ہیں۔ خطوط کا بھی یہی حال ہے کہ جو مل جاتے ہیں وہ بھی خوش قسمتی ہی سے مل جاتے ہیں۔

ہم اپنی بہنوں کو دوبارہ اور [illegible] بارہ پرچے روانہ کر کے نقصان پر نقصان اٹھا رہے ہیں۔ [illegible] مورد الزام ہم ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔ [illegible] غرض کر سکتے ہیں [illegible] کہ وہ اپنی ذمہ داری [illegible] ختم کر دیں [illegible] سر سے اتر [illegible] جا رہا ہے اور [illegible] نہیں کر [illegible] کی شکایت [illegible] کہ پرچے [illegible]

[illegible] چہ عمر شریف کا بھی سے [illegible] ترتیب ترمیم مقالات کے خریدار [illegible] شکایت کر کے [illegible] اور [illegible]

سب سے بڑا اُصول

قمر ہاشمی

اخلاق آدمی کا شرف آدمی کی خیر
اخلاق سے بڑے بڑے دشمن ہوئے ہیں زیر
اخلاق سے رسول نے جیتی ہے کائنات
پاس آئے کشش جہاں
اخلاق آدمی کے لبوں سے بکھرتے پھول
اخلاق زندگی کا ہے سب سے بڑا اصول
اخلاق آسماں کا زمیں کے لئے ہے
اللہ کا سے
اخلاق آدمی کی ہے [illegible] آدمی کی سیف
اخلاق آدمی کی [illegible]
اخلاق مومنیں کا ہے جسم و زند
اخلاق سرخرو
اخلاق ہو تو آدمی بنتا ہے آدمی
اخلاق سے زبان و بیاں میں شگفتگی
اخلاق ہی سے آدمی ہوتا ہے با
اخلاق زندہ
(بشکریہ ہمدرد صحت)

<u>پاکستانی ناول</u>

سفینۂ غم دل	..	قرۃ العین حیدر	..
دل آویز	..	نگار زریں	..
شہناز	..	[illegible] جبیں	..
پیاسا	..	[illegible] اعجاز	
گل بانو	..	[illegible] بانو	..

ایک نہایت دلچسپ تاریخی افسانہ

عظمتِ تشنگی

شہناز کنول

• غزنی کے بازارِ حسن سے امیر جلال خلجی نے پانچسو دینار میں ایک کنیز خریدی۔ لڑکی نے سودا ہو جانے کے بعد اپنے ساتھی غلام پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تاکہ اس کے آنسو وہ نہ دیکھ سکے۔ امیر جلال نے کنیز کو سیاہ چادر دی جسے اس نے اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور دونوں گھر آ گئے۔

رات کو [illegible] لڑکی کو سجا سنوار دیا تو ستر سالہ امیر جلال خوابگاہ میں پہنچا کمخواب لئے کپڑے بھاری جوڑے قیمتی زیورات اور سرخ جالی چہرے پر ڈالے وہ لڑکی قالین پر گاؤ تکیہ سے اپشت لگائے بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب تھی جسے [illegible] رہی تھی۔ امیر جلال کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ امیر جلال نے اس کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو کر پوچھا "لڑکی تیرا نام؟" لڑکی نے کہا "نام رشتہ داریاں قائم کرنے کے لئے ہوا کرتے ہیں بازار میں بکنے والی چیز کا کوئی نام نہیں ہوتا اور پھر میرا تمہارا تعلق نام کا محتاج نہیں ہے چاہے جو نام رکھ لو"

"خوب ـــ" امیر جلال مسکرایا "حسین بھی ہے اور فصیح البیان بھی۔ لڑکی! ہر تعلق ایک نام ضرور چاہتا ہے۔ میں [illegible] دہراؤں گا تیرا نام کیا ہے۔ [illegible] پھر نام بتانے [illegible] بات کا [illegible] تو بازار میں بک [illegible] بکی ہے"

لڑکی نے اپنی شربتی آنکھوں سے [illegible] ایک گہری نظر [illegible] آقا پر ڈالی اور آہستہ سے [illegible] "میرا نام ماہ [illegible] ہے"

"نہیں ـــ ناممکن ہے تو ماہ [illegible] نہیں ہو سکتی کہاں چاند کا داغدار چہرہ اور کہاں تیرا سراپا حسن و جمال تو تو سر سے پیر تک حسن ہے تیرا نام آج سے ماہ جمال ہے۔ امیر جلال اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا لڑکی خوبصورت حسین عورت کو کانچ کی گڑیا سمجھتا ہوں اور اسی طرح اس کی حفاظت بھی کرتا ہوں تیرے پھول سے چہرے اور مخملی جسم کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن وقت آنے تک میں تیری حفاظت اس طرح کروں گا جیسے گلاب کی نازک پتی کی کی جاتی ہے"

"تم میری کیا حفاظت کرو گے۔ حفاظت کا کام اس کا ہے جس نے مجھے یہ حسن یہ دلکشی دی ہے" اور کمرے میں امیر جلال کا قہقہہ گونج اٹھا اس نے ماہ جمال کی پشت تھپ تھپائی اور بولا تیری نظریں اور عقل دونوں تیز ہیں تو سمجھ چکی ہے کہ مجھ جیسے [illegible] سالہ بوڑھے کے لئے تیرا حسن و جمال اور تیرا گداز جسم بے معنی ہے لیکن پھر غور سے سن میرے لئے عورت میں اس وقت بھی کوئی کشش نہیں تھی جب میں ۲۵ سال کا خوبرو جوان تھا۔

"تب پھر تم نے مجھے کیوں خریدا ہے؟ کیا اب تم کسی اور سے [illegible]!

"وقت آنے پر تجھے خود معلوم ہو جائے گا کہ تو امیر جلال کے [illegible] تیرا یہ حسن تیری۔ پیاری آواز یہ مہذب گفتگو تیرے یہ آداب تجھے اور مجھے کیا [illegible] [illegible] ایک [illegible] ہتھیار خوبصورت اور نازک جسے [illegible] کے لئے بنایا گیا ہے [illegible] [illegible] پھول [illegible] تو کسی [illegible] میں بیٹی یا بہن بنا کر نہیں پیش کی جائے گی" ماہ جمال نے [illegible] نظروں سے امیر جلال کو دیکھا۔ دو شبنمی قطرے اس کی آنکھوں سے پھسل پڑے۔ امیر جلال نے منہ بنا کر کہا "تیرے آنسو میرے دل میں لگی آگ کو نہیں بجھا سکتے۔ بہتر ہو کہ آئندہ اپنی آنکھوں سے آنسو کی جگہ [illegible]۔ تو اصلاً کہاں کی ہے؟"

"ماں باپ [illegible] مجھ سے پوچھا گیا اپنے باپ [illegible] نام نہیں [illegible] کہ وہ ایک ناپاک جسم [illegible] کا [illegible]"

"خیر مجھے تیرے [illegible] لیکن وقت [illegible] معلوم ہوگی کہ تیرا حسن [illegible] تیرا زبان سے نکلنے والے کلمات [illegible] اور میٹھے [illegible] تیری آواز [illegible] قدر ترنم ریز [illegible] [illegible] گا؟"

نہیں ـــ ـــ [illegible] نے زندگی میں لحن سے سوائے کلام پاک اور کچھ نہیں پڑھا :: ماہ جمال نے سرجھکا کر کہا۔

[illegible] نے [illegible] اس کی طرف دیکھا اور بولا تیرے ہاتھ میں خالی کلام پاک ہی ہے۔ [illegible] سے کلام پاک [illegible] کے سوا کچھ اور کبھی نہیں پڑھا اور پھر بھی شہر [illegible] بازار میں بکنے کو آئی [illegible] کتاب نے تیری حفاظت نہیں کی؟

بکنے کو مصر کے بازار میں یوسف سا پیغمبر بھی بکا ہے۔ میں اسے ایک امتحان سمجھتی ہوں لیکن حفاظت کرنے والا اگر چاہے تو مجھ جیسے ہزار [illegible] میں بھی محفوظ رہ سکتی ہوں [illegible]

غصہ [illegible]

امیر [illegible] سے دیکھا اور [illegible] ہوتے بولا تیری [illegible] بولنا بہت سخت [illegible] ہے لیکن تیرے ان پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے میں پھول جھڑتے دیکھنا چاہتا ہوں!! اس کے بعد ماہ جمال دیر تک بیٹھے اس آقا کے بارے میں سوچتی رہی جو تیز نظر رکھتی تھا اور حقیقت بھی اس کی باتوں نے ماہ جمال کو کسی قدر [illegible] کر دیا تھا [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] میں شہاب الدین غوری نے [illegible] پر حملہ [illegible] ترائن کے [illegible] سے کھسان کی جنگ ہوئی [illegible] کی فوج [illegible] سپہ سالار [illegible] [illegible] کے سردار جو غوری [illegible] ان حالات [illegible] [illegible] لیکن غوری فوج کے افغانی اور ترکی سردار بھی میدان [illegible] شہاب الدین کا [illegible] مشورہ پسند نہیں آیا اس [illegible] میدان [illegible] شکست کھا کر بھاگ گئے [illegible] اگر [illegible] نہیں ہے تو آج میدان میں [illegible] ہو جاؤں گا۔ [illegible] مجھے [illegible]

نہیں ہے۔ اور بقیہ فوج لیکر میدان جنگ میں کود پڑا اور لڑتے لڑتے زخمی ہو کر گر پڑا اس کی فوج کو شکست ہو چکی تھی۔ شام تک وہ میدان [illegible] ہوتے ہی اس نے ان تمام بزدل اور بھاگنے والے امیروں [illegible] سزا دی کہ گھوڑوں کے توبڑوں میں گیا جو بھروا کر ان کے گلے میں لٹکا دیا اور کہا [illegible] ورنہ گردن مار دی جائے گی۔ امیروں [illegible] میں بے ہوش پڑا رہا رات کو اس کے غلام اسے ڈھونڈنے نکلے [illegible] کی کراہوں سے [illegible] پہچانا۔ فوری طور پر مرہم پٹی کر کے غلام اسے لے کر روانہ ہوئے رات بھر کاندھے بدل بدل کر سفر جاری رہا۔ صبح [illegible] بادشاہ کو فوجی سرداروں کے خیمہ میں پہنچا دیا گیا [illegible] سے حکم کی تعمیل کی۔ انہیں امراء میں امیر جلال خلجی [illegible] جسے اس بڑھاپے میں شاہی اعزاز چھن جانے اور اتنی سخت سزا ملنے کا بے حد قلق تھا [illegible] معلوم تھا کہ بادشاہ کو اس صورت حال سے قطب الدین ایبک نے آگاہ کیا تھا اس لئے اس نے اپنی اس توہین کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔

[illegible] ترکوں کے ایک بہت بڑے قبیلے البری کے سردار [illegible] تو اس بیٹا پیدا ہوا تو اس نے قبیلہ کے [illegible] کئی دن جشن منایا اور بے شمار دولت لٹائی [illegible] گیا۔ شمس الدین اپنے بقیہ بھائیوں سے صورت اور سیرت [illegible] بالکل الگ تھا وہ جتنا خوب صورت تھا اسی قدر خوب سیرت بھی تھا۔ بہادری اور شجاعت میں بے مثال تھا اس کی صورت [illegible] سیرت [illegible] سبھی فریفتہ تھے۔ باپ بھی رفتہ رفتہ اسکو [illegible] گیا اور یوں شمس الدین باپ کی خصوصی توجہ اور محبت کی بنا پر بھائیوں کے حسد کا شکار ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر حضرت یوسف والی روایت دہرائی گئی اور اس کے بھائیوں نے [illegible] کے بہانے لے جا کر ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا [illegible] ہوا وہ غزنی پہنچا تو اس کی شہرت شہاب [illegible] پہنچی اور بادشاہ نے غلام کی قیمت لگا کا حکم دیا ـــ ـــ لیکن سوداگر نے اس کی [illegible]

• [illegible] عصمت عورت خدائے پاک کی صنعت کاملہ کا نمونہ اور دنیا کی قابل قدر چیز ہے۔ (تخیل)

بےحد زیادہ بتائی اور کسی طرح کم کرنے کو تیار نہ ہوا۔ شہاب الدین غصہ سے کھول گیا اور حکم دیا کہ اس غلام کو کوئی نہ خریدے۔

قطب الدین ایبک جب ہندوستان سے غزنی پہنچا تو اس نے اس غلام کے چرچے سنے اس نے بادشاہ سے دریافت کیا "آج کل غزنی کے گلی کوچوں میں ایک ترک غلام کے حسن و جمال اور فہم و فراست کا بہت شہرہ ہے۔ کیا نایاب چیز آپ کے دربار کی زینت نہیں بن سکتی۔؟"

"اس کا مالک ہوس کا بندہ ہے اس لئے وہ غلام اب غزنی میں نہیں بک سکتا اگر تو چاہے تو اسے ہندوستان بلا کر خرید سکتا ہے۔ لیکن اگر تیرے علاوہ کسی نے خریدنے کی جرأت کی تو سوداگر غلام اور خریدار دونوں کی گردن ماری جائے گی۔" قطب الدین نے بادشاہ کے پرجلال چہرے پر نظر ڈالی اور خاموشی کے لئے رہ گیا۔

ہندوستان پہنچتے ہی شمس الدین بن ایلم خاں کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ قطب الدین ایبک نے ایک لاکھ جیتل میں دو غلام خریدے جس میں ایک شمس الدین تھا۔ چونکہ قطب الدین بھی غلام خاندان سے تھا اس لئے اس نے شمس الدین کو اپنا بیٹا بنا کر علم و فن سیکھنے بٹھا دیا۔ شمس الدین کی ذہانت کے جوہر کھلنے لگے اور وہ بہت جلد اپنے استادوں کا منظور نظر بن گیا۔ اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے شہاب الدین [illegible] التمش [illegible] دیا اور [illegible] میر شکار ریاست بنا دیا گیا۔

شمس الدین التمش اچھے خاندان کا لڑکا تھا اپنے آقا کی مہربانیاں اس کے لئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئیں اس نے خود کو بادشاہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور ان خدمات کے صلے میں بدایوں اور برن (بلند شہر) کی جاگیر اسے عطا کی گئی اور گوالیار کا قلعہ اس کی تحویل میں دے دیا گیا۔

کھکھڑوں کی بغاوت دور کرنے کے شہاب الدین غوری آیا ہوا تھا۔ دریائے بیاس کے کنارے تین دن سے فوجیں پڑی ہوئی تھیں۔ طغیانی پر آئے ہوئے دریا پر کسی کا قابو نہیں تھا۔ چوتھے روز التمش کو احساس ہوا اس طرح فوجوں میں سستی، کاہلی اور بددلی پھیل سکتی ہے اور فوج کا جوش و خروش ختم ہو گیا تو شکست یقینی ہے۔ وہ ایک جوش و ولولے کے ساتھ اٹھا اور اپنی فوج کے چند جیالوں کو لے کر ایک دم گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ شہاب الدین غوری نے حیرت سے یہ منظر دیکھا مگر اگلے چند منٹ میں التمش دریا پار کر کے مقابل فوج پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ساری فوج دریا عبور کرنے چل پڑی اور اتنی دیر میں شہاب الدین غوری وہاں پہنچا میدان التمش جیت چکا تھا۔

شہاب الدین غوری نے اپنی آنکھوں سے التمش کی جانبازی، بہادری [illegible] دیکھی تھی وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے فرط مسرت سے [illegible] "اگر ہم تمہیں قطب الدین سے لیں تو تمہاری طرف سے اس بے مثال بہادری کا انعام کیا ہونا چاہیئے؟"

قطب الدین مسکرایا اور بولا "اگرچہ یہ میدان کارزار ہے اور یہاں [illegible] فیصلہ [illegible] لیکن میں اپنے [illegible] نوجوان غلام کی زندگی کا فیصلہ [illegible] کئے دیتا ہوں۔ آپ سے بہتر [illegible] مجھے کبھی نہ ملے آج سے میں اس ترک غلام کو اپنی اولاد میں شامل کر رہا ہوں۔ میں اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر کے غلامی کا طوق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اتار دینا چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا اس سے بہتر صلہ میری طرف سے اور کیا ہو سکتا ہے۔" التمش کا [illegible] دونوں آقاؤں کے [illegible] شہاب الدین نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور [illegible] کے گلے کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔

امیر جلال کو حیرت تھی کہ ماہ جمال کو نہ زیورات [illegible] سے رغبت تھی نہ قیمتی پوشاکوں سے۔ اس کا پہلا اور آخری شوق مطالعہ تھا۔ وہ عربی و فارسی میں یکساں مہارت رکھتی تھی۔ علم و ادب اور حسن و جوانی کی اس بے مثال تصویر کو امیر جلال جلد سے جلد ہندوستان لے جانا چاہتا تھا کہ قطب الدین سے [illegible] لے سکے اور اپنا مقام حاصل کر سکے۔ لیکن امیر جلال کو ماہ جمال کی یہ سادگی قطعی ناپسند تھی۔ ایک دن اس نے ماہ جمال کو اپنے کمرے میں بلوایا اور بولا "وہ نمونہ تھا جو غزنی کے بازار حسن میں بک گیا۔ تجھ میں تو عام کنیزوں والی کوئی بات نہیں۔ تمہیں آخر کیا چاہئے؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں تم نے مجھے بازار سے خریدا ہے اب میری کوئی مرضی نہیں ہے۔"

"تجھے کوئی خاص پوشاک پسند ہے؟"

ہاں ـــــ ایسی پوشاک جو تو پہنانے کی طاقت رکھتا ہو۔"
امیر جلال مسکرایا اور بولا "تجھے ابھی تک شاید میری سکت کا اندازہ نہیں ہوا تو خواہش کر کے تو دیکھ ـــــ"

"ایک کنیز کو خواہش سے کیا کام جبکہ یہ بھی یقین ہو کہ دلی خواہش کا پورا کرنا تیرے بس میں نہیں ہے۔"

امیر جلال نے حیرت سے اسے دیکھا پھر بولا "خدا! میں نے آج تک تیرے جیسی لڑکی نہیں دیکھی تیری سنجیدہ اور بامعنی گفتگو کسی کا بھی دل [illegible] اپنے ہاتھ [illegible] ہے میں [illegible] لئے بڑا یا مجبور [illegible] کی طرف توجہ کریں گے۔ ماہ جمال نے [illegible] کے گردن [illegible] کاری

امیر جلال نے ماہ جمال کے لئے پالکی کا انتظام کیا تھا وہ بہت ہوشیاری سے [illegible] جا رہا تھا اس نایاب کو وہ ہر کسی کی نظر میں [illegible] تھا اس لئے قافلے کی روانگی سے کچھ پہلے پالکی آکر امیر جلال کی [illegible] دروازے پر رک گئی۔ ماہ جمال سیاہ چادر میں اپنی [illegible] کی نقاب [illegible] آکر پالکی میں بیٹھ گئی۔ امیر جلال کا گھوڑا پالکی کے ساتھ ساتھ تھا۔

امیر جلال [illegible] قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا وہ [illegible] ہندوستان میں اپنی پہلی منزل [illegible] جنوب مغرب [illegible] ایک [illegible] ریاست جالور کے راجہ نے اس کی پذیرائی کی اور [illegible] امیر کو [illegible] مقرر کر دیا [illegible] دیکھ بھال کرتے [illegible] امیر جلال کی ذات سے [illegible] کرنے پر تیار نہیں تھی [illegible] پامال کرنا تھا جس کے لئے اس نے اپنی جوانی کی [illegible] کو بچایا تھا [illegible] اور دنیا داروں کو دھوکہ دیا تھا [illegible] وہ عام آدمی کی طرح نہیں مرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر [illegible] حاصل کرنے کو تیار تھا۔

[illegible] کی مہم سے فارغ ہو کر امیر جلال جب گھر آیا تو ماہ جمال [illegible] قرآن مجید پڑھنے میں مشغول تھی اس کی پرسوز آواز [illegible] قرات نے امیر جلال کو مسحور سا کر دیا وہ خاموش کھڑا کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر [illegible] کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "سچ ہے کتنے سازوں [illegible] تیری آواز [illegible] کو توڑ [illegible] آواز

ہی کافی ہے۔ تو تو شہنشاہوں کے لئے بنی ہے اب وقت آگیا ہے کہ میں تجھے دہلی لے جاؤں اور تو اپنے سحر طراز کلام دل نشین گفتگو اور فتنہ ساماں حسن سے بادشاہ قطب الدین کو اپنا اسیر کر لے پھر دیکھ میں کیا کرتا ہوں ـــــ"

ماہ جمال نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کسی قدر تلخی سے بولی "علم و فن اور ادائیں دکھا کر مردوں کو زیر کرنے کے لئے نہیں ہوتے تجھ پر حرص و ہوس کا غلبہ ہے جو اس عمر میں تجھے زیر نہیں دیتا۔ میری آواز کی لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تو کبھی اب ترک خواہشات کرتا کہ آخرت میں ناکام و نامراد نہ رہ جا[illegible]

امیر جلال تلملا گیا بولا "تیرے علم و فضل اور آواز سے اگر مجھے مستقبل [illegible] ہوتا تو [illegible] تیری زبان کاٹنے کا حکم دے د[illegible] ہوتا۔"

ماہ جمال کے چہرے پر ایک تبسم کھیل گیا وہ بولی "تیرا حکم میری زبان تو کاٹ سکتا ہے لیکن اگر تیرا بس چل سکے تو ان فرشتوں کے ہاتھ کاٹ دے جو تیرے مونڈھوں پر بیٹھے تیرے اعمال لکھ رہے ہیں۔"

امیر جلال نے ایک جھرجھری سی لی اور قہر آلود نظروں سے ماہ جمال کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہ جمال اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آکر [illegible] سنجیدہ مت کر میں جانتی ہوں کہ میں تیری زر خرید ہوں تیرا حکم میرے سر پر [illegible] مگر میری روح پر کیوں ظلم کرتا ہے تیری نفس کشی نے بیسیوں [illegible] میں تیری عزت پیدا کی ہے لیکن اس نفس کی قربانی سے تو نے کیا حاصل کیا؟ میں جانتی ہوں تیرے اندر کا یہ سرکش حیوان تجھ سے کسی چیز کا طلب گار ہے اور یہ تو نے کہ میں تجھے خواہشوں کی اس جنت میں پہنچا سکتی ہوں، تو مجھے [illegible] کر کے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر بار بار میرے اعتماد کو مجروح کیوں کرتی ہے۔" امیر ج[illegible] بولا "میرا کہنا تجھ پر آشکار ہو چکا ہے پھر بھی تیری زبان اتنی تلخی اگلتی [illegible]

"تجھے غلط فہمی ہو گئی ہے ـــ ـــ میں صر[illegible] فہمائش کرتی ہوں تاکہ کل تیرا ضمیر مطمئن رہے اور میں بھی خدا [illegible] حضور شرمندہ نہ رہوں ـــ ـــ مجھے اندازہ ہے کہ تو اتنا برا نہیں جتنا حالات نے تجھے بنا دیا ہے ـــ امیر جلال

کر بولا "لڑکی! تو نے کتابیں بہت پڑھ لی ہیں اس لئے اتنی بے باک ہے ورنہ اس ۸۰ سالہ تجربہ کار بوڑھے سے اس قسم کی باتیں کرنے میں جرأت نہیں"

دوسرے ہی دن قطب الدین ایبک کے گھوڑے سے گر کر مرنے نے امیر جلال خلجی کو چونکا دیا۔ فوری طور پر قطب الدین کے آرام شاہ کو تخت نشین کر دیا گیا۔ لیکن کاہل اور نااہل شاہ کی حکومت بھی نہ رہی سارے ملک میں بدامنی اور انتشار پھیل گیا اور پھر چند ہی بعد امیر جلال نے شمس الدین التمش کی تخت نشینی کی خبر سنی۔

التمش کو تخت پر بیٹھتے ہی جالور کے راجہ اڑلیسہ کی بغاوت کی خبریں شروع ہو گئیں آخر جب بات بڑھی تو وہ خود اس کی بیخ کنی کے لئے پہنچ گیا۔ اور چند گھنٹوں کے معرکے نے معاملہ نمٹا دیا۔ اڑلیسہ ہار گیا۔

التمش نے اپنے دو جانثار سرداروں اقسنقر اور فرخ شاہ کے سپرد یہ کام راجہ اڑلیسہ اور دوسرے فوجی قیدیوں کو دہلی لایا جائے۔ ان فوجی ں میں امیر جلال بھی شامل تھا ۔۔۔ دہلی روانگی سے پہلے امیر جلال نے سردار اقسنقر کے پاس درخواست بھجوائی اس سے ملنے کا خواہش مند ہے ——— دولت طاقت کے غرور میں چور سردار اقسنقر نے پہلے تو یہ درخواست دی۔ لیکن جب پیغام رساں نے بتایا کہ وہ بہت بوڑھا اور تجربہ کار معلوم ہوتا ہے تو مصلحتاً اقسنقر نے ملنا منظور کر لیا۔

جب امیر جلال خلجی اقسنقر کے خیمہ میں پہنچا تو دیکھا سردار اقسنقر انتہائی نفیس قالین پر ریشمی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے شغل مے نوشی میں مصروف تھا اس کے داہنی طرف ایک کنیز بیٹھی ساقی گری کر رہی تھی۔ اقسنقر ... کمر میں انہیں ڈالے مے نوشی کے ساتھ بوس و کنار میں بھی ... کنیز کی فتنہ انگیز ادائیں دعوت عیش و طرب دے رہی تھیں۔

جلال کو اپنے سامنے دیکھ کر اقسنقر نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا اور بولا۔ "اے قیدی! تیرے چہرے کے خطوط بتاتے ہیں کہ تو بادشاہوں کی صحبت ... دن گزار چکا ہے۔ تو قیدی ضرور ہے لیکن تیری عمر مجھ سے ملتجی ہے کہ تجھ پر رحم کروں بول کیا کہنا چاہتا ہے ؟"

امیر جلال نے گردن کو کسی قدر خم کر کے کہا "ایک سردار دوسرے سردار کی انسان شناسی پر نہ صرف شکر گزار ہے بلکہ تیری نگاہوں کی داد دیتا ہے۔ اس نوعمری میں ایسی قیافہ شناسی رکھتا ہے جو میں نے بوڑھے بادشاہوں میں بھی نہیں دیکھی" سردار اقسنقر نے غرور و نخوت سے اور گردن اکڑالی اور بولا۔ "بوڑھے اپنا مدعا بیان کر تو دیکھ رہا ہے ہم کتنے مصروف ہیں۔" بوڑھے امیر نے شرم سے گردن جھکالی اور بولا "میں نے قسمت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے لیکن میں صرف اتنی عرض لے کر آیا تھا کہ میرے ساتھ میری ایک کنیز بھی ہے اسے حفاظت کے ساتھ اپنی نگرانی میں دہلی پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے تو میں اپنی قید اطمینان سے کاٹ لوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ کل مجھ پر کیا گزرے اور زنداں کی تاریکیوں میں کب تک رہوں۔ مجھ سے صرف اتنا وعدہ کرلے کہ میری امانت میں خیانت نہیں ہوگی ——"

"ہوں ——" اقسنقر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "گویا وہ پیشہ ور ہی نہیں اچھوتی بھی ہے۔ اگرچہ فاتح انسان مفتوح کی ہر چیز پر تصرف کا حق رکھتا ہے لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیری امانت سنبھال کر رکھی جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ہم تجھ سے مانگ لیں"

"اگر تقدیر کبھی مہربان ہوئی تو میں تیرے اس احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کروں گا" یہ کہہ کر امیر جلال واپسی کے لئے مڑ گیا اور سپاہیوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا ——

اقسنقر نے جب ماہ جمال کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا ایسا دل فریب، دل کش ہوش و خرد سے بیگانہ کرنے والا حسن اس نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا، وہ محو نظارۂ جمال تھا کہ ماہ جمال نے گردن ترچھی کر کے پوچھا "معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین ایبک کے فوجی سرداروں نے کبھی عورت نہیں دیکھی"

"واللہ نہیں دیکھی ——" اقسنقر ایک دم بول اٹھا۔ "اگر تو عورت ہے تو میں واللہ کہتا ہوں کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسا ہوش ربا حسن نہیں دیکھا اور اگر تو کوئی ماورائی ہستی ہے تو انسان کے قالب میں آکر تو نے مجھ جیسے ہزاروں انسانوں پر ظلم کیا ہے۔"

"ہوش میں آ اے انسان ——" ماہ جمال نے ذرا تن کر کہا۔ "جس جگہ آج تو بیٹھا ہے کل وہاں پر میرا مالک بھی بیٹھا کرتا تھا"

"کیا مطلب ——" سردار نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"تیری نگاہیں خیانت کی مرتکب ہو رہی ہیں آنے والے کل نے اگر میرے مالک کو پھر یہی مسند دیدی تو شاید وہ تیرے ساتھ وہ سلوک نہ کرے جس کی تجھے امید ہو ——"

سردار ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر شراب کا پیالہ زمین پر پٹخ دیا۔

شیشہ کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔ اقسنقر ان پر نظریں جما کر آہستہ سے بولا "لڑکی، لڑکی جیسے آج تو اس مسند پر دیکھ رہی ہے شاید کل اسے ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز دیکھے۔۔۔ یہ مسند اگر تیرے مالک کو مل جائے گی تو ہم بہرحال اس سے بلند ہوں گے۔ تو اپنی ان اداؤں کو غصہ و خفگی میں ضائع مت کر ہماری حسن پرست طبیعت کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"نوجوان سردار امیر حسن کی حقیقت کو سمجھ۔ یہ حسن تیرے بے لگام نفس کی تسکین کے لئے نہیں ہے۔ یہ حسن تیری آوارہ نگاہوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ حسن تیرے مزاج کی عیاشیوں کو آسودہ کرنے کے لئے نہیں ہے۔ میں تیرے پاس امانت ہوں۔ یاد رکھ جس نے عہد وفا نہیں کیا اس نے اپنے ہاتھ سے غلامی کا طوق پہنا۔ جس نے تجربہ کار اور دوراندیش لوگوں سے بگاڑی اس نے اپنے مقدر پر خود سیاہی پھیر دی۔ جس نے کسی کے اعتماد کو شیشہ کا پیالہ سمجھ کر توڑا اس نے اپنے نصیب کو خود پھوڑا۔ عورت کے حسن کو اپنی ہوس کی تسکین کا ذریعہ نہ بنا بلکہ اس کے حسن کی روشنی سے اپنے مقدر کے اندھیروں کو روشن کرنا سیکھ۔"

اقسنقر حیران حیران سا [illegible] اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس [illegible] کنیز اس درجہ ذہانت کی باتیں کیسے کر رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا یہ عورت تو دنیا کا تختہ الٹ سکتی ہے۔ بادشاہوں کو تخت [illegible] سے محروم کر سکتی ہے [illegible] عام آدمی کو بادشاہت دلوا سکتی ہے۔ اس نے مرعوب سا ہو کر ماہ جمال پر ایک نظر ڈالی اور اٹھتے ہوئے بولا "لڑکی تیری ذہانت اور خطابت کہیں تجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اپنی زبان قابو میں رکھنا سیکھ۔۔۔ تو ہمارے پاس امانت ہے [illegible] ہم تجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

اقسنقر دل و جان [illegible] ماہ جمال پر فدا ہو چکا تھا۔ لیکن [illegible] سے دلی تک سفر میں اس نے ہر وہ طریقہ اپنایا جس سے ماہ جمال کا اعتماد حاصل کر سکے۔ دلی پہنچ کر اس نے ماہ جمال کو اپنے ہی محل میں ٹھہرایا اور خود اپنے دست راست اور دوست فرخ شاہ سے ملنے پہنچ گیا۔ ماہ جمال کے بارے میں ساری تفصیل سن کر فرخ شاہ نے سنجیدگی سے کہا "میرے دوست ایسی عورتیں اس دنیا میں اتفاق سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے وہی کام لینا چاہیے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہیں۔۔۔ تیرے عیش و عشرت کے لئے ہند میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ بے شمار مل سکتی ہیں لیکن اتنا یاد رکھ ہندوستان کا تخت صرف ایک ہی ہے۔"

اقسنقر نے احمقوں کی طرح فرخ شاہ کی طرف دیکھا اور بولا "تیرا عیب مجھے ہمیشہ پریشان کرتا ہے کہ تو بات کو گورکھ دھندہ بنا دیتا۔ ذرا وضاحت سے بیان کر۔"

"میں اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد وضاحت بھی کر دوں گا۔ میرا یہ عیب اس لئے اور بڑھ جاتا ہے کہ تیرے پاس شجاعت و ہمت تو ہے لیکن عقل نہیں ہے۔ وہ خوبیاں جنھیں صرف میں نے ایک رائے قائم کی تو دیکھ کر بھی کچھ حاصل نہ کر سکا"

رات کو جب اقسنقر فرخ شاہ کو لے کر اپنے محل پہنچا تو ایک کمرے سے انتہائی سوز و گداز اور جادو بھرے لحن کے ساتھ آیات پڑھنے کی آواز آئی۔ فرخ شاہ نے دیکھا محل کی کنیزیں اور غلام مبہوت اور ساکت تھے۔ ماہ جمال کی آواز سے سارا عالم [illegible] میں تھا۔ فرخ شاہ گردن جھکائے اس وقت تک کھڑا رہا جب تک ماہ جمال تلاوت کرتی رہی پھر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا اور [illegible] سے بولا "جس حسن کا تو ذکر کر رہا ہے اس کے ساتھ یہ آواز ہی نہیں دنیا کی بادشاہتیں ہمارے قدموں میں ڈال سکتی ہے۔ اس لڑکی کی حفاظت کر۔ خود پر بھی قابو رکھ۔ یہ ہمارا [illegible] ہو سکتی ہے۔"

"لیکن وہ بڈھا۔۔۔؟" اقسنقر نے اضطراب سے پوچھا۔

"راجہ اڑیسہ کے ساتھ بغاوت میں حصہ لینا سنگین جرم اور ایسے جرم کی سزا موت ہے۔ سمجھ لے یہ کنیز اب ہماری۔ لیکن سردار تو مت بہک جانا اس لڑکی کا جسم، حسن اور آواز ہماری راہوں کے لئے راستے ہموار کریں گے۔" (باقی آئندہ)

سرپنچ بک کلب کی ممبری

گزشتہ سرپنچ میں اس عنوان کے تحت جو اعلان ہے اسمیں غلطی سے یہ بات شائع نہ ہو سکی تھی کہ اس ر[illegible] کا اطلاق صرف انھیں حضرات پر ہوگا جنھیں پہلے سے کمیشن نہیں دیا جا رہا ہے۔

فرشتہ

صفیہ ملک

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے زندگی میں کوئی فرشتہ دیکھا ہے؟ — تو میں فوراً کہہ دوں گی کہ ہاں! میں نے ایک فرشتہ دیکھا ہے۔

فرشتے ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔

وہ جب بھی ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تو ہماری نانی اماں اسے بہت اشتیاق سے دیکھتیں۔ ہم میں سے کوئی پوچھ بیٹھتا — "نانی اماں! — آپ وسیم صاحب کو اتنے پیار سے کیوں دیکھتی ہیں؟" — تو نانی اماں فوراً جواب دیتیں "لڑکیو! — تم کیا جانو یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے فرشتہ!"

پھر ہمارا شعور پختہ ہونے لگا۔ ہماری سمجھ میں آدمی، انسان اور فرشتہ کا فرق آنے لگا تو سب کے اصرار پر میں نے اپنے لاڈلے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور پوچھا — "میں نے تو سنا تھا کہ فرشتے زمین پر نہیں رہتے پھر یہ وسیم صاحب تو سیدھے سادے سے آدمی نظر آتے ہیں بالکل ہمارے ابا کی طرح پھر آپ انھیں فرشتہ کیوں کہتی ہیں؟"

نانی اماں ایک گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر الماری کے اوپر سے پاندان اٹھایا۔ سروتے کی ضرب سے سپاریاں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ نانی اماں نے پان کا ایک بیڑا بنایا اسے کلے میں دبا کر ذرا سا تمباکو پھانکا اور گویا ہوئیں:

"چندا! جسے تم وسیم سمجھتی ہو وہ وسیم نہیں فرشتہ ہے، سچ مچ کا فرشتہ!"

پھر تھوڑی دیر کو وہ یوں خاموش ہو گئیں جیسے کہیں بہت دور سے کسی کہانی کی کڑیاں تلاش کر رہی ہوں، کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سے گویا ہوئیں جیسے دھندلے منظر کی تصویر کشی کرنے لگی ہوں۔

"آج سے تقریباً تیس سال پہلے وسیم کی بیوی شمسہ اپنی کوٹھی کی لان میں بیٹھی تھی کہ وسیم معمول سے کچھ پہلے گھر میں داخل ہوئے۔

"بیگم آج اللہ میاں نے ہمیں پلا پلایا بیٹا دیا ہے۔" انھوں نے سات آٹھ سال کے سہمے سہمے سے لڑکے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

شمسہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا ان کی تیوریوں پر بل آگئے۔ جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہی ہوں — "یہ کیا مذاق ہے — کیسا بیٹا — کہاں کا بیٹا!" — سینے میں ایک ماں کا دل رکھتی تھیں۔ اس لیے منھ سے کچھ نہ کہا — "جانے اس غریب پر کیا گزری ہو —" یہ سوچ کر چپکی ہو رہیں۔ وسیم اپنی رفیقۂ حیات کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئے — مسکراتے ہوئے بولے:

"بس آج سے یہ ہمارا بیٹا ہے — کیوں عارف بیٹے ٹھیک ہے نا!" شفقت سے عارف کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے تائید چاہی۔ لڑکے نے ایک یاس کے عالم میں ان کی طرف دیکھا، اور نہ جانے کیا سوچ کر سر جھکا لیا۔ اب انہوں نے مزید عارف کا رہنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ شمسہ بیگم ایک بے کلی کے عالم میں پہلو بدل رہی تھیں۔ انھوں نے ملازم کو بلا کر عارف کو اس کے حوالے کیا اور کہا:

"لو یہ چابی۔ گاڑی میں کپڑوں کا ایک بنڈل رکھا ہے عارف بیٹے کو پہناؤ اور پھر اسے ہمارے پاس لاؤ۔ دیکھنا کوئی تکلیف نہ ہونے پائے بچے کو۔"

ملازم مؤدب سا ہو کر عارف کو لے کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلا آیا۔

آس پاس جو آل کلیئر کا ماحول پایا تو شمسہ بیگم فوراً بولیں "میں نے کہا کس کا بچہ ہے؟ کہاں سے لے آئے — کچھ تو کہئے مجھے تو اختلاج ہونے لگا ہے!"

وسیم صاحب مسکراتے ہوئے بولے: "ہاں! — بعض اوقات عورتوں کو کچھ نہیں سوجھتا ہے تو اختلاج ہونے لگتا ہے۔"

"آپ تو بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ میں تو اس لڑکے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

اپنے سابقہ رویے پر خجل ہو کر شمسہ بیگم دھیرے سے بولیں۔

"قصہ دراصل یہ ہے بیگم کہ ـــــ" لمحہ بھر پہلے کی شگفتگی ایک آن دیکھے دکھ کی پرچھائیوں میں چھپ چکی تھی۔ لگتا تھا وہ کوئی بہت ہی دل دوز انکشاف کرنے والے ہوں۔

"بیگم یہ وہی بچہ ہے جو میرے دوست محمود اور ان کی بیگم کے انتقال کے بعد اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہے۔"

"اوہ! ـــ کیسا بد نصیب بچہ ہے ـــ اتنی سی عمر میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا۔" شمسہ بیگم نے تاسف سے کہا۔

"ہاں ـ شاید ـ کیونکہ کار کے حادثے کے وقت یہ تینوں گاڑی میں تھے۔ والدین تو جائے حادثے پر ہی فوت ہو گئے خدا کی قدرت کہ اسے صرف معمولی خراشیں آئیں۔ لیکن ذہنی صدمہ کی وجہ سے اسے ایک ماہ تک اسپتال میں رکھا گیا ـــ یوں تو اس کے کئی رشتہ دار بھی ہیں۔ لیکن ان کے اپنے ہی کئی کئی بچے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے عزیز دوست کی واحد نشانی کو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ ہم بخوبی اس کی پرورش کر سکتے ہیں ـــ اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

وسیم احمد خاموش ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی رفتار تھم گئی ہو۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس خاموشی کو شمسہ بیگم نے توڑا:

"آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے اپنے ساتھ لے آئے میں ماں بن کر اس کی پرورش کروں گی۔" ان کی آواز میں ممتا کی گمبھیرتا اور عزم کی پختگی تھی۔

"خدا کا شکر ہے!" ـــ وسیم احمد نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ "میں دفتری کارروائی کے بعد اسے اسپتال سے لایا ہوں۔ اگر کسی رشتہ دار کو ملنا ہو گا تو وہ خود یہاں آجائے گا لیکن عارف ان کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" انہوں نے بیگم کو مزید تفصیل سے آگاہ کیا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔" شمسہ بیگم مطمئن انداز میں گویا ہوئیں ـــ اور وسیم احمد مطمئن ہو کر نسرین کو اسکول سے چل دیئے۔ تاکہ اسے جلد سے جلد عارف سے متعارف کرا جائے۔

عارف سے شروع شروع میں نسرین خاصی کھنچی کھنچی سی رہی۔ کیونکہ اس کے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا بچہ ہی نہ وہ اس اکیلے پن کی عادی ہو چکی تھی لیکن رفتہ رفتہ ان پہلا سا کھنچاؤ نہ رہا۔

اب اسکول سے واپس پر وہ دونوں گھنٹوں کھیلتے کبھی کبھی ان میں جھڑپ بھی ہو جاتی۔ کیونکہ نسرین جیتنے لیے اکثر بے ایمانیاں کیا کرتی۔ عارف اس عادت سے کرتا۔ لیکن چوری پکڑی جاتی تو وہ رونے بیٹھ جاتی ـــ بچوں کو یوں آپس میں جھگڑتے دیکھ کر وسیم احمد کو ایک مسرت کا احساس ہوتا۔ انہیں محسوس ہوتا۔ اس طرح نے اجنبیت کی دیوار کو ڈھا دیا ہے جو ان کے درمیان حا

عارف کو پہلے اسکول سے اٹھوا کر نسرین کے ا میں داخل کرا دیا گیا۔ اگرچہ عارف، نسرین سے تین کلا آگے تھا لیکن اسکول کے بعد دونوں ایک ساتھ کر اسکول کا کام کرتے۔ ایک ساتھ کھیلتے ـــ صلح جو عارف خود سے تو کوئی گڑبڑ نہیں کرتا ـــ ہاں جب گڑیاں کھیلنے کو کہتی تو فوراً شرط رکھ دیتا کہ اس کے کھیلو گی تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں کھیلوں گا ـــ نسرین کو وعدہ کرنا پڑتا ـــ یوں بھی اب اسے گڑ کے ساتھ کھیلنا کچھ زیادہ نہ بھاتا۔ پہلے گھر میں اور تھا اس لیے ان کے ساتھ کو غنیمت جانتی۔ لیکن عارف کے بغیر کھیل میں لطف ہی نہ آتا تھا ـــ منظر کچھ یوں ہوتا کہ نسرین گڑیا کو تیار کر رہی ہے اس کے ڈوپٹے میں ستارے لگا رہا ہے ـــ بیٹ لانے جا رہا ہے تو نسرین دکشیں لگا رہی۔

نسرین کو یوں مگن دیکھ کر شمسہ بیگم کا ڈھیر بڑھ جاتا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بچہ بن جاتیں۔ کوئی اجنبی عارف کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا

یہ اس گھر کا فرد نہیں۔ جتنی توجہ نسرین کی پرورش پر دی جا رہی تھی اتنا ہی عارف کا خیال رکھا جاتا۔ بلکہ وسیم احمد اس کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے۔ اس کی ہر خواہش بلا کبھی پوری کرنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن بارہا کہنے پر بھی کبھی کسی چیز کی خواہش نہ کرتا۔ نہ جانے یہ احساس محرومی تھا یا اور کوئی احساس ——

غرض ایسے ہی لیل و نہار میں وقت تیزی سے گزرتا رہا

تیزی سے گزرتے لمحے اپنے ساتھ بہت سی یادگاریں لے چلے۔ جیسے تیز رفتار دریا اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ تو دوسری طرف اپنے ساتھ لائی ہوئی مٹی اور ریت سے نئے نئے ٹیلے بنا جاتا ہے۔ جو اکثر سیلاب کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس بہاؤ کے سامنے آنے والی بستیاں بھی اس تیزی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مکان ڈھے جاتے ہیں مکین بہہ جاتے ہیں۔ پھر اس تباہی کے صرف نشانات ہی باقی رہتے ہیں۔ لیکن —— تازہ دم لوگ مضبوط عزم کے ساتھ نئے گھروندے بنا لیتے ہیں —— لیکن گزرتے وقت کی دھول کچھ اس طرح اڑکر ان کی آنکھوں پر چھا جاتی ہے کہ وہ خود اپنے بنائے گھروندے بھی نہیں پہچان پاتے۔ یہ ہر جائی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اکیلے ہی ریت کے گھروندے بناتے ہیں اور تنہا ہی ان لمحاتی مسرتوں سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ کیف آور لمحہ بھی غیر محسوس طور پر بیت جاتا ہے اور وہ حقیقت کی پتھریلی نوکیلی چٹانوں پر ننگے پاؤں اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں تب وحشت زدہ ہوکر ان آس کے گھروندوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں پر احساس ممنونیت غالب آجاتا ہے یا احسان کا بوجھ گردن پر یوں آپڑتا ہے کہ اٹھائے نہیں بنتا —— پھر کسی طرف سے نمک حلالی کا فلسفہ بھی ذہن میں رینگ جاتا ہے —— اس سیلاب میں سارے جذبے بہہ جاتے ہیں۔ چاہت، خواہش، اظہار تمنا۔ سب کچھ۔!

عارف کا شمار ایسے ہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جو اپنی آرزوؤں پر پہرے بٹھاتے ہیں۔ اور یوں ساحلِ مراد پر ہونے کے باوجود تشنہ کام رہتے ہیں۔

بچپن کی بے ساختگی رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ شگفتہ متانت نے لے لی تھی۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی گہرا ہوتا گیا کہ میری کسی بھی حرکت سے ڈیڈی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ بچپن سے اب تک اولاد کی طرح پرورش کی پڑھایا لکھایا اس پر اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم کہ ہر طرح سے مجھے خود مختار بھی رہنے دیا۔ اتنے ڈھیر سارے احسانات کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔ ایک ہی صورت ہے کہ اپنا محاسبہ کرتے رہنا اور اپنے آپ کو ان کی ہر خدمت کے لیے تیار رکھنا ان کی اعلیٰ ظرفی تھا تو یہ عالم کہ اپنی نیکیوں کے جواب میں کبھی کچھ طلب نہ کیا۔

اپنے اطراف سے بیگانہ عارف اس بات سے بے خبر تھا کہ بڑی دیر سے کوئی اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے اور اس محویت کا احترام اس قدر کہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش بھی نہ کی گئی۔ جب کہ عام دستور تو یہ ہے کہ جہاں آپ نے توجہ نہ دی دانستہ یا نادانستہ وہیں اس شخص نے اپنے آپ کو منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ایک دوسرے کے احساس کا اتنا پاس کہ اپنی موجودگی کا احساس دلانا بھی چھوٹی بات لگے —— جیسے دونوں اس مقام پر ہوں جہاں الفاظ اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی موجودگی ہی سکون کا باعث ہوتی ہے۔

"نسرین —— عارف بیٹے تم لوگ کہاں ہو؟ —— آج چائے نہیں پینی ہے کیا۔؟"

دور سے آتی شمسہ بیگم کی آواز نے دونوں کو ایک دم چونکا دیا۔

"ہیں —— امی بلا رہی ہیں!" دونوں کی زبان سے نکلا۔ جیسے ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہوں —— واقعی جو میں نے سنا اس میں حقیقت ہے۔ پھر ایک دوسرے پر

فیاضانہ نظریں ڈالتے ہوئے مسکرا دیئے جیسے کہہ رہے ہوں اتنی بے خبری اچھی نہیں۔!

شمسہ بیگم نے جو انھیں یوں مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار انھوں نے نظر دل ہی نظروں میں بلائیں لے ڈالیں۔ "اللہ جوڑی سلامت رکھے!"
ان کے دل کی گہرائیوں سے ایک صدا ابھری۔

دونوں نے خاموشی سے اپنی اپنی مخصوص کرسیاں سنبھال لیں

"بڑے خاموش ہو عارف بیٹے! کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں امی بس۔" عارف نے کہا اور اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے نسرین بول اٹھی۔

"خاموشی کا دورہ پڑا ہے آج پھر شاید ان کو"

"کیا الٹے سیدھے کلمات نکالتی رہتی ہو۔ پتہ نہیں کون سا وقت قبولیت کا ہو۔ اللہ بری گھڑی سے بچائے۔" شمسہ بیگم نے سرزنش کی۔

"نہیں۔ نہیں امی اسے نہ ڈانٹیں۔ وہ تو میں بس یوں ہی۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔ آپ فکر نہ کریں" عارف نے بے اختیار کہا۔

شمسہ بیگم اس بے ساختگی پر مسکرا دیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں تم اسے ڈانٹ سے بچانا چاہتے ہو۔

"بیٹے! اس عمر میں اتنی سنجیدگی اچھی نہیں۔ تمھاری عمر کے لڑکے تو کڑکڑ لگایا کرتے ہیں۔ محال ہے جو کسی وقت سنجیدہ ہوتے ہوں۔ تم جمال کی ہی مثال لے لو۔ بس بلا کا شوخ ہے۔"

جمال۔ عارف کا چچا زاد بھائی تھا۔ جب وسیم احمد اسے لے آئے تھے تو ان لوگوں نے ... بڑے آدمی ہیں، غلام کی طرح پالنے کو لے جا رہے ہیں۔ ایک دن سارے ... [illegible] ... کی زندگی گزارنے لگے گا۔

کئی سال بیت گئے ... [illegible] ... آکر بچا سکتا تک نہیں۔ ... [illegible]

ہی طرح طرح سے ڈرا دیئے جاتے۔۔۔ لیکن اس پر ان باتوں کا الٹا ہی اثر ہوتا۔ وہ نئے گھر سے اپنا رشتہ مضبوط تر کیے جاتا۔ پھر وہ دن بھی آگیا کہ بدخواہوں نے دیکھا کہ نسرین اور عارف میں کوئی فرق نہ رہا۔ بلکہ عارف تو اچھے اچھے گھرانوں کے لڑکوں سے ہزار درجے بہتر نکلا جن کے ماں باپ سر پر موجود تھے۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ پڑھنے کے بہانے بس اسٹاپوں پر فلمی ہیروز کا سا حلیہ بنائے سارا سارا دن بسیرا کیے رہتے ہیں اور رات رات بھر سڑکوں پر آوارہ پھرا کرتے ہیں۔

سب نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وسیم صاحب نے اسے اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم دلوائی اور اب کی تعلیم ختم ہونے والی تھی۔ اور اس بات کی اطلاع بھی سب کو تھی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد عارف ہی وسیم احمد کا سارا کاروبار سنبھالنے والا ہے۔۔۔ اتنی ہنگامہ خیز خبروں کے بعد ضروری تھا کہ اس کے سابقہ رشتہ داروں کو اس سے اپنے رشتوں کی تجدید کرانا پڑتی۔

عارف کی موجودہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے طرح طرح کے لالچ ان کے دلوں میں پیدا ہونے لگے۔ عارف انھیں سونے کی چڑیا نظر آتا۔ ان خاندان کے لڑکے بھی اس کی دوستی پر فخر کرنے لگے۔ اس چکر میں جمال اکثر وسیم صاحب میں نظر آیا کرتا۔ کئی ایک لڑکے تو عارف کے سرد رویے کی وجہ سے خاموش ہو بیٹھے۔ لیکن ثابت قدم رہنے والوں میں جمال بھی شامل تھا۔

عارف کے والد صرف دو بھائی تھے۔ ننھیال کافی بڑا تھا۔ لیکن سگی خالہ صرف ایک تھیں جو بیوہ تھیں۔ اس دن وہ بلک بلک کر روئی تھیں جب وسیم احمد ان کے بھانجے کو اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا اپنی بہن کی واحد نشانی کو وہ خود پالیں۔ لیکن وہ جذبات سے ہٹ کر سوچنے کی عادی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عارف بھی ... مستقبل کا شکار ہو جائے۔ اور یوں ملک میں ایک اور ... ہوئے بچے کا اضافہ ہو۔ وہ خود اپنے گھر کی گاڑی ... گھسیٹ رہی تھیں۔ جب کہ وسیم احمد سے

وابستہ ہو کر عارف کو ایک درخشاں مستقبل کی نوید مل رہی تھی۔ تو وہ کیوں اسے اپنے ساتھ رکھنے پر بضد ہوتیں۔ دل کی غنی تھیں۔ دعائیں ہی دے ڈالیں۔ عارف کے "تسیم ولا" جانے کے بعد کتنی باران کا جی چاہا کہ وہ اسے دیکھ آئیں لیکن دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ گئیں کہ مبادا کل کلاں کو کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ نسیمہ خاتون کسی لالچ سے وہاں جاتی ہیں

کبھی کبھار جب عارف ان کے یہاں چلا جایا کرتا تو وہ نہال ہو جاتیں۔ بھینچ بھینچ کر گلے لگاتیں۔ پھر وہ وقت آیا جب عارف نے خالہ بی کو پیسہ پیسہ جوڑ کر سعدیہ کا جہیز بناتے دیکھا۔ ایک دن کسی کو آس پاس نہ پاکر خالہ بی بولیں

"بیٹے! سعدیہ کی منگنی تو بچپن ہی میں جمال سے ہوگئی تھی۔ اب ماشاء اللہ جمال نوکر ہوگیا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے؟ وہاں سے کوئی جلدی ہی نہیں ہوتی ــــ میں نے تو پوری تیاری کرلی ہے۔ ایک بیوہ ماں اپنی بیٹی کو جو کچھ دے سکتی ہے اتنا ہی دوں گی ــــ جو آج دے سکتی ہوں وہی کل دوں گی اس لیے جلدی کوئی سلسلہ ہو جائے تو میرا بھی بوجھ ہلکا ہو۔"

"واہ ــــ واہ خالہ بی ــــ یہ بات تو مجھے معلوم ہی نہ تھی ــــ اور اس جمال کے بچے نے بھی کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"اچھا!" ــــ خالہ بی کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری ــــ "شرماتا ہوگا ــــ بڑا شریر ہے۔" وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں بولیں۔

اس روز واپسی پر جب عارف گھر آیا تو اسکی آنکھوں کے سامنے خوبصورت رنگوں کی دھنک بکھر رہی تھی۔ سعدیہ کا شرمایا شرمایا چہرہ نسرین کے چہرے میں ڈھل گیا ــــ اس کا سراپا نظروں میں ڈول گیا ــــ اس کے سراپا پر نظریں جمائے وہ سوچنے لگا ــــ میرے بغیر اسے چین کہاں؟ ــــ لیکن وہ تو اس سے بھی بے خبر ہے کہ میرا کوئی لمحہ اس کے تصور سے خالی نہیں!۔

خالہ بی کی آج کی گفتگو نے سوئے سوئے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ پرانے خاکوں میں رنگ آمیزی کی تھی ــــ نسرین کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کھل کر دیا تھا۔ اور اس نے خاموشی سے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا ــــ لیکن سوچ نگر میں نسرین کا ہاتھ تھامے دور تک نکل آیا۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم چلا آرہا تھا کہ نسرین کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"فلاسفر صاحب! ــــ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں" اسے بیرونی گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر نسرین نے نعرہ بلند کیا۔

"آپ کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔" وہ شگفتگی سے بولا۔

"خوب خوب! آج تو بہت موڈ میں ہیں۔ کیا پالیا ہے جناب نے"

"بہت کچھ ــــ بس اب تمھاری خیر نہیں۔" ــــ وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہئیں ــــ ہئیں آپ ہوش میں تو ہیں عارف صاحب؟" وہ مسخرے پن سے بولی۔

"بندہ خیریت سے ہے اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے ــــ دیگر احوال یہ ہے کہ میں آج ڈیڈی سے کہوں گا کہ بس اب جلدی سے نسرین ....." وہ کہتے کہتے کہیں کھو گیا۔

نسرین کا دل دھک سے رہ گیا۔ نہ جانے آج یہ کیا کہہ جائے ــــ بہتر ہے زبان سے کچھ نہ کہے ــــ اف توبہ! کبھی کبھی تو اس کی گہری سیاہ آنکھیں مقابل کو ڈبو دینے پر تیار ہو جاتی ہیں ــــ کبھی یہی آنکھیں مجسم الفاظ بن جاتی ہیں جیسے اس وقت ــــ لیکن یہ تو کبھی زبان سے ادا کرنے کا عادی نہیں ــــ بس چپ چاپ اپنے تک محدود رہتا ہے آج۔ آج کیسے یوں بے دھڑک اظہارِ تمنا پر مائل ہے۔

نسرین تو نظریں نیچی کیے جانے کس انکشاف کو سہارنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی ــــ دوسری طرف ایک تند و تیز لہر آکر گزر چکی تھی۔ ضبط اور پاس وفاداری کے بند جو باندھ دیئے تھے وہ دوبارہ اپنے حصار میں لوٹ گیا تھا۔

یہ بھاری لمحے بھی دھیرے سے سرک گئے۔ وہ چونک گیا۔

"ہٹیں۔ یہ کیا حماقت سرزد ہوئی جا رہی تھی مجھ سے ——

یہ زیب دیتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ممی ڈیڈی کا یہی خیال ہے کہ ان کی بیٹی شادی کے بعد بھی ان کے ساتھ رہے اور ظاہر ہے کس کے ساتھ۔ لیکن مجھے آخری لمحات تک اپنی طرف سے کوئی اظہار نہیں کرنا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ میری حاصلِ تمنا ہے۔ لیکن ——

یہ لمحہ جو بیتا اپنے ساتھ اس تند و تیز لہر کو بھی بہالے گیا جس نے ان دونوں کو بے خود سا کر رکھا تھا

اور پھر عارف نے پہل کی۔

"اے محترمہ کیا سر جھکائے کھڑی ہو جیسے ہمارے حضور کسی جرم کا اقرار کر رہی ہو۔"

نسرین نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور وہی برسوں کا جامد سکوت طاری تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔ جیسے کہہ رہی ہو "تم کبھی نہ کہہ سکو گے ——

اس کے دل نے صدا دی۔ نجانے اتنی غیرت کیوں؟

اس کی آنکھیں جھینگ سی گئیں اور وہ تیزی سے گھوم کر آگے بڑھ گئی۔

"بنا کر جایا کریں —— خواہ مخواہ میں نے ابھی تک چائے نہیں پی۔ ممی ڈیڈی تو چائے پی کر باہر چلے گئے ہیں۔"

"اوہ —— تو چلو پھر ہم لوگ بھی پی لیتے ہیں"—— اتنا کون سا ضروری ہے چائے پینا۔ تم نے پی لی ہوتی —— وہ یوں تیز تیز اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وسیم احمد کمر پہ ہاتھ باندھے بے چینی کے عالم میں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے اور پھر لوٹ آتے۔ چہرے پہ کشمکش کے تاثر تھے۔ دل کا کرب آنکھوں سے عیاں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر زبردست توڑ پھوڑ ہو رہی ہو۔

شمسہ بیگم نے وسیم احمد کو یوں پریشان پریشان دیکھا تو وہ خود بھی پریشان ہو اٹھیں۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں طرح طرح کے پریشان خیالات کا ہجوم ہوگیا۔

"نصیب دشمناں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے!"

وہ گھبراتے ہوئے بولیں۔

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لیکن۔ لیکن آپ اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ مجھ سے کہئے شاید میں آپ کے کام آسکوں

"ہاں۔ تم ہی میرے کام آسکتی ہو۔" انہوں نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر کہہ ڈالیے" وہ بے تابی سے بولیں۔

"آج میں نسیمہ خاتون کی طرف چلا گیا تھا۔ سوچا ذرا ان کی خیریت معلوم کرلوں۔ لیکن ——"

"لیکن کیا —— کیا نسیمہ خاتون کچھ بیمار ہیں۔ اللہ خیر کرے، ان کے بچوں پر ان کا سایہ سلامت رکھے۔" شمسہ بیگم اس نیک سیرت خاتون کے لیے دعاگو ہوگئیں۔

"یوں تو وہ خیریت سے ہیں لیکن لگتا ہے یہ صدمہ سہار نہ سکیں گی۔ گھر کا ماحول یوں اداس اداس سا —— جیسے خدانخواستہ کوئی موت واقع ہوگئی ہو ——" وہ یوں آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے بہت تکلیف سے اپنی بات مکمل کرنا چاہ رہے ہوں۔

"ٹھیک، ٹھیک بتائیے۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں مجھے تو اختلاج ہونے لگا ہے۔

وسیم احمد ٹہلتے ٹہلتے صوفے کے کنارے پر ٹک گئے اور پیشانی پر ہاتھ ملتے ہوئے گویا ہوئے

"یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ نسیمہ خاتون کی بڑی بیٹی رخسانہ کی منگنی جمال سے ہوچکی تھی۔"

"ہاں۔ ہاں مجھے اچھی طرح علم ہے۔"

"لیکن افسوس جب شادی کا وقت آیا تو جمال کی صاحب نے قطعی انکار کر دیا۔ اور اتنی پرانی منگنی توڑ ڈالی۔

"ہائے غضب خدا کا! —— ایسی کیا مار پڑی تھی لوگوں پر —— بظاہر تو ایسے ہلکے لوگ نہیں لگتے۔!"

"لوگوں کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ جب تک

اچھی نوکری نہیں ملی تھی، سعدیہ کے سلیقے پر ریجھے ہوئے تھے اور اب جب کہ ان کے بیٹے کی مارکیٹ ویلو بڑھ گئی تو انھوں نے ایک بیوہ کی بیٹی کو بیاہنے سے انکار کر دیا، تاکہ کوئی دوسری لڑکی اپنے ساتھ لاتے ہوئے جہیز سے ان کا گھر بھر دے۔ ایک بیوہ اپنی بیٹی کو ان کی منشا کے مطابق جہیز نہیں دے سکتی ہے۔ اب تم خود اندازہ لگا سکتی ہو نسیمہ خاتون کی حالت کا ــــ ایک تو بیوگی اوپر سے یہ تازہ زخم کہ بیٹی کا اتنا پرانا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور وجہ بھی کیا؟ صرف ان کی غربت۔ لیکن اب وہ یہ بات کس کس کو سمجھائیں ــــ اس صدمہ سے تو ان کی کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔ اور اس پر لوگ جینے نہیں دیتے ہر آیا گیا پرسہ دینے کے انداز میں یہی پوچھتا ہے کیوں کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ــ اور پھر کچھ لوگ [illegible] باہر اگر لڑکی کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گھڑ [illegible] ــــ اس طرح سعدیہ کے کسی اور جگہ شادی کے امکانات بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھ سے اس نیک سیرت خاتون کی حالت نہیں دیکھی جاتی ــــ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا شمسہ ورنہ وہ بے موت مر جائے گی۔"

"اللہ انہیں حوصلہ دے۔ میں کل عارف کے ساتھ ان کے گھر جاؤں گی۔"

عارف ــــ عارف۔

عارف کے نام پر ذہن میں جیسے ایک کوندا سا لپکا اگر ــــ اگر عارف تیار ہو جائے تو ــــ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ذہن کے پردے پر نسرین [illegible] ہوئی محسوس ہوئی ــــ "ڈیڈی، عارف تو میرا حق ہے ــــ میں اس سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں بیٹے مجھے علم ہے۔ تم کیا چاہتی ہو۔ خود میری بھی یہی خواہش تھی لیکن ــ لیکن اب یہ ایک بیوہ ماں کی یتیم بچی کے مستقبل کا سوال ہے جان ــــ تمہیں یہ ایثار کرنا ہی ہوگا۔"

"نہیں ڈیڈی مجھ سے اتنا حوصلہ نہیں ــ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا"

عالم خیال میں وسیم احمد اپنی اکلوتی بیٹی سے مصروف گفتگو تھے جس کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو لیکن آج وہ اس کی سب سے بڑی خواہش سے دست بردار ہونے کی تلقین کر رہے تھے۔

چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ ذہنی کشمکش اور اندرونی کرب چہرے سے عیاں تھا۔

"آپ کیا سوچنے لگے۔" شمسہ بیگم حیرت سے گویا ہوئیں

"ہاں ــ ہاں ــ ہاں" وہ جیسے چونک سے گئے اور پھر ایک گہرا سانس لے کر انھوں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہوں۔

"میری ایک تجویز ہے ــــ میرا خیال ہے کہ تم اس سے اتفاق کرو گی ــــ نسیمہ کی سعدیہ کو تو اب ان حالات میں کوئی مناسب رشتہ نہیں ملے گا ــــ اور اس کے مقابلے میں اپنی نسرین کئی گنا خوش قسمت ہے۔ اسے ایک سے ایک اچھے رشتے مل جائیں گے۔ لیکن۔"

"اس وقت نسرین کا کیا ذکر۔" شمسہ بیگم الجھ کر رہ گئیں۔

"کیوں نہ جب تم نسیمہ خاتون کے گھر جاؤ تو ان سے کہہ دو کہ ہم عارف بیٹے سے ان کی سعدیہ کا رشتہ کرنے کو تیار ہیں۔" بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی بات پوری کی۔

شمسہ بیگم یوں اچھل پڑیں جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے کچھ سوچا بھی ہے۔" مارے غصے کے ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔

"تسلی رکھو شمسہ ــ تسلی سے ــ"

"کیا تسلی سے تسلی ہے۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ یہ میری بچی کی زندگی کا سوال ہے۔ عارف اور نسرین ایک دوسرے کے ہیں انھیں علیحدہ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ــــ ایسی ہی ہمدردی ہے تو ہم خود کوئی ڈھنگ کا رشتہ ڈھونڈھ دیں گے۔" اور وہ یوں اٹھ کھڑی ہوئیں جیسے یہ ان کا آخری فیصلہ ہو۔

"میری بات تو سنو شمسہ۔" انھوں نے بیوی کو زبردستی روکتے ہوئے کہا۔

"ٹھنڈے دل سے سوچو۔ یہ شادی تو آخر ایک دن ہونا ہے۔ مجھے بھی اس کے احساسات کا احترام ہے ــــ لیکن یہ سب وقتی باتیں ہیں ــــ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان باتوں کو بھول جائے گی ــــ مجھے اس کا یقین ہے۔"

"لیکن آپ نے عارف کی رضا کے بغیر کیسے فیصلہ کر لیا ــــ"

زندگی تو اسے گذارنی ہے نہ کہ آپ کو" غصہ کی شدت میں نسیمہ بیگم کے دماغ کے سارے خانوں نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

"اس بارے میں [illegible] سوچ لیا ہے میں نے ۔۔۔ میں جب اسے سمجھاؤں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا وہ میرا بیٹا ہے تمھاری بیٹی کی طرح جذباتی نہیں ۔۔۔" نسیمہ بیگم کا [illegible] کرنے کے لیے وسیم صاحب نے مسکراتے ہوئے بیگم پر چوٹ کی۔ اور اب انھیں خاموش ہو جانا پڑا۔ اس [illegible] حقیقت تھی۔

[illegible] دکھی دل سے وسیم [illegible] کے فیصلے [illegible] اور [illegible] سعادت مندی سے [illegible] کاروباری [illegible] اس سے کچھ طلب کیا [illegible] اور [illegible] وسیم [illegible] ایک [illegible] لڑکی کی خاطر اپنی بیٹی کے جذبات کو قربان کر دیا۔

نانی اماں نے اپنی بات ختم کر کے پان کا بیڑا [illegible] رکھا۔ [illegible] اس آواز نے ساتھ [illegible] ہم سب وسیم صاحب کی [illegible] ہوش آئے۔ اچانک وسیم صاحب سامنے سے گزرے [illegible] بے ساختہ میرے منہ سے نکلا:

"وہ دیکھئے نانی اماں۔ فرشتہ جا رہا ہے۔"

• کسی بھی بات کا جواب چاہتی ہوں تو جوابی کارڈ یا جواب کے لیے ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔

• مضمون بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں، ورنہ مضمون دیکھے بغیر ہی تلف کر دیا جائے گا۔

• [illegible] کوشش کر کے منی آرڈر سے روانہ فرمائیں [illegible] طرح آپ کو چھ روپیہ محصول وی۔ پی کی بچت ہوگی۔

ضمیر

• ان تمام شکوک اور شبہات کے درمیان جن کے بارے میں پچھلے چار ہزار سال سے، چار ہزار طریقوں سے ہم سوچتے چلے آرہے ہیں، ہمارے لیے سب سے بہتر طریقہ کار یہی ہے کہ ضمیر کی آواز کے برعکس کوئی بات یا کوئی کام نہ کریں۔ اگر اس راز کو ہم نے پالیا تو ہماری زندگی پُرمسرت رہے گی اور موت سے ہمیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ (والٹیر)

• خدا نے انسان کو شعور کی دولت بخشی ہے اور دل میں ضمیر کا چراغ روشن کیا ہے۔ اگر شعور کی رہنمائی اور ضمیر کی آواز سے کام نہ لیا جائے اور برے بھلے کی تمیز کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق باقی نہیں رہتا۔ (ڈارون)

• ضمیر انسان کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ وہ اسے سیدھے راستے کی رہنمائی کرے بلکہ وہ اسے یہ سمجھنے میں مدد دے کہ کیا چیز صحیح ہے اور کیا غلط؟ (جے مل)

• ضمیر ہمارے جسموں میں ایسی آواز ہے جو ہمیں وارننگ دیتی ہے [illegible] سمجھ کر قدم اٹھاؤ، کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (منکین)

• ضمیر کی آواز اندرونی [illegible] جو ان سن سکتے ہیں اور نہ [illegible] اس کے بغیر [illegible] گزر سکتی ہے۔ ([illegible])

• ایک سچی، ہمدرد، مخلص اور خاموش آواز! ([illegible] کنگ)

• انسان کے اندر خدا کی دھیمی لیکن واضح آواز! ([illegible])

• سونے اور چاندی کے سکے تمہاری آنکھوں میں چمک پیدا کر سکتے ہیں اور تمہارے منہ پر تالہ ڈال سکتے ہیں لیکن وہ ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتے! (جان ٹراولیر)

• کوئی تکیہ اتنا ملائم نہیں ہوتا جتنا صاف ضمیر!۔ (فرانسیسی کہاوت)

• حریم ہر ماہ [illegible] تاریخ تک [illegible] روانہ کر دیا جاتا ہے ایجنٹ ڈاک کی بدنظمی کے باعث غیر معمولی تاخیر سے ملتے ہیں اس لیے آپ [illegible] تاریخ تک انتظار کر کے بعد میں شکایت [illegible]

نجات

اسماء محمد

رابعہ نے اسپتال کے کمرے میں کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند داخل ہو کر قدم رکھا تو اس کی متوحش نظریں سامنے والے بستر پر جم گئیں، اس پلنگ پر شاہد کسی بے جان لاش کی مانند پڑا ہوا تھا۔ اسے خون دیا جا رہا تھا۔ جب ہی اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی زندگی میں ایک بھونچال سا آگیا ہے۔ اس کے پیروں تلے زمین سرکتی جا رہی ہے کانپ رہی ہے، خوف و دہشت کی سنسناہٹ بنکر اس کے سراپا میں دوڑ گئی، وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی، اس کا چہرہ فق تھا۔ وہ اپنے دل کی بگڑتی ہوئی حالت پر قابو نہیں پا سکتی تھی، صدمے سے اس کے ہونٹ ہی نہیں اس کا وجود بار بار کانپ رہا تھا۔ اس کے اعضاء کی ایک ایک نس میں لرزش تھی۔ وہ آگے بڑھ کر دیوار کا سہارا نہیں لیتی تو فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی، وہ جانتی تھی کہ اس کے بے ہوش ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

رابعہ کو بعد میں یہ سوچ کر کتنی حیرت ہوتی تھی کہ آج سہ پہر سے پہلے تک وہ کتنی خوش تھی۔ بلکہ مہینوں اور سالوں کے ایک ایک لمحے میں پر سکون اور مسرت بھری زندگی بیتی ہوئی تھی، زندگی کی پر سکون سطح پر خوشحالیوں سے بھری کشتی رواں دواں تھی کہ اچانک حالات کے کسی زور نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا خوش گوار زندگی پر وقت نے سیاہ چادر ڈال دی تھی، اسے گھر پر شاہد کے دفتر کے ایک ساتھی نے اطلاع دی تھی کہ دوپہر کے وقت شاہد کی طبیعت اچانک بگڑ گئی، اس نے خون کی الٹی کر دی تھی۔ لہٰذا اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ــــ

وہ کتنے ہی وسوسوں اور اندیشوں میں گھری ہوئی اسپتال پہنچی، اس کمرے کی جانب وحشیانہ انداز سے لپکی تھی، اسے اتنی [illegible] [illegible] کی فکر بھی نہیں رہی تھی، اس کے دونوں بچوں کو لئے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھیں، اسے اپنے سہاگ کا خیال تھا۔ [illegible] اور سینے میں پھڑپھڑاتے دل سے وہ اپنے شوہر کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

بارگاہ الٰہی میں اس کی دعا نے قبولیت حاصل کر لی تھی۔ شاہد موت کے چنگل سے نکل کر اور صحت یاب ہو کے گھر آگیا لیکن ڈاکٹر نے اسے چھ ماہ تک مکمل طور پر ذہنی اور جسمانی آرام کرنے کا مشورہ اور ہدایات دی تھی شاہد کی بوڑھی ماں اور کنواری بہن بھی خوش تھیں کہ بیٹے اور بھائی نے دوبارہ زندگی پائی ہے۔ ان سے کہیں زیادہ رابعہ اپنے شوہر کی صحت یابی سے خوش تھی کہ اس کا سہاگ سلامت رہ گیا لیکن دوسری جانب وہ فکر مند تھی کہ گھر کے اخراجات کیسے چل سکیں گے۔ کمپنی آخر کب تک شاہد کے علاج کے اخراجات برداشت کرتی رہے گی، ایک مہینے یا دو مہینے بعد اس کی چھٹی کر دی جائے گی۔

شاہد کی دس سال کی خدمات تھیں۔ انسانی بنیادوں پر رابعہ کو شاہد کی ملازمت مل گئی، وہ شاہد سے زیادہ ہی پڑھی لکھی تھی۔ شاہد اسے گھر میں دفتری امور اور اس کے کام کی نوعیت کے بارے میں سمجھاتا، رابعہ نے توقع سے کہیں زیادہ اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے ادا کرنا شروع کر دیں، کمپنی بھی مطمئن اور خوش ہو گئی بڑی آسانی سے ایک خلا پر ہو گیا تھا۔

لیکن رابعہ اندر سے خوش نہیں تھی وہ ٹوٹ کر بکھر سی گئی تھی۔ اسے گھر کی چہار دیواری پسند تھی، وہ اپنے بچوں کی تربیت، ساس، شوہر اور نند کے ساتھ رہ کر اپنے جذبوں کو سیراب کرتی رہتی تھی، لیکن دفتر میں اسے یہ احساس رہتا کہ یہاں ایک عورت کو تحفظ حاصل نہیں ہے کتنی ہی نگاہیں اس کے سراپا پر چپک کر رہ جاتیں، جیسے ہزاروں ہزاروں آنکھیں اس کے جسم پر ابھر آئی ہوں، وہ ہر مرد کو دیکھتی تھی ان مردوں کی نگاہیں اس کے سراپا کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں گدھ بن کر جیسے نوچنے لگتی تھیں۔

رابعہ نے ایک رات دفتر کے ماحول پر بڑی سنجیدگی سے سوچا۔ وہ دفتر کی اور لڑکیوں اور عورتوں سے قدرے مختلف تھی، اس نے اپنے آپ کو دفتر کے ماحول میں کسی حد تک مدغم کر لیا تھا لیکن دفتر سے باہر دفتر کے لوگوں سے ملتے ہوئے کتراتی تھی۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنا ان لوگوں کے ساتھ ہوٹلوں میں جا کر چائے پینا، کسی کی کار یا اسکوٹر کی لفٹ لینا، اس نے بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جب کہ دفتر کی لڑکیاں اور [illegible] سے اکثر وحشیانہ سرگوشیاں کرتی تھیں ـــــــ ایسے مردوں کی جیب خالی کرنا تو عبادت کا ثواب ہے۔

وہ کسی ایسے تو انا صحت مند کبھی نہیں تھی، شاہد اس سے بے پناہ محبت کرنے والا شوہر ہی نہیں بلکہ ایک مرد تھا۔ اسے اسا اوقات شاہد کے لہجے کے طنز پر حیرت ہوتی تھی، ایک مشرقی عورت، بیوی بنکر باوفا ہوتی ہے اس کا شوہر مجازی خدا ہوتا ہے، وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد کو دل میں جگہ نہیں دے سکتی ہے۔ پھر بھی جب اس کی زبان پر دفتر کے کسی مرد کا تذکرہ بار بار آتا تھا تو شاہد چونک سا جاتا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے اس کی جانب جیسے گھورنے لگتا تھا۔ جب وہ بس کی یا دفتر میں کام کی زیادتی کے باعث تاخیر سے گھر پہنچتی تو شاہد کی تیز و تند نگاہیں اس کے سراپا کو شاک بھرے انداز سے ٹٹولتی تھیں۔ اس کی نس نس میں دکھ کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ سوچتی کہ مرد اور عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اس کا شوہر کتنا گھٹیا آدمی ہے۔ جو اپنی بیوی کے ایثار کا ذرا سا بھی احساس نہیں کرتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ عورت ہوکر اتنی شکی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

چھ ماہ گزر گئے، شاہد پہلے سے کہیں صحت مند سرخ و سپید اور توانا دکھائی دینے لگا۔ وہ جیسے کسی بلند مقام پر چھٹیاں گزار رہا تھا۔ اسے گھر پر سارا دن رہنا، اچھے سے اچھا کھانا، صبح دیر تک اٹھنا، جیسے ریٹائرمنٹ مل گئی ہو اخبار اور رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا۔ سرِشام اس کے چند ایک دوست جو محلے میں رہتے تھے، وہ گپ شپ اور شطرنج کے لئے آجایا کرتے تھے، بے فکری نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ جوان اور پرکشش بنا دیا تھا۔

آج رابعہ دفتر سے اٹھی تو بے حد خوش تھی۔ گھر پر اس کی نوجوان نند اس کے دونوں بچوں کے ساتھ ٹیلی ویژن کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ شاہد ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کرانے گیا ہوا تھا، وہ ڈاکٹر سے رپورٹ لے کر آئے گا۔ رابعہ نے ... پڑھ کر ... ہوئے سوچا ... کل سے دفتر جاکر وہ اپنی ذمے داریاں سنبھالنے لگا، اسے دفتر کے گھٹتے ہوئے ماحول سے نجات مل جائے گی، آخر وہ ایک عورت ہے، اس کا تحفظ اس کی عزت، عظمت اور گھر میں ایک کنبہ کی نگہداشت میں ہے، وہ گھر کی مالکن کر وقار اور دبدبے سے رہ سکتی ہے۔

شام کو شاہد واپس آیا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ تھی۔ رابعہ کو دیکھتے ہی رنگ معدوم سی ہوگئی، رابعہ نے اس کے ہاتھ سے رپورٹ کا لفافہ لیتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"تم خود ہی پڑھ لو!"

"لیکن، میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں!" رابعہ نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"اس نے مزید تین ماہ آرام کرنے کے لئے کہا ہے!"

"کیا؟" "رابعہ!" شاہد نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا ـــــ میں نے ڈاکٹر سے کہا بھی کہ ـــــ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر صحت مند محسوس کرتا ہوں۔ میں کل سے دفتر جوائن کرنے جا رہا ہوں۔ یہ سن کر ڈاکٹر کو طیش آگیا، اس نے تلخ لہجے میں صاف صاف کہہ دیا کہ ـــ پھر میں آپ کی موت کا ذمے دار نہیں ہوں!"

رابعہ نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا ـــ "شاہد" اس نے عجیب سی تھرتھرائی آواز میں کہا ـــ صرف تین ماہ کی بات ہے یہ دن بھی پلک جھپکتے گزر جائیں گے، مجھے دنیا میں تم سے عزیز کوئی اور نہیں ہے۔"

"مگر رابعہ!"

رابعہ جبر و زیادتی سے ہنس پڑی ـــــ اگر مگر کچھ نہیں!"

وہ رات رابعہ پر بڑی بھاری رہی، بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی، اس کا شوہر گہری نیند میں ڈوبا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ دفتر کا ماحول، مصروفیت، مردوں کی بے تکلفی، بچوں کی تعلیم و تربیت، جو امر ... اس اور ... کے بس کی بات نہیں رہی تھی، یہ سب مل کر اسے ڈسے جا رہے تھے۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی، اسے کھلونا سے کشتی ذہنا ... ہو۔

تین ماہ اور گزر گئے، رابعہ نے تنخواہ ملنے پر بازار سے چائے کا ایک خوبصورت سیٹ خریدا۔ شاہد کے دوست جو سرِشام آجاتے تھے۔ وہ ایک ہی ڈیزائن کے کپ میں چائے پی پی کر شاہد کا مذاق اڑاتے تھے ... کوئی نئے ڈیزائن کا چائے کا سیٹ خریدنے کا سوچ رہی تھی۔ آج ... خرید لیا، اسے واپسی میں دیر ہوگئی، جب وہ بس سے اتر کر گھر کی طرف ... رہی تھی، اسے خیال آیا کہ ـــ ساس اور نند بچوں

لے کر پڑوس میں میلاد میں چلی گئی ہوں گی، وہ رات کا کھانا کھا کر لوٹیں
ے، البتہ شوہر گھر میں اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف
ہوگا۔ انھیں چائے بنا کر دینے والا کوئی نہیں ہے۔

اس نے گھر کی جانب تیزی سے قدم بڑھایا، ایک خیال ذہن میں
ہرا کر اسے شگفتہ کر گیا ــــــ کل شاہد ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا چیک اپ
کرا کے رپورٹ لے آئے گا۔ ــــــ پرسوں دن سے اسے دفتر سے نجات
مل جائے گی۔ اس کی نجات کے لئے صرف ایک ہی دن تو رہ گیا ہے۔

اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھلا ہوا دیکھا، اس نے آہستگی
سے اندر قدم رکھا، اس کا شوہر ملاقات کمرے میں بیٹھا اپنے دوست
سے باتیں کر رہا تھا ــــــ اس وقت ایک ہی دوست کمرے میں
موجود تھا۔ وہ شاہد سے پوچھ رہا تھا ــــــ

کل تم ڈاکٹر کے ہاں سے چیک اپ کرا کے رپورٹ لے آؤ گے نا؟۔
اور پھر پرسوں دن سے اپنی سروس دوبارہ جوائن کر کے بھا بھی
کو چھٹی دلا دو گے ـ ـ ـ ـ ـ ؟"

"نہیں یار!" شاہد نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا ــــ میں
نے دس گیارہ سال دفتر میں جھک ماری ہے، کیا دو سال تک آرام کرنے
کا حق نہیں رکھتا ــــ" بیوی کو بھی تو معلوم ہو کہ نوکری کیا ہوتی ہے!"

"لیکن ڈاکٹر کی رپورٹ ــــ ؟"

"ڈاکٹر سے کون چیک اپ کراتا ہے!" شاہد ہنسا ڈاکٹر کے ٹائپسٹ
کو دس کا نوٹ دو تو وہ کسی دوسرے مریض کی رپورٹ میرے نام سے ٹائپ
کر کے اور اپنے دستخط کر کے دے دیتا ہے۔ میری بیوی وہاں جا کر تصدیق
کرنے سے رہی۔ کیوں ٹھیک ہے ؟"

ان دونوں کے بے ہنگم قہقہے فضا میں بلند ہو کر اس کے کانوں میں گرم
گرم سیسہ انڈیلنے لگے۔

ــــــــــــ

• حریم ۲۰ ر تاریخ تک قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے لیکن
ڈاک کی بدنظمی کے باعث پرچے غیر معمولی تاخیر سے ملنے
لگے۔ آپ ۲۵ ر تاریخ تک انتظار کرنے کے بعد ہی شکایت لکھیں۔
جنوبی ہند کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں حریم بہت تاخیر کے
ساتھ پہنچتا ہے۔ اکثر بہنیں ۲۰ کے بعد شکایت لکھتی ہیں۔ دوسرا پرچہ بھیج
دیا جاتا ہے۔ بعد میں اطلاع آتی ہے کہ پہلے والا بھی مل گیا، اس لئے
بہتر ہو کہ ۲۵ کے بعد شکایت لکھی جائے۔

لطیفے

• "مجھے آپ سے ہمدردی ہے"
"ہمدردی ــــ کس بات کی ہمدردی ہے ؟"
"میری بیوی نے آج ایک سو روپے کی ساڑی خریدی ہے اور
وہ اسے پہن کر کل تمہاری بیوی سے ملنے تمہارے گھر جانے والی ہے"

• خاتون :۔ (استاد سے) مجھے بیگم عابدہ کہتے ہیں۔ میرا [illegible]
کہاں ہے۔ کلاس میں نظر نہیں آرہا ہے ؟"
استاد :۔ معاف کیجئے وہ آپ کے جنازے میں شرکت کے لئے گیا ہے!!

• ایک اندھا فقیر ہاتھ پھیلائے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ ایک منچلے نے
قریب رک کر کہا۔ "کیا تم واقعی اندھے ہو ؟"
"اس میں کیا شک ہے جناب" فقیر نے عاجزی سے کہا
"کیا تم کوئی ثبوت دے سکتے ہو"
کیوں نہیں صاحب۔ کیا آپ کو وہ سامنے جاتی ہوئی سرخ اسکرٹ
پہنے لڑکی نظر آرہی ہے"
منچلے نے جواب دیا۔ ہاں میں اسے دیکھ رہا ہوں"
"لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی ہے۔" فقیر نے کہا
مرسلہ۔ سیما سمیع۔ (الدور)

• ایک بیوی سے ڈرنے والا شوہر رات کو دیر سے گھر آیا۔ بیوی
سو گئی تھی۔ چپکے چپکے وہ اپنے ننھے بچے کے پالنے کے پاس گیا اور اسے ہلا کر
لوری گانے لگا۔ بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ تو شوہر نے کہا۔ ماشاءاللہ کمال ہے
کیسی غفلت کی نیند ہے تمہاری۔ ننھا گھنٹہ بھر سے رو رہا تھا مگر تم
غفلت کی نیند سو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اسے خاموش کرایا ہے۔
بیوی نے [illegible] کہا۔ یہ بھی تم نے دیکھا کہ منا پالنے میں نہیں
میری بغل میں سویا ہوا ہے۔
مرسلہ :۔ زیبا عرفان۔ گوالیار

• مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا۔ کانسٹبل کی شکایت یہ ہے کہ تم
نے اس سے عامیانہ گفتگو کی۔
ملزم نے کہا۔ حضور۔ وہ مجھے اس طرح ہدایات دے رہا تھا
جس طرح میری بیوی دیا کرتی ہے۔ اس لئے میرے منہ سے نکل گیا تھا
"ٹھیک ہے میری جان"

رُوح کے زخم

حمیدہ جبیں

شام ہو چلی تھی۔

سہ پہر کا سورج اپنی نرم کرنوں سے فضا میں سونے کے ذرات بکھیر رہا تھا۔ اور اس رنگین ماحول میں سانولی سلونی نوری زری کی گاڑی آہستہ آہستہ دھکیلتی چلی جا رہی تھی۔

نوری تین سال سے زری کی خدمت کر رہی ہے۔ مگر زری ... [illegible] ... نہ سمجھ سکی تھی۔ اکثر اس نے سوچا ... [illegible] ... بی بی ہے یہ۔ کبھی حد سے زیادہ پیار کرتی ہے اتنا ڈانٹتی ہے کہ ادھ موا کر دیتی ہے۔

پھر وہ خود ہی سوچتی۔

سچ ہی تو ہے بے چاری بیماری سے تنگ آ گئی ہے چار سال سے فالج میں مبتلا ہے۔ میں اس کے سامنے بھاگتی پھرتی ہوں اور اس کی ٹانگیں بے حس لکڑیوں کی مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ اور وہ مجھے کتنی حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ مجھ پر ہی برس پڑتی تھی ——— اور اب ——— کتنی خوش قسمت ہے زری بی بی کتنے لمبے اور چمکیلے بال ہیں۔

اور ... [illegible] ...

"نوری سمندر کی طرف لے چلو"

زری کی اداس آواز ابھری

"بی بی وہاں بڑا ویرانہ ہے"

"میں جو کہتی ہوں وہ کرو"

... [illegible] ... تیز تیز گاڑی چلانے لگی ... [illegible] ... کی گاڑی چار ماہ سے ... [illegible] ...

"نوری"۔ زری نے پکارا

"جی"

ناراض تو نہیں ہو"

نہیں بی بی جی آپ سے بھلا کوئی ناراض ہو سکتا ہے"

"تم بہت اچھی ہو نوری"

سورج کی ڈوبتی شعاعیں سمندر میں کانپ رہی تھیں۔ نوری نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ زری کے چہرے پر بھیانک اداسی تھی۔ نوری برداشت نہ کر سکی۔ کہنے لگی۔

"بی بی آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟"

"خاموش۔ ہونہہ۔ تم نہیں جانتی نوری۔ یہ چار سال میرے چار صدیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ میں مایوسی کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔ میں زندہ کہاں ہوں نوری۔ اس چار سال کے عرصے میں ... [illegible] ... جو دوگھنٹے ہوئے دیکھا ہے کتنی بار موت کا دامن تھامنے کی کوشش کی ہے"

دفعتاً ایک بھاری اور گمبھیر آواز سن کر وہ دونوں چونک پڑیں۔

"آپ ——— آپ کون ہیں"؟

زری حیرت سے گھٹی ہوئی آواز میں بولی

ایک انسان"

اس نے جواب دیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی ہی دلفریب تھی

"مگر... مگر...؟

"مگر وگر کچھ نہیں۔ میں آپ کو مایوسی کی بات کرتے دیکھ کر نہ رہ سکا۔ میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ مایوسی گناہ ہے" میری زندگی رات جیسی تاریک ہے اور روشنی کی ایک بھی کرن دور دور تک نہیں آتی۔ میں ایک اپاہج ہوں۔ اپنا بوجھ زبردستی اس گاڑی اور نوری پر لادے پھر رہی ہوں ——— لا مقصد ——— بلا وجہ

زری کا دکھ جاگ پڑا

یہ بھی آپ کا وہم ہے"

حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے لبوں پر۔ وہ مرد حسین کہانیوں کا جیتا جاگتا انسان تھا۔ جانے کیوں زری کا دل بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

اجنبی نے کہا

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے اپنی ٹانگوں سے چادر ہٹا دی۔ اجنبی کے چہرے پر حیرت کوئی آثار نہ تھے۔ وہ کہنے لگا

"میں جانتا تھا"

کتنی دیر تک وہ وہیں رہے۔ نوری شرمائی سی ایک طرف کھڑی رہی۔ اجنبی نے اپنے متعلق بہت کچھ بتایا!!

وہ آرٹسٹ تھا۔ اور تصویریں بنانے کے اس علاقہ میں آیا تھا۔ رات وہاں دونوں ساتھ گئے زری نے اسے اپنے ڈیڈی سے ملایا زری کے ڈیڈی بڑے ہی ملنسار تھے۔ اس سے مل کر بہت خوش ہوتے کہنے لگے

زری کی تصویر بناؤ گے بیٹے"

نوید مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں"

پھر وہ روز زری کے ہاں آتا رہا۔ کتنی عمدہ شخصیت تھی اس کی۔

زری کہتی رہی۔!

"میری تصویر کب بنائیں گے آپ۔؟"

"کتنے پیسے دیں گی آپ"

"میرے دامن میں صرف کانٹے رہیں"

وہ اداس ہو گئی۔

مگر نوید اسے یوں سمجھاتا۔ جیسے وہ بہت کچھ ... اس سے زندہ رہنے کی، زندگی سے پیار کرنے کی باتیں کرتا۔

زری کا حسن پہلے سے زیادہ نکھر آیا تھا۔

یکایک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ زری کے حسین خدوخال کو برش اور رنگوں کی مدد سے کینوس پر اجاگر کرکے اپنے فن کو بلندیوں پر پہنچا دے گا اور پھر ایک پرکیف جذبے کے تحت وہ کینوس پر زری کے خدوخال اجاگر کرنے لگا۔ زری پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنے شاہکار میں محو ہو جاتا۔ اور زری بھی اسی ماحول میں کھوئی رہتی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکرا دیتے۔ اور پھر تصویر میں کھو جاتا۔

زری سوچنے لگی تھی۔

"کیا میری زندگی خوشیوں اور مسرتوں کی راہوں پر گامزن ہو جائے گی۔ نوید نے ہی مجھے جینا سکھایا ہے اگر نوید میری جھولی خوشیوں سے بھر بھی دے تو۔ تو یہ اس کے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔

ایک اپاہج لڑکی۔ اور نوید جیسا خوبصورت۔ قابل نوجوان"

وہ یہ سوچ کر سہم گئی

مگر نوید کی نرم نرم گفتگو اسے سب کچھ بھلا دیتی

تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ زری کی تصویر اپنے حسن شاداب کے ساتھ کینوس پر دلہن بن کر ابھر آئی تھی۔ نوید بڑا ہی خوش تھا۔ یہ تصویر اس کا شاہکار تھا۔ تصویر سے جونہی اس نے پردہ کھینچا زری حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے بولی۔

"یہ میں ہوں"

"ہاں زری ... یہ تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے"

زری کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں

وہ بولا

"میں آج جا رہا ہوں زری"

اسے یوں لگا جیسے بہت سارے کانچ کے برتن ٹوٹ کر اس کے جسم میں پیوست ہو گئے ہوں۔ کہ جیسے ... کی روح نکل ... رہی ہو وہ کچھ نہ بولی۔ گھور گھور کر نوید کو دیکھتی رہی۔ اور پھر آنکھوں سے ... ساون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ نوید کے ہاتھ بھیگ گئے۔

دوسرے دن نوید جا رہا تھا۔

جیسے وہ زری کے پاس آیا زری پھوٹ پڑی کافی دیر بعد اس کے لب ہلے۔

واپس نہیں آئیں گے؟

"شاید"

نوید کار میں بیٹھ گیا۔ اور وہ اپنی گاڑی دھکیلتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔

نوید چلا گیا

زندگی درد بن گئی۔

سنہرے خواب ٹوٹ گئے۔ گھروندا مسمار ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ درد دینے والے کچھ بھی تو نہیں سوچتے۔ اس دنیا میں ہر روز کہیں عہد و پیمان کئے جاتے ہیں۔ اور پھر حالات کے ساتھ ساتھ پل بھر میں توڑ دیئے جاتے ہیں۔ ایک مجبور بدنصیب کا دل ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔

میں تو سائے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اور سایہ ... کبھی

کسی کے ساتھ دغا کی ہے۔

ایک دن شہر میں ایک ڈاکٹر آیا۔ بڑی دھوم تھی اس کی اس نے باہر کے ملکوں میں صرف فالج کے بارے میں تربیت حاصل کی تھی۔ زرّی بھی اس کی مریض بنا دی گئی۔

ڈاکٹر نے فوراً زرّی کو زیر علاج رکھا اور پھر آہستہ آہستہ زرّی کی ٹانگوں میں طاقت کی لہر دوڑنے لگی وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی تھی۔ مگر زندگی اب بھی اس کے لئے بے کیف تھی۔

کچھ دن اور گزرے۔ بیساکھیاں بھی اس نے چھوڑ دیں اب وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔

زرّی خوش تھی!

ڈیڈی مطمئن تھے!

مگر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسی تنہائی جو اس کے وجود کو جھلسا رہی تھی۔

وہ چلتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ دل غم سے بوجھل تھا۔ بہار آئی تھی۔ راستے پھولوں سے سجے تھے۔ کیاریوں میں زرد خودرو پھول اگ آئے تھے۔

نوید اسے یاد آ رہا تھا — اور پھر!

کچھ دن بعد اس کی شادی طے کر دی گئی۔ وہ ڈیڈی کی خواہش کا خون نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ خاموش رہی اور ایک اور تماشہ دیکھنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگی۔

اور ایک دن سرخ جوڑا پہنا کر اسے دلہن بنا دیا گیا۔ سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی ایک نئی جگہ آ گئی۔

آنکھیں چپ چاپ برس رہی تھیں۔

زندگی کی حقیقت ہے اب تو انکار نہیں زرّی کو!

ایک ایسی آواز جو اس کی روح کی گہرائیوں میں دفن تھی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے دیکھا سامنے سنہری شیروانی میں نوید کھڑا تھا۔

"کون — آپ — ؟"

وہ گھبرائی۔

نوید کا چہرہ کیا ہوا اور لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ

مگر — !

"مگر — آپ اتنے عرصہ کہاں تھے۔؟"

وہ رو گئی۔

تب نوید نے بتایا کہ میں تو تمہارے ڈیڈی سے بات پکی کر گیا تھا مگر میں تمہیں یہ خبر ایک دم سنانا چاہتا تھا۔ عین شادی کی رات — لیکن پھر تمہارے ڈیڈی کے کہنے کی بنا پر ہمیں شادی ملتوی کرنی پڑی کیونکہ انہی دنوں ڈاکٹر شیرازی آ گئے تھے اور تمہارے ڈیڈی ایک بار پھر اپنی بھرپور کوشش کرنا چاہتے تھے" اور وہ کہتا رہا۔

"خدا کا شکر ہے اور میری قسمت تھی کہ تمہیں ٹانگیں مل گئیں ورنہ مجھے تو تم اس کے بغیر بھی قبول تھیں۔ میں تو اپنے ہاتھوں سے تمہاری گاڑی کھینچنا چاہتا تھا۔ اور اس کے بعد میں" بالکل تم سے غائب رہا۔ پل پل کی خبر تھی مجھے۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ مل کر ہی تمہارے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔

"نوید —"

! بہت سے عزیز لڑکیوں نے کھلکھلا کر ہنسنے کی ملی جلی آوازیں سنا دیں!

اور زرّی اٹھ کر نوید کے پاؤں کی طرف جھک گئی مگر نوید نے اسے درمیان میں سے اٹھا لیا۔ زرّی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

نوید نے کہا زرّی تم رو رہی ہو کیا تم اس شادی سے خوش
زرّی نے کچھ نہ کہا اور اپنا سر نوید کے سینے سے ٹیک دیا۔

- لڑکیوں کو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ عشق و محبت کے شعلوں سے کھانا نہیں پکایا جا سکتا۔
- ایک مرحوم کے چھوٹے یتیم لڑکے سے کسی ہمدرد نے پوچھا "آخر وقت میں تمہارے والد مرحوم نے کچھ کہا تھا۔"
لڑکے نے کہا۔ کچھ کہتے بھی کیسے۔ میری امی ان کا دم نکلنے تک ان کے پاس جو بیٹھی رہی تھیں۔
- مجھے کسی چیز نے اتنا متاثر نہیں کیا۔ جتنا ایک باعصمت لڑکی کے حیا آلود تبسم نے۔ (رسکن)
- عورت کی عصمت اس کے بدن کے ضمیر کا نام ہے (بالزاک)

چمن سے آئی ہے خوشبو.... میک اپ

(کے۔ پی۔ سکینہ)

ٹی وی کے مشہور ڈرامہ بی بی ناتوان والی اور دوسرے بہت سے مزاحیہ ڈراموں کے خالق جناب کے۔ پی۔ سکینہ کا یہ مزاحیہ مضمون ہم ناظرات حریم کی دلچسپی کے لیے شائع کر رہے ہیں (ادارہ)

مثل مشہور ہے حضرات کہ انسان انڈا نہیں دیتا مگر آملیٹ اور ہاف فرائی کی بابت مرغی سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ ہی حال میرا ہے، کم سنی کے کچھ برسوں کو چھوڑ کر میں نے آج تک میک اپ نہیں کیا مگر میک اپ کی تہیں اور پرتیں دیکھ کر ان کے اصلی چہرے کی پہچان بھول گیا ہوں۔ یہاں پر میں خواتین سے دست بستہ عرض کرنا چاہوں گا کہ سیاہ فام ہوتے ہوئے بھی میں میک اپ کا مخالف نہیں ہوں۔ بچپن میں رگڑ رگڑ کر مجھ ناچیز کا بھی خوب خوب میک اپ ہوا ہے۔ تیل ابٹن کاجل بیجا پاوڈر اور نہ جانے کون کون سے لوشن سیلوشن مجھ پر کھپائے گئے ہیں۔ گھر والے چاہتے تھے کہ میں گل و گلزار بنا رہوں اور عہد جوانی میں دولہوں کی منڈی میں بھرپور قیمت پر فروخت ہو سکوں۔ میری قیمت فروخت اٹھی یا گری .... [illegible] الگ بات ہے۔ اب اس عمر میں اڑی ہوئی گرد کے پیچھے دوڑنے سے کیا حاصل وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ اللہ کے فضل سے اب اپنی ہی تصویر کا نیگیٹو نظر آتا ہوں کاش [illegible] میک اپ کی دھوپ اور روشنی سمیٹ لیتا تو آج باقاعدہ سرخ رو ہوتا.... خیر!....

ہمارے یہاں محکمۂ ریلوے میں گاڑی اسپیڈ بڑھا کر ٹائم میک اپ کرتی ہے۔ خواتین کا سلسلۂ میک اپ اس کے برعکس ہے یعنی میک اپ عمر کو پیچھے لے جانے میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کی اسپیڈ پر میک اپ کی پرت بریک کا کام کرتی ہے اجڑی ہوئی بہاریں لوٹ آتی ہیں کو ٹلیں وغیرہ کو نپلیں لگتی ہیں اور بقول شخصے ہاتھی دانت پر گھوڑے نقش جیسا نظر آنے لگتا ہے۔ میں اگر آج تھوڑا سا بھی میک اپ پرست ہوتا تو متوازن چہرے کے میک اپ پر بھی لکھ رہا ہوتا

مگر جس شخص کے مکان کی دیواروں کو پانچ پانچ برس چونا نہ لگتا ہو دروازے وارنش کو ترستے ہوں اور ہر طاق میں ابابیل کے گھونسلے پرورش پا رہے ہوں وہ بھلا کیا جانے کہ میک اپ کون سے برش سے پوتا جاتا ہے، طرح طرح کے میک اپ دیکھ کر ہر بار اپنے دل میں جل ترنگ وغیرہ بجتے ہوئے خود محسوس کئے ہیں ایک آدھ بار منھ کے بل گرا بھی ہوں.... مثلاً اب آپ سے کیا پردہ؟ ....

ہماری کالونی میں ایک عورت رہتی ہے۔ نام مجھے معلوم نہیں یوں بھی میک اپ زدہ سے اس کا نام پوچھنا میک اپ کی توہین ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے جب وہ کالونی سے گزریں کئی کئی کلومیٹر خوشبو کے سیلاب رواں کرتی گئیں۔ آپ کی قسم صرف انھیں ہی دیکھ کر لگتا تھا جیسے کالونی کے کرم خوردہ انبار میں صرف ایک صاف ستھرا کاغذ ثابت بچا ہو۔ اُف! .... میک اپ ایسا کہ .... کہ.... جلدی سے کوئی عمدہ سی تشبیہ ہاتھ میں لگ رہی ہے۔ میرا ایمان گواہ ہے کہ میں صرف اس میک اپ کا دیوانہ تھا۔ لفافے کے مضمون سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر ایک دن اچانک کالونی کی کسی ویلفیئر اسکیم کے تحت چندہ لینے ان کے وہاں جانا پڑا۔ گھنٹی بجائی.... میک اپ موصوفہ کی والدہ نے دروازہ کھولا۔ بڑے ادب سے ہم نے ان کی بابت پوچھا کہ تشریف فرما ہیں یا خوشبوئیں تقسیم کرنے کہیں شاپنگ پر گئی ہیں۔ وہ والدہ محترمہ لڑکھڑائیں اور دروازہ بند کر لیا۔ ہوش و حواس درست ہونے پر پتہ چلا کہ جنھیں ہم والدہ سمجھ رہے تھے وہ وہ خود ہیں اور فی الحال میک اپ سے جدا ہیں۔ بس اسی لمحہ شعراء کے ذکر حسن و جمال اور پری پیکر مہ لقا آہو چشم وغیرہ الفاظ پر سے ہمارا یقین اٹھ گیا۔ تخیل کے سارے فانوس ایک ساتھ چھناکے سے چکنا چور ہو گئے اپنی ہی کھڑکی میں اس جانب بیٹھ کر کے بیٹھنے لگے جدھر سے ان کا گذر ہوتا تھا۔ پرانی شکایتوں کی طرح ان کے چہرے کی جھریاں آج بھی دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ خاک ڈالئے ایسے میک اپ پر کہ چڑھتی دھوپ پل بھر میں منڈیر پھلانگ جائے۔

میں دوبارہ عرض کروں کہ میں مخالف میک اپ ہرگز نہیں ہوں مگر خوشبوؤں کی بلیک بھری کے عوض عطر کا پورا کنستر برداشت نہیں کر سکتا۔ کمپنی والوں نے ساری خوش نما شیشیاں اس لیے

نہیں بنائی ہیں کہ کوئی بیری ڈولتی عمر کے کھیل جائے۔ اب آپ سے عرض کر ہی دوں کہ خاکسار کو کیسا میکپ پسند ہے۔ جیسے جھٹکے ہوا کا ایک مدھم جھونکا تازہ کھلے گلاب کو چھو کر گذر گیا ہو۔ جیسے صبح سویرے کھڑکیوں کے شیشوں پر اوس کی بیحد نازک بوندیں پڑ گئی ہوں۔ جیسے چہرے پر گلابی شیشوں سے چھنتی دھوپ پڑ رہی ہو — یا جیسے چہرے پر شرارت کا کوئی خیال آکر ٹھہر گیا ہو .... جیسے الجھے گھونگھروؤں کی آواز کہیں دور سے آرہی ہو ... جیسے ... اف ... اب سب میں ہی بیان کر دوں گا؟ باقی سب آپ اپنی جانب سے جوڑ لیجئے۔ بلاوجہ طبیعت سن پچاس کی طرف سرکنے لگتی ہے جب ہم بھی وقت کے پتھروں کو ڈھوتے نہیں تھے تراشتے تھے۔

لگے ہاتھوں کالونی کا ہی ایک ذکر اور ہے۔ صبح صبح اپنے بچے کے ساتھ کھیلتی ہوئی اسے اسکول پہونچانے جاتی ہیں۔ مجھ میں اور میرے دوست مرزا میں اس پر کافی کی شرط لگ جاتی ہے کہ میکپ ہے یا نہیں۔ میرا بھی دل کبھی کبھی کہتا ہے کہ ہے ... کبھی کہتا ہے نہیں ہے۔ اگر ہے تو زندہ باد! میں ایسے ہی میکپ کا قائل ہوں۔ .... اور اگر نہیں تو سو بار زندہ باد ..... کچھ چہرے ایسے بھی ہونے چاہئے کہ دھلائی چھپائی ڈرائی کلینک اور قلعی کے بغیر بھی تاج محل جیسے تر و تازہ نظر آتے رہیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو کون دھوتا ہے صابن سے؟ چمپا پر کون عطر پاشی کرتا ہے؟ قدرت سے بڑا میکپ اور میکس فیکٹر کا کارخانہ آج تک نہیں تھا۔

آپ کے اس غلام کے کالونی میں چند چہرے ایسے بھی ہیں جنھیں دیکھ کر بنانے والے کی عقل پر ترس آنے لگتا ہے میکپ کے بعد یوں لگتا ہے جیسے بیحد ٹوٹی چٹختی عمارت پر پانی برس کر کھل گیا ہو اور کھنڈروں کی ویرانی کو اور بھی نمایاں کر گیا ہو۔ آپ کی قسم کبھی کبھی دل میں دہشت پیدا ہونے لگتی ہے لگتا ہی جیسے کوئی رنگا پُتا ہمالیہ پہاڑ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا کالونی میں صرف اپنے وجود کی یاد چھوڑ گیا ہو۔! ... مرزا میاں ایسے وقت کالونی کے بچوں کو آغوش میں سمیٹنے لگتے ہیں کہ کہیں کوئی معصوم دہشت زدہ ہو کر بے ہوش نہ ہو جائے بے حد گہرا کھنچا ہوا کاجل اور ہونٹوں سے ٹپکتے لہو جیسی لپ اسٹک دیکھ کر من میں ویسا ہی بیراگ سمانے لگتا ہے جیسا کلنگ کی لہو پاشی کے بعد اشوک کے من میں سما گیا تھا۔ آئی برو (EYE BROW) کی تلواروں سے خوف زدہ ہو کر بار ہا گوشۂ قالب ڈھونڈھنے کی نوبت آگئی ہے۔ حالاں کہ ضمیر اندر سے سمجھاتا ہے کہ اسے بے وقوف .... پیار سے ڈرتا ہے ... پرت در پرت .... در پرت پھر کچھ نہیں۔ میکپ کی ان تہوں تلے۔ بس رہے نام اللہ کا! ..... اس کے برعکس میکپ کی ہلکی سی تہہ دیکھ کر سارے تازے پھل پھول یاد آنے لگتے ہیں۔

ادھر ہمارے مرزا میاں تحیم شحیم میکپ اپ سے ڈرتے ضرور ہیں مگر دیوانگی کی حد تک میکپ کے قائل ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جوتی جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے زیادہ پالش کھاتی ہے۔ یہ تھوڑا ہے کہ ڈھب سے چہرے پر ذرا سا پاؤڈر ٹیپا اور نکل پڑے۔ جغرافیہ کے نقشے کی طرح ہر ندی دریاؤں کو الگ الگ پہلوؤں سے شیڈ دینا ضروری ہے۔ سو میں تینتیس نمبروں کے مرزا کبھی قائل نہیں رہے۔ حالانکہ حضرت ہماری ہی طرح عمر کی ان سرحدوں کو چھو رہے ہیں جب چائے کی زیادہ گرم چسکی سے زبان جل جاتی ہے۔ مگر محراب دار ابروؤں کے دیوانے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بھئی قدرت سے لڑ رہے ہو تو ترکش میں کوئی تیر باقی نہ رکھو۔ .... ساری شیشیاں ڈبے ٹیوب اور برش داؤں لگا کر ثابت کر دو کہ عمر کی ڈھلان پر قدم جما کر کوئی کس طرح نکارہ سکتا ہے۔ گرہستی کا بوجھ اٹھے نہ اٹھے میکپ کا بوجھ پھول جیسا اٹھائے رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ مرزا کو منزل سے زیادہ راستوں کا شوق ہے۔ یہ شخص ایک ایسا کنکر ہے جو کسی دال میں ہی گل سکتا خود ہماری بھاوج کو صابن سے منھ تک نہیں دھونے دیتا مگر دوسروں کے میکپ کی تہوں کو دوسرے کے اشعار کی طرح گنگنانے میں سکون محسوس کرتا ہے۔ بس یہیں پر میری اور مرزا کی نہیں پٹتی۔ ان کا کہنا ہے کہ پاؤڈر گھر میں گیہوں کے آٹے کے برابر اسٹاک رکھنا چاہئے۔ اور میں کسی بے حد لدے پھندے چہرے کو مسکراتے بھی دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ مسکراہٹ کمبخت لپ اسٹک میں چپک کر پھڑپھڑا رہی ہے۔ یہ تھوڑا ہے کہ عمر کے بھاری قدم سب کچھ روندکر آگے بڑھ گئے اور آپ خواہ مخواہ دسمبر میں اپریل بننے کی دھن میں سرگرداں ہیں۔ میکپ کے ساتھ بے رنگی

مجھے بھی برداشت نہیں ہوئی۔ میکپ تو سپنوں جیسا نرم ہوتا ہے کہ بس انسان کو خوشگوار رہنے کی یاد دلاتا رہے یہ صحیح ہے کہ پرانی یادیں کبھی کبھی بہت للچا دیتی ہیں۔ مگر اس لالچ پر خوشبو کی ایک ہلکی سی تہہ کافی ہے۔ دھان کی بالیوں تک میں وقت آنے پر دودھ خشک ہو جاتا ہے اور وہ اناج کا دانہ بن جاتی تھیں۔ پختہ عمر اناج کا وہ دانہ ہے جس کے پاس صرف کونپل کی یاد ہی باقی رہ جاتی ہے۔

بہرحال اپنی کالونی کی شکل میں، میں اپنے گرد و پیش سے مطمئن ہوں کہ جہاں فسانۂ میکپ کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ جیسمن کی مہین سی مہک بھی اڑتی ہے اور پاؤڈر کے دھول بھرے بادل بھی۔ آئینوں پر سے پارہ اتر گیا ہے مگر چہرے کا عکس دھندلا نہ دکھائی دے یہ جدو جہد جاری ہے بغیر سالن نوالہ توڑنے کا عالمی ریکارڈ قائم ہو سکتا ہے مگر پاؤڈر کی پرت کا وزن ہرگز نہیں گھٹ سکتا بقول مرزا سب کچھ خرچ ہونے کے بعد جو بچتا ہے وہی زندگی کا حاصل ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا چاہیئے کئی بار میں خود مرزا کے گھپلے میں شامل ہو گیا اور ارادہ کیا کہ شریکِ حیات کے نام پر جو کچھ بچا ہے اسے میکپ سے آراستہ کر دوں ۔۔۔ مگر ہر بار ایک ہی شعر یاد آیا ؎

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھوں

کہاں کہاں تک میکپ کو سمجھاتا پھروں گا کہ کبھی تھوڑی قلعی ادھر بھی ۔۔۔۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ عمارت کو تعمیر کرنے کی عمر رہی نہ پرانی حویلیوں میں فانوس ٹانگنے کی۔ عمر کے پراویڈنٹ فنڈ میں سے جو بچا ہے اسی پر قناعت کیجئے باقی سب خیریت ہے۔

(آکاش دالی لکھنؤ سے نشر)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے، شعر ہمارے مقررہ عنوان سے متعلق ہو، موزوں اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ چھپنے والے مہینے سے پہلے مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانے والے شعر ہی شریکِ اشاعت ہو پاتے ہیں۔ جون کے لئے عنوان ہے "شوق" اور جولائی کے لئے "صبح"

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ، سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات

مرسلہ۔ حجاب فاطمہ عرف نائلہ (تاتار پور بھاگلپور)

ہوس کا دہر میں دو روز بول بالا تھا
کہ عارضی شبِ مہتاب کا اجالا ہے

مرسلہ۔ نجمہ انصار مٹا (جھنگل)

سہیلیوں کا یہ جھرمٹ، یہ بزم آرائی
کہ جیسے شب کو ستاروں کے بیچ میں مہتاب

مرسلہ۔ عصمت آرا (بانکا)

کسی مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈھتا ہر شب جہان آباد کی گلیاں

مرسلہ۔ شہلا بانو (الہ آباد)

خوابگاہ شہ میں گل تکیے نہیں زربفت کے
دو ہیں گویا زیبِ بستر آفتاب و ماہتاب

مرسلہ: مسز فیروزی قیسم (لکھنؤ)

اکثر بہنوں نے ماہ "قمر" پر شعر بھیجے جو عنوان کے تحت نہ آتے تھے اس لئے شائع نہ ہو سکے۔

نظریں جو اٹھا دے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارہ

مرسلہ: کشور سلطانہ۔ لال باغ۔ لکھنؤ

جس کو خدا رکھے

برق آشیانوی

بصرہ کا ایک رئیس اپنی دولت کے نشہ میں چور تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کو بھلا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دولت وہ شئے ہے جس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ غریب عوام کو دولت کے عوض خرید سکتا ہے۔ مفلس اپنی تنگ دستی اور مصیبت کی زندگی میں اخلاقی اقدار کھو دیتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولتمندوں کی جائز و ناجائز ہر قسم کی خواہش کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک کردار کی بلندی کا کوئی معیار نہ تھا کہ غریبوں میں بھی عزت نفس اور بلندیٔ کردار کے اعلیٰ نمونے ہوتے ہیں۔ دولت کی فراوانی نے اس کی آنکھوں پر غفلت و گمراہی کی پٹی باندھ دی تھی۔ اس کو اسلام کی تعلیم کا وہ درس یاد نہ رہا تھا کہ غیر عورت ماں بہن یا بیٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

اس رئیس کا ایک بہت وسیع و عریض باغ تھا۔

اس باغ میں انواع و اقسام کے میووں کے درخت موجود تھے اس نے اس باغ کی حفاظت کے لئے ایک ملازم کو مامور کیا تھا ایک روز جب وہ اپنے باغ کی حالت دیکھنے کے لئے گیا تو باغ کے محافظ کی نوجوان بیوی کی جھلک نظر آئی۔ جو نہایت حسین اور کمسن تھی۔ بدکار رئیس کی نظر بد سے حسن و جوانی کا پیکر محفوظ نہ رہ سکا۔ نظر پڑتے ہی رئیس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوگئے۔ اس کی ہوس بھری نظروں نے اس کے ذہن میں شیطانی جذبات کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس وقت وہ رئیس واپس ہو گیا لیکن اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر کار اس نے یہ معلوم کر لیا کہ باغ کا محافظ روزانہ گھر سے باہر کب جاتا ہے اور کب واپس آتا ہے۔ تاکہ وہ ایسے وقت باغ کو پہنچے جب اس کی حسین اور نوجوان بیوی تنہا موجود ہو۔

ایک روز جب باغ کا محافظ ضروریات زندگی کے سامان کی خریداری کے لئے باغ سے باہر آبادی میں گیا ہوا تھا وہ رئیس اپنے باغ میں پہنچا۔ دیکھا کہ محافظ کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ رئیس بے دھڑک گھر میں داخل ہو گیا۔ محافظ کی نوجوان بیوی اچانک باغ کے مالک کو اپنے گھر میں موجود پاکر پریشان ہوئی۔ شوہر آبادی میں گیا ہوا تھا اس کے واپس آنے میں کافی دیر تھی۔ تاہم اس نے دل کو دلاسا دے کر مالک سے کہا کہ اس کا شوہر آبادی میں گیا ہوا ہے۔ آپ پھر کسی وقت آئیں۔ رئیس نے جواب دیا کہ وہ محافظ سے ملنے یا اس سے بات کرنے یا باغ کی حالت دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ تب تو نوجوان عورت اور پریشان ہوئی۔ اور نظریں نیچی کر کے دریافت کیا کہ پھر آپ کس کام کے لئے آئے ہیں رئیس نے بلا کسی تمہید کے جواب دیا کہ جب میں پچھلی بار آیا تھا تو تمہارے حسن و نوجوانی پر فریفتہ ہو گیا اور اسی وقت سے تمہارے حسین پیکر سے ملاقات کے لئے بے چین تھا۔ اب موقع پاکر ایسے وقت آیا" جبکہ باغ کا محافظ موجود نہیں ہے اور تم تنہا ہو۔ پھر رئیس نے کہا کہ اگر تم اپنے حسن اپنی نوجوانی کا تحفہ میری خدمت میں پیش کر دو تو میں تم کو بیش بہا دولت دوں گا۔ یہ سنکر اس نوجوان عورت کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ وہ اپنے آپ کو بے بس اور بیکس و تنہا پاکر سوچنے لگی کہ اب اس کی عصمت و پاکیزگی کو ایک ڈاکو لوٹ لے گا۔ سر جھکا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر دل ہی دل میں اس نے کہا۔ اے اللہ تیرا وعدہ ہے کہ جو مخلوق اپنے آپ کو تیرے حوالہ کر دے تو تو اس کا محافظ ہو جاتا ہے اور تو ہی اس کی امیدوں کا سہارا بنتا ہے اور تو ہی اس کی حفاظت کرتا ہے۔ فرعون جب دریائے نیل میں غرق ہو رہا تھا تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو آٹھ مرتبہ گڑگڑا کر پکارا اور التجا کی کہ اے موسیٰ مجھے بچا لو۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اُسے نہیں بچایا۔ اس وقت اے اللہ تعالیٰ تو نے موسیٰ سے کہا تھا کہ موسیٰ فرعون نے تم کو آٹھ مرتبہ پکارا لیکن تم نے اسے نہیں بچایا۔ اگر ایک مرتبہ بھی ہمیں پکارتا تو ہم بچا لیتے۔ اے پاک پروردگار اگر فرعون ایک مرتبہ پکارتا تو تو اسے بچا لیتا۔ اس وقت ایک ڈاکو میرے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ مجھے تباہ کرنے کے درپے ہے۔ وہ میری عزت و آبرو کا خزانہ لوٹنا چاہتا ہے۔ اس وقت میں تجھے اور صرف تجھے پکارتی ہوں کہ اس وقت مجھے بچا لے اور اپنا وعدہ پورا کر۔ جب اس

نوجوان نے اپنی عفت و عصمت کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے سپرد کردی اچانک اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ وہ رئیس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اور ادب کے ساتھ کہنے لگی "حضور۔ آپ آقا ہیں اور ہم غلام آپ مالک ہیں اور ہم نوکر۔ ہماری ہر شئے آپ کی ملکیت ہے۔ چنانچہ میں آپ کے حکم کی تعمیل سے کیسے انکار کر سکتی ہوں" یہ سنتے ہی رئیس کے شیطانی جذبات میں طوفان آگیا۔ وہ بہت مسرور ہوا اور اپنے ارادے میں کامیابی کے امکانات سے اس کا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔ اس عورت نے پھر کہا "حضور اس گھر کے دروازے اور دریچے بند کر کے آؤں تو پھر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔ رئیس نے اس کی اجازت دے دی۔ نوجوان عورت نے دروازے اور دریچے بند کر دیے اور واپس آکر پھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اور عرض کیا۔ حضور جتنے دروازے اور دریچے تھے میں نے بند کر دیئے لیکن ایک دروازہ بہت بھاری اور وزنی ہے جس کو میں بند نہ کر سکی۔ آپ مرد ہیں۔ ماشاءاللہ تندرست اور طاقت ور ہیں۔ مہربانی فرماکر وہ دروازہ آپ بند کر دیں"

"رئیس نے کہا "ضرور۔ ضرور، بتاؤ وہ کونسا بڑا دروازہ ہے۔ میں خود بند کئیے دیتا ہوں" نوجوان عورت نے جواب دیا "حضور وہ دروازہ ایسا ہے جس سے خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ وہ دروازہ میں نہیں بند کر سکی۔ آپ اس کو بند کر دیجئے۔ پھر آپ جو چاہیں سلوک کریں" اتنا سنتے ہی رئیس کے شیطانی جذبات میں برف کی سی لہر دوڑ گئی اور سارے جسم میں سردی کی ایک خوفناک کیفیت پیدا ہوگئی۔ وہ اللہ کے خوف سے کانپ اٹھا۔ اور آگے بڑھ کر اس نے عورت کے پاؤں پکڑ لیئے اور گڑگڑا کر اس سے معافی مانگی۔ اور اٹھ کر خاموش باغ سے چلا گیا ـــــ سچ ہے جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

"ماضی وحال سے"

اُمِّ ہانی

حیران ہے عقل وقت کی گردش سے حال سے
اجسام داغدار ہیں ان ماہ و سال سے
صدیاں گذر گئی ہیں بشر کے عروج میں
کتنا ہے بُعد آج کے ان خدّوخال سے
اہلِ خلوص کے لئے دار و رسن بنے
اہلِ ہوس نے کام لیا زر سے مال سے
اب بھی نہیں کسی کو ہے تعمیر کا خیال
راہِ حیات خستہ ہے ماضی و حال سے
افکار تو یہ ناز تو ہے مسکرین کو
حیراں مگر ہیں آج بھی بارش سے کال سے
بہبود کے لباس میں حاوی ہے اقتدار
بے دست و پا عوام ہیں حلقوں سے جال سے
نادم خطا پہ ہے جو جبین عرق عرق سی
بہتر ہے صد ہزار وہ گوہر سے لعل سے
انساں کے ارتقار کے لئے ہیں شعور و عقل
شاہین کا عروج ہے جوں پر سے بال سے
حاجت ہے اب بشر کو کہ وہ باعمل بھی ہے
بنتی نہیں ہے بات فقط قیل و قال سے
جن کا خلوص آج بھی ہاتّی ہے پائیدار
ملتے ہیں ایسے لوگ، مگر خال خال سے

حریمی دسترخوان

پسندے

اشیا۔ ران کا گوشت ایک کلو۔ بلا ہڈی کے گوشت کے پتلے پتلے سلائس تراش لیں۔ پیاز تقریباً ۲۵۰ گرام پپیتہ کچا ۱۰۰ گرام۔ ادرک ۵۰ گرام لونگ ۱۰-۱۲۔ دہی ۲۰۰ گرام۔ سیاہ مرچ ۱۵-۲۰۔ بڑی الائچی دو عدد۔ سرخ مرچ حسب خواہش۔ نمک حسب ضرورت۔ بھنا ہوا دھنیا ۶۰ گرام

پہلے پپیتے کو باریک پیس کر نمک ملالیں۔ گوشت کے بنائے ہوئے سلائس کو پپیتے میں لت پت کرکے دو ڈھائی گھنٹے تک رکھے رہیں۔ تمام مسالوں کو باریک پیس کر دہی میں ملالیں۔ کسی فرائی پین یا کڑاہی میں تھوڑا تھوڑا گھی یا ڈالڈا ڈال کر پسندوں کو مسالوں میں لت پت کرکے تلیں مسالہ نہ جائے تو بعد میں تھوڑے گھی میں بھون کر پسندوں پر ڈال دیں۔ نمک کم ہو تو مسالے میں تھوڑا سا ملالیں۔ ہرا دھنیا ملتا ہو تو کاٹ کر چھڑک دیں۔ چٹپٹے رکھنا ہوں تو ہری مرچیں بھی باریک باریک تراش کر چھڑک دیں۔

مرسلہ: مسز فیروزی تسنیم لکھنؤ۔

مرغ کا لذیذ سالن

مرغ وزن تقریباً ۷۵۰ گرام وزن کا جوان پٹھا ہو بوڑھا نہ ہو۔ پیاز ۱۰۰ گرام۔ ادرک ایک چھوٹی آنٹی ہری الائچی ۱۰ عدد۔ کالی مرچ ۱۵-۲۰۔ نمک اور سرخ مرچ حسب خواہش۔ گھی تقریباً ۲۰۰ گرام۔ لیموں بڑا ہو تو ایک چھوٹے ہوں تو دو۔ زعفران مل سکے تو ۸-۱۰ پنکھڑیاں ورنہ کیوڑہ کا عمدہ عرق ۱۰ ماشہ۔ دہی ۲۰۰ گرام۔ بالائی ۱۰۰ گرام پپیتہ کچا ۵۰ گرام۔ مرغ اگر وزن میں کم ہو تو مسالے بھی اسی اعتبار سے کم کر دیں۔ زیادہ ہو تو مسالوں میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کرلیں۔ ترکیب:- مرغ کو ذبح کرنے کے بعد اچھی طرح صاف کرلیں۔ پیٹ چاک کرکے تمام آلائش بھی نکال دیں اور بوٹیاں کرلیں۔ بالائی کو کسی باریک کپڑے میں دبا دبا کر چھان لیں اور دہی میں ملاکر پپیتہ بھی پیس کر ملائیں۔ اور اس میں بوٹیوں کو ڈال کر ہر رشتہ کرلیں (پپیتہ صرف اس لیے شامل کیا جاتا ہے کہ جلد اور بآسانی گوشت گل جائے۔ اگر مرغ جوان اور گوشت حلوان ہو تو پپیتہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

نصف پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی میں سرخ کرکے نکال لیں۔ نمک، سرخ مرچ، ادرک، بادام، لہسن، کالی مرچ اور بقیہ پیاز بھی پیس کر گوشت میں ملالیں۔

بقیہ گھی میں لونگ، الائچی ڈال کر بھونیں اور مسالا لگی بوٹیوں کو ڈال کر ہلکی آنچ میں پکائیں۔ پانی قطعی نہ ڈالیں دہی اور بالائی کے پانی ہی میں گل جائے گا۔ تیار ہونے پر اگر شوربہ ڈالنا چاہیں تو تھوڑا پانی ڈال کر چند منٹ پکائیں تلی پیاز مسل کر ڈالیں۔ نمک چکھ لیں اور لیمو کا رس ڈال دیں سب سے آخر میں زعفران یا کیوڑہ خوشبو کے لیے چھڑک دیں

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع ہوسکتی ہے، جو ولادت اطفال سے متعلق ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کریں کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہوجائے۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے چھپتی ہیں۔ خبر میں کتابت کی کسی بھی غلطی کا ذمہ دار ادارہ نہ ہوگا، البتہ اطلاع ملنے پر غلطی کی تصحیح شائع کردی جائے گی ——— ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• ناہید ضیا وارثی (رجگولیا) میرے چھوٹے ماموں محمد شہنواز انور اور ممانی فرحت انور کو اللہ پاک نے ۲۵ مارچ ۸۳ء بروز پیر بوقت ۵ بجے شب بمقام رانچی ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• شمس النساء محسن (مدراس) میری چچازاد بہن سعاد اور رشید اشرف صاحب کو اللہ پاک نے ۲ مارچ ۸۳ء بروز بدھ پانچ بجکر اکتیس منٹ پر ایک دختر عطا فرمائی۔ نام حبیبہ قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب و فخر خاندان بنائے۔

• فیروز سلطان مرچکر (اندھیری۔ بمبئی) میری بہن عابدہ اور بہنوئی محمد علی بابا میاں قاضی کو اللہ پاک نے ۲۴ فروری ۸۳ء کی شب میں پونے گیارہ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام شاداب قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• کہکشاں ترنم (اسری بی بی رامپور) ہماری چھوٹی پھوپھی نیلوفر سعد پھوپھا سعد اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۲۸ دسمبر ۸۲ء بروز ... بوقت ڈھائی بجے دن، پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔ نام ندا تبسم قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے۔

تابندہ مصباح (حاج مئو۔ کانپور) میری ہمشیرہ محترمہ کشور مصباح اور بہنوئی ظفر عالم صاحب کو خداوند تعالیٰ نے دو لڑکیوں کے بعد ۲۵ مارچ ۸۳ء بروز جمعہ ۵ بجکر ۳۵ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ اولاد

فخر خاندان بنے۔

• مینگار سعدیہ کوثر (پرنام بٹ) میرے چچا چچا مینگار حفظ الرحمن صاحب اور چاچی اودم شائستہ فاطمہ کو اللہ پاک نے ۲۳ دسمبر ۸۲ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام مبشر الزماں قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

• خریداری نمبر ۱۵۹۵۔ آپنے سرکاری ٹکٹ بھیجے ہیں۔ یہ پبلک استعمال میں نہیں آسکتے۔

پیغامات نشاط

• میرے آفس منیجر برادر عزیز سید جمیل الحسن ردولوی صاحب کے فرزند ارجمند عزیزی انجم سلمہ کی شادی کنیز فاطمہ عرف درخشاں سلمہا (دختر نیک اختر سید محمد احسن صاحب) کے ہمراہ ۱۴ اپریل ۸۳ء کو بمقام بارہ بنکی بحسن و خوبی انجام پائی ۱۵ اپریل کو جمیل صاحب نے اپنے اعزہ، احباب اور معززین شہر کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• محمد غفران احمد نعمانی (دیوبند) عزیزی ریحانہ طلعت نعمانی سلمہا (دختر نیک اختر جناب قاری محمد نعمان صاحب) کا عقد سعید ہمراہ ممتاز خاں۔ (فرزند افضل صاحب آف ناہن۔ ہماچل پردیش) بمقام علامہ منزل دیوبند، بتاریخ ۲۵ مارچ ۸۳ء بروز جمعہ بوقت ۱۱ بجے دن بحسن و خوبی انجام پایا اللہ مبارک کرے۔

• پیش امام عبد الباسط صاحب (آمبور) کی نواسی فرحانہ پروین سلمہا (بنت جناب تولسے عبد الرزاق عرف مولانا صاحب) کا عقد سعید ہمراہ کلیم الرحمن سلمہ (ابن پچکار حاجی عبید الرحمن صاحب ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء بروز اتوار بوقت صبح ۱۰ بجے بمقام جامع مسجد۔ آمبور، بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• چودھری محمد نسیم صاحب (ملکہ گنتی گیٹ۔ لکھنؤ) کی صاحبزادی شمیمہ خاتون سلمہا کی شادی ہمراہ انور جمال سلمہ (فرزند سید ظفر علی صاحب لکھنؤ) ۲ اپریل ۸۳ء کی شام کو بمقام برلنگٹن ہوٹل بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• معز الدین احمد صاحب نے اپنے فرزند نواد محمود سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں، جو حصہ سلمہا (دختر نیک اختر چودھری اے بصیر صاحب) کے ہمراہ عمل میں آئی ——— ۲۰ اپریل ۸۳ء کی شام کو یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس علی گڑھ میں ولیمہ کی دعوت عصرانہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پر ملال کی خبریں

• ۲۵ مارچ کو محترم ایم۔ اے رحمٰن صاحب پاٹلی پترا کالونی کی نواسی کی شادی کے سلسلہ میں پٹنہ گیا تو قیام منظور عالم صاحب ریٹائرڈ جج کی کوٹھی میں ہوا۔ وہیں معلوم ہوا کہ جج صاحب موصوف کی والدہ محترمہ ۲۴ فروری ۸۳ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بزرگ صفت خاتون تھیں۔ خوش اخلاق، ملنسار اور پابند صوم و صلوٰۃ بھی تھیں۔ اللہ مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

• عصمت آرا (بانکہ) افسوس کہ میری خوشدامن صاحبہ ایک مختصر علالت کے بعد ۱۶ مارچ ۸۳ء بروز چہار شنبہ بوقت ساڑھے دس بجے دن اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

• دلی رنج و الم کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میرے کرمفرما اور محسن جناب شاہ غیاث عالم صاحب ریٹائرڈ جج منگل ۲۵ اپریل اور بدھ ۲۶ اپریل ۸۳ء کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم شاہ فیملی غازی پور کے ممتاز فرد تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد لا پلاس لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار فرمالی تھی اور سنّی وقف بورڈ کے کنٹرولر کی حیثیت سے عرصہ تک اس کے فرائض بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے تھے۔ مرحوم بڑے ہی نیک نفس، شریف اور عبادت گذار تھے۔ جس سے بھی ملتے، خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ مجھ حقیر پر اس وقت سے مہربان تھے جب منصف دیوریا تھے۔ سرتیج کو بے حد پسند فرماتے تھے اور اس کی ہر ممکن امداد ہمیشہ کرتے رہے تھے۔ افسوس کہ تنفس کی شدید تکلیف کے باعث تادم تحریر میں مرحوم کے پسماندگان کے پاس تعزیت کے لئے بھی نہ جا سکا۔ میری یہ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو بخشے، اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

• ۷ مئی کا اخبار اٹھایا تو یہ المناک خبر نظر سے گذری کہ اہلیہ صاحبہ جناب امین سلونوی کا ۶ مئی کی شام کو ۶ بجے انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کو میں بھابی کہا کرتا تھا اس لئے کہ امین صاحب مجھ سے عمر میں بڑے ہیں ان کی عمر ۷۷ سال کے لگ بھگ تھی۔ رائے بریلی کے ایک مقتدر خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ امین سلونوی صاحب کی یہ دوسری شریک حیات تھیں اور ان کا ایک طویل عرصہ امین صاحب کی رفاقت میں گذرا تھا۔ دو ماہ قبل گھر ہی میں گر جانے سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فریش تھیں۔ مرنا تو سب ہی کو ہے آج یا کل۔ فنا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ لیکن امین صاحب کی بیگم مرحومہ کے سلسلے میں افسوسناک ترین واقعہ یہ ہے کہ چند ہی روز قبل امین سلونوی صاحب کے کولہے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اور تین روز قبل ہی ان کا آپریشن میڈیکل کالج میں ہوا تھا اور ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ انھیں اس حادثۂ جانکاہ کی خبر دی جا سکتی۔ اس لئے ان کے علم میں لائے بغیر ان کی رفیق حیات کو ۷ مئی ۸۳ء کو بعد نماز ظہر عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرحومہ کے تین اولادیں ہیں۔ جن میں سے دو ممالک غیر میں ہیں۔ صرف حسین اسلمہٗ یہاں موجود تھے۔ اللہ پاک امین صاحب اور ان کے صاحبزادگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ شریک غم (نسیم انہونوی)

اچانک ان کا سر چکرانے لگا۔ یا خدا۔ کیا ہو رہا ہے مجھے۔ کس نے کہا ہے اس سے کہ۔ میری بیماری کی وجہ وہ ہے۔ نہیں نہیں یہ کس نے جانتے بوجھتے مجھے موت کے منہ میں جھونکا ہے۔؟۔

اپنے پسینے میں تر بتر جسم کو انہوں نے بستر پر گرا دیا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگے۔!

شہابی اتفاقاً ادھر آنکلی۔ اپنے ڈیڈی کو کسی اور عالم میں دیکھ کر اس نے چیخیں مارنی شروع کر دیں۔ اور پل بھر میں گھر بھر جمشید کے کمرے میں اکٹھا ہو گیا۔

شہابی نے ایک ملازم کو حمید کے گھر دوڑا دیا۔ دوسرے کو بھگایا کہ وہ ڈاکٹر کو لے آئے۔!

غضنفر نے کاغذ کا وہ پرزہ شہابی کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی حالت غیر ہو گئی۔!

"یہ کیا ڈیڈی۔؟" وہ بھی چیخی۔ "کیا وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کیوں چلے گئے۔ ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ یہ کیا ہوا۔؟"

"نہیں معلوم بیٹی۔" غضنفر کے آنسو ان کے گالوں پر بہہ نکلے شہابی نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔!

گھر کی فضا ایک بار پھر کشیدہ ہو گئی۔!

تاثرات بھی تو ایسے ہی تھے۔ آنکھیں گیلی، ہونٹ مرتعش، رنگ پر حمید میاں جو ناشتے کی میز پر بیٹھ چکے تھے وہ یکبارگی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ اور نوشینہ کے چاروں لڑکوں نے اس کے اطراف ہالہ سا بنا کیا ہوا بھئی" حمید نے پوچھا "تم رو رہے ہو کیا۔ صبح صبح گھر۔ کپڑوں میں۔۔۔!"

"پھوپھا جان" جمشید کے منہ سے نکلا اور دوسرے لمحے وہ پھر پڑا۔

"بڑے بھیا کیسے ہیں؟" نوشینہ کچھ اور سمجھی اور چیخ اٹھی۔

"وہ۔ وہ اچھے ہیں۔ پھوپھی جان۔ مگر۔ مجھے۔ چچی جان نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ۔ مم۔ میں۔" وہ بات پوری نہ کر سکا۔

نوشینہ نے اطمینان کی سانس لی۔ اور بڑا سا منہ بنا کر بولی "ان کی بات بے کار کرتے ہو۔ انہوں نے کبھی تم کو نظر بھر کے دیکھا بھی ہے۔ ہمیشہ سے بھابھی نے سب کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ ہائے ہائے کرتی قبر میں پہونچ گئیں۔ ابا جان کو دق لگا دی۔ بڑے کا کلیجہ نوچا کیں۔ اور جبھی سے تو باپ مارے کی دشمنی باندھی ہے۔ بڑے بھیا ہمیشہ منع کر دیتے ہیں ورنہ میں تو ان کے ہوش ٹھکانے لگا دوں"

"اچھا امی پہلے جمشید صاحب کو ڈھنگ سے ناشتہ تو کرا دیجئے" نے کہا۔ "ان کی کہانی بعد میں سن لیجئے گا۔"

"ہاں ہاں۔ چلو یار آؤ۔" حمید نے کرسی پر بیٹھ کر نیپکن اپنے زانو پر پھیلاتے ہوئے بولے۔ "اول طعام بعدہٗ کلام۔ جلو آؤ۔"

نوشینہ نے سب کے ساتھ جمشید کو بٹھا لیا۔

"ہاں اب کہو۔ اطمینان سے کھاتے بھی رہو اور بولتے بھی رہو۔ کیا
ت تھی۔ ایسی بدحواسی سے بھاگے آئے ہو۔" حمید نے کہا۔
"میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ پھوپھی جان" جمشید نے گلوگیر لہجے میں
ہا اور پوری روداد سنادی۔
"میں تو ہمیشہ سے دیکھتا آرہا ہوں" حمید نے پرنفرت لہجے میں
ہا "تم کو وہ محترمہ نجانے کیوں اپنی راہ کا پہاڑ سمجھتی ہیں۔ خیر۔ اب کیا
واہ ہے۔ تم میرے پاس رہو گے۔ کیا میں پاس، عامر سے تم کو کم سمجھتا
ں۔ میں آفسر سے پوچھوں گا۔ انہوں نے تمہارے ایڈمیشن کا کیا
ندوبست کیا ہے۔ یہیں رہ کر لا کر لینا۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟"
نجانے چچا جان پر میرے اس فرار کا کیا اثر ہوگا۔" جمشید نے کہا
وہ جب بھی غضنفر کو چچا جان کہہ کے مخاطب کرتا، نوشینہ کے دل
۔ موگری سی چل جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بھائی کو موردِ الزام ٹھہراتی
ن کی ذرا سی بزدلی اور کم ہمتی نے تو گویا بنیاد کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی
کھ دی تھی۔ اور ان تمام برسوں میں حالات کی جو عظیم الشان دیوار
ٹھی تھی وہ بھی ٹیڑھی تھی۔ اب اس کا سیدھا ہونا بڑا مشکل کام تھا۔
نوشینہ نے بارہا سوچا تھا کہ حمید کو اپنا رازدار بنالے مگر وہ بھائی
ی مرضی کے خلاف نہ جا سکی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر کسی روز بھی
بھی جمشید کے راز کا بم پھٹے گا تب سب کے ساتھ وہ بھی حیرت کے
ظہار میں پیچھے نہ رہے گی! ۔ اور بس۔
"پھوپھا جان۔ آپ کسی نہ کسی طرح چچا جان کو مطلع کر دیجئے گا کہ
میں آپ کے پاس ہوں۔" جمشید نے حمید سے کہا۔ "وہ پہلے ہی اختلاج

تھوڑی دیر بعد گھر میں پھٹ پڑنے والے بم کے دھماکے سے
وہ بے خبر نہ تھی۔!
غضنفر نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا کہ ماحول کچھ غیر فطری
سا ہے۔ سامنے میز پر ناشتے کھانے کا سامان جوں کا توں رکھا
ہوا تھا۔ اس کے جوتے اسٹینڈ پر دھرے تھے۔ برش میز پر پڑا
تھا۔ دراز آدھی کھلی آدھی بند۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ گھوم
رہا تھا۔ اور اوپر اسٹینڈ پر رکھا ہوا نیلا ٹرانسفارم بھی آن تھا۔
انہوں نے ناگوار انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دراز بند کیا
پنکھا آف کیا۔ اور ٹرانسفارمر بجھایا۔ پھر مڑ کر تاسف انگیز نگاہوں
سے ناشتے کی میز کو دیکھنے لگے۔!
"لڑکوں کے مزاج میں بھی نفاست اور سلیقہ چاہئے۔" انہوں
نے زیر لب کہا۔ "ملازم کو ناشتہ بڑھانے کی تاکید بھی نہیں کی
تھی۔!"
دفعتاً ان کی نظر کاغذ کے اس پرزے پر پڑی۔ جو پیپر ویٹ
کے نیچے دبا ہوا تھا۔
"دری کا بل ہوگا شاید۔" انھوں نے اسے کھینچا۔ تحریر پر
نظر پڑی اور چہرہ متغیر ہوتا دکھائی دیا۔ پرزہ ان کی انگلیوں
میں لرزنے لگا۔ اور آنکھوں کے نیچے رنگین ترمرے تلملانے لگے
انھوں نے جلدی سے کرسی کا سہارا لے لیا۔
"میرے پروردگار! یہ کیا۔ یہ چلا گیا وہ۔ کہاں گیا ہے۔ اُو
معبود! کوئی شاخسانہ میری چھوٹی تقدیر کا اور باقی ہے۔؟"

بات چیت چل رہی ہے اور ہمیں کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔ لیکن جناب آپ صاحب زادے سمیت تشریف ضرور لایئے گا۔ ہم بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کریں گے۔!"

"میں ضرور آؤں گا۔ معافی چاہتا ہوں صفدر صاحب اور افشاں تم بھی برا مت ماننا۔ دراصل گھر کا موقف ایسا نہیں ہے۔ ورنہ میں بڑی خوشی سے آپ لوگوں کو اپنے پاس ٹھہراتا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" صفدر نے کہا۔

شہابی نے چلئے اور لوازمات بھجوا دئے تھے۔ افشاں اور صفدر چائے کے بعد رخصت ہو گئے۔!

غضنفر اکیلے بیٹھے افشاں اور اس کے شوہر سے اچانک ملاقات پر خوش ہوتے رہے۔ ان کا سارا اضمحلال دور ہو چکا تھا۔ ایک ایک بات انہیں یاد آتی رہی۔ اچھی بری یادوں کا ایک قافلہ سارواں دواں تھا۔ پھر وہ اٹھے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا جمشید واپس آگیا کہ نہیں، اس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔!

ان کا رخ باہر کی طرف دیکھ کر سیما کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تو کچھ دیر پیشتر ہونے والے عجیب سے ڈرامے ہی کو حیرت و تعجب سے دیکھتی رہی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح اس کا ذہن عجیب و غریب اوہام کے جال بننے لگا تھا۔! غضنفر اور ان کے دیرینہ ملاقاتیوں کی گفتگو اچھی طرح اس کے پلے نہ پڑی تھی! اب غضنفر کو جمشید کے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر بے خبر سوتی بن گئی۔!

کے بیمار ہیں۔ نجانے اب کیا اثر لیں گے۔"

"اول تو تمہارے چچا جان ہی عجیب جو ہے ہیں۔" حمید نے کہا

"ڈیڈی آج کل کے ترقی پسند جدید چوہے بھی آدمی سے نہیں" عامر بولا۔ "پہلے آہٹ پر بھاگتے تھے۔ اب سامنے سے آتے جاتے ہیں بھی نہیں ہچکچاتے۔"

ناشتے کے بعد حمید اپنے آفس جانے کے سلسلے میں اٹھ گئے۔ فری تھے۔ وہ ماں کے ساتھ جمشید کو گھیر کے بیٹھ گئے۔ اور طرح طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن وہ بدستور اداس اور مغموم رہ رہ کر اسے غضنفر کا خیال آتا۔ سیما کا دل شکن سلوک پھانس بن جاتا۔ اپنی دربدری کا خیال آجاتا اور طبیعت پر پھر افسردگی کا غلاف جاتا۔ نوشینہ نے اسے سونے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن نیند کہاں کی؟ آرام دہ تنہا کمرے میں پڑا ہوا وہ اپنے مستقبل کی بھیانک تصویریں دیکھتا۔

کئی دن کے مسلسل ترشح کے بعد آج مطلع صاف ہوا۔ غضنفر کمرے میں بند پڑے پڑے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے دھوپ میں کرسی نکلوائی اور پیروں پر رلائی ڈال کر برآمدے کی نرم دھوپ میں بیٹھے۔! دونوں لڑکے انھیں ٹھیک دیکھ کر اپنے کام سے جا چکے تھے۔ شہابی اپنی باسکٹ اٹھا کر باپ کے پاس دہلیز میں آبیٹھی۔ اور سویٹر بننے لگی۔!

عضنفر اسے بہت چاہتے تھے۔ ان کے خاندان میں وہ ایک لڑکی
ا۔ نوشینہ، مظفر اور نوبی کے یہاں لڑکوں کی "پیداوار"
دہ تھی۔ چوں کہ اتنے لڑکوں میں وہ تنہا لڑکی تھی۔ لہذا قدرتی طور
پا اور پھوپھیوں کی پیاری بھی تھی۔ ! نوشینہ نے یاسر کے لیے اسے
ے بھی رکھا تھا۔

عضنفر نے ایک محبت پاش نظر اس پر ڈالی اور سوچنے لگے۔ اب اسے
بار کا کر دینا چاہیے۔ سترہ سال کی ہو چکی تھی۔ ان کی موت وزیست
ب کوئی بھروسہ نہیں۔ موت نے وارننگ تو دے ہی دی تھی ! کیا
اگر اسی زبردست اختلاجی دورے نے انہیں موت کے گھاٹ اتار
ہوتا۔ تب۔ شہابی کا مستقبل غیر محفوظ تھا۔ سیما شاید اپنے میکے کے
عزیز کے گھر جھونک دیتی۔ نوشینہ وغیرہ سے سیما کو خاص انس نہیں
۔ بلکہ شادی کے بعد اس نے خالہ زاد بہنوں کے رشتے ختم کر کے خالص
بھاوج کے روایتی ناطے مقرر کر لیے تھے۔ پہلے پہل نوشینہ اور نبیلہ نے
ں دھیان نہیں دیا۔ مگر سیما کے بار بار کے مغائرانہ سلوک نے انھیں
کا دیا۔ اب نوشینہ ہی بھائی اور بچوں کی محبت میں رہ رہ کے بھاگ
تھی۔ مگر نبیلہ کو تو علانیہ بھاوج سے بغض تھا۔ وہ بہت کم آتی اس
نے بھی اپنے ننھیالی عزیزوں سے زیادہ مانوس نہیں تھے۔ !
یاسر پڑھا لکھا بے حد ذہین اور خوب صورت لڑکا تھا۔ باپ کی شرافت
ں کے حسن کا مجموعہ۔ عضنفر کو وہ بے حد پسند تھا۔ ! وہ صرف حمید کے پیغام
ے کے منتظر تھے ! ویسے تو حمید اور نوشینہ بار بار یاسر و شہابی کا ساتھ
تھ نام لیتے تھے۔ لیکن حمید نے باقاعدہ پیام نہیں دیا تھا۔

" انتقال ہو گیا باجی کا۔ ہائے۔ وہ مر گئیں " افشاں کے
آنسو پھر بہنے لگے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ درحقیقت عضنفر
کا دل بھی بھر آیا تھا۔ آج تک اتنے سچے دل سے کہکشاں کی موت
پر کس نے آنسو بہائے تھے۔ ؟
تھوڑی دیر بعد افشاں ہی بولی:
" ہائے میں کیسی کیسی خوشی چلی تھی۔ دل میں ہزاروں باتیں
سوچ رہی تھی۔ کہ اچانک باجی مجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوں گی
یہ مجھے کیا معلوم تھا کہ باجی کا داغ بھی مجھے لگے گا۔ !"
" بڑا افسوس ہوا۔" افشاں کے شوہر نے کہا۔ " ان
سے آپ سب کا تذکرہ سنتے سنتے میں بھی آپ لوگوں کا نادیدہ
مدّاح ہو گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو اب ان کا بچہ۔ کہاں ہے۔"
" ہاں عضنفر بھائی۔ اسے بلوائیے۔ اسی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی
کر لوں۔ باجی کی نشانی کو اپنے سینے سے لگا لوں۔"
" اس وقت وہ اپنے ایڈمیشن کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے"
انھوں نے کہا۔ " تم کہاں ٹھہری ہو۔ میں اسے لے کر تمھارے پاس
آؤں گا۔ "
" کیا ہم آپ کے یہاں نہیں ٹھہر سکتے ؟ " افشاں نے بڑے
تعجب سے کہا۔
" نی اکال اشوک لاج میں ہمارا قیام ہے جناب۔ " اس
کے شوہر صفدر نے جواب دیا۔ " اور ابھی ہم ایک ہفتہ اور آپ
کے شہر میں رہیں گے۔ دراصل یہاں ایک جگہ لڑکے کے رشتہ کی

نام اور پتہ پوچھا۔ لیکن آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے لاعلمی ظاہر کر دی تھی۔!"

"ہاں کوئی لڑکا تھا۔" افشاں نے کہا۔ "میری عقل مندی دیکھئے کہ میں اسی کو آپ کا نام لے کر مخاطب کرنے والی تھی۔ کچھ آپ کا شبہ ہوا تھا اس پر۔!"

"وہ۔ جی ہوگا۔ جمشید۔ میرا لڑکا ہے۔" غضنفر نے کہا۔ افشاں وفور اضطراب سے کھڑی ہوگئی۔ "لے چلئے نا ہمیں باجی کے پاس۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔؟"

"کیسے لے چلوں تمھیں ان کے پاس۔ افشاں۔" غضنفر نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "ان بیس بائیس برسوں میں بڑا انقلاب آگیا ہے۔ ہماری تو دنیا ہی بدل گئی۔ اب وہ پہلے کے سے حالات نہیں رہے۔"

"کیا ہوا۔؟" افشاں نے سہم کر پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔ نہیں۔ بہن۔" غضنفر نے کہا۔ "تم یہاں نہیں تھیں۔ تمہیں اطلاع بھی نہ دی جا سکی۔ تت۔ تمھاری باجی.... وہ تو۔!"

"وہ کہاں ہیں۔ غضنفر بھائی۔ کیا خدانخواستہ کچھ بیمار۔!"

"دنیا کے دکھوں سے وہ آزاد ہو گئیں۔ افشاں۔ بہت پہلے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ بچے کی پیدائش میں۔!" غضنفر بولے۔!

دفعتہً شہابی بولی۔ "ڈیڈی! پھر آپ نے کہا نہیں کہ میں بی میں کون سے مضامین لوں۔ میں نے سوچا ہے ڈیڈی۔ میں اُردو میں اے کروں گی۔"

"ضرور بیٹی ضرور۔" غضنفر نے کہا۔ "ہم تمہیں آگے ضرور"

"لیکن ممی تو کہتی ہیں کہ مجھے اب کالج نہیں جانے دیں گی" نے کہا۔ "آپ ممی کو سمجھائیے ڈیڈی۔ میری تمام سہیلیوں نے بی۔ میں داخلہ لے بھی لیا ہوگا۔ میں ان سے پیچھے رہ جاؤں گی۔"

"آرام سے چھٹیاں گزارو بیٹی۔ داخلہ بھی مل جائے گا۔"

"آپ تو منع نہیں کریں گے ڈیڈی۔ ممی کہیں آپ کو بھی سکھا نہ دیں۔"

غضنفر کو ہنسی آگئی۔ "ہم کسی کے بہکائے میں نہیں آتے تم"

ایک طرف سے سیما نکلی، اس کا دل طوفان سیل بنا ہو نجانے جمشید کی فرار کا ان پر کیا ردِّعمل ہوگا۔ اب اسے خوف محسو تھا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑیں۔ ابھی ان پر شدید دورہ پڑ چکا ہے نہ کرے اگر پھر ویسا ہی دورہ پڑا تو پھر۔ کیا وہ خود کو معاف کر سکے لیکن نہیں۔ باپ کی جان سے بڑھ کر بیٹی کی آن ہے۔!!

اسے دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئے۔ سیما نے اپنی عادت خلاف بڑے نرم لہجے میں غضنفر سے پوچھا:

"دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیے گا۔ بتا دیجئے۔ تاکہ میں پک"

شہابی دل ہی دل میں متحیر ہوئی۔ غضنفر نے بڑے تعجب سے دیکھا۔ ان کے لبوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ اتنی طنزیہ تھی

ے بھی ہوئی جھنجھلا بھی گئی۔

"تم پکاؤ گی؟" غضنفر نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے میں نے کوئی نئی بات کہہ دی ۔" سیما نے بھنا کر کہا۔

"نئی بات تو ہے۔ بھلا تم اور میرے لیے تکلیف کرو۔" غضنفر نے اور ہاتھ بڑھا کر نیچے فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کیس اور دیا سلائی کی یہ اٹھالی۔

"بتایئے نا؟" سیما نے کہا۔ شاید اس طرح وہ اپنے دل کی جان چھپانا چاہتی تھی۔

"ڈیڈی۔ آپ کو ڈاکٹر صاحب نے منع کیا تھا۔" شہابی نے نا کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "سگریٹ مت پیجئے ڈیڈی۔!"

"اچھا بی بی۔" وہ مسکرائے اور پھر سیما کی طرف دیکھنے لگے۔ برسوں گزر گئے کوئی خاص چیز کھائے بغیر۔ آج بھی وہی کھاؤں گا جو ہمیشہ کھاتا ہوں۔ دو روٹیاں اور تھوڑا سا آملیٹ۔" پھر انھوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ سیما کھڑی ہیں یا چلی گئیں۔ شہابی سے کہا "تو بیٹی۔ تم نے مضامین کا انتخاب کیا؟ فارسی اور نفسیات ضرور لینا۔ مجھے دونوں مضامین بہت پسند ہیں۔ مجھے تو پڑھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ میں نے سائنس پڑھی تھی۔"

وہاں ملازم لڑکا آیا۔ "سرکار۔ باہر کوئی صاحب اور ایک خاتون ئے ہیں۔ آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ کیا کہہ دوں۔؟"

"خاتون؟" سیما نے کان کھڑے کیے۔

"صوفہ پر بیٹھو۔ افشاں۔" غضنفر نے کہا۔

وہ صوفہ پر جا بیٹھی۔ اور اپنے شوہر کا تعارف کرایا۔

"لیکن تم تو اس طرح گئیں کہ پھر اپنا کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا۔" غضنفر بے حد خوش تھے۔ غیر شعوری طور پر کئی برسوں پہلے کا ماحول ان کے ذہن میں زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اسی ماحول میں چلنے پھرنے لگے تھے۔!

"جی ہاں۔" افشاں نے کہا۔ "مجھے خالہ جان ساتھ لے گئیں۔ کئی بار سوچا تھا کہ ایک بار پھر واپس آؤں گی۔ مگر خالہ جان اتفاقی حادثے میں چل بسیں۔ میری شادی ہو گئی اور پھر۔ کھیتی باڑی کے چکر، بچے بالوں کی جھنجھٹ میں گاؤں سے نکلنا ہی نہ ہوا۔"

"ہماری یاد بہت دلوں بعد آئی تمھیں!" غضنفر نے کہا۔

"نہیں غضنفر بھائی۔ آپ کی یاد تو دم کے ساتھ تھی۔ کون سا دن جاتا تھا کہ آپ سب لوگ یاد نہ آئے ہوں۔" افشاں نے کہا پھر بے حد اشتیاق سے پوچھا۔ "بتائیے۔ باجی کیسی ہیں۔ آپ کے کتنے بچے ہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "باجی کو مت بتائیے گا کہ میں آئی ہوں۔ یکبارگی میں سامنے جا کھڑی ہوں گی۔ بکا بکا رہ جائیں گی۔ ڈرپوک تو ویسے ہی ہیں۔"

غضنفر نے سر جھکا لیا۔

اتنے میں افشاں کے شوہر نے کہا:

"ہم صبح کو بھی آئے تھے۔ جناب۔ اور ایک صاحب سے آ کر

صاحب کو بھی جانتے ہیں ؟

"سید صدیق حسن صاحب ؟" غضنفر کی ہتھیلیاں پسیجنے لگیں انھوں نے بصد دقت کہا۔ "جی ہاں۔ م۔ میں انہیں جانتا ہوں۔"

اور — پھر عجیب سی بات ہوئی۔

عورت نے یکبارگی گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ کر ان کے زانو پر سر رکھ دیا۔ اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔! غضنفر کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ کیا معمّہ تھا یہ۔! لیکن جلد ہی یہ معمہ حل ہو گیا۔!

عورت نے اپنا آنسوؤں سے تربتر چہرہ اٹھایا اور سسکیوں میں بولی:

"غضنفر بھائی۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ ؟"

سوچ رہا ہوں۔ میں نے آپ کو اس سے پہلے کہاں اور کب دیکھا تھا؟ —" وہ ہکلائے۔ بری طرح گھبرا گئے تھے۔!

"غضنفر بھائی۔ آپ اپنی افشاں کو بھول گئے۔"

"افشاں؟ ۔ تم ڈولی کہلاتی تھیں۔" حیرت و مسرّت کے جذبوں نے ان کی زبان گنگ کر دی۔

"جی ہاں۔ میں وہی آپ کی ڈولی ہوں۔" افشاں نے کہا پھر وہ گریۂ و تبسم کے سنگم پر مسکرائی اور سیدھی ہو بیٹھی۔ "نہ پوچھئے کہ آپ کی تلاش میں ہم نے کل سہ پہر سے رات تک اور آج صبح سے اس وقت تک کتنے دروازوں پر دستک دی اور کتنے لوگوں سے پوچھا ہے کہ ان کا نام محمد غضنفر تو نہیں ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔!"

"کون لوگ ہیں؟" غضنفر نے لڑکے سے پوچھا۔

"جی سرکار۔ میں تو آپ کے پاس آنے والوں کو پہچانتا ہوں دونوں کوئی نئے لگتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ رات کی گاڑی سے آئے اور صبح سے آپ کا پتہ پوچھتے پھر رہے ہیں!"

"کیا قصّہ ہے؟" غضنفر نے زیر لب کہا اور پھر لڑکے سے! "جمشید میاں سے کہو وہ تفصیل سے پوچھ کے مجھے اطلاع دے جاؤ۔!"

سیما تیزی سے مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہاں سے چل د لڑکے نے کہا "جی بھیا اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ حضور، میر ہی کے پاس گیا تھا۔"

"اچھا۔" غضنفر نے کچھ کراہ کر کہا۔ "تم ان لوگوں کو دیوا میں بٹھاؤ۔" پھر شہابی سے بولے "بیٹی تم ذرا چائے وائے بن بھجوا دو۔ میں خود دیکھتا ہوں۔ اف فوہ۔ مجھ میں تو جیسے اٹھنے چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ معلوم نہیں۔ ایک ساتھ لڑکے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔!"

"میں آپ کو پکڑ کے لے چلوں ڈیڈی؟" شہابی اپنی با ایک طرف رکھ کر اٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں بیٹی۔ جاتا ہوں آہستہ آہستہ۔"

یہ کہہ کر غضنفر باہر کی طرف مڑ گئے۔

سیما کے کانوں میں ملازم کا کہا گونج رہا تھا:

کوئی خاتون غضنفر سے ملنے آئی تھیں۔ اس کی دانست

غضنفر کی ساری زندگی ہی ملوث رہی تھی۔ اب بھی اسے چین نہیں پڑا
اپنے شوہر کو اپنی باتوں کے ثبوت کے طور پر رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی
ی۔ لہٰذا جیسے ہی شہابی باورچی خانے میں گئی اور غضنفر نگاہوں سے
جھل ہوئے۔ وہ بھی باہر برآمدے سے نکل کر دیوان خانے کے دروازے
پہنچ گئی اور پردہ ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا۔!

ملازم لڑکا نووارد ملاقاتی اور ان کی ہمراہ خاتون کو ڈرائنگ روم
ں بٹھا گیا تھا!۔ خاتون نے نقاب الٹ رکھی تھی اور ان کا چہرہ
دروازے کے عین سامنے تھا۔ سیما کی نظریں اس کے چہرے پر
یں اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔!

کیسا جانا پہچانا چہرہ تھا؟ کس کا چہرہ تھا ایسا؟ اور پھر اس کی
ذہن پر سے گویا ایک پردہ سا اٹھ گیا۔ جمشید میں اور اس اجنبی
رت میں کتنی قریبی مشابہت تھی۔! اگرچہ کہ عورت شباب کی حد
ے آگے بڑھ چکی تھی لیکن اس کا نم آلود چہرہ جمشید کی شکل سے
بنا ملتا جلتا تھا۔!؟

کیا یہ اس کی ماں تھی؟ ۔ سیما بے خبر سی اسے تکے جا رہی تھی
دفعتاً سامنے دروازے سے غضنفر آتے دکھائی دیئے۔ اور نووارد
قاتی ان کی تقدیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔!

"السلام علیکم جناب۔!" ان صاحب نے سلام کے بعد مصافحہ
لیے ہاتھ بڑھایا۔

"وعلیکم السلام۔" غضنفر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے
ے اخلاق سے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیے۔"

خاتون کی موجودگی میں وہ کچھ جھجک رہے تھے اور محسوس کر رہے
تھے کہ وہ نجانے کیوں بڑے غور سے ان کا چہرہ تک رہی تھی۔!

"فرمایئے۔ جناب والا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟" جب
وہ لوگ بیٹھ چکے تو غضنفر نے بڑے تکلف سے پوچھا۔

"معاف کیجئے صاحب۔ آپ کو زحمت دیتا ہوں۔" ملاقاتی نے
کہا۔ "بات در اصل یہ ہے کہ ہم حیدرآباد میں نووارد ہوں پہلی
مرتبہ یہاں آیا ہوں۔ لہٰذا یہاں کے مقامات اور اشخاص سے
بھی میری ناواقفیت قابلِ معافی ہے۔!

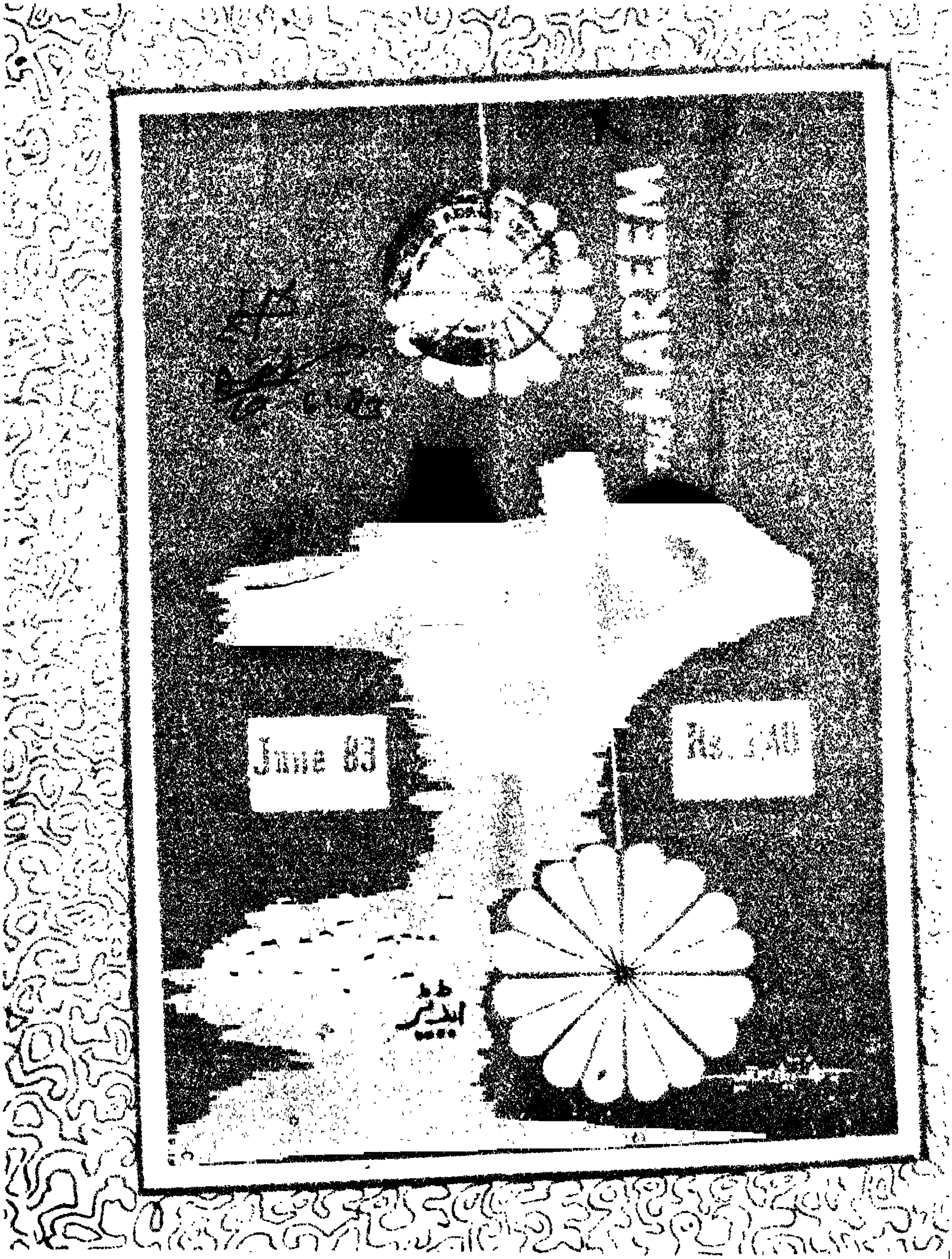
ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" غضنفر بے وجہ کھنکھار کر بولے۔ "پھر
بھی۔ فرمایئے۔ کوئی دشواری درپیش ہے۔ یا پھر۔!"
اجنبی نے بھی خواہ مخواہ گلا صاف کیا اور کہا:

"یہ۔ میری بیوی ہیں۔"

"جی۔!" غضنفر متعجب ہو گئے۔ انھوں نے پہلی دفعہ نظریں
اٹھا کر عورت کو دیکھا۔ اور دفعتاً اس کے چہرے پر ہلکا سا سایہ پھیل
کر معدوم ہو گیا۔!

"ہمیں محمد غضنفر نامی ایک صاحب کی تلاش ہے۔" اجنبی نے
کہا۔ "ہم اور یہ کل سے اب تک مختلف مکانوں پر دستک۔۔"

"ایک محمد غضنفر تو میں ہی ہوں۔" وہ مسکرائے۔ "لیکن میں
یہ نہیں بتا سکتا کہ آپ کو اس شہر میں کسی خاص محمد غضنفر کی تلاش ہے؟"
دفعتاً عورت نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ بڑی کانپتی ہوئی
آواز میں اس نے پوچھا تھا۔ "سچ بتایئے۔ آپ سید صدیق حسین..."


June 83

ماہنامہ حریم

گذشتہ ۵۰ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں

ہندوستان کا سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم اہنوذی و شفیق النساء بیگم سلیم اہنوذی مرحوم

جلد (۵۰۳) — فہرست مضامین ماہ جون ۱۹۸۳ء — نمبر (۶)

ایڈیٹر و نگران: نسیم اہنوذی

معاونین: ملکت جہاں بیگم غزالہ —— جمالی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اندرونی خریداری	فی پرچہ ۲ روپے	سالانہ ۲۲ روپیہ
[illegible]		[illegible] روپیہ
[illegible]		[illegible]

[illegible]

- حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
- حریم ہر انگریزی مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے لئے [illegible]
- [illegible]

[illegible]

لکھنؤ

حلاوتوں لطافتوں اور نزاکتوں کا شہر ہے

اور اس شہرِ نگاراں میں بھی بخشی کمپنی کی محافظ صحت ادویات

حسن افزا مصنوعات آپ کو بآسانی حاصل ہو سکتی ہیں

قلب شہر کے علاوہ اتر پردیش کے مرکزی

شہروں میں بھی بخشی کے اسٹاکسٹ موجود ہیں۔

اپنے قریبی بخشی اسٹاکسٹوں سے

اپنا پسندیدہ **سرمہ نور نظر - سندری سہاگ** تیل

اور **اکسیر اعظم ڈراپس** وغیرہ

آسانی سے حاصل فرمائیں

ایس اے بی بخشی کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۲۲۵ ۱۲ کلکتہ ۱

اسٹاکسٹس:

لکھنؤ - اشتیاق حسین رضوی اینڈ سنس ——— مولوی گنج لکھنؤ

اسلامی بک ڈپو ——— مسجد چڑائی ——— امین الدولہ پارک لکھنؤ

کانپور - ناظم علی صدیقی ——— ۶۷ ریل روڈ ——— جمن ... ——— کانپور

لمعات

یو۔پی حکومت کے محکمۂ محنت نے ایک جائزہ حال ہی میں لیا تھا، جس کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا تھوڑا سا اقتباس، میری بہنوں کے ملاحظہ کے لئے نقل کر رہا ہوں۔

کان پور۔ ۱۱ رمئی۔ اتر پردیش میں ملازمت کرنے والی ہر ۳ عورتوں میں سے کم سے کم ایک عورت کو ہر روز اپنے مرد ساتھیوں کی طرف سے کی جانے والی چھیڑ خوانی کا واسطہ پڑتا ہے۔ ان عورتوں نے اپنے مرد ساتھیوں کی طرف سے محبت کے پینگ بڑھانے کی بات تسلیم کرتے ہوئے بتایا کہ بعض اوقات ان کے افسران ان سے بے تکلفانہ تعلقات قائم کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اور ان کی کارکردگی ان کے ردعمل کی روشنی میں جانچی جاتی ہے۔

یہ حقائق حال ہی میں اس جائزے کے دوران روشنی میں آئے ہیں ریاستی محکمۂ محنت نے تعلیمی اداروں، ٹیلی فون کمپنیوں، صحت کے شعبوں، نرسنگ پیشہ، انتظامی دفاتر اور سرکاری زمرے کے کارخانوں کی خاتون ملازمین کے کام کرنے کے حالات کا لیا تھا۔

اس جائزے کو پڑھ کر یہ نہ سمجھئے کہ یہی بات درست ہے کہ ۳۳ فیصدی ملازمت کرنے والی عورتیں ہی چھیڑی جاتی ہیں۔ یہ تعداد تو وہ ہے جو ملازمت کرنے والی عورتوں کے اقبال کرنے پر لکھی گئی ہے۔ ورنہ تعداد زیادہ ہی ہوگی بلکہ میرے خیال سے سو فی صدی ہوگی۔۔ دراصل ہر عورت ایسی باتیں کرتے اور کہتے، کچھ شرماتی ہے۔ کچھ گھٹی میں پڑی ہوئی مشرقی تہذیب مانع ہوتی ہے۔ وہ نہیں پسند کرتی کہ اپنی رسوائی کی کہانی خود بیان کرے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیشتر لڑکیاں اپنی بے آبروئی کو جو زبردستی کی جاتی ہے، عام کرنا پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ وہ داغ لگ جاتا ہے، اس سے وہ مجبوری واقف ہوتی ہیں اور اس کا غم [illegible] لیکن انھیں ملازمت تو نہیں چھوڑنا پڑتا۔ اگر وہ اس [illegible] اور عدالت تک پہنچے تو بات بہت [illegible] سے [illegible] ملتی ہے۔ اس

لئے یہ ۶۰ عورتیں، جنھوں نے مردوں کی چھیڑ چھاڑ کا اقرار کیا، ایسی عورتیں ہوں گی جو غالباً شادی شدہ ہوں گی اور اپنے شوہروں کی مرضی سے ملازمت کرتی ہوں گی انھیں سماج کی انگشت نمائی کا ڈر کیوں ہونے لگا۔ انھیں شادی کی منزل سے تو گزرنا نہ ہوگا ——— ڈر صرف شوہر کی ہی انگشت نمائی کا ہو سکتا ہے ۔۔۔ لیکن ایسے شوہر جو بیویوں سے ملازمت کراتے ہیں، شرم پروف ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ عورتوں سے قریب رہنے والے مرد، چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو یہ خلاف فطرت ہوگا۔ وہ مرد ہوتے ہوئے مرد کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، اس لئے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی بیویوں کو کن کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہوگا۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ ۹۰ فی صدی عورتوں نے مردوں کے ساتھ کام کرنے کو قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ صرف دس فی صدی عورتوں نے یہ اظہار کیا کہ وہ مردوں کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کا مطلب یہ

. . . .

کہ غیرت و حمیت ابھی بالکل ہی ختم نہیں ہوئی ہے ——— اور میرے خیال سے یہ ایسی کنواری لڑکیاں ہوں گی جو خانگی مجبوریوں کے تحت ملازمت کرتی ہوں گی، اس لئے کہ اگر شوقیہ نوکری کرتیں تو اس ناپسندیدہ عمل کو پسند ہی کیوں کرتیں۔ جن ۹۰ فی صدی عورتوں نے مردوں کے ساتھ کام کرنا پسند کیا ہے ان کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مغربی طرز معاشرت کی پیروی کرتے ہوئے عورتیں جس طرح تفریح گاہوں، بازاروں اور تقاریب وغیرہ میں آزادانہ اور بے باکانہ چلتی پھرتی اور شرکت کرتی نظر آتی ہیں، اس کے پیش نظر انھیں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے میں بھلا کیا تکلف ہو سکتا ہے۔ گھر کی گھٹی گھٹی اور محدود فضا سے نکل کر [illegible] ہے بلکہ جنسی مخالف کی [illegible] اور [illegible] کا لطف بھی [illegible] ہے۔ شوہروں کا عام طور پر خیال ہوتا ہے کہ شادی کے بعد کچھ دن تو بیویاں [illegible] قربان ہوتے رہتے ہیں ——— رفتہ رفتہ بیویاں گھر کی

عورتیں ... ہیں ۔۔۔ اور ... [illegible]
ظاہر کرنے ... مردوں سے ... [illegible]
رکھیں ... [illegible] ۔۔۔ جنس مخالف کی طرف ...
ایک فطری ... ہے ۔ غرض ... [illegible] کے ... [illegible]
پیدا کرتی ہے لیکن اگر جنس مخالف کی طرف سے اسے چھیڑا جائے ... اس
کا اظہار ... کیا جائے تو وہ کہاں تک ضبط کر سکتی ہے ۔۔۔ اور
پھر جب اس کی ... حالت ... ہے تو وہ ... [illegible] ... سے
... [illegible] ... ہے ۔

عورت ... [illegible] ... اگر وہ ... کی
... سے ... [illegible] ... اس کی ...
... [illegible] ... حاصل کرنے کی ... کوشش کرتا ہے
... [illegible] ... اسلام نے ... عورتوں اور مردوں کے
... [illegible] ...

... [illegible] ... تعلیم اور تہذیب کے اثرات ... [illegible]
... [illegible] ...
... [illegible] ... سے زیادہ ... [illegible]
... [illegible] ... اسلام نے ...
... [illegible] ... کی اجازت نہیں دی ...

روس میں اسلام کے نقش قدم پر

روس میں ... [illegible] ... مردوں ... [illegible]
... [illegible] ...
... [illegible] ...
... [illegible] ...
... [illegible] ...

[illegible]

اسلام نے ... حالات کے ... مردوں کو ... [illegible]
کرنے کی اجازت ... [illegible] ...
... [illegible] ... کرنے ... [illegible]
... [illegible] ... کسی دور ... [illegible]
سے ... [illegible] ... کرنے لگے ۔۔۔ اور ... [illegible]
کے سلسلے میں ... اسلام نے ... [illegible]

حریم نہ ملنے یا دیر سے ملنے کی شکایت

ہر ماہ ہمیں ایک ... ایسے خطوط ملتے ہیں جن میں ... کی
شکایت ہوتی ہیں ۔ اکثر بہنوں کی شکایت پر دوسرا پرچہ بھجوانے کے بعد
پہلا بھی مل جاتا ہے ۔ لیکن وہ ایسی آسان نہیں ہوتی ... دفتر کو ... کا
نقصان ہوتا ہے ۔ اکثر بہنیں ہمارے بار بار لکھنے کے باوجود ...
کر لیتی ہیں ۔ حالانکہ ہم تو قصوروار اسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ ہم
پرچہ شائع نہ کریں ہمیں فخر ہے کہ حریم برابر ہر ماہ شائع ہوتا ہے اور
ہندوستان میں اردو کے چند ... رسائل ایسے ہیں جو پابندی کے
ساتھ شائع ہوتے ہوں ۔ ہمیں ... اس کا بھی احساس ہے کہ
شکایات پر جس طرح ہمارا ادارہ ... ہے ، شاید ہی کوئی ادارہ
اتنا خیال رکھتا ہو ۔ اس کے باوجود ... [illegible] ...
الفاظ میں ... خط لکھتی ہیں ۔ ایسی بہنوں سے ہماری درخواست
ہے کہ اگر وہ مطمئن نہیں ہیں تو حریم کی خریداری بند کر دیں ۔

وی۔ پی کا استعمال

گزشتہ ... [illegible] ... وی پی کے ... [illegible]
... [illegible] ...
... [illegible] ...
... [illegible] ...
... [illegible] ...

[illegible] خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو تو
[illegible] روپیہ بھیجے یا ایک کارڈ ہمیں لکھ دیں۔ لیکن اگر ان [illegible]
[illegible] خط سے آگاہ فرما دیں۔ ہم بہر حال ضرور
وصول کریں گے۔ اور اس طرح ہمیں صرف ایک روپیہ [illegible] پیسے
کا نقصان ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ بہتوں نے ہماری اس
درخواست پر عمل کیا یا نہیں اگر نہیں تو ہم وی۔ پی اسی وقت بھیجیں
گے جب کہ خریدار کا خط آجائے۔ سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ
منی آرڈر سے ۲۲ روپیہ بھجوا دیا جائے۔ بلاشبہ بہتوں کو اس میں
دشواری ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے نقصان کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ
ذیل باتوں میں سے کسی ایک پر ضرور عمل پیرا ہوں۔

۱۔ خریداری آئندہ کے لئے منظور نہ ہو تو ایک کارڈ یا بیرنگ خط سے آگاہ فرمائیں۔

۲۔ قیمت سالانہ ختم ہونے پر لکھ دیں۔ آئندہ سال کے لئے وی پی روانہ کر دیا جائے۔

۳۔ سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ فرمانے کی کوشش فرمائیں۔

جہیز کی بھینٹ

جہیز کے رواج کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بہت سی لڑکیاں زندگی بھر کنواری بیٹھی رہتی ہیں بلکہ فلاں فلاں عورت کو جہیز کم لانے کی وجہ سے سسرال والوں نے تنگ کیا۔ اور اس نے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ [illegible] سسرال والے جہیز کم لانے والی اور میکے سے مزید سامان [illegible] لانے والی بہو کو ہلاک بھی کر دیتے ہیں حالیہ [illegible] میں اتر پردیش کے مختلف شہروں سے آئی ہوئی اس قسم کی دو خبریں شائع ہوئی ہیں لیکن ایسے [illegible] واقعات اخباروں کے علم میں نہیں آتے [illegible] واقعات [illegible] ہیں۔ در حقیقت جہیز [illegible]

جہیز طلب کرنا قانوناً جرم ہے۔ لیکن اس جرم کی [illegible] کی جا رہی ہے اور [illegible] کوئی خبر سننے میں نہیں آتی ہے کہ کسی [illegible] شادی کے موقع پر لڑکے والوں یا لڑکی والوں کو اس جرم کے سلسلے میں پکڑا گیا ہو۔ بظاہر پولیس شادی کی خوشی میں رکاوٹ ڈالنے سے پرہیز کرتی ہے۔ اسے مزاحمت اور بدنامی کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ لڑکی والے چونکہ غرض مند ہوتے ہیں اس لئے وہ شکایت بھی نہیں کرتے۔ اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کی زندگی میں جہیز کا معاملہ عدالت کے سامنے جائے ایسے معاملات اخباروں میں یا عدالت کے سامنے تب آتے ہیں جب جھگڑا بہت بڑھ جاتا ہے یا لڑکی کو بری طرح زخمی یا ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

ایسی حرکتوں کے خلاف قانون پہلے ہی سے موجود ہے۔ اسی قانون کے تحت ملزم پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اور جرم ثابت ہونے پر اسے سزا دی جاتی ہے۔ پھر بھی موت کی سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی ہے کسی بہو کو تنگ کرنے پر سسرال والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی اور اسے زخمی کر دینے پر جو سزا دی جاتی ہے۔ وہ محض برائے نام ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ محض قانون کے ذریعے اس لعنت کو ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر یہ لعنت ختم نہیں ہوتی تو اس کے مضر اثرات بڑھتے رہیں گے۔ سماجی اور سیاسی کارکنوں اور مختلف مذاہب کے مبلغوں کا فرض ہے کہ وہ اس لعنت کے خلاف رائے عامہ ہموار کریں۔ اور ان لوگوں کے علاوہ دوسرے ذمہ دار شہریوں کا بھی فرض ہے کہ شادی کی جن تقریبات میں جہیز کا لین دین ہو اس میں شرکت سے انکار کریں یا [illegible] اس کے خلاف احتجاج کریں۔ اگر کچھ لوگ اپنی خوشی سے جہیز دیتے رہیں گے تو دوسرے لوگوں کو بھی زیادہ جہیز دینا پڑے گا۔ اور جو لوگ جہیز نہیں دے سکیں گے ان کی لڑکیاں [illegible] بیٹھی رہ جائیں گی۔ [illegible] قانون کو [illegible] سخت بنانا چاہئے اور جہیز کے سلسلے میں بہو کو [illegible] ہلاک کر دینے کی سزا دوسرے [illegible] کے جرم کی سزا سے [illegible] چاہئے [illegible] زخمی کر دینے کی سزا [illegible] جائے۔

بیت الحرام کی کہانی

مشتاق الحکیم پوری

میں اللہ کا گھر ہوں۔ بیت الحرام۔

لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے اس خالق کائنات کا جس نے اس جہان رنگ و بو میں مجھے اس درجہ اور عظمت سے سرفراز فرمایا جس کا شکر میں قیامت تک ادا نہیں کر سکتا۔

میرا وجود میرے خالق کے حکم اور اس کے فرشتوں کا رہین منت ہے۔ ویسے میری تخلیق اسی آب و گل اور اسی انسان کے ہاتھوں ہوئی جسے میرے معبود نے اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔

دنیا کی ہر شے کی طرح میں نے بھی اپنی تخلیق کے بعد کئی انقلاب اور زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اس میں جو اللہ کا گھر ہوں کئی بار بتوں کی آماجگاہ بنا ہوں۔ میری پاکی اور طہارت کو اللہ کے بھیجے ہوئے اس خلیفۂ ارض نے کچھ بے فرمان بندوں ہی نے سب سے پہلے ناپاک کیا ہے۔ میں نے زندگی کا ایک طویل حصہ جس کرب ناک ماحول میں گذارا ہے اسے میرا دل ہی سمجھ سکتا ہے لیکن شکر ہے اس رب کائنات کا کہ اس نے مجھ پر رحم فرمایا اور اس سے کہیں زیادہ سرفرازی و عظمت عطا فرمائی جو اب تک میں نے پائی تھی ——— یہ اس کے کرم کی انتہا تھی کہ اس نے اپنے خلیل کے ہاتھوں مجھے زندگی کی حرارت بخشی تو اپنے محبوب کے ذریعے پاکی کا نیا پیرہن عطا کیا۔

دنیا کے لاکھوں انسان آج بھی ہر سال ایک مقررہ تاریخ پر لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور میرا طواف کرتے ہیں نیز بیت اللہ ہونے کے ناطے مجھے عظمت دیتے ہیں۔ آج بھی میرے سینے پر اس کے پرستاروں کی جبینوں کے نشانات محفوظ ہیں اور [illegible] [illegible] [illegible] کائنات کے خالق کے دربار میں سجدہ کر کے اس کے جلال کو جہاں [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھا اس کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو جاتا

ہے جو میری پاک سرزمین پر رکھے جاتے تھے تو میں اپنے وجود سے شرمندہ ہوتا ہوں اور میری پیشانی عرق انفعال سے نم ہو جاتی ہے۔

بتوں کی بات پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آپ کو تاریخ کے اوراق میں لے چلوں تا کہ میری آلودگی کے بارے میں سوچنے سے پہلے مجھے آلودہ کرنے والوں کے حقائق تک آپ کی نظر پہونچ سکے۔

سیدنا آدم علیہ السلام جب اپنے خالق کی حمد و ثنا کرتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے تو کرۂ ارض کے اس خلیفہ کے رقیب ابلیس لعین نے سوچا اب موقع اچھا ہے کیوں نہ باپ کا بدلہ بیٹوں سے لیا جائے۔

بعض مصدقہ روایتوں کے بموجب حضرت آدم علیہ السلام کے پانچ بیٹے۔ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جو نہایت نیک صالح تھے جب وفات پا گئے تو ان کی قوم کو شدید رنج ہوا اور وہ انتہائے غم میں ان کی قبر کے گرد بیٹھ گئے اور سب کچھ چھوڑ کر ان پر رونے لگے۔ وہ رات دن بابل شہر کے اس قبرستان میں بیٹھے رہتے دنیا سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہ گیا تھا۔ ابلیس لعین نے جب یہ دیکھا تو ایک روز انسانی روپ میں ان کے سامنے پہونچا اور کہا اگر تم کہو تو ان نیک لوگوں کے بت میں تمہارے لئے بنا دوں ان کی شبیہیں دیکھ کر اپنے دل کو تسلی دے سکو۔ وہ لوگ تیار ہو گئے۔ اس طرح دنیا میں اس ملعون نے سب سے پہلے بت کے پیکر کو وجود بخشا۔ اب کیا تھا مرنے والے مرتے گئے اور ہر معزز و صاحب ثروت کے بت تیار ہوتے گئے۔ ابلیس لعین ان کی شبیہیں بنواتا رہا یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب اس نے عقیدت کے اس جذبے کو پرستش میں تبدیل کر دیا ——— اس کا کام چونکہ اب پورا ہو چکا تھا اور انسان خود شیطان کی راہ پر چل پڑا تھا۔ اس لئے اب وہ اس سے الگ ہو گیا اور صرف رہنمائی کے فرائض انجام دینے لگا۔

بتوں کی پرستش کا باقاعدہ آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے اس قرن بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے [illegible] کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام ان لوگوں تک اللہ کا پیغام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

جاری رہیں آخر اللہ تعالیٰ کا قرآن پر طوفان بنکر نازل ہوا اور سب کو نگل گیا۔

کہا جاتا ہے۔ عرب میں عمرو ابن لحی وہ پہلا آدمی تھا جس نے بت نصب کئے تھے۔ یہ تین سو چالیس سال زندہ رہا اور اس کی اولاد پانچ سو سال میری متولی رہی جس میں آخری فرد کا نام زحلیل تھا

میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تعمیر اس دنیا میں چار بار کی گئی۔ سب سے پہلے مجھے فرشتوں نے اس وقت تعمیر کیا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ زمین پر میرے نام کا ایک گھر بناؤ تاکہ بنی اولاد آدم میں جس پر ناراض ہو جاؤں وہ اس کا طواف کر کے مجھ سے پناہ لے گے۔

دوسری بار مجھے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ تیسری تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور چوتھی اہل قریش نے انجام دی۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس کے بعد میری عظمت اور دین ابراہیمی میں جلد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانے میں بھی میرا تقدس اور احترام اسی صورت رہا لیکن اس کے بعد جب عمرو ابن لحی کا دور آیا تو یہاں شیطان کا سکہ چلنے لگا۔ اور میری حالت ایک مفتوح قلعہ کی سی بنکر رہ گئی۔

میں حد درجہ غمگین رہنے لگا۔ انہیں دنوں میں نے سنا کہ عمرو نے ایک جن کو تابع کر رکھا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ جدہ پہونچکر ان تمام بتوں کو یہاں لے آئے جو حضرت نوح اور حضرت ادریس علیہ السلام کے دور میں پوجے جاتے تھے۔ جن ان تمام بتوں کو لے آیا ـــــ اور یہاں سے میری بدقسمتی کا نیا دور شروع ہوا۔ عمرو بن لحی نے ان بتوں کو میری پیشانی پر بٹھا دیا۔ اور مشہور کر دیا کہ ان بتوں کا جن کے نام حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ اور جنہیں پتھر بنا دیا اور مختلف دعاؤں سے بنا لیا گیا تھا۔ ان بتوں کی پرستش پر آمادہ کیا جا چکا۔ یہ تمام بت مختلف قبیلوں کے خدا بن گئے اور [illegible] نے ود کی۔ [illegible] نے سواع کی۔ مذحج نے یغوث کی۔ مراد نے یعوق کی اور حمیر نے نسر کی پرستش شروع کر دی۔

وقت کی [illegible] زبردست ہوئی ہے اس کا احساس مجھے اب ہوتا [illegible] بیت الحرام ہونے کے [illegible] اور [illegible] شیطان [illegible] [illegible]

کو اقرار کرنے کے بعد اب اس نے اس شہر کی تقدیس کو بھی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساحل سمندر پر اس نے وہیں [illegible] جو غسان قبیلوں کے لئے ایک نئے بت کی کھڑا کر لی تھی جو "مناۃ" کہلاتا تھا۔

ہبل اور نائلہ کے بت میرے سینے پر پہلے ہی بوجھ بنے ہوئے تھے پانچ بت اس کے بعد نصب ہوئے تھے اور اب ہر دن ان میں ایک نیا اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا کتنا سخت امتحان تھا۔

یہ بدبخت ان بتوں کے بارے میں نت نئے افسانے تراشتا رہتا تھا اور نعوذ باللہ من ذالک ان بتوں کو خدا کا شریک ثابت کرنے کے لئے اپنی قوم کے لوگوں سے بتاتا تھا کہ خدا سردی کے زمانہ میں "لات" کے پاس اور گرمی میں "عزیٰ" کے پاس رہتا ہے۔

بت پرستی کی یہ لعنت اب اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ عرب تو عرب دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ایک انسان بھی پکار کر یہ کہہ سکتا۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ،

(شراب بت اور قرعہ کے تیر شیطانی کام ہیں ان سے الگ رہو تاکہ فلاح پاؤ)

میرے جسم کا ہر حصہ ان بتوں کے زخموں سے چور تھا کیونکہ ان [illegible] سالہا بتوں کا نشانہ [illegible] اور صرف [illegible] تھا۔ آخر اس خالق ارض و سما کو اپنے بندوں پر رحم آیا اور اس نے اپنے سب سے محبوب بندے کو سرتاج انبیا بنا کر ریگ دیجور اور کفر و شرک میں ڈوبے ہوئے اس خطہ میں ہدایت کے لئے بھیجا اور ان لوگوں سے فرمایا ـــــ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ

(تمہارے پاس ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں)

اور پھر وقت کی کتاب نے کچھ اور اوراق پلٹے۔ کفر و شرک کی اس وادی سے ایک صدا بلند ہوئی۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ

اس صدا کا بلند ہونا تھا کہ ساری فضا نور و نکہت سے معمور ہوئی۔ اطراف عالم کے ہر ذرے نے حمد و ثنا پڑھتے ہوئے اپنے رب کے حضور سر جھکا دیا اور رسالت کون و مکاں کے پیارے حبیب نے میری پیشانی سے [illegible] سالہا بتوں کی [illegible] یہ کہتے ہوئے اٹھا کر پھینک دیں۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا [illegible] میری [illegible]

[illegible]

چھلنے سے پاک رکھنے کا فکر کیا جانا بہتر ہوتا ہے [illegible] سال [illegible]
[illegible] کی صورت رہ جائے اور [illegible]
[illegible] کی زبان پر [illegible]
چلتی ہے ـــــــ وہ عقیدت کا مرکز ہے [illegible] کرتے ہیں کیونکہ
[illegible] اور اس کے نام سے [illegible] کے طفیل نے بنایا اور
اس کے [illegible] قرار دیا۔

> جس جہاں کو ہے پاکی سے زیبا
> وہ جہاں ہے شان ہوں یا سکینہ
>
> ـــــــ حسن اقبال [illegible]

لطیفے

• دو لڑکے ایک زیورات کی دوکان میں ساتھ کام کرتے تھے ایک دن
ایک نے دوسرے سے کہا مجھے ڈر ہے کہ کسی روز چوری نہ ہو جائے [illegible]
دوکان میں۔
دوسرے نے کہا تم اس کی فکر نہ کرو میں تم کو تنہا چھوڑ کر
[illegible]

• [illegible] کے دوران [illegible] ایک شخص
[illegible] دکان [illegible] اس نے [illegible]
[illegible]
[illegible] معلوم ہوا ہے تمہاری شادی ہو گئی ہے
[illegible]
[illegible]

• [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

سادہ غذا

[illegible] لکھنوی

سادگی سے زندگی اپنی گزارنی ہے بسر
سبزیوں ترکاریوں کی سمت بھی کیجے نظر
ہے مناسب ہم کریں سادہ غذا کا انتخاب
اور اس سادہ غذا میں سبزیاں ہیں لاجواب
آدمی کے واسطے کیا کیا اگاتی ہے زمیں
روپ اپنے کس سلیقے سے دکھاتی ہے زمیں
مختلف سب کا مزہ ہے، مختلف نشو و نما
مختلف ہے شکل و صورت مختلف ہے ذائقہ
[illegible] ایسی کہ انساں کر نہیں سکتا قیاس
ہر طرح کی ہیں غذائیں جس کو [illegible]
مولی اور گاجر سے بھی پڑتا ہے معدے کا [illegible]
اپنی اپنی ہے طبیعت اپنا اپنا ہے مزاج
کوئی آلو پر ہے عاشق کوئی اروی پر نثار
اور چقندر پر کسی کو ٹوٹ کر آتا ہے پیار
[illegible]
[illegible]
جس طرح چاہیں پکائے کوئی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عظمتِ [illegible]

شہناز کنول

1 [illegible] تاریخ [illegible] خود شہنشاہ التمش کے عہد [illegible]
[illegible] ہو جانے کے بعد اس نے بادشاہ سے
[illegible] بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اور پھر امیر جلال خلجی کی پوری
تاریخ التمش کے گوش گزار کی۔ شہاب الدین غوری سے لے کر قطب الدین
ایبک اور پھر التمش کے عہد میں اس کے [illegible] کا ذکر کرکے بولا آپ
کے اس ملک [illegible] کا خیال ہے کہ ایسا شخص کسی طرح بھی قابل معافی
نہیں ہے جس نے سب سے پہلے دو بادشاہوں کو زک دینے کی کوشش
کی جس کی بزدلی نے دشمن کو غالب آنے میں مدد دی۔ اور جو پہلے ہی
سے سزا یافتہ ہے۔ ایسے مجرم کے لئے سوائے گردن زدنی کے اور کیا سزا
مناسب ہو سکتی ہے؟

سلطان شمس الدین التمش مسکرایا اور بولا۔ جلال [illegible]
[illegible] بہادر تھا اور [illegible] کے ہم قائل ہیں۔ لیکن جلال
[illegible] ہم [illegible] کریں گے [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] اس کی [illegible] مستنصر [illegible] محل [illegible]

اس کے علاوہ اس محل میں کنیزوں کی طرح [illegible]
سب کا سلوک [illegible]
خلاف مزاج بات پر مجبور کیا جاتا تھا۔ [illegible]
[illegible] مستنصر جب بھی آتا اس کے ساتھ بہت [illegible]
[illegible] اس کے چہرے پر [illegible]
[illegible]

[illegible]

جلال نے غور سے دیکھا اور بولا [illegible]
[illegible]

[illegible] ایسے خواب کون نہیں دیکھتا —— اور [illegible]
[illegible]

[illegible]

سکتی ــــــ؟

ماہ جمال نے کسمسا کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور بولی "ذاتی طور پر میری حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارے احسان کا بدلہ میرا مالک ہی دے سکتا ہے ــــ!"

"نہیں ــــــ تم بھی دے سکتی ہو" آسنقر نے زور دے کر کہا۔

ماہ جمال نے کچھ وحشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا آج اس کے انداز کچھ اور کہہ رہے تھے۔ وہ ہر بات قطعیت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"آسنقر! [illegible] احسان اتارنا پسند کرے گی؟"

"اس سلسلے میں غور کرنا چاہوں گی!"

"غور کرنے کے لئے تمہیں وقت دیا جا سکتا ہے لیکن انکار کی صورت میں شاید تم نقصان میں رہو۔"

ماہ جمال کی تیوریوں پر بل دیکھ کر آسنقر کچھ گھبرایا پھر ذرا سنبھل کر بولا "دوست تم صرف میری مدد کا وعدہ کرو تمہاری ذات کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ بلکہ میری کامیابی تمہیں جو بلندیاں دے گی وہ آج بھی تیرے لئے خوشگوار ہوں گی وہ کل بھی۔ اور پھر کیا تم یقین کرو گی میری مدد نہیں کرو گی کہ سلطان التمش نے تیرے مالک کو ہلاکت کرنے کے قصور میں ہی پھانسی دلادی ہے"

ماہ جمال کے چہرے پر اچانک زردی چھا گئی۔ جس کو آسنقر کی چالاک نظروں نے واضح طور پر محسوس کر لیا۔ ماہ جمال کا سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ آسنقر [illegible] قریب کھسکنے لگا۔ [illegible] ماہ جمال پیچھے ہٹ کر دیوار [illegible] آسنقر کی طرف دیکھنے لگی۔ آسنقر نے آخری [illegible] سے [illegible] سوچنے کے لئے [illegible] آؤں گا۔ میری بات [illegible] بہتری ہے۔"

[illegible]

ماہ جمال کا احسان اسے ٹھنڈا کر دے گا۔ اچھے اچھے آقا جلال لکھنوی کی موت اسے بادشاہ سے متنفر کر دے گی اور پھر اسے تم ہی خبر دو [illegible] وہی وقت ہو گا جب پیار کی ہر بات وہ مان لے گی! آسنقر نے چمکتی نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے تدبر کا قائل ہو گیا تھا۔

ماہ جمال کو امیر جلال لکھنوی کی موت سے واقعی صدمہ پہنچا تھا وہ رات بھر بے چین رہی۔ بوڑھے جلال لکھنوی نے اپنی مجبوری طبیعت کے باوجود ماہ جمال کے ساتھ ہمیشہ ایک شریفانہ برتاؤ کیا تھا وہ جمال سے اپنے دل کی ہر بات کہہ لیتا تھا ــــ اگرچہ وہ اس کی زر خرید کنیز تھی لیکن اس نے نہ تو اسے فروخت کیا تھا اور نہ اپنے تصرف میں لایا تھا۔ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ پانے کبھی غلط اور غیر فطری نہیں سمجھا تھا۔ اسے جلال لکھنوی سے ہمدردی تھی پھر اسے آسنقر کا خیال آ گیا۔ وہ آسنقر جو جالوں میں اس پر رحم چکا تھا اور وہ ہر لمحہ اس کی ذات سے اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگی تھی لیکن دہلی پہنچ کر وہ خود بخود اس سے دور ہو گیا اور وہ اس ذلت سے پھر بچ گئی جو اس جیسی کنیزوں کا مقدر رہتا۔ وہ آگئی اور مقدر کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئی۔ کوئی ایسی قوت تھی جو بار بار اسکو ہلاکت سے بچا رہی تھی۔

چوتھے روز آسنقر نے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھیجی تو ماہ جمال خود ہی باہر نکل آئی۔ اس کے چہرے پر آج روز پہلے والی پژمردگی نہیں تھی بلکہ سنجیدہ بشاشت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور آسنقر کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ آسنقر فرخ شاہ کی قیافہ شناسی اور مستقبل بینی پر حیران تھا جو ماہ جمال کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچ کر ماہ جمال نے آسنقر کو بٹھایا اور بولی "تو اپنے احسان کا کیا بدلہ چاہتا ہے؟"

"کیا تو نے اچھی طرح غور کر لیا ــــ؟"

"ہاں ــــ میں نے صرف اتنا غور کیا کہ میں تیرے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہوں [illegible] ایک دل [illegible] ہو۔ اس سے پہلے کہ میں [illegible] جاؤں تو مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔"

آسنقر [illegible] خوشی سے [illegible]

کی بھی لیکن بادشاہ نے تیرے ملک کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میری بات کا ثبوت ہے۔ جو حالات تم بادشاہ کے بارے میں محسوس کرتی ہے"

ماہ جمال کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے وہ آہستہ سے بولی۔ جہاں تک میرے ابا کا سوال ہے میرے ساتھ ان کا عمل شریفانہ تھا لیکن اگر وہ بھی غدار وطن اور ملک و قوم کا باغی تھا تو اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ رہ گیا بادشاہ تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں وہ ہے یا کوئی اور آجائے کل قطب الدین ایک بادشاہ تھا آج التمش ہے اور کل کوئی اور بن جائے تب بھی کنیز کنیز ہی رہے گی، اس کا جسم، اس کی روح اور اس کے جذبات کے سودے ہمیشہ ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ بادشاہوں کے نام ضرور بدلے ہیں لیکن انصاف سے بتا کیا ہمارے مقدر بھی بدلے ہیں؟"

"انسان انسان میں بھی فرق ہوتا ہے ماہ جمال۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ میرے [illegible] کی مدد سے بادشاہ اور تیرا مقدر بدل جائے۔

ماہ جمال کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہوگئی وہ بولی "نہیں! میں ظلم کی چکی کا ایک پاٹ نہیں بننا چاہتی۔ تو مجھے باتوں میں مت الجھا۔ جس احسان کا تو بار بار ذکر کرتا ہے اس کا کیا صلہ چاہتا ہے ـــــ میں سمجھ چکی ہوں کہ میری عزت اور عظمت کا آبگینہ ہی تیرا صلہ ہے"

"تو چاہے تو اسے بچا بھی سکتی ہے ـــــ قسنقر نے ہنس کر کہا۔ میرا مقصد تجھ سے کھیلنا نہیں ہے۔ اگر میرے دل میں گناہ ہوتا تو سوچ کہ [illegible] میرے ہی گھر میں رہ کر تو مجھ سے کیسے بچ سکتی تھی۔ میرا مقصد بہت بلند ہے اور اس میں تیری مدد درکار ہے اب یہ تجھ پر موقوف ہے کہ اپنی عزت کو بچا کر میرا کام کر دے"

ماہ جمال نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو قسنقر اس کے قریب آیا اور بولا "تجھے محل میں پہنچانا میرا کام ہے اور وہاں پر سب کو اپنے [illegible] میں لینا تیرا کام ہوگا خاص طور پر بادشاہ کو [illegible] جب چاہوں محل [illegible] سکوں [illegible] مجھ سے اس وقت اتنا ہی چاہتا ہوں" ماہ جمال نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

[illegible] قسنقر نے ان کے لئے [illegible]

قبول کر لیا جاتا ہے۔ الہام سے متعلق ہوا ہے کل [illegible] کیا جائے گا؟

رات کو سلطان التمش نماز سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو ماہ جمال سرخ زرنگار قبا پہنے چہرے پر ایک نقاب ڈالے سر جھکائے کھڑی تھی۔ التمش نے اس کی سرو قامتی پر تعریفی نظر ڈالی اور بولا "ذرا نقاب اٹھا تاکہ ہم تحفہ بھیجنے والے کے ذوق کا اندازہ کر سکیں" ماہ جمال نے تیزی سے رخ موڑا اور نقاب اٹھا دی۔

"ماہ رو... تو ـــــ" التمش کی زبان سے نکلا اور ماہ جمال سکتے سی کھڑی التمش کے چہرے کو گھور رہی تھی اس کے سامنے غزنی کا ساتھی غلام کھڑا تھا ـــ ماہ جمال کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر سرخ قبا کے گریبان میں جذب ہوتے رہے۔ اور اس کا سینہ اس طوفان کے مدوجزر سے قیامت بپا کر رہا تھا۔ التمش نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اور بولا "غزنی کے بازار میں میری آنکھوں کے سامنے ریشم کی [illegible] تھی جانے کن کن ہاتھوں سے پامال ہو کر یہاں تک پہنچی ہے"

ماہ جمال کی آنکھوں سے سمندر ابل پڑا ـــ التمش نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا "ماہ رو! آج تو اپنے ساتھی غلام کے سامنے نہیں بلکہ شہنشاہ ہند کے سامنے کھڑی ہے یہاں فریاد [illegible] نہیں جا سکتی۔

"کس کس کو سزا دو گے ـــ ابو الیم" ماہ جمال نے فریاد کے لہجے میں کہا۔

التمش نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ دے کر اسے اپنے قریب کر لیا اور بولا "ماہ جمال سوداگر کے گھر پر میں نے غزنی ہی میں تجھ سے یہ بات کہی تھی کہ جب ہم بازار میں بکنے کو آگئے تو پھر اپنے آپ کو جنس سمجھ لینا چاہئے اور شاید تجھے یہ بھولنے کی فرصت نہیں کہ غم اور خوشی کا احساس انسانوں کو ہوا کرتا ہے۔ غلام اور کنیزیں کسی کو سزا دینے کے لئے نہیں ہوتے۔ البتہ اس [illegible] پناہ میں ہے۔ آج ملک کے دکھوں کو بھول جا میں کوشش کروں گا کہ تیرے دل سے گناہ کے بوجھ کو ہلکا کر سکوں [illegible] جو تو نے کنیز بن کر جھیلے ہیں ـــ [illegible] میں تیرے ساتھ وہ کون سا سلوک کروں جو تیری نظر میں بہتر ہے [illegible]

ماہ جمال [illegible] گئی [illegible] وہ اپنے غم [illegible]

[illegible] کی [illegible] اس نے [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] کی حالت کے [illegible]

[illegible] ان حالات کا [illegible]

[illegible] نے ایک [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible]

بادشاہ نے [illegible] سے کہا۔ [illegible]

[illegible] بات [illegible]

[illegible] ہم [illegible] گے۔

دوسری طرف [illegible]

کرنے میں لگ گئی۔ شہزادی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے ۔

[illegible] کی سلطنت کے سامنے [illegible]

[illegible] ہے ۔

[illegible] — فرخ شاہ نے اسے گھورا

فرخ شاہ — اختر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا [illegible] میں

[illegible] آنے والے خطرے [illegible] جلال

[illegible] ہے ۔

[illegible] سامنے رکھا ہے [illegible] سے

سازش کھل جائے [illegible] اور نقصان بچ جائے ۔ مجھے کوئی نہیں

جانتا [illegible] سب کے سامنے ہوں —

اختر جوش میں آ گیا — فرخ شاہ [illegible]

[illegible] ساتھ دینے کو تیار ہوا

تھا [illegible] اور ایک بار [illegible]

فرخ شاہ — [illegible] ہیں ۔

[illegible]

ایک [illegible] اختر [illegible] گیا ۔

اختر جس وقت [illegible] ایک تنگ [illegible]

[illegible]

امیر جلال — [illegible]

جلال [illegible] سازش کر سکتا ہے [illegible]

[illegible] سلطان التمش کی حکومت کا [illegible]

ہے وہ بادشاہ کے خلاف سازش کر سکتا ہے اب [illegible]

[illegible] چشم ہے ۔ تیری اس [illegible]

شاہ کا [illegible]

[illegible] خطرے [illegible] جائیں گے ۔ !

[illegible]

[illegible] فرخ شاہ [illegible] جلال [illegible]

[illegible]

[illegible] سلطان التمش [illegible] سازش [illegible]

[illegible] جلال [illegible] ہے — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کر رہے تھے ... [illegible]

بیٹھ گئے ... [illegible] ... اس نے امیر جلال سے

سوال کیا۔ "قرآن کے بارے میں ... [illegible] ... ہمارے پاس آ کے کچھ پڑھے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

امیر جلال ... [illegible]

[illegible]

بادشاہ یوں جیسا سلوک نہیں کرتا بلکہ اس کے ... [illegible]

کے اس ظلم کی ... [illegible]

امیر جلال کو چند روز ان بادشاہ کے سامنے بھی ... [illegible]

بچا سکتا تھا۔ اس لئے دونوں کے درمیان رکھ رکھاؤ ضرور تھا اور کوئی تعلق نہیں تھا۔

اگلے دن علی الصبح بادشاہ نے دہلی کوچ کا حکم دے دیا اور ... کی روانگی ہو گئی۔

رات سے سلطان التمش کا ذہن عجیب الجھن میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ امیر جلال کو یہ جھوٹی خبر کیسے سنائی گئی کہ بادشاہ امیر جلال کو پھانسی کی سزا دے چکا۔ اسے کسی آنے والے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے پرانے قیدی کی رہائی کے احکامات جاری کر دئے۔ لیکن اُسے پتہ چلا کہ قیدی قید خانہ میں نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ بے چین سا ہو گیا۔ وہ ذہنی طور پر کسی سازش سے نمٹنے کی تیاری کر رہا کہ غلام نے آ کر اطلاع دی کہ امیر جلال خلجی باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ بادشاہ چونک پڑا۔ اس نے ایک لمحہ غور کیا اپنے خاص غلام کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ غلام نے آنکھوں کی زبان سمجھ لی اور پھر باریابی کی اجازت دے دی گئی۔ امیر جلال حاضر ہوا اور کورنش بجا لایا۔ بادشاہ نے اس کو بغور دیکھا اور سخت لہجہ میں بولا "جلال خلجی! تو جانتا ہے کہ ہماری قید میں کیوں تھا؟" امیر جلال نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا بادشاہ پھر بولا "نہیں ... [illegible] ... گے۔ تو جانتا ہے کہ ... [illegible] ... ان تینوں جرائم کا ارتکاب کیا۔ لیکن ... [illegible] ... کہ ہم نے تیرے بڑھاپے کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا؟"

"بے شک ... عالی جاہ ... غلام کو اعتراف ہے کہ حضور ... [illegible]

[illegible]

میں ... بھی ... نہیں تھا ... حالات کے تحت بدقسمتی سے بزدلی کا
... لیکن میں شاہی دربار کا خیر خواہ کل بھی تھا اور
آج بھی ہوں ——"

"خیر خواہی کا کوئی ثبوت؟" جلال خلجی کی جرأت سے
متاثر ہو کر بادشاہ نے نرمی سے پوچھا۔

"میری غیر موجودگی میں میری کنیز ماہ جمال یہاں ایک
سازش کے تحت بھیجی گئی ہے۔"

"ثبوت ——؟" شہنشاہ کی زوردار آواز گونجی۔ سب
لوگ گھبرا کر رہ گئے۔

اسی وقت فرخ شاہ اندر داخل ہوا۔ التمش نے حیرت
اور ناگواری سے اسے دیکھا اور بولا۔ "جلال خلجی ہم سے دروغ
گوئی کر کے ہمیں پریشان کرنے کا مطلب سمجھتا ہے ——؟"

"عالم پناہ کا اقبال بلند ہو میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا
نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ لوگ آپ کی عنایات اور نوازشوں
کے باوجود آپ کی رحم دلی اور نرم خوئی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے
ہیں۔ ماہ جمال کو بلوائیے اگر آپ نے اس پر نوازشیں کی ہیں
اور وہ احسان فراموش نہیں ہے تو ساری بات ابھی واضح
ہو جاتی ہے۔ یہ جاسوس سردار فرخ شاہ ہے جس نے قسنقر کی اس
ذلیل حرکت سے مجھے آگاہ کیا جس میں ماہ جمال برابر کی شریک
ہے ——!"

التمش نے نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ جمال کو بلوا لیا۔ قسنقر کا
نام سن کر التمش کو کسی سازش کا یقین ہو چکا تھا کیونکہ اسی نے ماہ
جمال کو جلال خلجی کی ... کی اطلاع بھی دی تھی ——

ماہ جمال جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی امیر جلال کو دیکھ کر
... رہ گئی۔ فرخ شاہ نے مسکرا کر کہا — "ماہ جمال ایک مردہ
انسان کو زندہ دیکھ کر حیران ہے شاید۔" اب ماہ جمال نے ادھر
رخ کیا اور ایک اجنبی کو دیکھ کر بولی۔ "یہ کون ہے اور مجھے
کیوں بلایا ہے ——؟"

فرخ شاہ نے پہلے امیر جلال ... "ماہ جمال تیری
[illegible]

ہے آج میں اسی کا واسطہ دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو شہنشاہ
ہند سلطان شمس الدین التمش اور اس کی اولاد کی خیر خواہ بن کر یہاں
آئی تھی؟"

ماہ جمال کا رنگ زرد ہو چکا تھا وہ ...
کو التمش کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ بادشاہ نے اس کا جائزہ لیا اور بولا
"ماہ رو جواب دے۔ کیا واقعی تو ہماری دشمن بن کر اس محل
میں داخل ہوئی تھی؟"

ماہ جمال اپنے آقا کی حرکت کو سمجھ چکی تھی اس نے سوچا ... آقا کی
خواہش کے لئے عزت کے بدلے جان دینا زیادہ آسان کام ہے۔ اس
نے گردن جھکا کر جرم کا اقرار کر لیا۔

"ماہ رو —— کاش تو اس وقت اپنے جرم سے انکار کر دیتی
تو قصور وار ہونے کے باوجود ہم تجھے معاف کر دیتے۔" التمش ...
لہجے میں بولا۔

بادشاہ کا درد بھرا لہجہ سن کر فرخ شاہ نے کہا۔ "کیا تو یہاں اس
لئے نہیں بھیجی گئی تھی کہ شہنشاہ ہند اور ان کی اولاد کو دشمنوں
کے حوالے کر دے ——؟"

ماہ جمال نے گردن اٹھائی ایک نظر سب پر ڈالی اور بولی۔
"میرے آقا امیر جلال خلجی نے جس مقدس کتاب کا واسطہ دیا ہے اس کے
بعد مجھ پر واجب ہو جاتا ہے کہ میں سچ بات کا اقرار کر لوں۔ لیکن
شہنشاہ ہند سے اتنی گزارش ضرور کروں گی کہ اس سازش کا پردہ
جس بوڑھے ضعیف امیر جلال نے چاک کیا ہے وہ یقیناً ان کا اور
ملک کا بھی خیر خواہ ہے۔"

"ماہ جمال —— مجھے تیری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"
امیر جلال پھنکارا۔ "کہاں ہے وہ تیرا سردار قسنقر جس نے تجھے ہندوستان
کی ملکہ بننے کے خواب دکھائے تھے۔"

"امیر جلال کی کنیز ——" التمش نے پہلی بار اسے کنیز کہہ کر مخاطب
کیا۔ "تو نے ہم سے اپنی طرح کی حفاظت کا وعدہ لیا اور پھر ...
... کر دی۔ تجھے ...
... اور ہمارے وجود کو مٹانے کی کوشش۔ کیا تجھے اقرار ہے کہ جب
سازش ... تھی ——"

"مجھے اقرار ہے ——" ماہ جمال ...

لعل حیرت زدہ رہا تھا۔ ایک طرف وہ ان اور پی سالار وغیرہ حیرت کر رہے تھے کہ [illegible] ایک دہشت کا شبہ ہو گئی تھی۔ اس بیٹھے کر [illegible] اور محل [illegible] تھا۔ [illegible] اس نے ماہ جلال سے سوال کیا۔ "غزنی کے بادشاہ سے بے کر ہمارے پاس آنے تک تیرے دو بیٹوں نے احسانات کئے [illegible] بیانات ہیں [illegible] کبھی ان کا بدلہ [illegible] کی بات [illegible] تو ہماری سرپرستی کے [illegible] احسان فراموش کہلوانا پسند کرے گا؟"

ماہ جلال [illegible] ہو گیا۔ اس نے [illegible] بادشاہ کے چہرے کو دیکھا [illegible] نہیں تھا۔ اس نے [illegible] آقا [illegible] ہے لیکن میرے ساتھ عجیب معاملہ ہے۔ [illegible] اور مطلب [illegible] کا حصہ [illegible] ہے اور [illegible] جس کا [illegible] سے الگ [illegible] دیجئے؟"

سلطان التمش [illegible] کون [illegible] جس نے تیرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ہمارے [illegible] پھانسی پا گیا۔ کیا نام تھا اس شخص کا جس نے ایک طرف اتنا [illegible] کام کیا اور دوسری طرف اتنا بڑا جرم۔ پھر [illegible] کیسے ہو گیا؟"

[illegible] گیا تھا۔ شہاب الدین غوری کے عہد [illegible]

[illegible]

بادشاہوں جیسا سلوک نہیں کرتا تھا کہ [illegible] کے کل [illegible] کہ اس [illegible] کی جھلکیاں تھیں [illegible] ماہ جلال کا [illegible] بادشاہ کے سامنے کبھی [illegible] بنا سکتا تھا۔ اسی لئے دونوں کے درمیان رکھ رکھاؤ ضرور تھا اور کینہ کا تعلق نہیں تھا۔

اگلے دن علی الصبح بادشاہ نے دہلی کوچ کا حکم دے دیا اور [illegible] کی روانگی [illegible] گئی۔

رات سے سلطان التمش کا ذہن عجیب الجھن میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ماہ جلال کو یہ جو تازہ خبر [illegible] سنائی گئی کہ بادشاہ امیر جلال کو پھانسی کی سزا دے چکا۔ اسے کسی آنے والے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے قیدی کی رہائی کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ لیکن اُسے پتہ چلا کہ قیدی قید خانہ میں نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ بے چین سا ہو گیا۔ وہ ذہنی طور پر کسی سازش سے نمٹنے کی تیاری کر رہا کہ غلام نے آکر اطلاع دی کہ امیر جلال خلجی باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ بادشاہ چونک پڑا۔ اس نے ایک لمحہ غور کیا اپنے خاص غلام کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ غلام نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حامی بھر لی اور پھر باریابی کی اجازت دے دی گئی۔ امیر جلال حاضر ہوا اور کورنش بجا لایا۔ بادشاہ نے اس کو غور سے دیکھا اور سخت لہجہ میں کہا "جلال خلجی! تو جانتا ہے کہ تو ہماری قید میں کیوں تھا؟" امیر جلال نے جھک کر عرض کیا [illegible] بادشاہ [illegible] "نہیں۔ تو نہیں [illegible] کا جواب [illegible] گے۔ تو جانتا ہے کہ بزدلی، کم ہمتی اور غداری کی سزا موت ہے۔ ان تینوں جرائم کا ارتکاب کیا، لیکن [illegible] اعتراف نہیں کہ ہم نے تیرے بیٹے کے ساتھ رحم کا سلوک کیا؟"

"بے شک ہے [illegible] عالی جاہ — غلام کی عرض ہے کہ حضور [illegible] تیرے ساتھ [illegible] ہے۔ اور [illegible]

[illegible] نصیب ہو [illegible]

"جلال خلجی — ہم جانتے ہیں [illegible]

[illegible] آ گئے [illegible]

"نہیں — عالی جاہ! جلال خلجی [illegible]

[illegible]

میں غدار کبھی نہیں تھا حالات کے تحت بدقسمتی سے بزدلی کا
اظہار ضرور کیا۔ لیکن میں شاہی دربار کا خیر خواہ کل بھی تھا اور
آج بھی ہوں ——"

"خیر خواہی کا کوئی ثبوت؟" جلال خلجی کی جرأت سے
متاثر ہو کر بادشاہ نے نرمی سے پوچھا۔

"میری غیر موجودگی میں میری کنیز ماہ جمال یہاں ایک
سازش کے تحت بھیجی گئی ہے۔"

"ثبوت ——؟" شہنشاہ کی زوردار آواز گونجی۔ سب
لوگ گھبرا کر رہ گئے۔

اسی وقت فرخ شاہ اندر داخل ہوا۔ التمش نے حیرت
اور ناگواری سے اسے دیکھا اور بولا: "جلال خلجی ہم سے دروغ
گوئی کر کے ہمیں پریشان کرنے کا مطلب سمجھتا ہے ——؟"

"عالم پناہ کا اقبال بلند ہو میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا
نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ لوگ آپ کی عنایات اور نوازشوں
کے باوجود آپ کی رحم دلی اور نرم خوئی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے
ہیں۔ ماہ جمال کو بلوائیے اگر آپ نے اس پر نوازشیں کی ہیں
اور وہ احسان فراموش نہیں ہے تو ساری بات ابھی واضح
ہو جاتی ہے۔ یہ جاندار سردار فرخ شاہ ہے جس نے قسنقر کی اس
ذلیل حرکت سے مجھے آگاہ کیا جس میں ماہ جمال برابر کی شریک
ہے ——!"

التمش نے نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ جمال کو بلوایا۔ قسنقر کا
سن کر التمش کو کسی سازش کا یقین ہو چکا تھا کیونکہ اسی نے ماہ
جمال کو جلال خلجی کی جاسوسی کی اطلاع بھی دی تھی ——

ماہ جمال جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی امیر جلال کو دیکھ کر
ششدر رہ گئی۔ فرخ شاہ نے مسکرا کر کہا: "آؤ ماہ جمال ایک مردہ
انسان کو زندہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہے شاید۔" اب ماہ جمال نے لہجہ
[illegible] اور ایک [illegible] کو [illegible] کر بولی: "[illegible] ہے [illegible]
مجھے [illegible] ہے ——؟"

فرخ شاہ سے پہلے امیر جلال بول اٹھا۔ "ماہ جمال تیری
[illegible]
[illegible]

نے آج میں اسی کا واسطہ دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو شہنشاہ
ہند سلطان شمس الدین التمش اور اس کی اولاد کی خیر خواہ بن کر یہاں
آئی تھی؟"

ماہ جمال کا رنگ زرد ہو چکا تھا وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی [illegible]
کہ التمش کا مجرم بن کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ نے اس کا جائزہ لیا اور بولا
"ماہ رو جواب دے۔ کیا واقعی تو ہماری دشمن بن کر اس محل
میں داخل ہوئی تھی؟"

ماہ جمال اپنے آقا کی حرکت کو سمجھ چکی تھی اس نے سوچا اپنے آقا کی
خواہش کے لئے عزت کے بدلے جان دینا زیادہ آسان کام ہے۔ اس
نے گردن جھکا کر جرم کا اقرار کر لیا۔

"ماہ رو —— کاش تو اس وقت اپنے جرم سے انکار کر دیتی
تو قصور وار ہونے کے باوجود ہم تجھے معاف کر دیتے۔" التمش [illegible]
لہجہ میں بولا۔

بادشاہ کا درد بھرا لہجہ سن کر فرخ شاہ نے کہا: "کیا تو یہاں اس
لئے نہیں بھیجی گئی تھی کہ شہنشاہ ہند اور ان کی اولاد کو دشمنوں
کے حوالے کر دے ——؟"

ماہ جمال نے گردن اٹھائی ایک نظر سب پر ڈالی اور بولی:
"میرے آقا امیر جلال خلجی نے جس مقدس کتاب کا واسطہ دیا ہے اس کے
بعد مجھ پر واجب ہو جاتا ہے کہ میں سچ بات کا اقرار کر لوں۔ لیکن
شہنشاہ ہند سے اتنی گزارش ضرور کروں گی کہ اس سازش کا پردہ
جس بوڑھے ضعیف امیر جلال نے چاک کیا ہے وہ یقیناً ان کا اور
ملک کا بہی خواہ ہے۔"

"ماہ جمال —— مجھے تیری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"
امیر جلال پھنکارا۔ "کہاں ہے وہ تیرا سردار قسنقر جس نے تجھے ہندوستان
کی ملکہ بنانے کے خواب دکھائے تھے۔"

"امیر جلال کی کنیز —— التمش نے پہلی بار اسے کنیز کہہ کر مخاطب
کیا۔ "تو نے ہم سے اپنی عزت کی حفاظت کا وعدہ لیا اور پھر [illegible]
سے [illegible] اے [illegible] آئی۔ تجھے [illegible] اور اپنے وجود سے
پیار اور ہمارے وجود کو مٹانے کی کوشش۔ کیا تجھے اقرار ہے کہ جب
سازش [illegible] تو تجھے [illegible] تھی ——
مجھے اقرار ہے —— [illegible]

[illegible]

بالکل نئی رومانی ناولیں

[illegible]

الاؤ

از نسیم فضل خالق

میں اور عطیہ آپا بہت دیر سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ میں آم کے ایک گھنے درخت کے پیچھے چھپ گئی تھی اور عطیہ آپا مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکی تھیں آخرکار بیزار ہو کر چلائیں:

"تم جہاں کہیں بھی ہو فرحت! فوراً نکل آؤ۔ بس اب کھیل ختم کرتے ہیں ورنہ دادی جان کے عذاب سے نہ بچ سکیں گے۔"

میں نے دیکھا شام کا سلونا پن آہستہ آہستہ دھندلکوں میں چھپ رہا تھا۔ ابھی پل بھر میں رحیم بابا بلانے آجاتا۔ میں ہنستی ہوئی درخت کی اوٹ سے نکل آئی۔ اتنے میں رحیم بابا ہانپتا ہوا آیا۔ عطیہ آپا میرے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی میں رحیم بابا کی نقل اتارتے ہوئے بولیں: "اب یہ حسب معمول کہے گا... بی بی! بڑی بیگم صاحبہ کہتی ہیں، شام ہو گئی ہے بس اب جلدی گھر آجاؤ۔ شام کے بعد درختوں اور پیڑوں پر جن بھوتوں کا بسیرا ہو جاتا ہے۔" اس کی نقل اتارنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑی۔ لیکن رحیم بابا نے قریب آکر آج خلافِ معمول نئی بات کی۔

"وہ جی... کوئی لڑکا آیا ہے۔ خود کو منجھلی بیگم صاحبہ کا بھائی بتاتا ہے۔" ہم دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے پوچھا: "امی کا بھائی؟ یہ کہاں سے آگیا؟ تمہیں سننے میں غلطی تو نہیں ہوئی رحیم بابا؟" [illegible] دادی کی حکومت ہوگی۔

"نہیں چھوٹی بی بی! اب اتنا بھی بہرا نہیں ہوا ہوں میں۔" وہ ناراض ہو گیا۔ "آپ خود جا کر دیکھ لیجئے..." بڑی بیگم صاحبہ کی عدالت میں کھڑا [illegible]

[illegible]

حال ہو گی [illegible] کر [illegible] طرف چلی [illegible]

"کتنی بار کہا ہے کہ شام ہونے سے پہلے باغ سے آجایا کرو لیکن جب تک رحیم تمہیں بلانے نہیں چلا جاتا تم خود سے آتی ہی نہیں۔ اب میں تم دونوں کا باغ میں داخلہ بند کرا دوں گی۔" ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عینک کے پیچھے سے ہمیں گھور رہی تھیں۔ ہم دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھیں کہ برآمدے سے امی نکلتی ہوئی نظر آئیں۔ اب دادی اماں ہمیں چھوڑ کر امی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ امی نے قریب آکر حیرت سے اس لڑکے کو دیکھا اور آہستہ سے ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں: "مراد ہے تم؟"

"ہوں۔" دادی اماں نے ہنکارا بھرا۔ "گویا یہ سچ مچ تمہارا بھائی ہے۔ بے چارہ کب سے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ تم اس کی آپا ہو لیکن اس کے حلیے کو دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔" دادی اماں کے لہجے میں تمسخر تھا۔ میری اور عطیہ آپا کی نظریں بیک وقت اس لڑکے کی طرف اٹھیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے، آستین پر سے قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ بانس کی طرح لمبا اور پتلا تھا۔ چہرے سے بے چارگی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ امی کو دیکھ کر اس کے سہمے ہوئے پیلے چہرے پر گویا زندگی کا رنگ دوڑ گیا۔ امی نے دادی اماں کی تلخ بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا البتہ درشت لہجے میں اس لڑکے کو مخاطب کیا:

"مراد! کیوں آیا ہے تو ادھر؟"

"باجی..." وہ ہڑبڑایا۔ اپنی میلی آستین سے آنکھیں رگڑتا ہوا [illegible] "تائی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ کہتی ہیں تیری بہن کی اتنی بڑی حویلی ہے جا اس کے ساتھ رہ۔ ہم اپنے پیٹ بھر نہیں سکتے تجھے کہاں سے کھلاتے رہیں گے۔"

عطیہ آپا دو چار مہینوں میں [illegible] کے سلسلے [illegible] میرے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھیں "فرحت! [illegible]" اپنے ماموں کو [illegible] بے چارے کے آنسو [illegible]

عطیہ آپا اس کا مذاق اڑا رہی تھیں [illegible] دادی اماں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چھوٹی چچی بھی ہر وقت مرادے کا راگ الاپنے لگیں۔ مگر یہ چاؤ چونچلے اس کی محبت میں نہ کیے جاتے تھے بلکہ ان دنوں حویلی میں نوکروں کی قلت ہو گئی تھی۔ اندر کا کام تو عورتیں کر لیتی تھیں لیکن باہر کے کام کاج کے لیے تو بہر حال مردوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ رحیم بابا اس حویلی کا جدی ملازم تھا لیکن اب وہ خاصا بوڑھا ہو گیا تھا، دوسرے اس کے ساتھ باہر کا کام کاج کرنے کے لیے جو پختہ عمر کے دو نوکر تھے ان میں سے ایک نے بغیر کچھ کہے سنے نوکری چھوڑ دی اور دبئی چلا گیا دوسرے کا جوان بیٹا فوت ہوا تو اس نے چارپائی پکڑ لی اور بیمار رہنے لگا۔ سو باہر کے کام کاج کی دشواری ہوئی لیکن خدا مسبب الاسباب ہے اس نے مرادے کی شکل میں حویلی والوں کو نوکر دے دیا۔ امی کا بھائی ہونے کے ناتے اس کے حویلی کے اندر آنے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی، دوسرے وہ حد درجہ فرماں بردار تھا دوڑ دوڑ کر کام کرتا تھا، چہرے سے مسکینی برستی تھی، سر جھکائے مخاطب کی بات سنتا، مجال ہے جو نظریں اٹھا کر بات کرے، اور تو اور امی بھی اس سے حویلی والوں کی طرح نوکر سمجھ کر بات کرتیں سرخ پتھروں کی حویلی میں رہتے رہتے امی کا دل بھی پتھر بن گیا تھا میں مراد کے لیے کئی بار امی سے لڑی بھی تھی لیکن امی کا رویہ نہ بدلا۔

انھیں دنوں ہمارے لیے استانی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہماری استانی مسز رضوی اپنی بیٹی کا سادگی سے نکاح کر کے بیٹی و داماد کے ساتھ ہی چلی گئی تھیں۔ دادی اماں نے دوسری استانی ڈھونڈنے کی ذمہ داری رحیم بابا کے سر ڈال دی۔ رحیم بابا نے تھک ہار کر بتایا کہ کئی استانیوں سے وہ ملا مگر وہ حویلی میں آ کر پڑھانے پر راضی نہیں ہوئیں۔ ہاں اگر آپ اجازت دیں تو میں استاد کا بندوبست کر دوں۔

دادی اماں کا غصہ اچانک عروج پر پہنچ گیا، وہ سخت لہجے میں بولیں: "رحیم! تم سٹھیا تو نہیں گئے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی مرد اس حویلی میں آیا ہو اور بچیاں اس کے سامنے بے حجاب گئی ہوں۔ جب کہ پڑھنے کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ بچیوں کو استاد کے سامنے کھلے عام بیٹھنا پڑے گا پردے میں بیٹھ کر تو پڑھائی نہیں ہو سکتی تمھیں شاید علم نہیں کہ تم نے کیا کہہ دیا؟"

رحیم بابا سٹ پٹا کے رہ گیا پھر ہمت کر کے بولا "لیکن بڑی بیگم صاحب جی! جس استاد کی بات میں کر رہا ہوں وہ ایک پختہ عمر بے انتہا شریف آدمی ہے۔ میں اسے ایک زمانہ سے جانتا ہوں پھر بھی آپ کی تسلی کے لیے عرض کر دوں کہ جتنی دیر بچیاں اس کے پاس پڑھیں گی میں پاس بیٹھا رہوں گا۔"

ماسٹر قدیر کی عمر پینتیس سے تجاوز کر رہی تھی، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، جسم بے ڈول، چہرے پر مظلومیت کا اشتہار، آواز دھیمی اور لہجہ نرم تھا۔ دادی اماں کے حضور وہ انٹرویو میں کامیاب ہو گیا ہماری پڑھائی شروع ہو گئی۔ رحیم بابا پاس ہی بیٹھا ہوتا۔ چند دن تک دادی اماں بھی کچھ فاصلے پر بیٹھی رہتیں، بعد میں مطمئن ہو کر وہ ہمارے پاس سے ہٹ گئیں۔

ان دنوں، میں نے محسوس کیا کہ عطیہ آپا کچھ بدل سی گئی ہیں، وہ کھوئی کھوئی سی رہتیں، اس کے لب آپ ہی آپ مسکراتے رہتے آنکھوں میں قندیلیں جلا کرتیں۔ ذہنی طور پر وہ مجھے غیر حاضر لگتیں۔

اس دن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، ہماری پڑھائی کا ٹائم سہ پہر چار سے چھ بجے تھا۔ اس دن صبح ہی سے میری طبیعت خراب تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا میں [illegible] کر لیٹی تھی کہ عطیہ آپا آ گئیں اور چادر کھینچتے ہوئے بولیں:

"اٹھو فرحت! پڑھنے نہیں چلے گی کیا؟"

میں نے دیکھا وہ کتابیں لیے کھڑی تھیں میں نے چادر دوبارہ لپیٹتے ہوئے کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے عطیہ آپا۔ تم چلی جاؤ"

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں یا وہ اکیلی پڑھنے چلی جاتیں لہٰذا وہ میری بات پر حیران ہو کر بولیں "ہوش میں تو ہو تم دادی اماں سے پٹواؤ گی مجھے؟"

دادی اماں اس موسم میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں اور پھر تم اکیلی تھوڑی ہو گی، رحیم بابا جو تمھارے ساتھ ہو گا" میں نے بیزاری سے جواب دیا تو وہ سوچ میں ڈوب گئیں، پھر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ کیا اور بولیں:

"تمھیں تو واقعی بخار ہے فرحت!" وہ کھڑی کچھ دیر جانے کیا سوچتی رہیں پھر جاتے جاتے بولیں "چلو آج اکیلے پڑھنے کا تجربہ بھی کر لیں گے"

وہ کافی دیر بعد لوٹیں۔ میں نے دیکھا وہ بات بے بات مسکرا رہی تھیں، چہرے پر گلاب بکھرے تھے انھوں نے کوئی بات کی

میں نے پوچھا:

"رحیم بابا تو تمہارے ساتھ تھا نا؟"

"ارے نہیں" وہ ہنس کر بولیں۔ "آج تو وہ بھی بیمار پڑ گیا"

میں سہم گئی۔ اگر دادی اماں کو پتہ چل جائے کہ عطیہ آپا بالکل تنہا ماسٹر قدیر کے ساتھ بیٹھی پڑھتی رہی ہیں تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ماسٹر قدیر کو برداشت نہیں کریں گی اور ان کا غصہ آفت بن کر عطیہ آپا اور رحیم بابا پر ٹوٹے گا۔ لیکن شکر ہے کہ دادی اماں کو اس بات کا علم نہ ہو سکا۔

وہ بھی ہمیشہ کی طرح ایک عام سا دن تھا۔ ہمارے آموں کے باغات تو کئی تھے لیکن یہ باغ حویلی سے ملحق تھا۔ حویلی کا ایک گیٹ باغ میں کھلتا تھا۔ ظہر کے وقت مالی بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے لہٰذا ہمیں باغ میں جانے اور گھومنے کی اجازت تھی۔ ہمیشہ کی طرح میں اور عطیہ آپا پڑھنے کے بعد باغ میں جا رہے تھے۔ برآمدے میں تخت پر دادی اماں بیٹھی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسی جگہ بیٹھی تسبیح کے دانے گھماتی رہتی تھیں۔ ہم جب ان کے سامنے سے گزرتے تو وہ ایک نگاہِ غلط ہم پر ڈال کر دوبارہ تسبیح گھمانے میں مصروف ہو جاتیں۔ باغ میں جانے کی اجازت انھوں نے خود دی تھی۔ لہٰذا روک ٹوک کا کوئی سوال نہ تھا لیکن آج جب ہم دونوں ان کے سامنے سے گزریں اور انھوں نے ہمیشہ کی طرح ایک نگاہ ہم پر ڈالی تو جیسے ان کی یہ نگاہ عطیہ آپا پر جم کر رہ گئی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ سی گئیں، وہ ہکا بکا عطیہ آپا کی صورت تکنے لگیں۔

"عطیہ!" وہ اتنے زور سے پکاریں جیسے بادل گرج اٹھا ہو میں تو دم بخود رہ گئی۔ عطیہ آپا کا رنگ املتاس کے پھولوں جیسا زرد پڑ گیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" تسبیح کی مالا پھینک کر دادی اماں تیر کی طرح اٹھیں۔

میں ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی جب کہ عطیہ آپا خوف سے ڈگمگاتی دادی اماں کے ہمراہ چلی دیں۔ جانے اندر کیا کچھ ہوا۔؟ دادی اماں نے عطیہ آپا سے کیا کہا؟ مجھے کچھ علم نہ ہو سکا۔ میں حیران و ششدر یہ تھی سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک دادی اماں کو عطیہ [illegible]

آپا کے من میں کیا چور تھا جو وہ دادی اماں کی آواز پر اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھیں؟ اس کے بعد میں تین دن تک عطیہ آپا سے نہ مل سکی۔ دادی اسے اپنے پاس سے ملنے تک نہ دیتیں۔

ان دنوں حویلی کی فضا بڑی پراسرار ہو گئی تھی۔ ماسٹر قدیر نے حویلی آنا خود چھوڑ دیا تھا یا اسے حویلی آنے سے منع کر دیا گیا تھا اس کا علم تو مجھے نہ ہو سکا لیکن بہرحال ماسٹر قدیر کا حویلی آنا بند ہو گیا تھا دادی اماں کے بند کمرے میں کانفرنس ہوتیں جس میں تائی اماں شامل ہوتیں، امی اور چھوٹی چچی کا وہاں داخلہ ممنوع تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ حویلی کے سارے مکین اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے۔ سیلنگ فین چل رہے تھے خس کی ٹٹیوں کی مہک برآمدوں میں چکراتی پھر رہی تھی۔ آنگن میں لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔

میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلی۔ میں عطیہ آپا کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ رحیم بابا کے ساتھ ماسٹر قدیر ہی تھا، دونوں چوروں کی مانند دبے پاؤں چل رہے تھے میں سانس روکے ایک پیڑ کے پیچھے چھپ گئی جب وہ میرے سامنے سے گزرے تو تجسس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کے پیچھے جاؤں۔ جب سے عطیہ آپا دادی اماں کے چنگل میں پھنس گئی تھیں میرا صبر اور قرار جیسے چھن گیا تھا۔ میں یہ راز پانے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اور یوں چوروں کی طرح رحیم بابا اور ماسٹر قدیر کو ساتھ جاتے دیکھ کر جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے ماسٹر قدیر کے ساتھ عطیہ آپا کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ آج افشائے راز ہونے والا ہے

کئی غلام گردشیں اور طویل برآمدے عبور کر کے وہ دونوں حویلی کے پچھلی طرف نکل آئے جہاں ساری حویلی سے الگ تھلگ دادی اماں کی رہائش گاہ تھی۔ دبے پاؤں چلتے ہوئے میں بھی اس طرف پہنچ گئی۔ لیکن میرا رخ دادی اماں کے بیڈروم کی پشت کی طرف تھا۔ دادی اماں کے بیڈروم کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ دادی اماں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اس تپتی دوپہر میں کوئی ادھر کی پچھلی طرف بھی آ سکتا ہے۔ ورنہ وہ کم از کم آج کے دن کھڑکیاں کبھی کھلی نہ چھوڑتیں حویلی کا یہ حصہ بالکل سنسان تھا یہاں کسی وجہ سے مٹی ڈالی گئی تھی

[illegible]

ڈرتے ہوئے ایک شعلے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ بڑے بڑے پایوں والی مسہری پر بیٹھی دادی اماں غیظ و غضب سے کانپ رہی تھیں، پاس ہی تائی اماں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ تائی اماں کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اور وہ اس قدر پیلی لگ رہی تھیں جیسے ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔ ان کے سامنے عطیہ آپا کھڑی تھیں انہیں دیکھ کر میں سکتے میں آ گئی۔ ان چند دنوں میں عطیہ آپا کیا سے کیا بن گئی تھیں وہ عطیہ آپا نہیں لگ رہی تھیں وہ تو عطیہ آپا کا سایہ تھا۔ چہرہ لٹھے کی مانند سفید تھا، آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے عطیہ آپا کے سڈول جسم پر کبھی گوشت تھا ہی نہیں۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی بمشکل اپنے پیروں پر کھڑی تھیں۔ ایک طرف ماسٹر قدیر بوکھلایا سا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس سمے وہ مجھے کسی ایسے مجرم کی مانند لگا جسے دار پر چڑھایا جانے والا ہو۔ دادی اماں کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے۔

"ماسٹر قدیر! اقرار کرو کہ عطیہ کے پیٹ میں تمہارا گناہ پل رہا ہے... اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو مجھے ٹیڑھی انگلیاں استعمال کرنی ہوں گی اور تب شاید تمہیں کتے کی موت مرنا پڑے۔" دادی اماں کی آواز سفاک اور بے رحم تھی۔ عطیہ آپا کی چوٹی کو کھینچتے ہوئے وہ بے بسی سے بولیں: "تین دن سے ہم نے اس لڑکی کا جینا حرام کر رکھا ہے لیکن یہ کمبخت منہ سے نہیں پھوٹی۔"

"مم... مگر... بیگم صاحبہ آپ نے مجھے مجرم کیسے سمجھ لیا؟" ماسٹر قدیر کی گھگھیائی ہوئی آواز آئی۔

"اس لیے کہ ہماری لڑکیاں پچھلے دنوں میں چند مہینوں کی مانند ہوا کرتی تھیں اور اس گھر میں آنے والے پہلے مرد تم ہو اور نقب لگانے والے لٹیرے بھی تم ہو ماسٹر قدیر۔" دادی اماں کی آواز غصے کی شدت سے لرز رہی تھی۔ میں انہیں قتل کروا دیتی اور پھر تمہاری لاش کا پتہ تک [illegible] جاتے [illegible] لیکن اس عورت [illegible] ہے۔ اور [illegible] عطیہ کو بھی [illegible] اس کی ایک ہی صورت ہے کہ عطیہ کو تمہارے پلے باندھ کر [illegible] کے لیے [illegible] دیا جائے جب اسے [illegible] معلوم ہو گا تو اس کے سر سے عشق کا بھوت [illegible]

اتر جائے گا اور تب یہ اس خاندان کی اونچی حویلی کی طرف حسرت سے دیکھ کر سوچے گی کہ اگر اس نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو کسی نواب زادے کی بن کر ایسی ہی کسی حویلی میں بڑی شان اور آن بان سے رہتی۔" دادی کا لہجہ اتنا سنگلاخ تھا کہ میں کانپ کر رہ گئی۔ خدا جانے ان کے اس فیصلے سے تائی اماں، عطیہ آپا اور ماسٹر قدیر پر کیا رد عمل ہوا کیونکہ میرے پاؤں لرز رہے تھے اور دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو برداشت نہ کر پاتی اور دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتی، میں وہاں سے ہٹ آئی۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی میرے دل کو کسی طور قرار نہ تھا۔ میں کبھی اٹھ کر بیٹھتی کبھی کمرے میں چہل قدمی شروع کر دیتی۔ یہ انکشاف کتنا لرزہ خیز تھا کہ عطیہ آپا جیسی شوخ و شنگ کومل اور پیاری سی ہستی کو اپنی عمر سے دگنی عمر کے مرد کے پلے باندھ دیا گیا تھا۔ دادی اماں کے اس فیصلے پر میرے کمزور دل نے زور و شور سے احتجاج کیا۔ لیکن میں نے سوچا عطیہ آپا کو کیا ہو گیا تھا؟ ماسٹر قدیر میں تو کوئی بات بھی پسند کرنے والی نہ تھی۔ میری سوچوں کا رخ بدل گیا۔ میں نے سوچا عطیہ آپا کو اپنے کیے کا پھل [illegible] مجھے وہ دن یاد آ گیا جب عطیہ آپا ماسٹر قدیر سے پڑھنے کے لیے آتی تھیں اور واپسی پر ان کے قدم بہک رہے تھے [illegible] مجھے ان کی وہ شوخ شوخ سی شرارتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ ماسٹر صاحب کے ساتھ کرتی تھیں۔ کبھی اس کا چشمہ اٹھا کر چھپا دیتیں، کبھی وہ اپنا قلم ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتے تو عطیہ آپا قلم اٹھا کر بڑی معصومیت سے پوچھتیں: "ماسٹر صاحب! کہیں یہ آپ کا قلم تو نہیں؟"

غرض ایسی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں جنہیں اس وقت میں نے اہمیت نہیں دی تھی اب میرے ذہن کے پردے پر تازہ ہو رہی تھیں۔ مجھے عطیہ آپا پر غصہ آنے لگا، لمحہ بھر میں میرے اندر کی ہمدردی ختم ہو گئی۔

عطیہ آپا کا نکاح ماسٹر قدیر سے کر دیا گیا۔ تائی اماں تو [illegible] رہ گئی تھیں لیکن میرے خیال میں [illegible] کیونکہ انہوں نے بھی ایک لفظ [illegible] کا احتجاج نہ کیا۔ حویلی میں [illegible] کے بعد دادی اماں نے ماسٹر قدیر سے [illegible] ان پر بند ہو گیا ہے وہ عطیہ کو لے کر [illegible]

ساری زندگی عطیہ آپا کی وہ بے بس نگاہیں نہیں بھلا سکی جاتے وقت وہ جس طرح دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں! اس نے دیکھنے والوں کا دل ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد تائی اماں پلنگ سے لگ کر رہ گئیں۔ امی اور چھوٹی چچی قیاس آرائیاں کرتی رہتیں کہ دادی اماں نے ایسا کیوں کیا؟ سب کا متفقہ خیال تھا کہ دادی اماں نے عطیہ آپا کو ماسٹر قدیر کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھ لیا تھا اور سزا کے طور پر ساری عمر کے لیے اسے کنویں میں دھکیل دیا۔ چھوٹی چچی سرگوشی میں امی سے کہتیں "یہ عورت اتنی سنگ دل ہے کہ اس سے کچھ بعید نہیں کہ کب کیا کر بیٹھے، شکر ہے میری کوئی بیٹی نہیں۔"

ایسے میں امی جھرجھری لے کر میری طرف دیکھ لیتیں۔

میں سمجھتی تھی کہ میں عطیہ آپا کو کبھی بھلا نہ سکوں گی لیکن وقت بڑے بڑے گھاؤ بھر دیتا ہے۔ عطیہ آپا کے نکاح کے فوراً بعد دادی اماں نے نواب حویلی میں میری نسبت طے کر دی۔ شاید وہ جوانی کے شوریدہ سر جذبوں سے ڈر گئی تھیں۔ نواب صمد خان امریکہ سے انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری لے کر حال ہی میں وطن لوٹے تھے۔ میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں نئے گھر اور نئے ساتھی کی خوشی میں بھول گئی کہ کبھی میرے سنگ سنگ چلتی ہوئی ایک شوخ و شنگ عطیہ آپا ہوا کرتی تھیں جو آفاق کی گردش کا شکار ہو گئیں۔ میں کبھی کبھی امی ابو سے ملنے حویلی آجایا کرتی تائی اماں ہڈیوں کا پنجر بن گئی تھیں۔ دادی اماں کا وہی رعب اور دبدبہ تھا۔ جیرا ماموں مراد "حویلی کا نوکر بنا ہوا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت نے نہ تو اس کے چہرے کی مسکینیت پر کوئی اثر ڈالا تھا نہ اس کی تابعداری اور خدمت گزاری کا جذبہ کم کرنے میں کوئی فرق آیا تھا۔

سردیوں کی ایک شام تھی، فضا میں خنکی تھی۔ میں امی کی بیمار پرسی کے لیے آئی تھی۔ صمد خان مجھے چھوڑ کر کام سے چلے گئے تھے۔ میں امی کے پاس بیٹھی تھی کہ ایک چار سالہ بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر خاتون ہانپتی ہوئی آئیں اور اس کو بازوؤں سے پکڑ کر [illegible] میں حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ حویلی میں [illegible] بچہ [illegible] تھا پھر یہ کہاں سے آگیا اور یہ اجنبی عورت کون تھی؟ [illegible] حیرت سوال بن کر ابھری امی نے بتایا:

[illegible]

[illegible] حیرت زدہ ہو گئی۔ میں منہ پھاڑے امی کا منہ تکنے لگی۔ امی نے مزید بتایا:

"ہفتہ ہوا ہوگا، اس بچے کو اس کا باپ ماسٹر قدیر لایا تھا عطیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

میرے سر پر دھماکے ہونے لگے، دل شدت سے دھڑکنے لگا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ہنستی کھلکھلاتی عطیہ آپا میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں، میرا سانس گھٹ کر رہ گیا۔ اور دوسرے لمحے میں خود پر قابو نہ پا سکی، پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ امی گھبرا گئیں۔ شاید انھیں یقین نہیں تھا کہ میں عطیہ آپا کے لیے اس قدر جذباتی ہو جاؤں گی۔ اسی لمحے صمد خان مجھے لینے آگئے۔ میں نے عطیہ آپا کی موت کی تفصیل امی سے پوچھنا چاہی لیکن موقع ہی نہ مل سکا۔ میرے استفسار پر امی نے اتنا ہی بتایا:

"تمھاری دادی اماں نے بچے کو قبول تو کر لیا ہے لیکن وہ اس معصوم جان سے شدید نفرت کرتی ہیں۔ آپا کو سخت ممانعت ہے کہ بچہ نہ دوسروں سے گھلے ملے اور نہ اس حصے کی طرف آئے جہاں دوسرے لوگ بیٹھے ہوں۔ ایک طرح سے یہ بچہ اچھوتوں کی طرح حویلی میں پل رہا ہے۔"

میں دل میں منوں بوجھ اٹھائے حویلی سے آگئی۔ لیکن تنہائی میں مجھے عطیہ آپا اور زیادہ شدت سے یاد آئیں۔

"ہائے عطیہ آپا! میں تو سمجھتی تھی تم اپنی پسند کا ساتھی پا کر خوش و خرم زندگی گزارو گی لیکن دادی اماں کا کہنا درست نکلا۔ تم مفلسی سے نباہ نہ کر سکیں۔ کاش! تم یہ بات پہلے سوچ لیتیں عطیہ آپا" میں خود سے کہتی۔

کئی دن بے کل رہی۔ راتوں کو ان کا ہنستا مسکراتا پیکر خوابوں میں آتا تو دن کو خیالوں میں، اس معصوم بچہ کا خیال آتا پھر جیسے کوئی کلیجہ نوچنے لگتا۔ میرے دل سے آہ نکلتی۔ دادی اماں سے میری نفرت دوچند ہو جاتی۔ حویلی میں دادی اماں اور تائی اماں کے بعد میری ہستی میں ہی تھی جسے علم تھا کہ عطیہ آپا کا بچہ ناجائز تھا لیکن میرے خیال میں عطیہ آپا اپنے کیے کی سزا بھگت چکی تھیں۔ اب بچے کا کیا قصور تھا۔

"ہائے عطیہ آپا!... تمھاری نشانی حویلی میں رُلتی پھر رہی ہے" بھلا نے بیٹھی [illegible] خیالوں میں عطیہ آپا کو مخاطب کر کے کہتی۔ اس کے [illegible] جس نے اپنی اولاد کو دادی اماں کے ظلم [illegible] دیا تھا۔

میرا دل حویلی سے اچاٹ ہو گیا۔ کافی دن ہو گئے تو امی نے مجھے بلا بھیجا۔ میں بادلِ ناخواستہ چلی گئی۔ امی کا حکم ٹال بھی نہیں سکتی تھی۔ امی سے ملی تو انہوں نے حسبِ معمول کہا کہ پہلے دادی اماں کو سلام کر آؤ پھر میرے پاس آجانا۔

میں اپنے دل پر جبر کر کے دادی اماں کے پاس چلی آئی برسوں بیت گئے لیکن دادی اماں کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی اسی تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس ہی ماموں مراد کھڑا تھا حسبِ معمول اس کی نظریں جھکی ہوئی، دادی اماں اسے کچھ لکھوا رہی تھیں۔ میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ عرصہ پہلے کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا وہ بھی ایسا ہی وقت تھا۔ دادی اماں اسی تخت پر بیٹھی تھیں۔ مراد ماموں پہلی بار آیا تھا۔ میں اور عطیہ آپا باغ سے آنکھ مچولی کھیل کر آ رہی تھیں مراد ماموں اسی جگہ کھڑا تھا جہاں اب کھڑا ہے۔ اور جہاں میں اس وقت کھڑی تھی یہی وہ جگہ تھی جہاں عطیہ آپا میرے پیچھے منہ چھپائے کبھی کبھی کر کے مسلسل ہنس رہی تھیں۔ اور مراد ماموں پر شرارتی جملے کس رہی تھیں۔

میرے دل میں ہوک اٹھی۔ عطیہ آپا منوں مٹی تلے دب چکی تھیں میں نے خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسی وقت دادی اماں نے مجھے دیکھ لیا۔

"ارے!" وہ چونک پڑیں۔ "تم کب آئیں فرحت؟"

"ابھی آئی ہوں دادی اماں"۔ میں کھوئے کھوئے لہجے میں بولی

"آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" وہ تخت کے ایک طرف سرکتے ہوئے بولیں۔ میں بے دلی سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ان کے سامنے ٹرالی میں ... کے برتن پھل، خشک میوہ اور دوسرے لوازمات تھے دادی اماں نے مراد ماموں کو حکم دیا:

"فرحت کے لیے چائے بنا دو مرادے۔"

مراد ماموں چائے بنانے لگے تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں اٹھتے ہوئے بولی: "تم رہنے دو ماموں، چائے میں بنا دوں گی۔"

ابھی چائے دانی اٹھا کر میں کپ ... چائے انڈیل ہی رہی تھی کہ ... سے گیند آئی اور نازک سی چائے دانی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ... ریزہ ہو گئی گرم گرم چائے میرے ہاتھوں اور کپڑوں ... نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہی چار سالہ بچہ وہ ... تا

ہوا گیند لینے آ رہا تھا۔ میں اپنی تکلیف بھول کر دلچسپی سے ا... دیکھنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے عطیہ آپا کے بچے کو دیکھ کر میرے دل کا سلگتا ہوا آتش کدہ اچانک ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ دادی اماں اسے د... کر آپے سے باہر ہو گئیں۔

"تو پھر تم آگئے کمینے۔ بدذات ... سو بار کہا ہے اس طرف نہ آیا کر۔"

وہ سہم کر رک گیا۔ میں اس کی گیند اٹھا کر دینے لگی تو داد... اماں کی سخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: "مزہ چکھاتی ہو... اس طرف آنے سے باز نہیں آتا۔" دادی اماں کی آواز میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ سنگدل تو وہ ہمیشہ سے تھیں لیکن آج تو انہو... نے ظلم کی انتہا کر دی۔ چھوٹے سے معصوم بچے کو بے دردی سے اپنی ط... کھینچا اور اس کے منہ پر تابڑ توڑ تھپڑ برسانے لگیں، بچہ اپنے چھو... چھوٹے ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنے آپ کو بچانے لگا۔ وہ رو رہا تھا۔ میں ... بت بنی کھڑی رہ گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر اس معصوم بچے کو ... آپا کی اس واحد نشانی کو دادی اماں کے ظالم ہاتھوں سے بچا لیتی لیک... بالکل ڈرامائی انداز میں مراد ماموں دادی اماں کے سامنے جا کھڑا ہوا ... بچے کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ میں ہونقوں کی طرح دیکھتی رہ گئی۔ دادی اماں کا منہ ... کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہٹ جا مرادا! میرے سامنے سے۔" وہ کسی ناگن کی سی پھنکار... ساتھ بولیں۔ "آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

ہمیشہ کی جھکی جھکی نگاہوں والا مراد آج تن کر کھڑا تھا وہ ا... آنکھیں دادی اماں کی آنکھوں میں ڈال کر تپتے لہجے میں کہہ رہا تھا:

"بہت ظلم کیے ہیں آپ نے بڑی بیگم صاحبہ، بہت ظلم۔ اب م... اپنی عاقبت خراب نہ کیجیے۔"

"تو ... دو ٹکے کا آدمی ... میرے ٹکڑوں پر پلنے والے ... مجھے عاقبت سنوارنے کا درس دے رہا ہے۔" دادی اماں غص... سے پاگل ہو گئیں۔ "نکل جا میرے گھر سے ... اور اس بچے کو چھوڑ ... میں اس پر ظلم کروں یا رحم ... تجھے اس سے کیا سروکار؟ تیرا اس ... کیا رشتہ ہے؟"

"رشتہ؟" دادی اماں کی چیخ پکار کا اس پر کوئی اثر نہ ہو... سخت لہجے میں گونج دار آواز میں بولا "مرنے والی نے تو لاکھ قسمیں دی ...

... مرنے کی دھمکیاں دی تھیں کہ کبھی اس رشتہ کو ظاہر نہ کروں لیکن آج مجھے بتانے دو بڑی بیگم صاحبہ! ... کہ میں اس بدنصیب کا باپ ہوں۔ ماسٹر قدیر نے میری غلطی کی سزا بھگتی اور عطیہ نے اپنے آپ کو مٹا لیا اور مجھے وعدے کا پابند کر گئی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ عطیہ بیگم کو مرنا ہی ہے تو میں تمہیں اسی وقت مرنے دیتا اور خود بھی مر جاتا۔ گالوں پر روانی سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا: "مجھے معاف کر دو عطیہ! مجھے اپنی ذات پر ہونے والے ظلم کی پروا نہیں تھی لیکن آج میں اپنی اولاد پر ستم ہوتے نہ دیکھ سکا۔" ماموں مراد بچے کو سینے سے لگا کر سسک پڑے۔

میں دم بخود رہ گئی۔ میرا ماتھا عرق آلود ہو گیا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے دادی اماں کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ان کے چہرے پر سنگلاخ چٹانوں کی سی سختی ابھر آئی تھی وہ آہستہ آہستہ خواب کی سی کیفیت میں بڑبڑا رہی تھیں:

"تم سمجھتے ہو مراد کہ یہ انکشاف آج تم نے کیا ہے حالانکہ اس کا علم مجھے اس وقت سے ہے جب عطیہ ماسٹر قدیر کے عقد میں نہیں دی گئی تھی۔"

یہ انکشاف جہاں مجھ پر بم کی طرح گرا وہاں مراد کی بھی حالت بری ہو گئی۔ ہکلا کر بولا "پھر ... پھر بھی آپ نے ...."

"ہاں۔" اس کی بات کاٹ کر دادی اماں زہریلے انداز میں بولیں: "تم کیا سمجھتے ہو کہ عطیہ کو تمہارے عقد میں دے کر میں حویلی کی نئی نسل کے لیے گناہ کا ایک دروازہ کھول دیتی؟ پھر تو جس کی مرضی ہوتی غلط راستہ اختیار کر کے اپنی منزل پا سکتا تھا۔ پھر مراد سے" دادی اماں شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولیں: "تم دونوں کو اس جرم کی سزا بھی تو ملنی چاہیے تھی۔ جانتے ہو ماسٹر قدیر کتنی مشکل سے عطیہ سے بیاہ پر راضی ہوا تھا اور میں نے اسے کتنی رقم دی تھی۔"

خدا جانے دادی اماں کیا کچھ کہتی رہیں لیکن مجھ میں کچھ سننے کا یارا نہ تھا۔ میں نے اپنے تیزی سے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

○○○

• [illegible] کا جواب نہیں دیا جاتا۔

مرسلہ: فیروزی قسیم (لکھنؤ)

خریمی دسترخوان

کسٹرڈ ایک انگریزی شیریں ڈش ہے جو بڑی آسانی سے تیار کی جا سکتی ہے۔ کسٹرڈ پوڈر مختلف خوشبوؤں کے ہر بڑے جنرل مرچنٹ کے یہاں دستیاب ہو سکتا ہے ایک ہی پیکٹ خرید کر رکھ لیں اور جب چاہیں اسے تیار کر کے دسترخوان پر رکھ سکتی ہیں۔

اشیاء

کسٹرڈ پاوڈر چھ چار کے چمچے بھر کر۔ دودھ ایک کیلو۔ انڈے دو۔ نمک آمیز مکھن دو ٹیبل اسپون۔ شکر ۲۰۰ گرام۔ زیادہ میٹھا پسند ہو تو ۳۰۰ گرام۔ بالائی دو سو گرام۔ کیلے پانچ سنترے دو سیب بڑا ہو تو ایک ورنہ دو۔

تقریباً ۲۰۰ گرام دودھ نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔ بقیہ دودھ کو پکنے کے لئے رکھ دیجئے۔ جب دودھ پک کر گاڑھا ہو جائے تو شکر ملا کر تھوڑی دیر پکائیں اور اتار لیں انڈے پھینٹ کر کسٹرڈ پاؤڈر کے ساتھ اس دودھ میں ملا کر اچھی طرح ایک جان کر لیں۔ بالائی کو کسی باریک لیکن مضبوط کپڑے میں دبا دبا کر چھانیں اور اسے بھی اسی آمیزے میں ملا لیں۔ پھر مکھن ڈال کر ان سب کو اچھی طرح پھینٹ کر اس دودھ میں ڈال دیں جو چینی ڈال کر پکایا گیا ہے۔ ہلکی آنچ پر اس آمیزے کو پکائیں لیکن اس طرح کہ کسی کفگیر سے اسے مسلسل چلاتی رہیں تھوڑی دیر پکانے کے بعد اتار کر کسی کھلے برتن میں انڈیل کر ٹھنڈا کر کے فرج میں رکھ دیں۔

کھانے کے وقت کیلے اور سیب کے باریک باریک ٹکڑے کر لیں۔ سنترے کے جوے نکال لیں اور کھانے کی میز پر لگانے لگیں تو سب چیزیں ملا دیں۔ آپ پسند کریں تو صرف کیلے یا صرف سیب ہی ملا سکتی ہیں۔

سنترے کے جوے ملانا ضروری نہیں۔ کسٹرڈ کو آپ فرج میں رکھ کر کئی دن تک استعمال کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ پھل ملا کر نہ رکھیں۔ پھل استعمال کرتے وقت ہی ملائیں۔

کسٹرڈ بغیر پھلوں کے بھی کھایا جا سکتا ہے لیکن پھلوں سے لذت بڑھ جاتی ہے۔

بالائی اس کا ضروری جز نہیں ہے۔ لذت بڑھانے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ بالائی کے بغیر بھی اگر دودھ اچھا [illegible]

عِلاجِ محرومی

شمیم اختر ایم۔ اے۔ بی ایڈ

یتیم خانہ کے بوسیدہ سے گیٹ کو پار کر کے لمبی راہ داری کو عبور کرتے ہوئے وہ کمرے میں آکر ٹھہر گئی۔ آج سے اس نے اپنی زندگی کا نیا باب شروع کیا تھا۔ تنہائی اس کی قسمت میں لکھی تھی اور اس تنہائی کا واحد سہارا اس کے اپنے آنسو تھے۔ اشک ہی اس کے ہمدرد و غم گسار تھے۔ حالات نے جو طوفان اٹھائے تھے ان کی زد میں آکر وہ چور چور ہو چکی تھی۔ اب اس کی تمام کوششوں اور صبر کے صلہ میں خدا نے اس کی زندگی کو ایک نیا سہارا دے دیا تھا۔ طوفان کے بعد اب اس کی زندگی پر سکون ہو چکی تھی۔ جس محرومی نے اسے یہ دن دکھایا تھا، وہ اب اس کے لیے فراواں تھی اس کے کھیون ہار نے اسے منجدھار میں چھوڑ دیا ہے۔ اب ساحل اس سے بہت دور ہو چکا تھا۔ وہ پھر وہیں آ گئی تھی جہاں سے روانہ ہو کر ایک نئی دنیا میں گئی تھی۔ لیکن یہاں کی فضا میں بھی گھٹن تھی۔

ایک سال تک وہ حالات کے تند و تیز دھاروں میں بہتی رہی اچانک ایک دن انھیں دھاروں نے اسے ساحل پر لا پٹکا۔ ایک اشتہار دیکھ کر اس کو اپنی کشتیٔ حیات کے کنارے لگنے کی موہوم سی امید ہو گئی تھی۔ پیپر میں تھا کہ یتیم خانہ میں ایک بیوہ یا طلاق شدہ عورت کے لیے وارڈن کی ضرورت ہے، جو یتیم بچوں کو اپنی بے پناہ محبت و پیار سے نواز سکے۔ رہنے کے لیے کمرہ، کھانا اور معقول تنخواہ بھی دی جائے گی۔ ہر چند گھر میں اس کو سب نے منع کیا لیکن وہ کسی کی کوئی بات ماننے کے لیے قطعی تیار نہ ہوئی۔ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑی ہونا چاہتی تھی تاکہ وہ کسی پر کوئی بوجھ نہ بنے۔ وہ اس تلخ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی کہ چار دن بعد سماج اس کو تمام ناکردہ گناہوں سے منسوب کر دے گا اور وہ اپنے ہی لوگوں کے طنزیہ تیروں سے زخمی ہو جائے گی۔ اسی لیے اس نے درخواست بھیج دی جو منظور ہو گئی۔ اور وہ اپنی مختصر و بوجھل زندگی اپنے سامان کے ساتھ یتیم خانہ میں گزارنے چلی آئی تھی۔

وہ پتھر کے بے جان مجسمہ کی مانند چپ چاپ دل میں اٹھتے طوفان کو دباتی رہی۔ اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی مانند سلگتی رہی۔ لیکن یوں کہ ذرا بھی دھواں نہ اٹھنے پائے۔ وقت کے بے رحم ہاتھ نے اس کو ایسا مجبور کر دیا تھا کہ وہ خود اپنی حالت پر آنسو بہانے سے قاصر تھی۔ قدرت کے حسین مذاق نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ دور لان میں کھیلتے ہوئے معصوم بچوں پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر ہی اندر کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔ اب زیادہ تر اس کی آنکھیں خشک ہی رہتی تھیں لیکن آج دل کی اتھاہ گہرائیوں میں آنسوؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ ماضی کے سارے زخم ہرے ہو کر رسنے لگے۔ منزل پر پہونچ کر قدرت نے اسے شدید دھچکا پہونچایا۔ دنیا کتنی سنگدل اور بے رحم تھی یہ تو اس نے بعد میں جانا۔ آسمان کی بلندیوں پر پہونچ کر وہ یوں پستیوں کی جانب منہ کے بل گرے گی یہ تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ طنزیہ نے اس کے خوابوں تک کو چھلنی کر دیا تھا۔ مسرتوں کو ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا تھا۔

اب اس کے پاس ماضی کی تلخ و شیریں یادیں ہی اس کا بیش قیمت سرمایہ تھیں جن کو وہ باوجود کوشش کے ذہن سے جدا نہ کر سکی تھی اور گاہے بگاہے ان کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی ـــــ

"ثمن ڈیر کہاں ہو جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔" ارشد نے محبت آمیز لہجہ میں پکارا۔

"آ رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ثمن خراماں خراماں چلی آ رہی جیسے کسی ریاست کی شہزادی ہو۔

"اف اتنا بن سنور کر مت نکلا کرو۔ ورنہ میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔" اس نے والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ثمن کے رخسار شدتِ حیا سے تپ کر گلابی ہو گئے آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی گاڑی کے قریب ٹھہر گئی۔

"اب جانے کبھی یا یوں ہی دیکھتے رہیں گے۔ شادی کو اتنے دن گزر گئے لیکن آپ کی شوخیاں کم نہیں ہوئیں۔"

"کیا کروں خدا نے تم کو ایسے بے پناہ حسن سے نوازا ہے"

"اچھا اچھا بس کیجئے اب شاعرانہ باتیں ختم بھی کیجئے۔"

پھر گاڑی ایک جھٹکے سے باہر نکل گئی اور دربان نے گیٹ بند کر دیا۔

دونوں میاں بیوی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دوسرے کو بے انتہا پیار کرتے تھے۔ ساس نندیں وغیرہ بھی ثمن پر واری جاتی تھیں۔ وہ تھی بھی اتنی پیاری اور معصوم کہ ہر شخص اس کے سامنے اپنا دل ہار دے۔

ثمن متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھی لیکن حسن و کردار، اعلیٰ خصائل اور قدرت کی مہربانی نے اس کو شہر کے مشہور امیر کبیر گھرانے میں پہونچا دیا تھا۔ نہ صرف آس پاس کے بلکہ دور دراز کے لوگوں کو بھی اس کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ گھر والے خوش اور مطمئن تھے کہ ان کی لڑکی اچھے گھرانے کی بہو بن کر عیش کرے گی۔ خود ثمن کو بھی اپنی قسمت اور اپنے پرستار پر ناز تھا۔ لیکن ہر آرام و آسائش کے بعد خدا نے اس کو اب تک اولاد جیسی نعمت سے محروم کر رکھا تھا۔ اسی طرح تین سال گزر گئے۔ سسرال والوں کے انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جا رہی تھیں۔ دبے دبے الفاظ میں تو روز ہی چہ می گوئیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن ایک دن لبریز پیمانہ چھلک ہی گیا ــــ

"خدا جانے میرے گھر خوشی کب آئے گی۔ میں تو کہتی ہوں بیٹا اب تم دوسری شادی کر لو۔"

"امی حضور"۔ ارشاد نے احتجاج کیا۔ چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

"لیکن بیٹے تم ہی سوچو چار سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے ہم لوگ کب تک انتظار کریں گے۔ مجھ کو تو لگتا ہے کہ اس خواہش کو سینے سے لگائے ہوئے میں قبر میں چلی جاؤں گی۔" انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا

"لیکن .... لیکن امی حضور اس کے لیے ثمن کیا کر سکتی ہے یہ تو خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔" ارشاد نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

"کیا ناخلفوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ اسی لیے تو میں تم کو دوسری شادی کرنے کا مشورہ دے رہی ہوں۔ جب ثمن تم کو خوشی نہیں دے سکتی تو .... پھر تمہارے ابا جانی کو بھی بڑا ارمان ہے۔"

کمرے میں پردے کی اوٹ سے کھڑی ثمن سب سن رہی تھی۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لرزنے لگے ارشاد خاموشی سے کمرے میں چلے آئے۔ وہ پردے کے پاس سے ہٹ گئی۔ انجانے خوف سے دل کانپ گیا لیکن ارشاد کے .... اس کے دل کو کسی حد تک تسکین دینے میں کامیاب رہے۔

اس کے بعد تو اکثر ہی ساس نندیں ارشاد سے دوسری شادی کرنے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ ساتھ ہی ثمن پر ظلم و ستم کرنا بھی شروع کر دیے۔ کیونکہ وہ لوگ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس گھر میں ثمن کے ہوتے ہوئے ارشاد دوسری شادی کا تصور تک نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے ثمن کو دل کی گہرائیوں سے پیار کیا تھا۔ اس کو طعن و تشنوں سے نوازا جاتا لیکن وہ سب کچھ سن کر بھی ضبط کر لیتی۔ چار سال اور گزر گئے لیکن قدرت کو اس پر رحم نہیں آیا۔

"ثمن ڈیر! تم کچھ اداس نظر آ رہی ہو۔" ارشاد نے آتے ہی پوچھا اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی۔ نہیں تو۔ آپ کپڑے اتار دیئے۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی تو ارشاد نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے نزدیک ہی بٹھا لیا اور محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "ثمن میں .... میں تم کو افسردہ نہیں دیکھ سکتا۔ تم سب غموں کو بھول کر خوش رہا کرو میری خاطر۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب تک آپ میرے ہیں مجھ پر غموں کا سایہ تک نہیں پڑ سکتا۔"

"تمہارے لبوں پر نہ تو پہلے جیسا تبسم رقص کرتا ہے اور نہ ہی وہ شوخیاں ہیں۔ تم امی حضور کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔ میں تو تم کو کچھ نہیں کہتا۔ پھر خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔" ارشاد نے افسردہ لہجہ میں سمجھایا۔

"میں .... میں ....." ثمن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے آواز خوشی سے کانپ گئی۔ "میں قطعی افسردہ نہیں ہوں۔ جب آپ میرے ہیں تو مجھ کو کسی بات کی فکر نہیں ہے۔ میں امی وغیرہ کی باتوں کو محسوس نہیں کرتی آخر ان کے بھی ارمان ہیں اسی لیے .... اچھا آپ ہاتھ منھ دھوئیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور ارشاد خیالات میں غرق ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہا۔

ثمن تنہائی میں اکثر اپنے معصوم دل کو تسلی و تشفی دیتی کہ دنیا کچھ بھی کہے میرا خدا تو مجھ سے خوش ہے۔ میں اس کی محبت کے سہارے

ہی اپنی کشتی حیات کو پار لگاؤں گی۔

آخر ارشاد بھی کب تک اس صورت حال کا مقابلہ کرتا۔ پتھر بھی مسلسل پانی گرنے سے گھس جاتا ہے پھر ارشاد تو اسی دنیا کا گوشت دپوست کا انسان تھا۔ روز روز سنتے سنتے وہ بھی متاثر ہونے لگا اور اب اس کے لیے بھی ثمن کا وجود بے مقصد تھا۔ اب ارشاد کی محبت میں بھی پہلی جیسی گرمی اور جوش نہ تھا۔ ثمن تنہائی میں آنسو بہا کر دل میں لگی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کرتی۔ دل چراغ مفلس کی مانند شام ہی سے بجھا بجھا سا رہتا۔ ظلم وستم کو وہ اپنی قسمت تصور کرتی پھر بھی اس کو خدا کی ذات پر امید تھی۔ تمام مظالم کو وہ اپنی ذات تک محدود رکھتی کسی سے ذکر تک نہ کرتی یہاں تک کہ اپنے میکے والوں سے بھی نہ کہتی۔ مصلحتاً وہ خاموش ہی رہتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صورت حال جو بھی ہو وہ اپنی زندگی اسی گھر میں گزار دے گی۔

ایک دن ثمن نے دبے الفاظ میں کہا۔ "سنئے! آپ دوسری شادی کر لیجئے۔"

ارشاد غصے سے پھٹ پڑا۔ "چپ بھی رہو ثمن۔ یہ تمہارے ہوتے ہوئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

"میں اپنی مرضی اور خوشی سے کہہ رہی ہوں۔ میں خود آپ کی شادی کر کے لاؤں گی۔" ثمن نے اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا

"میں کہتا ہوں تم اپنی مرضی اور خوشی کو اپنے تک ہی رکھو۔ مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں تمہاری رائے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ثمن نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

"تمہاری موجودگی میں یہ قطعی ناممکن ہے۔" لہجہ زہرخند تھا۔

ثمن کا جسم لرز گیا۔ حسرت ویاس سے اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا لیکن وہ اس کو متحیر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اور ثمن بستر پر گر کر بے اختیار رونے لگی۔ اب اس کو یقین ہو چلا تھا کہ اس گھر میں اس کا رہنا ناممکن ہے کیونکہ اس کا مجازی خدا بھی اس کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔ ساس نے تو ظلم کی انتہا ہی کر دی تھی۔

"اے بے نا دل کون سی منحوس گھڑی تھی جب یہ منحوس اس گھر میں آئی۔ بیوی تو میرے گھر کو روشنی کے لیے ایک چراغ بھی نہ دے سکی۔ بلکہ گل کر دے گی میرے خاندان کا۔ مرتی بھی نہیں نہ ہی کم بخت پیچھا ہی چھوڑتی ہے۔ میرا ارشاد دُبلا ہوا جا رہا ہے۔ جب میرے ... کو کھا لے گی تب ہی چین آئے گا۔"

"امی حضور ..... آپ ہی سوچئے میں کیا کر سکتی ہوں۔ سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا۔"...... غم وغصہ کی وجہ سے آواز گلے میں ہی پھنس

ثمن نے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو کانپ گئی اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ وہاں اس کو اپنی بربادی کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔

"آگے بولو خاموش کیوں ہو گئیں۔ میں... میں... کہتی ہوں کہ تم ارشاد سے طلاق لے لو۔"

"نہیں۔ ایسا مت کہئے۔ آپ... آپ میری زندگی کو آخر کرنا کیوں چاہتی ہیں۔" وہ تڑپ گئی۔ اور ثمن بے اختیار رونے لگی

"نہیں۔ طلاق تو تجھ کو لینا ہی پڑے گی۔" فیصلہ کن لہجہ میں کہا گیا۔

اس کے آگے اس میں سننے کی تاب ہی کہاں باقی تھی۔ اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو گئی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ان کے پیروں کے نزدیک ہی ڈھیر ہو گئی۔ مستقبل کے تاریک سائے لہرانے لگے۔ اب اس کو اپنے غموں سے بوجھل وجود کو اٹھانے تک کی سکت باقی نہ تھی۔ آنے والے طوفان کے سائے برابر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی زندگی اجیرن ہونے لگی تھی۔ ضبط وصبر کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ ہر وقت اسے تمام گھر والوں کے طنزیہ جملے سننا پڑتے تھے۔ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ارشاد کا رویہ بھی بدل گیا۔ ان کی محبت میں بھی پہلا سا جوش وخروش اسے محسوس نہ ہوتا تھا شاید اس لیے کہ وہ ثمن کے ساتھ ہی اپنے والدین سے بھی محبت کرتا تھا جو اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر اسے دوسری شادی پر آمادہ کر رہے تھے اس کے باوجود شاید ارشاد ثمن کو طلاق دینے پر راضی نہ ہوتا۔ لیکن ایک روز ارشاد کی جیب سے ایک ایسا خط ثمن نے اس کے صبر وضبط کے بندھن کو توڑ دیا۔ یہ خط کسی لڑکی کا تھا جو ارشاد کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ اس نے لکھا تھا ... آخر آپ کب تک مجھے انتظار کی کشمکش میں مبتلا

رکھیں گے۔ ایک سال گزر گیا لیکن آپ نے اب تک
اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ میرے والدین ایسی صورت
میں کبھی راضی نہ ہوں گے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیوں
آپ اس معاملے کو ٹال رہے ہیں۔ جب آپ کے گھر والوں
کی بھی یہی مرضی ہے کہ آپ شادی کر لیں تو اس کانٹے
کو نکال پھینکئے۔ میرے والدین کو میری شادی کی عجلت
ہے، بہت سارے پیغام آئے ہوئے ہیں، اگر انہوں
نے کوئی فیصلہ کر لیا تو پھر میں کچھ نہ کر سکوں گی۔"

اسی روز شمیں نے اپنا مختصر سا سامان لیا اور اس طرح
اپنے میکے چلی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ جاتے وقت شمن
نے اس خط کے ساتھ جو ارشاد کی جیب سے اسے ملا تھا اپنا ایک
خط منسلک کر کے اپنی میز پر رکھ دیا تھا۔ خط میں اس نے لکھا تھا
"نئی رفیقۂ حیات مبارک ہو۔ اخلاقی کمزوری کے
باعث آپ مجھے طلاق نہیں دے رہے ہیں، اس لیے
اب میں خود آپ کو آزاد کر کے جا رہی ہوں اور کبھی واپس
نہ آؤں گی۔"
آپ کی شمن

میکے میں اسے بہت سمجھایا گیا۔ ارشاد نے بھی اسے کئی خط
لکھے، لیکن اس کا دل چور چور ہو چکا تھا۔ وہ نہ ارشاد کے گھر جا کر
ساس نندوں کے زہر بھرے الفاظ سننا پسند کرتی تھی، نہ ہی
والدین پر بار بننا چاہتی تھی۔ اللہ پاک نے جس نعمت سے
اسے محروم رکھا تھا، وہ اس نعمت کے اژدہام میں اپنی زندگی گزارنا
چاہتی تھی۔ اب وہ ایک دو نہیں، پچاس کے زاید بچوں کی ماں
بن گئی تھی۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہوئی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر جو ہائے
مقررہ عنوان کے تحت، سنجیدہ، سوز دل اور پاکیزہ ہو شائع کیا جاتا
ہے۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو اشعار شائع ہونے
والے ماہ سے پہلے ماہ کی ۲۰ تک وصول نہیں ہوئے شامل نہیں کئے
جاتے جولائی کے لئے عنوان "صبح" ہے اور اگست کے لئے "گھٹا"

ہجوم شوق ہے دل میں، مگر خاموش رہتے ہیں
چھپایا تھا یہ ہم نے راز تم سے، آج کہتے ہیں

مرسلہ:۔ طاہرہ تبسم اعظمی (اعظم گڑھ)

مرسلہ۔ مہرافروز فضیا۔ بیگو سرائے)

آہ وہ قبلہ جو میرا کعبۂ مقصود ہے
میری چشم شوق میں ہر وقت جو موجود ہے

مرسلہ:۔ نجمہ انصار رشا (کٹھکل)

شوق طلب ہے راہبر، جوش جنوں ہے پاسباں
سوئے مدینۂ آرزو کون ہے یہ رواں دواں

مرسلہ:۔ عصمت آرا (بالکا)

حال دل احوال غم، شرح تمنا، عرض شوق
بیخودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لال باغ۔ گھٹو)

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے

مرسلہ:۔ بی عقیلہ انجم راحلہ
(ابڑام بٹ)

دل ترک شوق کر نہ سکا، اُف یہ کیا ہوا
میری نگاہ مل گئی ان کی نگاہ سے

مرسلہ۔ نورجبیں (رجیت۔ نوادہ)

مجھ سے شوق کو دیکھیں بھی تشنگی دریا کا
مچلتا مجھ ہوا اضطراب دریا کا

مرسلہ: عظمت شفیق (آسمبر)

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مرسلہ: راحت (کرنول)

لکھ چکے ہم جا چکا خط، گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

مرسلہ: قرۃ العین (بھوپال)

بیوی پیاری تو سالیاں

عبد المجیب سہالوی

میں نے کہا مرزا صاحب! آپ کے کوئی سالی والی ہے یا خالی خولی بیوی ہی ہاتھ لگی۔ بھئی میرا تو خیال ہے کہ سالیاں نہ ہوں تو شادی کا آدھا مزا رہ جاتا ہے۔

مرزا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا سالیاں تو ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ ان کو قریب قریب ساس کا درجہ دیا جاتا ہے اور ہنسی مذاق نہیں کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا سالیاں اگر ادھار دیے جانے کا رواج ہوتا تو اللہ نظر بد سے بچائے میری اپنی درجنوں سالیوں میں سے ایک آدھ سالی آپ کو دے دیتا۔

مرزا نے کہا رواج کی کیا بات ہے رواج تو ہمیں لوگ بناتے ہیں شروعات کر دو رواج ہو جائے گا مگر۔ بتاؤ ہیں کیسی؟

میں نے کہا بڑے مزے میں آگئے جیسے آپ کو اپنی سالیاں دے ہی تو دے رہا ہوں آپ کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں دیکھ لیجئے گا تو ڈھیروں پانی منہ میں آنے لگے گا۔

مرزا نے کہا تمہاری سالیاں کیا رس گلا ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو بھئی بخشو آج کل ایسے ہی چیونٹیوں کی وہ افراط ہے کہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ وہ پہونچ نہ جائیں بستر پر لیٹنا مشکل ہو رہا ہے ذرا آنکھ لگی کہ چپ سے کبھی آنکھ میں کبھی کان میں کاٹ لیا اور نیند غائب ہو گئی۔

میں نے کہا اگر آپ رس گلا قسم کی سالیاں نہیں چاہتے تو آپ راجہ مہندی علی خاں سے رابطہ قائم کیجئے کیونکہ ان کی سالی نے ان سے شکایت کی تھی کہ

جانے کیا اس وقت ہوتی میری گر کالی نہ ہوتی آپ کی کچھ اور ہوتی آپ کی سالی نہ ہوتی خیر کالی ہوں تو کیا ہے دل نہیں ہے میرا کالا کر ہی لے گا مجھ سے شادی کوئی دولہا بھولا بھالا

میں نے کہا ظاہر ہے کہ آپ سے زیادہ بھولا بھالا کون ہوگا کہ آپ نے پتہ لگائے بغیر کہ آپ کی ہونے والی بیوی کی کوئی چھوٹی چٹپٹی بہن ہے کہ نہیں شادی رچالی اور اب ماتھے پر ہاتھ رکھے جوڑی کا رونا رو رہے ہیں۔ مجھے دیکھئے میں نے بیوی کے دیکھنے کا کام بہنوں پر چھوڑ دیا اور سالیوں کے متعلق خود براہ راست پتہ لگایا اور اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ غالب صاحب کے آموں کی طرح وہ بھی بہت ہیں اور ڈھیر ساری ہیں تب میں نے شادی کے لئے ہاں کی۔

مرزا نے کہا سالی کوئی اپنی چیز ہے جو اچھی ہونے والی تھی اور پتہ لگا لیا تھا اور تم جانتے ہو کہ تمہاری بھابی ہزاروں میں ایک ہیں

مرزا جملہ پورا بھی نہیں کر پائے تھے کہ میں نے کہا آپ تو غلط کر رہے ہیں۔ ہماری بھابی ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہیں اسی لئے تو آپ ان کو دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔

مرزا نے کہا تو پھر سالیوں کا کیا سوال ہے چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی۔ کالی ہوں یا گوری۔ مثل مشہور ہے۔

کان پیارے تو بالیاں
بیوی پیاری تو سالیاں

میں نے کہا مرزا صاحب گھر کی مرغی دال برابر۔ شادی کے بعد بیوی گھر کی ہو جاتی ہے۔ ہاں سالیوں کی حیثیت پلاؤ زردے کی سی باقی رہتی ہے۔

مرزا نے کہا اس پلاؤ زردے سے کیا فائدہ جو دوسرے پلیٹ میں رکھا ہو اور ہم ندیدے پن سے دیکھ سکتے ہوں کھا سکتے ہوں۔

میں نے کہا مرزا صاحب معاف کیجئے گا سماج نے سالیوں کو صرف دیکھنے کی اجازت دی ہے آگے نہ بڑھئے گا ورنہ چندیا کے بال بھی غائب ہو جائیں گے۔

اس کے بعد مرزا اپنی چندیا سہلانے لگے۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہوسکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجی جائے۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں، ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کا ذمہ دار ادارہ نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کردی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• شبیر احمد (کھیری) میرے بھائی زین العابدین اور بھابھی شگفتہ یاسمین کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۶ اپریل ۸۳ء بروز بدھ بوقت ۶ بجے شام، بمقام بھاگلپور ایک دختر عطا فرمائی۔ نام شکیلہ یاسمین رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• سعیدہ پروین۔ ساجدہ یاسمین (آمبور) ہماری باجی عظمت ترنم صاحبہ اور انکل فاروق احمد صاحب کو اللہ پاک نے ۹ فروری ۸۳ء کو پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام فیروز رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغامات نشاط

• عزیزی رعنا سلمہا (دختر نیک اختر بیگم اسرار مسعود و سید اسرار مسعود صاحب۔ ریت گھاٹ بھوپال) کی شادی ہمراہ پرویز صدیقی سلمہ (پسر جناب عبدالماجد صدیقی) بمقام پری پارک، جم خانہ شاہجہاں آباد بھوپال، بتاریخ ۵ مئی ۸۳ء بروز بدھ بوقت ۸ بجے شب، بحسن و خوبی انجام پائی جس میں معززین شہر، عزہ اور اقربا کے ساتھ ہی یہ حقیر راقم التحریر بھی شریک تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک بھتیجی رعنا سلمہا اور پرویز سلمہ ہمیشہ شیر و شکر بنکر پر مسرت زندگی گزاریں۔ (نسیم انہونوی)

• مولانا منظور نعمانی صاحب کے فرزند محترم حفیظ النعمانی صاحب کے فرزند اکبر شمعون نعمانی سلمہ کی شادی ۹ مئی ۸۳ء کی شب میں بارہ دری قیصر باغ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۱۲ مئی ۸۳ء کو حفیظ نعمانی صاحب کی صاحبزادی عالیہ نعمانی سلمہا کا عقد نکاح عمل میں آیا۔ اسی سلسلہ میں حفیظ صاحب نے شمعون نعمانی سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں ایک شاندار عشائیہ بھی دیا جس میں معززین شہر، شعرا اور ادیبوں نے شرکت فرمائی۔ میری دعا ہے کہ شمعون سلمہ اور عالیہ سلمہا کی یہ شادیاں کامیاب ہوں اور دونوں کی جوڑیاں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ (نسیم انہونوی)

• سید محسن رضوی صاحب کی صاحبزادی شاہندہ سلمہا کی شادی ممتاز سلمہ کے ساتھ ۱ مئی ۸۳ء کی شب میں بمقام سینٹ جونس کالج وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• اودم شائستہ رحمٰن (پرنام بٹ) میرے بھائی شمیم نام حافظ عبدالاعلیٰ صاحب اور عزیزی صبیحہ بانو ۲۰ مارچ ۸۳ء بروز اتوار بمقام نئی مسجد پرنام بٹ میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ دعا ہے کہ دونوں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• حذیفہ راحت و فوزیہ نکہت (امبور) ہماری سہیلی فرحاد پروین (خریدار حریم) کی شادی کلیم الرحمٰن کے ہمراہ ۱۰ اپریل ۸۳ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• عقیلہ انجم راحلہ (پرنام بٹ) میرے ماما سمیع اللہ (فرزند حاجی عبدالکریم صاحب مرحوم) کی شادی حوا ناز (دختر حاجی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۲۰ مارچ ۸۳ء بروز اتوار بحسن خوبی انجام پائی۔ دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

• مفتی محمد رضا انصاری صاحب (لکھنؤ) کی صاحبزادی عزیزی [illegible] سلمہا کا عقد سید محبوب علی وارثی سلمہ کے ہمراہ ۶ مئی ۸۳ء کی شام کو بمقام فرنگی محل لکھنؤ نہایت سادگی سے انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے اور [illegible] سلمہا کی ازدواجی زندگی پر بہار گزرے۔ (نسیم انہونوی)

• رشید احمد حسین اے سید صاحب نے اپنے فرزند جاوید حسین سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو مہر النسا سلمہا (دختر فخر الدین، وی سید [illegible]) کے ہمراہ ہوئی، ایک شاندار [illegible] ۱۰ مئی ۸۳ء [illegible] بھائی لال بھائی [illegible]

شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• نواب کاظم علی خاں صاحب کی صاحبزادی نجمہ بانو سلمہا کی شادی ہمراہ انیس احمد سلمہ (فرزند [illegible] سردار احمد صاحب نجور، لکھنؤ) بمقام ہوٹل کلارکس لکھنؤ میں ۲۲ مئی سنہ ۸۳ء کی شب میں بڑے تزک احتشام کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• [illegible] جناب عرفان عباسی کی صاحبزادیوں نازہ عباسی سلمہا اور زرینہ عباسی سلمہا کی شادیاں بالترتیب ہمراہ عبدالقدوس صدیقی سلمہ و اقتدار حسین عباسی سلمہ ۱۰ مئی سنہ ۸۳ء کو جعفر منزل لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائیں۔ بہت سے معززین، شعرا اور ادبا نے شرکت فرمائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• تاج محمد صاحب (لکھنؤ) کی صاحبزادیاں، عروس انجم و شبینہ انجم سلمہا اللہ تعالیٰ کی شادیاں بالترتیب ہمراہ محمد باقر ابن محمد عمر صاحب [illegible] مرحوم (الہ آباد) و ڈاکٹر محمد شفیع سلمہ (فرزند جناب نور محمد، گونڈہ) ۸ مئی سنہ ۸۳ء کی شام کو رفاہ عام کلب لکھنؤ میں شان و شوکت سے انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• عبدالباسط خاں صاحب (بھوپال) کی صاحبزادی طلعت یاسمین سلمہا کی شادی ہمراہ سید احمد علی سلمہ (پسر سید محمود علی صاحب) ۸ مئی سنہ ۸۳ء بوقت ۱۰ بجے شب بمقام تاج ڈیرس بدھوارہ بھوپال بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• سلمیٰ بی بی سلمہا دختر نیک اختر جناب قاسم خاں [illegible] بکڈپو حیدرآباد کا عقد مسعود ہمراہ عزیزی ریاض احمد سلمہ فرزند نجم الدین صاحب ۱۹ مئی سنہ ۸۳ء کی شب میں بمقام جماعت خانہ سلیمانی حیدرآباد بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• نیر و فاطمہ [illegible] (میرے [illegible]) عزیزی نعیم اختر سلمہ کی شادی یاسمین [illegible] دختر نیک اختر جناب دوست محمد خاں، شاکر [illegible] کے ہمراہ [illegible] مئی سنہ ۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• [illegible] آپ کا دعوت نامہ ۳۰ اپریل کو ملا تھا۔ [illegible] اور [illegible] سلمہا کی شادی کی تفصیل [illegible]

انتقال پر ملال کی خبریں

تابندہ مصباح (تاج منزل کانپور) افسوس صد افسوس میرے ماموں اخلاق احمد صاحب ۱۶ مئی سنہ ۸۳ء بروز اتوار بوقت ۶ بجے صبح اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم صرف ایک گردے پر ۱۲ سال تک حیات رہے۔ پھر ان کی بہن نے اپنا ایک گردہ انھیں دیا جس سے مزید ۱½ سال بقید حیات رہے۔ ان کی عمر صرف ۵۰ سال کی تھی۔ والدین یہ سانحہ دیکھنے کے لئے بقید حیات ہیں۔ ایک بیوہ ایک [illegible] اور ایک دختر اپنی یادگار چھوڑی۔ اللہ پاک ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

[illegible] عورت کے لیے اور کون سی سزا ہو سکتی ہے!

[illegible] ایک [illegible] ان کے دماغ میں [illegible] تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے چھا جاتی [illegible] واقعات [illegible] آنکھوں تلے ہوئے تھے۔ وہ گھر کی ایک بزرگ [illegible] تھیں۔ انہیں اس سانحہ کا سخت افسوس تھا لیکن وہ سوچ رہی تھیں کہ [illegible] کی بے جا اور نامناسب ہٹ دھرمی نے غفلی سے واقعہ کو اتنا تکلیف دہ [illegible] بے چاری کو سب کچھ پتہ تھا لیکن وہ منہ نہیں کھول سکتی تھی۔ پھر انہوں [illegible] کیا کہ چاہے جو کچھ ہو جائے۔ وہ ایک بار غضنفر کو سمجھائیں گی ضرور!

اس روز ناشتہ بڑی دیر میں ہوا۔

غضنفر نے اپنا ناشتہ واپس کر دیا تھا۔ بڑی بی کو بہانہ ہاتھ آیا۔ شہنائی سے بولیں:

"لا بیٹی کشتی مجھے دے۔ میں اسے سمجھا بجھا کے کھلا آؤں گی۔ بچپن میں بھی جب وہ ماں سے کسی بات پر روٹھ بیٹھتا تھا تو میں ہی اسے مناتی تھی۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اللہ رکھے اس کے بچے جوان ہو چکے ہیں مگر میرے لیے تو وہ اتنا ہی [illegible] ہے جیسے میں اپنے پیروں پر ڈال کر نہلاتی دھلاتی تھی۔"

بڑی بی کی لن ترانی شہنائی کو کچھ اچھی نہیں لگی تھی مگر بے دلی سے کشتی انھیں [illegible] دی اور بازو سے پکڑ کر انھیں کمرے کے دروازے تک چھوڑ بھی آئی! [illegible] کے اصرار و انکار کا تماشہ دیکھنے کو وہ وہاں رکی نہیں تھی۔!

آہٹ سن کر غضنفر نے دیوان کے تکیے سے سر اٹھایا اور اٹھ بیٹھے۔ بڑی بی [illegible] ناشتہ لگا رہی تھیں!

"[illegible] تھوڑا سا منہ جھٹال لو۔ ایسا بھی کیا غصہ۔؟" بڑی بی [illegible] "اور پھر ناشتے کھانے سے کیا بیر ہے؟"

[illegible] ڈاکٹروں نے اب کی بار صاف کہہ دیا تھا کہ اگر دوبارہ کوئی ذہنی [illegible] پہنچ گیا تو پھر ان کا جانبر ہونا مشکل ہوگا! ڈاکٹروں کو بھی تعجب تھا۔ [illegible] غم یا کمی ان کی زندگی میں ایسی نمایاں نہ تھی جو بار بار انھیں موت کے دروازے تک کھینچ لاتی۔ وہ ایک عمدہ عہدہ پر تھے۔ باعزت زندگی گزارنے کے [illegible] اور وسائل تھے۔ خدا نے اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ سعادت مند بیٹے [illegible] ہونہار خدمت گزار بیٹی تھی۔ بھرا پرا خاندان تھا۔ بھائی بہن سب کے سب [illegible] جاں نثار اور محبت کرنے والے۔ پھر بباطن غم کا کون سا گھن انھیں کھوکھلا کیے دے رہا تھا!

رات تک گھر میں کئی دھماکے ہوئے۔ نوید، سدید، نوشینہ کے چار دو [illegible] لڑکے آ موجود ہوئے۔ مظفر اور جعفر بھائی کے پاس آ بیٹھے۔ ان سب کو تعلق تھا آخر جمشید کے فرار کا محرک کیا تھا؟

یاسر نے اپنے ماموں کے کان میں کہہ دیا تھا کہ جمشید ان کے پاس ہے۔ اس خوش خبری نے غضنفر کے تنِ مردہ میں نئی روح تو پھونک دی تھی مگر جمشید کے اس طرح علم و اطلاع کے بغیر چلے جانے کا صدمہ جو انھیں پہنچا تھا وہ ناقابلِ برداشت تھا؟ ردِ عمل کے طور پر غضنفر کو بستر پر گرا گیا تھا!

گھر کے سب افراد وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے! سیما بھی تھیں۔ بالکل قطعی بے تعلق اور انجان سی۔!

دفعتہً غضنفر نے یاسر سے پوچھا۔ "بیٹے۔ کیا واقعی اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ اب اس گھر میں میرے پاس آنا پسند نہیں کرتا؟"

"بڑے ماموں جان۔" یاسر ادھر ادھر دیکھ کر [illegible] "میں کیا بتاؤں مجھے بھی [illegible] نہیں [illegible]۔ اور [illegible] نے [illegible]"

[illegible] جعفر نے کہا۔
"مجھے بالکل اشتہا نہیں بھائی،" غضنفر نے کہا۔ "کھانے کے بعد [illegible] چائے پیا تو مجھے بھی ایک پیالی دے جانا۔ بس۔"

ان سب کے اٹھ جانے کے بعد غضنفر آرام کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر جا [illegible]ے۔ اور سیما کو قطعی نظر انداز کر کے شال سینے تک کھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ [illegible]کے اور آگ لگ گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سیما نے انھیں مخاطب کیا:
"میں کہتی ہوں۔ اگر وہ وہاں خوش ہے تو آپ اسے یہاں بلانے کا اصرار [illegible] کیوں کر رہے ہیں؟"

خون کے گھونٹ کی طرح غضنفر نے ان کی یہ بات پی لی۔ اور کچھ نہ بولے۔

سیما نے پھر کہا:
"آپ لوگ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ گھر کا ہر [illegible] بس آپ ہی سب ہیں۔ میں باہر سے آئی ہوں۔ یہاں کے اچھے برے میں میرا کوئی دخل، کوئی اجارہ ہی نہیں ہے۔ مجھے آپ لوگ غیر سمجھتے ہیں اب یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔"

"تمھاری یہ [illegible] مگر اس کا مطلب میں نہیں سمجھا۔" بالآخر غضنفر نے برہم ہو کر کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں [illegible] کیا چاہتی ہو۔ کس نے تمھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ کس کی شکایت کر رہی ہو تم مجھ سے؟"

"شکایت وکایت مجھے کسی سے نہیں ہے،" سیما نے بے رخی سے جواب دیا۔ "میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ اپنے بچوں پر آپ کی طرح مجھے بھی حق ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ تمھارا حق نہیں ہے۔۔۔!"

"تو پھر میری بات مانیے کہ اب اس گھر میں شہلا نہیں آئے گا۔"

شہلا کو کیا وہ نہیں [illegible] اس کے پیار سے [illegible]
کچھ کہا ہو۔ وہ اب [illegible] نرم آواز میں بہت [illegible]
تھے۔ ان کی آنکھوں سے محبت ٹپکتی تھی۔ ان کے [illegible] اس کے لیے [illegible] تھا۔ مگر اس وقت [illegible] وہ کانپ گئی [illegible] دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ کتنے عجیب اور نئے لگ رہے تھے [illegible]۔ داڑھی [illegible] کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔ بال بکھر کے ماتھے تک جھک آئے تھے۔ آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نیم روشن [illegible] کے ایک حصہ میں کھڑے وہ کتنے خوف ناک اور غضب ناک لگ رہے تھے۔!

سب دم بخود تھے۔ غضنفر کے تیور بدلے دیکھ کر ان کے سامنے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ایک بار اور آگے بڑھ کر سیما کو روک لیتے۔ حتیٰ کہ وہ چلی گئیں۔!

[illegible] اور [illegible] بچا کھانا [illegible] اور [illegible] گھبرا کر [illegible] کو دیکھے وہ بھی شروع سے آخر تک اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ [illegible]۔!

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور سناٹا گہرا اور بوجھل سا معلوم ہونے لگا تھا۔!

"بیٹھیے بھیا۔" دیر بعد ظفر نے حواس [illegible] پوچھا۔ "شہلا کو آخر [illegible] بھی کیا غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ آپ سے [illegible]۔"

[illegible]

کہا [illegible]

[illegible]

شہلا [illegible]

[illegible] بچا اسکے [illegible] سمجھایا۔ "آپ لوگوں کو کوئی خطرناک غلط فہمی ہو گئی ہے [illegible] اور شرافت سے [illegible] جا سکتی ہے۔ تم سے سیما، آپ [illegible] سوچئے تو وہ کیا کہیں گے۔ ہم لوگ کتنے جاہل اور ..."

"ابھی تو ساری دنیا کہے گی۔ جب میں اس کا طلاق نامہ اخباروں میں چھپواؤں گا" غضنفر نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔" آپے سے باہر ہو کر سیما نے کہا اور چیخ کر شہابی کو آواز دی "چل میرے ساتھ۔ اب بھی سویرا ہے۔ تیری کمائی میں تیرے باور کو کھانے نہیں دوں گی!" اور بس غضنفر کا ضبط رخصت ہو گیا۔ ایکبارگی انھوں نے اٹھا ہاتھ اسی زور سے سیما کے منہ پر رسید کیا کہ ایک چیخ مار کر وہ دیوار سے ٹکرائیں اور خون تھوکنے لگیں۔!

پھر [illegible] قیامت برپا ہو گئی۔!

اور پھر سیما نہیں رکیں۔ سب نے ہزار ہزار انسانوں کی منت و خوشامد کی۔ ہاتھ پاؤں جوڑے۔ لیکن ایک ان کی 'نہیں' دوبارہ 'ہاں' میں نہیں بدلی۔ وہ زار زار روتی رہیں [illegible] پھر ایک آخری نظر [illegible] پر ڈال اور [illegible] سے [illegible] چلی گئیں۔ [illegible] کہ آخر یہ [illegible] ہوا تھا۔

[illegible] ماں کے ساتھ [illegible] کے لیے [illegible] کی طرف [illegible] کر گیا تھا۔

"کیوں نہیں آئے گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہو جائے۔!"

"اور وہ گھر میں آئے گا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ آپ اچھی طرح یاد رکھئے"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے سیما۔ میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں کہ اس بچے نے تمہاری [illegible] باندھ رکھا ہے۔ دلار پیار تو ایک طرف رہا تم اسے نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ اس نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ اس کی دشمن ہو گئی ہو؟"

"اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ کیوں فدا ہیں اس پر۔ کون سی چیز نے آپ کو گھول کر پلا دی ہے کہ اس کی محبت میں آپ اپنے بچوں کو بھی فراموش کر گئے ہیں۔ آپ کی آنکھوں پر کسی منتر کی پٹی بندھ گئی ہے۔ آپ کو اس کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتے۔!"

"سیما۔ دیکھو۔ دماغ درست رکھو۔ اور زبان کو بھی اتنا بے لگام نہ بناؤ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اس جھگڑے کا انجام بہت برا ہوگا۔ یا تو میں تم سے قطع تعلق کر دوں گا یا پھر گھر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہے۔ تمہارے ساتھ میرا گزر اب ناممکن ہے۔!"

"اب؟ بڑھاپے میں؟" سیما نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ بڑھاپے میں آدمی کو آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت زیادہ ہوتی [illegible]"

"تو پھر جو آپ کا دل چاہے کیجئے۔ میں سب باتوں کے لیے تیار ہوں۔ میرا بھی آپ کے ساتھ نباہ ناممکن ہے۔ میں بائیس سال سے دوزخ میں جل رہی [illegible]

ورنہ میں کوشش کرتا کہ اس دوزخ سے تمہیں جلد نجات ہو جائے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ایک فیصلے کے بعد اپنی اپنی جگہ دونوں کو سکون مل جائے گا۔! تو پھر آزاد کر دو تمہیں!۔"

"اب تو آپ کی یہی تمنا ہو گی۔ بہت دن صبر کیا ہے نا آپ نے؟" سیما کے طیش و غضب کا کیا پوچھنا تھا۔ منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ "میں دیکھ رہی ہوں آپ کی بے قراری مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔"

"سیما۔ یہ بتاؤ۔ ان جلی کٹی باتوں سے آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"میں لگی لپٹی نہیں رکھتی۔ سچ کہتی ہوں۔ اور سچی سچی باتیں آپ کو جلی کٹی لگتی ہیں۔ ابھی کچھ اور کہہ دوں گی تو پھر زیادہ تپنے لگیں گے۔!"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" غضنفر نے شال الگ پھینکی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "کرو اور سچی باتیں کرو۔ میں بھی اطمینان سے سن لوں۔ ممکن ہے کہ آئندہ تمہیں کہنے اور مجھے سننے کا موقع نہ ملے۔"

"اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے کہ اب آپ کا لاڈلا بیٹا اس گھر میں نہیں آسکتا۔"

"میرا لاڈلا بیٹا؟" حیرت سے غضنفر نے پوچھا۔ "تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا۔!"

"سمجھ گئے ہیں آپ۔ انجان مت بنیئے۔"

اچھا تو پھر

تو پھر یہ کہ۔ اب وہ اس گھر میں داخل نہیں آسکتا اور میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔ ہمیں بائیس سال سے زیادہ ہو رہے ہیں۔" اچانک سیما کو رونا آگیا "شروع سے ہی آپ کی بیٹی کی مخالفت اور نفرت کا زہر پی آ رہی ہوں۔ کبھی آپ کو

تنہائی میں کھانے اسی میں چھپ لے۔ بھابی وہ بڑے بھیا کے دوست ہیں تو اسے بڑے بھیا نے اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ــــ"

"تمہارے بڑے بھیا نے اسے اس قابل کر دیا ہے کہ وہ ان کی جوان بیٹی سے دیدے لڑا اس سے ہنس ہنس کے پیار و محبت کی باتیں کرے۔ اور یہ۔ دیدہ دلیر چھوکری۔" انھوں نے شہابی کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "کالج میں پڑھ کے اتنی چلبلی نکلی کہ میٹھی میٹھی بولیاں بولتی ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے کہ اس گھر سے نہ جائے اے ان پر خدا کی مار ــــ بے غیرت کہیں کے۔!"

"ممی۔!" شہابی چیخی اور اٹھ کر بھاگ گئی۔

"بھابی!۔" ظفر اور جعفر بھی بڑے ناگوار انداز میں بولے۔

دفعتہً وہاں غضنفر بھی آگئے۔ ان کا چہرہ دونوں غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹ پھڑک رہے تھے۔! انہوں نے غصّہ کے مارے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ظفر اور جعفر اس پتھر سے تم لوگ سر مت پھوڑو۔ یہ اس طرح قائل نہیں ہو گی۔ اس کا بس ایک علاج ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت اسے طلاق ــــ!"

"آگے کچھ منہ سے مت نکالئے بڑے بھیا۔" ظفر نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ لیکن غضنفر نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور سیما کی طرف دیکھ کر نہایت سرد آواز بولے۔ "تمہیں زہر اگلنا تھا تم نے اگل دیا۔ اب میں خود اپنے منہ سے کہتا ہوں باہر میری ایک آدھ نہیں متعدد داشتائیں ہیں۔ اس گھر میں اور گھر کے باہر بہت میرے ناجائز بچے ہیں۔ اب میں انہیں کے درمیان زندگی گزاروں گا۔ تم بڑی شوق سے ایک بار ضرور بہا لینا۔ تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔ دوبارہ تمہاری شکل پر نظر پڑی تو ۔۔۔ جاتا۔!"

"آپ دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ بڑے بھیا۔" جعفر نے خود بھی پاگل ہو کر کہا۔

نہیں کرتی۔ وہ آوارہ ہے۔ کسی طوائف کا خون ہے۔ اس میں سارے چرترابھی
مل گئے ہیں۔ میری پاک نہایت معصوم بچی کے دل میں وہ اپنا زہر اتار رہا ہے۔ ہزار دفعہ
میں نے اس خبیث کو شہابی کے ساتھ ہنس ہنس کر مکر کی باتیں کرتے دیکھا ہے۔ یہ ذلیل
چھوکری بھی اس کے ساتھ دانت نکال کر ہنستی ہے۔ سنا تم نے۔ میں اس کی آنکھیں
پھوڑ ڈالوں گی، شہابی کو زہر کھلا دوں گی۔ عشق بازی کے یہ بے حیا ناٹک میرے
گھر میں میری آنکھوں کے سامنے نہیں ہو سکتے۔!"

"ممی۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ممی میں انھیں اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں!"
شہابی چیخ کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی توہین کے مارے آنسو بھر آئے! بجلی
بھی چمک گئی تھی۔!

"آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے بھابی۔" جعفر نے سیما کا ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔
اور پیار بھرے نرم لہجہ میں بولے "خدا کے لیے آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے۔ آپ کتنی غلط باتیں
کہہ رہی ہیں۔!"

"بس میں کہہ چکی۔" سیما سر سے پاؤں تک شعلہ جوالہ بنی تھیں۔ "تمھیں اپنی دوسری
شادی مبارک۔ سوکن کے ساتھ اس گھر میں میرا گزر نہیں ہو سکتا!"

"سوکن۔ حد ہو گئی۔ ارے آپ کو ہو کیا گیا ہے۔" ظفر ہنس پڑے۔ "آپ نے
کوئی خواب دیکھا ہے۔ آپ اب بھی سو رہی ہیں۔ بڑے بھیا کو آپ شادی سے پہلے
جانتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے۔!
آپ خدا نخواستہ سوکن کے سے نامناسب الفاظ منہ سے کیوں نکال رہی ہیں۔
بھابی سوچئے تو کیسے بھیا پر یہ اتہام ہے۔!"

"اور بھابی۔ کچھ غلط فہمی آپ کو جمشید کے متعلق بھی ہو گئی ہے۔" جعفر نے سمجھایا۔
"ہرگز اتنا کم ظرف کمینہ نہیں ہے کہ جس گھر میں رہے اسی کی بنیادیں کھود ے۔ جس

مجھ سے محبت نہیں ہوئی اس عرصہ میں کبھی آپ نے ہنس کے مجھ سے بات نہ
کی۔ میری دکھ بیماری میں مجھے الٹ کے نہ پوچھا۔ مجھے اپنے گھر کی مشین کا ایک پرزہ
پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا اور بس۔"

"یہ رونا دھونا محض بیکار ہے۔" غضنفر نے خشک لہجے میں کہا۔ "عجب
حالات کے آئینہ میں تمھیں صرف میری شکل دکھائی دے رہی ہے۔ اپنا چہرہ
تم بھول گئی ہو۔ تم نے اپنی زبان کے کیسے کیسے خنجر میرے دل پر نہیں چلائے
یاد نہیں ہے تمھیں؟"

"نکل جائیں گے یہ خنجر۔ آپ نے خواہ مخواہ اماں باوا کے ڈر سے میرا عذرا
کیوں گلے لگا لیا۔ تبھی طلاق دے دیتے اور اس چہیتی کے ساتھ مزے سے زندگی
جس کی یاد کی خلش پچیس برسوں میں بھی آپ کے دل سے نہیں مٹی۔"

"اب اس بکواس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"ہونہہ! آپ مجھے جھٹلا دیجئے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔" سیما نے کہا۔ "لیکن
اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتی۔!"

وہ چپ رہے۔ اگرچہ کہ جگر پھنک رہا تھا۔

"میرا کانٹا درمیان سے نکل جائے۔ بس آپ کو چین آ جائے گا۔ آپ اپنی منظور
کو گھر میں لائیے۔ اپنے بیٹے کو لے آئیے۔ مزے میں زندگی گزار دیئے۔ میری وجہ سے
اپنا راحت و آرام کیوں برباد کرتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ میں اپنی بچی کو لے کر
کے پاس چلی جاؤں۔ اس کی تباہی میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی۔!"

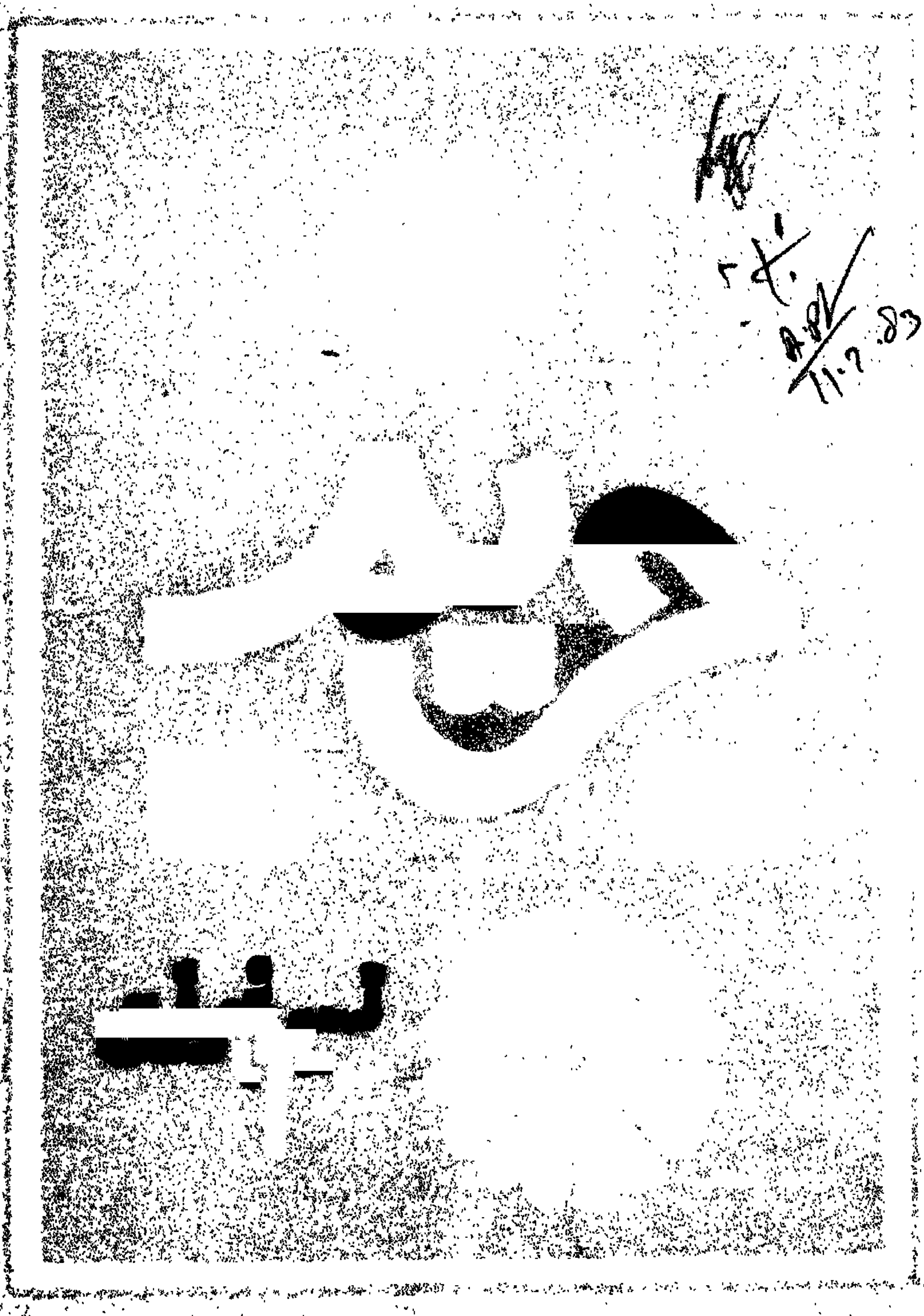
"سیما۔!" غضنفر نے ان کی طرف رُخ پھیر کر بڑی متانت اور سادگی سے
"جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سب بے معنی ہے بجائے کہ وہ جو ہوں نے تمھیں گھیرا ہے۔ تم
سمجھتی ہو کیا کہ [illegible]

فائدہ کیا ہے ہم خود سوچو ہم میاں بیوی ہیں لیکن ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے
اپنے کم و بیش پچیس سال اس سرائے کے مسافروں کی طرح گزار دیئے ہیں۔ ایک
دوسرے کے اچھے برے محسوسات سے قطعی بے نیاز۔! سیما۔ اگر تمہیں اپنے نامناسب
سلوک کا اعتراف ہے تو مجھے بھی اپنی لاپرواہیوں کا احساس ہے۔ لیکن جو کچھ گزر
چکا۔ اس پر لعنت بھیج کر کیا ہم از سر نو پر سکون زندگی نہیں گزار سکتے۔ بڑا تعجب ہے کہ
تم اس عمر میں مجھ سے طلاق کی طالب ہو؟ جب کہ ہمارے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ ہم نے
انہیں پروان چڑھانے میں اپنی زندگیوں کا خون صرف کیا ہے۔ انہیں پھلتا پھولتا دیکھنا
اور ان کی خوشیوں سے خوش ہونا ہمارا کام ہے۔ ذرا تو سوچو کہ تمہارے نامناسب مطالبہ
اور ہماری مفارقت کا ان پر کیسا عجیب اثر پڑے گا؟ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔
تمہیں اپنی ماں کہتے شرمائیں گے۔! ان کے مستقبل تباہ ہو جائیں گے۔ سیما۔ سوچو۔
اب ہماری یہ عمر نہیں۔ نا سمجھ لڑکے لڑکی کی طرح بات بات پر روٹھنا اور بگڑنا ہمیں سزاوار
نہیں ہے۔ اب ہمیں اپنی زندگیوں کو پس پشت ڈال کر اپنے بچوں کی زندگیاں بہتر
بنانے کی تدبیریں سوچنا چاہئیے۔"

"میرا کوئی قصور نہیں۔ جس پر مجھے بچوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے"
سیما نے غصہ کے لہجہ کے جواب میں کہا۔ "آپ اللہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے"
"تم اپنی بد زبانی سے باز نہیں آ سکتیں" دفعتہً غضنفر کو غصہ آ گیا۔ "دو تین مرتبہ
تم نے میرے چال چلن پر حملہ کیا ہے۔ کسی منظور نظر کا تذکرہ کیا ہے۔ میرے قول
و فعل میں تضاد کی شکایت کی ہے۔۔۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا دیکھا ہے؟
تم نے اس بہانہ طلاق کا مطالبہ کیا ہے۔"
[illegible] اس بات سے بھی [illegible] کہ آپ کی کوئی چہیتی داشتہ آپ
[illegible] آپ [illegible] رکھتے

سوچے بغیر [illegible] آپ [illegible]
فرط غیظ سے کانپتے ہوئے غضنفر نے کہا۔ "تمہاری ان [illegible]
میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ ورنہ میں تمہارا [illegible] دیتا۔ نکال [illegible]
سے۔ شکل نہ دیکھتا تمہاری عمر بھر۔"
"تمہیں کبھی کوئی کمی نہیں ہوتا ہے۔" سیما نے روتے ہوئے [illegible]
جلتی جلتی آنکھوں سے غضنفر اس دروازے کو [illegible]
تھیں۔!
دالان میں ظفر نے سیما کو روک لیا۔ اور [illegible] حیرت سے [illegible]
ہے بھابی۔ آپ اس طرح رو رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے؟"
"تم اپنے بھائی کو سمجھاؤ اپنا گھر [illegible]
نے چلا کر کہنا شروع کیا تا کہ ان کی آواز باہر غضنفر تک [illegible]
باہر کھڑے سوچ رہے اور غضنفر کے پیچ و تاب میں چند درجہ اضافہ کر [illegible]
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی؟" ظفر نے [illegible]
"سمجھو ہے آنکھیں بند کر لی ہیں" سیما [illegible]
کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اکیلی ہو جو دیکھی ہو [illegible]
یا چھوٹے بھائی ہے کہ [illegible] ان سے [illegible]
کے بندی کی آنکھیں انہیں [illegible]
کے ساتھ میرے گھر میں رہے گا۔"
"آپ جمشید کے متعلق کہہ رہی ہیں بھابی؟" [illegible]
ظفر نے کہا۔
"ہاں ہاں جمشید کے متعلق [illegible]

786



ٹیلیفون نمبر آفس - ۴۴۵۵۴ ٹیلیفون نمبر پریس - ۴۵۳۳۲

حریم

ماہنامہ لکھنؤ

ہندوستان کا سب سے قدیم ماہنامہ ہے جو گذشتہ ۵۳ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا پرچہ ہے۔

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ادارہ حریم و نسیم بکڈپو لکھنؤ کی جانب سے تمام حریمی بہنوں، بھانجیوں اور بھتیجیوں کو

عید مبارک ہو

جلد (۵۳) فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۸۳ء نمبر (۷)

اڈیٹر و نگراں ۔ نسیم انہونوی

معاونین :۔ شوکت جہاں بیگم غزالہ ـــــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	ستائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	پچیس روپیہ
معمولی خریداری	"	بائیس روپیہ

وی۔پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۴۰ پیسے

غیر ممالک سے

انھیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایئرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے دامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم ۔ ۴۵ لاٹوش روڈ سے شائع کیا

دنیا

ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نماز نہیں پڑھتے یا اور دوسرے فرائض ادا نہیں کرتے لیکن اگر ان کو کوئی تلقین کرے فرائض کو ادا کرنے کے سلسلہ میں تو عموماً مخاطب شرمندہ ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ جواب دے کہ یہ فرائض بیکار ہیں۔ روزہ نماز کی اس دور میں کسے فرصت ہے۔ اور اس طرح کا جواب اگر کوئی دے گا تو وہ یقیناً ایسا شخص ہوگا جو خدا کا منکر ہو، جسے ملحد یا ناسٹک کہتے ہیں۔

پردہ فرائض میں شامل نہیں، اس لئے مندرجہ بالا تمہید کے بعد اس کے ذکر سے ہرگز میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ پردہ فرائض میں شامل ہے لیکن فرائض اور سنن کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ممکن ہو تو عمل کرنا چاہیئے۔

کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کرسکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلعم نے اپنی پیغمبری کے دور میں خواتین کو پردہ کرلے کی ہدایت کی تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اختلاط مرد و زن نہ ہو، اس لئے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو معاشرہ کو پاکیزہ نہیں رکھ سکتی اور اسلام چاہتا تھا کہ ہمارا معاشرہ صاف ستھرا رہے اور اسی لئے اسلام لے ایک سے زائد شادیاں کرنے کی بھی مردوں کو اجازت دی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی کریم صلعم کی زندگی میں غزوات کا سلسلہ جاری تھا۔ جس میں مسلمان برابر شہید ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں کم ہوتی جارہی تھی، بلکہ شادی شدہ شہیدوں کی بیویاں بیوہ ہوجاتی تھیں ــــ نفس کی خواہشات مردوں اور عورتوں سب میں ہوتی ہیں۔ تجرد کی زندگی کوئی بھی سکون سے گذار نہیں سکتا ــــ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی صورت میں بھی کوئی کوئی اپنے کردار کی بلندی کو قائم رکھ کر نفس کی خواہشات پر قابو حاصل رکھتے ہیں۔ لیکن ایسے مردوں یا عورتوں کو مستثنیات میں ہی شمار کیا جاسکے گا۔ عموماً لوگ خواہشات نفس پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ اسلام ان حقائق سے واقف تھا ورنہ کبھی ایسا حکم نہ دے سکتا تھا جو بادی النظر میں مردوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوتا ہو اور عورتوں کو سوتاپے کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہو، جبکہ اسلام نے عورت کو ایسے حقوق عطا کئے جیسے اس سے پہلے کسی مذہب نے نہ دئے تھے، انھیں قعر مذلت سے نکال کر ایسی بلندی پر پہنچایا کہ دنیا حیران ہوگئی۔ وہ عورتیں جو غلامی کی زندگی بسر کررہی تھیں، جنھیں کوئی عزت و وقعت معاشرے میں حاصل نہ تھی جنھیں رہن بیع تک کردیا جاتا تھا اسلام نے انھیں ایسی عزت بخشی کہ انھیں ہمارے رسول صلعم نے شیشے کی مثال دیکر بتایا کہ ان کی نزاکت کا خیال رکھا جائے۔ اس ایک مثال سے ہی ثابت ہوجاتا ہے کہ جس جنس کو پتھر سمجھا جاتا تھا، اسے رحمت دوعالم نے نازک ترین جنس بتاکر ہدایت کی کہ اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے، تاکہ اسے کوئی صدمہ نہ پہنچے ــــ اس کے بعد اسلام نے مردوں کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی تو کیوں ــــ صرف اس لئے کہ اس وقت کے حالات اسی کے متقاضی تھے ــــ ایسا نہ کیا جاتا تو معاشرہ غیر پاکیزہ ہوجاتا اور فسق و فجور کی جو راہیں اسلام نے بند کی تھیں، شاید بند نہ ہوسکتیں۔

معاشرے کی پاکیزگی ہی کے لئے اسلام نے عورتوں کو پردہ کرنے کی ہدایت کی، پردہ ہی ایک ایسی صورت ہوسکتی تھی جو اختلاط مرد و زن کو بچا سکتی تھی۔ حد ہے کہ اسلام نے عبادت الٰہی یعنی نماز کے سلسلہ میں بھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ مرد اور عورتیں ایک ساتھ اللہ کے حضور کھڑی ہوسکیں۔ مساجد میں بھی ان کی جگہ مردوں سے علیٰحدہ ہوتی تھی (حالانکہ یہ صورت بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی تھی) اور اس کے لئے یہ بھی بتایا گیا کہ مردوں کو مساجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب ملے گا اور عورتوں کو گھروں میں پڑھنے سے۔ یہی نہیں یہ بھی کہا گیا کہ گھروں میں بھی کسی گوشہ میں جہاں دوسروں کی نظریں نہ پہنچ سکیں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ کیا اس کی کوئی اور توجیہہ اس کے سوا ہوسکتی ہے کہ اسلام مردوں اور عورتوں کو عام زندگی میں ایک دوسرے سے جدا رکھنا چاہتا تھا۔ جس کے لئے پردہ ضروری

تھا۔ صرف یہی وہ واحد طریقہ ہو سکتا تھا جو اختلاط مرد وزن کو روک سکتا تھا۔

میں ان بہنوں سے یہ سوال کروں گا جو بے حجابانہ، سر برہنہ پرکشش لباسوں میں سرا پا بہار بنی محفلوں پارٹیوں میں جلوے دکھاتی ہیں۔ کیا کسی بھی تاریخ سے کسی بھی حدیث یا روایت سے یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ ہمارے رسول اکرم صلعم یا آپ کے بعد صحابہ کرام کے عہد میں کبھی ایسی کوئی مجلس، محفل یا نشست ہوتی ہو، جس میں مرد اور عورتیں بے حجابانہ ساتھ رہتے ہوں ــــــ اگر نہیں تو آج اس کا لحاظ و پاس کیوں نہیں کیا جاتا اگر معاشرے کو ایسے اختلاط مرد وزن کی ضرورت ہوتی تو ہمارے نبی اکرم کے دور میں بھی یہی سب کچھ ہوتا جو آج ہو رہا ہے۔

آج لمعات میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی محرک ایک محترمہ کی پردے کے سلسلہ میں ہرزہ سرائی ہے، یہ صاحبہ لڑکیوں کے ایک اسکول میں پرنسپل ہیں۔ محکمہ تعلیم سے متعلق بیشتر خواتین پردہ نہیں کرتیں ــــــ لیکن پردہ نہ کرنا علیحدہ بات ہے اور پردہ کو برا بھلا کہنا، دوسری بات ہے۔ ان محترمہ نے یہ بھی نہ سوچا کہ زیادہ مدت نہیں گذری کہ اس فعل قبیحہ کی مرتکب ان کی والدہ، نانی اور دادی بھی تھیں جو بہت ہی سخت قسم کا پردہ کرتی تھیں۔ ان محترمہ کو حریم کے نام سے نفرت ہے، صرف اس لئے کہ وہ پردہ کی تبلیغ کرتا ہے اور وہ خود پردہ نہیں کرتیں۔ انھیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ پردہ بذات خود عورت کے لئے بری چیز نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ حالات کے پیش نظر کوئی پردہ ترک کر دے، لیکن اس کی مذمت تو نہ کرنا چاہیئے، جبکہ خود ان کے متقدمین میں بھی پردہ رائج تھا۔

جہیز کی بھینٹ

اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال صدہا معصوم اور بے قصور خواتین کو صرف اس لئے ہلاک کر دیا جاتا ہے کہ وہ سسرال والوں کے حسب دلخواہ جہیز لے کر نہیں آتیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ فعل قبیحہ ابھی تک صرف برادران وطن ہی میں ہو رہا ہے۔ ایسی کوئی خبر نظر سے نہیں گذری کہ کسی مسلمان خاتون کی جان اس لئے لی گئی ہو کہ وہ جہیز کم لے کر آئی ہو۔ جس طرح مسلمانوں میں بھی جہیز اور ڈاوری کا چلن بڑھتا جا رہا اس کے پیش نظر ہر خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ آج نہیں تو کل سنگدلانہ حرکتیں کہیں مسلمان بھی نہ کرنے لگیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو خدا اور رسول کا خوف دلایا جائے۔ جہیز وغیرہ کی موجودہ رسم ہی ایک لعنت ہے، لیکن اس لئے معصوم دلہنوں کی جانیں۔ کہیں زیادہ لعنت زدہ فعل۔ اللہ پاک سب کو اس ظالمانہ حرکت سے باز رکھے۔ خصوصاً مسلمانوں کو، اس لئے کہ اسلامی تعلیم میں جہیز کی یہ صورت نہیں ہے جو عمل میں لائی جا رہی ہے۔

ایک قابل تعریف فیصلہ

دہلی کے ایک انصاف پسند جج نے اپنے ایک فیصلہ میں اور ایک عورت کو پھانسی کی سزا دے کر ایک ایسی مثال قائم کی جو ان ظالموں کے لئے عبرتناک ہے۔ اس مقدمہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک عورت کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی ہے۔ فیصلہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے جس میں ایک بیاہی دلہن کو جو حاملہ تھی اور جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، جہیز کم لانے کے جرم میں شوہر اس کے بڑے بھائی اور ماں نے مٹی کا تیل ڈال کر جلا ڈالا تھا۔ دلہن یتیم تھی۔ بھائیوں نے ہزار روپیہ صرف کر کے بہن کی شادی کی تھی سسرال والے دس ہزار کا مطالبہ کر رہے تھے جو نہ دیا جا سکا تھا۔

شری ایس ایم اگروال جو ڈیشنل سیشن جج دہلی قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے عبرتناک سزا دے کر دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ خدا کرے کہ اپیل میں بھی یہ سزائیں بحال رہیں۔ معاصر نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ ایسے لوگوں کو بر سر عام سزا دی جائے اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ اسلام کے قانون میں سزائیں عوام کے سامنے دی جاتی تھیں تاکہ عبرت حاصل ہو سکے اور دیکھئے میں آتا ہے۔ اخبار میں یہ پڑھ لینے سے کہ فلاں کو فلاں جیل میں پھانسی دی گئی زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ بر سر راہ عوام کے سامنے ایسی سزا دی جائیں تو بڑی حد تک ایسے اخلاقی جرائم کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

بوتل کا دودھ پلانے پر صدر جمہوریہ ہند کی نکتہ چینی

دہلی میں ایک تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند سردار گیانی ذیل سنگھ نے ان ماؤں پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو اپنے شباب و رعنائی کی حفاظت کے لئے بچوں کو اپنا دودھ پلانے کے بجائے بناسپتی دودھ بوتلوں سے پلاتی ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ جو عورتیں ایسا کرتی ہیں وہ فطرت کے قوائد و ضوابط کو توڑتی ہیں اس لئے کسی ہمدردی کی مستحق نہیں ہوتیں ـــــ"

صدر جمہوریہ نے جو بات کہی ہے وہ اس سے پہلے اخبارات و رسائل میں بھی چھپ چکی ہے، لیکن یہ تو مغربی ترقی یافتہ ملکوں کی دین ہے، جہاں فیشن پرستی نے عورتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا دودھ پلانے کے بجائے بازار کا ڈبوں میں بند ملنے والا دودھ پلائیں۔ ہمارا ہندوستان تو نقالی میں مشہور رہا ہے۔ انگریزی تہذیب و تمدن سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ ان کے لباس پہننے لگا۔ ان کی ادائیں اختیار کر لیں اور آج ہندوستان کی خواتین، جو کبھی سیتا اور ساوتری بنیں اور چادر لپیٹی ہوا کرتی تھیں۔ اب نیم برہنہ گھومتی پھرتی ہیں بلکہ ان کا بس چلے تو اس نیم لباس کو بھی ختم کر دیں ـــــ ایسی خواتین بھلا بچوں کو دودھ پلانے کی زحمت کیونکر گوارہ کر سکتی ہیں ـــــ

لیکن صرف یہی سبب نہیں ہے جس سے شیشی کا دودھ پلانے کا چلن ہوا۔ بلکہ ایک اور سب سے بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ یورپ کی نقالی میں عورتوں کو ملازمت کرنے پر بھی اکسایا گیا۔ آج کسی بھی آفس میں جائیے عورتیں آپ کو کام کرتی نظر آئیں گی دکانوں، بینکوں اور ریسٹورانٹس میں بھی ان کا عمل دخل ہو گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ سب ہی نہ تو کنواری ہیں نہ بیوہ۔ ان میں کم سے کم پچاس فی صدی بچوں والیاں بھی ہیں۔ وہ بچوں کو گود میں لاد کر تو ڈیوٹی پر جا نہیں سکتیں اسلئے ان کے لئے شیشی کا دودھ پلانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اور جب تک یہ مائیں ملازمت کرتی رہیں گی اپنا دودھ کیسے پلا سکتی ہیں۔ صدر جمہوریہ کو چاہیئے تھا کہ اپنی تقریر میں یہ بھی فرماتے کہ بچوں والی عورتوں کو بلا ضرورت ملازمت کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ چیز خلاف فطرت نہیں ہے۔ کیا عورت اسی لئے پیدا کی گئی ہے کہ وہ گھر ول سے نکل کر دفتروں اور ریلوں میں دھکے کھاتی پھرے اور پھر غیر مردوں سے بچکر اپنے باسوں (افسروں) کی نظریں دیکھے اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ لڑکوں کی بدنگاہوں اور بدتمیزیوں کا مرکز بنے۔

نوٹ

اکثر بہنیں شکایت کرتے وقت خط پر تاریخ نہیں ڈالتیں ڈاک خانے والے ایسی مہر نہیں لگاتے جو پڑھی جا سکے۔ اس لئے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خط کب پوسٹ کیا گیا۔ حریمی بہنیں اس کا خیال رکھیں۔

- کسی بھی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا جواب کے لئے لفافہ روانہ کریں۔
- کوئی بھی مضمون حریم کے لئے بھیجیں تو اس پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ واپسی کے لئے ٹکٹ بھی ساتھ ہی بھیجیں تاکہ نہ چھپ سکے تو واپس کر دیا جائے۔
- ہر تحریر میں اپنا خریداری نمبر حریم ضرور لکھیں۔
- تبدیلی پتہ کی اطلاع اس طرح دیں کہ ۳۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ اگر اطلاع ۶ کے بعد آئے گی تو پرچہ دوبارہ قیمتاً ملے گا۔
- ہر ماہ کے پسندیدہ اشعار علیحدہ علیحدہ کاغذوں پر لکھیں۔ اسی طرح بزم حریم کے لئے ہر خبر علیحدہ علیحدہ لکھیں۔ ایک ہی کاغذ پر دو چیزیں نہ لکھیں۔
- ہر کسی سے اپنا درد دل بیان نہ کرو۔ دوست سنیں گے تو انہیں غم ہوگا اور دشمن سنیں گے تو انہیں خوشی ہوگی۔
- دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو، برف کی ایک قاش کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے پانی بنتے دیکھا جا سکتا ہے لیکن آگ لگتے کبھی نہیں دیکھا جا سکتا۔

مرسلہ۔ صائمہ خاتون۔ حیدر آباد

گرہ میں باندھ لینے والی باتیں

- عہد کو پورا کرو اس کی باز پرس کی جائے گی (قرآن مجید)
- دانشمندوں کے لئے ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے (شیخ سعدیؒ)
- نرمی۔ اخلاق اور صلح کن الفاظ طاقتور ہوتے ہیں (امام شافعیؒ)
- جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے (حسن بصریؒ)
- تمہارے سب سے بڑے دشمن تمہارے برے ہمنشیں ہیں۔ شیخ جیلانیؒ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

ب۔ ن۔ اکبر ابراہیم

یہ وہی حضرت ذوالنون مصریؒ ہیں۔ جو یوسف ابن الحسینؒ کے پیرومرشد تھے۔ جن کا ذکر یوسف ابن الحسینؒ کے عنوان سے حریم میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ بادشاہ طریقت کہلاتے تھے اور توحید میں آپ کا درجہ بلند تھا۔ مگر آپؒ خلق سے اس قدر بے تعلق اور اپنے اذکار و تحیّر میں منہمک رہتے تھے کہ آپ کو اپنے حال میں مست اور ہر طرف سے لاپرواہ دیکھ کر لوگ آپ کو زندیق کہا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کا باطن کسی پر ظاہر نہ تھا۔ خدا جب کسی بندے کو اپنا بنا لیتا ہے تو اس پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور وہ مشاہدے و مجاہدے میں اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور ذات باری سے واصل ہو جاتے ہیں۔ ان کی گردش گردشِ حق ہوتی ہے اور جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے حق کی باتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے رسول مقبولؐ کا ارشاد ہے کہ حق تعالےٰ حدیث قدسی یعنی ولیوں کے بیان میں فرماتا ہے کہ جب میں بندے کو اپنا دوست بناتا ہوں تو اس بندے کے جن کا میں خداوند ہوں اسی بندے کے کان بن جاتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے سنے، اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے دیکھے اس کی زبان بن جاتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے بولے۔ لہٰذا وہ سب باعزوجت میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ولیوں میں حضرت ذوالنونؒ مصری بھی ہیں۔ جن کے مناقب تو بہت ہیں لیکن یہاں پر صرف ایک کا ہی تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ حق کی جستجو میں آپ سرگرداں رہا کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی عابد و زاہد کا ذکر سنتے ان کے مشاہدے کے لئے ان کے پاس جا پہنچتے الغرض ہمیشہ خاصان خدا کی تلاش رہا کرتی۔ ایک دن آپؒ نے سنا کہ کسی جگہ پر ایک عابد رہتے ہیں آپ ان کی زیارت کے لئے جا پہنچے، دیکھا کہ وہ عابد ایک درخت سے لٹکے ہوئے ہیں اور بدن سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں اے بدن اطاعت حق تعالےٰ میں میرا ساتھ دے ورنہ میں تجھکو اس وقت تک اسی طرح رکھوں گا جب تک تو مر نہ جائے۔ حضرت ذوالنونؒ اس عابد کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑے۔ جب عابد نے رونے کی آواز سنی تو پوچھا کہ کون ہے جو ایسے شخص پر رحم کھاتا ہے۔ جس کو شرم تھوڑی ہے۔ اور جس کے گناہ زیادہ ہیں؟ آپ فرماتے ہیں میں اس عابد کے سامنے گیا اور سلام کر کے کہا یہ کیا حالت ہے۔ اس عابد نے جواب دیا یہ بدن حق تعالےٰ کی عبادت میں میرا ساتھ نہیں دیتا۔ اس لئے اس کو سزا دے رہا ہوں عابد کے جواب نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ تعجب سے فرمایا کہ مجھے گمان ہے تم زبردست زاہد ہو۔ عابد نے دریافت کیا۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ زاہد کو دیکھنا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں دیکھنا چاہتا ہوں عابد نے کہا اس پہاڑ پر جا کر دیکھو وہاں تمہیں وہ زاہد ملے گا۔ لہٰذا آپ پہاڑ پر گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک صومعہ ہے۔ اس کے دروازے پر ایک جوان کھڑا ہے جس کا ایک پاؤں تو صومعہ کے اندر ہے دوسرا صومعہ سے باہر کٹا پڑا ہے اور اس کو کیڑے کھا رہے ہیں۔ آپ اس کے سامنے گئے اور سلام کر کے پوچھا یہ کیا حال ہے اور یہ کیا ہوا۔ اس جوان نے جواب دیا کہ ایک دن میں اسی عبادت خانہ میں بیٹھا تھا ایک عورت یہاں سے گزری۔ میرا دل اس پر مائل ہو گیا۔ اور میرے نفس نے اس کا تقاضہ کیا اور میں نے نفس کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے ایک پاؤں باہر رکھا۔ اسی وقت میں نے ایک آواز سنی "تجھے شرم نہیں آتی کہ تیس سال عبادت کرنے کے بعد شیطان کی اطاعت کرتا ہے" میں نے جب یہ آواز سنی تو مجھ پر خدا کا خوف غالب ہوا اور وہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا میں نے جو پاؤں باہر نکالا تھا اسے کاٹ ڈالا اب یہاں بیٹھا ہوں کہ دیکھئے کہ اب کیا ظاہر ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ تم ایسے گنہگار کے پاس کس لئے آئے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ مردانِ خدا میں سے کسی مرد خدا کو دیکھو تو اس پہاڑ کی بلند چوٹی پر جا کر دیکھو۔ حضرت ذوالنونؒ مصری کہتے ہیں کہ اس نوجوان کی اتنی قدر سخت ریاضت کو دیکھ کر میں کانپ گیا۔ مگر پہاڑ کی بلندی کی وجہ سے میں پہاڑ پر نہ جا سکا اس لئے اس بزرگ کا حال اسی جوان سے پوچھا۔ تو اس نے کہا ایک مدت سے اس عبادت خانہ میں وہ عبادت الٰہی میں مشغول ہیں ایک شخص نے آپ سے مناظرہ کیا کہ روزی کہ

[illegible] ان کا رزق انسانی
جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سنکر ان بزرگ کے دل میں یہ شک
پیدا ہوگیا کہ رزاقِ دوجہاں کے بجائے انسان کو اس کی سعی
سے رزق کا بہم پہنچانے والا مان لینے سے کہیں شرک نہ ہوجائے۔
لہٰذا ان بزرگ نے اس بات کا عزمِ صمیم کرلیا کہ "میں کوئی ایسی شے
نہ کھاؤں گا جس میں مخلوق کے کسب و تحصیل کو دخل ہوگا"۔ کئی دن
گزر گئے انہوں نے کچھ نہ کھایا حق تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو بھیجا
وہ ان کے گرد اگرد اڑتی تھیں۔ حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں ان
واقعات اور مشاہدات سے مجھ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔ میں نے
جان لیا کہ جو شخص حق تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو خداوند کریم خود اس کے
کاموں کو انجام دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ توکل کے ساتھ صرف اسی کا ہوکر
رہ جائے اور دنیا کے علائق سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ ان واقعات
نے آپ کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ اور آپ دنیا والوں سے کنارہ کش
ہوکر عبادت و ریاضت میں منہمک ہوگئے۔ ان کی عبودیت اس حد
تک پہونچی کہ سوائے خیالِ محبوب کے ان کے دل میں ماسوا کا دخل نہ
تھا۔ اسی عالم میں ایک دن وہ کسی جنگل میں گئے۔ وہاں
ایک خزانے کے منھ پر ایک تختہ تھا۔ اور اس تختہ پر حق تعالیٰ کا نام
لکھا ہوا تھا۔ آپ کے دوست جو آپ کے ساتھ تھے۔ فرمایا یہ تختہ جس پر
دوست کا نام لکھا ہوا ہے مجھے دیدو۔ آپ نے وہ تختہ لے لیا اور اسے
بوسہ دیا۔ اس سے آپ پر ایک والہانہ وجد کی سی کیفیت طاری
ہوگئی۔ اسی رات آپ نے حالتِ خواب میں یہ آواز سنی کہ ذوالنونؒ
ہر شخص نے زر و جواہر کی طرف رغبت کی اور تو نے اسی سے بلند
شئے قبول کی اور وہ ہمارا نام ہے ہم نے علم و حکمت کے دروازے
تجھ پر کشادہ کردیئے اور اس راہ میں تیرا مرتبہ بلند کردیا۔ اس
کے بعد آپ کی حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔ تاہم اس میں ابھی پختگی
آنی تھی لہٰذا ذوالنونؒ فرماتے ہیں راہِ حق کی تلاش میں ایک دن
میں ایک نہر کے کنارے پر پہونچا۔ اور کنارۂ نہر پر میں نے ایک
محل دیکھا۔ میں نہر پر گیا اور وضو کیا۔ جب وضو سے فارغ ہوا تو ناگاہ
میری نظر اس محل کے بام پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوبصورت
کنیز اس محل کے کنگرہ پر کھڑی ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی آزمائش
کروں۔ میں نے اس کنیز سے پوچھا "اے کنیز تو کون ہے"؟ اس نے
جواب دیا اے ذوالنون جب آپ دور سے نظر آئے تو میں نے سمجھا
شاید کوئی دیوانہ ہے۔ اور جب کچھ نزدیک آگئے تو میں نے خیال کیا
کہ شاید کوئی عالم ہے۔ جب آپ بالکل قریب آگئے تو میں نے آپ
کو عارف سمجھا۔ اور جب پھر میں نے غور سے دیکھا تو نہ آپ کو
دیوانہ پایا اور نہ ہی عالم اور نہ عارف۔ آپ فرماتے ہیں میں نے
اس سے پوچھا کہ یہ تم نے کس طرح جانا تو اس نے جواب دیا اگر
آپ دیوانے ہوتے تو طہارت نہ کرتے۔ اگر عالم ہوتے تو نامحرم
کی طرف نہ دیکھتے اور اگر عارف ہوتے تو آپ کی آنکھ ماسوا پر نہ
کھلتی۔ یہ اس کنیز نے تکبیر کہا اور غائب ہوگئی میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی انسان
نہ تھی فقط میرے لئے ایک تنبیہ تھی۔ میں خوفِ خدا سے کانپ گیا اور
توبہ کی اور دریا کی طرف چلدیا۔ وہاں ایک کشتی کھڑی تھی کچھ
لوگ کشتی میں سوار ہورہے تھے میں بھی ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ
گیا اور کشتی چل پڑی۔ اتفاق سے اس میں موتیوں کا ایک سوداگر
بھی تھا۔ کشتی میں اس کا ایک موتی کھوگیا۔ سب نے ادھر ادھر دیکھ
کر کہا موتی اس خرقہ پوش کے پاس ہے۔ لوگ مجھ کو تکلیف دینے
لگے اور شرمندہ کرنے لگے میں بالکل خاموش رہا لیکن جب معاملہ
حد سے تجاوز کرگیا تو میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا خداوندا تو
بہتر جانتا ہے" آپ فرماتے ہیں میرے یہ کہتے ہی سینکڑوں مچھلیوں
نے دریا سے سر نکالے اور ہر ایک مچھلی کے منھ میں ایک ایک موتی تھا۔
آپ نے ایک مچھلی کے منھ سے ایک موتی لے لیا اور اس سوداگر کو
دے دیا۔ اہلِ کشتی نے یہ ماجرا دیکھا تو آپ کے قدموں پہ گر پڑے
اور معذرت چاہی یہی وجہ تھی کہ آپ کا نام ذوالنونؒ [۱] ہوگیا۔ ایک دفعہ
آپ پہاڑوں میں سرگرداں تھے۔ تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ
جمع ہیں آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تم سب یہاں کیوں کھڑے ہو۔
تو سب نے جواب دیا کہ "اس جگہ ایک عابد رہتے ہیں وہ سال بھر میں
ایک دفعہ اپنی عبادت گاہ سے باہر نکلتے ہیں اور مریضوں پر دم کرتے
ہیں تو سب شفا پاتے ہیں۔ پھر وہ صومعہ میں چلے جاتے ہیں لہٰذا ہم انتظار
میں ہیں" آپ کو بھی اس عابد کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ آپ بھی ان لوگوں
کے درمیان کھڑے ہوگئے۔ حتیٰ کہ وہ بزرگ صومعہ سے باہر تشریف لائے۔

---

[۱] حضرت یونس کا لقب تھا جو مچھلی کے پیٹ میں بحکم خدا زندہ تھے۔ اور ذوالنونؒ نے بحکم خدا مچھلی کے منھ سے موتی لیا۔

ان کا چہرہ بہت زرد تھا۔ اور وہ بہت کمزور تھے آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑے تھے۔ لیکن ان کی ہیبت سے پہاڑ دل پر بھی لرزہ طاری تھا۔ ان بزرگ نے چشم شفقت سے ان تمام مریضوں کی طرف دیکھا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا اور ان تمام مریضوں پر دم کیا۔ سب نے شفا حاصل کی۔ یہ دیکھ کر ذوالنون متحیر رہ گئے اور اپنی بے مائگی کا احساس ہوا۔ جب وہ بزرگ صومعہ میں واپس جانے لگے تو آپ نے بڑھ کر ان کا دامن تھام لیا۔ اور فرمایا "آپ نے علت ظاہر کا تو علاج کیا خدا کے لئے آپ میرے علت باطن کا بھی علاج کیجئے"۔ ان بزرگ نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا اے ذوالنون میرا دامن چھوڑ دے۔ کیونکہ تیرا دوست اپنی عظمت و جلال کے ساتھ تجھے دیکھ رہا ہے جب وہ دیکھے گا کہ تو نے اس کے سوا کسی غیر کا دامن تھاما ہے تو وہ تجھے چھوڑ دیگا"۔ یہ کہا اور صومعہ میں چلے گئے۔ اس دوسری تنبیہ سے آپ پر رقت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد سے آپ کی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں اور ترقی ہوگئی۔ اور آپ پر اسرار حق کا اظہار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے مناقب اور تصانیف ہیں۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ، موزوں اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے تحت اس طرح بھیجا گیا ہو کہ جس ماہ کے پرچے میں چھپنا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ اگست کے لئے مقررہ عنوان ہے گھٹا اور ستمبر کے لئے "نغمہ" یا "نغمے"۔

تری عمر بیشتر ہے مری عمر مختصر ہے
تو شراب بزم عشرت میں ہوں صبح کا ستارہ

مرسلہ۔ امروز جہاں (آرہ۔ بہار)

غم کی اندھیری رات میں دل کو نہ بے قرار کر
صبح ضرور آئے گی صبح کا انتظار کر

مرسلہ۔ شہناز بیگم (منگاراٹ)

اے شمع صبح ہوتی ہے اسے بھی گداز دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گداز دے

مرسلہ۔ طلعت فاطمہ (   )

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

مرسلہ۔ نغمہ اسلم (تاتارپور۔ بھاگلپور

مرسلہ۔ طاہرہ تبسم اعظمی (اعظم گڈھ

پہلے کی انگڑائی شفق تم کو جگاتی ہوگی
آب انوار سے منہ صبح دھلاتی ہوگی

مرسلہ۔ عفیرہ کرن عرف شرتیہ (دا

یاد خدا ہے لب پہ محمد کا نام ہے
اپنا یہی وظیفہ غرض صبح و شام ہے

مرسلہ۔ بی عظمت النسا فاروق (آ

ہو رہی ہے صبح پھر بھی رخ پہ ہے شب کا سرور
انتہا میں ابتدا، انجام میں آغاز ہے

مرسلہ۔ نگار سلطانہ جلیلی قرلطیف (آ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

مرسلہ۔ کشور سلطانہ (لال باغ بنگ

شعاع صبح سے شبنم کے موتی جھلملاتے ہیں
زمیں پر جس طرح گردوں کے تارے جھلملاتے ہیں

مرسلہ۔ نجمہ انصار (کٹنگ

اللہ اللہ رے درازی شب ہجراں تیری
صبح محشر تلک امید سحر کس کو ہے

مرسلہ۔ فریدہ اے حلیم (کٹہار

لاکھ تڑپا کرے بیمار شب ہجر تو کیا
صبح ہونے کی نہیں چار پہر سے پہلے

مرسلہ۔ قرۃ العین (ا

نالۂ شب اور آہ صبح گاہی کے سوا
ہمسفر ہے اور کیا پونجی جو کام آنے کو ہے

(رفیعہ یاسمین بیلا سیتا مڑھی)

دوراہا

ـــــ شاہدہ بلگرامی

حسب معمول شام ہوتے ہی گھر کے سب ہی لوگ کہیں نہ کہیں گھومنے چلے گئے تھے۔ شمشہ پھر اکیلی رہ گئی وہ ٹہلتی ہوئی باہر نکل آئی اور کچھ بیزار سی لان پر پڑی ہوئی کین چیئر پر ڈھے گئی بنگلے کا آہنی پھاٹک بند تھا اور اس کے اس پار سڑک سنسان تھی ـــــ اونچے اونچے درختوں کے اوپر کوے بسیرا لینے کو چلا رہے تھے مغربی آسمان پر شفق کی سرخی دوڑ چلی تھی۔

ملحق کوٹھی سے قہقہوں کی آواز سن کر اس نے گردن اونچی کر کے جھانکنے کی کوشش کی جھاڑیوں کے اوپر سے ایک شٹل کاک ہوا میں اچھلی۔ بل کھاتی دوسری طرف جا رہی تھی ـــــ او نصیر صاحب کے یہاں بیڈمنٹن ہو رہا ہے چلو تھوڑی دیر وہیں پر وقت کاٹا جائے۔ وہ کرسی چھوڑ کر ٹہلتی ہوئی جھاڑیوں کے قریب چلی گئی دونوں کوٹھیوں کے بیچ مہندی کی جھاڑیوں کی باڑ تھی وہ وہیں جا کر کھڑی ہو گئی ـــــ نشاط بیڈمنٹن کھیل رہی تھی اور اس کی امی قریب ہی گھاس پر بیٹھی نٹنگ کر رہی تھیں۔ اس کو جھانکتے دیکھ کر انھوں نے آواز دی۔

"کیا کر رہی ہیں۔ خالی ہوں تو یہیں آ جائیے۔"

وہ تو گویا منتظر ہی تھی ان کے بلاتے ہی وہ جھاڑیاں پھلانگ کر دوسری طرف چلی گئی اور مخملیں گھاس کو روندتی ہوئی ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"کیا بنا رہی ہیں نمونہ تو آپ نے بڑا اچھا ڈالا ہے" اس نے بیٹھتے ہی سوئٹر ہاتھ میں لے کر دیکھا

"نشاط کے لئے سوئٹر بنا رہی ہوں" مسز نصیر نے کہا

اس نے مڑ کر نشاط کی طرف دیکھا۔ پیازی رنگ کا شلوار سوٹ۔ دوپٹہ شانوں پر آڑا کر کے کمر کے گرد بندھا ہوا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے بال اس وقت ربربینڈ کے حلقے میں سمٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی ہی پھرتی کے ساتھ شٹل کاک پر ہٹ لگا رہی تھی دوسری طرف منوج تھا۔ نشاط کی دوست رینا کا بھائی جو اکثر ان کے یہاں آتا رہتا تھا۔

"نغمہ کہاں ہے آج آئی نہیں" مسز نصیر نے پوچھا۔

"دوپہر میں فیصل کے ساتھ بازار گئی تھی ابھی تک دونوں واپس نہیں آئے انھیں کا انتظار کر رہی تھی تنہائی میں دل گھبرانے لگتا ہے۔"

"گھر میں لوگ ہی کتنے ہیں گنتی کے دو بچے وہ بھی بہت خاموش طبیعت اور الگ تھلگ رہنے والے۔ ہماری تو نشاط ماشاء اللہ ایسی چنچل ہے کہ اس کی وجہ سے آنے جانے والوں کا سلسلہ بندھا رہتا ہے کبھی گھر خالی نہیں رہتا۔"

"ہوں" وہ نغمہ کے بارے میں سوچنے لگی جو واقعی بہت کم بولتی تھی اور زیادہ تر کتابوں کا کیڑا بنی رہتی تھی۔

"ارے ہاں یاد آیا آج تو تم انٹرویو دینے گئی تھیں کیا ہوا؟"

"ریجکٹ کر دیا۔"

"کیوں" مسز نصیر نے نشاط اور منوج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کھیل ختم کر کے ان کے قریب ہی آ کر گھاس پر بیٹھ گئے تھے دونوں کی سانسیں پھول رہی تھیں اور تمتماتے ہوئے چہروں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے وہ زور سے ہنس دی۔

"بھئی ـــــ اب کیا بتاؤں۔ ان تیس برسوں میں تو اپنے ہی بچے تیار ہو کر اپنے مقابلے پر آ گئے ہیں آج انٹرویو دینے گئی تو معلوم ہوا کہ ہم لوگ بالکل آؤٹ آف ڈیٹ چیز ہو چکے ہیں زمانہ بہت بدل چکا ہے۔"

"وہ کیسے۔"

وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی "بس ایسے کہ اگر آپ اردو میڈیم اسکول کی پڑھی ہوئی ہیں اور فر فر انگلش نہیں بول سکتیں تو آپ کو کوئی سروس نہیں مل سکتی۔ ایک دو نہیں پچاس ساٹھ لڑکیاں ـــــ بہت اسمارٹ۔ بے جھجک ـــــ فراٹے کی انگلش بولتی ہوئی انٹرویو کے لئے آئی تھیں میں تو وہاں کسی قدیم زمانے کی بوسیدہ سی مخلوق لگ رہی تھی جس کے لئے اسکول میں نوکری تو نہیں۔ ہاں میوزیم میں جگہ مل سکتی ہے۔"

"اے رشو بہن۔ اب ہم لوگ ایسے بھی پرانے نہیں ہو گئے ہیں۔" مسز نصیر نے بڑی ادا سے کہا۔

"جی نہیں ـــــ نہیں میرے کہنے کا مطلب ہے کہ گھر کے باہر نکل کے پتہ

چلا کر یاد بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔"

بیگم نصیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "بہن اسی لئے تو سب لوگ آجکل اپنے بچوں کو شروع ہی سے کانونٹ میں پڑھاتے ہیں۔ مقابلے کے امتحانات ہوں، سروس میں، بزنس میں، ہر جگہ انہیں کو کامیابی ملتی ہے۔"

شمسہ نے سرسبز گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پہلو بدلا۔

"ہم لوگوں کے زمانے میں تو کرسچین اسکول کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اچھے مسلم گھرانے کی لڑکیوں کو پہلے مذہبی تعلیم دی جاتی تھی پھر ایسے اسکول میں بھیجا جاتا تھا جہاں کا ماحول صاف ستھرا ہو اور ۔۔۔"

"ایسی تعلیم پریکٹیکل لائف کے لئے تو بالکل بیکار ہے" مسز نصیر نے اپنے لپ اسٹک لگے ہوئے ہونٹوں کو تھوڑا سا خم دیکر برا سا منہ بنایا اور حقارت سے اس کی بات کاٹ دی۔

"مگر مسز نصیر میں سمجھتی ہوں کہ دینی تعلیم اور مادری زبان سیکھنا بہت ضروری ہے جب ہم ہی اس کی اہمیت سے انکار کر دیں گے تو ہماری تہذیب اور اخلاقی قدروں کا خدا ہی حافظ ہوگا" شمسہ نے کہا۔

"آنٹی آپ سروس کیوں کرنا چاہتی ہیں" نشاط بیچ میں بول اٹھی۔

"بس یونہی۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں اب زیادہ تر فارغ رہتی ہوں۔ سوچا کچھ پڑھے لکھے کا فائدہ اٹھاؤں ساری ڈگریاں الماری میں پڑی پڑی دیمک چاٹ رہی ہے!!"

"ہاں ہاں ... تمہارے شوہر بھی زیادہ تر دورے پر رہتے ہیں اسی وجہ سے اور تنہائی محسوس کرتی ہوگی" مسز نصیر نے کہا۔

"آنٹی آپ کو گھومنے پھرنے کا شوق نہیں ہے آپ بھی انکل کے ساتھ نکل جایا کیجئے آپ تو بس گھر ہی میں رہتی ہیں" نشاط نے کہا۔

"میں بچوں کے ساتھ ہر جگہ کیسے جا سکتی ہوں اور پھر یہاں لڑکیوں کو کس پر چھوڑ دوں"

شمسہ نے کہا۔

"ممی ... آپ بھی پرانے وقتوں کی باتیں کرتی ہیں [illegible] اور [illegible] وہاں کی لڑکیاں بالکل [illegible] INDEPENDENT ہوتی ہیں گھروں میں اور باہر بھی۔ اپنے اوپر پورا CONFIDENCE (اعتماد) ہوتا ہے" نشاط نے پورے جوش کے ساتھ اس کو سمجھانے کی کوشش کی ۔۔۔

وہ مسکرا دی "بیٹی ہر لڑکی ہر گھر ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہے۔"

"چھوڑیے ۔۔۔ رسم و رواج کیا چیز ہے۔ رسم و رواج تو ہم اپنے بنائے ہوئے ہوتے ہیں ایک بار ان زنجیروں کے بندھن میں کوئی پھنس جائے بس گیا کام سے۔ زندگی ایک منٹ میں پھنس کر رہ جاتی ہے ۔۔۔ آنٹی زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں خوب انجوائے کر لیجئے۔"

نشاط اسے زندگی کے میدان میں بالکل اناڑی سمجھ کر چلی جا رہی تھی اور شمسہ اس کی کم عمری کا جوش و خروش اور ناتجربہ کاری دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"اوہ۔ آسیٹ، این اپوائنٹمنٹ ایٹ سکس تھرٹی" منوج نے کلائی پر گھڑی دیکھی اور دفعتاً کھڑا ہو گیا۔

"یو ول کم ٹو مارو۔ ڈونٹ یو؟" نشاط نے آنکھوں میں ساری شوخی بھر کر پوچھا۔

"شیور۔ شیور۔ بائی" منوج نے ہاتھ ہلایا اور بڑے ادا سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ۔۔ سیٹی بجاتا ہوا پھاٹک کی طرف چل دیا۔

کتنی بے ساختگی اور روانی سے یہ بچے انگلش بولتے ہیں گویا مادری زبان ہو۔ اس کے دل میں اپنے اندر ہی شکست کی ذلت پھانس کی طرح چبھ اٹھی۔ کس طرح اسے ایک سوال کے بعد عضو باطل کی طرح کاٹ دیا گیا۔

اس کے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل گئی ۔۔۔ کاش کہ ماں باپ اتنے دقیانوسی نہ ہوتے۔ کاش کہ وہ آنے والے وقت کے تقاضوں کو محسوس کر سکتے تو آج ہندوستان کے بڑھتے پھیلتے ماحول میں اسے اپنی ناموزونیت کا احساس نہ ہوتا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے دیکھا کہ نشاط کے معصوم چہرے پر [illegible] کی رعنائیاں پھیل گئیں۔

[illegible] ابھی سب ادویات [illegible] ہیں آپ ہم [illegible]
بیٹھنے کی عوض [illegible] پلٹئے اور خوب گلشن کی بہاریں اور [illegible]
کے پروگرام دیکھا کیجئے اور ہاں ایک ترکیب اور ہے آپ [illegible]
کی جدید [illegible] ناول پڑھا کیجئے جس میں آسان اردو اور [illegible]
بول چال کے ڈائیلاگ ہوتے ہیں۔ آپ پڑھتی ہیں ایسی ناولیں؟"
نتاشا نے اچانک پوچھا ہاں ہاں کیوں نہیں میں نے جین آسٹن۔
چارلس ڈکنز۔ ہارڈی وغیرہ کی بہت ناول پڑھی ہیں۔
"ڈینسنس۔۔ وہ سب کلاسکس بالکل بیکار ہیں اس سے کچھ نہ
ہونے کا۔ آپ آجکل کی ناول پڑھئیے ہر بک اسٹال پر ملتی ہیں۔
میرے پاس بہت ہیں آجکل تو انہیں کا کریز (جنون) ہے ہم لوگ
خوب پڑھتے ہیں اور آپس میں ایکسچینج (تبادلہ) کرتے ہیں۔ نغمہ
بھی اکثر مجھ سے لے جاتی ہے۔"

وہ خاموشی سے اس کو دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ میں نہ
آ رہا ہو۔

"آپ پڑھئیں گی ۔۔۔۔ اس سے آپ کو بولنے میں بہت
ہلپ (مدد) ملے گی اور آپ کا خالی وقت بھی بڑا اچھا کٹ
جائے گا ۔۔۔۔ میں ابھی لاتی۔"

اس کے جواب کا انتظار کئے بنا جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے
کی طرف دوڑ گئی مسز نصیر بڑے پیار سے اس کو جاتے ہوئے دیکھتی
رہیں پھر بولیں

"اس کو تو ناولیں اور میگزین پڑھنے کا خبط ہے جیسے ہی
ایک ناول ختم ہوتی ہے دوسری کی فکر لگ جاتی ہے۔ دوستوں
کو ٹیلیفون کیا جاتا ہے کہ فوراً دوسری کتاب بھیجو بور ہو رہی ہوں۔
آجکل کے بچوں کو بوریت کا مرض لاحق رہتا ہے ذرا خالی ہوئے
اور بوریت بوریت چلانا شروع کر دیتے ہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہیں آپ اس مرض سے تو میں بھی پریشان رہتی
ہوں ہم کو یاد ہے جب ہم ان کی عمروں کے تھے تو جہاں خالی
وقت ملتا تھا [illegible] بنائی وغیرہ کیا کرتے تھے کبھی کبھی کوئی
اچھی اصلاحی [illegible] دیکھے نہیں اگر دستیاب [illegible] کا نکال لیتے تھے۔
[illegible]

"اماں اور [illegible] کرتے تھے تو اماں

[illegible]
چمک دیکھنے لگی۔

نتاشا دوڑتی ہوئی واپس آگئی اس کے ہاتھوں میں پانچ
چھ کتابیں تھیں اس نے وہ کتابیں مسز نصیر کی گود میں گراتے ہوئے کہا۔
"لیجئے آنٹی ان کتابوں کے ڈائیلاگ آپ کے دماغ میں ایسے
گھس جائیں گے کہ دیکھتے دیکھتے آپ انہیں کو بولیں گی اپنی زبان
بالکل بھول جائیں گی ۔۔۔۔ آجکل یہ ناول بہت پاپولر ہیں۔
ہر لڑکی اور ہر لڑکا پڑھتا ہے اور ٹیچرس بھی بڑے شوق سے چھپ
کر پڑھتی ہیں۔"

اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ شمسہ نے کتابوں کو الٹ پلٹ [illegible]
سرورق پر زیادہ تر مرد اور عورت کی جذبات انگیز پوز میں تصویریں
بنی تھیں اس نے جلدی سے ساری کتابیں پلٹ کر سمیٹ لیں [illegible]
نتاشا کی نظروں سے چھپانا چاہ رہی ہو۔

رات میں جب اس کو سارے کاموں سے فرصت ملی تو تھکن
سے اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور نتاشا کی دی
ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے
لگی آٹھ دس صفحے پڑھنے کے بعد ہی اسے احساس ہونے لگا کہ ناول
بے حد دلچسپ تھی واقعات تیزی سے بدل رہے تھے انداز بیان
اچھوتا جذبات نگاری حسین۔ وہ گویا آگے بہتی چلی گئی۔ نیند کا ایک
جھونکا آیا مگر وہ آنکھیں بند نہ کر سکی بوجھل پلکیں کالی سطروں پر پھسلتی
رہیں اس نے صفحہ الٹا ۔۔۔۔ "کارینا باتھ روم ہی میں تھی کہ
دروازے پر کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا
شاید نینسی صبح کی چائے لائی ہوگی تولیہ کے کپڑے کا بنا ہوا گاؤن اپنے
ننگے جسم کے چاروں طرف لپیٹتے ہوئے اس نے باتھ روم سے نکل کر
جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھول دی مگر وہاں نینسی نہ تھی ۔۔۔۔
مسٹر [illegible] کھڑے ہوئے تھے۔ وہ حیران رہ گئی اپنے چاروں طرف
گاؤن کو اور اچھی طرح سنبھالتے ہوئے اس نے ان سے آنے
کا سبب پوچھا۔ وہ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کمرے میں گھس آئے اور
بولے ۔۔۔۔ کارینا تم یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ میں نے ساری رات
کس طرح گزاری۔ تم میرے دل و دماغ پر [illegible]
[illegible] ایک پل نہیں [illegible] سکا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور کارینا [illegible]

باہوں میں لے لیا۔ کارینا نے پوری قوت سے ان کی باہوں سے نکلنے
کی کوشش کی اس جد و جہد میں اس کا گریبان کھل گیا مسٹر براؤنک
کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک ابھری اور انھوں نے کارینا
کو گود میں اٹھا کر بستر پر ڈال دیا اور ——"

نغمہ نے گھبرا کر ناول دور پھینک دی اور اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے سارے جسم پر چونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور دماغ چکرا رہا تھا یہ ناول —— یہ پاپولر ناول۔ کیا یہ سب کچھ نشاط نے بھی پڑھا ہوگا اور اس کے ساتھ کی سب لڑکیوں نے بھی پڑھا ہوگا نغمہ نے بھی —— ان کے کچے ذہنوں نے کیا اثرات قبول کئے ہوں گے خدا کرے نغمہ نے نہ پڑھا ہو کبھی کبھی نہ پڑھا ہو۔ وہ تو اس خیال کے تصور ہی سے لرز رہی جاتی ہے —— نغمہ اور نشاط کی عمریں تیرہ چودہ سال سے زیادہ نہ ہوں گی اس عمر میں تو ایسی کتابیں اس کے پاس سے بھی دگزری تھیں گھر کے بڑے اور بزرگ اس معاملہ میں خاص احتیاط برتتے تھے اسے یاد تھا کہ اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اسے مولوی نذیر احمد۔ مولانا شرر اور راشد الخیری وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کو دی گئی تھیں اس کے بعد حجاب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا حجاب امتیاز علی۔ شفیق الرحمٰن اور شوکت تھانوی کی کتابیں گھر میں آگئیں۔ ان کتابوں کی صاف ستھری زبان اور ادبی مزاح سے سارا گھر ہی لطف اندوز ہوتا تھا۔

مگر اب ...... اس کی رگوں میں کپکپاہٹ دوڑ گئی اس نے ڈرتے ڈرتے نغمہ کی کتابوں کے شیلف پر ایک نظر ڈالی پھر نغمہ کی طرف دیکھا وہ قریب ہی مسہری کے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی شمسہ آہستہ سے اٹھی اور نغمہ کی شیلف کے قریب جا کھڑی ہوئی دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ساری کتابیں پلٹ کر دیکھیں اس کی ادھوری سانس [illegible] کتابوں کے بیچ میں پڑی ہوئی تھیں —— نغمہ میری بیٹی —— نہیں۔ نہیں کوئی ضروری نہیں کہ یہ ساری کتابیں ویسی ہی ہوں اس نے جھک کر ایک کتاب اٹھائی اور ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں آنکھوں سے لگا کر پڑھنے لگی چار، پانچ صفحے پڑھنے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی اور آگے پڑھتی گئی اور پھر گویا اس کے منہ میں نمک سے بھرا ہوا نوالہ آگیا ہو —— یہ مغربی تہذیب اور رومانیت —— اس سے کوئی بھی ناول کیونکر مبرا ہو سکتی ہے۔ سراسیمگی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے وہ دونوں کتابیں کھڑکی سے باہر اچھال دیں اور کھڑکی کے باہر گہرے اندھیرے میں تکتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس کے ماں باپ اور دوسرے بزرگ کتنے دور اندیش تھے جنھوں نے اپنی تہذیب اور اپنی زبان کی حفاظت کی ورنہ یہ چراغ ایک نسل پہلے ہی بجھ چکے ہوتے

اس نے کھڑکی سے پلٹ کر نغمہ پر نظر ڈالی سفید نائٹ گاؤن میں لپٹی ہوئی وہ ایک معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی کتنی پیاری۔ کتنی معصوم —— مگر کہیں اس کی معصومیت کی حفاظت نہ ہو پائے کہیں اس کے ہاتھوں ہماری تہذیب ہماری اقدار ہماری زبان کا جنازہ نہ اٹھ جائے۔

تھوڑی دیر سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر مستحکم قدموں سے اپنی پرانی کتابوں کی الماری کے پاس گئی جو مدتوں سے بند پڑی تھی اس میں سے اس نے زندگی۔ مراۃ العروس۔ فسانۂ عجائب۔ خاتون۔ انارکلی گرنیں وغیرہ نکال کر نغمہ کی کتابوں کے بیچ میں لگا دیں۔ ابھی اسے یہی سب ناول پڑھنا چاہئے پھر جب اس کا ذہن پختہ ہو جائے وہ کچھ بھی پڑھ سکتی ہے ...... اس نے اطمینان کی سانس بھر کر شیلف پر دوبارہ ایک نظر ڈالی —— انگریزی ناولوں کے دلچسپ ناموں اور بھڑکیلے سرورق کے آگے اردو ناولوں کے نام بے جان کتبوں کا تاثر دے رہے تھے اس نے گھبرا کر جلدی اپنی پلکیں جھپکائیں اور ایک بار پھر اس نے اردو ناول ترتیب دے کے نمایاں جگہوں پر کر دیا —— ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے پھر شیلف کا جائزہ لیا —— وہ کتابیں اب بھی آنکھوں سے فریاد کرتی نظر آ رہی تھیں۔

بجلی کی سرعت سے یہ حقیقت اس پر واضح ہوئی کہ نغمہ کو روانی کے ساتھ اردو پڑھنا آتی ہی نہیں وہ ہجے لگا لگا کر اردو کو پڑھنے کی زحمت کیسے گوارا کرے گی ——

وہ مایوسی کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔ —— کوئی فائدہ نہیں —— نغمہ خود ان کتابوں کو نہ کا

بجا کر دور پھینک دے گی ۔۔۔ اس نے بڑے دکھ سے ان نادانوں کی طرف دیکھا اور سست ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ان کو نکال کر اپنی گود میں رکھتی گئی ۔۔۔ اگلے سال بس اگلے ہی سال وہ نغمہ کا داخلہ اردو میڈیم اسکول میں کروا دے گی اپنی زبان سے بے بہرہ ہو کر پوری قوم ڈوب جاتی ہے ۔۔۔ مگر پھر اس کا مستقبل ۔۔۔ پل پل بدلتے سماج میں اس کا مقام ۔۔۔ اس کا کیریر ۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اسی طرح کسی انٹرویو میں ریجکٹ (نا پاس) کر دی جائے ۔۔۔ مقابلے کے امتحانوں میں بازی ہار جائے ۔۔۔ پھر اس ذلت کو برداشت کرتے ہوئے کیا وہ اپنے والدین کو دقیانوس اور کوتاہ اندیش نہ کہے گی لیکن انٹرویو میں بیٹھنا ہی کیا ضروری ہے ۔ جہاں مرد بیکار پھر رہے ہوں ، وہاں عورتوں کو ان کی جگہوں پر کام کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔۔۔ نہیں ہرگز وہ اسے کانونٹ میں نہ بٹھائے گی ۔۔۔ اسے اس تعلیم سے کیا لے گا جہاں کامیابی کی دیوی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہو ۔۔۔ اور اگر کانونٹ میں ہی پڑھے گی ۔ تو بھی اسے یہ اخلاق سوز اور فحش ناول پڑھنے نہ دیں گی جو کچے ذہنوں کو برباد کر دیں ۔ میں اسے اردو گھر میں پڑھاؤں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ اخلاقی ، اصلاحی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہے ۔ انگریزی تعلیم کا حصول کرنا ضروری ہے تو اس کے توڑ کے لئے اردو کی پاکیزہ کتابوں کا مطالعہ بھی ثواب کا عمل سمجھ کر اسے کرنا ہوگا ۔ خدا کی پناہ انگریزی کا یہ لٹریچر گندگی کے بجبجاتے کیڑوں کی طرح چاروں طرف پھیل رہے تھے ۔ اسے جھرجھری سی آ گئی ۔ جیسے وہ کیڑے اس کے جسم پر رینگتے چڑھتے آ رہے ہوں ۔

یا رب وہ کس دوراہے پر کھڑی تھی ۔ اس دوراہے سے کون سی سڑک سیدھی جاتی تھی ۔ اس نے اپنی گود میں رکھی ہوئی کتابوں پر نظر ڈالی ۔ یہ صحیح ہے کہ نغمہ کو اردو روانی سے پڑھنا نہیں آتی مگر اتنا ہی کیا کم ہے کہ آتی تو ہے ۔ تو یہ کتابیں اس کی نظروں کے سامنے رہیں گی تو بھولے بھٹکے اٹھا ہی لے گی اور پھر شاید کوئی اصغری خانم اپنے سلیقے اور ہنر مندی سے نغمہ کا دل جیت لے ۔۔۔ کسی تو بی بی کی اکبری کا انجام میری فرزانی نغمہ کو اپنی طرف متوجہ کر لے ۔ کسی نازک کلی کی سسکیاں اس کے دل کو چھو لیں ۔۔۔

امید کی ہلکی کرن کے سہارے نغمہ نے اپنی گود میں رکھی ہوئی کتابیں ایک ایک کر کے [illegible] کے شیلف میں سجا دیں ۔ کوئی بھی راستہ متعین کیا جائے اور کیسی ہی طرح اپنائی جائے گی مگر چراغوں کو تو روشن رکھنا ہی ہے ۔ یہ چراغ جلتے ہی رہنا چاہئے ۔

وہ ایک نئے عزم کے احساس کے ساتھ اٹھی اور بستر پر جا کر لیٹ گئی ۔ بوجھل ذہن صاف ہو چکا تھا ۔ تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو گئی ۔

ڈرامہ

ثریا صغیر

ڈرامے تو دیکھے ہی ہوں گے؟

اور ڈرامے پڑھے بھی ہوں گے؟

دراصل ڈرامے دیکھتے ہوئے مناظر کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی بس وہ ایک کے بعد ایک نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی ڈرامہ کاغذ پر لکھا دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مناظر کی ترتیب کیا ہے۔

کاغذ پر جب ڈرامہ پڑھنے کو ملتا ہے تو شروع میں وہاں اوپر لکھا ہوتا ہے: "پہلا منظر" ——— اس کے بعد کچھ اس طرح کی سطور لکھی ہوتی ہیں۔

"ایک بڑا سا ڈرائنگ روم سامنے ہے۔ جہاں دروازوں پر رنگین پردے لٹک رہے ہیں۔ گلدانوں میں پھول رکھے ہوئے ہیں۔
ایک جانب ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہے جس میں کسی نوجوان لڑکی کا عکس نظر آ رہا ہے۔ یکایک اس عکس کے عقب سے ایک نوجوان کا چہرہ جھانکتا ہے......"

تو اس وقت سماں ایسا ہی تھا۔ ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔

پہلا منظر میرے سامنے تھا ایک گھر کا اور سین تھا اس کمرے کا جو اس گھر کے اصل کمروں میں سے ایک تھا۔ یہ کمرہ ذرا بڑا تھا ——— یہ کمرہ زیادہ تھا اور [illegible] ——— اس میں تین پلنگ پڑے تھے۔ ایک پلنگ خالی تھا، دوسرے پر شاہدہ پھوپھی بیٹھی پان چھالیہ سے شغل کر رہی تھیں تیسرے پلنگ پر ہر جانب کپڑے اور کترنیں بکھری ہوئی تھیں اس کے سامنے ایک سٹول پڑا تھا اور اس سٹول پر ایک کپڑے سینے والی مشین رکھی ہوئی تھی جس کا پہیہ چل رہا تھا خود بخود نہیں بلکہ اسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ یہ کوئی سولہ سترہ سال کی رہی ہوگی اس کے ہاتھ پیروں کی حرکت [illegible] [illegible] لڑکی سے ذرا پرے [illegible] [illegible] [illegible] ——— [illegible] [illegible] سال کا [illegible] اس نے اس کے [illegible] [illegible] ہوں۔ اس کی [illegible]

ہوں میں۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا کہ [illegible] مشین کر رہے تھے [illegible] پائنتی والے حصے میں کوئی اور بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی بھی [illegible] نظر آ رہی تھی جو بیٹھ کر تکیہ پر سر رکھے ہوا تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ [illegible] کی بیوی شبیہ ہے۔ نیچے ذرا سا جو فرش بچ گیا ہے وہاں پانچ عدد بچے جن میں دو لڑکیاں تھیں اور تین لڑکے تین سال سے لے کر آٹھ سال تک کے۔ یعنی صرف سال سال بھر کے فرق والے بیٹھے خدا معلوم کھیل رہے تھے یا [illegible] تھے یا کیا کر رہے تھے اس وقت یاد نہیں پڑ رہا ہے

وقت تھا دو بجے دوپہر کا۔ میں اتفاق سے پھوپھی جان کے گھر جا چکی تھی۔ آنگن سے یہ کچھ میں نے دیکھا یعنی پہلا منظر۔

اب یہاں سے دوسرا مرحلہ یوں شروع ہوا کہ مجھے دیکھ کر اس سین میں خاص تبدیلی ہوئی پھوپھی نے سروتہ رکھ دیا اور مجھے گھور کر دیکھا ——— پھر سلام دعا کا مرحلہ طے ہوا۔ پھر میں نے پھوپھی والے بستر پر قبضہ کیا۔ پھر خدا جانے کیا کیا باتیں ہوئیں پھر شاید کسی موقع پر مشین کی کھچ کھچ نے مجھے کوئی ٹہوکا دیا یا کیا ہوا کہ میں ادھر متوجہ ہوگئی۔

"یہ لڑکی......؟" میں نے استفہامیہ انداز میں پھوپھی کی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اور وہ جواب میں زور سے بولیں "نزاکت ہے"

نزاکت نے مشین روک دی اور مجھے دیکھا پھر جلدی سے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ جواب دیا گیا۔ وہ دوبارہ مشین پر جھک گئی کھچ کھچ نے پھر اپنی صدا بلند کر دی۔

"نزاکت؟!"

میں نے ذہن پر زور ڈالنا شروع کیا۔

یا اللہ یاد کرا دے کہ یہ لڑکی کون ہے؟ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے یا نہیں دیکھا ہے۔ یاد کیوں نہیں آتا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں مدد طلب نظروں سے پھوپھی کی طرف دوبارہ دیکھا کہ شاید وہ اس اجمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیں لیکن وہ تو دوبارہ بڑے انہماک سے پاندان کی اس خالی کلھیا کو گھور رہی تھیں جس میں کتھا اب برائے نام رہ گیا تھا۔

"ارے بہو۔ ذرا اس میں پانی تو ڈالیو۔" وہ کلھیا اٹھا کر بہو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

بہو نے بڑے تساہل کے ساتھ کلھیا کو ہاتھ میں لیا پھر [illegible]

سے آئے گھر لوٹ۔

"اس میں کہنا تو ہے ہی نہیں" اس نے زیرِ لب کہا۔

"جاؤ بیا پانی ڈال دے" پھوپھی نے دوبارہ اسے بھیجا۔ وہ اٹھی اور چلی گئی۔

نزاکت۔

میرے گلے میں پھندا ابھی تک لگا ہوا تھا۔ میں نے اپنی بھنویں بڑی مشکل سے راز دارانہ انداز میں اچکا کر پھوپھی جان کو ٹٹولا۔

"ارے تم نہیں جانتیں یہ بہو کی بھتیجی ہے۔ بیچاری کے ماں باپ مر گئے ہیں بہو کے گھر آ گئی ہے۔ وہاں اس کے بھائی کی بیوی نے بیچاری کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ غریب اس سے قبل ماموں کے ہاں چلی گئی تھی۔ ہاں ماموں کے بیٹوں نے ناک میں دم کر دیا تھا بے حد پریشان تھی۔ بہو ساتھ لے آئی ہے۔ بڑی نیک لڑکی ہے کوئی پندرہ دن سے یہاں ہے سارا دن گھر کے کام کاج میں جتی رہتی ہے۔ خدا رکھے میری اور تمہارے پھوپھا کی بے حد خدمت کرتی ہے۔"

یاور نے درمیان کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا "ہاں جی، باجی۔ عجیب لوگ ہیں ایک آدمی کا کھانا برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ تو اتنا کام کرتی ہے کہ کوئی نوکر بھی نہیں کرے گا۔"

یاور اوّل درجے کا کنجوس تھا۔

میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"تو تم نے سوچا ہے کہ اب اسے اپنے ساتھ رکھو گے۔"

"تو اور کیا پھر وہیں بھیج دوں۔" وہ بولا۔ "باجی ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو اس بے چاری کو نجمہ کی بھابی دو دہتڑوں سے مار رہی تھی۔ ہم نے پوچھا — کیا بات ہے آخر۔ معلوم ہوا کوئی پیچ یا گلاس ٹوٹ گیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اب ایسا بھی کیا۔ کتنے گلاس ہم توڑ دیتے ہیں۔"

میں نے مزید حیرت سے اسے دیکھا۔ یاور اوّل درجے کا خر دماغ آدمی تھا۔ بچوں تک کو معاف نہ کرنے والا۔ ایسی ہی کسی بات پر اپنی پانچ سالہ بچی کو ایسا مارا تھا ایسا مارا تھا کہ بے چاری بے سدھ ہو گئی تھی۔

"اچھی بات میاں" میں نے کہا۔ "بن ماں باپ کی بچی ہے — یہاں آرام سے رہے گی تمہارے کام بھی کرے گی اور اس غریب کو بھی سکھ کا سانس مل جائے گا۔"

"کیوں دو — [illegible] تو خوش ہے؟"

یاور نے بچوں جیسے پھو ہڑپن سے اسے جھڑکا دیا اور پھر نزاکت نے کھسیا کر دانت نکال دیئے۔

"بولتی کیوں نہیں" یاور نے پھر بچپنا دکھایا۔

"میاں تم کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے ہو" میں نے یاور سے اس کی گلو خلاصی کے لئے کوشش کی۔

"یہ لو آگئی اپنی کلھیا" نجمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

پہلا منظر ختم ہوا۔

دوسرا منظر ایک مہینہ بعد کا تھا۔

گھر وہی تھا —— افراد وہی تھے۔ وقت بھی دوپہر کا تھا اور میری آمد بھی ویسے ہی بے ڈھنگی تھی۔ مگر نہیں افراد ذرا کم تھے۔ ایک فرد کم تھا۔

اس منظر میں نزاکت موجود نہ تھی۔

اسٹول پر مشین بھی موجود نہ تھی یہ مشین اس وقت کمرے میں آخری حصے میں رکھی ہوئی تھی اور بچے اسی کے پاس فرش پر آلتی پالتی مارے کھانا کھا رہے تھے یاور اپنے کمرے میں تھا۔ وہ کرچوں میں سے آدھا کو نجمہ باورچی خانے میں تھی اور پھوپھی جان بدستور اسی پلنگ پر موجود تھیں اس بار کلھیا میں کھتا خاصا تھا۔

سلام۔ دعا۔ یہ۔ وہ۔ تیری خیریت۔ میری خیریت۔ اس کا رونا اس کا دھونا۔ باتیں ہونے لگیں۔۔۔ اچانک مشین پر نظر پڑی میں نے پھوپھی جان سے سرسری لہجے میں پوچھا: "وہ لڑکی ۔۔۔ نزاکت کہاں ہے؟"

پھوپھی اماں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لمبا سانس لیا۔ یاور تھا نہ نجمہ۔ بہت آہستہ سے گردن میری جانب بڑھا کر بولیں: "وہ تو بولیں۔ وہ چلی گئی ہے۔ یہ مرا یاور اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تلا تھا بڑی مشکل سے ٹالی ہے۔"

"نزاکت کے لئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تو اور کس کے لئے؟" پھوپھی اماں نے آنکھ نکال کر جواب دیا۔

کڑے کوس

ثریا احمد صغیر

حیرت کی بات تھی۔

آج آسیہ پورے آدھ گھنٹہ لیٹ پہنچی تھی۔ وہ میرے کمرے میں آئی جہاں حاضری رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ تو میں نے اس سے دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی۔

"کیا بات ہے آسیہ خلافِ معمول تم آج دیر سے آئی۔ خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں باجی!" وہ قدرے مسکرا کر بولی۔ "دراصل رات آنکھ دیر سے لگی اور پھر صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی۔"

"رات آنکھ دیر سے کیوں لگی بھئی؟" میں نے کسی قدر مذاق کے لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ شرما سی گئی۔ تاہم اس نے کہا رات میرے پڑوس میں ایک واردات ہو گئی تھی۔ بس اسی سلسلے میں جاگنا پڑ گیا تھا۔"

"واردات؟ کیا کوئی چوری وغیرہ؟" میں نے بھنویں اٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں۔ یہ چوری کی واردات نہیں تھی۔ ایک عورت نے دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے وہ خود سے کود پڑی تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ خود سے کود پڑی تھی۔"

"اے تو کیا وہ مر گئی؟"

"جی نہیں۔ مری تو نہیں ہے۔ البتہ ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ شاید ہی سیدھی ہو کر بیٹھ سکے اب۔"

"شوہر بچوں والی تو نہیں؟"

"جی شوہر والی بھی ہے اور بچوں والی بھی۔"

"تچ تچ" میں نے اظہارِ ہمدردی کیا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے کیا عمر ہو گی اس کی؟"

"اسے ابھی اس کی کیا عمر ہو گی۔ سترہ سال کی تھی جب شادی ہوئی تھی اس کا بڑا بچہ مشکل سے چار پانچ سال کا ہو گا۔ یہ کوئی بائیس تیئیس سال کی ہے۔"

"ابھی تو وہ خاصی کم سن ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ وہ اس حادثے میں معذور ہو گئی تو سخت پریشانی میں پڑ جائے گی۔"

"پڑ کیا جائے گی۔۔۔ پڑ گئی ہے۔" آسیہ نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "میاں اپنے شوہر غریب کا بیڑہ بھی غرق کرا رہی ہے۔ اور وہ چھوٹا بچہ جو ابھی دو سال کا بھی نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا ان عورتوں کی عقل آخر چلی کہاں جاتی ہے؟"

وہ ذرا جھنجھلائی۔ میں نے مسکرا کر کہا: "یہ بات مت بھولنا کہ تم خود بھی عورت ہی ہو۔"

وہ قدرے سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی: "باجی مذاق کی بات نہیں میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے نا کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے ایسو فی صد درست ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سو پچاس میں سے ایک آدھ عورت نکل آئے عقل مند۔ مگر ایکسیپشن کہاں نہیں ہوتے۔"

میں نے اس فلسفیانہ نقطۂ نظر پر حرفِ اظہارِ خیال سے گریز کیا۔ اور اس کے موڈ میں قدرے شگفتگی پیدا کرنے کے لئے کہا۔۔۔ "بہرحال تم عورت ہو تمہیں عورتوں کا سائڈ ہی لینا چاہیئے۔"

"جی نہیں۔" وہ اکھڑے اکھڑے انداز میں بولی۔ "میری طبیعت ہمیشہ سے انصاف پسند رہی ہے۔ میں غلط سائڈ لینے کو قطعاً پسند نہیں کرتی خواہ سامنے والا مجھے کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ہر مرد و عورت کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن آسیہ معاملہ کیا تھا۔ آخر۔ میں بھی تو ذرا سنوں عورت نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی کس خوشی میں؟"

"غصہ تو سارا اسی پر ہے کہ بڑا ہی مہمل اور بیہودہ سا جواز تھا اس کا۔" آسیہ نے تلخی سے کہا۔

"بیہودہ اور مہمل سا جواز؟"

"جی ہاں۔۔۔ جواز تھا کہ اس کا شوہر سالی کے ہاں کیوں ٹھہر گیا؟۔۔۔"

"کیا؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس کا شوہر اس کی بہن سے کوئی چکر چلا رہا تھا؟"

"اوہو۔۔۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں باجی۔ بس وہ بیچارا اپنی

سالی کے گھر گیا تھا۔ وہ جگہ ان کے اپنے گھر سے بیس بائیس میل کے قریب دور ہے۔ سالی اور اس کے شوہر نے اصرار کیا تو وہ غریب ایک دو دن وہیں رہ گیا ــــ اس کا رات وہاں رک جانا اور اصل نیا قیامت ہے عتاب ذرا اندازہ لگائیں اس عورت کی فطرت کا ــ یا میں غلط کہتی ہوں؟"

میں چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی "دیکھو آسیہ تم دوسروں کو دور سے دیکھتی رہی ہو۔ ہو سکتا ہے معاملہ کچھ زیادہ ہی سیریس رہا ہو ــــ بھلا لڑکی اتنا بڑا قدم اٹھاتا دوسری منزل سے نیچے کود گئی۔ ضد ہو گئی ہو گی۔"

آسیہ مجھے کینہ توز انداز میں دیکھنے لگی۔ پھر بولی "پورا محلہ جانتا ہے کہ سرفراز ــــ یعنی اس عورت کا شوہر بے چارہ اللہ میاں کی گائے کی طرح شریف اور سیدھا نوجوان ہے ــــ کسی مل میں کام کرتا ہے۔ میں تو اس کے گھر میں آتی جاتی ہوں۔ میں نے اسے بہت اچھا پایا۔ گھر آکر ہر معاملے میں بیوی کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا ــــ کبھی بچوں کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کپڑے دھونے میں مدد کر رہا ہے۔ کبھی گھر کی صفائی میں جتا ہوا ہے۔ اب ذرا سوچیں اور سمجھیں اس عورت کے دماغ کے خلل کو کہ اپنی سگی بہن کے گھر شوہر کے جانے پر واویلا مچا رہی ہے۔ جبکہ وہ بے چاری شادی شدہ ٹھہری ــ مجھے یقین ہے رات زیادہ ہو گئی ہو گی۔ گھر دور تھا ــ ان لوگوں نے کہا ہو گا سرفراز رک گیا۔ اور یہ ایسا کوئی جرم نہیں۔ یہ بات میں اس لئے جانتی ہوں کہ دوسری منزل پر سرفراز کے فلیٹ سے ملحق میرا فلیٹ ہے۔ ایک گھر کی ساری باتیں اگر زور زور سے ہو رہی ہوں تو سنی جاتی ہیں۔ ساجی حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ڈرامے کے آخری جملے میں نے صاف سنے

"سرفراز کی بیوی نے غصے میں کہا تھا ــــ "میں ابھی نیچے کود جاؤں گی۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تیرا کوئی بات ہے تو کود جا۔"

"دیکھو میں واقعی چھلانگ لگا دوں گی۔"

"ارے بہت دیکھے ہیں چھلانگ لگانے والے۔" یہ تھی سرفراز کی آواز پھر ایک چیخ ابھری تھی اور سناٹے کو چیرتی ہوئی بکھر گئی تھی۔

"سرفراز کی بیوی جمیلہ نے سچ مچ ہی چھلانگ لگا دی تھی۔"

"انھیں سے تو عدالت کی پیروی اس کیس میں ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ــــ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جمیلہ نے اپنا بیان عقل مندی سے دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ میں گرے ہوئے کپڑے ڈال کر منڈیر سے اٹھا رہی تھی کہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ جھگڑے والی بات دوسرے نے گول کر گئی تھی ورنہ بے چارے سرفراز کی شامت آجاتی۔ وہ بہت ڈر رہا تھا۔"

"پھر تو جمیلہ کی تعریف کرنی چاہئے نا کہ برائی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ضرور تعریف کرنی چاہئے۔ ذرا سوچئے اس عورت نے شک کو اپنے دل میں جگہ دے کر نہ صرف اپنی زندگی برباد کر ڈالی بلکہ ساتھ میں اپنے معصوم بچوں اور شوہر کے لئے بھی وبال جان بن گئی ہے مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ بے چاری ابھی نوجوان ہے اور سامنے ایک لمبی عمر کے کڑے کوس کھڑے ہیں۔"

مئی کا حریم

مئی کو رواج ہوا تھا۔ حسب قاعدہ ۲۵ سے شکایتیں آنا شروع ہوئیں۔ لیکن اس طرح ایک ایک دن میں پچاس پچاس شکایتیں آگئے بمبئی، حیدرآباد اور تمام جنوبی ہند سے چند روز کے اندر تقریباً چار سو شکایتیں وصول ہو گئیں۔ ہم صرف ۱۵۰ پرچے ہر ماہ زائد چھپواتے ہیں اس لئے ۴۰۰ پرچے بھیجنے کا امکان ہی نہ تھا۔ خیال ہوا کہ ڈاک کی کرم فرمائی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی کہ ۳ روز کے بعد بہت سی بہنوں نے لکھا کہ انھیں حریم مل گیا ہے۔ البتہ جن بہنوں کو اس مدت میں بھی نہیں ملا تھا اور انھوں نے دوبارہ شکایتیں لکھیں، انھیں دوبارہ پرچہ بھیج دیا گیا۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہم کون سی تاریخ شکایت لکھنے کی مقرر کریں۔ ڈاک کا تو اب کوئی ٹھیک نہیں۔ جب بھی پرچہ خریدار کو مل جائے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے باوجود کچھ خریدار ہمیں کو الزام دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ہی وجہ سے پرچہ دیر سے ملتا ہے۔ ایسی خریدار بہنوں کو چاہئے کہ وہ پرچے پر لکھی کی اور اپنے مقامی ڈاک خانہ کی مہر دیکھ لیا کریں کہ پرچہ کب چلا اور انھیں کب ملا۔ اس سے بڑی حد تک انھیں اطمینان ہو جائے گا کہ ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔

دل سے زبان تک

صغرا سلطانہ

"کیا بات ہے صائمہ؟" میری سہیلی گلنار نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ــــ "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم وہ لڑکی ہی نہیں رہی ہو جسے میں نے آج سے دس سال قبل کالج میں دیکھا تھا ــــ تم تو کالج کی محفلوں کی روحِ رواں تھیں۔ تمہاری شرارتیں۔ تمہارے قہقہے، تمہارا لباس، اب میں تمہیں بالکل الگ پا رہی ہوں۔ آخر بات کیا ہے کیا تمہارا شوہر اچھا آدمی نہیں ــــ کیا تم پریشان ہو۔ کیا تمہیں وہ پسند نہیں؟" آخری جملے کہتے ہوئے اس نے سرگوشی کا انداز اختیار کر لیا۔

ہم دونوں آج دس سال بعد اتفاق سے آن ملے تھے۔ ہمارے ایک رشتے دار کی شادی تھی اور میں وہاں شریک ہوئی تھی۔ وہیں سسرالی رشتوں کی طرف سے صائمہ بھی مدعو تھی۔

کالج میں ہم دونوں فرسٹ ائیر میں ساتھ تھے بعد میں سکنڈ ائیر جوائن بھی نہیں کیا تھا۔ بعد مجھ کو شادی کی جکڑ بندیوں میں پھنس جانا پڑا تھا۔

شادی ــــ شوہر، پریشانی، پسند... میرے ذہن میں آندھیاں سی چلیں۔

"کیا تمہارا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے؟ کیا تم پریشان ہو ــــ کیا وہ تمہیں پسند نہیں...؟"

صائمہ کا جملہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔

اور ذہن منتشر ہو گیا۔ ذہن جو کسی کمپیوٹر کی طرح ہوتا ہے۔ کھٹ کھٹ... ہر چیز اپنے مقام پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اور پھر جواب... جواب درست، بر محل، بے تیز رفتار۔

شادی ــــ میری شادی ہو گئی تھی ــــ

میری شادی کو کافی پہلے ہونا چاہئے تھا ــــ کیونکہ میری بڑی بہن کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ میری عمر اس وقت پچیس سال تھی جب میں نے فرسٹ ائیر جوائن کیا تھا۔ حالانکہ میرے لئے کہیں سے رشتہ آتا ہی نہیں تھا، اختلاف ضرور تھا ــــ شادی کا اختلاف، رشتے اور پیام کا اختلاف ــــ یہ اختلاف ہر لڑکی کو

ہے۔ لیکن میں جہاں تھی۔ وہاں یہ اختلاف مجھ سے زیادہ میرے بھائی کو تھا یعنی بھاوج کو تھا۔ میرے ماں باپ ہوتے تو شاید یہ نا شدید نہ ہوتا۔ باپ باپ ہوتا ہے اور ماں۔ لیکن میرا باپ مر چکا تھا۔ اور یہ ستم تھا میرے بھائی کو جس اس کے سر پر ایک بھاری قرض کی طرح تھی۔ میرا وجود اس کے لئے بھاری بوجھ کی طرح تھا۔ وہ جسے اٹھائے کئی برسوں سے لڑکھڑا رہا تھا۔ اور ــــ میری ماں بھی موجود نہ تھی۔ میری بھابھی تھی۔ میں اپنی بہو کے لئے ایک مصیبت تھی۔ ایک بلائے درماں تھی۔ فالتو چیز تھی۔ گھر کے اخراجات میں اضافے کا موجب تھی ــــ اس کی "پرائیویسی" کی دشمن۔

ان کی کوشش تھی کہ مجھے جلد سے جلد چلتا کر دیا جائے ــــ میرا بھائی۔ بہرحال میرا بھائی تھا۔ وہ بھی وہی چاہتا تھا۔ جو وہ چاہتی مگر وہ مجھے کسی نہ کسی رخ سے اپنی بہن سمجھتا تھا۔ اس نے کئی رشتے جو میری بھابی نے کہیں سے فراہم کئے تھے ــــ مسترد کر دیئے ــــ اور کئی بیت گئے ــــ میں نے فرسٹ ائیر جوائن کر لیا۔ مجھے اس مسئلے کی گمبھیرتا کا احساس اس روز ہوا جب میری بھابھی نے لڑائیاں شروع کر دیں۔

"کہاں سے آئے گا وہ ہیرو جسے تم اپنی بہن دو گے؟"

"واہ جی واہ ــــ آدم زاد ہے پری زاد کا لنگور تو نہیں۔ رنگ کالا ہے کیا ہوا ہے تو مرد ذات۔"

اور پھر میرا ایک رشتہ بھابھی جان کی کوششوں سے طے ہو گیا۔

شوہر ــــ

ہاں شوہر ــــ مجھے بھی ایک بر مل ہی گیا۔ بڑی بات تھی۔ اور بھابھی کی کوشش تھی جیتنے والے لگ تھے۔ مگر یہ گھر میرا ستم دیکھتا۔ اس کے بڑے بھائی کا تھا۔ جہاں تین بھائی اور تھے۔ اور بہنیں بھی تھیں ــــ

میرے شوہر کی عمر بھی کوئی پچاس سال تھی۔ بھابھی کے بقول اگر پچیس برس کا مرد بھی بہرحال میرے لئے کا مرد ڈھونڈ نے کو کہا جائے تو نہ ملتا ــــ کہا جاتا ہے۔ اصل چیز صحت ہوتی ہے ــــ میرے شوہر صحت ماشاءاللہ بہت اچھی ــــ تھی۔ ان کی صحت کا دن کرانے کے لئے اسپیشل ترازو کی ضرورت پڑتی تو مبالغہ نہ تھا۔ ان کی شکل کچھ ایسی ہو گی۔ یہ خیال ذہن میں میرے سامنے تھی ــــ ویسے میرا ہونا مجھے اتنا زیادہ تو میری کمزوری ہوئی کوئی حسن تو نہیں۔ شوہر صاحب کی صحت کے حساب

کا یہی نظر وہ تھی۔ مگر بعد میں ان کی محبوبہ اس خصوصی صفت کا نتیجہ
ہو گئیں کہ کی گڑیا میں ڈھل گئی۔

کس سے احتجاج کرتی؟

سہیلی سے؟

بھائی سے؟

زمانے سے؟

تقدیر سے؟

کرنی بھی تو کیا تھا۔ پھر یہ احتجاج ایک مشرقی لڑکی کرتی! بہت مشکل تھا میرے لئے۔ میں نے ویران نگاہوں سے اپنے ماضی میں جھانکا تھا۔

حال کوئی نہ تھا ——— میرا باپ ——— میری ماں ——— میرے اقارب سب سر جھکائے، بجھی نظریں، بجائے کھڑے تھے۔ میرے سامنے زندگی کے لمبے دن تھے ——— اور میں ابھی بوڑھی بھی نہ تھی ———

زندگی بہت خوب صورت چیز ہوتی ہے اور زندگی سے پیار ہم سب پر فرض ہوتا ہے ——— مجھے بھی زندگی سے پیار ہے۔ تھا بھی۔ مگر میں اب ایک ایسی کلی کی طرح ہوں جو اپنی شاخ پر بس جھول رہی ہے اسے پھول بننے کی توقع نہیں۔ کیونکہ وہ بس شاخ پر کھلی ہے۔ اس میں زندگی کی کوئی قوت موجود نہیں جو اسے شو نما دے سکے۔ میں آہستہ آہستہ مرجھا رہی ہوں۔ اپنی ہی تپش میں جلتی ہوئی۔

پریشانی ———

پریشانی ہی پریشانی تھی مگر میں نے پھر ایک فیصلہ کیا کہ میرے پاس کچھ جانے کا راستہ مسدود ہے۔ میں نے پھر اپنی کشتیاں جلا ڈالیں میں نے طے کیا کہ میں جس جگہ، جس حالت میں ہوں، وہیں موجود رہوں گی۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لئے ——— منہ کس کر بند کر لیا۔ آہوں اور کراہوں کو خیرباد کہا ——— اور پھر میں نے اجنبی راستے پر اپنے قدم رکھنے کے لئے بڑھائے۔

میرے لئے اب کوئی پریشانی نہیں ——— میرا شوہر بڑا اچھا ہے جانے نہیں دیتا۔ جو میں پیار کر سکتی ہوں۔ لطیفے پڑھ لینے سے مسائل تو حل نہیں ہوتے۔ پیار لینے کے بعد کہ میرا شوہر اپنی خامی کے احساس کے تحت ہر اس شخص سے شکوک رکھتا ہے جو ذرا بھی میرے قریب آئے ——— میں کیا کر سکتی ہوں ——— اس کا کیا حل ہے۔ میں تو اپنی جگہ چٹان کی

طرح مضبوط ہوں۔ مجھے اس کا نہیں اپنا خیال ہے۔ اگر وہ مجھ پر شک کرے دل میں جرم کرتے نہیں رکھتا تو میں کہاں سے یہ گلے شکوے برداشت کر سکتی ہوں ———؟

وہ کہتا ہے ——— تم منہ بنا کر مت رہا کرو۔ ہنستی رہتی دکھائی دو ورنہ لوگ پوچھیں گے ——— میں یہ بات بالکل پسند نہیں کرتا ———

گڑیا چابی والی، فوراً مسکرانے لگتی ہے۔ اتنا اسے لباس پہنا دیتے ہیں وہ صاف ستھری ہو جاتی ہے۔

واہ کیا اچھی گڑیا ہے۔؟

صاف ستھری سی۔

ہنستی مسکراتی سی۔

خاندان والے کہتے ہیں "ارے اس کا شوہر اسے بہت چاہتا ہے، ایک پل کو جدا نہیں ہونے دیتا۔ ہمیشہ پہنا اڑھا کر رکھتا ہے۔ گھوماتا پھراتا رہتا ہے ———"

میرے بچے نہیں ہیں ——— یہ میرا قصور ہے خاندان والے کہتے ہیں "ارے پانچ سال ہو گئے ہیں ——— کسی اچھی ڈاکٹر کو جا کر دکھاؤ دوا کھاؤ ———"

میں کیا کہوں ———

وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

دوا ——— مجھے ہی کھانا ہے ———

اور جو دوا کھائے ——— مرض اسی کو تو ہوتا ہے۔

گڑیا ——— پھر گڑیا ہے نا؟

چابی کے بل پر اس کی ہر حرکت کا انحصار ہوتا ہے۔

پسند اور ناپسند کا اب کوئی جھمیلا نہیں۔ جس کا کوئی دل ہو اس کی پسند کیا اور ناپسند کیا!

میں نے مدتوں سے یہ لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ خدا جانے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ جو مجھے دیا جاتا ہے۔ وہ مجھے پسند ہے۔ میں نے تو اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہیں۔ اب کیا پسند اور کیا ناپسند

"کیا بات ہے صائمہ۔ میں دیکھ رہی ہوں تم وہ لڑکی ہی نہیں رہی ہو جسے میں نے آج سے دس سال قبل کالج میں دیکھا تھا ——— کیا تمہارا شوہر اچھا آدمی نہیں ——— کیا تم پریشان ہو۔

کیا وہ تمہیں پسند نہیں ؟"

گلنار کی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلتی ہیں۔۔۔ میں اُسے نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں اور جلدی سے کہتی ہوں۔

"نہیں تو ـــ میرے شوہر تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ مجھے پسند ہیں۔ میں بالکل پریشان نہیں "

"مُنَاجَات"

از۔ ام ہانی

نہ یوں وقفِ رنج و الم کر خدایا!
کرم کر۔ کرم کر۔ کرم کر خدایا!

حمیت مسلماں کی سوئی ہوئی ہے
بصیرت نگاہوں کی کھوئی ہوئی ہے
اب ایماں کی کشتی ڈبوئی ہوئی ہے
تو محکم یقیں دے۔ کرم کر خدایا!

ہمیں لہو لعب زمانہ ہیں گھیرے
خیالوں میں اصنام کے ہیں بسیرے
ہمارے دلوں میں ہیں کافر اندھیرے
ہیں نادان بندے۔ کرم کر خدایا!

ہیں ڈوبے ہوئے ہم سبھی معصیت میں
پناہیں ملی ہیں، ہمیں دہریت میں
تجھے منہ دکھائیں گے کیا عاقبت میں
ہیں قرآن کو بھولے۔ کرم کر خدایا!

ہیں پابندیاں کیوں دعاؤں پہ چھائی
ہیں تاریکیاں کیوں فضاؤں پہ چھائی
پشیمانیاں، ہیں خطاؤں پہ چھائی
خطا درگزر کر۔ کرم کر خدایا!

نہ یوں وقفِ رنج و الم کر خدایا!
کرم کر۔ کرم کر۔ کرم کر خدایا!

حریمی دسترخوان

دہی کے بیگن

بیگن ایک عام ترکاری ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔ اسے مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے۔ ایک ترکیب یہ بھی ہے جو میں لکھ رہی ہوں تجربہ کرکے دیکھیں۔ امید ہے پسند آئیں گے۔

سامان: بیگن گول والے ۵۰۰ گرام۔ دہی جما ہوا تازہ، ۳۰۰ گرام۔ نمک حسبِ ضرورت۔ سرخ مرچ پسی ہوئی حسبِ خواہش، پیاز دو بڑی آنڈی لہسن ایک چھوٹی آنڈی۔ ہری مرچ حسبِ خواہش ناریل ۵۰ گرام۔ زیرہ سفید۔ خشخاش اور کالی مرچ پسی ہوئی چائے کا ایک چمچہ۔ ڈالڈا یا سرسوں کا تیل جسے کڑوا تیل بھی کہتے ہیں ـــ حسبِ ضرورت

ترکیب:۔ بیگنوں کا چھلکا اتار کر باریک باریک قتلے کاٹ لیں اور نمک چھڑک کر کچھ دیر کے لئے رکھ دیں۔ اس کے بعد ڈالڈا یا تیل میں ان ٹکڑوں کو دبا دبا کر ان کا پانی نکال کر تلیں۔ جب گلابی ہو جائیں تو نکال لیں اور اسی ڈالڈا یا تیل میں ½ آنڈی پیاز کے لچھے کاٹ کر سرخ کرکے نکال لیں اور پیس لیں۔

زیرہ اور خشخاش کو چھے یا الٹے توے میں بھون لیں۔

لہسن کے جوے اور گری (ناریل) بھی چھیل کر پیس لیں اور پسی ہوئی پیاز میں سرخ مرچ، خشخاش، زیرہ نمک کے ساتھ شامل کرکے ایک جان کرنے کے لئے پھر پیس لیں۔ اور اس آمیزے میں مسلی چھلے اور بیگن کے تلے ہوئے ٹکڑے ملا کر کسی پتیلی یا بھگونے میں چند منٹ پکا اتار لیں۔

دہی میں بقیہ آدھی آنڈی پیاز کے لچھے، تھوڑا سا نمک، کالی مرچ اور ہری مرچ کاٹ کر ملائیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں

کسی ڈش میں نصف دہی پھیلا کر بیگن کا آمیزہ اس پر پھیلائیں اور بقیہ دہی اوپر سے ڈال دیں اور نوش فرمائیں۔

نمک کئی منزلوں میں پڑتا ہے اس لئے اندازہ رکھیں۔ زیادہ نہ ہونے پائے کم ہی رہے تو بہتر ہوگا۔ بعد میں چھڑک سکتی ہیں۔

رسالہ۔ نیونہ عاصیم اشرف۔ لکھنؤ

دو دن بھوپال میں

نسیم انہونوی

بھوپال کا پہلا سفر میں نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں کیا تھا اور اس
تب مجھے افسوس ہوا تھا کہ زندگی کے اس دور میں بھوپال کیوں نہ گیا
ب سیر و تفریح کا صحیح لطف انسان کو محسوس ہوتا ہے۔ جب ہر شے
ان نظر آتی ہے بہرحال ڈیڑھ ہی سال بعد پھر بھوپال جانا پڑا۔
ت بار میں مرحوم تخلص بھوپالی کی یاد میں جو تقریب عبدالقوی دسنوی
صاحب کے زیر اہتمام ہوئی تھی، اس میں شرکت کے لئے گیا تھا
ر مہمان ہوا تھا اسرار مسعود صاحب کا جن سے میری پہلے کی کوئی
شناسائی نہ تھی، لیکن تین روزہ قیام میں مسعود صاحب اور ان کی
ی رعنا سلطانہ نے حسن اخلاق سے ایسا متاثر کیا کہ جب رعنا سلطانہ
ی شادی کا کارڈ ملا تو میں نے فوراً ہی رزرویشن کرا دیا۔ جانتا تھا کہ
سم سخت ہوگا۔ ۲۴ رمئی کو سفر کرنا ہوگا اور جھانسی سے گذرنا
گا، جہاں کی پتھریلی گرمی صبر آزما ہوتی ہے، لیکن محبت سخت ترین
زمائشوں سے بھی باآسانی گذار دیتی ہے۔ رعنا بیٹی کی شادی میں
نہ پہنچ پاتا تو تمام عمر اس کا غم رہتا۔

بھوپال جانے کے لئے بس ایک ہی ٹرین ہے جو لکھنؤ سے
بلا واسطہ جاتی ہے اور ٹرین شاید بھوپال والوں ہی کے لئے مخصوص
ہے جو گونڈہ، بستی، بہرائچ اور اعظم گڑھ وغیرہ سے سیکڑوں کی تعداد
میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔ بہرحال اس میں تین بوگیاں فرسٹ کلاس
نام کی بھی ہوتی ہیں۔ نام کی میں نے اس لئے لکھا کہ ان کی اندرونی
حالت اچھی ٹرینوں کی سکنڈ کلاس بوگیوں سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

طویل سفر کی شاید ہی کوئی ایسی ڈیلکس ٹرین ہندوستان میں
چلتی ہو۔ ان میں بجلی کے پنکھے بھی ہوتے ہیں، جن کے پر گھومتے
بھی ہیں، لیکن ہوا خارج نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی
پنکھے ہیں جو سب سے پہلے کبھی ریلوے نے استعمال کئے ہوں
گے۔ حکومت کرایہ میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے لیکن یہ نہیں
دیکھتی کہ مسافروں کو سہولتیں کیسی پہنچ رہی ہیں۔ اس فرسٹ کلاس
کے ساتھ بوگس کی کہانی یہ ہے کہ جو دو میرے کیبن سے قریب تھا

غسل خانوں میں ایک سے اندر رہنا اس کی طہارت کے لئے پانی مسلسل ٹپکتا رہتا
تھا ضرورت اس کی تھی کہ چھتری لگا کر اس میں داخل ہوا جائے دوسرے
کی چٹخنی اندر سے ٹوٹ گئی تھی اس لئے اسے بند نہیں کیا جا سکتا تھا کوئی
مسافر اندر رفراغت کر رہا ہو تو دوسرا بے تکلف دروازہ کھول کر داخل
ہو سکتا تھا۔

گاڑی لکھنؤ سے دن کو ۴ بجے چلتی ہے، اس لئے برتھ ریزرویشن
کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کنڈکٹر سکنڈ کلاس والوں کو یا فری سفر کرنے
والوں کو ریل لے کر ٹکٹ خرید کر چلنے والوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ایک ایک
برتھ پر پانچ پانچ چھ چھ لوگ آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں نے اگر اوپر کی برتھ
پر سفر کرنا گوارہ نہ کیا ہوتا تو لکھنؤ سے بھوپال تک بیٹھے بیٹھے ہی جانا پڑتا۔
لیکن اس گرمی میں تپتی ہوئی چھت سے دو فٹ نیچے لیٹنا بھی کم تکلیف
دہ نہ تھا، جبکہ پنکھا ہوا نہ دے رہا تھا، بہرحال اس طرح ۱۱ بجے کے
قریب مرتا کھپتا بھوپال پہنچ گیا۔ مسعود صاحب خود تشریف لائے تھے۔
بغلگیر ہو کر میں نے سامان اتروایا اور چند ہی منٹ بعد گھر پہنچ گیا۔ میرا
خیال تھا کہ شادی کے ہنگامہ میں پرسکون طریقہ پر قیام ممکن نہ ہو سکے گا،
لیکن مسعود صاحب نے وہی بڑا کمرہ میرے لئے مخصوص کر رکھا جس میں
پہلے میں ٹھہرا تھا گھر کے تمام افراد سے مل کر میں جلد سو گیا۔

صبح ۷ بجے مسعود صاحب بہ نفس نفیس خود چائے لے کر آگئے ہم دونوں
نے ساتھ ہی بیڈ ٹی لی۔ اس کے بعد مسعود صاحب شادی کے کاموں میں
مشغول ہو گئے، لیکن میں تنہا نہیں رہا اسی وقت محترم شرقی صاحب
مالک مکتبہ شرقیہ تشریف لے آئے اور کافی دیر تک تشریف فرما رہے۔
شرقی صاحب کے جاتے ہی محترم عبدالقوی دسنوی صاحب نے قدم
رنجہ فرمایا۔ دسنوی صاحب کی آمد غیر متوقع تھی، اس لئے کہ موصوف
کو اس زمانہ میں دہلی جانا ضروری تھا، لیکن آپ نہیں گئے۔ دسنوی
صاحب کے ہمراہ نعمانی صاحب بھی تھے جو سیفیہ کالج میں لکچرر ہی
نہیں۔ دسنوی صاحب کے خویش بھی بن گئے ہیں۔

مجھے کوئی کام نہ کرنا تھا۔ اس قابل ہی نہیں رہ گیا کہ مسعود صاحب
کا ہاتھ بٹا سکتا، اس کے باوجود میں کہیں باہر نہیں گیا اور تنہا بھی نہیں رہا
دسنوی صاحب تشریف لے گئے تو اخلاق اثر صاحب آگئے۔ موصوف نے عام
ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں کی تاریخ، فن اور اصناف پر کئی کتابیں لکھی ہیں
ان کے علاوہ اقبال اور شیش محل اور مکاتیب احتشام بھی آپ کی قابل قدر

تالیفات ہیں اور میں انھیں پڑھ چکا ہوں۔ تحقیقی کاموں کے سلسلے میں اقبال صاحب کو بڑی دلچسپی ہے آپ کی نئی کتاب اقبال نامے ہے جو شائع ہو چکی ہے اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے وعدہ فرمایا کہ کل یہ کتاب مجھے عنایت فرمائیں گے۔ ساتھ ہی میں نے تقریب شادی میں بھی ملنے کا وعدہ لیا۔

مسعود صاحب نے رعنا سلمہا کی شادی کا اہتمام ہری پارک میں کیا تھا اور جیسا کہ میں نے رات میں دیکھا اس پارک کو لڑکوں نے اچھی طرح سجایا تھا کہ واقعی پرستان کا سماں بندھ جاتا اگر شادی کا سب پروگرام اسی جگہ انجام پاتا لیکن آفات ارضی و سماوی میں کسے دخل ہے تین بجے سے جو بارش شروع ہوئی تو اس نے شام تک ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ خیریت ہوئی کہ مسعود صاحب کے اثرات سے جیم خانہ کی متعلقہ عمارت کی کنجی مل گئی اور اس کے ہال میں جلدی جلدی جو انتظامات ہو سکتے وہ کئے گئے تھے ـــــ ہال کو پارٹیشن لگا کر تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا پہلا مردوں کے لئے، دوسرا خواتین کے لئے اور تیسرا آخری کھانے کے لئے۔

بارات کا استقبال ۹ بجے ہونا تھا۔ میں مسعود صاحب کے ساتھ ۹ بجے ہال پہنچا۔ خیال تھا کہ بارش وغیرہ کی وجہ سے بارات تاخیر ہی سے آئے گی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ بارات آ چکی ہے۔

بارش کے باعث جیم خانہ بلڈنگ کے راستہ میں اتنی کیچڑ تھی کہ [illegible] اور سینڈلیں اس میں ڈوبی جا رہی تھیں لیکن اسی عالم میں بیگمات کی آمد و رفت کا سلسلہ ۱۰ بجے رات تک قائم رہا۔ مسعود صاحب نے دو ہزار افراد کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو صورت حال تھی اس میں سب کی شرکت ممکن ہی نہ ہو سکتی تھی اس کے باوجود آنے والوں کی رفتار بتاتی رہی کہ مسعود صاحب کو بھوپال میں کتنی مقبولیت حاصل ہے۔ یہیں میری ملاقات [illegible] صاحب سے ہوئی جو آج کل [illegible] کالونی کے سکریٹری ہیں [illegible] سے کوئی تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی۔ [illegible]

پڑی تھیں اور روشنی کی سجاوٹ بارش میں بھی ختم نہ ہو سکی تھی۔ دو کرسیاں لے کر ہم دونوں بھی بیٹھ گئے۔ موضوع گفتگو یہی تھا کہ کاش بارش نہ ہوئی ہوتی اور شادی حسب پروگرام کھلے پارک ہی میں ہوئی ہوتی۔ ۱۲ بجے رعنا سلمہا کو رخصت کیا گیا۔ میں بصد افسوس اس منظر کو دیکھتا رہا۔ جب بھی کسی لڑکی کی رخصتی دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی پیاری بیٹی نجم السحر کی رخصتی یاد آ جاتی ہے اور میرا دل بھر آتا ہے۔ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

رخصتی کے بعد سب ہی رخصت ہونے لگے۔ میں بھی گھر آ کر سو گیا۔ صبح حسب معمول بیدار ہوا۔ مسعود صاحب شادی کے بعد والی زحمتوں میں مبتلا تھے۔ سامان وغیرہ کی واپسی اور حساب فہمی بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ انھیں کوئی زحمت دوں لیکن مجھے بہن رضیہ محسن صاحب کے در دولت پر حاضری دینا ضروری تھا۔ اپنے گزشتہ سفر بھوپال میں، میں کوشش کے باوجود بہن موصوفہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔ رضیہ بہن بھوپال میں حریم کی سب سے پرانی خریدار ہیں۔ ویسے کل خریداروں میں بھی بہن صاحبہ کا نمبر پانچواں ہے۔ بھوپال کے راستوں سے نابلد تھا۔ کسی رہبر کی ضرورت تھی۔ اچانک رئیس دسنوی صاحب مع اپنے ایک صاحبزادے کے آ گئے میں نے موصوف سے درخواست کی۔ دسنوی صاحب سیفیہ کالج کے قدیم اساتذہ میں شامل ہیں اس لئے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا گھرانہ ایسا ہو جو موصوف سے واقف نہ ہو۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار دسنوی صاحب سے کیا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ محترم محسن صاحب گزشتہ دنوں شدید علیل ہو گئے تھے لیکن اب بہتر ہیں۔ یہ خبر سننے کے بعد تو میرا رضیہ بہن کے یہاں جانا ضروری ہو گیا تھا۔

اسکوٹر کے ذریعہ ہم چند منٹوں میں ہی [illegible] محسن صاحب کی کوٹھی بہت ہی قریب تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو [illegible] صاحب نے اندر سے اطلاع کرائی۔ کہہ دیا [illegible] نسیم صاحب آئے ہیں ـــــ [illegible]

نظر آیا تھا۔ لیکن اسی درمیان غلطی ہو گئی۔ محسن صاحب شکل صورت سے [illegible] رہے تھے۔ ہم سب نے سلام کیا۔ بڑی ہی خندہ پیشانی سے بیٹھنے کے لئے کہا اور دسنوی صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے مخاطب نہیں ہوئے۔ لیکن جب دسنوی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو محسن صاحب جھک کر بیٹھ گئے اور بولے "آپ نسیم انہونوی ہیں، بڑی تمنا تھی آپ سے ملنے کی۔ نوکر نے آکر کہا تھا کہ لکھنؤ سے کوئی کریم صاحب آئے ہیں۔" اور موصوف نے رضیہ بہن کو بلایا اور بتایا کہ میں کون ہوں۔ رضیہ بھی بہت خوش ہوئیں اور واپس جاکر بھائی کی خاطر مدارات کا انتظام کرنے لگیں۔ محسن صاحب ناسازیٔ طبع کے باوجود باتیں کرتے رہے۔ موصوف نے بتایا کہ وہ بھی حریم پڑھتے ہیں۔ بلکہ مضامین ہی نہیں اشتہارات تک پڑھ جاتے ہیں۔

لمعات کی تعریف کی تو میں حیران رہ گیا۔ مجھے علم نہ تھا کہ محسن صاحب جیسے حضرات بھی حریم پڑھ سکتے ہیں۔ یہ میری خدمات کا بہت بڑا صلہ تھا اور میں اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔

پر تکلف ناشتہ کے ساتھ رضیہ بہن نے ہمیں چائے پلائی۔ میں نے محسن صاحب سے کہا۔ آپ کی کوٹھی نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ بے حد دلکش جگہ پر ہے۔ یہاں بیٹھ کر تو شاید میں اب بھی ناول لکھ سکتا ہوں۔ محسن صاحب نے فرمایا کہ آئیے، بلا تکلف قیام کیجئے۔ [illegible]۔ میں نے کہا۔ جب آپ کسی کی شادی میں جائیں گے تو انشاءاللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ اس پر بہار جگہ سے واپس جاؤں، لیکن واپس ہونا ہی تھا۔ ناشتہ کر لیا تھا، اس لئے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ آرام کرتا رہا۔

بھوپال میں دو ہی اردو کتابوں کے قابل ذکر کاروباری ہیں۔ ایک مکتبہ شرقیہ جس کے روح رواں شرقی صاحب ہیں۔ پہلے سفر میں شرقی صاحب سے مل سکا تھا لیکن بھوپال بک ہاؤس بند تھا، جس کے مالک جناب عبدالباسط خان صاحب ہیں، اس لئے اس مرتبہ باسط صاحب سے ضرور ملنا چاہتا تھا، لیکن ان تک پہنچوں کیسے۔ راستوں سے واقف نہیں۔ مسعود صاحب کو زحمت دینا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اخلاق احمد صاحب آ گئے۔ جب وعدہ اقبال لائے "کبھی لائے تھے" [illegible] ساتھ [illegible] کی [illegible] ہی پہنچ گیا۔ [illegible] قریب تھا۔ [illegible] صاحب سے باتیں کرتا رہا [illegible]

[illegible] میں اردو شاعری کے مؤلف مختار شمیم صاحب تشریف لے آئے۔ موصوف سے ملاقات اتفاقیہ ہی تھی۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ موصوف کی اہلیہ ڈاکٹر کشور سلطان صاحبہ [illegible] بھوپال ہی میں موجود ہیں اور مکان قریب ہی ہے اس لئے میں مختار شمیم صاحب اور اخلاق احمد صاحب کے ساتھ چند منٹ کے لئے بہن کشور سلطان صاحبہ سے ملنے چلا گیا۔

اپنے دونوں سفر کے دوران جس حد تک میں نے بھوپال دیکھا اسے بے حد صاف ستھرا شہر پایا۔ یہاں کوئی ملٹی اسٹوری عمارت نظر نہیں آئی۔ آبادی شہر کی وسعت میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ ٹریفک کا ہجوم بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ افسوس کہ بھوپال کی آبادی کا نیا حصہ ٹی ٹی نگر میں نہ دیکھ سکا جس کی بے حد تعریف سنتا آیا ہوں۔

اخلاق صاحب نے اپنی خوش اخلاقی کے تحت مجھے اسکوٹر پر مسعود صاحب کے یہاں پہنچا دیا جو ولیمہ میں جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ فوراً ہی ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ [illegible] پہنچ گئے۔

دعوت ولیمہ کے ساتھ ہی انگریزی طریقے پر دولہا دلہن سے متعارف کرانے کے لئے انھیں ایک تخت پر [illegible] گیا تھا۔ لوگ آتے جاتے دولہا دلہن کو دیکھتے اور تحائف پیش کرتے۔ میں افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ یہ ترقی پسندی میرے لئے تکلیف دہ تھی۔ ایک مسلمان دلہن کو اس طرح نمائش کے لئے بٹھانا قطعاً اسلامی اصول کے سخت خلاف تھا۔ پردہ نہ کرنا دوسری بات ہے، لیکن دلہن کو اس طرح تمام مردوں اور عورتوں کے مجمع میں بٹھانا بہت زیادہ ترقی پسندی ہے۔ افسوس کہ مسلمان مغربیت میں اس طرح ڈوبے جا رہے ہیں کہ اپنے اسلاف کی قدروں کا انھیں کوئی پاس و لحاظ نہیں رہ گیا۔ اللہ ہی انھیں راہ مستقیم دکھائے۔

دعوت کے کھانے بے حد لذیذ تھے، لیکن جگہ کی فراوانی کے باوجود [illegible] طریقہ پر کھانا پڑا۔ ایٹ ہوم تک تو خیر چنداں تکلف نہیں ہوتا۔ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی پلیٹ میں چمچے سے نکال کر کھڑے کھڑے بھی کھائی جا سکتی ہیں، لیکن ذرا سوچئے تو کہ روٹی، سالن، بریانی کھڑے کھڑے ایک ہاتھ میں پلیٹ لے کر دوسرے ہاتھ سے کس طرح کھائی جا سکتی ہے۔ فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانے کا طریقہ ختم ہوا۔ [illegible] کا رواج ہے اور اب [illegible] کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے۔ [illegible]

بے حد بے تکلف ہوں۔

دعوت ولیمہ سے فارغ ہو کر میں ½۱۰ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ آرام کرنے جا ہی رہا تھا کہ "سعادت" ناول کے مرحوم یعقوب یاور کوئی صاحب آ گئے۔ ان سے ملنے کا اشتیاق اس وقت سے تھا۔ جب سے میں نے ریواز شائع کیا تھا۔ افسوس کہ وہ اتنی دور رہتے ہیں کہ میں ان سے اور چند دوسرے کلاکاروں سے ملنے کے لئے وقت نہ نکال سکا یعقوب صاحب کو میری جائے قیام کا علم نہ تھا اس لئے وہ جناب متین صاحب کی رہبری میں آئے۔ متین صاحب مسعود صاحب کے پڑوس ہی میں رہتے ہیں اور حریم بھی آپ کے یہاں جاتا ہے۔ کافی دیر تک یعقوب صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ وہ رخصت ہوئے تو میں نے سونے کی کوشش کی۔ لیکن ½۲ بجے بیدار ہو کر پونے تین بجے جسے اسٹیشن جانا ہو اسے نیند کیسے آ سکتی ہے۔ اب تو ریزرویشن کا دور ہے۔ گاڑی چھوٹ گئی تو پھر نہ جانے کتنے دنوں بعد کا ریزرویشن مل سکے۔

½۲ بجے مجھے ناحق مسعود صاحب کو جگاتے مجھے بڑا دکھ ہوا لیکن انھیں جگائے بغیر میں جا ہی نہ سکتا تھا مسعود صاحب خود ہی بیدار نہیں ہوئے بیگم صاحبہ بھی جاگ اٹھیں اور چائے بنا کر پلائی۔

اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے مسعود صاحب میرے اصرار کے باوجود مجھے چھوڑ کر نہیں گئے۔ خدا خدا کر کے گاڑی آئی تو میں مسعود صاحب سے بغلگیر ہو کر سوار ہو گیا۔ واپسی کا سفر بھی اسی ناہنجار لکھنؤ بمبئی ایکسپریس ہی سے کرنا پڑا۔ آتے ہوئے پنکھے ہوا نہیں دیتے تھے، لیکن تسلی کے لئے گھومتے تو تھے۔ اس مرتبہ پوری بوگی کے پنکھوں نے اسٹرائک کر دی تھی جھانسی میں کوئی صاحب انھیں منانے آئے مگر ان کی ایک نہ چلی اور اس فرسٹ کلاس بوگی کے تمام مسافر سارے دن کی ناقابل برداشت گرمی میں جلتے بھنتے اپنی منزلوں پر پہنچتے رہے۔ میں اس مرتبہ بھی بالائی برتھ پر تھا۔ کس طرح لکھنؤ پہنچا ہوں میں ہی جانتا ہوں۔

لطیفے

• ایک بیوی نے جسے اپنے شوہر کے چال چلن پر شبہ تھا ایک پرائیوٹ سراغرساں کی خدمات حاصل کیں۔ پہلے دن کی رپورٹ دیتے ہوئے سراغرساں نے کہا "آج آپ کے شوہر فاضل وقت میں چار مختلف ہوٹلوں، باروں اور ایک کنواری کے کلب میں گئے تھے۔

"اچھا" بیوی نے کہا۔ تم نے کیا پتہ لگایا کہ وہ وہاں کیا کرنے گئے؟

سراغرساں نے کہا۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں وہ آپ کا پتہ لگاتے پھر رہے تھے۔

• ایک بے تکلف دوست بے دھڑک اندر آ گئے تو دوست کو بیوی کے ساتھ کپڑے دھوتے دیکھ کر بولے "تمہیں کپڑے دھوتے شرم نہیں آتی" دوست نے کہا جب میری بیوی روٹی پکانے میں میرا ہاتھ بٹا سکتی ہے تو پھر کیا میں اس کے ساتھ کپڑے نہیں دھو سکتا۔

• طلاق کے ایک مقدمے میں عورت نے جج سے کہا "ہم دونوں شادی کے بعد ایک عرصے تک خوش و خرم زندگی گزارتے رہے، لیکن بے بی کے آنے کے بعد ہماری ازدواجی زندگی تلخ ہو گئی۔

جج نے پوچھا بے بی لڑکا ہے یا لڑکی

بیوی نے کہا "وہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہے اور ہمارے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ میں آ کر رہنے لگی ہے۔

• کانسٹبل نے غلط طریقے پر سڑک پار کرتے ایک بوڑھی عورت کو دیکھ کر بار بار سیٹی بجائی لیکن وہ نہ رکی تو کانسٹبل نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "میں کب سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تم رکتیں نہیں

بوڑھیا نے کہا بیٹا! وہ زمانہ تو عرصہ ہوا گزر گیا جب میں سیٹی کی آواز پر رک جایا کرتی تھی۔

• ایک رئیس نے ایک ماہر یادداشت کو ملازم رکھنے کے لئے رکھ پہلے ہی دن ماہر یادداشت اپنا سبق دے کر باہر چلے گئے، لیکن چند منٹ بعد انھوں نے گھنٹی بجائی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو انھوں نے کہا میں اپنی چھتری اندر ہی بھول گیا ہوں۔

"لاحول ولاقوۃ"

———— دُرِین بارہ بنکوی

ہمیشہ سے سنتی چلی آرہی تھی بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا لڑکیوں کے لئے تو بڑے منھ تکنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کے بڑی مشکل سے اچھے رشتے مل پاتے ہیں مگر لڑکوں کے لئے کیا دشواری چند گھر جھانکو کہیں نہ کہیں من پسند لڑکی مل ہی جائے گی۔ اور اب میں بھی انھیں بوڑھیوں میں شامل ہو چکی تھی جب تیسری بیٹی شادی کی تقریب سے فارغ ہوئی تو چین و سکون کی سانس لی اور کئی دن گہری گہری نیندیں سوئی۔ ۔۔ بخدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے تینوں بر سرِ روز گار کامیاب زندگی گذار رہی تھیں اور میں انتہائی شاداں و فرحاں قلب کی گہری ترین گہرائیوں سے خدائے واحد کی شکر گذار تھی۔ البتہ دل میں ایک کانٹا تھا جو اکثر چبھنے لگتا۔ وہ کھٹک کیسی تھی؟ کیوں تھی؟ کسی سے کہہ بھی تو نہ سکتی تھی لوگ کیا سوچتے کیا کہتے؟ یہی کہتے نا کہ سٹھیا گئی ہوں اور اب میں اپنے آپ کو کافی حد تک بدل ڈالی ہوں۔ ماحول خاصا بدلا اس لئے بات اپنی حد تک سلیقہ سے کرتی ہوں۔ ۔۔ بات در اصل یہ ہے کہ تینوں کی شادیاں کے بعد دیگرے جلدی جلدی کرنی پڑیں اس سے اب ایسا لگتا ہے جیسے گھر میں جھاڑو پھر گئی ہو۔ بڑی بڑی دیگچیں چاندی کے جگ گلاس۔ پاندان خاصدان گلدان۔ سب کچھ دے ڈالا دیتو بھی تھے نے۔ لڑکیاں ماشاءاللہ تین اور لڑکا اللہ رکھے ایک۔ بس یہی کرید تھی جو کلیجہ چھلنی کئے دے رہی تھی اب سوچ تو یہی کر رکھا تھا لڑکی ایسی ڈھونڈ نکالوں گی جو پھر سے ایک بار گھر بھر دے اور وہ کمی جو تینوں بیٹیوں کو دے کر ہوتی ہے پوری ہو جائے لیکن یہ راز تو ہمارا دل کا دل ہی میں رہا ہر زبان سے یہی کہتی اپنے دلھو کے لئے خوبصورت و نیک سیرت دلہن لاؤں گی جو بیٹی کی طرح میری خدمت کرے مجھے دولت نہیں چاہئے اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے ۔۔۔ مگر یہی سوچ تو اصل میرے لئے عذاب جان بن گئی تھی حسین ترین لڑکیاں دیکھیں لیکن نظر میں پھر وہی۔ یعنی سونا چاندی۔ یہ کمی بھی کب پوری ہوگی پھر خیال آتا۔ بہرحال بڑی سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جو جتنا دے گا سب خوشی خوشی قبول کر لوں گی اور کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔ مگر یہ بات دل میں کھٹکتی رہی جس کا حل یہی تھا کہ بیٹے سے بات کروں لیکن دلھو نے صاف صاف کہا تھا کہ جہیز کی کوئی چیز نہیں لیں گے جو کچھ نا مکمل تعلیم یافتہ

چیز تھی کہا کرتی تھیں بچیوں کے لئے صرف قرآن شریف اور میلاد پڑھ لینا کافی ہے نہایت ہمت و حوصلہ کے باوجود میری سب سے بڑی کمزوری یہی تھی بسا اوقات یہ جہالت خفت کا باعث بن جاتی آجکل کے دور میں یہ تھوڑی لڑکیاں سنجالنے کی بجائے بول جاتی ہیں اپنے پلے کچھ نہیں پڑتا سب سے زیادہ کوفت تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی بات کو اچھی طرح سمجھ کر دلھو کے ابا سے کہتی ہوں تو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ جھنجھلا کر لاحول ولا حول ولا قوۃ کہتے ہوئے باہر مردانے میں چلے جاتے ہیں۔ بات تو میں نا پ تول کر سمجھ بوجھ کر ہی کرتی ہوں اب یہ جو سونا چاندی میری کمزوری بنکر رہ گیا تو اس میں میرا کیا قصور ———— ؟ ابھی کل ہی کی بات ہے دبی زبان میں نے کہا دلھو کے ابا جب سے لڑکیوں کی شادیاں کیا ہوئیں ایسا لگتا ہے جیسے گھر میں بالکل اندھیرا ہو گئی اب بہو ایسی لاؤں گی جو پھر سے گھر اچھا لگے۔ بس وہ جل گئے یہ اندھیرا کیا؟ کیا چیز اڑ گئی تمہاری۔۔ ؟ لاحول ولا قوۃ بچیوں کو دیا کبھی اندھیرا ہو گیا۔ میں دل کی بات بھی پوری نہ کہہ پائی تھی کہ اپنا سا منھ لے کر رہ گئی۔ دو دن اور آج کا دن پھر میں نے کوئی بات زبان سے نہیں نکالی ———— مگر دادی مرحومہ کا وہ درس جو بچپن سے لے کر جوانی تک پہنچ رہا کیسے دل سے نکال پھینکتی؟ وہ بڑے اعتماد سے کہا کرتی تھیں یہی وقت پڑنے پر بس سونا چاندی ہی کام آتا ہے ان کی نصیحت فرد جان بنائے اور آج تک گلے سے لگائے ہوئے ہوں اور اتفاق بھی کیوں نہ ہو وہ کہتی تھیں ویسی کر دکھایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جہیز میں ایسا بھیجا تھا کہ سسرال والے حیران تھے ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا محلہ والیوں کو بلا بلا کر فخریہ دکھائیں اور میں خوشی سے پھولی نہ سمائی اب میں نے دل میں ٹھان لی کوئی بات کسی سے نہ کہوں گی مگر طبیعت یہ دل کی کرید ایسی تھی کہ دل کو چین نہ راحت کرتا ہم ———— جذبۂ تجسس کو جتنا دبانے کی کوشش کرتی اتنا ہی ابھرتا جا رہا تھا ہمہ وقت خواب بیداری میں اپنے گلدان خاصدان۔ پاندان سب کا خیال رہتا اور سب سے زیادہ چھوٹے بیٹے کے دلھن بننے کے تو بڑے ہی ارمان تھے۔ ہائے کیا نتھی پلید کی ہاتھ کے لئے یہ کچھ کر بڑا دے کہ لڑکیوں کے جن سیٹ بہترین تیار ہو جائیں کہ انھیں پہننے کے لئے سرخ سفید صندلیں پر ہونے چاہئیں واقعی اس دن میں نے اپنے بیٹوں پر غور کیا۔ جو لڑکے ہوئے بہت عمدہ ہی تھے ہال،

کچھ عجیب سی لگتی ہیں اس دن تو۔!! سوچتے سوچتے میرا دماغ۔ معطل ہوا جا رہا تھا۔ سب ہی ان بڑی بوڑھیوں کی کیا دوڑیں پر بھی لعنت بھیجے، جنہی جو کہا کرتی تھیں سترہ جا گو کہیں نہ کہیں من پسند لڑکی مل ہی جائے گی اور یہاں تو ستر سے دس برس اوپر ہی ہو چکے ہوں گے ہنوز محروم و ناکام ہوں۔ اب پرسوں بلقیس آنٹی صاحب کے یہاں شادی ہے دو لڑکیوں کی ایک ساتھ کریں گے خیر یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے تقریبات میں تو لڑکیاں خوب دیکھنے کو ملتی ہیں اب کی میں نے دفتر کے ابو سے کہہ دیا میں اپنی گاڑی سے جاؤں گی تم رکشے سے دفتر چلے جانا۔ اچھا اچھا بیگم رکشے سے ہی چلا جاؤں گا۔ تمہارا مقصد تو روز اول ہی سے سمجھتا آرہا ہوں۔ آج خلاف معمول وہ بڑی شگفتہ مزاجی سے بولے لڑکیاں بھی آنے والی ہیں تمہارا ہاتھ بٹانے کی۔

تم نے بہت اچھی خبر سنائی اللہ سب کو جیتا رکھے کچھ دن بھرے بھرے گذریں گے۔ لیکن دل میں سوچا مجھے ذرا اب جلدی کرنی چاہیئے ورنہ یہ ڈاکٹر بچیاں اپنی اپنی رائے پیش کریں گی اور میں۔ بمن مانی کرنا چاہ رہی تھی۔ خیر جی پرسوں آ ہی گیا خوب بن ٹھن کر اپنی امپیریل پر پہنچی بڑی دھوم دھام تھی مگر میری تمام تر توجہ ان لڑکیوں تک ہی محدود رہی جو بنے سے ہال میں ایک طرف بیٹھی خوش گپیوں میں مشغول تھیں کبھی کبھی نظر اٹھا کر میری جانب دیکھ لیتیں پھر سرگوشیاں ہونے لگتیں ان میں ایک لڑکی بہت پسند آئی سرخ سفید۔ دلکش نقوش۔ اور جب پتہ چلا کہ سعادت نواب کی بیٹی ہے تو جیسے اس کا حسن میری نظروں تک اور بھی نکھر آیا یوں لگا جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔! اب تو الجھن کہ پتہ نہیں اس کی منگنی تو نہیں ہوئی۔ قربان جاؤں اس خدا کے کہ جس نے جلد ہی یہ مشکل حل کر دیا معلوم نہیں آہستہ آہستہ کیا باتیں ہو رہی تھیں ان میں سے ایک ہنس کر بولی خالہ باتیں جب ہی بھی ہوگی جب پتہ چلے گا [illegible] ضرور۔ کہ وہ غریب [illegible] بیاہ [illegible] ایسا [illegible] وقت [illegible] بیگمات [illegible] جیسے [illegible] انہوں نے [illegible] والی [illegible] بیگم [illegible] سے پیش آئیں [illegible] کی [illegible] اپنے موضوع پر۔۔۔ نواب بیگم [illegible] سے میرا

منہ تک رہی تھیں۔ کوئی جلدی نہیں سب سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔

سوچنے سمجھنے کی کوئی بات نہیں بہن اس کی تو شادی بچپن ہی میں طے ہو گئی تھی اب تو ماشاء اللہ ننھا منا گود میں ہے۔۔۔ ایں۔۔۔ اچھا اچھا اللہ زندہ و خوش رکھے ارے گھبراہٹ کے [illegible] بیگم مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ لڑکی منہ پھیر کر جو بھاگی تو پلٹ کر شکل بھی نہ دکھائی البتہ پچھلے کمرے سے مسلسل قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں معلوم ہوتا ہے اس دن لڑکیوں نے مجھے صرف احمق بنانے کے لئے یہ ناٹک رچایا تھا! میں بھی کیسی بیوقوف ہوں جہاں بھی کسی اچھی لڑکی پر نگاہ گئی اور پھسلی۔!! دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستی اور بظاہر خوش اخلاقی سے سلام دعا کے بعد گھر واپس آ گئی یہ تو صرف میری ہمت تھی جو آج بھی قائم ہے جا متعدد بار خفت ہوئی کبھی کبھی ذلت کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مگر ہر ناکامی کے بعد ایک نیا جذبہ۔ نیا عزم اپنے دل میں محسوس کرتی۔ آج بھی ہماری نئی پڑوسن بتا رہی تھیں جسٹس فضل الرحمٰن کی صاحبزادی صوفیہ بڑی اچھی لڑکی ہے ڈاکٹری پڑھ رہی ہے [illegible]۔ خاندان ہے ان کا حیثیت کا کیا کہنا۔ جسٹس وسٹس تو خاک سمجھ میں نہ آیا لیکن تعلقداری کا سن کر ضرور منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ ہی سچ میں نے تیاری کر دی اتفاق سے آج جیسی تھی لہٰذا گاڑی نکلوائی حتی الامکان بناؤ سنگھار کیا جلدی جلدی دو چوٹیاں [illegible] اوڑھ کر قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ برا ہو موئے دانتوں کا سامنے ہی کے چار اپنی عمر تمام کر کے رخصت ہو چکے تھے کئی مرتبہ ڈاکٹر کے ابو سے کہا میرے دانت لگوا دیں مگر وہ کہاں سے کہ سنتے تھے میرا دانتوں کی کمی سے کچھ دکھ سا ہوا۔۔۔ پھر اس سے کیا فرق پڑے گا! یہ سوچ برقع اوڑھا اور بیٹھ گئی امپیریل پر چند ہی منٹوں میں پہنچ گئی جسٹس صاحب کے بنگلے پر۔۔۔ ایک خادمہ نے میری رہنمائی کی اور میں ایک بڑے سے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں [illegible] سب کچھ [illegible] ہر چیز کتنی مہنگی و خوش سلیقگی سے سجائی [illegible] میرا [illegible] تمنا اور [illegible] ہے۔!! تھوڑی دیر بعد پردہ سرکا اور ایک [illegible] لڑکی آداب کر کے میرے قریب بیٹھ گئی۔ [illegible] جسٹس صاحب کی بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہوں۔ [illegible] ہیں ذرا دیر سے آئیں گی [illegible]

کہہ دوں گی۔ وہ غور سے مجھے دیکھے جا رہی تھی شاید میرا جھکا جھکا چہرہ اسے پسند آیا تھا کیونکہ ایک بار وہ مسکرائی تھی رونما دیکھ کر کام کو کچھ نہیں۔ دراصل میں ان سے بیٹی مانگنے آئی تھی اپنے وشو کے لئے میں نے شائستگی سے جو اظہار مدعا کر ہی دیا۔ بیٹی مانگنے؟ کیا بیٹی مانگنے کی چیز بھی ہوتی ہے۔ ہوتی کیوں نہیں ہیں بیٹی۔ لڑکی تو پرایا دھن ہوتی ہے۔ اچھا تو آپ کے وشو میاں کرتے کیا ہیں تاکہ میں انہیں پہلے ہی بتا دوں۔ وہ۔ وہ بارھواں پاس کیا تھا مدت ہوئی اب لیڈر ہے۔

اشر پاس اور لیڈر؟ کتنی انکم ہے اس نے حیرانگی سے پھر پوچھا

انکم وانکم تو میں جانتی نہیں البتہ دو ڈھائی ہزار ہر ماہ لے آتا ہے۔

ہونہہ بارھواں پاس ——— بڑی بی نیتا گیری بھی کوئی پیشہ ہے۔ یہ تو بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ یہاں تشریف لانے سے پہلے آپ کو سوچنا بھی چاہئے تھا۔ کیا آپ نے یہ مثل سنی ہے "منہ لو مسور کی دال" خبردار جو آئندہ اس کوٹھی میں آپ آئیں۔

اے بیٹی۔ کیا تم ہی صوفیہ ہو۔

جی ہاں میں صوفیہ ہی ہوں۔ جائیے تشریف لے جائیے۔

خیریت ہوئی کہ تنہا آئی تھی، ورنہ لڑکی نے ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ غضب خدا کا لڑکی کیا تھی فتنہ تھی۔ بے غیرت اور بے شرم بھی تھی۔ مگر کرتی بھی کیا۔ اپنا سا منہ لئے چپکے سے اٹھی اور چلی آئی۔ لڑکیاں ایک ایک کرکے تینوں آگئیں خوب چہل پہل ہے دن بھر ہنگامہ خیزی میں وقت گذر جاتا اگر پتہ ہی نہ چلتا اور گھوم پھر کر گاڑی اپنے مرکز پر رک جاتی۔ موضوع گفتگو وہی وشو میاں کی شادی۔ سب اپنی جمع ہیں آج تو وشو کے ابو بھی باتوں میں حصہ لے رہے ہیں میں بھی خاموش رہی جو آئی تو صوفیہ صوفیہ کی بھنک پڑی کانوں میں۔!!! ابا صوفیہ بڑی اچھی لڑکی ہے عرشی نے کہا۔ شوبی تم بتاؤ ——— شادی تمہاری کیا رائے ہے۔ وشو کے ابو تو آج تک رہا تھا جیسے اپنی بہو کے دوست ہوں بہت اچھی۔ بہت ٹھیک باجی کی کلاس فیلو بھی تو رہ چکی ہیں دونوں کے جیسے ہیں۔ اب میری باری ہے۔ [illegible] گھر والے بہت اچھا پایا ہے۔ پہچانا ہے میرے تعلقات کی [illegible] ہیں نفس الرحمن صاحب جسٹس ہیں۔ جن [illegible] میں نے کہا او ہو تو میں ایسی لڑکی کو [illegible] کیا ہے [illegible] ہے۔

لڑکیوں نے حیرت سے [illegible] معلوم ہوا تو میں نے پوچھی تھی سب سنا دوں گی۔

پھر تو خوب قہقہہ لگا ——— میں حیران تھی ان موئی لڑکیوں کی ہنسی پر۔ یہ رونے کی بات تھی یا ہنسی کی۔ ماں کی توہین پہ قہقہے۔ یہ کیسا زمانہ آگیا ہے لڑکیوں نے کہا امی آپ نے بھی غضب کر دیا۔ بھیا کو رضیہ سے لیڈر بنا دیا اور گیارھواں پاس کہہ دیا ——— ارے امی بھائی جان نے تو بی اے۔ ایم اے کر لیا ہے۔ پھر ریسرچ اسکالر ہوئے۔ فوراً ہی لکچرر بنے اور پھر ریڈر ہو گئے۔ ریڈر تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے امی۔

میں لڑکیوں کی باتیں سن کر جھلا گئی۔ میں نے کہا میں کیا جانوں ریڈر لیڈر کیا ہوتا ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا۔

"لاحول ولا قوۃ" وشو کے ابو قہقہہ لگا کر بولے۔ اس زمانے میں جاہل ہونا بھی بس ایک لعنت ہے۔

میں نے غصے ہو کر کہا تو پھر کیوں مجھ جاہل کو بیاہ لائے تھے۔ کوئی گریجویٹ کرتی لے آئے ہوتے۔

لڑکیوں نے قہقہے لگائے۔ بہرحال وشو میاں کی شادی ہو گئی اور صوفیہ ان کی دلہن بن کر آئی تو سب سے پہلے اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ کہنے لگی "امی جان اس روز کی باتوں کو دل سے نکال دیجئے گا جس روز آپ میرے گھر گئی تھیں میں کیا جانتی تھی کہ آپ عرشی بہن وغیرہ کی والدہ ہیں۔ اب کیا کرتی میں نے بھی اپنا دل صاف کر لیا۔ غلطی اپنی ہی محسوس ہوئی جہیز میں جج صاحب نے سلامی میں اسکوٹر (اسکوٹر) گھڑی، ٹیپ ریکارڈ (ٹیپ ریکارڈر) اور نہ جانے کیا کیا دیا۔ ایک ننھی سی کتاب بھی دی۔ میں سمجھی کوئی وظیفے کی کتاب ہو گی۔ میں نے بہو کے آجانے پر خاص طور سے وہ کتاب دیکھنے کو مانگی حالانکہ میں بھی "اگر اس میں اچھے وظیفے ہوں تو پڑھا کروں۔ لڑکیوں نے سنا تو میرا خوب مذاق اڑایا۔ بولیں یہ بینک کی کتاب ہے۔ جج صاحب نے پچاس ہزار روپیہ بینک میں صوفیہ بھابی کے نام جمع کر دیئے ہیں" تاکہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ اور بھیا اپنی پسند سے خرید لیں جس پر وشو کے ابو نے کہا سنا تم نے کیسی کیسی نئی نئی باتیں ہونے لگی ہیں۔ زیور، برتن اور جوڑے وغیرہ کے بجائے بینک کی کتاب ملی ہے۔

وشو کے ابو یہ سن کر بولے لاحول ولا قوۃ۔ تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ یہ تو اچھا طریقہ ہے جس چیز کی ضرورت ہو خرید لی جائے۔ یہ کیا کہ ڈھیر ساری چیزیں دے دی جائیں جو لڑکے والوں کے یہاں موجود ہوں۔ میں سوچنے لگی بات تو ٹھیک ہی کہی وشو کے ابا نے۔

ریاست اودھ

ریاست اودھ کے حکمراں نواب آصف الدولہ اپنی سخاوت و دریا دلی کے باعث سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ ایک بار ایک مفلس زدہ شخص دربار میں حاضر ہوا۔ وہ شکل و صورت سے کسی اعلیٰ خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنا حال زار بیان کرتے ہوئے ادب سے کہا۔ یہ بات سرکار کی شان کے خلاف ہوگی کہ میں اپنا حسب و نسب بیان کروں۔ ویسے بھی ابر کرم کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کھیتوں میں برس رہا ہے یا پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ میں ایک ضرورت مند ہوں میری تین بیٹیاں ہیں جن کی شادی کی عمر تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ آصف الدولہ اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور ایک لاکھ روپیہ کا گراں قدر انعام دیا۔ ایسے موقع پر خوشامدی اور نکمے درباریوں کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ ایک لاکھ کا ذکر سن کر وہ بری طرح جل بھن اٹھے۔ آخر افسر خزانہ اور دوسرے صاحبوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ خزانہ سے مطلوبہ رقم نکال کر اس راستے میں ڈھیر کر دی جدھر سے نواب کا گزر ہوتا تھا۔ کسی نے اس تماشے کا سبب پوچھا تو کہا گیا کہ نواب صاحب نے اپنی آنکھ سے ایک لاکھ روپئے نہیں دیکھے ہیں اگر وہ ایک بار بھی چاندی کے سکوں کے اس سوا گز چوڑے، سوا گز لمبے اور سوا گز اونچے ڈھیر کو دیکھ لیتے تو اتنی بیدردی کے ساتھ شاہی خزانہ کو نہ لٹاتے۔ ہم آج سرکار کو یہی دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہونٹوں کی ایک جنبش سے جو ڈھیر لوگوں کو بخش دیتے ہیں۔ اس کی عملی شکل کیا ہوتی ہے۔ تمام حاسدوں نے منصوبے کی بہت تعریف کی۔ اور عجیب و غریب تماشے کا انجام دیکھنے کے لئے رک گئے۔ آخر دربار ختم ہوا تو نواب آصف الدولہ ہال سے نکل کر دیوان خاص کی طرف بڑھے۔ اچانک ان کی نظر روپیوں کے ڈھیر پر پڑی۔ چونک کر رکے اور افسر خزانہ سے پوچھنے لگے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ جواب میں اس نے بتایا کہ آج سرکار نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ عطا کئے تھے۔ یہ وہی رقم ہے جو خزانے سے نکالی جا رہی ہے۔ نواب صاحب چند لمحوں تک چاندی کے اس انبار کو دیکھتے رہے۔ اور پھر ندامت آمیز لہجہ میں کہنے لگے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ایک لاکھ روپیہ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ مگر آج اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔ خیر ابھی وقت ہے اس شخص کو مزید ایک لاکھ دے دو۔ کیونکہ اس کی ضرورت زیادہ ہے اور روپیہ کا ڈھیر کم۔ یہ کہہ کر نواب آصف الدولہ اپنے کمرہ میں داخل ہوگئے۔

قصوروار کون

از ۔ ح ۔ ح

ایک زمانہ تھا جب بقعہ، بہار درویش، داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ اور توبۃ النصوح قسم کی کتابیں گھر والوں میں اس طرح پڑھی جاتی تھیں کہ ایک بی بی پڑھ رہی ہیں، باقی سب سن رہی ہیں۔ کوئی کتربیونت میں مصروف تو کوئی سلائی کرنے میں، کوئی کروشیا میں منہمک تو کوئی پان لگانے اور کھانے میں، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب عورت دوٹوک بات کرتی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے جو عورتوں کے خلاف ہیں ایک دن کہا، کیا عورتوں میں منافق پیدا نہیں ہوتیں۔ کیا تمام چور، ٹھگ، ظالم اور بدکردار مرد ہی ہوتے ہیں۔ میں نے جواب دیا ہوتی ہیں۔ لیکن عورت ابنائے آدم کی ماں ہے، اس کا نام ادب سے لو۔ پھر میں نے اپنے ایک اور دوست کے قول کا حوالہ دیا جو ایک شام روٹھا ہوا ریسٹوران میں بیٹھا تھا۔ بیوی سے ناخوش اور اپنی جان سے بیزار۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا۔ میں عورت کو برا کہہ ہی نہیں سکتا۔ کوشش کے باوجود نہیں کہہ سکتا۔ پوچھا کیوں نہیں کہہ سکتے؟ کہنے لگا، اس وقت میری آنکھوں کے آگے اپنی فرشتہ سیرت ماں کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔

بیبیاں کہیں گی یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ ہاں ہر مرد کی کمزوری ہوتی ہے وہ بیوی میں بھی ماں کا روپ تلاش کرتا ہے۔ کھانے پر کہتا ہے۔ میری ماں کریلے اس طرح پکاتی تھی۔ یہ تم نے کیا کر کے رکھا ہے میری ماں اونچی آواز سے نہیں بولتی تھی۔ تمہاری آواز سارے محلے میں گونجتی ہے میری ماں مہمانوں کو چائے پانی کے لئے ضرور پوچھتی تھی۔ تم نے میرے دوست کو باہر سے ہی چلتا کر دیا۔ مرد ہر دکھ میں مہمانوں کو چائے پانی لئے ضرور پوچھتی تھی۔ تم نے میرے دوست کو باہر سے ہی چلتا کر دیا ہر دکھ میں اذیت کے لمحے میں ماں کو ہی آواز دیتا ہے۔ ہائے میری ماں۔

خیر بات کچھ اور ہو رہی تھی۔ مردوں نے ہر زمانے میں عورتوں پر ستم توڑے ہیں۔ اہل دانش اور عورتوں کی رائے میں یہ مردوں کا معاشرہ ہے، ان میں بالادستی مردوں کی اجارہ داری ہے۔ لیکن انصاف شرط ہے، وہ بھی تو عورتیں تھیں، جن کی گود میں سید احمد، نذیر احمد، حالی، شبلی اور راشد الخیری پل کر بڑے ہوئے۔ بڑے بڑے مرد بڑے ماحول کی پیداوار ہیں۔ اور اس سے پہلے بھی کہ ان پڑھ بد مزاج، بداخلاق، بدکار، کینہ پرور پھوہڑ اور بدتمیز ماؤں کی گود میں آنکھ کھولتے رہے ہیں۔ جو ان کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا دے کر گھر سے باہر دھکا دے کر کہتی ہے باہر نکلو میری جان مت کھاؤ۔ پھر بیٹے جو ماں کی توجہ، ان کی شفقت اور والدین کی تربیت سے محروم ہوتے ہیں۔ بڑے ہو کر بدراہ اور بدقماش بن جاتے ہیں۔ اور بچپن کی محرومیوں کا انتقام ماں سے، بہن سے، بیوی سے، بلکہ ہر عورت سے لیتے ہیں۔ کیونکہ کسی عورت کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا

اور یہ جو آج کل دوہرے معیار کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ تو یہ فساد عورتوں نے زیادہ بویا ہے۔ بھائی کے لئے رشتہ تلاش کریں گی تو غیر لڑکیوں میں سو سو کیڑے ڈالیں گی، اپنا لنگور صفت بھائی انہیں پری پیکر نظر آئے گا۔ پھر بہن کے رشتے کے لئے ایسی عورتیں بھلا کیوں نہ پریشان ہوں۔ یہی صورت مہر کی رقم، جہیز اور شادی کی رسوم میں دیکھی جاتی ہیں۔ اور تو اور اپنی بیٹی اسکول میں ملازمت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن دوسرے کی بیٹی دفتر میں کام کرے تو یہ گھات میں لگی رہتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی بات ملے۔ کوئی اسکینڈل ہاتھ لگے تو روکھی بے رنگ زندگی میں کچھ رنگ آئے۔ تاریخ شاہد ہے اور مشاہدے میں بھی آیا ہے کہ عورتوں سے جتنی دشمنی عورتوں نے کی ہے مردوں نے نہیں کی۔ اس بات کی تردید یہی کہنے سے ہو سکتی ہے کہ یہ دشمنی عورتوں نے مردوں کی شہ پر کی ہے ان کے بہکانے میں آگئیں۔

مرد محض اس لئے بلند یا پست نہیں کہ مرد ہے اور عورت محض اس بنا پر مظلوم یا مقدس نہیں کہ عورت ہے۔ ایسی خودسر، خود پسند، طناز، عشوہ طراز، چالاک اور سفاک عورتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ جو عورت و مرد سب کے لئے یکساں ظالم ہوتی ہیں۔ بلکہ ظالم مرد ان کے آگے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ استحصال کے معاشرے میں یہی ہوتا ہے کہ بالادست طبقے اور گروہ کے افراد باقی سب کو اپنا محکوم اور دست نگر بنا لیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسے معاشرے میں عورت دہری محکومی کا شکار ہوتی ہے۔ کھیت میں مزدوری کرنے کے بعد وہ گھر میں اپنے مرد کی جوتیاں سیدھی کرتی ہے اور سر پہ آئیں تو کھاتی بھی ہے۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کے قارئین کی طرف سے ایک خبر مسرت شائع ہو سکتی ہے۔ یہ خبر مسرت ولادت، منگنی، شادی یا امتحان سے متعلق ہو سکتی ہے مگر الفاظ میں صاف صاف لکھا ہوا ہو اور یہ اس پتے کے ڈاک کے ذریعہ خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائے کہ ہر تاریخ تک وصول ہو جائے۔ دیر سے وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

- [illegible] (میرے چھوٹے چچا آدم صاحب [illegible] صاحب کو اللہ پاک نے ۲۳ اپریل [illegible] بروز [illegible] بوقت [illegible] ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام [illegible] قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ عمر دراز عطا کرے اور نیک خاندان بنائے۔

- امیرہ [illegible] (سکندر آباد) میرے عزیز محمد رشید اور [illegible] کو اللہ پاک نے [illegible] اپریل [illegible] بروز [illegible] ایک فرزند عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے (بچے کا نام [illegible])

- [illegible] ہاشمی ([illegible]) میری سہیلی صابرہ جاوید کو اللہ پاک نے پہلی بار [illegible] کو ایک فرزند عطا فرمایا (نام [illegible]) اللہ سے دعا ہے کہ [illegible] عمر خضر پائے اور فخر خاندان بنے۔

- اے آر [illegible] (میرے بھائی محمد [illegible] اور بھابی [illegible] کو اللہ پاک نے [illegible] بروز [illegible] بوقت [illegible] ایک دختر عطا فرمائی۔ نام [illegible] رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر دراز اور صاحب نصیب کرے۔

- [illegible] اللہ پاک نے [illegible] کو ایک فرزند عطا [illegible] اللہ پاک سے [illegible] اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

- مسز [illegible] (میرے [illegible] اور بھابی [illegible] بیگم کو اللہ پاک نے [illegible]

پانچ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام عائشہ صدیقہ قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور صاحب نصیب ہو۔

پیغامات نشاط

- میری خالہ زاد بہن حمیدہ [illegible] اور چودھری اقبال احمد صاحب (سلیمان پور) کے فرزند چودھری ظفر احمد [illegible] کی شادی دختر جناب حشمت علی صاحب [illegible] بارہ بجے کے ہمراہ [illegible] بعد نکاح خیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیمہ [illegible])

- جناب [illegible] (چیئرمین [illegible]) کے فرزند دلبند عزیزی [illegible] کی شادی [illegible] دختر جناب [illegible] ایل۔ این [illegible] صاحب [illegible] کے ہمراہ [illegible] جون [illegible] کی صبح [illegible] بمقام [illegible] حیدرآباد میں بحسن و خوبی انجام پائی دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ (نسیم [illegible]۔ [illegible])

- زبیدہ بتول، صغریٰ [illegible]، [illegible] (آمبور) ہمارے بھائی حافظ عبدالحئی (فرزند [illegible] عبدالصمد صاحب) کی شادی [illegible] کوثر (بنت [illegible] عبدالخالق [illegible]) کے ہمراہ ۲۰ مارچ [illegible] بروز [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بھابی بھیا دونوں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

- نجم النساء پیرزادہ [illegible] میری بھابی کوثر پروین کی شادی نظام الدین (فرزند جناب شیخ شمس الدین) کے ہمراہ [illegible] مئی [illegible] بروز [illegible] بمقام [illegible] بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

- [illegible] میری [illegible] کی شادی [illegible] (دختر جناب عبدالرزاق) کی شادی [illegible] (فرزند جناب [illegible]) آمبوری کے ہمراہ ۲۴ مئی [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و خرم رکھے۔

- [illegible] عبدالمجید (میرے [illegible]) کی شادی [illegible] کے ساتھ [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔

- [illegible] (میرے بھائی [illegible]) کی شادی [illegible] کے ہمراہ [illegible] بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں جوڑوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ [illegible]

اور [illegible] صاحب کو مبارک باد دیتی ہوں۔

• نسرین صادق (رحیمہ) ہمیرے .. بھیا ڈاکٹر شمس الرحمٰن ایم بی۔ بی ایس۔ ایم۔ ڈی کی شادی [illegible] نسرین بنت اے اے [illegible] اے حمید صاحب کانٹی [illegible] (الدور) کے ہمراہ [illegible] کو بروز دوشنبہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• مجیبہ خانم، ہبلی [illegible] کرناٹک۔ میرے بھائی فیاض احمد خاں کی سلمہٗ کا عقد سعیدہ زبیدہ خانم [illegible] (افرومن۔ باپ کا نام [illegible]) کا ۲۳ مئی ۲۰۰۳ء بروز [illegible] بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ پاک مبارک کرے۔ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خوش رہیں۔

• محمد سلیمان صاحب (رتھی۔ ہزاری باغ) کے فرزند شاہنواز جمیل کی شادی نامید [illegible] سے اور [illegible] حسین صاحب مرحوم) [illegible] کی شادی بانو [illegible] پسر ڈاکٹر طاہر حسین صاحب پالیوی مرحوم) کے ہمراہ ۸ مئی ۲۰۰۳ء کو بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اشرف ہنوی)

• عبدالرزاق عبدالقادر محمد نبین۔ ضلع نقارہ) کی صاحبزادی امینہ کی شادی عبدالصمد (فرزند [illegible] اسحاق صاحب بہار [illegible]) کے ہمراہ ۵ مئی ۲۰۰۳ء کی شام کو بمقام بہار [illegible] بخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم اشرف ہنوی)

• الحاج ایم عبدالحمید صاحب کانٹی پلانٹر (الدور) کی صاحبزادی وسیمہ نسرین سلیمانی۔ اے کی شادی ہمراہ ڈاکٹر انیس الرحمٰن سلمہ ایم بی۔ بی ایس۔ ایم ڈی، میڈیکل افسر (مجید اوتی) ابن الحاج ایم خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم (میسور)۔ ۳ مئی ۲۰۰۳ء بوقت ۱۱ بجے دن بمقام [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اشرف ہنوی)

انتقال پر ملال

[illegible] اور [illegible] پرنٹنگ پریس (حیدرآباد) کے مالک [illegible] صاحب ۱۸ مئی ۲۰۰۳ء کو بعد شام کے وقت حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے [illegible] بڑی ترقی کی تھی [illegible] بہت [illegible] انسان بھی تھے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم اشرف ہنوی)

• عظیمہ ساز۔ مدوش واپس، دختر [illegible] لطیف (آمبور) افسوس کہ ہمارے والد نانا محمد عبدالرحمٰن صاحب ۱۲ اپریل ۲۰۰۳ء روز [illegible] وقت ساڑھے آٹھ بجے شب رحلت فرماگئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کی روح کو سکون عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔

امین سلونوی

"میری ادبی زندگی" حصہ اول اور اردو کے مشہور جرنلسٹ شاعر اور مزاح نگار جناب امین سلونوی ۲۰ جون ۲۰۰۳ء کی شام کو اپنے مکان واقع تکیہ گوپا میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میں نے ۱۹۲۵ء میں جب اپنی موجودہ زندگی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے میری ملاقات امین سلونوی مرحوم ہی سے ہوئی جن کا وطن سلون میرے وطن [illegible] سے قریب، ایک ہی ضلع میں ہے۔ کچھ عرصہ قبل امین صاحب کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ میڈیکل کالج میں آپریشن ہوا تھا۔ اسی درمیان بیگم امین سلونوی کا انتقال ہو گیا۔ اور احتیاطاً امین صاحب کے علم میں لائے بغیر انہیں دفن کر دیا گیا۔ کچھ روز بعد اسپتال سے آئے جب امین صاحب کو اس حادثہ کا علم ہوا تو ان کے رنج و الم کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ زندگی یکسر بے کیف ہو گئی، دنیا سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور آخرکار وہ رحلت فرما گئے۔ میری ہی طرح امین صاحب بھی حد درجہ جفاکش اور محنتی تھے۔ ہم دونوں ہی نے خدا کی مہربانی سے اپنی زندگیوں کو عروج دینے کی کوشش کی تھی۔ امین صاحب کے چار بیٹے ہیں، ایک پہلی بیوی سے اور بقیہ تین دوسری بیوی سے ہیں۔ پہلی بیوی کے بیٹے بھی جرنلسٹ تھے، [illegible] اخبار سے منسلک ہو کر ریٹائر ہو گئے۔ وہ باپ سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ دوسری بیوی سے جو تین بیٹے ہوئے ان میں سے دو غیر ممالک میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک صاحبزادے حسین امین جو امین صاحب کے ساتھ رہتے ہیں۔ قابل جرنلسٹ اور ادیب ہیں۔ قومی آواز سے وہ کر انہوں نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔

امین صاحب حقیقی پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ امین آباد پارک کی [illegible] کے ہمیشہ روح رواں رہے۔ [illegible] سے [illegible] محفل میلاد کے [illegible] تھے جس کے [illegible] سے کام لے سکتے تھے [illegible] قریب [illegible] ان کے [illegible]

مضامین کا مجموعہ دنیا میں جہنم میں نے نسیم بکڈپو سے شائع کیا تھا امین صاحب ہی نے شوکت تھانوی سے مجھے متعارف کرایا تھا جو میرے ادارے سے کافی عرصہ تک منسلک رہے تھے اور میرے بہترین ادبی دوست تھے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں اخبار سرپنچ کی اشاعت کے لئے جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس میں ہم تینوں یعنی میں، امین صاحب اور شوکت صاحب شریک تھے۔ امین صاحب عرصہ تک سرپنچ کے لئے بھی لکھتے رہے تھے۔ مرحوم نے ا۔ن۔س کے نام سے ایک اردو خبروں کی فراہمی کا ادارہ قائم کیا تھا۔ جو اپنی نوعیت کا واحد ادارہ تھا۔ ہم تینوں ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھے جاتے تھے اور لوگ ہمیں باپ، بیٹا اور روح القدس کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ شوکت صاحب پہلے ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ اب امین صاحب بھی مجھے تنہا چھوڑ کر کنارہ کش ہو گئے۔ اللہ پاک ان کی روح کو بخشے انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ — نسیم انہونوی

قصہ ایک ٹیچر صاحب کا

ایک ٹیچر صاحب بہت ٹالو آدمی تھے۔ کبھی وقت سے کلاس میں نہ آتے۔ جب کلاس میں داخل ہوتے تو لڑکوں پر رعب جمانے کے لئے میز پر زور سے چھڑی مارتے اور کہتے خاموش یہ کلاس ہے کہ منڈی شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ میں اسی لئے دیر میں آتا ہوں کہ دیکھوں تم لوگ میری عدم موجودگی میں کیا کرتے ہو۔

گھر سے پڑھ کر کبھی نہ آتے اور ساتھ کتاب بھی نہ لاتے قریب بیٹھے کسی لڑکے سے کتاب مانگ کر پڑھانا شروع کر دیتے۔ پڑھاتے کم سوالات زیادہ کرتے۔ ایک دن انھوں نے تھوڑا سا پڑھانے کے بعد لڑکوں سے کہا مثال دے کر اچھائی، برائی کی وضاحت کرو۔

سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ سب لڑکے خاموش رہے ایک شریر لڑکا کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا۔

ٹیچر نے کہا ہاں شاباش بتاؤ۔ لڑکے نے کہا اگر میں اپنی دوست لڑکی کے ساتھ پکچر دیکھنے جاؤں تو یہ اچھائی ہے اور اگر لڑکی اپنے دوست لڑکے کے ساتھ پکچر دیکھنے جائے تو برائی ہے۔

یہ جواب سن کر پوری کلاس میں ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا اور ٹیچر صاحب گھبرا گئے اور کتاب رکھ کے [illegible]

[illegible]

[illegible] کے لئے [illegible] رسالہ

حریم [illegible] کی [illegible] اشاعت [illegible] ہونے والا
اردو کا سب سے [illegible] رسالہ ہے [illegible]
[illegible] کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

[illegible] میں معاشرتی عورت کے مسائل [illegible] صاحب کے قلم سے [illegible]
[illegible] سخن [illegible] عمدہ اشعار، بزم حریم [illegible]
ایک مسلسل قسط وار ناول شائع ہوتا ہے۔ جو آج کی سب سے [illegible]
[illegible] ہوتا ہے اس کے علاوہ جنوری میں شائع
ہونے والا سالنامہ [illegible] کے ایک نئے مکمل ناول پر مشتمل ہوتا ہے اس طرح
[illegible] حاصل ہوتی ہیں اس کے علاوہ سالنامہ میں
[illegible] آپ [illegible] خرید سکتے ہیں۔ آج ہی [illegible]
[illegible] ہو جائیں۔ وی۔ پی منگانے سے [illegible] روپیہ زائد دینا ہوں گے۔

[illegible] آمات یہ [illegible] رسالہ [illegible] رنگ سے شائع ہوتا ہے۔

- ایک مسلسل قسط وار جاسوسی ناول
- [illegible] اور [illegible] باتیں چٹکلے

[illegible] کی اشاعت [illegible] کے ساتھ ساتھ ان کی جھلکیاں وتبصرے [illegible]
[illegible] آپ [illegible] ہو جائیں گے اور اس کے [illegible]
[illegible] صرف [illegible]
[illegible]

[illegible]

"میں نے کہہ دیا تھا۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ پھر آپ کیوں [illegible]
دیجئے۔ وہ آ کے لے جائے۔!"

"میاں۔ میں بھی تو بہو کی ہوں۔ آج تک تو ایسا ہوا نہیں کہ تم نے کھانا
اور میں نے کھا لیا ہو۔ میں بڑھی آدمی ہوں۔ ایک ہی دفعہ میں قل ہو جاؤں گی
آؤ اٹھو۔!"

غرضیکہ بڑی بی نے کچھ ایسا سمجھایا کہ غضنفر کو کھاتے ہی بنی۔ اس کے
بڑی بی نے خود بھی کھانا کھایا۔!

چائے کے دوران انھوں نے غضنفر سے اس جھگڑے کی وجہ معلوم کی۔ اب
حضورن دادا کے سوا غضنفر کا بزرگ اور غم خوار دوسرا کون تھا۔ ابتدا انھوں نے
نہایت جوش اور غصے کے عالم میں ان سے ساری باتیں کہہ دیں۔!

اور ادھر شہابی کی گریہ و زاری سے مجبور ہو کر ڈیڈی غضنفر سے اجازت لینے آیا
تھا کہ اگر ان کی مرضی ہو تو وہ چلمن کو ممی کے پاس لے جائے۔ لیکن انھیں زور زور سے
گفتگو کرتے دیکھ کر وہ کمرے میں نہیں گیا بلکہ دروازے کی اوٹ ہی میں کھڑا ہو
اور انتظار کرنے لگا۔ حضورن دادی کمرے سے نکلیں تو وہ اندر جائے یا ان سے
کہے کہ وہ درخواست کرے کہ وہ ڈیڈی سے شہابی کی سفارش کر دیں۔ کم از کم شہابی
پر سے تو یہ ظالمانہ پابندی اٹھا لیں۔ لیکن وہ کھڑا رہا سنتا رہا۔ اور دادی کمرے سے
نہ نکلیں۔

دفعتاً ادھر سے ظفر گزرے اور اشارے سے تا ٹک کے یہاں کھڑے ہونے
کا سبب پوچھا۔!

اور تب [illegible] جلدی جلدی [illegible]

الجھن

"آپ کی بیٹی چا[illegible]"

[illegible] نے بھی آنسو کان لگائے اور پوری طرح متوجہ ہو گئے!

[illegible] لیکن ہمارے ضبط [illegible] کہہ رہی تھیں!

[illegible] تسلیم نہ کرو۔ یہ اور بات ہے لیکن میں تو یہی کہوں گی کر

[illegible] ہے۔ تم نے شروع ہی سے اس بات پر راز داری کے ڈھکے

[illegible] بھلا کون سا گناہ تھا۔ کیا کر لیتی تمہاری دلہن۔ تب تو یہ

[illegible] اب جو تم گھر بگاڑنے اور ماں بچوں میں جدائی ڈالنے پر تلے

[illegible] عقلمندی ہے۔؟"

[illegible] مظفر کی آواز سنائی دی۔ "اس راز پر سے پردہ اس

[illegible] جب [illegible] ہو جاؤں گا۔"

[illegible] والدہ بولیں۔ "بیٹے۔ اس طرح بنے بنائے گھر کو تباہ کرنا

[illegible] ادھر دلہن کا اور ادھر بچوں کا کیا حال ہوگا۔ میرے

[illegible] کہ اللہ رکھے [illegible] تمہارا [illegible]

[illegible] مظفر نے [illegible] جواب دیا "[illegible]

[illegible] سکتا۔ آپ سمجھتی ہیں [illegible] کا خوف تھا۔

[illegible] کے سامنے رسوائی کا خوف ہے۔ [illegible]

[illegible] اس [illegible] ہوگا۔ [illegible]

[illegible] یہ سارا جھگڑا [illegible] رہے گا۔!"

"اور جب تک تم [illegible] اس بات کو برداشت کیا کرو گے کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

نسیم [illegible]

آج کے دور کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible]

جن کے [illegible] کی طرح [illegible]

جال [illegible] گئے

[illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible]

آفاق ۔ مس طلعت ۔ جناب ۔ [illegible]

زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اسی سوال کا جواب [illegible] کوشش کرنے [illegible]

چھوڑ کر ایک راہب کی زندگی بسر کرنے [illegible]

ملاقات خوبصورت [illegible] اور جس نے اسے [illegible]

سب [illegible]

ہو سکا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک [illegible] خوبصورت [illegible]

[illegible] آپ کی زندگی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے دیگر مقبول اور خوبصورت ناول

[illegible]

وسیم بالک روانی [illegible]

[illegible] نفرت کی آندھی

[illegible]

شعلہ و شبنم • عرشیہ

• گنوا دیا دامن [illegible]

• [illegible] زہرہ جبیں

• [illegible] بیدا جمیل

• سیلیا بلقیس ظفر

• بینا عنبی مسرور

• [illegible] اختر بانو

• [illegible] عذرا جمال

• بہار جاوداں زبیدہ خاتون صدیقی

• ترنم زبیدہ خاتون

• [illegible]

• بلور [illegible]

• [illegible] [illegible]

• [illegible] شرف [illegible]

کو نمائش دوں گا۔ جو خلاف عرف انداز میں ایک [illegible]
کیا سمجھتی ہیں کیا میں چپ چاپ سارا تماشا دیکھ رہا ہوں [illegible]
غصہ صرف اسی بات پر آیا تھا کہ انہوں نے جمشید اور شبانہ [illegible]
اس کا بدترین سلوک مجھ سے پچیس برسوں سے ہے۔ کیا [illegible]
آرہا ہوں۔ کبھی اس سے پہلے بھی میں نے ان پر ہاتھ اٹھایا تھا؟ [illegible]
بحث جاہل کہیں کی۔ بکواس کر رہی تھی کہ تیرے باپ کو تیری [illegible]
تھا! مجھے پکڑ لیا تھا ظفر اور نوید نے۔ ورنہ میں تو [illegible]

"جو بات راز نہیں ہے۔ اسے چھپانے کے لیے تم [illegible]
کرتے ہو۔ یہی نا؟" بوا جی بولیں۔

"اب میں خود بیزار آگیا ہوں۔ بوا جی! آپ دیکھتی ہیں کہ میری [illegible]
ناگوار اثر پڑ رہا ہے۔ امی کی مرضی پر میں ایک مدت سے [illegible]
میں نکال پھینکوں گا پھانسی کا پھندا۔ اور سکھ کی زندگی بسر کروں گا [illegible]

"اچھا کل کون ملنے آیا تھا تم سے؟"

"پرسوں! پرسوں صبح کو آئے تھے جمشید کی خالہ [illegible]
نے جواب دیا۔ "آپ سے میں نے کہا بھی تھا کہ جمشید کی ایک [illegible]
طویل عرصہ بعد بے چاری آئی تھی بہن سے ملنے کے لیے۔ بہت [illegible]
کو جمشید کی ماں کے انتقال کی بدخبری سنا دی۔ ضبط نہ کر سکی بے چاری [illegible]
روئی۔!"

"ارے چھٹے۔ چھٹے تو پھر تم نے کیا سمجھ لیا؟ [illegible]
اس کا خیال ہے۔!"

[illegible] حالات سے ملنے سے جاؤں گا۔ مگر میرا سارا پروگرام ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا
[illegible] سے میں نے وعدہ بھی کیا تھا۔ شاید اس نے میرا انتظار بھی کیا ہو۔ پتہ نہیں!
[illegible] پھر ان کی آواز جیسے ڈوبنے لگی۔ "بوا جی، وہ بڑا بد قسمت لڑکا ہے۔ ہمیشہ
[illegible] زندگی میں تلخیاں، محرومیاں اور خفگی ملی ہیں۔ جب میں مر جاؤں گا تو
[illegible] تم اس پر ٹوٹیں گے۔ کیا میں اس سے کہہ دوں کہ وہ اپنی خالہ کے ساتھ
[illegible] چلا جائے!۔"

"ٹھہرے کہاں ہیں وہ لوگ؟" بوا نے پوچھا۔ "میں جا کے ملوں گی جمشید کو
[illegible] جاؤں گی۔!۔"

وہ اداس سی ہنسی ہنس پڑے۔ "نہیں، آپ بھلا کہاں جا سکتی ہیں۔ بڑی
[illegible] ہوٹل میں مقیم ہیں وہ لوگ۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ اس شہر میں یہ
ہوٹل واقع کہاں ہے!!"

"میری مانو بیٹا۔ اب بھی حالات ہاتھ سے نہیں گئے۔" حضور ن بوا نے کہا
"[illegible] میاں یا ... میاں سے کہہ دو۔ کن حالات میں تم نے جمشید کی ماں سے نکاح
کیا تھا۔ اور جمشید تمہارا اپنا بیٹا ہے۔ اس میں ندامت کی کون سی بات ہے۔
[illegible] اعتراض کریں تو کہہ دینا کہ اپنے سے چھوٹوں کو تمام تفصیل بتانا کوئی ضروری
نہیں تھا۔ کچھ مصلحت بھی تمہاری اس میں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ... میاں
اور ... ساری باتیں سنبھال لیں گے۔!"

"مطلب یہ کہ میں سبا سے شکست قبول کر لوں۔ وہ تو یہی سمجھیں گی کہ میں
نے ان سے [illegible] سے اپنا راز اگل دیا ہے۔" غضنفر نے کہا۔ اور پھر بولے
"[illegible] اب آپ مجھ سے کچھ زیادہ مت کہئے [illegible]
[illegible]

کے لیے بھی سو نہ سکا۔!"

"میں نے اسے اپنے سینے سے لگایا ہے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ اس [illegible]
میں نے معافی مانگ لی۔ اس نے مجھے معاف کر دیا۔ مگر آپ مجھے
معاف کریں گے۔ کیا ... گستاخیاں میں نے نہیں کیں۔ ... [illegible]
نے سچ مچ بہت کم سزا مجھے دی۔ میں اس سے زیادہ کی مستحق ہے!"

"بھول جاؤ سبا۔ اب بلکہ ان باتوں کا تذکرہ مت کرو۔
میری حماقت تھی کہ میں نے شروع ہی سے تمہیں سارے معاملات [illegible]
نہیں کر دیا۔ میں نے ایک غلطی کی تھی اور پھر متواتر غلطیاں ہی کرتا چلا
گیا۔ لیکن۔ اب جو ہوا۔ وہ ہو چکا۔ آج۔ میں۔ بہت خوش ہوں۔ مجھے
ایسا لگتا ہے جیسے ایک پھانس جو مسلسل مجھے بے چین کر رہی تھی۔ آج
اس کی چبھن ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہو۔ اب ہم۔ ایک پُر مسرت زندگی
کا آغاز کریں گے ۔۔ ہے نا!۔"

سبا نے چپکے سے سر ہلایا۔
اور تب۔ غضنفر نے جذباتی انداز میں ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں
لے لیا۔ اور ان کے لب گہرے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے!!!۔

ختم شد

[illegible]

ختم معافی!

"جمشید !!"
"جی !!"
"[illegible] بیٹے۔ کیا سیما آئی ہیں ؟۔۔۔!"
"[illegible] بھی مہمان وغیرہ سب ہی لوگ تو آگئے ہیں:" وہ خوش ہو کر [illegible]
"میں انھیں لے آؤں یہاں ؟ ۔"
"میں خود ابھی باہر آتا ہوں۔ تم سیما کو یہاں بھیج دو۔"
"جی۔ بہت اچھا۔ ابھی بھیجتا ہوں۔"
دالان سے اٹھنے والا ہنسی قہقہوں کا پرمسرت شور غضنفر کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔! غیر ارادی طور پر ان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی ویسے انھیں اطمینان تھا۔ ایک انوکھی اطمینان۔ جیسے سفینہ حیات طوفانوں کے [illegible] کھانے کے بعد ساحل مراد سے آلگا تھا!!۔
پھر دفعتہً پردہ سرکا اور سیما کی جھلک دکھائی دی۔ غضنفر اٹھ کر بیٹھ گئے۔! جانے کیوں دونوں ایک دوسرے سے شرمسار ہو رہے تھے۔ مجوب سے تھے۔!
غضنفر منتظر تھے کہ وہ اندر آئیں گی مگر وہ پردے کی سلوٹوں میں گم رہیں تو وہ خود اٹھے اور دفعتہً ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔
سیما کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔!
غضنفر نے اپنے ہاتھ میں ان کے آنسو سمیٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:
"میں نے بڑی زیادتی کی۔ معاف کر دو مجھے۔ ساری رات پچھتاووں کے نشتر میری روح کو زخمی کرتے رہے اور ساری رات میں ایک لمحہ

بیٹھتا ہے۔ بس"
"تو تم نہ تو سیما بٹیا کو لاؤ گے نہ جمشید کو اس کی خالہ سے ملنے [illegible]" بوا نے پوچھا۔
"سیما جائیں جہنم میں۔ اور جمشید کا اپنی خالہ سے ملنا بھی کچھ ایسا اہم [illegible] ضروری نہیں ہے۔ اب آپ جائیے اور میرے لیے ایک پیالہ گرم کافی [illegible] دیجئے۔ ساری رات میں جاگا ہوں۔ اب تھوڑی دیر میں سوؤں گا۔!"
بوا جی تھک ہار کر اٹھنے لگیں اور پھر بولیں: "شہابی بٹیا کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔!"
"میں اسے سمجھا دوں گا۔ بوا اماں۔ آپ فکر مت کیجئے۔!" وہ [illegible] انداز میں ہنسے تھے!!۔
"اسے ماں سے ملنے نہیں بھیجو گے ؟"
"ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔"
بوا جی آنسو پونچھتی اور بڑبڑاتی باہر نکلیں۔ اور ظفر اور نوید تیزی سے چال کر دالان میں آگئے۔! بوا شکست خوردہ سی باورچی خانے میں چلی گئیں۔
"سنا آپ نے چچا جان۔!" نوید بولا۔ "ڈیڈی نے یہ بات ہم سب سے چھپائی۔ اب کیا کرنا چاہیے۔؟"
"بڑے بھیا ازل کے ضدی ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ وہ ہرگز ہرگز اپنے فیصلے سے نہیں ہٹیں گے۔!"
"تو پھر۔!" بے چینی سے نوید نے پوچھا۔
"سنو نوید ! ابھی تم اس بات کا چرچا مت کرو۔" ظفر نے سمجھایا۔ "[illegible] جانتا ہوں بھائی کے گھر۔ ان سے میں سارے واقعات [illegible]

[illegible] اس سارے ے و
[illegible] ختم کر دوں گا۔"
"مجھے سخت حیرت ہے۔ میں نے بھی جمیا کو واقعی ڈیڈی کے دوست کا بیٹا سمجھا
تھا مگر مجھے ان سے بے حد محبت تھی!"
"اب [illegible] ہے۔"
"میں ان سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔"
"اچھا [illegible] تم اب خاموشی اختیار کرو۔ میں جا رہا ہوں۔"
[illegible] کے سینے میں ایک طوفان سا مچل رہا تھا۔ مگر وہ چپ چاپ اپنے
[illegible] جا کر [illegible] اور بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ دیکھئے اب کیا گل
کھلتا ہے!"
گھر بھر میں پھر خاموشی کا راج تھا۔ ہر سو سناٹا۔ ہر طرف ویرانی۔
[illegible] تبدیل کر کے چلے گئے!
سدید اور شہلا باغ کی طرف برآمدے میں بیٹھے بہت چپکے چپکے باتیں
کر رہے تھے۔

سیما نے اپنے جنون میں ایک انتہائی قدم تو اٹھا لیا تھا مگر اب
[illegible] کا عالم کچھ اور تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھیں کہ جس چیز کو وہ
[illegible] سمجھی تھیں اسے زہر دے کر اچھا نہیں کیا۔
[illegible] نے [illegible] تب [illegible] محبت [illegible]

ایک [illegible]
ڈیڈی ہے!"
"[illegible] ہے!"
"ڈیڈی۔ میں بہت دن تک اپنے ماں باپ کو [illegible]
کے لیے روتا رہا ہوں۔ اب آپ مجھے مل گئے ہیں۔ مگر میری ماں [illegible]
ایک دھچکا سا پھر غضنفر کے دل پر لگا۔ "ماں ۔۔۔ ہاں [illegible]
نہیں۔ ہاں ایک مرتبہ پھر جا کے ابھر کر آئی اس کا [illegible]
کہاں سے لاؤں تمھاری ماں ۔۔۔ اور پھر کہکشاں کی یاد [illegible]
آئی۔
"ڈیڈی۔ میں ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے میری ماں [illegible]
جمشید نے کہا۔
"تمھیں ظفر چچا نے سب کچھ بتا دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ تمھاری
ماں مر چکی ہیں!" غضنفر نے کہا۔
"نہیں ڈیڈی۔ وہ بیٹے لگا۔ آپ کو نہیں معلوم۔ میری [illegible]
میرے ساتھ آئی ہیں۔ میں زبردستی انھیں لایا ہوں۔ وہ [illegible]
رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ نہیں کہ اگر آپ [illegible]
بھی نہیں جاؤں گا۔ بس وہ آگئیں میرے ساتھ۔ میں نے ان سے
کہا تھا کہ میں آپ کے پاس [illegible] آپ [illegible]
[illegible] میرے ڈیڈی۔ میری [illegible] معاف کر [illegible]
ان کے بغیر کیسے رہیں گے؟"
اس نے جھک کر ان کے پاؤں [illegible] اعلان [illegible]

[illegible] ہی کیا۔
"[illegible] بھائی کہاں ہیں؟" اشان نے پوچھا
"[illegible] دیکھو آ۔" مظفر نے جمشید سے کہا۔
[illegible] آہستہ آہستہ سدید اور شہابی سے اس کی کہانی
[illegible]
"میں مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے بھائی ہیں۔" شہابی بولی۔
"تمہیں معلوم تھا؟" سیما نے حیرت سے پوچھا۔
"میرے دل سے ایک آواز آئی تھی۔" شہابی نے کہا۔
"تب تو مجھے عید کا دن سا لگ رہا ہے!" سدید ہنس پڑا۔
غضنفر بے خبر سو رہے تھے۔ نیند ہی کے عالم میں انھیں محسوس ہوا کسی
[illegible] سر پر کھ دیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔
"ڈیڈی۔ میں آگیا۔" جمشید ہنستا ہوا بولا۔
غضنفر کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں انہوں
نے کہا:
"تم نے مجھے ڈیڈی کہہ کے پکارا ہے۔ یا میں کوئی خواب ـــ؟"
"نہیں ڈیڈی۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا
لیا۔ "مجھے ظفر چچا نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں اب
میں بھی آپ کو ڈیڈی کہہ کے پکارا کروں گا۔ جب فرید اور سدید آپ کو
[illegible] تو میں سوچتا تھا کاش میں بھی آپ کو ڈیڈی کہہ سکتا۔"
[illegible] میری دعا سن لی۔ ڈیڈی۔ بار بار خدا جانے اللہ کیوں کہا جان وغیرہ
[illegible] گئی تھا!"

[illegible]

اولاد محبت کا سلیقہ دیتا! ایک ہی رات کی مسافت نے ان [illegible]
انھیں اندازہ ہوا کہ زبانی جدائی کی بات کرنا آسان ہے۔ مگر [illegible]
ہو جانا بڑا کرب انگیز ہے!
ساری رات وہ کبھی نہ سوئیں اور صبح کو انھیں [illegible]
میکے میں صرف والدہ اور بڑے بھائی بچا رحم زندہ رہ گئے تھے۔ [illegible]
واقعات معلوم کر کے وہ کچھ خوش نہیں ہوئے تھے بلکہ دبی زبان [illegible]
ملامت کی تھی کہ انھوں نے بات کا جھگڑا کیوں بنا دیا تھا!
اب وہ اپنے بستر پر گم صم پڑی تھیں۔ نیز [illegible]
اذیت۔ شوہر سے جدائی۔ بچوں سے علیحدگی۔ گھر سے دربدری۔ [illegible]
بیک وقت کئی بیماریوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اور اب وہ کسی اچھے [illegible]
سے قاصر تھیں!
پھر وہ بڑی بے بسی سے رونے لگیں۔ اکیلے اکیلے چپکے چپکے کوئی [illegible]
آنسو پونچھتا۔ تب اپنے شوہر کی یاد آئی اور شدت سے آئی [illegible]
ہی لگ گئیں!
دفعتہً وہاں ان کی بھابی آئیں۔ اور مژدہ سنایا کہ ان کے [illegible]
مع جمشید کے ان سے ملنے آئے ہیں!
سوکھے دھانوں میں جیسے پانی پڑا ہو۔ اپنا رعب داب [illegible]
بھول کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں اور بے ساختہ بولیں "[illegible]
کہاں ہیں؟"
"اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔ [illegible] دن تمہارے [illegible]
[illegible] بھائی!"

واپس لوٹے تو ظفر اور نوشینہ ان کے قریب ہی آ گئے۔ دعا سلام کا ہوش
کسے تھا۔ یہ لوگ تو سیما کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ! عجیب حلیہ تھا۔ ملگجا سا لباس
تھا۔ بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں سرخ اور متورم۔ ہونٹ سوجے ہوئے اور پیشانی
پر ایک زخم جس پر جما ہوا خون شاید جمنے لگا تھا!۔ نوشینہ کو بہت برا
لگا۔ کیا حال کیا تھا بڑے بھائی نے بیوی کا۔۔ اتنے بے درد تو نہ تھے وہ۔ !

شاید ظفر نے سارا حال نوشینہ سے کہہ دیا تھا۔ اس نے بھی سیما کو بتانے
میں دیر نہ لگائی۔ ! اور ظفر نے ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ پوری قطعیت اور سچائی کے ساتھ
اس نے غضنفر کی پچھلی زندگی اور جمشید کی پیدائش، اس کی ماں کی وفات
اور خالہ کی آمد کی ساری تفصیل سیما کو سنا دی۔ !

سیما کا یہ حال تھا کہ جیسے جادو کے زور سے بت بن گئی ہوں۔ جمشید کا
حال بھی کم و بیش یہی تھا۔ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے نوشینہ کی باتیں
سُن رہا تھا۔ پھر سیما نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر آواز نہ نکلی۔ اتنے
میں ظفر نے کہا:

"بھابی۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ آپ سے بھی ہوئی۔ اور بڑے
بھائی سے بھی ہوئی لیکن۔ پیاری بھابی۔ غلطی کا مداوا غلطی سے نہیں ہے
آپ اب سب کچھ بھول جائیے۔ اور یقین کیجئے کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ خط
کی قسم ایک ایک بات سچ ہے۔ ہم اپنے ساتھ جمشید کو بھی اسی لیے لے
آئے ہیں کہ آپ اپنے دل کی ساری کدورت مٹا دیں اور ایک بیٹے کی طرح آپ
کے قدموں پر جھک جائیں۔ یہ بن ماں کا بچہ ہے بھابی۔ اسے اب تک محبت
نہیں ملی۔ پیار نہیں ملا۔ ماں نہیں ملی۔ آپ اس کی ماں بھی بن جائیے
بھابی۔ آپ اپنا دل بھی صاف کر لیجئے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

بھابی۔ بھابی۔ اب گھر چلیے۔ اب آپ کے بغیر سب کچھ ویران ہے۔ آپ ہمارے ساتھ
چلیے۔ ہم بڑے بھیا کے پاؤں پڑ کے انہیں بھی منا لیں گے۔ !"

سیما کی آنکھوں سے ایک بار پھر گنگا جمنا بہہ نکلیں۔ انھوں نے کچھ کہے
بغیر جمشید کو دیکھا اور اپنی باہیں پھیلا دیں۔ !

جمشید بھی اسی کا منتظر تھا۔ اس نے ایک ہچکی سی لی۔ "میری امّی" اور پھر
سیما کی کھلی ہوئی باہوں میں سما کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب تو یہ حال تھا کہ ظفر کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا ہجوم تھا اور نوشینہ
بھی بلک اٹھی تھی۔ !

"میرے بچے۔" سیما نے جمشید کے لب چوم لیے۔ "مجھے معاف کر دو میں
نے تم پر بڑا ظلم ڈھایا۔ اب میرے دل پر ٹھوکر لگی ہے تو میری آنکھیں کھلی
ہیں۔ جمی۔ مجھے ماں کہہ کے پکارو۔ !"

"آپ کے سوا میری ماں اور کون ہے امی۔ !" جمشید نے [illegible]
سینے سے چمٹا لیا۔ پھر دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنسو بھری
آنکھوں سے ہنس پڑے۔ !

سہ پہر ہو رہی تھی۔ تب ظفر اپنے ساتھ نوشینہ، جمشید، افشاں
سیما اور جمشید کو لے کر اپنے گھر پہنچے۔ ! سیما خوف زدہ تھیں۔ لیکن
جس طرح ایک جلا وطن قیدی بعد مدت اپنے وطن پہنچ کر بھولا ہوا سا [illegible]
اسی طرح سیما بھی ایک مدت کے بچھڑے ہوئے در و دیوار کو دیکھ رہی تھیں
جیسے [illegible] ہو گئے ہوں [illegible]
شہلا ان سے لپٹ گئی۔ ! [illegible]
ظفر نے ان سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ افشاں اپنے بھائی [illegible]

786

EASON'S BEST

CITIZEN FAN

Guaranteed for 5 Years

CITIZEN FAN INDUSTRIES, 3 Crematorium Street, Calcutta-4

Distributors for U.P : **BOMBAY ELECTRIC CO., Lucknow**

دانت نکلنے کے دنوں میں بچّہ کی مَدد کرتا ہے . . .



نونہال گرائپ سیرپ

نونہال گرائپ سیرپ دانت نکلنے کے دنوں کے لیے خاص طور سے بنایا گیا ہے، جو ان مشکل دنوں میں آپ کے بچے کی مدد کرتا ہے۔ یہ مسوڑھوں کی تکلیف، پیٹ درد، قبض اور دستوں کی شکایتوں میں آرام دیتا ہے۔ ہاضمہ درست رکھتا ہے اور بھوک لگاتا ہے۔ دانت نکلنے کے دنوں میں بچے کو ہمیشہ نونہال گرائپ سیرپ دیجیے۔

ہمدرد



نونہال بے بی ٹانک

بچوں کی بھرپور تندرستی اور طاقت کے لیے غذائیت سے بھرپور نونہال بے بی ٹانک جس میں وٹامن اے، سی، ڈی، بی کمپلیکس اور چار معدنی اجزا شامل ہیں، جو آپ کے بچے کی جسمانی بڑھوتری اور صحت کے ضامن ہیں۔ نونہال بے بی ٹانک سے بچہ مضبوط اور تندرست بنتا ہے۔ چست اور خوش و خرم رہتا ہے۔

. . . اور یہ مَدد کرتا ہے بچّہ کی بڑھوتری میں

9.8.83

ٹیلیفون نمبر آفس ۲۲۵۵۹۹

ٹیلیفون نمبر رہائش ۲۵۳۴۴

حریم

لکھنؤ

ماہنامہ

گزشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہولوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہولوی مرحوم

جلد (۵۳) فہرست مضامین اگست ۱۹۸۳ء نمبر (۸)

ایڈیٹر و نگراں: نسیم انہولوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ——— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	چھبیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	پچیس روپیہ
معمولی خریداری	"	بائیس روپیہ

وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

غیر ممالک سے

انھیں کے مساوی قیمت مع ڈاک رجسٹری اور ایئر میل سے مختلف ممالک کے مختلف شرحیں

- حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
- حریم ہر انگریزی ۵ / ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہولوی پرنٹر پبلشر نے [illegible] پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

لمعات

کچھ عرصہ پہلے اخبارات میں ایک خبر چھپی تھی کہ روزگار کی متلاشی عورتوں کی تعداد میں بالخصوص شہریوں میں بڑا برا اضافہ ہونے کی وجہ سے ان کے واسطے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی کئی تجویزوں پر مرکزی حکومت غور کر رہی ہے۔

سرکاری ذرائع نے بتایا کہ روزگار دفتروں میں اکتوبر ۱۹۸۲ء کے خاتمہ پر روزگار چاہنے والی عورتوں کی تعداد تیس لاکھ سات ہزار تھی۔

وزارت محنت نے ریاستی حکومتوں سے کہا ہے کہ وہ آئی ٹی آئی وانڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اکلیتاً عورتوں کے لئے قائم کریں تاکہ ان کو مختلف ہنر کی تربیت دی جا سکے کیونکہ عورتوں کے واسطے جو تربیتی سہولتیں موجود ہیں۔ وہ بالکل ناکافی ہیں۔

وزیر محنت مسٹر ویریندر پاٹل نے ایک خط میں لکھا ہے کہ سماجی رکاوٹیں بھی عورتوں کو ملک کے بعض حصوں میں ایسے آئی، ٹی، آئی میں جانے سے باز رکھتی ہیں جن میں عورتیں اور مرد دونوں تربیت حاصل کرتے ہیں۔

عورتوں کے لئے آئی، ٹی آئی کا مطالبہ خواتین کی مختلف تنظیموں کی طرف سے اور پارلیمنٹ میں کیا جاتا رہا ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں خواتین کی دنیا گھروں تک ہی محدود رکھنا پسند کرتا ہوں اور میرے خیال سے دو ہی شعبے ایسے ہیں جن کے لئے خواتین کو ڈگریاں حاصل کرنا چاہئیں۔ اولین شعبہ تعلیم کا ہے۔ لڑکیوں کے لاکھوں تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ ان میں خواتین ہی تعلیم دیتی رہیں تو بہتر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میرا مشورہ ہے کہ ان سے متعلق علیحدہ ڈائرکٹریٹ قائم ہو۔ اور انتظامی امور کے لئے بابوؤں کے بجائے خواتین ہی رکھی جائیں۔ آج لاکھوں خواتین بینکوں میں ڈاکخانوں وغیرہ کے شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ کیا وہ اسکولوں اور کالجوں میں بابوؤں کی جگہ کام نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں کے لئے منسٹر، سکریٹری اور ڈائرکٹریٹ میں اسی صنف کے لوگ ہوں تاکہ اس محکمہ میں ملازمت کرنے کے بعد خواتین کو ابتدا سے انتہا تک عورتوں ہی سے سروکار رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور اسی لئے خواتین کو مختلف دفاتر میں مردوں کے پاس جانا پڑتا ہے اور اس سلسلے میں اکثر انہیں ناگفتہ بہ حالات سے دوچار بھی ہونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ان کے ساتھ انصاف بھی نہیں ہو پاتا۔

جو عورتیں بیباک ہوتی ہیں انھیں ترقی مل جاتی ہے۔ ان کے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں لیکن جو خواتین مردوں سے بے تکلف نہیں ہو پاتیں انہیں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ کیا حکومت ایسا نہیں کر سکتی کہ محکمہ تعلیم میں سروس کرنے والی لاکھوں لڑکیوں کا تعلق صرف خواتین افسروں ہی تک محدود رہے۔ آخر کیوں انھیں یہ سہولیت نہیں دی جاتی۔ کیوں ان کے لئے خواتین افسران ہی مقرر نہیں کی جاتیں۔ منسٹر خاتون ہو سکتی ہے تو سکریٹری اور انڈر سکریٹری بھی خاتون ہو سکتی ہیں ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی خواتین ہو سکتی ہیں۔ بہرحال یہ مجھ دقیانوسی انسان کے خیالات ہیں! حکومت تو ہندوستان کو مغربی ممالک جیسا بنانا چاہتی ہے۔ اسے اب اس کا خیال نہیں کہ عورت کا فرض اولین کیا ہے۔

لطف کی بات ہے کہ ہندوستان میں بیکاری اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ لاکھوں سے بھی زیادہ نوجوان، بیکار پھر رہے ہیں انہیں ملازمت نہیں ملتی اور ملے کیسے۔ لاکھوں سے بھی زیادہ عورتیں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ مردوں کے لئے جگہیں کہاں سے آئیں۔

دراصل یہ طریقہ کار کہ مرد و عورت دونوں مل کر تمام طرح کے کام کریں، ان ملکوں میں درست ہے، جہاں آبادی کم اور کام زیادہ ہے لیکن جہاں کام کم اور آبادی زیادہ ہو۔ وہاں پہلے مردوں کو کام ملنا چاہئے۔ بلاشبہ ایسی خواتین کی مدد ضرور کرنا چاہئے جو واقعی ضرورت مند ہوں اور جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو یا جن پر خاندان کی پرورش کا بار ہو۔ لیکن یہاں تو میں دیکھتا ہوں کہ ضرورت مند خواتین سے زیادہ ان خواتین کو جگہیں پہلے ملتی ہیں جو متمول گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے شوہر بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ شوہر دو ہزار کماتے ہیں۔ بیوی ڈیڑھ ہزار میں بھی

بارہا ہوا ـــــ ایسے گھر بھی ہیں جہاں شوہر بھی بیکار اور بیوی بھی بے روزگار ہوتے فاقوں پر رہتی ہے۔ کیا حکومت یہ نہیں کر سکتی کہ جس عورت کا شوہر [illegible] پاتا ہو اس کی بیوی کو ملازمت [illegible] کہ اس کی [illegible] بیکار کر دے۔ کیا مساوات [illegible] ہے

بہرحال یہ باتیں تو ہم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے لکھ دیں۔ جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ لیکن حکومت کی اس سفارش کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے ایسے آئی۔ ٹی آئی، ٹیکنیکل انڈسٹریل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کھولنے کی ہدایت صوبائی حکومتوں کو کی ہے جو کہ خواتین ہی کے لئے ہوں تاکہ خواتین بے تکلفی سے ان میں دی جانے والی تعلیم کو حاصل کر سکیں ـــــ اسی سلسلے میں حکومت کو ایسے میڈیکل کالج بھی قائم کرنے چاہئیں جن میں صرف اور تمام تر خواتین ہی تعلیم پائیں اور علم جراحی وغیرہ سیکھیں۔ موجودہ میڈیکل کالجوں میں لڑکیوں کو شریک ہونے میں تکلف ہوتا ہے، اس لئے کہ ان میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے ـــ اور کون نہیں جانتا کہ ہمارے ملک کے لڑکوں کی اخلاقی حالت کس قدر گرتی جا رہی ہے۔ موجودہ تعلیم [illegible] بے پردگی اور آزادی کے باوجود اکثر ایسے والدین ہیں جو اپنی لڑکیوں کو میڈیکل کالجوں میں تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے اور یہی سبب ہے کہ ملک میں لیڈی ڈاکٹر مرد ڈاکٹروں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں۔ ان کا تناسب بڑھانا ضروری ہے۔

کاغذ اور محصول ڈاک میں اضافہ

حالیہ بجٹ میں حکومت نے کاغذ پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا تھا، اس کے باوجود [illegible] نے تقریباً [illegible] اضافہ کر دیا جس سے [illegible] اخبارات کا بار [illegible] لیا۔ [illegible] نہیں [illegible] کر سکے۔

ایک طرف محصول ڈاک کے اضافہ [illegible] ہے۔ جرائم کی [illegible]

اس طرح ۲۲ روپیہ کے بجائے وہی رسالے قیمت اٹھائیس روپیہ لے کر جاری ہو جاتی ہے۔ جو متوسط خاندان کی بچیوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اسی وجہ سے اکثر حرم کی بچیوں نے خریدنا ختم کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا بجٹ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

کاغذ کی گرانی کے باعث ہمیں سالانہ قیمت میں مزید اضافہ کرنا پڑے گا۔ اس کا اور اثر پڑے گا۔ ویسے تو حرم ہمیشہ سے نقصان کا شکار رہا ہے، لیکن ہم اس نقصان کو نسیم بکڈپو کی آمدنی سے پورا کرتے چلے آئے ہیں۔ اب یہ واضح ہو رہی ہے کہ کاغذ کی گرانی کے باعث کتابوں کی قیمتیں بھی بڑھیں گی۔ موجودہ قیمتیں ہی بہت زیادہ ہیں کتابوں کی نکاسی پر اس کا اثر پڑا ہے۔ مزید اضافہ قیمت فروخت پر مزید اثر ڈالیگا۔ حکومت ایک طرف تو جہالت دور کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور دوسری طرف ایسی صورتیں پیدا کر دیتی ہے کہ لوگ زیادہ نہ پڑھ سکیں۔ اخبارات، رسائل اور عام مطالعہ کی کتب سے ہی پڑھنے والوں کا علم بڑھتا ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جس طرح ان چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ اسی طرح قوت خرید کم ہوتی جاتی ہے۔ حکومت کے ارباب حل و عقد کو اس پر غور کرنا اور اخبارات و رسائل کے سلسلہ میں رجسٹری وی۔پی کے محصول کو کم کرنا چاہئے۔ جمہوریت رکھنے کے لئے عوام کی تعلیم کے لئے ایسی سہولتیں پیدا کرنا چاہئیں کہ آسانی سے لوگ ہر طرح کا علم حاصل کریں

یاد رکھنے کی باتیں

- وقت دنیا کی روح ہے ـــــ [illegible]
- مشورہ ہمیشہ دانا شخص کے ساتھ کرنا چاہئے ـــ لقمان
- سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے ـــ افلاطون
- عقلمند وہ ہے جو اپنی زبان کو دوسروں کی ملامت سے محفوظ رکھے ـــــ جالینوس
- تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے ـــــ سقراط
- [illegible] کا باعث ہوتی ہے ـــ ارسطو
- [illegible]
- [illegible]

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

اُمِّ ہانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل اوّل دعوتِ اسلام کا مخفی آغاز کیا اور اپنے ان مقربانِ خاص کو ہی توحید کا پیغام دیا جو آپؐ کے خصائلِ مبارکہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے لیکن آپؐ کا فرض صرف خفیہ تبلیغ اور چند لوگوں کی ہدایت سے فیض یاب ہو کر اسلام قبول کر لینے پر ہی ختم نہ ہو سکتا تھا بلکہ اسلام تو تمام تر دنیا کے لیے ایک بہترین نظامِ حیات بن کر آیا تھا۔ اور انسان کے کردار اور اخلاق میں جو انحطاط پیدا ہو چکا تھا اور جن خرافات اور بدترین رسوم کے وہ پابند ہو چکے تھے ان کا قلع قمع کرنے آیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نجات دہندہ بن کر مبعوث ہوئے تھے اس لیے آپؐ نے کچھ ہی دنوں بعد اعلانیہ دعوت دینی شروع کر دی۔

ایک ایسی قوم کو جو صدیوں سے شرک اور بداخلاقی کی ضلالت میں مبتلا ہو، راہِ حق کی طرف بلانا آسان کام نہ تھا۔ مشرکینِ مکہ رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کے درپے ہو کر ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ رسولِ کریمؐ کو ان کے معزز صحابہ کو اذیت ناک تکالیف دینی شروع کر دیں۔ ستانے کے لیے نئے نئے اندازِ ستم ایجاد کیے گئے۔ اسلام کے اس اولین دور میں مسلمان ہونا جان پر کھیل جانے کے مترادف تھا۔ جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا اپنے ہی عزیز و اقارب کی اذیتوں کا نشانہ بن جاتا۔ مرد تو مرد، مسلمان عورتیں تک ان ظالموں کے ظلم سے محفوظ نہ تھیں۔ یہی وہ بلند اقبال خواتین تھیں جن کو اسلام کے سایۂ عاطفت میں اولیت کا شرف حاصل ہے جن کو صحابیاتؓ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اسلام [illegible] ان صحابیات کے دینی ذوق و [illegible] میدانِ عمل میں ان [illegible] وہ ان کو سبقت لے گئیں۔ اسلام کو سینے سے لگانے کے جرم میں ان پر بھی ظلم و جور کے پہاڑ توڑے گئے۔ اور صحابیات کو بھی صحابہ کرام کی طرح آزمائش کے سخت ترین مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ مگر ان کے ایمان میں ذرہ برابر بھی واقع نہیں ہوئی۔ مشرکین کی یہ تمام سعی کیا ان کسی ایک مسلمان کو بھی جادۂ اسلام سے ہٹا نہ سکیں۔ شمعِ نبوت کے گرد اسی طرح پروانوں کا اضافہ ہوتا رہا۔

انھیں جلیل القدر صحابیات میں حضرت سودہؓ بنت زمعہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ پاک امّ المومنین میں سے تھیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آغازِ دعوتِ اسلام میں ہی مسلمان ہوئی تھیں اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا عامر بن لوی قبیلے سے تھیں یہ نامور قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا تھا اور ایک ذی حیثیت قبیلہ مانا جاتا تھا۔ آپؓ کے والد کا نام زمعہ اور والدہ کا نام شموس تھا۔ آپ کا ننھیال عدی بن نجار سے تعلق رکھتا تھا آپ کے نانا کا نام قیس تھا اور آپ کے سگے بھائی کا نام عبداللہ تھا آپ کی شادی آپ کے چچا کے بیٹے سکران بن عمرو سے ہوئی تھی دونوں اپنے قبیلے کے بے حد جنگ جو جوان تھے اور اپنی شجاعت و دلیری میں کافی مشہور تھے۔ اسلام کے دشمنوں کی صف میں ان کا نام پیش پیش تھا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا کھلم کھلا آغاز کیا تو مشرکینِ مکہ کو حضورؐ کے اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والوں میں یہ دونوں بھی شامل تھے۔ اور اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔ حضورؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے مگر آپ ان تمام سختیوں کو خندہ پیشانی اور صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور ان اذیت دینے والوں کے حق میں دعائے خیر کرتے تھے۔ قریش اور منکرین متحیر تھے کہ آپ یہ تمام سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔

سکران بن عمر اپنے گھر میں عورتوں سے بھی اپنی بہادری کا ذکر کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و تحمل کو بے بسی پر محمول کرتے تھے۔ ابتدا میں تو دیگر عورتوں کی طرح حضرت سودہ پر بھی ان داستانوں کا اثر ہوا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

رفتہ رفتہ وہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں کہ اس صورتِ حال میں ان سخت ترین ایذا رسانیوں کا حضرت محمدؐ جواب کیوں نہیں دیتے جو خود کو خدا کا رسول اور پیغمبر بتاتے ہیں؟

آخر اشتیاق اس قدر بڑھا کہ وہ اس تعلیم کے بارے میں لوگوں سے معلوم کرنے لگیں اور جب اس کا علم ہوا تو ان کے قلب میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔ ان کی روح آفتاب اسلام کی پرنور شعاعوں سے منور ہوگئیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حضورؐ کی محفل میں صحابہ کرام رضؓ تشریف فرما تھے۔ محفل میں مکمل طور پر سکوت طاری تھا حاضرین خاموشی اور احترام سے آقائے نامدار کے ارشادات کی طرف متوجہ تھے۔ چند افراد احترام کی وجہ سے نظریں جھکائے ہمہ تن گوش تھے اور چند نظریں اپنے شوق پر قابو نہ پاتے ہوئے حضور پرنور کے رخِ انور کی بلائیں لے رہی تھیں اسی وقت حضرت سودہ رضؓ اس مقدس اور پاک بزم میں داخل ہوئیں ان کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا سر سے پاؤں تک ایک بڑی چادر میں ملبوس تھیں۔ چوں کہ وہ اپنے کافر باپ اور شوہر سے چھپ کر آئی تھیں حضورؐ کی خدمت میں۔ یہاں آتے ہی ان کے قلب میں ایک عجیب سی راحت و تقویت کا احساس ہوا۔ نبی کریمؐ کا ایک ایک لفظ ان پر اثر پذیر ہو رہا تھا۔ آخر آپ سے صبر نہ ہو سکا اور حضورؐ کے روبرو آکر بے ساختہ کہہ اٹھیں:

یارسول اللہ! اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنْتَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یارسول اللہ! میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں

جب وہ اس مقدس محفل سے واپس ہوئیں تو دولتِ اسلام سے مالامال تھیں اب ان کا سخت ترین دشواریوں کا دور شروع ہوگیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے شوہر ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے برعکس اسلام اور حضورؐ کے سخت دشمن تھے حضرت سودہ مخمصے میں پڑی تھیں۔ ان حالات میں نہ وہ اپنے قبول اسلام کا اظہار کر سکتی تھیں۔ بس خدائے عزوجل سے اپنے شوہر کو ہدایت پر لانے کی دعائیں مانگتی تھیں۔ اور جب انھیں موقع ملتا اپنے شوہر کے روبرو اسلام اور حضورؐ کی تعریف کرنے سے باز نہ رہتی تھیں اور اس نظامِ حیات کی خوبیوں پر بہت بڑے حسین پیرائے میں روشنی ڈالا کرتی تھیں۔ دھیرے دھیرے سکران پر ان کی باتوں کا اثر تو ہوا مگر مسلمان ہونے پر ابھی نہیں ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے حضرت سودہ رضؓ کچھ مایوس سی ہوگئیں مگر اس کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے خانگی معاملات میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی۔

نیک بیوی کی صحبت سے سکران اسلام کے معترف تو ہوگئے تھے مگر اسلام کی طرفداری کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اس شرمندگی سے ڈرتے تھے کہ قریش ان کا مضحکہ اڑائیں گے۔ کیونکہ کل تک تو وہ خود ہی دشمن رسول اور اسلام تھے۔ لیکن ایک روز جب انھوں نے دیکھا کہ حضور اکرمؐ ان تمام ایذا رسانیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرکے خدا سے بڑی عاجزی کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہے ہیں:

"اے اللہ! تو میری قوم کو ہدایت کا راستہ دکھا۔ یہ نادان ہیں، ان کی خطاؤں کو معاف فرما، انھیں دین کی فہم عطا فرما۔"

یہ منظر اس قدر اثر انگیز تھا کہ سکران بن عمرو پر لرزہ طاری ہوگیا حضورؐ کے اس قدر ضبط و تحمل اور رحم دلی نے آپ کی خاموشیوں کو زبان دے دی اور آپ نے کھلم کھلا اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا تو حضرت سودہ رضؓ جیسی اطاعت گذار اور وفا شعار بیوی کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اب انھیں شوہر کی تائید حاصل ہوگئی تھی اس لیے اعلانیہ حضورؐ کی خدمت میں حاضری دینے لگیں اور درسِ قرآن سے فیض یاب ہونے لگیں۔

قریش سکرانؓ بن عمرو اور حضرت سودہؓ کے بھی خلاف ہوگئے۔ سب سے پہلے عبداللہ نے اپنی بہن اور بہنوئی کی مخالفت کی۔ مگر ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ حق پرستوں کی تیغ حق کو گل کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا مشرکین مکہ اور قریش کو پہلے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ چند کمزور اور نادار لوگ اسلام کی طرف

مائل ہو گئے ہیں اس لیے آئے دن ان کو نت نئے طریقوں سے ستاتے تھے۔ اور وہ لوگ دربارِ رسالت میں آ کر اس ظلم و ستم کی فریاد کرتے تو رحمتِ دو عالمؐ انھیں صبر کی تلقین فرماتے اور انھیں کلامِ الٰہی کی آیات پڑھ کر سناتے:

"صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے وہی حامی و مددگار ہے۔"

حضرت سودہ رضؓ اور سکرانؓ بن عمرو ذی حیثیت قبیلہ کے فرد تھے۔ جب مشرکین نے دیکھا کہ اسلام غرباء اور مسکینوں سے بڑھ کر عمائدین و معززین میں پھیلنے لگا ہے تو وہ اور بھی غضب کے عالم میں غلاموں اور غریبوں پر ٹوٹ پڑے۔ اسلام کا چرچا گھر گھر ہونے لگا تھا اور وہی مقتدر اور باعزت ہستیاں جو کل تک مسلمانوں کے درپے تھیں آج اسلام کی شیدائی ہو چکی تھیں۔ قریش غصہ سے باؤلے ہو گئے اور ان کی ستم رانیاں اور بڑھ گئیں۔

ایک روز حضرت سودہ رضؓ اور سکران بن عمروؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ چند مشرکین نے ان پر تیروں سے حملہ کر دیا۔ اور انھیں بری طرح زخمی کر دیا۔ وہ دادرسی کے لیے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی وقت چند دوسرے مسلمانوں نے بھی آ کر فریاد کی۔ آخر حضورؐ نے انھیں ارضِ حبشہ جو ان کے لیے مانوس مقام تھا چلے جانے کا حکم دیا۔ حبشہ کی ہجرت کا واقعہ ۵ نبوی بعثت میں پیش آیا۔ گیارہ مردوں اور چار عورتوں کے اس مختصر قافلے میں حضرت سودہ رضؓ اور سکرانؓ بھی شامل تھے۔ یہ مسلمانوں کی پہلی ہجرت تھی۔

سکران بن عمرو کی وفات کے متعلق اختلاف ہے بعض روایتوں میں ہے کہ حبشہ کے قیام کے دوران ہی آپ وفات پا گئے تھے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ حبشہ کی واپسی کے چند روز بعد مکہ میں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ چند روایات میں ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پانچ سال قبل رونما ہوا۔ سکران سے آپ کے ایک بیٹے عبدالرحمٰن تھے جو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ انھوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی لیکن ابن قتیبہ دینوری کے مطابق حضرت سودہؓ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ آنحضرتؐ نے حضرت سودہ رضؓ کی بیوگی پر افسوس فرمایا۔ آپؓ اب اپنے والد زمعہ کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔

حضرت سودہ کی بیوگی کے دو برس بعد ۱۰ نبوی کو رمضان المبارک کی گیارہ تاریخ کو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی۔ اور ان کے انتقال کے چند دنوں قبل آپ کے چہیتے چچا اور ظاہری پشت پناہ حضرت ابوطالب کا بھی انتقال ہو چکا تھا سال کے اندر اندر آپؐ کے دو محسن اٹھ گئے۔ یہ زمانہ آپؐ کے لیے بڑا سخت تھا۔ آپؐ ہر وقت کشمکش کا شکار رہنے لگے۔ دو محبوب ہستیوں کی جدائی تو آپؐ پر پہلے ہی شاق تھی اوپر سے مشرکین مکہ اور قریش نے اب کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی تھی۔ ان کو اب کسی کا پاس و لحاظ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ابوطالب کی حمایت اور حضرت خدیجہؓ کی مالی اعانت اب باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے انھوں نے نہایت بے باکی کے ساتھ آپؐ کو ستانا شروع کر دیا تھا۔ باہر کی اذیتوں کو سہنے کے بعد جب حضورؐ گھر آتے تو وہاں بھی بدنظمی کا دور دورہ ہوتا کیونکہ آپؐ کی مونس و غم خوار حضرت خدیجہؓ جو گھر کا تمام کام خوش اسلوبی سے انجام دیتیں اور آپؐ کو دلی تقویت پہنچاتی تھیں آپ سے جدا ہو چکی تھیں۔ آپ کو غمگین اور پریشان دیکھ کر خولہؓ بنت حکیم نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپ سودہ سے نکاح کر لیجیے۔

جب حضورؐ نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو خولہؓ حضرت سودہؓ کے والد زمعہ کے پاس یہ خوش خبری لے کر گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر انھیں سلام کیا: "انعم صباحًا" پھر نکاح کا پیغام سنایا۔

انھوں نے کہا: "ہاں محمد شریف کفو ہیں، لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کر لو۔" زمعہ نے خود ہی اپنی بیٹی سے ان کی رضامندی دریافت کی۔ ظاہر ہے حضرت سودہ کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ انھوں نے خوشی خوشی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ جب تمام مراحل طے پا گئے۔ تو آپؐ خود تشریف لے گئے۔ سودہ کے والد نے نکاح پڑھایا چار سو درہم مہر حضرت سودہ کے لیے

آپؐ کی شادی ہوگئی۔ طبقات میں ہے کہ رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں ان کا نکاح ہوا تھا۔ زرقانی نے سنہ ۱۰ نبوی ہی لکھا ہے۔ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کی وفات کے سنہ میں بھی اختلاف ہے۔ ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو ہی حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ سیرت النبیؐ میں رقم طراز ہیں کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کا خطبہ اور نکاح قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لیے مورخین میں اختلاف ہے کہ کسے تقدم حاصل ہے۔ اور عبداللہ بن محمد عقیل کا قول ہے کہ حضرت سودہؓ ہی پہلے آپ کے نکاح میں آئی تھیں۔

ہشام بن محمد کے حوالے سے ابن سعد نے روایت کی ہے کہ جب حضرت سودہؓ سکران بن عمرو کے نکاح میں تھیں اور دونوں دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے تو ایک رات حضرت سودہؓ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرتؐ تشریف لائے ہیں اور انھوں نے اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھ دیا ہے۔ یہ خواب انھیں بہت عجیب محسوس ہوا۔ اور جب انھوں نے اپنے شوہر سے اس کا ذکر کیا تو چند لمحے سکوت کے بعد سکران بن عمرو نے کہا،

سودہ! اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد رسول اللہؐ تم سے نکاح کریں گے۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؓ نے ایک اور خواب دیکھا کہ وہ تکیے کے سہارے لیٹی ہیں کہ اچانک آسمان شق ہوا اور چاند ان کے اوپر گر پڑا۔ اس خواب کی تعبیر بھی سکران بن عمرو نے یہی بتائی کہ میرے مرنے کے بعد تم مجھ سے بہتر شخص کے نکاح میں جاؤ گی۔

حضرت سودہؓ کے بھائی عبداللہ [illegible] جو اس وقت [illegible] وہ بات پر [illegible]

لیکن کچھ عرصے بعد جب انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اپنی بہن کی ہوئی باتیں یاد آئیں تو بہت افسوس کیا۔

حضور اکرمؐ سے نکاح کے وقت حضرت سودہؓ کی عمر پچاس برس تھی۔ وہ نکاح کے وقت نہ تو خوبصورت تھیں نہ ہی جوان بلکہ اس دور سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکی تھیں۔ مگر آنحضورؐ کے پیغام پر وہ فوراً رضامند ہو گئی تھیں یہ رضامندی محض قیامت کے روز حضورؐ کی زوجہ کہلانے کی وجہ سے تھی۔ کسی عورت کو اس سے زیادہ خوش نصیبی اور سعادت کیا حاصل ہو سکتی ہے۔ اور رسول اللہؐ نے بھی یہ نکاح اس لیے کیا تھا کہ آپؐ کو گھر میں ایک رفیق اور بچوں کے لیے ایک مہربان و نگہداشت کرنے والی معمر خاتون کی ضرورت تھی۔

حضرت سودہؓ نے نکاح کرنے کے بعد مکہ مکرمہ میں تین برس گزارے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ہوا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو تقریباً سات ماہ بعد زید بن حارثہ کو بھیج کر ام المومنین حضرت سودہؓ اور دونوں صاحبزادیوں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کو مدینہ بلوا لیا۔ حضرت سودہؓ نے ۱۰ نبوی میں آنحضرتؐ کے ساتھ فریضۂ حج بھی ادا کیا۔

حضرت سودہؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہ سکتی تھیں حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انھوں نے آنحضرتؐ سے اسی وجہ سے سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی۔

حضرت سودہؓ ایک خدمت گزار اور وفا شعار بیوی تھیں حضورؐ کی خدمت اور اطاعت شعاری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتی تھیں اور اس کے بعد اپنا تمام وقت یاد الٰہی میں گزارتی تھیں۔ زہد و تقویٰ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ اور سخاوت بھی ان کی خاص صفتوں میں سے [illegible]

حضرت سودہ رضؓ مزاج کی تیز تھیں جلد مشتعل ہو جاتی تھیں مگر پھر فوراً ہی غصّے پر قابو بھی پا لیتی تھیں اس کے ساتھ ہی ان کی فطرت میں حد درجہ ظرافت بھی تھی۔ آپ بڑا شستہ مذاق کرتیں یہاں تک کہ کبھی کبھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی مسکرا دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہی ہوں۔ آپ اس قدر دیر تک رکوع میں رہے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میری نکسیر نہ پھوٹ جائے اس لیے میں نے دیر تک اپنی ناک پکڑے رکھی۔" یہ سنکر آنحضرتؐ متبسم ہو گئے۔

امّ المومنین حضرت عائشہ رضوان کی بے حد مداح تھیں صحیح بخاری میں مرقوم ہے کہ عروۃؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ سودہ رضؓ بنت زمعہ نے اپنی باری عائشہ کو دیدی تھی اور رسول اللہؐ حضرت عائشہ کے یہاں دو دن رہتے تھے ایک دن انھیں کی باری میں دوسرے دن سودہؓ کی باری میں۔

اطاعت وفرمانبرداری ان کا خاص وصف تھا اور اس وصف میں وہ تمام ازواجِ مطہرات سے ممتاز تھیں جو بات آنحضرتؐ فرمادیتے اس کے خلاف کبھی نہ کرتیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔

آیت حجاب سے قبل عرب کے قدیم طرز پر ازواجِ مطہرات اور شریف گھرانے کی خواتین قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں حضرت عمر رضؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا اس بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردے کی تحریک کرتے رہتے تھے لیکن ابھی ان کی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہ رضؓ ایک روز رات کے وقت رفع حاجت کے لیے باہر نکلیں چونکہ ان کا قد نمایاں تھا اس لیے حضرت عمر رضؓ نے ان کو پہچان لیا اور کہا:

سودہ تم کو ہم نے پہچان لیا۔

یہ بات حضرت سودہ نے محسوس کی اور گھر آکر دریافت کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم ضرورت کے لیے بھی گھروں سے نہ نکلیں؟۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے تمھیں ضرورت کے لیے گھر سے نکلنے کو منع نہیں کیا۔" یہ سن کر حضرت سودہ خاموش ہو گئیں اب آپ کو اطمینان ہو گیا تھا مگر کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ آیت حجاب نازل ہوئی اور پردے کا حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے نافذ ہو گیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عورتوں کے لیے پردے کا حکم دے کر ازواج مطہرات کے لیے فرمایا:

"میرے بعد گھروں میں بیٹھی رہنا۔"

چنانچہ ام المومنین حضرت سودہ رضؓ نے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ پھر گھر سے قدم نہ نکالا یہاں تک کہ حج کے لیے بھی کہا گیا تو فرمایا:

"میں حج اور عمرہ دونوں کر چکی ہوں لہٰذا اب خدا اور رسولؐ کے حکم سے گھر میں بیٹھوں گی۔"

آنحضرتؐ کے اخلاق وعادات میں سخاوت وفیاضی ایک نمایاں وصف تھا اس بنا پر صحابہ میں جس کو آپ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصفِ خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا۔ ازواج مطہرات کو آپ کے اخلاق وعادات وفیضِ صحبت سے متمتع ہونے کا زیادہ موقع حاصل تھا۔ اس لیے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا تھا حضرت سودہ رضؓ اس وصف میں باستثناء حضرت عائشہ رضؓ سب سے زیادہ ممتاز تھیں آپ بڑی بے نیاز فطرت کی مالک تھیں ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے درہم سے بھری ہوئی تھیلی اپنے غلام کے ہاتھ آپ کے پاس بھیجی۔ جب غلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا: "اس میں کیا ہے؟"

غلام نے عرض کیا: "امیر المومنین نے آپ کے لیے درہم بھیجے ہیں۔"

یہ سن کر آپ نے بڑی بے نیازی سے فرمایا:

"کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں۔ کھجوریں ہوتیں تو کھا لیتے، درہم ہمارے کس کام کے۔"

یہ کہہ کر اسی وقت درہم محتاجوں میں تقسیم کر دیئے۔

حضرت سودہ رضؓ کے ذریعہ صرف حدیثیں مروی ہیں جن میں

بخاری میں صرف ایک شامل ہے۔ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، اور تابعی رضؓ سعید الرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے۔

حضرت سودہ رضؓ کے سنہ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ خلافت راشدہ میں آپ نے صدیق اکبر رضؓ اور فاروق اعظم رضؓ کا دور دیکھا اور خلیفۂ دوم حضرت فاروق اعظم رضؓ کے زمانہ میں ۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ واقدی کے نزدیک انھوں نے امیر معاویہ رضؓ کے زمانۂ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں۔

امام بخاری نے تاریخ میں سند صحیح سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضؓ کی خلافت میں آپ نے انتقال کیا۔ ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات پائی۔ حضرت عمر رضؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی۔ اس لیے ان کا زمانۂ وفات ۲۳ھ ہوگا۔ خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔

گھریلو چٹکلے

آزما کر دیکھیں ممکن ہے صحیح نکلیں۔

- سوتی یا اونی کپڑے پر خون کا دھبّہ لگ جائے تو اس پر سرکہ لگائیں۔
- انڈے کا داغ چھڑانے کے لئے کپڑے کو پہلے ٹھنڈے پانی سے پھر گرم پانی سے دھوکر صابن سے دھوئیں۔
- آلو کے دو ٹکڑے کرکے سیاہی کے داغ پر ملنے سے داغ دور ہو جائے گا۔
- لال روشنائی کے دھبّے پر انڈے کی سفیدی لگا کر صابن سے دھو ڈالیں۔ نیز روشنائی کے دھبوں پر لیموں اور نمک بھی رگڑ کر صاف کیا جا سکتا ہے۔
- اگر کپڑے پر روشنائی کا داغ لگا ہو تو دھبے والی جگہ پر کپڑے کے نیچے سوتی کپڑے کا ٹکڑا رکھ کر داغ والی جگہ پر روئی سے ... پھر ... کر دیجئے ... ہو جائے گا۔

فطرت کا قرض

شاعر لکھنوی

کھیل، ورزش، کام، جذبہ اور محنت چاہیے
زندگی میں سب سے پہلے فکر صحت چاہیے

تندرستی کی طرف سے ہو نہیں سکتے ملول
وہ جو اپنے روبرو رکھتے ہیں صحت کے اصول

چاہیے حسن توازن خون کی گردش میں بھی
جسم کے نشو و نما کا راز ہے ورزش میں بھی

دوڑنے سے بھاگنے سے آدمی ہوتا ہے چست
خون کے دوران کو رکھتی ہیں یہ باتیں درست

اس صداقت سے کسی کو بھی نہیں ہے اختلاف
جلتی ہیں سادہ غذائیں خون کو کرتی ہیں صاف

کھائیے سادہ غذائیں خوب محنت کیجیے
اپنی صحت کی بہر صورت حفاظت کیجیے

روز روشن کی طرح یہ بات ہے سب پر عیاں
دور رہتی ہیں توانا جسم سے بیماریاں

ہو جو مستحکم ہمارے کار صحت کا نظام
خود بخود ہو جائے گی بیماریوں کی روک تھام

لوح انساں پر یہ فطرت کی طرف سے قرض ہے
اپنی صحت کی حفاظت ہر بشر پر فرض ہے

بشکریہ ہمدرد صحت

شکست

عفت موہانی

ہمیشہ کی طرح ان دونوں کے بحث کا خاتمہ اب بھی لڑائی پر ہوا۔ نیتر تو سچ مچ اسے سنجیدہ لڑائی ہی سمجھ رہی تھی لیکن یہ حال تھا کہ ہنسی ضبط کرتے کرتے اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا! لیکن وہ اس کے بگڑ اٹھنے کے خیال سے مسکرا نہ سکا!۔ اگر وہ اسے مسکراتے بھانپ بھی لیتی تو زیادہ جوش سے لڑنے لگتی۔ مگر ہوا یہ کہ کسی بے تکے موقع پر نیتر نے مسکراتا دیکھ لیا اور جھنجلا کر اس پر چڑھ دوڑی۔!

"کیا آپ مجھے اُلو سمجھتے ہیں؟"

"یہ تمہارا حسن ظن ہے نیتر بی بی۔" انجم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اپنے بارے میں رائے بالکل درست رکھتی ہو۔۔۔ میں تمہیں اُلو جیسی اونچی چیز کیسے سمجھ سکتا ہوں۔!"

"میں آپ پر پیپر ویٹ کھینچ ماروں گی۔!۔"

"یہ البتہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ تم واقعی مردوں سے بلند ہو۔ نیک ارادے کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا دو۔ میں اپنا ٹوٹا ہوا سر لے کے چچا میاں کے حضور میں جاؤں گا وہ تو بے انتہا خوش ہو جائیں گے کہ ان کی اکلوتی صاحبزادی اتنی فارورڈ ہے۔ ہاں تو پھر۔ بسم اللہ۔"

"میں آپ کے ساتھ قطعی نباہ نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے فیصلے پر سوچنا پڑے گا!"

"اپنے آخری فیصلے سے مجھے بھی آگاہ فرما دینا۔" انجم نے جواب دیا۔ "اس طرح میں بھی یہ فیصلہ کرنے سے بچ جاؤں گا کہ مجھے تمہارا کٹلٹ دینا چاہئے یا قیمہ بنا دینا چاہئے ایڈیٹ!"

"مہربانی کر کے آپ میرے کمرے سے نکل جایئے!" ابکی نیتر کمرے سے باہر ہو گئی۔ لیکن انجم صوفہ پر دراز ہو کر سگریٹ سلگانے لگا اور پھر لمبے لمبے کش لے کر فضا دھواں دھار کر دی۔ اسے پتہ تھا کہ نیتر کو سگریٹ کے دھوئیں سے بے حد سخت نفرت تھی! پھر اس

نے نہایت غصہ دلانے والے انداز میں مسکرا کر کہا۔ "ارے ہم تو عورت کی برتری پر لیکچر جھاڑ رہی تھیں نا! نیر اعظم۔ مجھ سے برتر ہونا تم۔ میں بے چارہ کیا۔ عورت کی برتری اسی میں ہے کہ اپنے ہونے والے شوہر پر چپلیں برسائے۔ تم شروع ہو جاؤ۔ میں گنتا جاؤں گا"

"آپ نے تو خود سے نفرت دلا دی۔" نیتر نے غصہ میں ہونٹ سکوڑ لیے۔ "اپنے گریبان میں منہ ڈال کے تو دیکھتے ہی نہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک آپ نے مجھے رُلایا ہے۔ کیا مجھے وہ سب کچھ یاد نہیں ہے۔ آپ میری مسکراہٹوں کا سبب کبھی نہیں بنے۔!"

"مذاق کو لے دوڑتی ہو۔" انجم نے بُرا مانا۔ "میں نے تو اس طرح کبھی نہیں سوچا۔ تم کچھ کم پریشان کرتی تھیں مجھے۔ اف فوہ۔ یاد ہے۔ ایک دفعہ چچی اماں نے کچی امیوں کے ٹکڑے کئے تھے اور ان میں نمک مرچ لگا کے اچاری میں رکھ دیا تھا۔ تم ایک ٹکڑا چبکر چبکر نگل رہی تھیں۔ میں نے تم سے ذرا سا مانگا تھا۔ پانی بھرا آرہا تھا میرے منہ میں بھی۔ مگر تم نے ایک اتنا سا مصالحہ تک نہ دیا۔ بلکہ اپنے گلہری کے سے تیز دانت میرے ہاتھ میں گاڑ دیئے تھے۔ ابھی تک نشان باقی ہیں۔ دیکھ لو چاہے۔ میں تو تمہاری شکایت کسی سے بھی نہیں کی تھی۔ تھوڑا سا بدلہ لیا تھا۔ بس۔"

"دل سے گھڑ کے جھوٹے سچے قصے سنا دیجئے۔" اس سے کیا نیتر کا منہ سیدھا نہیں ہوا۔

"اچھا بھائی سنو! میں کہتا ہوں کہ اب اس منحوس بحث کا خاتمہ ہو ہی جائے۔ کیونکہ ہمارے درمیان ایک حسین سا رشتہ بھی ہے۔ جو کچھ دنوں بعد پختہ ہو جائے گا۔ اگر تم اسی طرح مردوں کو برا بھلا کہتی رہیں اور میں عورتوں پر کیچڑ اچھالتا رہا تو پھر نتیجہ [illegible] ہماری۔ اس نکتہ پر ہمیں سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ دنیا بھر کے مرد اور عورتیں گئیں ہو لیے ہیں۔ ان سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہم دونوں ایک معیار کے ہیں۔ بس!۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں آپ کی مکاری۔ جہاں دیکھا کہ عورت سے جیت نہ سکے۔ بس شروع کر دی سمجھوتے کی خوشامد۔ میں آپ سے متفق ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ مرد سب ایک جیسے ہوتے ہیں خود غرض، مطلبی، مکار، دغاباز۔ اور۔ اور۔!"

"بریک ذرا آہستہ میں۔ یہ کیا واہیات ہے۔ ایک مرد کے منہ پر

تم مردوں کو گالیاں دے رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ ایک ہاتھ اگر گال پر تول دوں تو پھر رہ جائے یہ ساری برتری۔!"

"میرے ہاتھ نہیں کیا۔؟"

"نیّر ــ!" وہ گرجا۔

"نکل جائیے آپ میرے کمرے سے۔ آپ اجازت کے بغیر آئے کیسے تھے؟" وہ بھی گرجی۔

اور وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ مذاق میں بات ذرا سی ہوگئی تھی۔ ویسے ان میں یہ زوردار بحث روز ہی ہوتی تھی۔ عورتوں کی برتری ثابت کرنے کے لیے نیّر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی انجم بھی مردوں کی حمایت میں ڈٹ جاتا۔ یہ بحث کبھی یونہی کبھی نیّر کے ابا کی مداخلت سے ختم ہو جاتی۔ مگر آج۔ انجم نے محسوس کیا کہ نیّر واقعی سنجیدہ تھی۔ اور سنجیدگی ہی سے اپنی نفرت و بیزاری کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نفرت اور ساتھ ہی تحقیر کے جذبات منجمد تھے۔

انجم جیسے ہی باہر نکلا نیّر نے دھڑاک سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ دونوں بچپن کی تھی سی پگڈنڈی پر ساتھ ساتھ چلتے شباب کی حسین وادی میں آ نکلے تھے جہاں کا ہر پھول ہر کلی اور ہر غنچہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر انھیں بھی کچھ نہ کچھ کہنے کی دعوت دے رہا تھا۔ نیّر کے ابا نے اپنے بے سہارا بھتیجے کو شروع ہی سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کی پرورش کی تھی۔ اور اب ان کے سوا اس کا کوئی نہ تھا۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔ لیکن زندگی کی اتنی شدید محرومی کو انجم نے مسکرا کر بڑے حوصلے سے انگیز کر لیا تھا۔ چچا میاں اس کے ماں باپ۔ بہن بھائی اور دوست تھے۔ اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پھر غم کس بات کا۔ وہ بہت خوش مزاج تھے۔ ہنسنے ہنسانے کا شائق۔ مجلس پسند، مخلص محبت کرنے اور محبت کو پہچاننے والا۔!

چچا میاں نے اسے اپنے بزنس کا نگراں کار بھی بنا دیا تھا۔ اور جب وہ ایم۔ اے ہو گیا۔ نیّر نے بھی گریجویشن کی تکمیل کر لی۔ تو انھیں منگنی کے ریشمی زنجیروں میں باندھ دیا۔

وہ سمجھتے تھے ان کی نازوں کی پالی بیٹی کو انجم کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ باپ کے بے تحاشہ دلار سے کچھ مغرور تیز مزاج اور زبان دراز ہوگئی تھی لیکن یہ اس کی فطرت بھی نہیں بے چاری ماں سے محروم تھی۔ شاید اسی کمی نے اُسے کچھ چڑچڑا کر دیا ہو۔!

پھر یوں ایک حادثہ ہوا کہ اس کی ایک جگری سہیلی کے منگیتر نے اسے دھوکا دیا اور پردیس میں شادی کر لی۔ سہیلی بے چاری نے خودکشی کر لی۔ تب سے اس کے خیالات میں ایک عجیب سا انقلاب آ گیا کہ وہ یکبارگی دنیا بھر کے مردوں سے متنفر ہو گئی حتیٰ کہ انجم سے بھی۔ امرد تو وہ بھی تھا۔ جانے کب اس کے بھیجے میں کیڑا کلبلائے اور وہ بھی منحوس ماری مردانگی پر اتر آئے۔ تب۔؟ وہ اعلانیہ مردوں سے نفرت کا اظہار کرتی۔ عورت کی وفا شعاری پر تقریر کرتے کرتے عورت کی برتری ثابت کرتی اور اس سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے روز ان دونوں میں جھڑپیں ہوا کرتیں۔!

لیکن یہ جھڑپ ذرا تیکھی ہوگئی تھی۔!

انجم کی خوش مزاجی پر دکھ کا کہرا منڈھ گیا! وہ اسے ہی پسند کرتا تھا۔ نجانے کب سے اسے دیکھتا آیا تھا۔ تب چھوٹی سی گڑیا تھی۔ جو اس کے ساتھ لگی لگی پھرتی۔ اسی کے ساتھ اسکول جاتی۔ اس کے ساتھ ہر کھیل میں شریک ہوتی۔ ایک پل کی بھی مفارقت جسے گوارہ نہ تھی۔!

انجم کو پتہ بھی نہ چلا آہستہ آہستہ وہ کیوں کر بڑی ہو گئی جیسے کلی پنکھڑیاں کھولے۔ اسی طرح۔ اس نے جب پہلی دفعہ انجم کی کسی شرارت پر برا ماننے کی بجائے سر پہ آنچل اوڑھ لیا تھا۔ اور دھیرے سے مسکرا کر سر جھکا لیا تھا۔ تب حیرت کے مارے وہ دنگ سا ہو گیا تھا۔ اور پھر یکبارگی اس کے دل کے گھروندے میں چراغاں سا ہونے لگا تھا۔!

وہ سوچنے لگا۔ کیا نیّر اب اس کے ساتھ کھیلا نہ کرے گی؟ دیر تک اسے چین نہ آیا۔ بستر پر پڑا پڑا سوچتا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر نیّر کے پاس پہونچا۔ نیّر برآمدے میں بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی۔ دل ہی دل میں مسکرائی۔

"سنو تو۔ نیّر۔!" وہ ہکلانے لگا۔ "میں۔ یہ۔ یہ۔ پوچھنے آیا تھا کہ۔"

"پوچھیے ۔ !" نیرؔ نے کہا

"میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ ۔ کہ ۔ یہ سوئیٹر تم کس کے لیے بنا رہی ہو ۔ ؟" اپنی بزدلی پر وہ اندر اندر بگڑ اٹھا۔

"پہچانیے ۔ !" اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔

"چچا میاں کے لیے ؟" اس نے پہیلی بوجھ لی۔

"نہ ۔ !" وہ بولی ۔ "ابا ایسے شوخ رنگ کہاں پہنتے ہیں ۔ ؟"

"تو پھر ۔ تمہارا ہوگا ۔ !"

"میرا بھی نہیں ہے ۔"

"ہار گئے بھئی ۔ !" لمبی سی سانس لے کر اس کے پاس ٹک گیا ۔ نیرؔ نے تیکھی ہو کر اسے گھورا۔

"اور کوئی نہیں ہے گھر میں جس کے لیے بنا سکوں ۔ ؟" وہ تو خفا ہو چلی تھی ۔

"ہاں ہاں ۔" اس نے خوش ہو کر سر ہلایا ۔ "شرفو کے لیے ۔ بوا حکیمن کے لیے ۔ یا پھر ۔"

"ارے آپ کو ہو کیا گیا ہے ۔" نیرؔ نے جل کر اس کے گھٹنے پر چٹکی لے لی ۔ "یہ اون آپ اپنے لیے نہیں لائے تھے کیا ۔"

"اوہ ۔ ہو ۔" انجم کے دانت نکل پڑے ۔ "سچ مچ بڑا ہی بھلکڑ ہوں ۔ مگر تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو جلدی جلدی اتنا بہت سارا بنا لیا ۔ یہ تمہاری نازک نازک انگلیاں دکھ ۔ !"

"آپ یہاں سے جائیے !"

"کیوں ۔ !"

"بس ۔ میں کہہ رہی ہوں ۔"

"جو حکم !"

انجم نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا ۔ اس کے گال گلابی ہو چلے تھے ۔ انجم کے دل نے قلابازی سی کھائی ۔ آخر یہ انقلاب کیسا ؟ ۔ وہ ابھی حیران ہی تھا کہ دوران حیرانی میں چچا میاں نے منگنی کر دی ۔ نہ پوچھا نہ پاچھا ۔ نہ کسی کو مدعو کیا بولے تھے :

"ہم خود اپنی ذات سے ایک پوری محفل ہیں ۔ ہماری خوشی سو مہا خوشی ۔ شادی پر سارے شہر کو مدعو کر لیں گے ۔ فی الحال تو ہم ۔ !"

"خالی خولی منگنی ۔" وہ گنگنایا تھا ۔ "اگر چچا میاں نکاح ہی پڑھا دیتے ۔"

"چپ رہیے ۔ !" نیرؔ کا چہرہ مارے شرم کے دہک اٹھا

اتنے دن گزر چکے تھے ۔ بہت اچھے دن تھے وہ ۔

مگر ۔ اب ۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے سوچا یہ تانے بانے بکھر کیسے گئے ۔ ؟ کیا اب وہ اس کی زندگی سے نکل جائے گی ؟ کیا وہ چچا میاں سے کہہ دے گی کہ اسے مردوں سے چڑھ ہے ۔ نفرت ہے ۔ وہ انجم کو اپنا نہ سکے گی ! ۔ ایک حادثے کا اس پر اتنا اثر ہوا ہے ۔ ارے کیا سبھی مرد ایک سے ہوتے ہیں ؟ وہ خود تو سر سے پاؤں تک وفا کا پیکر تھا ۔ ! ۔ مگر نیرؔ کو کیسے سمجھائے گا ۔ !

مرد جاہل ہوتے ہیں ۔ وہ ظلم کرتے ہیں ۔ میں یونہی رہوں گی ۔ مجھے کمی کس چیز کی ہے ۔ وہ کہتی تھی ۔

تب انجم نے بھی بڑے طیش میں جواب دیا تھا :

"میں چچا میاں سے کہوں گا تمہاری شادی وہ کسی بد شکل بونے سے کر دیں ۔ مجھ سا حسین تمہیں ملا ہے تو تم نخرے بگھار رہی ہو ۔ !"

ان کی بے تکی لڑائی کا حال چچا میاں کو معلوم ہو گیا تھا انہوں نے نیرؔ کو بری طرح ڈانٹا اور انجم کو بھی اس طرح پھٹکارا کہ وہ ہکا بکا ہو کر رہ گیا ۔ انجم نے چپ سادھ لی ۔ اب بولنے کو کچھ رہا ہی نہ تھا ۔ وہ اداس ہو گیا ۔ جیسے کرنے کو کچھ کام نہ ہو ۔ بھولا بھٹکا سا ۔

لیکن وہ یہ تو دیکھ نہیں سکتا تھا کہ نیرؔ جیسی شریف بھولی بھالی اور اونچے خاندان کی لڑکی بری راہ چلے ۔ ان دنوں پتہ نہیں کون سی ایک پرانی سہیلی کوٹھی میں آنے لگی تھی ۔ نیر نے بتایا کہ وہ کئی سال لندن میں رہ کے آئی تھی ۔ اور شاید اپنی لندنی مصروفیات سے نیرؔ کو بھی آگاہ کرتی رہتی تھی ! ۔

انجم نے ایک بار نہایت حیرت سے دیکھا تھا کہ اس کی نئی دوست بڑے مزے میں سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھی ۔ سگریٹ اور لڑکی کے لبوں میں ! جس کی بدبو سے نیرؔ کو

ایکائی آتی تھی۔ اب نہیں آتی ایکائی۔ انجم نے سوچا۔ شاید ایک آدھ گھونٹ آب حیات کی بھی کرے میں مل جائے۔! وہ پریشان تھا ایک سہیلی نے خودکشی کر کے نیتر کو بدحواس کر دیا۔ اب یہ محترمہ۔ بیکیا حشر کریں گی نیتر کا۔! آخر چچامیاں اس کی آمدورفت پر پابندی کیوں نہیں لگاتے؟

مگر جب بھی نیتر کی یہ لندن پلٹ سہیلی جیب سے ایک ننھی سی شیشی نکال کے اس کا پیچدار ڈھکنا کھولتی اور ایک چسکی لگا کر سگریٹ سلگا لیتی تو نیتر کے خیالوں میں انجم خوب قہقہے لگاتا۔

"یہ سہیلی تو خوب بد تر نکلی۔ مشرق کی بیٹی شراب سے شوق فرمائے۔ سگریٹ پیئے، کلب میں مردوں کے سینے سے سینہ چپکا کر ناچے گائے تھر کے۔ سب جائز۔ برتری کی نشانیاں۔ پہلے مشرقی لڑکیوں کا کوئی سایہ تک نہ دیکھ سکتا۔ مگر آج۔ تیز رفتار دنیا جانے کس سمت اڑی جا رہی ہے کہ راستے کا اندازہ لگانا محال ہے۔ عورت اپنی آزادی اور برتری کے زعم میں مگن ہے۔ وہ احساس ہی نہیں کر سکتی کہ مشرقی اقدار کو پیچھے چھوڑ کر وہ پستی و نکبت اور بے حیائی کے کون سے پاتال میں پھسلی جا رہی ہے۔!

لیکن نیتر خود کو مطمئن کرتی۔ بھلا کوئی حد ہے خود غرضی کی۔ آپ کلبوں میں جا کر تھرکائیں تو کوئی کچھ نہ کہے۔ آپ ساری ساری رات داد عیش دیتے پھریں تو آپ کی مردانگی سلامت عورت اگر گھر سے باہر ہی جھانک لے تو لے لپک اٹھ جائے اس پر انگلیاں اٹھیں۔ اسے مطعون کیا جائے۔ اب اس فرق کو ختم ہی ہو جانا ہے۔ زمانہ آگے نکل گیا ہے۔ عورت مرد برابر [illegible]

[illegible]

بل کھایا کرو۔ جلا بھنا کرو۔ ہم تمہیں کچھ سمجھتے کب ہیں؟

انجم بدحواس ہو جایا کرتا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ بددماغ چھوکری نیتر کو بھی توڑ دے۔ سکھا پڑھا دے کچھ۔ چچامیاں کی اکلوتی بچی ہے۔ بہکاوے میں آکر وہ بھی نہ بہک جائیں۔ ارے تب تو دنیا ہی قبرستان ہو کر رہ جائے گی۔ بلا سے۔ وہ بھی اسے گوارہ۔ مگر۔ یہ الو کی پٹھی روحی۔ اسے کسی برائی میں نہ ڈال دے جس سے نجات اور چھٹکارہ ممکن نہ ہو۔ تب کیا ہوگا؟ سانپ کی لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔

مصیبت تو یہ تھی کہ وہ چچامیاں سے بھی شکایت نہ کر سکتا کیا سوچتے وہ۔ ابھی سے ہونے والی بیوی پر پابندیاں بٹھا رہا ہے۔ نہیں چاہتا کہ اپنی سہیلی ہی سے میل جول رکھے۔! وہ برا مانتے۔ تنگ دل جاہل گنوار سمجھتے۔

انجم کو گھر پر دیکھ دیکھ کر روحی نے بھی نوٹس لینا شروع کر دیا۔ لیکن بڑی حیران تھی۔ عجیب احمق ہے۔ تنہا مسکراتا تک نہیں۔ جب کہ روحی کی ایک مسکراہٹ پر بڑے بڑے جیوٹ آدمی بتیسی نکال دیتے ہیں۔ مغرور کہیں کا۔ وہ اس کی دشمن بن گئی تھی۔

"ہے کون یہ آدمی؟" اس نے نیتر سے پوچھا۔

"کیوں۔!"

"حد درجہ مغرور اور سنگدل لگتا ہے؟" روحی بولی۔ "مجھے دیکھ کر یوں کراہیت سے منہ پھیر لیتا اس نے جیسے کہیں بڑی گندی چیز ہوں۔ بتاؤ مجھے۔ یہ تمہارا کوئی خاص عزیز نہیں تو میں اسے اپنی توہین کرنے کی سزا دیئے بغیر نہ مانوں گی۔"

کیا سزا دو گی؟" کچھ سوچ کر نیتر ہنس دی۔

"میں اسے سبق سکھا دوں گی۔ عورت کی شکست دراصل [illegible]

[illegible]

کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتا ہو۔ نیر جھلا گئی۔ اچھا ہے سزا جیلے بہت آپے سے باہر ہو رہے ہو تم۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے برآمدے سے گزر گیا۔ انہیں مزید غصہ دلا گیا۔ روحی جل بھن گئی تب اچانک نیر کی ہمسائی ناہید آگئی۔ اور نیر کو آپ ہی آپ مسکراتے دیکھ کر بولی
کیا ہوا۔ جو آپ اکیلے اکیلے ہنس رہی ہیں؟"
"کسی سے اپنی توہین کا بدلہ لینا کتنا روح پرور ہوتا ہے ناہید۔؟"
"لیکن آپ کس سے بدلے رہی ہیں؟" ناہید حیران تھی۔
"انجم سے۔!" نیر اکڑ کر مسکرائی۔
"انجم بھائی سے" ناہید اچھل پڑی۔ "اللہ انہوں نے کیا کیا ہے بھلا۔ ارے اتنے تو اچھے آدمی ہیں وہ۔ آپ کے ہونے والے میاں۔!"
"نہ میاں نہ کچھ" نیر بھنا گئی۔ "وہ اپنے مردپن کے گھمنڈ میں مگن ہیں۔ میں ذرا انہیں جھکانا چاہتی ہوں۔ سمجھیں۔!"
"نیر باجی! ذرا ہوش میں آیئے۔" ناہید تو دنگ تھی "سلمہ کی خودکشی نے دراصل آپ کے اعصاب کو کشیدہ کر دیا ہے۔ اسے دنیا کے سب آدمی ایک سے کب ہوتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ انجم بھائی بھی اسی کے منگیتر کی سے دغاباز ہوں یہ غلط سلط سبق دراصل آپ کو روحی پڑھا رہی ہے۔ آپ اس کی باتوں میں نہ آیئے۔ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے آپ کو تباہ کر کے رہے گی۔!"
"کچھ بھی ہو۔ میں انجم سے متنفر ہو چکی ہوں۔ اب وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔!"
"مگر آپ کی منگنی۔!" ناہید حیران تھی۔
"جہنم میں گئی منگنی۔!"
"نیر باجی! آپ یہ تو سمجھئے کہ آخر عورت اور مرد میں کچھ تو فرق ہے۔ عورت چاہے کتنی ہی طاقت ور ہو جائے مگر مرد [illegible] [illegible]

ہے مگر عورت صرف اسی لیے برتر ہے باجی کہ وہ ایک [illegible] جنتی ہے۔ اور ہاں۔!"
"ناہید۔!" نیر گرج اٹھی۔ "تم ہوتی کون ہو میرے معاملات میں بولنے والی۔!" ناہید یوں سمٹ گئی جیسے اس کے گال پر تھپڑ پڑا ہو۔ وہ حیران تھی۔ اب تک تو نیر اس کی بڑی بہن کی سی محبت کرتی رہی تھیں۔ اب کیا ہوا۔؟
وہ دبی سہمی سی باہر نکلی۔ باہر انجم ملا۔ اس کے ہونٹ لٹکے تھے۔ ناہید کو ہنسی آگئی۔
انجم کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ "تم ہنستی ہو تو مجھے اپنے پرس کی خیریت خطرے میں دکھائی دیتی ہے۔"
"سنئے۔ ادھر آیئے۔" ناہید جھلا گئی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گوشے میں لائی۔
انجم حیران تھا۔
ناہید نے چپکے چپکے اس سے کہہ دیا۔ نیر اور روحی اس سے کسی بات کا بدلہ لیں گی۔
"میں خود روحی سے بدلہ لوں گا۔" انجم بگڑ گیا۔
"عورت سے؟ آپ بدلہ لیں گے۔ کیا یہ آپ کے شایان شان ہے؟"
"میں اب روحی سے شادی کروں گا۔" انجم بدستور خفا تھا
"چھی۔!" ناہید نے کہا۔ "وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔ سینما باز، کلب کی شوقین، سگریٹ پینے والی لڑکی ہے۔!"
"سچ مچ؟"
"ہاں۔!"
"ارے تب تو میرے بھی مزے ہیں۔ میں اسی کے لائے ہوئے سگریٹ پیا کروں گا۔ مجھے خریدنے نہ پڑیں گے!" انجم اطمینان سے بولا۔
"وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔ کیسے آپ" ناہید نے اس کا ہاتھ جھنجھوڑ ڈالا۔ "آپ اناپ شناپ مت بکئے۔ ذرا ہوش میں آیئے۔"
"[illegible] [illegible]" انجم بولا۔ "[illegible] [illegible]"

یونہی بڈھا ہو جاؤں گا۔ میرے ارمانوں بھرے دن اور مرادوں بھری راتیں ــ !"

"خاموش ہو جائیے انجم بھائی، آپ بہت بے تکی ہانکنے لگے ہیں۔" ناہید شرمائی بھی بگڑ بھی گئی۔ آپ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے جائیے۔ تاکہ روحی بھی یہاں سے دفعان ہو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ جلد ہی کہیں جانے والی ہے۔" ناہید نے مشورہ دیا۔

"ارے واہ۔!" انجم بکھر گیا: "میں کیوں کہیں جانے لگا۔ یہ میرے سسر کا گھر ہے۔ مجھے یہاں سے تمہارا باپ ــ معاف کرنا۔ مجھے یہاں سے روحی کا باپ بھی نہیں نکال سکتا، سمجھیں۔ کیا میں ایک سفید چوہیا کے ڈر سے یہاں وہاں بھاگتا پھروں گا۔ تم تو بس تماشہ دیکھو۔ مگر یہ کیا۔ آج دادی اماں کیوں بن گئی ہو۔ ہمیشہ میرا پرس چھینا کرتی تھیں۔ آج فضول ٹائیں ٹائیں لگا رکھی ہے۔ ایک ہاتھ منہ پر تول دوں گا۔ چپٹی ہو کر رہ جاؤ گی۔ یوں تو پہلے ہی سے تمہاری ناک چپٹی ہے۔!"

"یہ کیا لفنگوں کی سی بولی آپ سیکھ آئے ہیں۔ منہ پر ہاتھ تول دوں گا۔ کسی اور سے بھی آپ کہہ رہے تھے۔ منہ پر ہاتھ تول دوں گا۔" ناہید چیخی۔ "کیا اچھا لگتا ہے۔ اس طرح کہتے !"

انجم نے قہقہہ لگایا۔ "مطلب یہ کہ کس کے ایک ہاتھ رکھوں گا گال پر ــ !" اپنی لاابالی میں انجم نیّر اور روحی کو بھول ہی گیا تھا کہ اچانک ایک دن صبح صبح چچا میاں نے اسے بلا بھیجا۔ وہ اندر گیا۔ اور ٹھٹھک گیا۔ کمرے میں نیّر بھی تھی اور روحی بھی۔ لیکن روحی کا حلیہ ایسا تھا جیسے کہ کسی حیوان نے اسے نوچا کھسوٹا ہو۔ وہ سر جھکائے رو رہی تھی۔!

"یہ کیا ہے؟" چچا میاں نے روحی کی طرف اشارہ کر کے سرد لہجے میں کہا۔ "کمینے بدمعاش۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے تیری پرورش کی تھی؟ مار آستین۔ تو نے گھر ہی کی بچی کو ڈس لیا۔ اب کیا سزا دوں میں تجھے؟۔"

"بول ناخلف۔ پھانسی پر لٹکا دوں تجھے۔" چچا میاں دھاڑے۔

"مم۔ میں نے۔ کک۔ کیا کیا۔" اس کی تو آواز ہی نہ نکلی۔

"نکل جا۔ میرے گھر سے۔ پاجی۔ ذلیل۔ کمینے۔ میں تجھے گولی مار دوں گا۔" چچا میاں کا پارہ آسمان پر تھا۔ چہرہ سرخ مارے غصے کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔

"چچا میاں۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔" وہ حیرت سے ایک ایک کو تک رہا تھا۔!

"پاجی۔ لفنگے۔ کمینے۔ انجان بن رہا ہے۔" چچا میاں کے گھن گرج سے کمرہ گونج گیا۔ اور اچانک انجم کے ذہن میں بجلیاں کوند گئیں۔

اچھا تو یہ ہے اس سے انتقام ــ !

اس نے پر نفرت نظر روحی پر ڈالی۔ اور بولا: "اچھی بات ہے۔ اب میری سزا یہی ہے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی تم سے شادی کر لوں۔!"

"شادی ــ !" چچا میاں نے دم بخود ہو کر کہا۔ پھر بولے: "مگر۔ انجم۔ میں نے تجھے ایسا نہیں سمجھا تھا بیٹا۔!" وہ یہ کہتے کہتے رو پڑے۔

ان کے آنسوؤں نے انجم کو خونخوار بنا دیا۔ وہ یکبارگی آگ ہو گیا۔ اور بولا:

"روحی! میں نے تمہیں تباہ نہیں کیا۔ مگر اب تمہاری زندگی برباد کر دوں گا۔ افسوس تم ایک احمقانہ انتقام کے جنون میں اس قدر آگے بڑھ گئیں کہ تم نے اپنے بزرگ کا بھی خیال نہ کیا۔ تم ذرا بھی نہ شرمائیں۔ تم کو تو ڈوب مرنا چاہیے تھا مگر تم۔ تم تو بہتر ہونا۔ نیّر نے بھی تمہیں یہی سبق پڑھایا ہے۔ اب اپنی برتری کے ثبوت میں ایک کام کرو۔ اگر تم مسلمان ہو اور اتنی ہی سچی ہو تو اٹھو اور اس کلام پاک کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لو۔ میں اپنا گناہ قبول کر لوں گا۔ اٹھاؤ قرآن مجید! نیّر! تم ہی اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دو۔"

"نیّر ــ !" روحی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

نیر دم بخود تھی۔ ایک رنگ اس کے چہرے پر آ رہا تھا ایک جا رہا تھا!

"ردحی۔ میری بہن۔!" انجم اچانک نرم آواز میں بولا۔ بھول جاؤ کہ یہ ناپاک ڈرامہ تم نے کیا تھا۔ تم مشرق کی بیٹی ہو۔! اس راہ سے ہٹ جاؤ جس پر تم اب تک چلتی رہی ہو یہ راہ تمھیں پاتال میں گرا دے گی۔ میری بتائی ہوئی راہ پہ چلو۔ میں تمھیں سہارا دوں گا۔ ایک بڑے بھائی کی طرح ردحی! کیا تم اپنی کھوکھلی بے جان زندگی سے مطمئن ہو۔؟"

"نہیں۔!" اچانک ردحی سسک اٹھی۔

"انجم۔!" چچا میاں کی آواز سنائی دی۔ "یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ تم لوگ کچھ دیوانے ہو گئے ہو۔؟ نیر۔؟ یہ سب کیا ہے۔؟"

"ابا۔!" وہ سسکی۔ مارے ڈر کے وہ کانپ رہی تھی

"یہ سب ریہرسل ہے چچا میاں۔" انجم ہنسنے لگا۔ "ردحی اور نیر کے کالج میں ایک ڈرامہ اسٹیج ہو رہا ہے۔ میں بھی تو کام کر رہا ہوں اس میں۔ آج ہم نے سوچا کہ اس ایکٹ کو آپ کے سامنے کریں۔ اور اندازہ کریں کہ نقل مطابق اصل ہے کہ نہیں۔ پتہ چلا کہ بالکل اصل ہے۔ آپ تک نہ پہچان سکے۔ ہاہاہا۔!"

نیر کمرے سے نکل بھاگی۔

چچا میاں نے اطمینان کی سانس لی مسکرائے۔ اور ایک گھونسا انجم کی پیٹھ پر لگا کے بولے:

"نالائق۔ تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی۔ یاد رکھنا آئندہ یہ ڈرامے میرے سامنے کئے تو ڈنڈے کی زبان سے داد دوں گا۔!"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں" انجم نے زور زور سے سر ہلایا۔

جب وہ بھی کمرے سے گئے تب ردحی کپکپاتی آواز میں بولی "میں آپ سے بیحد شرمندہ ہوں۔"

"خدا آپ کو راہ راست دکھائے۔!" اس نے بزرگوں کی طرح دعا دی۔

[illegible] ناہید کی بھائی [illegible]

"انجم بھائی۔ آج آپ نے کیا گل کھلایا ہے۔ نیر باجی کیوں رو رہی ہیں۔؟"

"ارے۔ تم تو اور میری زندگی اجیرن کرتی ہو۔" وہ چیخا۔ "آگئیں منکر نکیر کی طرح سوال و جواب کرنے۔ تمہاری نیر باجی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ۔ اگر آپ نے عورتوں کی مانند ماں بن کر مجھے دکھا دیا تو میں آپ کو اس صدی کا سپر ڈی میکسی منگیتر تسلیم کر لوں گی۔ میں نے مجبوری ظاہر کی کہ میں انشاءاللہ بلکہ ماشاءاللہ باپ تو بن سکتا ہوں۔ مگر ماں بننا میرے بس سے باہر ہے۔ بس نیر باجی کا دل ٹوٹ گیا۔ اور جب کسی دریا کا بند ٹوٹتا ہے تو سیلاب تو آتا ہی ہے۔"

"کبھی تو ڈھنگ کی بات کیا کیجئے آپ۔" ناہید کو غصہ آگیا

"ناہید! آج میں اس گھر سے جا رہا ہوں۔" اس نے بڑی لمبی آہ سرد بھری۔ "نجانے کہاں جاؤں گا۔ افق کے پار یا اس سے بھی اور پار۔ لڑ پڑو جس قدر لڑ سکتی ہو۔ آج میرا پرس بھی بالکل خالی ہے۔!" اس نے فلمی ہیرو کا سا موڈ بنایا

"پرس۔ پرس۔ کیا آپ نے میری چڑھ مقرر کی ہے۔ پرس میں آگ لگے۔ اب میں اپنا سر پیٹ لوں گی۔" ناہید جھلا گئی۔

"پرس سے پیٹنا۔ اسفنج کا ہے۔ چوٹ کم لگے گی۔" انجم نے مشورہ دیا۔ اور غصے کی زیادتی کے مارے ناہید کمرے سے باہر نکل گئی۔

"نیر۔!" تم بھی مجھے خدا حافظ کہہ دو۔" وہ بہت دنوں بعد نیر سے مخاطب ہوا تھا۔ نیر کا شرم و خوف سے برا حال تھا۔ کیا پتہ تھا کہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔

"مجھے۔ مجھے۔!" وہ ہکلا کر رہ گئی

"معافی مانگو گی تو تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔" وہ غرّایا۔ "ہم تم دونوں برابر ہیں۔ اللہ میاں کا بنایا ہوا لباس۔ تم مجھ میں مکمل ہو اور۔ تن تو دونوں سے ڈھکتے ہیں۔ تم محمل جیں کر خوش ہو جاؤ۔ بے وقوف کہیں کی۔!"

"میں آپ سے کیسے نظریں چار کر دوں گی۔" نیر کے دم خم رخصت ہو گئے۔

"نظریں چار کرو گی مجھ سے [illegible] اپنے منگیتر سے۔ [illegible]

لگے گی تمھیں۔" وہ بگڑ گیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں۔!" نیر رو پڑی۔

"ہائیں۔ پھر رلا دیا نیر باجی کو۔" ناہید کمرے میں آئی

"یا خدا کتنے جنگلی ہیں آپ انجم بھائی۔!"

وہ غصیلی آواز میں انجم کو گھورنے لگی۔ انجم نے بوکھلا کر جیب سے اپنا پرس نکالا اور ناہید کی طرف اچھال دیا جیسے رشوت دے رہا ہو۔!

ہزار ضبط کے باوجود نیر کو ہنسی آ گئی!!!

حریمی دسترخوان

کٹھل پلاؤ

کٹھل پلاؤ اگر قاعدے سے پکایا جائے تو نہ صرف دیکھنے میں بلکہ کھانے میں بھی گوشت پلاؤ ہی جیسا لذیذ ہوتا ہے ویجی ٹیرین کھانے والوں کے لئے گوشت پلاؤ کا صحیح بدل ہوتا ہے۔

سامان۔ پلاؤ والے پرانے چاول آدھا کلو کٹھل چھیلنے کے بعد ۵۰۰ گرام یا ایک کلو تیز پتہ ۱۰۔ لونگ، الائچی بڑی دس دس۔ پیاز بڑی ایک آنڈی۔ چھوٹی ہو تو دو۔ ادرک ۱۰۰ گرام۔ نمک حسب ضرورت۔ گھی ۲۵۰ گرام۔ دہی ۱۰۰ گرام، عرق کیوڑہ ۵۰ گرام جہاز مارکہ رنگ چاول کا نصف چمچہ۔

ترکیب۔ کٹھل کے ڈیڑھ دو انچ چوڑے اور لمبے ٹکڑے کر کے دھولیں۔ چاول چن کر پانی میں بھگو دیں۔ ایک گھنٹہ انھیں بھیگنے دیں۔ پیاز پیس لیں۔

کٹھل کے ٹکڑوں کو گھی میں تلیں، لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ سرخ ہو جائیں۔ اس کے بعد لونگ اور الائچی پانچ اور تیز پتے پانچ ڈال دیں۔ تھوڑا نمک، دہی اور پسی ہوئی پیاز ملا کر ٹکڑوں کو کچھ دیر پھر بھونیں۔ اس کے بعد اندازے سے پانی ڈال کر اتنا پکائیں کہ کٹھل اچھی طرح گل جائیں۔ پانی زیادہ نہ رہنے پائے بس مسالہ گاڑھا رہ جائے۔ اگر ٹکڑے اچھی طرح نہ گلیں تو پانی تھوڑا اور ڈال کر پکائیں۔

دوسری پتیلی میں ایک لٹر پانی میں تھوڑا نمک ۵ تیز پتے پانچ لونگ بڑی الائچی ڈال دیں اور بھیگے ہوئے چاولوں کو پکا کر ڈالیں۔ کچھ دیر پکائیں۔ جب تین کنی کے ہو جائیں تو اتار کر چھان لیں اور کسی بڑے بھگونے یا پتیلی میں نصف چاول پھیلا کر کٹھل کے ٹکڑوں کو مع مسالے کے ان پر پھیلا کر باقی چاول ڈال کر کٹھل کے ٹکڑوں کو بند کر دیں۔

عرق کیوڑہ میں رنگ گھول کر نصف حصہ چاول پر چھڑک دیں۔ پتیلی کے سرپوش کو سخت گندھے آٹے سے بند کر دیں تاکہ بھاپ نہ نکل سکے۔

دو اینٹوں کے درمیان انگارے رکھ کر پتیلی کو ان پر رکھ دیں۔

سرپوش کے اوپر بھی انگارے رکھ دیں اور دم ہونے دیں۔ پندرہ منٹ منٹ بعد کھول کر چاول ہاتھ میں لے کر مسلیں۔ اگر گل گئے ہوں تو ٹھیک ورنہ دودھ کا چھینٹا دے کر پھر انگاروں پر رکھیں۔

پلاؤ نکالتے وقت چاولوں کو اس طرح ملائیں کہ رنگ دار اور سادے چاول مل جائیں

(مس وزیر النسا ناہید۔ لکھنؤ)

لگے ہاتھوں ایک اور ٹیچر کا قصہ سنتے چلیے۔ یہ دیہات میں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ لگ بھگ ساٹھ برس کے تھے ریٹائر ہونے میں چند ہی مہینے باقی تھے مگر کام پوری نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا بڑی محبت سے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔

یہ کلاس میں پڑھانے کے بعد باقی وقت میں لڑکوں کو وعظ و نصیحت کرتے سب لڑکے ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی بات غور سے سنتے ایک دن انھوں نے کہا ہمیں دوسروں کی مدد کرنی چاہیے یہ سن کر ایک چھوٹا لڑکا بولا تو پھر ماسٹر صاحب۔ دوسرے کیا کریں گے۔ لڑکے کی بات سن کر سب کے ساتھ ماسٹر صاحب بھی ہنس پڑے۔

سچ مچ

اقبال بانو

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کہ تم لوگ لڑکی پسند کرنے نہیں بلکہ خود کو پسند کروانے جا رہی ہو۔" جاوید نے ان سب کو کپل کانٹوں سے لیس دیکھ کر شوخی سے کہا۔

"ہم نہیں جائیں گے اگر آپ نے ایسی باتیں کیں۔" مدیحہ تنک کر بولی۔

"اور کیا ـــــ پھر آپ سچ مچ کنوارے ہی رہ جائیں گے۔"

امبر نے کہا تو جاوید زور سے ہنس دیا۔

"امبر رانی! آج تمہارا جملہ سچ مچ بالکل صحیح موقع پر ادا ہوا ہے۔"

امبر بری طرح جھینپ گئی۔ کیونکہ ہر بات میں وہ "سچ مچ" کا ٹکڑا ضرور لگا دیتی تھی۔ شاید یہ اس کا تکیہ کلام ہے۔

"ویسے تم سب ہی نہ جاؤ تو بہتر ہے۔" جاوید نے شرارت سے کہا۔

"کیوں؟" سب کورس میں بولیں۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔ تم پانچ، پھر دادی اماں، نانی جان اور امی جان کل آٹھ افراد ہوئے۔" اس نے سب کو انگلیوں پر شمار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہو رہی ہے؟" عائشہ نے ناگواری سے پوچھا

"ابھی تو سسرال بنی بھی نہیں اور سچ مچ طرف داری کرنے لگے۔" امبر نے ٹکڑا لگایا۔

"بھئی تو یہ کہہ رہا ہوں کہ پتہ نہیں بے چارے سسرالی ہیں یا نہیں اور تم سب کھا پی کر آ جاؤ۔ تم سب کو جی جان سے کوسیں گے۔"

جاوید کو انہیں چھیڑنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"جی نہیں۔ اس مرتبہ ہم سب کو لڑکی پسند آ جائے گی۔" عائشہ وثوق سے بولی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے سہرے کے پھول کھل جائیں

گے سچ مچ۔ کیوں امبر؟" اس نے شریر نظروں سے امبر کی طرف دیکھا

"آپ میری نقل نہ کیا کریں ورنہ سچ . . ." امبر نے جلدی سے ہاتھ منہ پر رکھ لیا اور جاوید ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔

جاوید ایک سال قبل ہی ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کر کے انگلینڈ سے لوٹا تھا۔ اور بڑی کامیابی سے اپنا کلینک چلا رہا تھا۔

زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ دادی اماں کو اس کی شادی کی جلدی پڑ گئی۔ زندگی میں ہل چل مچ گئی۔ گزشتہ چار ماہ سے اس کے لیے بڑی شد و مد سے لڑکی تلاش کی جا رہی تھی

مگر گھر کے ہر فرد کی پسند الگ تھی۔ بزرگ خواتین کو ہر لڑکی ہی جاوید کا جوڑ لگتی۔ مگر لڑکیاں کوئی نہ کوئی خامی نکال لیتیں اور اس طرح خوب دعوتیں اڑا کر آنے کے بعد وہ لڑکی "ری جیکٹ" کر دی جاتی اور پھر نئے سرے سے تلاش شروع ہو جاتی۔ جاوید ہنستا رہتا۔

جاوید تین بہنوں کا بڑا اور اکلوتا بھائی تھا۔ مدیحہ، عائشہ اور رابعہ اس کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ امبر اور عبیر اس کے تایا کی بیٹیاں تھیں تایا کے تین بیٹے تھے شوکت، طالب اور شعیب۔ رخشندہ، ثمین اور عباس جاوید کی پھوپھی کے بچے تھے۔ گھر قریب قریب تھے۔ اس لیے سب ہی جاوید کے گھر گھسے رہتے۔ اور جب سے جاوید کے رشتے کی بات چلی تھی تب سے تو لڑکیوں کو تو خوب موقع مل گیا تھا۔ جاوید گھر میں سب سے بڑا لڑکا تھا پہلے اسی کی شادی ہونی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ دادی اماں کی خواہش تھی۔ امبر، عبیر اور رخشندہ کو بھی وہ بھائیوں ہی کی طرح عزیز تھا اس لیے جب بھی کہیں جانا ہوتا وہ ضرور جاتیں۔

"ہائے جیدی بھائی ہم نے بہت پیاری لڑکی دیکھی ہے آج۔"

عائشہ نے بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" جاوید نے مصنوعی غصہ سے کہا

"بس میں بھی نہیں بتاتی۔" وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی

"ارے نہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بتاؤ کیسی ہے؟" جاوید نے بہن کا رُخ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا

اور تب ہی وہ سب اس کے کمرے میں آ موجود ہوئے۔ سب جاوید کو تفصیل بتانے لگیں ہر ایک کے بعد ایک لڑکی کی خوبیاں بیان کرنے لگی۔ "سچ اس کی آنکھیں تو یوں لگتی ہیں جیسے کہ کانچ کی بنی ہوں سچ مچ"

اس خوشی نو خوشی بتا رہی تھی۔

"مگر میری شرط کا علم ہے نا؟" جاوید نے کہا تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"بھائی آپ یہ شرط ہٹا دیں۔" مدیحہ لجاجت سے بولی

"نہیں بھئی یہی سب سے اہم شرط ہے۔" جاوید نے اٹل کر کہا۔

"آپ کو بیوی چاہئے یا ناگن جو کہ لمبے بالوں کی شرط لگا رکھی ہے" رخشندہ منہ بنا کر بولی۔

"چاہئے تو بیوی ہی مگر ناگن ہو تو پھر کچھ مزا آجائے۔" جاوید نے شرارت سے کہا جس پر امبر نے اسے گھور کر دیکھا

"پلیز بھائی ہماری پسند کو اپنا لیں نا؟"

"لڑکی کیسی بھی ہو۔" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر اس کے بال لمبے ہونے چاہئیں بس۔"

"ایک تو کم بخت لڑکیاں آج کل مارے فیشن کے مری جا رہی ہیں اور بال کٹوا دیتی ہیں۔ جن کے بال لمبے ہیں۔ تو شکل واجبی سی۔ اب ہم کیا کریں؟" عنبر نے سر پر ہاتھ مار کر بڑی پریشانی سے کہا تو جاوید ہنس دیا۔

"آپ وہیں شادی کر آتے تو اچھا تھا۔" عائشہ نے کہا۔

"تم ہی لوگ تو لکھتی تھیں کہ کوئی انگریزن بھابی نہیں بن سکتی یہاں ایک سے آفتاب جیسے ماہتاب لڑکیاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ اب وہ سب کہاں گئیں؟"

"ہمیں تو اب پتہ چلا کہ دنیا کا مشکل ترین کام لڑکی تلاش کرنا ہے۔" عائشہ بولی۔

"بس چپ۔" امبر نے کہتے کہتے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس سنجیدہ سی پوزیشن پر بھی سب ہنس دیئے۔

جاوید جب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جا رہا تھا تو جیسے کیسے امی اور دادی اماں نے اس سے وعدہ لیا تھا۔

"بیٹا! خاندان کی عزت کو بٹہ نہ لگنے دینا۔"

"اپنے خون میں غیر مذہب کے خون کی آمیزش میں مر کر بھی قبول نہ کروں گی۔"

جاوید خاندان کا پہلا لڑکا تھا جو کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گیا تھا۔ اور پھر واقعی اس نے اپنی تعلیم سے خوب دلچسپی لی تھی۔ وہاں کے حسن میں بھی اسے کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ البتہ اس کی ایک کلاس فیلو جوزفین تھی جس کی آنکھیں کانچ کے مانند بلوریں تھیں اس کے بال سنہرے اور ایسے دلکش تھے کہ نظر پڑتے ہی جاوید کی نظریں الجھ جاتیں لیکن فوراً ہی ماں اور دادی کی نصیحتیں اسے یاد آجاتیں۔

وہ اپنے بزرگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنے دل کے ٹکڑے کرنا منظور تھا۔ بہنیں کتنا ارمان رکھتی تھیں کہ اپنے بھائی کا سہرا دیکھیں۔ اس سے لڑ لڑ کر نیگ وصول کریں۔ اپنے ہاتھوں بھابی بیاہ کر لائیں۔

وہ اپنے دل کے ٹکڑے جوڑنے کی خاطر اتنے دلوں کو نہ توڑ سکتا تھا۔

مدیحہ کے خطوط سے اسے پتہ چلتا تھا کہ وہ سب کس طرح اس کی شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ ہر خط میں پوری تفصیل لکھتی اور آخر میں ایک جملہ ضرور لکھ دیتی۔

"بھائی ابھی تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔"

وہ بہت ہنسا کرتا۔ مدیحہ کا خط بار بار پڑھتا۔ اور خوب لطف اندوز ہوتا۔

صرف جوزفین ہی سے اسے دلچسپی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی اظہارِ عشق نہ کیا تھا۔ البتہ ایک بار اس کا دل چاہا کہ وہ اس سے پوچھے:

"فینی! تم میرے ساتھ پاکستان چلو گی؟"

مگر وہ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ اسے علم تھا کہ اگر وہ اسے لے گیا تو ایک ہی بات ہو سکتی ہے کہ وہ اسے اپنا لے۔

مگر وہ یہ رشتہ جوڑنے والا کون تھا۔ ابھی تو اس کے بزرگ سلامت تھے اور اس نے بہت پہلے ہی بزرگوں کو وعدہ دیا تھا۔

کتنی حیرت کی بات تھی کہ پانچ سال تک وہ مختلف کالجوں لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا رہا تھا۔ مگر کبھی کسی کا خیال ذہن میں نہ آیا تھا۔ البتہ جوزفین کا تصور اکثر اسے ستانے لگتا تھا۔ لیکن وہ جوزفین کو اپنی بے قراری سے لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔

اور جب تعلیم مکمل ہونے کے بعد جاوید وطن واپس آنے لگا

اور صرف جوزفین ہی تھی جو جھروٹ واٹر پارٹ پر ہاتھوں کے کٹورے میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو دی تھی۔

"مت رو جوزفین!" جاوید نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اور میں بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا، لیکن محبت کا یہی مطلب نہیں ہوتا کہ شادی ہی کر لی جائے۔ بہن بھائی سے کیا ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ تم میری بہن ہی ہو۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ تنہا تمہارے لیے میں اپنے والدین، بہنوں اور سارے خاندان والوں کو دکھ نہیں پہونچا سکتا۔ جنھوں نے مجھے خاک سے پاک کیا۔ ان کا دل توڑ دوں۔ یہ شرافت کے خلاف ہے۔"

جوزفین اپنی آنسو بھری آنکھوں سے جاوید کو دیکھتی رہی اس لیے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ کہ جہاز کی روانگی کا اعلان ہو گیا۔ جاوید نے اس کے لمبے سنہرے بالوں کو پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

وطن آکر بھی اپنے لوگوں کے بیچ وہ کاسنی سنہری بالوں اور کانچ جیسی آنکھوں والی جوزفین کو نہ بھول سکا۔ جب بھی تنہا ہوتا تو جھم سے خیالوں میں وہی آجاتی۔ اور گھنٹوں وہ آنکھیں بند کیے اس کے تصور میں خود کو بہلاتا رہتا۔ وہ چونکا تو اس وقت جب اسے پتہ چلا کہ اس کے لیے زور شور سے لڑکی تلاش کی جا رہی ہے۔ ماں اور دادی اماں اس کی سعادت مندی پر بہت خوش تھیں کہ اس نے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہونچائی تھی مگر یہ پتہ نہیں تھا۔ کہ وہ دل کو ایسی ٹھیس لگا بیٹھا ہے — کہ جس کا علاج کسی بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔

اس نے تو ابھی سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ مگر انکار کی کوئی بھی وجہ سمجھ میں نہ آرہی تھی کیونکہ تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ سروس بھی اور اپنی کلینک بھی۔ اب کیا رہ گیا تھا؟ اور پھر ماں کی طرح امی کی خواہش تھی کہ وہ بیٹے کے سر پر سہرا باندھیں۔ دادی اماں جلد سے جلد پردادی بننے کے شوق میں [illegible] کر رہی تھیں۔

[illegible] جاوید نے شرط رکھ دی کہ اس کی شریک حیات کے بال بالکل جوزفین کی طرح ہوں۔ یعنی لامبے وہ جوزفین کا نام تو نہ لے سکا تھا۔ مگر خواہش تو یہی تھی۔

کتنی خواہش تھی اسے کہ جوزفین کے بالوں میں منہ چھپا کر اس کی مہک اپنے اندر اتار لے۔ اور اب اس کا خیال تھا کہ اس کی جو بھی شریک حیات ہو اس میں ذرا سی تو جوزفین کی شبیہ ہو جس کی قربت نے اس کے پتھر دل کو دھڑکنا سکھا دیا۔ بلاشبہ وہ جاوید کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ اور وہ اتنا بزدل تھا کہ اس بات کا اعتراف اکیلے میں خود سے بارہا کر چکا تھا۔ مگر کسی اور۔ خصوصاً جوزفین کے سامنے کبھی نہ کر سکا۔ حق کرآتے ہوئے بھی نہیں۔

موسم بہار کی بڑی گلابی سی خوب صورت شام تھی اور چھٹی ہونے کی وجہ سے جاوید کلینک نہ گیا تھا بلکہ چھٹی کا دن اس نے اپنے دوست علی رضا کے ساتھ گزارا تھا۔ اور جب وہ شام کو لوٹا تو وہ سب لان ہی میں سبز گھاس پر سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ اور جاوید کو علم تھا کہ موضوع بحث وہی ہے۔

اس کے سنجیدہ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھائی آگئے۔" عنبر نے اسے دیکھا تو حسب معمول چیخی۔

"پتہ ہے۔ نظر آرہے ہیں۔" مدیحہ جل کر بولی۔

جاوید گاڑی لاک کر کے ان ہی کی طرف آگیا۔

"کیوں امبر جی مجھے دیکھتے ہی سانپ سونگھ گیا۔ سچی مچی۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ننھی منی امبر کو چھیڑا۔

"مجھ سے بات نہ کریں سچی مچی۔" وہ غصے سے پھنکاری اور جاوید نے بڑی مشکل سے حلق سے ابلنے والے قہقہے کو ضبط کیا۔

"اب ہم نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" مدیحہ نے بات شروع کی۔

"کیسا فیصلہ؟" جاوید کی آنکھوں سے شرارت جھانک رہی تھی۔

"اب ہم سب بسوں میں سفر کریں گے۔" درخشندہ جلدی سے بولی۔

"مگر کیوں؟" جاوید نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کی دلہن ڈھونڈ سکیں۔" عنبر نے کہا۔

"اچھا تو نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے۔"

"ہاں اسکول کالج کی لڑکیاں بسوں ہی میں سفر کرتی ہیں کوئی بھی اچھی صورت نظر آئی اور آپ کا کام سچ مچ بنا۔" امبر جوش میں بولی۔

"تم کتنی اچھی ہو بھئی بگی بچی۔" جاوید نے امبر کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"دیکھئے آپ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ میرے منہ مت لگا کریں۔" امبر تپتے سے ایک دم اکھڑ گئی۔

"بھئی امبر مجھے چائے پلاؤ تو ایک مزے دار نیوز۔"

"نیوز۔" اس کی بات کاٹ کر سب چیخیں۔

"ہاں ہاں۔"

"پہلے بتائیں۔"

"نہیں پہلے چائے۔" جاوید نے ضدی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں بنا کر لاتی ہوں۔ مگر میرے آنے سے پہلے مت بتائیے گا۔" امبر اٹھتے ہوئے بولی۔

"بالکل نہیں۔" جاوید نے وعدہ کیا۔ اور وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔

اور ۔۔۔ اور جاوید تو اسے بس جاتا دیکھتا رہا۔

پشت پر جھولتی ہوئی سیاہ موٹی سی ناگن ۔۔۔ جس نے جاوید کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"میری پسند!" اس نے سوچا

"یہ ۔۔۔ یہ تو گھر میں موجود ہے۔ پھر سب باہر کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس کے دل کے آنگن میں جھماکا ہوا۔ اسے یوں بھی امبر اچھی لگتی تھی۔ معصوم سی بھولی بھالی امبر۔ جو اس کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی ہوتا۔ ہر بات منہ پر کہہ دینے والی۔ صاف دل امبر ایک دم ہی اس کے دل میں جگہ پانے لگی۔

وہ جگہ جہاں جوزفین کا بسیرا تھا۔ اب امبر بھی وہیں داخل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ مرد کا دل ایسی بارہ دری ہے جس کے بارہ دروازے ہیں۔ اور اس میں ہر لمحے چہرے آتے جاتے رہتے ہیں پرانی محبتیں بھی اس میں پڑی رہتی ہیں اور نئی محبتوں کے لیے بھی جگہ نکلتی رہتی ہے اور شاید اب یہی حال جاوید کے دل کا بھی ہو گیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی امبر آ گئی۔

ملازمہ چائے کے برتن اٹھائے ہوئے تھی اور امبر کے ہاتھ میں نمکو اور چپس کے پیکٹ تھے۔

"وہ خوش خبری سنائی تو نہیں نا۔؟" امبر نے آتے ہی پوچھا

"تمہارے بغیر بھلا سنا سکتا تھا۔؟" جاوید کا لہجہ ایک دم ہی گمبھیر ہو گیا۔

"یہ تو مجھے علم ہی ہے۔ میں ہوں ایسی ہی۔" وہ گھٹنے ٹیک کر گھاس پر بیٹھی اور چائے بنانے لگی۔

"سچ مچ۔" جاوید شوخی سے بولا۔

"اب لڑو مت۔ خوش خبری سننے دو۔" عائشہ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں بتائیں۔" رخشندہ بولی

"چائے تو پی لیں۔"

"پلیز بھائی۔" مدیحہ منمنائی تو جاوید کو ان سب پر ترس آ گیا۔ "بھئی تمہیں اب میرے لیے شریک حیات ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔" جاوید نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا۔؟" سب کی تحیر آمیز آواز بلند ہوئی۔

"میں نے کوئی لاطینی زبان میں بات نہیں کی۔" جاوید نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"کون ہے وہ؟" اب باقاعدہ سوالات شروع ہو گئے

"ایک لڑکی ہے۔"

"کیسی ہے؟"

"تم سب کو پسند آئے گی۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"یہیں۔"

"نام کیا ہے؟" امبر نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا

"بتا دوں گا۔ تم لوگ تو تلاش کر کر کے ہار گئیں اور دیکھو میں نے ایک نظر ہی میں تلاش کر لی۔"

"پہلے سے نظر میں ہو گی۔"

"غلط۔ بس ایک دم ہی نظر پڑی اور اچھی لگی۔"

"تو ہمیں لے چلو نا؟" مدیحہ نے کہا۔

"اب تم لوگوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ بہت اڑا لی جائے اور ناشتہ سمجھیں۔"

اور پھر دادی اماں کے آنے سے بات ادھوری ہی رہ گئی رات کو جاوید نے مزید کچھ سوچے بغیر ابا جان اور امی جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"واقعی خدیجہ لڑکی تو گھر ہی میں تھی اور تم لوگ باہر بھاگتی رہیں۔" اباجی نے نہایت شگفتہ لہجہ میں کہا۔

"میں کل ہی بھابھی سے بات کر دوں گی۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ تائی جی انکار نہیں کریں گی۔" جاوید وثوق سے بولا

"اور کیا انہیں تم جیسا داماد بھلا مل بھی سکتا ہے؟" امی جی تو نثار ہو گئیں

"مگر امی جی میری بھی ایک شرط ہے۔"

"لو اب پھر شرط۔" امی جی چہک کر بولیں۔

معمولی سی بات ہے اور وہ یہ کہ ابر کو پتہ نہ چلے۔" جاوید کے خمیدہ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تو اباجی ہنستے ہوئے بولے

"بھئی سمجھا کرو خدیجہ تمہارا بیٹا خود اسے بتانا چاہتا ہے۔"

"جی اباجی!" جاوید نے سر جھکا کر کہا۔ تو خدیجہ بیگم بھی ہنس دیں۔

ادھر لڑکیوں کی توم سخت بے چین تھی کہ کسی طرح جاوید کی پسند کا پتہ چل جائے۔ پھر طے یہ پایا کہ اس کے کمرے کی تلاشی لی جائے تاکہ کچھ تو سراغ ملے۔ اور اس مقصد کے لیے دوسرے روز کوئی کالج نہ گئی۔ جاوید کے ہوسپٹل جاتے ہی چند لمحے بعد ہی اس کا کمرہ الٹ پلٹ دیا گیا۔ بیڈ کور کے نیچے، تکئے، اسٹڈی ٹیبل، الماری، صوفے کے کشن تک دیکھ ڈالے مگر کچھ بھی نہ ملا۔ ذرا سی روشنی کی کرن بھی نظر نہ آئی کہ راستہ دکھائی دیتا۔

"اب سمیٹو سب کچھ۔" عائشہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا

سچ پوچھو ہم بہت بے وقوف ہیں۔" ابر نے کہا

سچ کہا تم نے۔ بھلا ایسی چیز وہ یہاں رکھتا۔ قطعی نہیں رخشندہ بولی۔

"پہلے یہ بکواس کرنا تھی اب بول رہی ہو۔" عبیر تڑخ کر بولی

"ایک آئیڈیا آیا ہے ذہن میں۔" مدیحہ چٹکی بجا کر بولی

"بولو — بولو۔" سب اس کے قریب تر ہو گئیں

"آج جب جاوید بھائی ہوسپٹل سے آئیں اور اپنے کمرے میں سستانے کے لیے لیٹیں تو ہم میں سے کوئی ایک ان کے پیچھے پڑ جائے اور یہ وعدہ کرے کہ کسی کو نہیں بتایا جائے گا۔ اس طرح۔"

"سچ مچ ان کے دل کے راز کا پتہ چل جائے گا۔" ابر خوشی سے تالی بجا کر بولی۔

سب نے مدیحہ کی بات سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ:

"پہلے عائشہ جائے گی۔ اگر کام بن گیا تو ٹھیک ورنہ رات کو کلینک سے جب جاوید واپس آئے گا تو عبیر کو بھیجا جائے گا اگر پھر بھی پتہ نہ چلا تو دوسرے دن پھر کسی کی باری ہوگی۔ آخر کب تک نہیں بتائیں گے۔"

سب نے خوشی خوشی جاوید کے کمرے کو سیٹ کیا اور باہر آگئیں۔

سہ پہر کو جاوید آیا تو عائشہ اس کے کمرے میں پہنچ گئی اور اس کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولی:

"بھائی ایک بات پوچھوں؟"

"ہزار پوچھو۔" جاوید نے بہن کی پیشانی چومتے ہوئے محبت سے کہا۔ اور تب ہی وہ بولی:

"بھائی بتائیں نا وہ کون لڑکی ہے جو آپ کی پسند کی ہو؟"

"اوہ۔!" جاوید زور سے ہنسا۔ "اب سمجھا لگاوٹ کا مطلب۔"

"پلیز بھائی بتائیں نا؟ سچ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" عائشہ منمنائی

"ابھی وقت نہیں آیا بتانے کا۔ پہلے امی سے تو بات کر لوں" جاوید بولا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ اس نے عائشہ کو بتا دیا تو وہ سب کو بتا دے گی۔ اور یوں عائشہ کا رونا تک کام نہ آیا۔

سب ہی اپنی اپنی کوشش کر کے رہ گئیں۔ رابعہ اور ابر نے ابھی جاوید سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ اور اس دفعہ ابر کی باری تھی

"میں تو پوچھ کر ہی دم لوں گی۔" ابر نے مضبوط لہجے میں کہا اور جب جاوید لنچ کے بعد اپنے کمرے میں گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے پہنچ گئی

"مصروف تو نہیں ہیں آپ؟" ابر نے اسے مخاطب کیا تو وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی پلکیں جھپکاتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ صوفے پر ٹک گئی۔

"کیسے آنا ہوا؟"

"کام تھا۔" امبر نے کہا

"کام؟" جاوید نے حیرت سے یہ لفظ دہرایا۔

"جی۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے نہیں ٹالیں گے۔" امبر نے ذوق سے کہا

"اوہ۔" جاوید نے طویل سانس لی۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے آئی ہے اور کتنے اعتماد سے کہہ رہی ہے کہ آپ مجھے نہیں ٹالیں گے۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ سچ سچ؟" جاوید نے شوخی سے کہا اور ہمیشہ کی طرح آج امبر نے اس بات کا برا نہیں منایا مطلب جو تھا۔

"آپ بتائیں کہ آپ کی پسند کون ہے؟" بغیر کسی تمہید کے امبر نے پوچھا تو جاوید اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔

امبر نے اپنی بات کے جواب کے لیے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو گڑبڑا کر رہ گئی۔ جاوید کی آنکھوں میں اس قدر چمک اور معنی خیز شرارت تھی کہ اس کی پلکیں سرخ عارضوں پر لرز کر رہ گئیں۔ اور ایک دم ہی دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔

یہ نیا انداز کیسا ہے جاوید بھائی کا؟
یہ آنکھیں ... راز شناس چنچل شوخ آنکھیں۔

امبر نے چنچل دل کو قابو میں کرتے ہوئے سوچا اور خود کو سنبھالتے ہوئے اس جاوید سے نظریں چراتے ہوئے بولی:

"بتائیں نا؟"

تب جاوید صوفے کی پشت پر جا کر کھڑا ہوا اور اس پر قدرے جھکتے ہوئے بولا:

"بتا دوں گا ویسے۔"

"کیسے؟"

امبر جاوید اتنا بھی بے وقوف نہیں تھا کہ جان نہ پاتا۔ امبر [illegible]

"پلیز بتائیں نا؟" امبر نے جھکی جھکی نظروں سے کہا۔

مگر اسے کوئی بھی تو جواب نہ ملا۔

اور چند لمحے بعد ہی جاوید اس کے سامنے تھا۔ گلدان میں لگا گلاب کے پھول کی کلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کے قریب آیا۔ اور نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے بولا:

"میری پسند تم نے پوچھی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"تو۔ تو وہ تم ہو امبر رانی۔"

"سچ سچ۔" بے ساختہ امبر کے منہ سے نکلا۔ اور پھر اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے بیساختہ انداز پہ جاوید کا قہقہہ کمرہ میں گونج گیا۔ امبر نے گھٹنوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

اس کے سیاہ لانبے کھلے ہوئے بال جاوید کے ہاتھوں پر آ پہنچے تھے۔ جنہیں جاوید نے نہایت محبت سے سمیٹا اور پھر گلاب کی کلی اس کے بالوں میں لگاتا ہوا بولا:

"ہاں سچ میری پسند تم ہی ہو۔ آج تم نے موقع کی مناسبت سے یہ لفظ بولا ہے۔"

وہ نجانے کیا کیا بولتا رہا اور وہ بس گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اس وقت اسے جاوید سے بے تحاشہ شرم آ رہی تھی۔ اور باہر دروازے پہ کھڑی لڑکیاں ابھی تک حیرت کناں تھیں۔ مارے حیرت کے ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ اور سب سے پہلے ہوش ان میں شاہدہ کو آیا تو وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے سب ہی اندر آ گئیں۔

جاوید ان سب کو دیکھ کر ذرا بھی نہ گھبرایا۔ کیونکہ کل والی میں سے وہ جب کی آ رہا تھا۔ تو دروازے کے پردے کے نیچے سے جھانکتے پاؤں اس نے دیکھ لیے تھے اور اسے پتہ تھا کہ سب باہر کھڑی ہیں۔

"دیکھو تو وہ لڑکی گھر میں موجود تھی اور ہم نیا جہان کی خاک چھانتی رہیں۔" جاوید نے [illegible] کہا۔

"تب ان لڑکیوں سے [illegible]

غسل خالو

عبدالمجیب سہالوی

شہر والوں کی زندگی کے لئے بجلی اور پانی کا صحیح انتظام انتہائی ضروری ہے مگر عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں محکموں کا انتظام بالکل چوپٹ ہے۔ بجلی کے سلسلے میں خود وزیر اعلیٰ نے کہا ہے کہ بجلی بورڈ کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے اس لئے وہ سوچ رہے ہیں کہ بجلی کی فراہمی میں نجی زمرے کو بھی شرکت کا موقع دیں۔

بات یہ ہے کہ بیا شاہ جان عالم واجد علی شاہ کا یہ لکھنؤ نوابوں کا شہر ہے یہاں ہر محکمہ کا افسر اپنے کو نواب سے کم نہیں سمجھتا وہ لوگوں کی گردن پر بھی بڑا احسان سمجھتا ہے کہ فائلیں اٹھا کر ماتحت عملے کے لکھے نوٹس پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے صحیح کہا ہے کہ افسروں کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے مگر توجہ کون دے جب توجہ دینے والے خود کام چوری کا شکار ہیں۔

تو عرض کرنا یہ ہے کہ شہر میں اوپر کی منزل کے نلوں میں پانی کا آجانا اب نعمت غیر مترقبہ ہے جس کے انتظار میں دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کرنی پڑتی ہے۔ ہم بدقسمتی سے اوپر کی منزل پر رہتے ہیں جو زیادہ اونچی بھی نہیں زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ فٹ اونچائی ہو گی لیکن دن میں ہمارا نل خاموش کھڑا اپنی تہی دامنی کا شکوہ کیا کرتا ہے اور ہم اس کی طرف حسرت کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔ اور واٹر ورکس کے ذمہ داروں کو پانی پی پی کر نہیں خشک زبان سے دعائیں دیا کرتے ہیں۔

جب پانی پینے کی دشواری ہے تو ظاہر ہے نہانے کا کیا سوال ہے مگر دن میں ایک مرتبہ نہانے کی بچپن سے عادت ہے۔ اگر نہ نہایا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر پر منوں بوجھ لئے پھر رہا ہوں۔ چنانچہ جب سے گرمی آئی ہے اور ہمارے گھر کے نلوں نے پانی دینے سے انکار کر دیا ہے ہم رشتے کی ایک سالی کے یہاں نہانے کی غرض سے چلے جاتے ہیں ان کا مکان تھوڑی ہی دور پر ہے اور در النشیب میں ہے اس لئے ان کے یہاں دن بھر پانی آیا کرتا ہے روزانہ ان کے یہاں نہانے کے لئے جانے سے ان کے یہاں کے بچے بھی ہمارے آنے کا مقصد جان گئے ہیں۔ ایک دن ہم گئے تو اندر سے دروازے بند تھے ہم نے دروازے کو کھٹ کھٹائے۔

ہماری سالی نے لڑکے سے کہا دیکھو کون ہے۔ لڑکے نے فوراً کہا "غسل خالو" ہوں گے اور کون ہو گا جس پر سب لوگ ہنس پڑے جب ہم اندر گئے تو ہماری سالی نے مسکراتے ہوئے کہا آپ کو معلوم ہے کہ بچوں نے آپ کا کیا نام رکھا ہے وہ آپ کو غسل خالو کہتا ہے۔

میں نے کہا ٹھیک کہتا ہے پانی کی قلت سے دیکھو ہمیں کن کن رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ تمہیں نہیں معلوم روزانہ تمہارے یہاں آنے سے تمہاری بجیا مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی ہیں۔ ہماری سالی طلعت نے کہا کہ اے جنئے بڑھاپے میں بھی آپ مذاق سے باز نہیں رہتے۔ آج ہماری بجیا کیوں شک کر نے لگیں۔ وہ ایسی چھچھوری باتیں نہیں کرتیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ؎

وقت پیری شباب کی باتیں

بال سن سفید ہو گئے ہیں نہ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اس میں شک وشبہ کی کیا گنجائش ہے۔ میں نے چھیڑنے کے لئے کہا ؎

بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

طلعت نے کہا چراغ بھڑک کر خاموش ہی نہیں ہوا ہے بلکہ ٹھنڈا پڑ گیا اور جلی ہوئی بتی ٹپک کر زمین پر گر گئی ہے۔

میں نے کہا طلعت تمہاری ان شاعرانہ باتوں ہی سے تو تمہاری بجیا کو شک ہوتا ہے۔

اس پر طلعت نے صابن اور تولیہ بڑھاتے ہوئے کہا مذاق ختم کیجئے اور جایئے نہایئے۔

میں نے کہا ٹھیک کہتی ہو زیادہ دیر ہو گی تو تمہاری بجیا کا شک اور بڑھے گا۔

طلعت نے کہا بوڑھے منہ مہاسے والی باتیں نہ کیا کیجئے آج میں بھی آپ کے ساتھ بجیا سے ملنے چلوں گی۔

میں نے کہا چلو خوشی سے چلو لیکن وہاں پہونچ کر یہ شعر ضرور پڑھوں گا

گھر پہونچ کر نہ مسافر کہیں لٹنے پائے
ہاتھ میں ہاتھ رہے ساتھ نہ چھٹنے پائے

طلعت نے کہا جو شعر بھی چاہے پڑھئے گا ہماری صحت پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں ہے

نوکری کا پروانہ

نگار فاطمہ (ریسرچ اسکالر) لکھنؤ

"عرفی بیٹے تمہیں نوکری کب ملے گی؟ اب تو پریشانیاں سہی نہیں جاتیں۔ میری حالت ہے کہ دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔" اتنا کہتے کہتے عرفی کی ماں کی آواز رُندھ جاتی ہے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

عرفی ماں کی بات سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کو کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ اٹھتا ہے اور یونیورسٹی چلا جاتا ہے۔ یونیورسٹی پہنچ کر وہ گھر کی الجھنوں میں ڈوب جاتا ہے کہ اچانک اس کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے۔

"عرفی آج ماسٹر صاحب لکچر نہیں دیں گے کیونکہ وہ چھٹی پر ہیں۔ چلو پکچر دیکھ آئی جائے۔"

"نہیں میں پکچر وکچر نہیں دیکھوں گا مجھے کچھ اور کام کرنے ہیں۔" عرفی جواب دے کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ پیریڈ خالی سن کر ہر لڑکا خوشی کے مارے مست ہے کوئی تو پکچر کا پروگرام سیٹ کر رہا ہے تو کوئی سیر کی سوچ رہا ہے۔ عرفی کو بھی کبھی یہ لمحے بہت خوشگوار لگتے تھے وہ ان لمحوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا تھا لیکن آج اس کے چہرے پر خوشیوں کے بجائے پژمردگی نظر آ رہی ہے۔ وہ اسی مضطرابی حالت میں یونیورسٹی سے روانہ ہو جاتا ہے اور راستہ میں دریا کے کنارے بیٹھ کر اس کی لہروں کو غور سے دیکھنے لگتا ہے جو کبھی ابھرتی ہیں اور کبھی پیچھے جاتی ہیں۔ "کیا یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ اچانک اسے ماں کی بات یاد آ جاتی ہے۔ اگر خدا نخواستہ امی کو کچھ ہو گیا تو۔ وہ سوچتا ہے کاش وہ ماں کا خاطر خواہ علاج کرا سکتا۔ کاش اسے کوئی نوکری مل جاتی۔ ایسی سوچتا ہوا وہ گھر چلا جاتا ہے۔

عرفی کی ماں کی حالت [illegible] بگڑتی جا رہی تھیں۔ دن بدن [illegible]

[illegible]

لپٹ جاتا ہے۔ "میری اماں میری پیاری اماں! تم مایوس نہ ہو کل میرا ایک جگہ سے نوکری کا انٹرویو لیٹر آیا ہے۔ مجھے نوکری مل گئی تو یہ سب پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ میں تمہارا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کرواؤں گا۔"

بیٹے کی باتیں سن کر عرفی کی ماں ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بولیں: "کاش خدا مجھے وہ دن دکھائے۔" پھر وہ نہ جانے کیا کیا دعائیں بیٹے کو دینے لگیں۔ اسی وقت عرفی کی چھوٹی بہن کمرے میں آ گئی۔ بڑی بہت ہی ناز و نعم سے پلی تھی لیکن باپ کی موت اور ماں کی شدید علالت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ بھی غمگین اور پریشان رہنے لگی تھی۔ عرفی اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت انھیں خیالوں میں ڈوبا رہتا تھا کہ اس کی بہن کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ اس کی تمام خواہشات پوری کر سکے لیکن مجبوریاں انسان کے ارمانوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ کیسے کرتا۔

عرفی کے باپ کو مرے ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا ہوگا ان کے مرنے کے بعد ان کی پنشن عرفی کی ماں کو ملنے لگی تھی۔ عرفی نے اپنی پڑھائی بہت حد تک اپنے باپ کی زندگی میں پوری کر لی تھی۔ اسے صرف ایم۔ کام کا آخری سال ہی پورا کرنا تھا جس کی خاطر اسے یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری عرفی پر ہی عاید ہو گئی تھی۔ قلیل پنشن گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔ اس وجہ سے عرفی برابر نوکری کے لیے انٹرویو دے رہا تھا اور اسی کوشش میں لگا تھا کہ جلد سے جلد اسے نوکری مل جائے۔

آج صبح عرفی بہت سویرے ہی اٹھ گیا۔ اس نے رات کے بارہ بجے تک انٹرویو کی تیاری کی تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ اس انٹرویو میں ضرور کامیاب ہوگا۔

انٹرویو سینٹر پہنچتے ہی عرفی نے ایک لڑکے کی گفتگو سنی جو یہ کہہ رہا تھا: "تم جانتے ہو یہاں پر چار سیٹیں ہیں جن میں دو تو پہلے سے طے کی ہیں اور دو میں اور لوگ لیے جائیں گے۔ جس میں میرے بابا نے پہلے ہی منیجر کو دس ہزار روپے دے دیے ہیں اور اس نے تو میری نوکری کا وعدہ بھی کر لیا ہے بس مجھے تو نام کا انٹرویو دینا ہے۔"

[illegible]

امتحان لینے والوں میں دو میرے پاپا کے ملاقاتی ہیں۔"

"کیا روپوں اور سورس کے آگے قابلیت کی کوئی اہمیت نہیں؟ ایسا ہے تو میرا انٹرویو دینا بے کار ہے۔" لیکن پھر اس نے سوچا کہ کوشش تو کرنا ہی چاہیے۔ نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ نکلے۔ خدا بھی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔

اس نے انٹرویو دیا اور گھر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے اپنے جوابات سے امتحان لینے والوں کو مطمئن کر دیا ہے۔

عرفی کی ماں اور بڑی دونوں ہی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بڑی، عرفی کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ اس نے پوچھا "بھیا! کیا آپ کو نوکری مل گئی ہے۔ دیکھیے پہلی تنخواہ میں سے میرے لیے اچھے اچھے کپڑے بنوا دیجیے گا۔ میرے کپڑے کتنے خراب ہیں۔"

عرفی نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ "مت گھبرا میری گڑیا۔ میں تیرے لیے بہت سے کپڑے بنوا دوں گا۔"

عرفی نا امید تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے نوکری نہ مل سکے گی اس لیے کہ اس کے پاس سفارش نہ تھی۔ اس کے پاس رشوت دینے کے لیے دولت نہ تھی۔ وہ ماں کے پاس گیا۔ انھیں تسلی دی اور لیٹ گیا۔

صبح اٹھا تو ماں کی تکلیف میں اضافہ تھا۔ گھبرا کر وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ انھیں ساتھ لا کر ماں کو دکھایا۔ فیس اور دوا کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے اپنی گھڑی بنئے کے پاس پچاس روپے میں رہن کر دی۔ تین دن بڑی کشمکش میں گزرے۔ ماں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ عرفی نے انھیں بہلانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ میں نوکر ہو گیا ہوں ماں۔ مجھے چار سو روپے تنخواہ ملے گی۔ لیکن ماں پر اس بات کا الٹا اثر ہوا۔ انھوں نے اپنے کمزور ہاتھوں کو اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور بولیں "میری آخری تمنا پوری ہو گئی۔" اس کے بعد ان پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے ماں کا سر سہلایا۔ چمچے سے ان کے حلق میں پانی ٹپکایا۔ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بڑی دوڑ کر گئی۔ پوسٹ مین نے ایک لفافہ اسے دیا۔ یہ عرفی کی تقرری کا پروانہ تھا۔ بڑی نے لفافہ پھاڑ کر عرفی کو خط دیا۔

عرفی نے ایک سرسری نظر خط پر ڈالی اور چیخ کر بولا۔ "ماں۔ میں نوکر ہو گیا۔ دیکھو یہ [illegible] آگیا ہے۔ کل ہی مجھے چارج لینا ہے۔" [illegible] نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ ساکت و سامت تھیں ان کی روح پرواز کر چکی تھی ــــ "ماں" کہہ کر دونوں چیخے اور ماں کے بے جان جسم سے لپٹ گئے۔ شاید ماں کو بیٹے کی نوکری کے پروانے ہی کا انتظار تھا۔

ایک لمحۂ فکریہ

م۔ خان

موجودہ دور کے ترقی یافتہ اور گراں دور میں اگرچہ خواتین کے کمانے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ ان کے کمانے کے طریقے مختلف ہیں جو خواتین تعلیم یافتہ ہیں وہ ملازمت کرتی ہیں اور جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں وہ کوئی گھریلو کام کرتی ہیں۔ اس سے ہمیں بہت سے فائدے نظر آتے ہیں۔ موجودہ دور میں ہر چیز کی قیمت اتنی زیادہ اور معیارِ زندگی اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ صرف ایک شخص کے لیے پورے کنبہ کی کفالت کرنا واقعی مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر خواتین اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہیں تاکہ وہ اپنے مردوں کی مدد کر سکیں اور گھریلو اخراجات برداشت کرنے میں سہولت ہو جائے۔ اس سے گھریلو زندگی پرسکون ہو جاتی ہے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی قلیل ہو تو بیوی کی کمائی سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں بیوی شوہر کی محتاج بھی نہیں رہتی۔ وہ اپنی بہت سی ضرورتیں خود پوری کر سکتی ہے۔ لیکن ملازمت ان خواتین کے لیے تو ٹھیک ہے کہ جن کے شوہروں کی آمدنی قلیل ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن خواتین کو واقعی ملازمت کی ضرورت ہوتی ہے وہ رہ جاتی ہیں اور جن خواتین کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہوتی ان کو ملازمت مل جاتی ہے۔

یہ تو ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خواتین کی ملازمت کے بہت سے فائدے ہیں مگر جہاں فائدے ہیں وہاں نقصانات بھی بہت ہیں۔ بہت سی خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کی اتنی فرمانبرداری نہیں کرتیں جتنی کہ کرنی چاہیئے۔ انھیں اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ ہماری آمدنی اپنی ہے اور ہم شوہر سے الگ رہ کر بھی گزارا کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے کفیل خود ہیں۔ یہ احساس گھر کی پرسکون زندگی برباد کرنے کے لیے [illegible] اگر کسی طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ شوہر [illegible] شوہر سے [illegible] ایسی خواتین اکثر اپنے شوہروں کی نافرمانی کرنے لگتی ہیں۔ شوہر اور اسکے متعلقین کی باتیں برداشت کرنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتی ہیں بجائے اس کے کہ وہ گھریلو معاملات کو سلجھانے کی کوشش کریں، شوہر سے علیحدگی اختیار کرنے پر اتر آتی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کسی معقول وجہ کے بغیر بیوی کی شوہر سے علیحدگی کو جائز قرار نہیں دیا۔ ایک جگہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ "جو خاتون سچے دل سے اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرے گی اللہ اس سے خوش ہوگا۔" اس سلسلہ میں کتنی بڑی مثال موجود ہے کہ حضرت خدیجہ رض نے حضورؐ کی جو خدمات انجام دیں ان کا اثر آپ کے دل پر آخر تک رہا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی کے لیے شوہر کی فرماں برداری کتنی ضروری ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی بھی خواتین ہوتی ہیں جن کی کوئی بھی آمدنی نہیں ہوتی اس کے باوجود وہ اپنے شوہروں کی فرمانبردار نہیں ہوتیں وہ اپنے شوہروں کو پیسہ کمانے کی مشین سمجھتی ہیں۔ جہاں ان کی تکمیلِ شوق میں کمی ہوتی، شوہروں سے شکوہ و شکایت کرنے لگتی ہیں۔ لیکن ایسی خواتین کی تعداد کم ہے اس لیے کہ بہرحال انھیں سوچنا پڑتا ہے کہ شوہر ہی ان کا کفیل ہے۔ اسکے برخلاف جو خواتین برسرِ روزگار ہوتی ہیں ان میں شوہروں سے نافرمانی کی مثالیں زیادہ نظر آتی ہیں کیونکہ ان کو اپنی ملازمت پر فخر ہوتا ہے۔

خواتین کی ملازمت کا ایک نقصان ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ گھر کا انتظام عورت کی موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دن بھر ملازمت پر رہنے کے بعد نہیں ہو سکتا۔

عورت کے لیے اس کا گھر ہی جنت ہوتا ہے۔ جو سکون اسے گھر والوں کی خدمت کر کے ہو سکتا ہے وہ باہر رہ کر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور پھر عورت کی قدر جتنی چہار دیواری کے اندر ہوتی ہے اتنی باہر رہ کر بھی نہیں ہو سکتی۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے لیے گھر کے اندر ہی اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ اسے ملازمت کا وقت ہی نہیں مل سکتا۔ بشرطیکہ خواتین اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ خواتین کی ملازمت اتنی ضروری نہیں ہے جتنی کہ ان کے شوہر اور بچوں کی خدمت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو گھر کے کاموں کے لیے پیدا کیا ہے۔ باہر کے لیے مردوں کو پیدا کیا ہے۔

جو سکون ہمیں پرانے لوگوں کی زندگی میں نظر آتا ہے وہ موجودہ دور میں نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں خواتین کیلئے

پابندیاں تھیں۔ اور اس زمانے کی خواتین میں قناعت بھی موجودہ دور کی خواتین قناعت سے زیادہ اس بات کو بہتر اور آسان سمجھتی ہیں کہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا جائے۔ اسی وجہ سے پرانے زمانے کا سا سکون اور اطمینان ختم ہو چکا ہے۔

بہ تقریب مسرت شادی سعید منعقدہ ۵ مئی ۱۹۸۳ء

نورِ چشمی رعنا مسعود سلمہا ہمراہ عزیزی پرویز سلمہ بھوپال
بیٹی ہے مگر صبر و قناعت کی نشانی

اللہ نے دی اس کو شرافت کی نشانی
اللہ نے دی اس کو صداقت کی نشانی
اللہ نے دی اس کو اطاعت کی نشانی
اللہ نے دی اس کو لیاقت کی نشانی
مومن کے لئے ہے یہی جنت کی نشانی

بیٹی کے لئے آئے ہیں پیغام شریعت
بیٹی کے توسّل سے ہوئی بخشش امت
بیٹی سے عیاں ہو گئے اسرار حقیقت
بیٹی کو وراثت میں عطا کی گئی جنت
بیٹی ہے عجب شان مشیت کی نشانی

بیٹی سے گھر آباد ہوا۔ شیر خدا کا
بیٹی سے ہوا نام شہیدانِ وفا۔ کا
بیٹی نے دیا درس ہمیں صبر و رضا۔ کا
بیٹی سے ملا ہم کو سبق جود و سخا۔ کا
بیٹی ہے ہمارے لئے رحمت کی نشانی

معصوم صفت لب پہ نہ فریاد نہ نالا
یہ دل کی خوشی اور نگاہوں کا۔ اُجالا
اپنوں سے ہوئی غیر یہ جب ہوش سنبھالا
یہ رسم عجب ہے یہ طریقہ ہے نرالا
بیٹی ہے حقیقت میں عنایت کی نشانی

حالات زمانہ اسے مجبور بھی کر دیں
پابندیٔ افلاس کی دل چور بھی کر دیں
سینے میں غم و رنج جو ناسور بھی کر دیں
ماں باپ نگاہوں سے اگر دور بھی کر دیں
بیٹی ہے مگر صبر و قناعت کی نشانی

تکلیف میں یہ غم کا مداوا۔ نہیں کرتی
اور عیش میں آرام کی۔ پروا نہیں کرتی
لب سے یہ شکایت کبھی شکوہ نہیں کرتی
ماں باپ کے یہ نام کو رسوا نہیں کرتی
ورثے میں ملی ہے اسے خدمت کی نشانی

ماں باپ بڑے ناز و نعم سے اسے پالیں
ناراض اگر ہو اسے خوش کر لیں منا لیں
اور اس کے لئے دنیا کی تکلیف اٹھا لیں
بےچین اگر ہو اسے سینے سے لگا لیں
سچ جانئے بیٹی ہے امانت کی نشانی

بیٹی پہ فدا باپ نے ارمان کئے ہیں
اور ماں کی مرادوں کے نئے پھول کھلے ہیں
نانی کی دعاؤں کے ثمر آج ملے ہیں
پرویز تمہیں اپنی خوشی سونپ رہے ہیں
رعنا ہے تمہارے لئے راحت کی نشانی

اللہ عطا کر دے تمہیں صبر کی۔ دولت
چھوٹے نہ کبھی ہاتھ سے دامان سعادت
لب بھی نہ ہلیں سر پہ جو آ جائے مصیبت
تم سامنے رکھنا یہی جوہر کی نصیحت
تم جیتے رہو شانِ شرافت کی نشانی

جوہر باسودوی — صدر انجمن ترقی اردو گنج باسودہ ضلع ودیشہ

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کی مرسلہ ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی اور انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھنا چاہیے خبر کے ساتھ نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی روانہ کریں۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کا دفتر ذمہ دار نہیں ہوتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• عفیرہ کرن عرف شرقیہ (وانمباڑی) میری سہیلی بہن ثمینہ شاہین اور بہنوئی بشارت احمد فاروقی صاحب (مدراس) کو اللہ پاک نے ۱۹ مئی ۸۳ء کی شب میں بارہ بجکر ۵ منٹ پر پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام صیف احمد فاروقی رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• صوفی صبیحہ ہاشمی (آمبور) میری منجھلی بھابی فریدہ شفیق صوفی کو اللہ پاک نے ۲۰ جون ۸۳ء بروز پیر بوقت ساڑھے گیارہ بجے دن پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام تنزیل الرحمٰن صوفی قرار پایا۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

پیامات نشاط

• میرے کرمفرما اور لکھنؤ کے ہر دلعزیز ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب کی دختر نیک اختر روبینہ سلمہا کی شادی ہمراہ عزیزی شارق سلمہ (فرزند دلبند جناب سراج الحق آئی۔ اے۔ ایس) ۱۲ جولائی ۸۳ء کی شب میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ (ٹی۔ جی ہال۔ میڈیکل کالج لکھنؤ) میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ چونکہ شدید اور مسلسل بارش کے [illegible] شرکت نہ کر سکا۔ مجھے افسوس ہے کہ [illegible] ہو جانے کے باعث شریک نہ ہو سکا۔ بہرحال میری دعا ہے کہ اللہ پاک روبینہ سلمہا اور شارق سلمہ کی متاہل زندگی ہمیشہ شادمانیوں میں گزارے۔ نسیم انہونوی

• میرے کرمفرما محترم شیخ عبداللہ صاحب کی صاحبزادی سیما سلمہا کی شادی عزیزی ضیاء الحسن سلمہ (فرزند دلبند قاضی فخر الحسن صاحب) کے ہمراہ ۲۴ جولائی ۸۳ء بروز اتوار بوقت شام جنکو ٹنی ہال۔ لکھنؤ کا ہوٹل میں بعد تزک و احتشام عمل میں آئی۔ معذرت خواہ ہوں کہ شریک نہ ہو سکا۔ بہرحال مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ سیما سلمہا کی یہ نئی زندگی ہمیشہ پر بہار رہے۔ (نسیم انہونوی)

• سلطانہ مشتاق۔ ثروت نازلی (پنام بٹ) ہمارے بھیا ارشد قریشی (فرزند جناب فضل الرحمٰن) کی شادی ہماری پھوپھی زاد بہن عشرت جہاں (بنت عبید اللہ صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۱۹ مئی ۸۳ء بروز جمعرات بمقام دلپور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ہمارے بھیا و بھابی کو ہمیشہ شادکام رکھے۔

• محترم ابوسعید صاحب اور مشہور ناول نگار بہن نوشابہ سعید ناز صاحبہ کی صاحبزادی شبنم نیلوفر سلمہا کی شادی ابوذر غفاری (فرزند الحاج محمد فاروقی صاحب) کے ہمراہ ۲۷ جولائی ۸۳ء کو بمقام کچھا بٹی۔ [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور دونوں ہمیشہ شادکام رہیں۔ بہن نوشابہ سعید ناز سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اس تقریب سعید میں شرکت نہ کر سکا۔ (نسیم انہونوی)

• میرے قدیم کرمفرما عبید الرحمٰن صاحب مرحوم بیلی بھیتی کے فرزند عزیزی سمیع الرحمٰن سلمہ کی شادی ہمراہ شمیم بانو سلمہا (دختر نیک اختر ڈاکٹر زیڈ۔ ایچ رضوی صاحب) ۲۲ جولائی ۸۳ء کی شب میں بمقام نادیگلا [illegible] لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ بیگم عبید الرحمٰن صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• جناب متین الرحمٰن صاحب (بھوپال) کی صاحبزادی راحیلہ سلطان کی شادی ڈاکٹر نفیس۔ آر۔ خانصاحب (پسر جناب ایم سلیمان خانصاحب) کے ہمراہ ۳۰ جولائی ۸۳ء کو بمقام تاج المساجد بھوپال بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پرملال کی خبریں

• گذشتہ دنوں دیوبند کی عربی یونیورسٹی کے روح رواں محترم قاری طیب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ قاری صاحب مرحوم کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں بچہ بچہ ان کے نام اور کام سے واقف ہے۔ تقریباً پچاس سال تک دیوبند کے اس تعلیمی ادارے کے سربراہ رہے [illegible] عالم اسلام میں مشہور ہے۔ قاری صاحب کا انتقال ساری [illegible]

ان کی شخصیت ایسی عظیم تھی کہ ان کا مثل پیدا ہونا مشکل ہے۔ جس قابلیت اور لگن سے مرحوم نے دار العلوم یونیورسٹی کی آبیاری کی تھی، اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ ایسے علم و فضل اور ایسے انسانی اوصاف کے حامل لوگ دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور مرحوم کے تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• شہناز عراقی (کلکتہ) بڑے رنج و الم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے والد جناب محمد یعفر عراقی صاحب ۹ر جون ۱۹۵۳ء کو ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بہت ہی شفیق مربی تھے۔ تقریباً ہر انسانی وصف ان میں موجود تھا۔ اللہ پاک ان پر اپنی رحمتیں کرکے انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سیدہ زینت افزا (بیجے نگر۔ بنگلور) افسوس میری باجی راحت افزا (قدیم خریدار حریم) حرکت قلب بند ہو جانے سے ۲۲ر جون ۱۹۵۳ء کی شام کو ۵ بجے انتقال فرما گئیں مرحومہ انتقال کے روز بھی روزے سے تھیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان خصوصاً ان کے سات لڑکوں اور ایک بیٹی عشرت افزا کو صبر جمیل عطا فرمائے (حریم کی کسی بھی خریدار بہن کے انتقال کی خبر میرے لئے افسوسناک ہوتی ہے۔ بہن راحت افزا صاحبہ کے سفر آخرت کی خبر سے بھی تاسف ہوا۔ (نسیم انہونوی)

• تاجندہ مصباح (حاجی مئو۔ کانپور) افسوس صد افسوس میرے نانا محترم ابو الحسنات صاحب ۱۴ر جولائی ۱۹۵۳ء بروز سہ شنبہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم پر ۸ر جولائی کو قلبی دورہ پڑا تھا۔ انتقال کے وقت عمر ۷۰ سال تھی۔ اپنی یادگار ایک بیوہ دو فرزند اور تین لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور سب ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ شعر ہمارے مقرر عنوان کے تحت ہو۔ شعر کا صحیح اور موزوں ہونا ضروری ہے۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو اشعار ماہ اشاعت سے پہلے ماہ کی ۲۰ر تک دفتر نہیں پہنچ جاتے۔ وہ شائع نہیں کئے جاتے۔ ستمبر کے لئے عنوان ہے "نغمہ یا نغمے" اور اکتوبر کے لئے "گلاب"

بجلی کی تاک جھانک مجھے ناگوار ہے
کالی گھٹا کی زلف پریشاں کو کیا کروں

مرسلہ:- طاہرہ تبسم اعظمی (راجہ پور بگہوارہ)

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے

مرسلہ:- عصمت آرا (بانکا)

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

مرسلہ:- شگفتہ (بانکا)

ساون کی گھٹا تری زلفیں ہیں، آنکھوں میں سمندر پایا ہے
ترے حسن کا جب دیدار ہوا، دل کھول کر بھی کچھ پایا ہے

مرسلہ:- شمع شگفتہ ناز (جہنوار پور)

خود ہے جب لیلیٰ کی صورت، پھر نہ جانے کس لئے
دوڑتی پھرتی ہے مجنوں بن کے دیوانی گھٹا

مرسلہ:- قرۃ العین (نندپال)

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

مرسلہ۔ کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

• منگنی کے بعد لڑکے نے اپنی منگیتر سے کہا۔ سردست ہمیں اپنی منگنی کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔
لڑکی نے کہا "نہیں پیارے، میں کم سے کم اپنے ان پرانے رشتوں سے تو ضرور کہہ دوں گی، جو کہا کرتے تھے تم سے کوئی بیوقوف ہی شادی کرے گا۔

عوامی خدمت کا خاموش سفر

"ہزاروں میل لمبا سفر پہلے ہی قدم سے شروع ہوجاتا ہے"

سیکڑوں سال پرانا یہ قول ایک مفکر کا ہے۔ جو سفر طویل اور مشکل ہوتے ہیں، ان میں شوروغل اور بلند و بانگ دعوے بہت دور تک ساتھ نہیں چل پاتے۔ مستحکم ارادہ ہی اس سفر کا پہلا قدم ہوتا ہے اور خود کو وقف کردینے کا جذبہ ہی کسی منزل تک لے جاتا ہے۔

ہر سفر پورا ہوسکتا ہے لیکن خدمت ایک ایسا سفر ہے جو ایک بار شروع ہوجائے تو کبھی ختم نہیں ہوتا اور ایک فلسفۂ حیات بن کر ہم سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ شاید اسی لئے جواہر لال نہرو نے کبھی کہا تھا کہ ہمارے ملک کے عظیم ترین شخص (گاندھی جی) کی تمنا تھی کہ ہر آنکھ کے آنسو پونچھ دیے جائیں۔ پتہ نہیں یہ ہمارے بس میں ہے یا نہیں لیکن جب تک کہ ایک بھی آنکھ میں آنسو باقی ہے اس وقت تک ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔ یہ عزم ہمارے بس میں ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ہر فرد کے دکھ جاننے اور اسے سماجی حیثیت اور سماجی انصاف دلانے کی مہم کوئی معمولی مہم نہیں رہی ہے۔ پھر بھی حکومت اتر پردیش نے پورے خلوص، لگن اور اعتماد کے ساتھ بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کی راہ میں بے مثل کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

- خصوصی مربوط اسکیم کے تحت سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں چار لاکھ پندرہ ہزار ہریجن خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے میں کامیابی۔
- مربوط دیہی ترقی اسکیم سے گذشتہ سال دیہاتوں کے پانچ لاکھ ۵۰ ہزار خاندان مستفید۔
- قومی روزگار پروگرام کے تحت ۳۳۰۴۱ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ ہوئی اور پانچ کروڑ ۲۸ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار کی دستیابی۔
- گندی بستی سدھار اسکیم سے ایک لاکھ ۹۰ ہزار افراد مستفید۔
- مالی امداد کے ذریعہ چھ ہزار پانچ سو پابند مزدوروں کی بحالی۔
- اب تک ۵۳ ہزار مواضعات اور ۲۲ ہزار پانچ سو ہریجن بستیاں بجلی سے آراستہ۔
- پانچ ہزار چھ سو قلت زدہ مواضعات سمیت ۱۹ ہزار مواضعات میں پینے کا پانی دستیاب۔
- گذشتہ سال ساڑھے چار لاکھ مردوں اور عورتوں کی نس بندی خاندانی بہبود اسکیم کی قابل ذکر کامیابی۔
- تمام ملک میں ۴۰ لاکھ ٹن کی گیہوں کی مجموعی فاضل پیداوار میں سے اتر پردیش میں ۲۲ لاکھ ٹن گیہوں کی سب سے زیادہ پیداوار۔
- سرکاری آبپاشی وسائل سے تین لاکھ ہیکٹر کی فاضل آبپاشی صلاحیت۔
- بجلی کی تنصیبی صلاحیت ۴۴۹۲ میگا واٹ۔
- سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۳ ہزار چھ سو چھوٹے صنعتی واحدوں کا قیام۔ اور ۸۴ ہزار افراد کو روزگار کی فراہمی۔
- اتر پردیش ——— سماجی انصاف اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

اور دانت پیسے: "آہستہ سے کھولو۔ لفافہ کی دھجیاں مت اڑا دینا"

"ہائے اللہ!" نینا نے لفافہ کھولا اور سرخ و سبز نگینے جڑے کنگن نکال کے اپنے سینے سے لگا لیے: "کتنے پیارے ہیں۔ کس کے لیے لائے ہیں یہ۔ مجھے سچ سچ بتا دُ مجھے!"

"سچ سچ بتا دوں تاکہ تم امی سے سچ سچ لگا دو۔ اور وہ سچ مچ مجھے پھانسی پر لٹکا دیں!" معتصم نے کہا۔

"اب میں سمجھی!" نینا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا: "آپ نے امریکہ میں کسی دُم کٹی چھچھوندر سے شادی کر لی ہے۔ یہ اسی کے لیے آپ لائے ہیں۔ کیا وہ بندریا ساتھ آئی ہے آپ کے؟"

معتصم کو شرارت سوجھی۔ نہایت سنجیدگی سے بولے: "وہی تو مجھے لائی ہے بے حد اشتیاق تھا اسے تم سے ملنے کا۔ ورنہ بھلا مجھے ابھی کہاں آنا تھا"

"عصمی بھیا۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا؟" نینا رو پڑی۔

معتصم نے ہنسی ضبط کر کے کہا: "اور تم۔ تم نے اس بے چاری کو بیٹھے بٹھائے بندریا اور چھچھوندر بنا دیا۔ سنے گی تو کیا کہے گی کہ ابھی اس گھر میں اس کی اچھی قدر ہوئی"

ناک سکڑتی ہوئی نینا بولی: "اسے رکھا کہاں ہے؟"

اپنی امی کے گھر میں ہے!

کیا اس کی امی کا گھر یہاں ہے۔

ہاں شاید یہیں ہے!۔

"کیا آپ کو نہیں معلوم؟" نینا کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

"میں کیا جانوں؟" معتصم بولے۔

نجانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا اسے یہاں بھی لائیے گا؟ (باقی آئندہ)

ایک دلچسپ اصلاحی ناول

موم کی زنجیریں

از

عفت موہانی

قیمت

نسیم بکڈپو۔ ۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون:۔ ۴۵۳۳۴۰ ۴۴۵۵۹
[illegible]

"اچھا بھائی بتاتا ہوں۔ تم وہ سوٹ کیس اٹھا تو لاؤ۔!" وہ کراہے۔
نینا سوٹ کیس لے آئی اور مسہری پر ان کے سامنے رکھ دیا۔
اب آنکھیں بند کرکے ہاتھ میرے آگے پھیلا دو۔" انھوں نے دبنگ بن کر حکم دیا۔ مگر نینا ہنستی ہوئی ان کے بازو سے چمٹ گئی۔
"واہ۔ میں تو خوب اچھی طرح دیکھوں گی آپ کس کے لیے کیا کیا لائے ہیں!"
اور سب سے اچھی چیز اپنے لیے چھانٹ لوگی۔ کیوں؟" انھوں نے آنکھیں نکالیں۔
ارے خدایا۔ آپ سوٹ کیس کھولیے نا۔!"
خدا خدا کرکے سوٹ کیس کھلا۔ اور ایک ایک چیز کے ساتھ نینا کی پرمسرت چیخ بھی نکلتی گئی۔ ہلکا پھلکا گنز قیمتی اور خوشنما سامان تھا۔ بھابی کے لیے خوبصورت لاکٹ۔ امی کے لیے شال۔ بھائی جان کے لیے نہایت عمدہ کف لنک، اباجان کے لیے خوشنما قلم۔ اور نینا کے لیے پیارا سا نکلس اور رسٹ واچ۔ بچوں کے لیے بڑے زرق برق جوڑے قیمتی سوٹ۔ احتیٰ کہ بوا نانی کے لیے بھی سفید ساڑی۔
نینا نے دل کھول کر تعریف کی۔ اپنا لاکٹ پہنا، کلائی پر گھڑی باندھی۔ اور پھر چونک کر معتصم کو گھورنے لگی۔
خیریت؟" وہ مسکرانے لگے۔
کیا چیز چھپائی ہے آپ نے؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔ سونے کا ایک چمکا دکھائی دیا ہے مجھے!"
"ارے کچھ نہیں ہے وہ۔!"
مگر نینا نہ مانی۔
"۔۔۔ تو پھر معتصم نے ایک سرخ لفافہ اس کی گود میں پھینک دیا۔

"نینا معتصم کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لائی۔

سامنے بچھی ہوئی مسہری آرام کی دعوت دے رہی تھی۔ معتصم نے دروازے پر پڑا پردہ اور دور تک پھیلا دیا۔ پھر مسہری پر آلیٹے۔ اور نینا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"بے اجازت ایک سگریٹ سلگالوں؟" وہ مسکرائے۔

ہائے عصمی بھیا آپ سگریٹ کب سے پینے لگے؟" نینا نے آنکھیں پھیلائیں

دو سال سے کسی سے کہہ مت دینا۔!

انھوں نے سگریٹ سلگایا اور خوب سا دھواں منہ میں بھر کر نینا پر چھوڑ دیا

اچھی بات ہے" اس نے سر ہلایا" اب یہ دھواں امی سونگھیں گی اور پھر دیکھئے گا آپ اپنا حشر۔!"

ہٹاؤ بھی۔ تم تو ذرا میرا چھوٹا سوٹ کیس اٹھا لاؤ" معتصم نے ہنس کر کہا۔

کچھ چیزیں ہیں اس میں۔ تم سب کے لیے۔ چھ ماہ سے اکٹھی کر رہا تھا کہ جاؤں تو لیتا جاؤں گا!"

عصمی بھیا؟" کڑے تیوروں سے نینا نے انھیں گھورا۔

کچا چبا ؤ گی کیا؟" معتصم نے سہم کر کہا

یہ کیا چکر ہے۔ مجھے بتائیے" نینا نے تھانیداروں کا لہجہ اختیار کیا" آپ تو ٹیلیگرام ملتے ہی روتے دھوتے بھاگے تھے نا۔ پھر یہ چھ ماہ پہلے سے تحفے تحائف اکٹھی کرنے کی بات۔!"

سچ مچ وکیل ہی کی بیٹی ہو۔ بال کی کھال" معتصم نے سگریٹ کا ٹکڑا خاکدان میں پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بتائیے!" نینا سر ہو گئی۔

انتساب

نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ

اپنی پیاری بہو

بشریٰ فہیم انہونوی

کے نام

عفت موہانی

رومہ نے انھیں دیکھا۔ سفید ململ کے کڑھے ہوئے کرتے اور بڑے بڑے پائنچوں کے پاجامے میں وہ کتنے اچھے لگ رہے ہیں اچانک ان کی مسکراتی ہوئی نظریں رومہ کی نظروں سے مل گئیں۔ وہ پانی پانی ہو گئی۔!

"پٹنہ سے باجی جان کو بلا لیجئے" رضا کہہ رہے تھے "عرصے سے نہیں آئیں۔ اور اب تو بہانہ بھی ہے۔ کیوں امی؟"

"ہاں رے وہ چلی آئیں۔!" امی بولیں۔

"ارے ہاں دوستو" علوی صاحب پھر چونکے "میں سب سے برا برعقل لڑا رہا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ بیگم۔ یہ کارستانی تمھاری ہے۔ تم اس کی جدائی کو بہت محسوس کرتی تھیں۔" سب اچانک ہنس پڑے۔

"اپنی وکالت مجھ سے نہ چلایئے" بیگم تنک اٹھیں "میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ جو اس کی پڑھائی [illegible] کر کے بلا بھیجتی۔"

"اچھا تو ان لوگوں نے [illegible] مارا ہے تار۔" معتصم نے بہنا اور بھابی کی طرف اشارہ کیا۔

"استغفر اللہ" بھابی کے منہ سے نکلا۔

عصمی بھیا [illegible] مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تار دیا کیسے جاتا [illegible] چھوڑ دو یہ الجھنیں۔ رضا نے بیزاری سے کہا "اور گولی مارو تار، تار سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔"

اور فوراً موضوع بدل [illegible] معتصم بیگم علوی سے پوچھنے لگے کہ بھائی جان کی شادی کی تفصیل سنایئے۔ بیگم کا پسندیدہ موضوع شادی ہی تھا۔ بہنا اور غیرہ بڑی تفصیل سے رضا کی شادی کی شاندار روایات بیان کرنے لگیں [illegible] اٹھ گئے

"آپ دہی کا رائتہ بنا لیجیے بوا نانی۔ مز عفر میں تیار کیے رہتی ہوں۔ اماں کہہ رہی ہیں تو کھانا لگا دیا جائے!"

"اچھا بیٹی۔ بنا لے۔ میرے تو ہاتھ سے چیزیں چھوٹی جاتی ہیں۔" بوا بولیں دفعتہ دھڑاک سے آدھا پھاٹک کھلا! اور معتصم برتنوں کو پھلانگ کر آ گئے۔ بڑھے اور بوا نانی سے لپٹ گئے!۔

"آپ مجھ سے ملیں نہیں۔ بوا نانی۔ میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی آپ کو۔"

رومہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اگر اس سے بھی کچھ کہہ دیا۔ تب۔ بوا جی نے انھیں کلیجے سے لگا لیا۔ فرطِ مسرت سے کپکپاتے ہوئے بیسیوں دعائیں دینے لگیں۔ گود یوں کھلا چکی تھیں۔ اور معتصم کو چاہتی بھی بہت تھیں!۔

"بوا نانی میں آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ آپ کو کبھی امریکہ بلاؤں گا۔ آپ سے مجھے بہت محبت ہے بوا نانی!"

"جگ جگ جیے میرے چاند!" انھوں نے معتصم کی پیشانی چوم لی۔ "سدا سکھی رہے۔ بچے۔ امریکہ میں کہاں جاؤں گی۔ بس مجھے حج کرا دے میرے لال"

"ضرور بوا نانی۔ ضرور۔!"

رومہ پتیلی میں چمچہ کھڑکھڑاتی رہی۔ جانے اب اس کی باری آئے گی کہ کیا۔ مگر وہ تو اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئے۔ دو چار باتیں بوا جی سے کیں۔ اور نہانے چلے گئے!۔

"میرے اللہ۔!" رومہ نے اطمینان کی سانس لے کر پتیلی میں جھانکا تو پیاز کوئلہ بن چکی تھی!۔ اس نے پتیلی اتار کے الگ رکھ دی اور پلکوں تک بہہ آنے والے پسینے کو پونچھنے لگی!۔

طعام خانے میں سب اکٹھا تھے!۔

گھر پر اچانک ایک اضطراب آمیز ہلچل پیدا ہو گئی۔ تھوڑی سی تشویش، کچھ مسرت۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کون سی ایسی بات تھی جس نے صاحبزادے معتصم کو تعلیم پوری کیے بغیر وطن واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو یہاں سے ایم ایس سی کر کے امریکہ گئے تھے۔ اور ابھی ان کی آمد میں پورے چھ سات برس اور باقی تھے۔ لیکن وہ تین ہی سال بعد بھاگے آ رہے تھے!۔

علوی صاحب نے تار بیوی کو پکڑایا تھا اور خود مجسم سوال بنے انھیں دیکھے جا رہے تھے۔ ان کے اطراف گھر کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔ بڑے بھائی صاحب، ان کی بیوی، چھوٹی بہن۔ اور دو ایک ملازم۔

علوی صاحب وکیل تھے۔ انھوں نے جرح کی: "میں پوچھتا ہوں۔ جب اسے یونہی نام ڈبونا اور پیسے برباد کرنا تھا تو پھر وہ وہاں گیا ہی کیوں تھا؟۔ پورے ہزار خرچ ہوئے تھے اس کے بھجوانے پر۔ سمجھیں؟"

"میں کیا جانوں۔" بیگم علوی پریشان تو تھیں ہی۔ جھنجھلا گئیں۔ "جہاں آپ وہاں میں۔ میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے ہیں۔ اللہ نہ کرے کچھ بیمار تو نہیں۔ کسی سے اس کا جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔ اور اتنے شوق سے گیا تھا۔ اور اپنے ہر خط میں لکھتا تھا کہ دعا کیجیے۔ جلدی ڈاکٹر بن جاؤں تاکہ آپ کی خدمت کر سکوں۔ پھر اب کیا ہوا ہے۔!"

"گھبرانے کی کیا بات ہے" ان کے بڑے صاحبزادے نے کہا: "اب تو وہ آ ہی رہے ہیں۔ صبح شام میں پہنچ جائیں گے۔ پریشان ہونے اور اپنی طبیعت خراب کرنے سے

کیا نام ہے؟"

"پتہ نہیں [illegible] کب آئے گا۔ ہم جاتے انھیں لینے۔" مینا بولی۔ چھوٹی بہن تھی۔ انیس بیس سال کی عمر۔ بڑی محبت کرنے والی۔ ہنس مکھ سی۔

علوی صاحب جو بہت ناراض تھے۔ بولے "کوئی ضرورت نہیں۔ گھر کا راستہ وہ بھول نہیں گیا۔"

پھر وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ دیوان خانے میں ان کے مؤکل حضرات اور دوست وغیرہ بیٹھے تھے۔ لیکن ان کا ذہن اب ایک جگہ تھم نہیں رہا تھا۔ انھوں نے ان سب سے الٹی سیدھی معذرت کرکے انھیں رخصت کیا اور خود [illegible] کر آرام [illegible] پر نیم دراز ہو گئے۔ دو دو غم جان کو لگ گئے تھے۔ [illegible] قیمہ کی بربادی۔ دوسرے ناخلف لڑکے کی ادھوری تعلیم۔ گویا سا جھگڑا رہے صرف [illegible] کی سیر و تفریح زمانے تک بیت لے گئے تھے۔ جی جل کر ہو گیا [illegible] کی سوچ [illegible] دل [illegible] [illegible] بیٹے تھے جن سے معتصم کو جدا [illegible] ۔

[illegible] خانے میں [illegible] انھیں معلوم تھا کہ معتصم [illegible] کا پلاؤ بہت [illegible] تھا۔ [illegible] دل میں [illegible] [illegible] سے بیٹے سب [illegible] مگر علوی [illegible] کے ہاتھ سے [illegible] لی [illegible] ۔

"اے بوا اتنے دنوں بعد لڑکا آ رہا ہے۔ کیا آپ نے [illegible] کا منہ [illegible] گی۔ رات کے لیے جو قیمہ رکھا ہے۔ اسے بیس کے جلدی سے کوفتے تل ڈالو۔ [illegible] تب تک پلاؤ کا بندوبست کر دوں۔" ان کے لہجے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ بلا سے [illegible] ڈاکٹر نے منع [illegible] ۔ جدائی [illegible] وہ اکثر چھپ چھپ کر رو لیتی تھیں۔ اب وہ پھر

میں رکھ کر باہر چلے گئے! معتصم نے اپنا بوجھل کوٹ اتار اور مینا کے کندھے پر ڈال دیا۔ پھر وہ مسکرائے۔

"لیجئے۔ اپنی وحشت میں مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اپنی بھابی سے ملتا۔" وہ اپنی دبلی پتلی نازک نازک سی حسین بھابی کی طرف جھکے اور بے حد ادب سے آداب بجا لائے!

وہ شرما گئیں۔

مینا نے منصور اور انصار کو سنبھال کر پُر مسرت لہجے میں کہا: "انھیں دیکھئے۔ آپ کے بھتیجے کتنے پیارے ہیں نا۔"

"آخ خاہ [illegible]" معتصم نے نعرہ لگایا "نہیں سچ کہو۔ یہ بھابی کے بچے ہیں؟ واہ رے [illegible] ان کی باتیں [illegible] بیگم علوی ہنس [illegible] "ارے دیوانے پھر یہ کس کے بچے ہیں؟"

"مجھے یقین نہیں [illegible]" معتصم نے دونوں کو دبوچ لیا اور سر ہلا کر بولے "یہ بھابی کے نہیں ہو سکتے۔ ابھی تو وہ خود ننھی بچی سی ہیں۔"

[illegible] معتصم نے اپنی بھابی کا دل جیت لیا [illegible] معتصم اپنے بھتیجوں کو پیار کرتے تھے۔ [illegible] [illegible] مجھے [illegible] ہوں۔

"اچھا آپ [illegible] وہ [illegible] چلے گئے۔

[illegible] انھیں دیکھا تھا اور [illegible] سے کچھ [illegible] آگئی تھی۔ [illegible] کے عالم میں [illegible] کے بیٹے [illegible] [illegible] سے کہا:

"یہ معمہ کیا ہے؟" علوی صاحب چیخے۔ "کس مردود نے یہاں سے ٹیلی گرام دیا ہے۔ جبکہ ایسی کوئی پیچیدہ سچویشن ہی نہیں تھی!"

رضا بھی ناخوشگوار لہجے میں بولے: "شدید بیمار ہیں۔ لاحول ولا قوۃ وضاحت نہیں کی کہ کون بیمار ہیں۔ کیسا واہیات مذاق ہے۔"

"صاحب یہ مذاق ہو یا کچھ اور۔" معتصم نے بھی نہایت ناراض ہو کر بے حد ناخوشگوار انداز میں کہا۔ "لیکن یہ تو سوچیے کہ میرا کیسا نقصان ہوا ہے۔ میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہوں۔ راستے بھر روتا رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون بیمار ہے۔ یہ بتائیے جناب کہ اب میرا ہو گا کیا؟"

"تو... تم۔ واپس جاؤ گے۔" رضا نے کہا۔

"جی... جا... والا۔ میرے نہ تو حواس درست تھے نہ میرے پاس اتنی رقم تھی کہ میں ریٹرن ٹکٹ بھی لیتا۔" معتصم نے بدستور خفا ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "اب آپ مجھے دس ہزار ٹکا کے واپس بھجوا سکتے ہوں تو بھجوا دیجیے۔ ورنہ میری میڈیسن کی پڑھائی تو گئی جہنم میں۔ ہائے ہائے...!"

سب حیرت اور تعجب سے بت بنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ علوی صاحب کی قانونی عقل بھی اس معمہ کو حل کرنے سے قاصر رہی!

"خیر۔ بہرحال۔" رضا نے کھنکھار کر کہا۔ "ہم سوچیں گے کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ تم معتصم۔ نہاؤ دھوؤ۔ کھانا تو شاید تیار ہو گا۔ پھر کھانے کے بعد آرام سے باتیں کریں گے!"

"جی بہت اچھا۔" معتصم نے کہا۔

علوی صاحب جو ابھی تک کسی سوچ میں گم تھے۔ تار کا فارم جیب

کلیجے سے آلگے گا۔ کتنا شریر، چلبلا اور خوش مزاج ہے۔ وہ گیا تھا۔ گھر کی روح نکل گئی تھی۔ اب پھر گھر میں قہقہے گونجیں گے۔ اللہ رکھے خاصا پڑھا لکھا ہے۔ یہیں روزگار مل جائے گا!

باورچی خانے میں دعوت کا سامان ہونے لگا!

نینا نے شیخ صاحب کی لڑکی رومہ کو ساتھ لیا اور بابر کا کمرہ درست کرنے پہنچ گئی۔ رومہ اس کی ہم عمر تھی۔ گھر کے قدیم ملازم شیخ صاحب کی اکلوتی بیٹی۔ ماں عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھیں۔ شیخ صاحب کچھ ہی مہینوں قبل ایک چھوٹے سے زخم میں زہر باد ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے۔ ماں باپ کے بعد رومہ کہاں جاتی۔ علوی صاحب کو شیخ صاحب کی خدمات یاد تھیں۔ انھوں نے رومہ کو اپنے پاس پناہ دی۔ چونکہ وہ اور نینا ایک ہی عمر کی تھیں۔ لہٰذا ان میں بہنوں کا سا پیار تھا۔ ایک دوسرے کی رازدار بھی تھیں۔ ان میں آقا و خادم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ گھر ہی کی ایک فرد سمجھی جاتی تھی۔ بیگم علوی کا خیال تھا کہ کوئی اچھا لڑکا اور شریف گھرانا ملے گا تو وہ نینا کے ساتھ ساتھ رومہ کو بھی اس کے گھر کا کر دیں گی!... وہ تھی بھی اتنی ہی سعادت مند، سلیقہ شعار، خاموش طبیعت کی ایک بہت پرکشش لڑکی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص وقار تھا۔ اسے کوئی نہ کہتا کہ وہ اس خاندان کے دیرینہ ملازم کی لڑکی تھی! بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتی تھی!

گلدان میں پھول سجاتے ہوئے نینا ہنس پڑی: "ارے دیکھ لینا۔ گھر کی تو ساری فضا کس طرح بدلتی ہے۔ میں تو دعا ہی مانگتی تھی کہ خدا کرے عصمی بھیا جلد آجائیں۔ یہ میری ہی دعا لگی ہے! میں تو سچ مچ بد حواس ہو چکی تھی۔ ارے کوئی زندگی ہے یہ بھی۔ ابا جان کو وکالت کی خشک باتوں سے فرصت نہیں

امی سے بھلا کیا باتیں کی جائیں۔ اور بھائی جان کی نہ کہو۔ ان کا تو سامنا ہی کرنے سے دم نکلتا ہے!"

وہ مسہری کی چادر اور غلاف وغیرہ بدل رہی تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ "ہاں تمھیں اتنے شریر تھے۔ مجھے بھی یاد ہے۔ بوا جی چھپکلیوں سے ڈرتی تھیں۔ ان کے ننھے منے پاندان میں مری ہوئی چھپکلی رکھ دی تھی۔ کیسی کیسی بولاتی تھیں۔ پورا پاندان گھورے پر پھینک دیا تھا۔!"

اپنے کمرے میں بھابی جلدی جلدی کپڑے بدل رہی تھیں۔ پھر انھوں نے اپنے دونوں ننھے منوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ منصور میاں ڈھائی سال کے تھے۔ اور ان سے چھوٹے انصار صاحب سات آٹھ مہینے کے!۔ ابھی تک سوائے تصویروں کے معتصم نے نہ تو اپنی بھابی کو دیکھا تھا نہ بھتیجوں کو۔ بھابی کو بڑا اشتیاق تھا جس دیور کی بینا اتنی تعریف کرتی ہے۔ وہ کیسا ہے۔ انھوں نے بھی صرف تصویریں ہی دیکھی تھیں۔؟

معتصم کے بڑے بھائی اعوان رضا ایک صوفہ پر بیٹھے ٹائم میگزین پڑھ رہے تھے لیکن ان کا ذہن بھی قابو میں نہ تھا۔ تقریباً سب ہی کو معتصم کی غیر متوقع آمد سے پریشانی اور آمد کا انتظار تھا۔

دن کے گیارہ بارہ بجے کے درمیان انتظار کی گھڑی کا خاتمہ ہوگیا۔ زینوں پر بھونچال سا آیا۔ صندوق کے دھڑ پٹخنے اور بستر بند کے گھسٹنے کی آوازیں کچھ تہقہے۔ اور زور زور سے پاؤں رکھ کے زینہ چڑھنے کی آہٹیں۔ آنگن سے بیگم علوی لپکیں۔ باہر سے علوی صاحب اندر آئے۔ اپنے کمروں سے لڑکیاں جھپٹیں۔ اور سب دالان میں اکٹھا ہوگئے۔

صاحبزادے معتصم ان سب کے سامنے کھڑے تھے۔!

عصمی بھیا۔!" بینا چیخی۔

"میرے بچے!" بیگم علوی نے کہا۔ اور انھیں کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ماں کے کندھے پر سے نظریں پھندا کر انھوں نے سب کو دیکھا۔ اور ایک لمبی سی اطمینان کی سانس لے کر الگ ہوئے اور پہلے سے زیادہ گہری سانس لے کر بولے۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ سب لوگ اچھے بھلے ہیں۔ مگر پھر اتنی گھبراہٹ میں تار دے کر مجھے کیوں بلایا ہے۔ یقین مانیے کہ اتنی بے چینی مجھے تھی کہ بس اپنا آدھا سامان میں وہیں چھوڑ کر بھاگا آیا ہوں۔!"

"تار۔؟" علوی صاحب نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو کس نے دیا تمھیں تار۔؟"

"تو کیا تھا تار نہیں؟" رضا نے بھی تعجب سے پوچھا۔

"ہے کہاں وہ تار۔؟" علوی صاحب نے پوچھا۔ سب وہیں بیٹھ گئے تھے۔

"جی۔ دیکھئے۔ یہ رہا۔!" معتصم نے اپنے جیب کی تلاشی لی اور ایک تار نکال کر علوی صاحب کو پکڑا دیا۔

رضا بھی جھک پڑے دیکھا تھا۔

"منصور بیمار۔ آپ فوراً پہنچیے۔!"

"ہائیں۔!" رضا نے بے حد متحیر ہو کر کہا۔

علوی صاحب نے کاغذات الٹ پلٹ کر پھر سے دیکھے۔ حیدرآباد ہی کا روانہ کردہ تھا۔ تاریخ کی مہر صاف پڑھی جا رہی تھی۔ اور کوئی ہفتہ عشرہ قبل کی تاریخ درج تھی۔

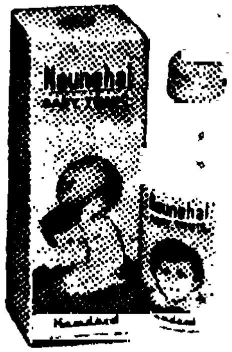
دانت نکلنے کے دنوں میں بچّہ کی مَدد کرتا ہے ...



نونہال گرائپ سیرپ

نونہال گرائپ سیرپ دانت نکلنے کے دنوں کے لیے خاص طور سے بنایا گیا ہے، جو ان مشکل دنوں میں آپ کے بچے کی مدد کرتا ہے۔ یہ مسوڑھوں کی تکلیف، پیٹ درد، قبض اور دستوں کی شکایتوں میں آرام دیتا ہے۔ ہاضمہ درست رکھتا ہے اور بھوک لگاتا ہے۔ دانت نکلنے کے دنوں میں بچے کو ہمیشہ نونہال گرائپ سیرپ دیجیے۔

ہمدرد



نونہال بے بی ٹانک

بچوں کی بھرپور تندرستی اور طاقت کے لیے غذائیت سے بھرپور نونہال بے بی ٹانک جس میں وٹامن اے، سی، ڈی، بی کمپلیکس اور چار معدنی اجزا شامل ہیں، جو آپ کے بچوں کی جسمانی بڑھوتری اور صحت کے ضامن ہیں۔ نونہال بے بی ٹانک سے بچہ مضبوط اور تندرست بنتا ہے۔ چست اور خوش و خرم رہتا ہے۔

... اور یہ مَدد کرتا ہے بچّہ کی بڑھوتری میں

786

SEASON'S BEST

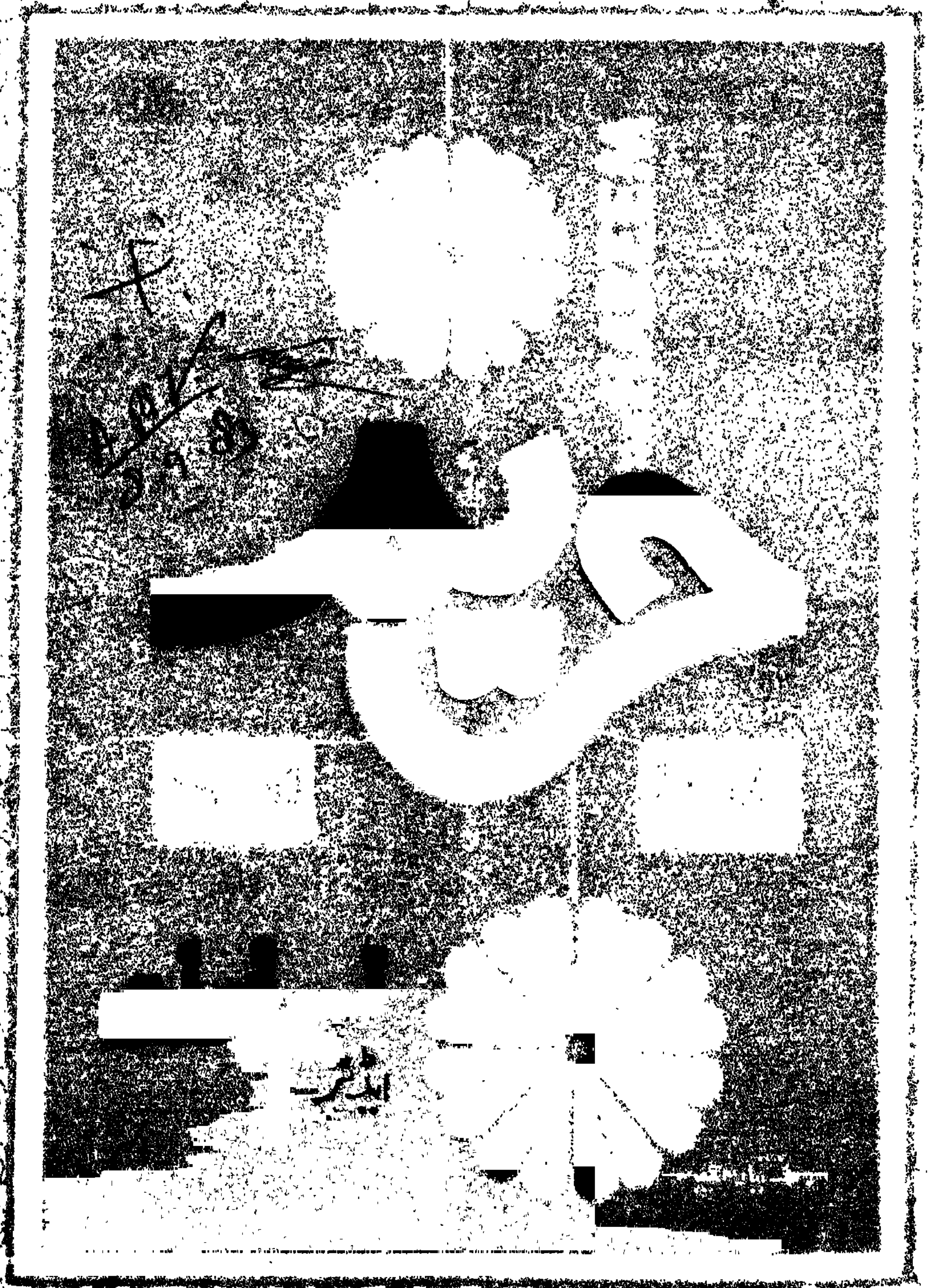
CITIZEN FAN



Guaranteed for 5 Years

CITIZEN FAN INDUSTRIES. 3 Crematorium Street, Calcutta-14

Distributors for U.P. : **BOMBAY ELECTRIC CO., Lucknow**



ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۴۴۵۵۹ ٹیلیفون نمبر رہائش ۔ ۴۵۳۳۴

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا

ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۳) فہرست مضامین ماہ ستمبر ۸۳ء نمبر (۹)

اڈیٹر و نگراں ۔ نسیم انہونوی

معاونین ۔ شوکت جہاں بیگم غزالہ ۔۔ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	ستائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	پچیس روپیہ
معمولی خریداری	"	بائیس روپیہ

وی ۔ پی سے منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۷۵ پیسے

غیر ممالک سے

انھیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

- حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا
- حریم ہر انگریزی ۵ / ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ / بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ / کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۔ ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے ۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ بھیجیں اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۔۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

جو پہلے چاروں طرف بے مقصد سرگرداں رہتا تھا، عارضی اور وقتی تقاضوں سے کبھی ایک رخ میں اور کبھی دوسرے رخ میں بہہ رہا تھا، اب سب طرف سے ہٹ کر اور سب چیزوں سے کٹ چھٹ کر ایک منزل مقصود پر آگیا ہے جو اس کا گھر ہے اور جس کی ملکہ اس کی بیوی ہے۔ کیا بیوی کے لئے یہ بات انتہائی کارگزاری کی نہیں کہ وہ شخص جو پہلے کسی کا نہیں تھا، اب زندگی بھر کے لئے اس کا ہو کر اس کے زیر اثر ہے: اس فتح یابی اور کامیابی پر بیوی کو بیحد شکر گذار اور احساس طمانیت سے لبریز ہونا چاہیئے۔

اظہار پسندیدگی و قدر شناسی

تشکر و طمانیت کے احساس و اظہار کے بعد دوسرا درجہ شوہر کی باتوں پر اظہار پسندیدگی کا ہے۔ وہ عورت جو بات بات پر شوہر کی بات کاٹتی اور اختلاف رائے ظاہر کرتی ہے، اس کے مذاق پر ناک بھوں چڑھاتی اور ہمیشہ اپنی رائے پر اڑی رہتی ہے، یا گفتگو میں حاکمانہ لہجہ اختیار کرتی ہے اور اپنی برتری ظاہر کرتی ہے، شوہر میں یاس و ناامیدی کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ شوہر رفاقت و ہم آہنگی کا بھوکا ہوتا ہے، جب یہ چیزیں اسے گھر میں نہیں ملتیں تو آخر کار وہ گھر سے کترانے اور دور دور رہنے لگتا ہے اور اچھے یا برے دوستوں میں دل بہلانے کو ترجیح دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ میاں بیوی دونوں میں ایک نفسیاتی یا روحانی خلیج حائل ہو جاتی ہے، جس کا خمیازہ زیادہ تر بیوی ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس حالت کی ذمہ داری زیادہ تر ناعاقبت اندیش بیوی ہی پر ہوتی ہے۔

شوہر کے آرام و آسائش کا خیال

سلیقہ مند بیوی ہر چیز میں شوہر کے آرام و آسائش کے خیال کو مقدم رکھتی ہے۔ رات کو خواہ وہ کتنی ہی دیر سے گھر آئے اسے گرم گرم کھانا دیتی ہے۔ صبح کا ناشتہ بڑے اہتمام و سکون سے کراتی ہے۔ جاڑوں میں گرم پانی تیار رکھتی ہے اور گرمیوں میں اسے برفاب پلاتی ہے۔ کھانا کھلاتے وقت اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے اور خفیف گھریلو جھگڑوں سے اسے پریشان نہیں کرتی۔ اس طرح کام پر جاتے وقت وہ مطمئن ہو کر گھر سے نکلتا ہے اور جب تھکا ماندہ گھر کو لوٹتا ہے تو گھر میں بیوی کی خوش سلیقگی دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کاروباری معاملات میں بھی سمجھدار بیوی اپنے شوہر کو نیک مشورے دیتی ہے اور مشکلوں میں ہمت بندھاتی ہے [illegible]

ازدواجی زندگی میں طرفین کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیئے

زندگی کے [illegible] ہموار [illegible] کو سمجھانا [illegible] کے لئے [illegible]

بیوی دونوں کو ہم قدم ہو کر ایک ہی سمت میں چلنا چاہیئے۔ سلیقہ مند بیوی وہی رخ اختیار کرتی ہے جدھر اس کا شوہر گامزن ہے۔ وہ مخالف سمت میں قدم نہیں بڑھاتی، بلکہ ہر مرحلے میں شوہر کے ساتھ اشتراک عمل کر کے تمام کٹھن منزلوں میں اس کی ہمدم و ہمساز اور رفیق راہ بنی رہتی ہے۔ اس طرح زندگی کی گاڑی ہم آہنگی کے ساتھ چلتی رہتی ہے اور منزل مقصود تک سلامتی کے ساتھ دونوں کی رسائی ہو سکتی ہے۔

غرض یہ کہ شوہر کے نباہ کے اہم گر یہ ہیں، شکر گزاری، بگوش ہوش اس کی باتوں پر کان دھرنا، شوہر کے ہر مرحلے اور بات میں تعاون، اس کی غلطیوں میں بھی شرکت، یہ یقین واثق کہ رشتۂ ازدواج ایک ناقابل شکست رشتہ ہے، جسے آخری دم تک قائم رہنا اور قائم رکھنا چاہیئے۔ یہ تمام اسلحہ ایسے ہیں، جو صرف ایک سلیقہ مند اور خوش قسمت عورت کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

نقاب کا خاتمہ اور واپسی

مراکش میں نسوانی آزادی کی تحریک کی علم بردار فاطمہ مرنسی کا خیال ہے کہ جو مسلمان عورتیں نقاب پہننا چھوڑ رہی ہیں اور جو نقاب کو پھر اختیار کر رہی ہیں وہ دونوں عورتوں کے حقوق کے لئے ایک ہی لڑائی لڑ رہی ہیں۔

امریکی دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والی فاطمہ مرنسی نے اپنی کتاب "ماورائے نقاب" میں لکھا ہے کہ درمیانی طبقہ کی مسلمان عورتوں میں نقاب اور پردے کے رواج کے خاتمے قوم پرستی اور اصلاح کی اس لہر کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ کے بعد مغربی ایشیا کے بڑے علاقہ میں پھیل گئی تھی۔ اس وقت عرب دنیا ترکی سلطنت سے آزاد ہوئی تھی اور بڑے بڑے عرب شہروں میں مغربی فیشن مقبول ہو گئے تھے

فاطمہ مرنسی نے لکھا ہے کہ اس کے باوجود یمن، خلیجی علاقوں اور بدوؤں میں چہرے پر نقاب کا رواج قائم رہا کیونکہ یہ غیر معمولی قدامت پسند علاقے تھے سر سے پیر تک کا لبادہ برقعہ اور چادر کا رواج مراکش اور ایران میں بھی رہا اور اسلامی سماج کے قدامت پسند طبقے اس کو استعمال کرتے رہے حالانکہ ان میں چہرہ بے نقاب رہتا ہے اور یہ لباس ایسے ہیں جن میں ضرورت پڑنے پر چہرہ کو چھپانے کے لئے دامن کی گنجائش ہوتی ہے

فاطمہ مرنسی نے لکھا ہے کہ حال ہی میں ایران، تیونس اور مصر کے باغی نوجوان مسلمان لڑکیوں اور عورتوں نے نقاب یا اس کے آج کل کے زمانہ کی تبدیلی شکلوں کو پھر سے اختیار کر لیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ

وہ اپنے اس ملک کے سماجی اور سیاسی رجحانات کی مخالفت کا اظہار کر سکیں۔

میک اَپ کی وبا

عمارت پرانی ہو، قابل مرمت ہو، پلاسٹر ٹوٹ گیا ہو، رنگ روغن اڑ گیا ہو تو بلاشبہ اس کی مرمت پر توجہ دے کر دلکش بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے، لیکن نئی نئی عمارت کے ساتھ مرمت اور لیپ پوت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے یہاں غزالہ سے یا مجھ سے ملنے والیاں کثرت سے آیا کرتی ہیں، ان میں حسین و جمیل جوان لڑکیاں یا دلہنیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ اور انھیں میں سے اکثر پورا میک اپ کر کے آتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ چیزیں جو میک اَپ میں استعمال کی جاتی ہیں، جلد کو خراب بھی کرتی ہیں۔ یہ حسین اور جوان لڑکیاں اور دلہنیں کیوں میک آپ کرتی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے خیال سے وہ بلا میک اَپ کے زیادہ اچھی لگیں گی۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے جوان حسن کو پرانا اور قابل مرمت سمجھتی ہیں اور کیوں ابتدا ہی سے اپنی مرمت اور لیپ پوت کا اپنے کو عادی بناتی ہیں۔

میں اور زیادہ حیران ہوتا ہوں جب میں چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو بھی میک اَپ کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ نہ جانیں ان کی مائیں انھیں کیوں میک اَپ کا عادی بناتی ہیں۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب شادی سے پہلے لڑکیوں کو بھڑکدار کپڑے بھی نہیں پہنائے جاتے تھے، انھیں سادہ سوز رکھا جاتا تھا۔ کیا یہ مصلحت ہماری موجودہ جنریشن (نسل) کی ماؤں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسا کرنے کے عواقب کیا ہوتے ہیں۔ کیا یہ سب ان کی نمائش کے لئے کیا جاتا ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے، لیکن یہ اچھی بات نہیں کہ بچپن ہی میں لڑکیاں گھوری جانے لگیں۔ کیا ہمارے بزرگ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ کیا ان میں کوئی شعور نہیں تھا۔ ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ میک اَپ کے سیلاب میں نہ بہیں۔ یہ نہ صرف یہ کہ فضول خرچی ہے، بلکہ اس سے جلد بھی خراب ہوتی ہے۔ اور کچھ عرصہ بعد تو اگر میک اَپ کرنے والا، بلا میک اَپ کے نظر آجائے تو عجیب سا نظر آتا ہے۔ حسن کی افزائش کے لئے بڑی بوڑھیوں کے نسخے یعنی ابٹن وغیرہ کا استعمال کیجئے، جو جلد کو دلکش پرکشش اور حسین بناتے ہیں اور یہ دلکشی ہمہ وقت قائم رہتی ہے۔ صبح سو کر اٹھیں تو بھی آپ کا چہرہ ترو تازہ نظر آئے گا۔ اس کے برخلاف میک اَپ کرنے والوں کے چہرے شب باشی کے بعد عجیب سے ہو جاتے ہیں اور انھیں سب سے پہلا کام یہی کرنا ہوتا ہے وہ جلدی سے میک اَپ کر کے اپنی صورت درست کرلیں۔ گرانی کے اس دور میں میک اَپ کے گرانقدر اخراجات کو کم کر کے، ابٹن کا استعمال کریں۔ یہ اشتہاری اشیا، اسی مغرب کی دین ہیں، جس نے ہمارے معاشرے کو چوپٹ کر کے رکھدیا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیئے کہ کیا سو برس پہلے بھی عورتیں میک اَپ کرتی تھیں۔ جواب نفی میں ہوگا، اس لئے کہ اس وقت کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ میک اَپ کیا بلا ہے۔ لیکن حسن اس وقت بھی عورتوں کے پاس ہوتا تھا، اس وقت بھی افزائش حسن کی چیزیں تھیں۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کے جسم پر ابٹن ملا جاتا تھا، جس سے ان کی جلد شاداب ہو جاتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ترقی پسندی نے جس طرح سگریٹ رائج کر کے حقے کو ختم کر دیا، اس طرح ابٹن وغیرہ کا استعمال بھی باقی نہیں رہا۔ کون نہیں جانتا کہ حقہ ایک سائنٹفک چیز تھی اور سگریٹ مضر ترین شے ہے۔ لیکن استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح میک اَپ نے بھی وبائی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ چھوٹی بچیوں کو بھی ماؤں کو دیکھ کر میک اَپ سے دلچسپی ہوتی جارہی ہے اور لطف یہ کہ کوئی انھیں نہ ٹوکتا ہے، نہ روکتا ہے۔

چند حقائق

- مرنے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے کیونکہ وہ عورتوں پر بھی مرتے ہیں۔
- انسان نے تاریخ سے جو سب سے بڑا سبق لیا ہے وہ یہ کہ انسان نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں لیا۔
- میں تین لفظ ایسے جانتا ہوں جو ہر خانگی لڑائی کو فوراً ختم کر دیتے ہیں۔ معاف کرنا۔ ڈارلنگ
- اگر محبت نہ ہوتی تو خطوط کی تعداد گھٹ کر آدھی رہ جاتی اور محکمہ ڈاک کا کام کم ہو جاتا۔
- ماڈرن گھروں میں روٹیاں کبھی باسی نہیں ہوتیں اس لئے کہ پکتی ہی نہیں۔

عفو و درگذر، اسلام کا طرۂ امتیاز

(از: عبدالغنی شمس)

"میں نے ایک رات یہ خواب دیکھا کہ یثرب سے ایک نہایت ہی روشن چاند چلا آرہا ہے، یہاں تک کہ وہ میری گود میں آگیا۔"

یہ خواب دیکھنے والی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حضرت جویریہؓ کے والد کا نام حارث بن ابی ضرار الخزاعی تھا۔ یہ قبیلہ مصطلق کے سردار تھے۔ مدینہ میں اسلام کے پھولنے پھلنے کی وجہ سے کفارِ مکہ کے ساتھ، مدینہ کے اطراف و جوانب کی غیر مسلم طاقتیں ہمہ دم مخالفت پر آمادہ تھیں۔ پہلے تو تنہا قریش، اسلام دشمنی میں سرگرم عمل تھے۔ اب یہودی بھی ان کے حلیف و مددگار بن گئے اور دونوں نے مل کر مکہ سے لے کر مدینہ تک تمام قبائل میں مسلمانوں کے خلاف آگ بھڑکا دی۔ اور سبھی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے جس کے نتیجہ میں ہلکی ہلکی جھڑپیں بھی ہوئیں۔

خزاعہ کا قبیلہ، قریشِ مکہ کا حلیف تھا۔ اس کے علاوہ دونوں میں باہم قرابت داریاں بھی تھیں۔ اسی وجہ سے خزاعہ کو قریشِ مکہ کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا۔ اس قبیلہ کی ایک شاخ جو بنی مصطلق کہلاتی تھی وہ مدینہ سے تھوڑی مسافت پر مریسیع کے مقام پر آباد تھی۔ اس قبیلہ کے رئیس حارث بن ابی ضرار نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

جب ختمی مرتبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حارث بن ابی ضرار کے منصوبے کی خبر ملی تو آپ بھی اپنے جانباز مجاہدوں کو ساتھ لے کر شعبان ۵ھ میں مدافعت کی غرض سے نکلے۔ مسلمانوں کے اچانک یلغار کی وجہ سے حارث بن ابی ضرار دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اور موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنے ہی میں مصلحت سمجھی لیکن مریسیع والوں نے کہا: "اگر ہمارے سردار حارث بن ابی ضرار نے پست ہمتی دکھائی تو کیا ہوا؟ ہم لوگ اس کی پیروی ہرگز نہ کریں گے اور مسلمانوں سے لڑ کر انھیں شکستِ فاش دیں گے۔"

اب کیا تھا؟ جنگ شروع ہو گئی اور دونوں طرف کے جانباز بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دینے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مریسیع والے بڑی بے جگری سے لڑے مگر قسمت میں جو لکھا تھا پیش آیا۔ وہ لوگ جانباز مسلمانوں کا مقابلہ زیادہ عرصہ تک نہ کر سکے۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ انجام کار انہوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی۔ ان کے [illegible] آدمی [illegible] باقی پورا قبیلہ جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو بہت سا مال ہاتھ آیا۔ اور بہت سی لونڈیاں اور غلام بھی ملے۔ انہیں جنگی قیدیوں میں سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ جویریہ بہت خوبصورت تھیں۔ اس وقت تک انہوں نے زندگی کی بیس بہاریں دیکھی تھیں۔

جویریہ نے اس لڑائی سے تین چار دن پہلے یہ خواب دیکھا تھا کہ یثرب سے بہت روشن چاند آرہا ہے یہاں تک کہ میری گود میں آگیا۔ حضرت جویریہ کہتی ہیں کہ جب میں جنگی قیدی بنی تو مجھے اپنے خواب کی تعبیر کی امید پیدا ہوئی۔

حضرت جویریہ کا اصل نام برّہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر جویریہ رکھا۔ حضرت جویریہ شادی شدہ تھیں۔ ان کے شوہر کا نام مسافع بن صفوان تھا۔ جو اسی جنگ میں کام آیا۔ حضرت جویریہ حضرت ثابت بن قیس انصاری کے حصہ میں پڑی تھیں۔ حضرت جویریہ بہت ہی ذی وجاہت خاندان کی چشم و چراغ تھیں اور سردار کی صاحبزادی۔ ان کی غیرت نے غلامی کو گوارہ نہ کیا۔ نو اوقیہ سونے پر حضرت ثابت بن قیس انصاری سے رہائی کی شرط قرار پائی تھی۔ لیکن حضرت جویریہ کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی تو نہ تھا پھر وہ مطالبہ کی رقم کس طرح ادا کرتیں؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اچانک انہیں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آیا۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بہت ہی غمگین لہجہ میں کہا:

"یا رسول اللہ! میں اپنی قوم کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بدقسمت بیٹی ہوں۔ میں جن مصیبتوں میں گرفتار ہوں، ان سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ میں جو رقم دے کر آزاد ہو سکتی ہوں، وہ میری طاقت سے باہر ہے۔ اب آپ کے حضور میں امید لے کر حاضر ہوئی ہوں۔"

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سکون و ہمدردی کے ساتھ حضرت جویریہ کی استدعا سنی۔ اور آپ نے فرمایا:

"میں تجھے اس سے بہتر راستہ کیوں نہ بتاؤں؟"

حضرت جویریہ نے کہا: "فرمائیے حضور۔"

حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا: "میں تیری طرف سے ثابت کی مطالبہ رقم ادا کر کے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

حضرت جویریہ کے لیے اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے شادی کی پیشکش کو خوشی سے منظور کرتے ہوئے کہا: "حضور! مجھے قبول ہے۔"

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا خواب سچ نکلا اور وہ ام المومنین بن گئیں۔

ایک مشہور روایت کے مطابق حضورؐ نے حضرت جویریہ سے یہ شادی سنہ ۵ھ میں کی۔ اور بعض سیرت نگاروں نے اس واقعہ کو سنہ ۶ھ کا بتایا ہے۔

صحابہ کرام کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ نے حضرت جویریہ سے نکاح کر لیا اور اس تازہ رشتہ کی وجہ سے بنو مصطلق اب حضور کی سسرال بن گئے تو انہوں نے اس رشتے کے اعزاز اور تقدس کے پیش نظر بنو مصطلق کے وہ لوگ جو ان کے لونڈی اور غلام تھے سبھی کو آزاد کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے طفیل سو گھرانے آزاد ہو گئے جن میں تقریباً سات سو افراد تھے۔

اس قسم کی مصلحتیں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان سب کاموں میں تھی جو آپ نے کیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ سے شادی کر کے دشمنوں کے ساتھ فراخ دلی حسن سلوک اور آبرو مندانہ رویہ اختیار کرنے کی بے نظیر مثال قائم فرمائی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اسی رحمدلانہ سلوک کی بنا پر حضرت جویریہ کے والد حارث بن ابی ضرار بھی ایک دن حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مریسیع کے معرکہ میں، مال غنیمت کے لالچ میں بہت سے منافقین بھی مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے جو ہر موقع پر فتنہ فساد برپا کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے میں ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی جماعت کو آواز دی فریقین کی تلواریں میان سے نکل پڑیں۔ چند آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور بات بگڑ کر سنور گئی۔ مگر اس واقعہ کی وجہ سے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو بھڑکانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے انصار سے کہا:

"تم لوگوں نے یہ بلا خود مول لی ہے۔ مہاجرین کو تم نے اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ اب وہ تمھارے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اگر اب بھی تم ان کی دستگیری چھوڑ دو تو یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو عبداللہ بن ابی کی اس زہر افشانی کی خبر ہوئی تو وہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور حضور کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا:

"حضور! اجازت ہو تو عبداللہ بن ابی کی آج ہی گردن اڑا دوں۔" رحمت عالم نے بڑے صبر و تحمل کے لہجہ میں فرمایا:

"اے عمر! کیا تم یہ چرچا پسند کرو گے کہ یہ لوگ کہتے پھریں کہ "محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔"

حضور کا یہ جواب سن کر عمرؓ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ عبداللہ بن ابی کے بیٹے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اسلام کے سچے اور پرجوش شیدائی تھے۔ جب انہیں اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ کہا:

"حضور! دنیا جانتی ہے کہ میں اپنے والد کا کتنا اطاعت گزار ہوں لیکن اگر آپ کی یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم فرمائیے کہ میں جا کر ان کا سر کاٹ لاؤں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی دوسرے کو حکم دیں اور میں محبت اور غیرت کے جوش میں اپنے والد کے قاتل کو قتل کر دوں۔"

سرور کائنات نے فرمایا: "تم اطمینان رکھو میں تمھارے باپ کو قتل نہ کروں گا بلکہ ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤں گا۔"

افک کا واقعہ جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگائی گئی تھی اسی غزوۂ مریسیع میں پیش آیا تھا لیکن قرآن حکیم نے خود اس کی پردہ دری کر دی۔ اور تہمت لگانے والے رسوا و ذلیل ہوئے۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے صرف سات احادیث مروی ہیں جنہیں سے ایک "صحیح بخاری" اور دو "مسلم" میں ہیں۔ آپ سے حضرت ابن عباس حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر نے احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے لیے چھ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔ حضرت جویریہ نے سنہ ۵۰ھ میں پینسٹھ برس کی عمر میں، مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔ بعض مورخین نے حضرت جویریہؓ کا انتقال سنہ ۵۶ھ میں، ستر سال کی عمر میں لکھا ہے۔ ام المومنین حضرت جویریہ کی نماز جنازہ والی مدینہ مروان بن الحکم نے پڑھائی۔

نعت

از۔ ابنِ حقانی ——— لکھنؤ

یا رسولؐ اللہ حبیبؐ کبریا، صادق امیںؐ
مصطفےٰ و مجتبےٰ و رحمتہ اللعالمیں

رب نے جب مبعوث فرمایا زمیں پر آپ کو
ہو گئے نغمہ سرا، صفت آسماں اور یہ زمیں

ظلمتوں پر نور چھایا اور خزاؤں پر بہار
اس سے پہلے کب تھے یہ ارض و سما اتنے حسیں

یوں تو لاتعداد بھیجے انبیاء اللہ نے
آپؐ سا محبوب لیکن دوسرا کوئی نہیں

بخش دی ایماں کی دولت اور شعورِ دین بھی
اور بتایا تیرا رب ہے تیری شہ رگ سے قریں

ہے وہی مومن جسے توفیق سنت ہو نصیب
اور جھکتی ہو خدا کے نام پر جس کی جبیں

اس جہاں میں گر ملے ہم کو رضا اللہ کی
ہے شفاعت آپؐ کی پھر تو مجھے عین الیقیں

آپ ہی ظاہر و ظاہر، آپؐ ہی حجّت و نورؐ
آپ ہی خیر الانام اور آپؐ ہی یٰسیں مبیںؐ

چشمِ حقانی کو لگی ہے اب مدینے کی لگن
ہے تمنا دل میں ہو بس پائے اطہر پر جبیں

حسنِ جہاں سوز

(از ب۔ ن آمنہ ابراہیم)

تیرے حسن کا شہرہ کانوں نے سنا۔ تصور کی آنکھوں نے دیکھا دل نے قبول کیا۔ اس کا فیصلہ دماغ کو سونپا۔ دماغ اونچ نیچ کی سوچ میں الجھا ہوا سوچ بوجھ میں کھویا رہا۔ آنکھوں نے تصور [illegible]

دل بے تاب ہوگیا۔ اس کی دھڑکن ناقابلِ برداشت ہوگئی۔

آخر کار دماغ نے خرد کی شمع جلائی۔ دلِ دیوانہ اس جلوۂ جہان آرا کو دیکھنے کے لیے مضطرب ہوگیا۔ مثلِ پروانہ اس شمع کے تصور میں اسکے گرد گھومنے لگا ——— مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ وہ اس حسنِ جہاں سوز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بیقرار ہوگیا ——— دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس کی تلاش میں جنگل کی راہ لی ——— دور ایک آگ کا شعلہ نظر آیا۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو۔ شعلہ طور پہاڑ کے دامن میں پہونچ کر غائب ہوگیا۔ وہ حیران ہوکر اسے دیکھتا رہ گیا ——— ندا آئی۔ اور ——— دربارِ حسن سے حکم صادر ہوا کہ طورِ سینا پر آئے۔ وہاں پہنچ کر اس کی بے قراری نے رَبِّ اَرِنِی کا تقاضہ کیا۔ ندا آئی قَالَ لَنْ تَرَانِیْ اس آواز پر نادان دل اور مچل گیا ——— بار بار تقاضے اور محب کے عشقِ صادق پر محبوب کو رحم آیا۔ فرمان آیا۔ اِنِّی اَنَا رَبُّکَ ——— ہوشیار! کہیں ہوش و حواس نہ کھو دینا۔ معاً ایک شعلۂ نور چمکا جس نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا ——— دیدار کا طالب جلوۂ حسن کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا۔ اس شعلہ کی تپش سے پہاڑ جل کر سیاہ ہو گیا ——— !

حسن کے بھی عجب کرشمے ہیں۔ کسی کو کلیم بنادیا کسی کو اپنے حسنِ سوز سے جلا کر خاک سیاہ کر دیا ۔!!!

لاگا چندری میں داغ

(از قیصری رحمان ایم اے)

اماں بھی ہر آئے گئے کے سامنے اس کا ذکر لے بیٹھتیں۔ جب سے اس نے بی اے کیا تھا' انہیں بس اسی کا روگ لگا جا رہا تھا۔

"اونہہ" اسے غصہ آجاتا۔ سنجوگ جب ہوگا ہو جائے گا یہ کیا بھک منگوں کی طرح ہر آئے گئے کے آگے ہاتھ پھیلائے رکھنا۔

بڑی اپیا آتیں تو اماں کہتیں۔ "ارے صفو! ذرا بہن کا دھیان کرو تمہارے میاں تو فوج میں ہے کسی جونیئر افسر سے اس کی شادی کرا دو پر اتنا خیال رکھنا لڑکا سید خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔"

"اماں میں تو خود ہی تلاش میں رہتی ہوں" آپ فکر نہ کریں جب بھی کوئی لڑکا ملا فوراً انگینہ کو بلوا بھیجوں گی۔" وہ ہمیشہ اماں کو ٹال جاتیں

"اے شموں!" جب بھی چھوٹی اپیا آتیں اماں ان کے سر ہو جاتیں "تیری تو بہت بڑی برادری ہے کئی لڑکے باہر بھی گئے ہوئے ہیں۔ اے کوئی بہن کا جوڑ بھی ڈھونڈھ۔"

"اچھا اچھا اماں" یہ چھوٹی اپیا کو اپنے ننھے ننھے کیڑوں ہی سے فرصت نہ تھی جوڑ ڈھونڈھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اور پھر گر پڑ کے تو ناطے کیے نہیں جاتے۔ کوئی عندیہ ظاہر کرے تو میں بھی بات کروں۔

"اونہہ!" بیگو جل کے رہ جاتی۔

اب رہ گئے بڑے بھیا ۔۔ بھابی تو خیر اماں کو کچھ سمجھتی ہی نہ تھیں اسی لئے تو بھیا کو لے کے الگ ہو گئی تھی، اب اماں ہی کے باعث کبھی کبھار آتے جاتے۔ بھیا کے کان میں بھی ڈاکرتیں جیسے بھیا کے سارے کنوارے دوست بس ان کی بہن ہی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ اور دونوں بیوں کے سسرالی دیوران کی بنو کو اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ اماں بجانے کس زمانے کی پیداوار تھیں سمجھتی ہی نہ تھیں۔

بھیا سیکڑوں بار اس ذکر کو بڑی خوب صورتی سے ٹال گئے اور ایکبار تو جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے کہ "بیگو کوئی نوکری ہی کر لے دل بھی بہلا رہے گا اور تب کوئی اچھا سا رشتہ بھی مل جائے گا۔"

"لو اور سن لو اماں بی۔ تمہارے کما ؤپوت نے کیسا جواب دیا ہے ان کا مطلب ہے اسے بی۔ اے کس دن کے لیے کرایا تھا۔ رشتے ملنے کوئی آسان کام نہیں ہے اور ہم خود بال بچوں والے ہیں۔ یہ ڈولا ہم سے نہ اٹھے گا۔ اس سے کہو نوکری کر لے۔ پیسے جمع کرے اپنا جہیز بنائے اور پھر جہاں مرضی چاہے چلی جائے۔

"ہائے ہائے۔" اماں تو دہائی دینے لگتیں اس نگوڑ مارے کا یہ مطلب تھا۔" ارے۔! ابھی اتنی مجھ میں سکت ہے کہ تیرے ہاتھ پیلے کر سکوں خدا جنت میں گھر کرے تیرے باپ کا۔ مجھے کسی کا محتاج چھوڑ کر نہیں گئے تین بچوں کو بیاہا ہے۔ تیرے نصیب کا تجھے بھی مل جائے گا۔"

"ہاں ابا میاں کیا گئے اس گھر سے تو محبت ہی رخصت ہو گئی ہے بس ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ اماں نے عقل مندی سے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو بیاہا۔ پھر کسی نے پلٹ کر اماں اور بیگو کی طرف نہ دیکھا۔ ہر ایک کے اپنے مسئلے کھڑے ہو گئے۔ اور بیگو گلکڑی کی بیل کی طرح بڑھتی بڑھتی بی۔ اے کر کے گھر بیٹھی چارپائیاں توڑ رہی تھی۔

تعلیم بھی سب سے زیادہ۔!

صورت بھی اچھی۔!

سیرت بھی خوب۔!

لیکن کسی کو اس کی فکر نہ تھی۔ کون اس کے بیاہ کی بات کرتا۔ امی یونہی بیٹھے جاتیں۔ اور ہر آئے گئے پر پیسے خرچ کئے جاتیں۔

ایک دن پریشان ہو کر وہ یونیورسٹی چلی گئی۔ گھر میں پڑے پڑے سارا دن بس اماں کی دہائیاں سنو۔ اچھے برے رسالے چاٹتی رہو۔

ہاں عام لوگوں کو اچھے لڑکے ملنے مشکل ہو رہے ہیں اور انھیں تو خاص سید زادے کی تلاش ہے۔ جب نوکری ہی مقدر ہے تو پھر ایم اے کیوں نہ کیا جائے۔

اماں چیختی رہ گئیں لیکن اس کی انا جاگ اٹھی تھی۔

اس دن وہ لائبریری سے نکل رہی تھی تو ایک نوجوان کار لے کر سامنے آگیا۔

وہ ٹھہر گئی۔ اس شہر میں کاروں کو لے کر لڑکی کے آگے پیچھے گھومنا کوئی نئی بات نہ تھی اور ایسوں سے نپٹنا وہ خوب جانتی تھی۔ اس لیے بہت سکون سے کھڑی رہی۔

"چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں"۔ وہ بڑی شان سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"کس خوشی میں؟" وہ بہت خود اعتمادی سے بولی "کیا اس کے لیے جان پہچان کا ہونا ضروری نہیں۔ ؟"

"میں آپ کو جانتا ہوں، آپ کا نام بھی جانتا ہوں اور آپ کو روز لائبریری میں آتے جاتے دیکھا کرتا ہوں۔"

"دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں دیکھا کیجئے۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"اس کا مطلب ہے آپ نے میرا گھر تک پیچھا کیا ہے؟"

"ہاں! ۔" وہ شرمندگی سے ہنسا

"اس سے ظاہر ہوتا ہے تمہاری نیت اچھی نہیں ہے۔"

"جی۔ نیت سے آپ کی کیا مراد ہے ؟"

"نیت سے وہی مراد ہے جو ہوا کرتی ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔"

"اس شہر میں نیا نیا تبدیل ہو کر آیا ہوں۔"

"دل بہلانے کا سامان چاہئے۔ ؟"

"جی نہیں۔ آپ غلط سمجھی ہیں۔ میں بہت شریف آدمی ہوں ــــ!"

"شریف آدمیوں کی تو اب فصل ہی اترنا بند ہو گئی ہے ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ فی زمانہ شریف آدمی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔"

"آپ بہت ذہین ہیں۔!"

"آپ بہت شاطر ہیں!"

"اچھا جب اتنی ساری باتیں ہو گئی ہیں تو آپ سے اپنا تعارف ضرور کراؤں گا۔"

"کرائیے!"

"میرا نام اظفر کمال ہے۔ وہ سامنے میرا دفتر ہے۔ میں بہت اچھی پوسٹ پر ہوں۔ میرے پاس ایک فلیٹ اور ایک کار ہے بالکل تنہا ہوں اور ...."

"اور اس کام کے لیے آپ کو مشاطہ نہیں ملی۔"

"آپ واقعی بہت ... بہت ہی ذہین ہیں۔ پہلے پہل تو آپ کی صورت مجھے پسند آئی تھی۔ روز دفتر سے باہر آ کر آپ کو آتے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا لیکن اب میں آپ کا گرویدہ ہو گیا ہوں!"

"گرویدہ کو ذرا سلیس اردو میں تبدیل کیجئے۔"

"ہاہاہا ــ!" کیا خوب صورت انداز تھا اس کے بے اختیار ہنسنے کا۔ یہ تو کوئی عجیب بات نہ تھی۔ دونوں کی باتیں ایک دوسرے کے ذہن میں یوں کھنچتی جا رہی تھیں جیسے وہ جنم جنم سے ایکدوسرے سے واقف ہوں۔

"خدا کے لیے آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔" میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیے۔ میں نے آج تک اتنی خوب صورت باتیں کرنیوالی لڑکی نہیں دیکھی.... عام طور پر لڑکیاں احمق اور بیہودہ ہوتی ہیں یا پھر انٹلیکچول بننے کی کوشش میں اور بھی ہونق نظر آنے لگتی ہیں۔ ایسی سچی کھری اور پیاری باتیں ایک لڑکی کر رہی ہے میرے سامنے نہ بے جا حجاب، نہ انجانا خوف میں آج آپ کو نہیں جانے دوں گا۔"

"نہیں جانے دوں گا۔"

کتنی خوفناک دھمکی تھی۔ گھر سے فرار حاصل کرنیوالی نگو موم کیطرح پگھلنے لگی۔ تعریف کا یہ انداز نیا بھی تھا اور انوکھا بھی۔ کوئی ہمیں کھوجے کوئی پوچھے۔ ہر جوان لڑکی یہی کشکول تھامے تو بھیک مانگتی پھرتی ہے اور اس کے کشکول میں یہ کھرا سکہ بن مانگے آگرا ہے۔

اس کی آنکھوں کی زبان پڑھنے والا۔

اس کی مسکراہٹ کو زبان دینے والا۔

انوکھا نرالا جادوگر۔ چند ہی دنوں میں اس کے حواس پر چھا گیا اور نگو نے بھی اس کے ہوش و حواس پر بجلی گرا دی تھی۔ عشق وفا بھی عجیب ہے۔ من پھونکتا ہے۔ تن پھونکتا ہے اور پھر انسان کو سارے جہان سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ملاقاتیں زندگی کو ہر بار ایک نیا موڑ بخشتی رہیں۔

شہر میں ایک نیا نیا ریستوراں کھلا تھا گرمیوں میں ٹھنڈا اور سرد میں گرم۔ ماحول بھی رومان پرور اور فضا بھی سازگار۔ دونوں کی دوپہر وہاں گزرنے لگیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہال کے نیم تاریک گوشہ میں پڑی میز کے گرد دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ کون آیا، کون گیا، انہیں کب ہوش رہتا۔ ... کے زمانے میں بس ایک دیا آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔

محبوب کا چہرہ، اسے چاند کہہ لو، چکور سے تشبیہ دے لو، دل، جگر سمجھ لو، اس چہرے کے اس پار کیا ہو رہا ہے۔ کون جانتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے مغربی دھنوں کے سروں پر جھولتے۔ کبھی جب اجو جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر نگو کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیتا تو اس کے جسم و جان کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے۔

"اجو! تم کتنی زبردست حقیقت ہو۔"

"حقیقت جو اپنا آپ منوا رہی ہے۔"

اور جو کبھی وہ میز پر رکھے ہوئے ہاتھ پر اپنا گرم گرم ہاتھ رکھ دیتا تو اس کے من میں جیسے ننھے منے قمقمے روشن ہو جاتے۔

اجو روشنی اور حرارت کا مرکز بن چکا تھا۔ مسجود بھی، معبود بھی۔ جس حرارت سے موم پگھلتا ہے اسی کے آگے سر ٹیک دیتی۔ ان منزلوں پر نگو جیسے دوڑی جا رہی تھی۔

جس ریستوران میں ان کی کیف آور دوپہریں گزرتی تھیں اس ریستوران کے باہر ایک فقیر اکثر چمٹا بجا بجا کر ایک خوب صورت گانا گایا کرتا تھا۔

اس دن جب وہ دونوں کار سے اترے ایک فقیر اپنی دھن میں مدہوش ناچ رہا تھا، چمٹا بجا رہا تھا اور گا رہا تھا۔

"لگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے۔"

موٹر سے اترتے ہی نگو نے اپنا پرس کھولا۔

"کیا بات ہے؟" اجو نے پوچھا

"مجھے یہ گیت بہت پسند ہے جو یہ فقیر گا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں یہ گانا سن کر میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔"

"بس عورتوں کو تو رونے دھونے والے ہی گانے اچھے لگتے ہیں"

"نہیں۔ اس گانے میں گہرا تصوف ہے۔ تم نے کبھی غور کیا؟"

"تصوف وغیرہ کا میں قائل نہیں ہوں۔"

"کیا سچ؟ میں تو تصوف کو بہت مانتی ہوں۔"

"بھئی کچھ عرصہ سے میرا تصوف، میرا اسکول، میری طریقت اور میری بندگی جو کچھ ہو بس تم ہی ہو۔"

"اوہ۔۔!" نگو کا دل دھڑک سا اٹھا۔ اظہارِ محبت کا کتنا انوکھا انداز تھا۔

"مگر میں اس فقیر کو پیسے ضرور دوں گی۔"

"ہاں۔ تم جیسی رقیق القلب خواتین نے ہی ان چمٹا بجانے والوں کے لیے چرس اور افیون کی راہیں آسان کر دی ہیں۔"

"بھئی توبہ ہے۔ اتنی بدگمانی اور وہ بھی ایک درویش سے۔" نگو نے آگے بڑھ کر درویش کی ہتھیلی پر ایک روپیہ رکھا۔

فقیر نے آنکھیں کھول کر پہلے ہتھیلی پر رکھا ہوا روپیہ دیکھا پھر پلکیں اٹھا کر نگو کو گہری نظر سے دیکھا۔ پھر ترنگ میں آ کر ناچنے لگا

بھول گئی میں دوچن وداع کے
کھو گئی میں سسرال میں آ کے
بھول گئی میں ۔۔ بھول گئی میں

"تم نے اس غریب کا ایمان متزلزل کر دیا ہے۔" اجو نے نگو کا بازو تھام کر ریستوران کا دروازہ اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کس غریب کا؟"

"تم نے غور نہیں کیا تھا وہ فقیر تمہیں کیسے گھور رہا تھا؟"

"اجو! پاگل نہ بنو۔!" نگو چیخی

"خدا کی قسم جس انداز سے اس نے تمہیں گھورا تھا مجھے سخت رقابت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کہہ رہا تھا اتنی سندر مورت اور اتنا اچھا دل .... آج کا دن تو وہ زندگی کے باقی دنوں میں شمار نہیں کرے گا۔ اور تمہارا دیا ہوا روپیہ سینے سے لگا کر رکھے گا کبھی خرچ نہ کرے گا۔"

نگو بے اختیار ہنس دی۔

"اجو ۔۔ باتوں میں واقعی تمہارا جواب نہیں۔" سچ کتنی پیاری اور دلچسپ باتیں کرتے ہو۔ جب میں تمہارے پاس سے اٹھ کر چلی جاتی ہوں تو پہروں تمہاری باتیں یاد کر کے ہنستی رہتی ہوں۔"

"صرف باتیں ہی خوب صورت نہیں، پیار بھی اسی انداز میں کر سکتا ہوں۔ موقعہ تو ۔۔۔۔"

"اجو۔!" نگو نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔ "پہلے ہی گھر میں بہت بڑا طوفان آ گیا ہے۔ میرے اس فیصلے نے خاندان کے در و دیوار ہلا دیے ہیں۔ اماں الگ سر پیٹ رہی ہیں، بہنوں کو اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ بھیا نے گولی مار دینے کی دھمکی دے دی ہے۔

سبھی اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ ایک میں ہی جھوٹی ہوں، پاپن ہوں، اندھی ہوں بہری ہوں۔ تم نے مجھے اندھی اور بہری بنا دیا ہے اپنوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ خون سے جدا کر دیا ہے۔ تم نے میرے من سے ناطہ جوڑا۔ میرے تن میں چراغ جلائے۔ اب میں ان لوگوں کو کیسے

بتاؤں۔ کیسے سمجھاؤں۔ کیا بتاؤں؟ یہی کہ جو آگ تمہیں دیکھ کر سلگ اٹھی ہے اسے بجھانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" اب اس کمبخت دل کو کون سمجھائے دین دھرم کی باتیں، ایمان و آگہی کی وارداتیں، ذات پات اور اس کے طلسم۔

اپنے فہم و ادراک کی کشتی کو عشق کے طوفان کی نذر کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ تو "سید زادی" ہے۔ اور "اجو۔؟" اجو ایک اتنا بڑا فاصلہ ہے جسے پاٹنے کے لیے خون کے ہر رشتے کی قربانی دینی پڑے گی۔ اپنے کئی اعضا کاٹ دینے پڑیں گے۔ عشق ہمیشہ آتش نمرود میں بے خطر کود پڑا کرتا ہے۔ یوں اماں بھی ساری عمر یہی کہتی رہیں کہ میکہ لڑکی کا عارضی گھر ہوتا ہے، عارضی گھر کے لیے مستقل سہارے کو کون ٹھکراتا ہے اور ان سید لڑکوں میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں اماں۔!

یہ مرد جنہیں اللہ نے افضل بنایا ہے عورتوں سے قوی تر ہیں۔ سبھی ایک سے ہیں، سید ہو یا غیر سید ——— میرے دل نے جس کو سجدہ گاہ بنالیا ہے۔ اپنی عبادتیں، اپنی ریاضتیں، نالۂ نیم شب اور آہِ سحر جس کے سپرد کردیا ہے۔ وہی عظیم ہے۔ سید زادہ سے بلند۔ یہ برادری نہیں مانتی تو نہ مانے۔

" اور پھر آنگن اماں کی کھا کر کھائی میں جا گرے گی کوئی تیرے تن کا کچھ بھی نقصان کرے گا۔ لڑکی کا بھرم میکہ سے ہوتا ہے میکے کے بنا تو لڑکی سڑک پر گرا ہوا پتہ ہے نہ کوئی راہ گیر اٹھاتا ہے نہ درخت قبول کرتا ہے۔ موٹر کی گرد ہی اسے اپنی جگہ سے لے جا کر دیتی ہے"

"بڑی بوڑھیاں نصیحتوں کے ... سے ہوتی ہیں۔"

" اماں میرا جہاں تو دیکھو آکر۔" صبح چڑھتے سورج کے ساتھ میری محبت ایک نیا روپ بدل کر میرے آنگن میں اترتی ہے اور رات گئے ہزاروں رنگ لے کر میرے پہلو میں ڈوب جاتی ہے۔ لمحے جو ان کی گرفت میں آکر ٹھہر گئے تھے۔ جنت کوئی اور ہے بھی ہے۔

میری تمیں، مسکراہٹیں، چہلیں، کیف، راحتیں اتنی ڈھیر ساری کہانیاں کہنے کو۔ اپنا بہت سارا وقت سننے کو۔

محبت کے نت نئے انداز۔

جوانی پر بہار روز نیا نکھار۔

اک دوجے کا ہو کر جینا کتنا سندر۔

اک دوسرے میں کھو جانا کیسا کھیل ہے۔

شادی زندگی کی خوشیوں کی معراج ہے۔

شادی۔ بنگوبی! تن من وارتی، سارے جہاں سے دور نکل آتی۔ مانگنے کو اور کیا تھا بھلا؟ جب کہ ٹھیک دس ماہ بعد چاہتوں کا ایک خوبصورت انجام گڑیا کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔

ماں بن کر عورت کتنی مکمل ہوجاتی ہے!

زندگی بھی تو،

شاید خوشیوں اور طمانیت کی معراج پر زندگی کو رک جانا چاہیئے

...... آگے کیا ہے اور۔

" اجو تمہارے سینے پر رکھ دینے کے بعد دل کی دھڑکن رک جانی چاہیئے۔"

اس نے کئی بار اپنی خوشیوں کی انتہا کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا تھا پھر ایک دن واقعی اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ تو زندگی کی معراج پاکے سارا سارا دن گڑیا میں لگی رہتی تھی۔ نہ اپنا ہوش نہ وقت کا احساس۔ نجانے کب اور کس وقت اجو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔!

اجو۔ جس کی چاہت کا انداز اچھوتا اور نرالا تھا۔

اجو۔ جو اس دنیا کی ایک زبردست حقیقت تھا اور جس کے لیے اس نے اس دنیا کو ٹھکرایا تھا۔

پہلے تو وہ سینے پر ہاتھ دھرے دم بخود دیکھتی رہی پھر ذرا دم میں دم آیا تو اس نے زبان کھولی۔

زبان کھلتے ہی نفرتوں اور ناراضگیوں کے اژدہے دونوں طرف سے لپکتے ہوئے آئے اور اس کی ساری سہاگن راتوں اور مہکتی چاندنیوں کو نگل گئے۔

باقی کیا بچا؟۔

اُف! قرب کتنی بھیانک حقیقت ہے۔

قرب۔ جس کی تمنا ہر لڑکی اور ہر لڑکا کرتے ہیں۔ جس کے لیے لوگ زہر کھا لیتے ہیں اور دین دھرم تو داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔ ماں باپ کی عزت سے کھیلتے ہیں۔

مجنوں کو لیلیٰ مل جاتی، فرہاد شیریں کو پالیتا، رانجھا ہیر کو حاصل کر لیتا یا سوہنی مہیوال کی بانہوں میں سما جاتی تو آج یہ کہانیاں زندہ نہ ہوتیں۔!

او نگینہ سید۔!

بول کیا کہتی ہے؟

کوئی بات نہیں۔ زندگی آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ تگ و دو اور ترچ پیچ میں تین طویل خشک اور بے کیف سال بیت گئے۔

والہانہ انداز میں پیار کرنے والے اجو سے نگو کو کبھی کبھار کی بھیک قبول رہتی پھر بھی اس نے اچانک محسوس کیا کہ وہ پھر ماں بننے والی ہے اب اس شاخ سے کونپلیں پھوٹنے کا مقصد؟

نگو نے جب اجو سے کہا تو وہ بے پروائی سے بولا۔

"میں کیا کروں؟"

"اجو تمہیں کیا ہو گیا ہے ـــ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت نہیں رہی تو ان معصوم بچوں کو بلانے کا شوق کیوں؟"

"مجھے کب شوق ہے۔"

"تو پھر. . . ."

"بس گھریلو عورتوں کی یہی ایک مصیبت ہے دونوں صورتوں میں پھٹکار شوہر پر ہی پڑتی ہے۔ بھئی اگر تم نہیں چاہتیں تو چھٹکارا حاصل کر لو۔"

مرد کے لیے یہ کہہ دینا کتنا آسان ہے جیسے پودے کو جڑ سے اکھیڑ دینے سے تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ وہ بھی طیش میں آگئی۔

پہلے تو ڈاکٹر حیران ہوئی کہ وہ خاصی متمول نظر آ رہی تھی۔ اور ابھی ایک ہی بچی تھی۔

پھر جب اس نے بتایا کہ بچی ابھی چھوٹی ہے اور اس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ اور گھریلو حالات ابتر ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ مانی

"لیکن آپ کی شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر میرے شوہر نہ آسکے تو میں ان کی تحریر لے آؤں گی"

اظفر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے تحریری اجازت نامہ دے دیا جب وہ بے نیازی سے جانے لگا تو وہ لجاجت سے بولی

"اجو مجھے ذرا کلینک تک چھوڑتے جاؤ۔" نہ جانے اس کی التجا میں کیا تھا۔ اس نے گاڑی روک کر اسے بٹھا لیا۔

تمام راستہ وہ پلکوں پر آنسو روکتی رہی اور منتظر رہی کسی ایک فقرے کی۔ ایسے میں . . . جو اس شکستہ کشتی کے لیے بادبان بن جاتا۔ ہاں کسی بہانے وہ اس تعلق کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی کشتی میں سوراخ ہو جائے تو راہ میں ڈوب جاتی ہے۔ ابھی تو منزل کافی دور تھی۔

مگر اجو چپ چاپ موٹر چلاتا رہا۔ ایک بار صرف ایک بار وہ اسے تسلی ہی دے دیتا تو وہ اس کی ساری خطائیں معاف کر دیتی اور ابھی پھر بستی چلی جاتی بچے زندگی کے اولین خوشی ہوتے ہیں کچی کلیاں نوچ کر کسی باغبان کو سکھ نہیں ملتا۔

کلینک آگیا۔ اس نے بے رخی سے دروازہ کھول دیا۔ زندگی اور موت کے دوراہے پر وہ اسے تنہا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ کیسا بے درد ہوتا ہے یہ مرد بھی! جانے اگلے لمحے کیا گزر جائے۔ سانس تو پل کا ہوتا ہے سانس کی ڈوری بھی تو اپنے بس میں نہیں ہوتی۔!

میرے خدا! عشق کی انتہا یہ ہے تو عشق نامراد ہی اچھا جو سینے میں سلگتا تو رہتا ہے

"اجو! آج کے دن گڑیا کو اپنے [illegible] ۔ اس کی دیکھ بھال وہاں کون کرے گا۔" اس کی التجا آنسو [illegible]

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ میں دفتر جاؤں یا اس کا خیال رکھوں۔ اس کا بندوبست تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔"

کار گیٹ سے باہر نکل گئی۔

چاہت کا پیمانہ اتنی جلدی نہیں بھرتا جتنی جلدی خالی ہو جاتا ہے۔ تین دن کلینک میں قیامت کے گزر گئے لیکن اجو اسے دیکھنے نہیں آیا۔ چوتھے دن وہ گھبرا گئی اور شدت سے اس کا دل اپنے گھر کو جانے کو چاہنے لگا۔ ڈاکٹر اسے جانے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اس کے مجبور کرنے پر ان ہدایات کے ساتھ اسے چھٹی دیدی

"آپ بہت کمزور ہیں خون کی بہت کمی ہے آپ کو مکمل جسمانی آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ تین ہفتے تک گھر کا کوئی کام نہ کریں بہتر ہوگا اپنی والدہ کے یہاں چلی جاؤ یا انہیں اپنے گھر بلا لیں تاکہ وہ گھر اور بچی کو سنبھالیں۔ غالباً آپ کے شوہر یہاں نہیں رہتے۔ آپ کو اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"ماں ہے ـــ کہاں ہے ماں؟ دکھ درد میں کام آنے والی"

اس نے گڑیا کی انگلی پکڑی اور باہر نکل آئی۔ ایک طرف کھڑی ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ کمزوری سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔

اتنے میں اظفر کا ایک عزیز دوست شکیل اور اس کی بیوی
ہاں سے گذرے انہوں نے نگو اور گڑیا کو وہاں کھڑے دیکھا تو کار روک
لی۔ "بھابی آپ یہاں؟"

"ہاں۔"

"ابھی ابھی تو میں نے مال روڈ پر آپ کو اظفر کے ساتھ جاتے ہوئے
دیکھا تھا۔"

"مجھے؟"

"ہاں۔"

"آپ کو مغالطہ ہوا ہوگا۔ میں تو تین دن سے ہسپتال میں
پڑی تھی۔ آج چھٹی لے کر جا رہی ہوں۔"

"اوہ!" شکیل کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ "ٹھیک
ہے مجھے مغالطہ ہوا ہوگا۔"

"چلئے آپ کو کہاں ڈراپ کر دوں؟"

"گھر۔!"

"گھر؟ گھر کیسا ویران اور اداس تھا جیسے ان تین دنوں سے
کسی نے اس کی خبر نہ لی ہو۔ کون تھا اس گھر میں جو اس کے آنے کی
خوشی مناتا۔ وہ کتنی دیر تک بستر پر پڑی روتی رہی .... یادوں کے
زہریلے ناگ اس کے آس پاس سرسراتے رہے۔ پھر ایک دم تنہائی
کے احساس سے وہ خوف زدہ ہوگئی۔ گھڑی دیکھی تو کھانے کا وقت
تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑ
رہا تھا۔

اس نے گڑیا کی انگلی پکڑی اور سڑک پر نکل آئی ــــ ٹیکسی سیدھی اس
ریستوران کے سامنے آکر رکی جہاں اس کی زندگی کی خوبصورت
دوپہریں گزری تھیں۔ آج سکونِ دل واپس لینے کے لیے وہ یہاں
چلی آئی تھی۔

آج پھر وہی مست الست درویش اپنے والہانہ انداز میں
ناچ ناچ کر گا رہا تھا

"جانے کہاں گئے گوری چنریا"
"کھو گئی مجھ سے موری چنریا"
"جا کے بابل سے نظریں ملاؤں کیسے؟"
"بابل سے نظریں ... بابل سے نظریں۔"

اس نے فقیر کو ہاتھ پر ایک روپیہ رکھا اور پلکوں پر تھرتھراتے آنسو
کو روکتی ریستوران کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

نیم گرم اور نیم تاریک ریستوران آج بھی ویسا ہی تھا۔ بھٹکتی بھٹکتی
اس کی نگاہ اپنی مخصوص نشست پر آکر رک گئی۔ وہاں کوئی بیٹھا تھا۔

ہاں وہ اجو ہی تھا۔

وہ جسے ہزاروں کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ؟
نگو کا دل بیٹھنے لگا۔ ان کے پیچھے جو میز لگی تھی اس پر جا کر خاموشی سے
بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی پشت اجو کی طرف کر لی۔

وہ اس لڑکی کو دیکھ سکتی تھی لیکن اجو کو نہیں۔

وہ دونوں اردگرد سے بے نیاز ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے
تھے ـــ!

اسے کہتے ہیں وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے لیکن انسان اپنے آپ کو
دہرا نہیں سکتا۔!

ریستوران کا ہال بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت غور سے لوگوں کا جائزہ
لینے لگی۔ اس کی ساتھ والی میز پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ وہ
بہت خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے جیسے ایک دوسرے سے کوئی تعلق
نہ ہو چہروں پر بشاشت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور
سامنے کونے میں گلابی کپڑوں میں ملبوس ایک شرمائی لجائی لڑکی ایک لمبے
تڑنگے آدمی کے پیچھے لگ گئی تھی مرد کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹتی
نہ تھیں لیکن لڑکی بار بار ریستوران میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیتی۔ ایک مبہم سا
خوف اور خجالت سی اس کے شرمائے ہوئے چہرے پر طاری تھی۔

وہ عشق و محبت کے اولین دور میں تھے۔ اور لڑکی غالباً گھر والوں سے
چوری چھپے اس کے ساتھ آئی ہوئی تھی

ان کے ساتھ والی میز پر ایک خوبصورت اور شوخ و شنگ لڑکی
فیروزی رنگ کی ساڑی میں ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اپنی سرخ ناخن
والی مخروطی انگلیوں کو نچا نچا کر وہ مسلسل باتیں کئے جا رہی تھی مسکرا رہی تھی۔
قہقہے لگا رہی تھی۔ اور وہ آدمی ہمہ تن گوش تھا یقیناً وہ اس کی منگیتر تھی۔
تبھی تو وہ اس کی لایعنی باتیں بڑے شوق سے سنتا جا رہا تھا۔

ایک قدم اور۔ بس ایک قدم۔ دلکشی کے سارے فانوس بجھ جائیں گے
نگو کی آنکھیں دھندلا گئیں۔!
ہلکی ہلکی موسیقی سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔!

بیرا اس کا آرڈر لے آیا تھا۔ گڑیا کو نیپکن باندھ کر اس نے قرینے سے میز کے قریب بٹھا دیا۔ اور سوپ پلانے لگی۔

اسے شدت کی بھوک لگی تھی۔ لیکن نہ جانے اب اس کی بھوک کہاں کھو گئی۔ اس کے جی میں جیسے کوئی پھانس سی اٹک گئی تھی۔ سینے میں بے پناہ جلن ہو رہی تھی۔!

شاید اتنا بڑا غم اس نے دل میں چھپا لیا تھا۔

اجو۔! تین سال کا عرصہ تو بہت کم ہوتا ہے اتنی جلدی چاند کیوں گہنا گیا؟ ابھی میری آنکھوں کے رتجگے ماند نہیں ہوئے۔ ہاں یہ لڑکی بے شک مجھ سے زیادہ تر و تازہ ہے لیکن یہ کیسے یقین کرے کہ اس کے رخساروں کے پھول نہ مرجھائیں گے کتنے ہی تازہ پھول سیج پر بچھائے جائیں صبح کو باسی نظر آتے ہیں..... محبت کا یہ امتحان بیجا ہے اجو! ان سے امتحان نہیں لیتے جنھوں نے مشکل ترین راستے کا انتخاب کیا ہو

"جب انسان کا اپنا آپ اختیار میں نہیں ہوتا تو وہ وعدوں اور قسموں کی بیساکھیوں کو کیوں استعمال میں لاتا ہے؟"

یکایک ہال میں تیرتی ہوئی موسیقی بند ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ہال میں چھایا ہوا ایک عارضی سا طلسم ٹوٹا۔ ایک دم ہی زندگی کا تلخ احساس جاگ اٹھا۔ باتیں کرنے والوں کی بھنبھناہٹیں ایکدوسرے کو سنائی دینے لگیں۔... یہاں تک کہ چمٹا بجانے والے فقیر کی آواز بھی اندر آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نگو کو اجو کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ وہی نشے میں بوجھل بوجھل آواز۔ وہی تقاضے۔

"اجو! تم شادی کے نام سے کیوں بدکتے ہو؟" لڑکی کہہ رہی تھی

"شادی فضول کی بات ہے رعنا!۔ بالکل بوگس۔ لڑکیوں کو اپنی زندگی میں صرف شادی کا شوق ہوتا ہے۔"

"مگر سنا ہے تم نے بھی شادی کی تھی اور محبت سے کی تھی۔"

"اب میری حماقت کو تم محبت کہتی رہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں"

اس کا قہقہہ سنائی دیا۔

"اب دوسری بار تم یہ حماقت نہیں کرنا چاہتے۔ ہے نا؟" تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"صرف محبت.....!"

اور تمھارا محبت کرنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ تمھارے قدموں سے اٹھ کر میں کہیں نہ جا سکی۔ اسی انداز پر سب کچھ لٹا دیا۔

"بھول گئی میں دلہن دواع کے۔"

فقیر زور زور سے گا رہا تھا۔

"اجو۔ وہ سہروں اور پھولوں کی باتیں تمھیں اتنی جلدی کیوں بھول گئیں۔"

اجو۔! محبت کیا نکاح کے دو بول سے فنا ہو جاتی ہے تو مجھے اس سولی پر کیوں لٹکا دیا تھا اسے لافانی کرنے کے لیے مجھے قرب کی آگ میں نہ جلاتے....

"کھو گئی میں تو سسرال میں آکے"

"کھو گئی میں تو...."

کھو گئی میں تو..." میں تو..."

"کہاں جاؤں؟ دل سینے سے باہر آنے کو پھڑک رہا ہے۔"

"گھر جا کے بابل سے نظریں ملاؤں کیسے"

گھر جاؤں کیسے؟"

فقیر ترنگ میں آگیا تھا۔

"اماں! تم کہاں ہو اماں۔"

"کھو گئی میں تو سسرال میں آکے۔"

"حالات کی دھند بہت تیز ہے اماں! مجھے اپنی کوکھ میں چھپا لو"

"گھر جاؤں کیسے؟" "گھر جاؤں کیسے؟"

"میرا گھر کہاں ہے؟ میرا میکہ کہاں؟ میں کون ہوں؟"

"جا کے بابل سے نظریں ملاؤں کیسے؟"

"گھر جاؤں کیسے؟"

"تم نے سچ ہی تو کہا تھا اماں۔ میرا بھرم ٹوٹ گیا۔ میں تو سڑک کے کنارے گرا ہوا ایک پتہ ہوں۔ میرے سلسلے کہاں تمھیں ماں؟"

"گڑیا۔ تو اتنی بے چین کیوں ہے۔ وہ دیکھ تیرے ابو وہاں بیٹھے ہیں۔ پہچانا ان کو۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو ان کے پاس چلی جانا۔"

پھر یکایک اسے زور کا چکر آیا۔ منہ تک جاتا ہوا چمچہ اس کے ہاتھ سے پلیٹ میں گرا۔ پلیٹ چھناکے سے زمین پر گر گئی۔ ہال میں ایک شور سا گونجا۔ اور اس کی گردن ڈھلک کر کرسی کی پشت پر ٹک گئی کاؤنٹر پر بیٹھا منیجر بھاگا بھاگا آیا۔

اظفر نے یونہی مڑ کر دیکھا۔ گڑیا اسے پہچان کر زور زور سے رونے لگی —— "ابو۔!۔ ابو!۔"

وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس کی میز کے قریب آیا۔ گڑیا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ منیجر نے نگو کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ ایک نبض ٹٹولی پھر دوسری اور بولا "آپ ان کے پرس میں ان کے گھر کا ایڈریس تلاش کریں میں ایمبولینس کے لیے فون کرتا ہوں۔"

بیرا دوڑ کر ٹوٹی پلیٹ کی کرچیاں چننے لگا۔

"یہ کون ہے اجو؟" وہ لڑکی اس کے قریب کھڑی حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟"

اس کی پہچان کھو گئی ہے۔ اجو نے اس کے بےجان اور زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ شہنائیوں کی گونج میں یہ چہرہ کتنا حسین لگا تھا!

"کھو گئی ہیں تو سسرال میں آکے۔"

"جانے کہاں گزری سوری چستر یا۔"

فقیر دیوانوں کی طرح ناچ رہا تھا۔

اجو نے اس کی ٹھنڈی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اجو۔ او اظفر کمال۔ دل کی ٹوٹی کرچیں تمہارے قدموں تلے بکھری ہیں۔ ان کو بھی تو اٹھاؤ نا!"

"ایمبولینس آگئی ہے" منیجر نے کہا۔

"گھر جاؤں کیسے؟"... گھر جاؤں کیسے؟"

"گھر جاؤں کیسے؟"

"جا کے بابل سے نظریں ملاؤں کیسے؟"

فقیر کے قدموں میں زلزلہ آگیا تھا۔ اور بچے اس کے گرد حلقہ بنائے تالیاں پیٹ رہے تھے۔

حریمی دسترخوان

پنیر پلاؤ

سامان۔ پنیر کے ٹکڑے دو سو گرام۔ چاول پرانے پلاؤ والے ۵۰۰ گرام۔ گھی تقریباً ۲۰۰ گرام۔ تیز پتے چار۔ لونگ ۶۔ بڑی الائچی ۔ مٹر چھیلے ہوئے دانے ۲۵۰ گرام (اگر ہرے مٹر نہ ملتے ہوں بازار میں تو ڈبوں والے مٹر استعمال کریں) نمک حسب ضرورت۔ زیرہ چار کا چمچہ۔ عرق کیوڑہ ۵۰ گرام۔

ترکیب۔ پنیر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے فرائی کر لیں، اس کے بعد انھیں پورے گھی میں ڈال کر گلابی کر لیں۔ پنیر کے ٹکڑوں کو نکال کر اسی گھی میں زیرہ ڈال کر چاولوں کو دھو کر ڈال دیں اور بھونیں۔ پھر پنیر کے ٹکڑے ڈال کر تھوڑا اور بھونیں۔ اس کے بعد لونگ الائچی، نمک، تیز پتہ اور مٹر ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ چاول گل جائیں۔ پانی زیادہ نہ ہونے پائے۔ اگر اچھی طرح نہ گلیں تو دودھ کا چھینٹا دے کر گلائیں۔ تیار ہونے پر عرق کیوڑہ چھڑک دیں ——— اگر مٹر نہ ڈالیں تو بھی مزیدار ہوگا، لیکن مٹر ڈالنے سے لذت دوبالا ہو جائے گی۔

مرسلہ:۔ مس ناہید ایم اے ایل ٹی

مٹر بھرے ٹماٹر

سامان۔ ٹماٹر درمیانہ سائز کے سرخ لیلیں سخت دس عدد۔ ہرے مٹر کے دانے سو گرام۔ آلو بڑے دو عدد۔ پیاز ۵۰ گرام۔ ادرک ۱۰ گرام لہسن دو جوے۔ ہرا دھنیا سرخ مرچ ہری مرچ اور نمک حسب خواہش و ضرورت گھی جتنا صرف ہو۔

ترکیب۔ ٹماٹر کو درمیان سے کاٹ کر دو دو ٹکڑے کر لیں۔ کسی چمچے سے اس کے بیج نکال دیں۔

پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی میں سرخ کر کے نکال لیں۔ آلو چھیل کر اسکے باریک باریک قتلے تراش کر خشک کرنے کے بعد اسی گھی میں گلابی کر کے نکال لیں اور کسی پلیٹ میں انھیں بچھا کر ہلکا سا نمک چھڑک دیں مٹر کے دانوں کو پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر اتنا ابالیں کہ گل جائیں۔ تلی پیاز، لہسن، سرخ مرچ، ادرک پیس کر تھوڑے گھی میں ڈال کر بھونیں پھر ابلے مٹر بھی اسی میں ڈال دیں۔ ہلکا سا نمک اور ملا لیں۔

بھوننے کے بعد اس آمیزے کو نکال لیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ کاٹ کر اس میں ملائیں اور ٹماٹر کے ٹکڑوں میں بھر کر آلو کے قتلوں پر اسطرح جما دیں کہ ٹماٹر کے ٹکڑوں کے پیندے آلو کے قتلوں پر رہیں اور مسالہ بھرا حصہ اوپر کھانے اور ناشتے دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مرسلہ:۔ امینہ خانم (کلکتہ)

اِسکوٹر کا چکر

ــــــ سلمہ ارشاد ایم۔اے۔بی ایڈ (نئی دہلی)

یہ اتفاق ہی تھا کہ رخشی کو نیند نہ آ رہی تھی۔ گھبرا کر وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ آسمان بارش کھل جانے کے بعد اتنا صاف ہو گیا تھا کہ ستاروں کی چمک روز سے زائد ہو گئی تھی۔ محویت کے عالم میں رخشی نے کائنات کے اس حسن کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ لیکن اسی وقت، اسے محسوس ہوا کہ اس کے ابّو اور امی بھی جاگ رہے تھے، شاید انھیں بھی نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ انھیں مشکل سے نیند آیا کرتی تھی اور اس بے خوابی کا سبب وہ خود تھی۔ اس لئے کہ وہ جوان ہو چکی تھی ــــــ اور جوان لڑکیوں کے والدین کو نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔ لاڈوں پلی لڑکی جس پر وہ قربان ہوتے رہتے ہیں، جس کی نگاہوں سے اوجھل ہونے پر وہ بے چین ہو جاتے ہیں، جہاں جوان ہوئی، وہ اسے کسی کو دیدینے کی فکریں کرنے لگتے ہیں، جیسے کہ ان کی محبت ختم ہو گئی ہو، جیسے کہ وہ ان پر بار ہو رہی ہو۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں، وہ تو قانون قدرت اور رسم و رواج سے مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ ورنہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کون خوشی سے جدا کرتا ہے۔ اس بیٹی کو گھر سے نکالنا بھلا کون پسند کرے گا جو ہمہ وقت ان کی خدمت کرتی ہو ان کی ہر بات کا خیال رکھتی ہو۔

اپنی شادی کے متعلق جوان ہو جانے کے بعد لڑکیوں کو بھی فکر سی لگ جاتی ہے۔ ہر شرم و لحاظ کے باوجود وہ سُن گُن لیتی رہتی ہیں کہ نہ جانے کس کے پلّے پڑیں۔ جیون ساتھی کیسا ہو۔ ساس نندیں کیسی ہوں۔ کس طرح پیش آئیں۔ کیسا سلوک کریں۔ وہ بھی چپکے چپکے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ابّو کہہ رہے تھے۔ میں نے پتہ لگا لیا ہے۔ لوگ اچھے ہیں، لڑکا خوبصورت اور تندرست ہے، ہر طرح وہ ہماری رخشی کے موزوں ہے۔ سرکاری نوکر ہے۔ گھر اُن کا ذاتی ہے۔ صرف ایک بہن ہے، کچھ روز بعد وہ بھی دوسرے گھر کی ہو جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اشفاق کے والدین بھی سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ اور پھر تم تو جانتی ہی ہو کہ سونا جانئے کسے اور آدمی جانئے بسے۔ خاندان کا کوئی لڑکا ہوتا تو سب کچھ معلوم ہوتا۔ خاندان کے باہر تو کبس جواہی کھیلنا پڑتا ہے۔ اور اکثر تو خاندان کے دیکھے بھالے گھروں میں بھی شادی کے بعد حالات خلاف توقع ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ اقبال اور رزینہ کی شادی کا یہ حشر ہوگا۔ سگی چچا زاد بہن تھی۔ لیکن طلاق تک پر نوبت پہنچ گئی۔ دراصل یہ قسمت کا کھیل ہے۔ لیکن خدا چاہے گا تو میری رخشی کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔

بیگم نے آہ سرد بھر کر کہا" ٹھیک ہے اگر آپ کو لڑکا پسند ہے۔ بات کر کے دیکھئے۔ کہیں زمانہ کے مطابق مانگیں لمبی چوڑی نہ ہوں۔

رخشی کے ابّو نے کہا" میرے ایک بیٹی ہی تو ہے، میرے فنڈ کا دس ہزار روپیہ جمع ہیں۔ کچھ سامان تم نے بنا ہی رکھا ہے۔ میں سب کچھ اپنی رخشی کے لئے صرف کر دوں گا۔ ہم بوڑھیا بڈھوں کی گذر بسر تو کسی نہ کسی طرح ہوتی ہی رہے گی۔

رخشی چپکے سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اشفاق کے متعلق سوچنے لگی۔ اس نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ کیا ہوگا، اسے علم نہ تھا، البتہ اس کے تصور میں مختلف چہرے آنے لگے اور وہ سوچنے لگی کہ آج کے مسلمان کدھر جا رہے ہیں۔ کیا وہ اپنے رسول کریم صلعم کی تعلیمات کو بھول گئے۔ جس عورت کو ہمارے پیغمبر صاحب نے قعر مذلت سے نکال کر بام عروج پر پہنچایا تھا، اسے آج پھر اس طرح ذلیل ہونا پڑ رہا ہے۔ اگر دولت نہ ہو تو اس کی شادی نہیں ہو پاتی۔ کیسی کیسی دشواریاں اس سلسلہ میں والدین کو اٹھانا پڑتی ہیں ــــ اگر یہ سلسلہ یوں ہی قائم رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر لوگ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے لگیں ــــ انھیں تصورات میں وہ سو گئی اور صبح قدرے تاخیر سے بیدار ہو کر کمرے سے باہر آئی تو اس کی امّی اس عورت سے بات چیت کر رہی تھیں جو کئی بار آ چکی تھی اور جس کے آنے کا سبب رخشی کو معلوم تھا۔ وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ اس نے ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ وہ جانتی ہے کہ اس عورت سے اس کی امی سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ بہرحال اسی شام گھر میں ایسے انتظامات ہو رہے، جیسے کوئی بہت ہی معزز مہمان آنے والا ہو۔ اور شام کے قریب کئی خواتین بڑے ٹھسے کے ساتھ نازل ہو گئیں۔ امی نے پیار کے ساتھ نہ جانے کتنے لوازمات میز پر سجا رکھے تھے۔ گویا انتظار کو پچھاننے کے لئے یہ چارہ ڈالا گیا تھا۔ پیاری کا سروس کے لئے امی نے زبردستی مجھے آمادہ کیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ مجھے

پسند کرلیا جائے۔

چند روز بعد عورتوں کے بجائے مردوں کی دعوت تھی۔ اشفاق بھی آئے تھے، تاکہ رخشی کی امی بھی اسے دیکھ لیں اور امی نے جھانک کر "بر" کو دیکھ بھی لیا، حالانکہ دیکھنا رخشی کو چاہئے تھا، مگر وہ بے چاری اپنے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

باہر کیا باتیں ہوئیں، اس وقت علم نہ ہوسکا۔ رخشی کے دل میں ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آج پھر اس کے ابّو اور امی میں اہم مسئلہ پر باتیں ہوں گی، اس لئے آج پھر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ جب اس کے ابو امی لیٹ گئے۔ کمرے کی بجلی بجھ گئی تو رخشی ننگے پیر سن گن لینے کھڑکی کے قریب آگئی۔ اس کے ابّو کہہ رہے تھے۔ "لڑکے والے اسکوٹر چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ آپ کچھ دیں یا نہ دیں اسکوٹر ضرور دیں ساتھ ہی یہ بھی کہ بارات کی خاطر مدارات ایسی ہو کہ کسی کو شکایت نہ ہوسکے۔ میں اسکوٹر دے دوں گا تو اور انتظامات کیسے ہوں گے۔ یہ تو کہنے کی بات ہے کہ اور کچھ دیں یا نہ دیں —— بھلا یہ کیسے ہوسکتا۔ زیور، کپڑے، برتن، فرنیچر، سلائی کی مشین اور دوسری ضروری چیزیں تو دینا ہی ہوں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ لڑکا اچھا ہے۔ ملازمت ایسی ہے کہ ترقی کے امکانات ہیں"۔ "لیکن" امی بولیں "اسکوٹر تو مہنگا ملتا ہے"۔

ابّو نے کہا "ہاں ۶-۷ ہزار سے کم میں تو ملے گا نہیں۔"

"تو ہم کہاں سے دیں گے اسکوٹر، انکار کردیجئے۔ ہماری رخشی کے لئے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔" ابو نے کہا "لیکن لڑکا اچھا ہے۔ میں سوچتا ہوں ابھی انکار نہ کروں۔ بارات آنے کے بعد لیا تو ہونے سے رہا کہ وہ بارات واپس لے جائیں۔"

"نہیں ایسا نہ کیجئے گا" امی نے کہا "کہیں وہ نہ مانے تو بڑی رسوائی ہوگی۔ ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو بارات واپس لے کر چلے جاتے ہیں۔ خدانہ کرے کہ ایسا ہو —— آپ انکار کردیں۔"

پھر معلوم ہوا کہ ابّو نے انھیں ایک خط لکھ کر معذرت کرلی کہ ان کی مالی حالت ایسی نہیں کہ وہ جہیز میں اسکوٹر دے سکیں۔ یہ خط اسی مشاطہ کے ذریعہ بھیجا گیا۔ لیکن اس کا جواب نہیں آیا۔ البتہ چند روز کے بعد اچانک ہی اشفاق خود رخشی کے والد سے ملنے آگئے۔ رخشی کے ابو گھر پر موجود تھے۔ انھوں نے اشفاق کو بڑی محبت سے بٹھایا۔ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اشفاق کے والد کے بجائے اشفاق خود کیوں آئے ہیں —— لیکن جلد ہی اشفاق نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ اپنی آمد کا مقصد بیان کردیا۔ اس نے کہا معاف فرمایئے گا میرے والد بہت لالچی انسان ہیں۔ وہ جہیز میں اسکوٹر لئے بغیر میری شادی نہ کریں گے اور اس کا سبب یہ ہے کہ میں از راہ سعادت مندی اپنی تنخواہ لاکر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ آفس جانے کے لئے مجھے اسکوٹر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کئی بار اپنی اس خواہش کا اظہار بھی میں نے پاپا سے کیا۔ انھوں نے اسکوٹر خرید کر دینے کے بجائے مجھ سے کہا۔ "صبر نہیں —— جلد ہی تیری شادی کرنے والا ہوں اور شادی وہیں طے کروں گا جہاں سے اسکوٹر مل سکے۔ دراصل میں ذاتی طور پر جہیز کے سخت خلاف ہوں۔ لیکن اپنے سلسلے میں ان کے سامنے کچھ کہنے سے میری سعادت مندی مجھے روکتی ہے۔ میں کئی روز سے دو فرائض کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف والدین کی فرمانبرداری ہے اور دوسری طرف یہ فرض کہ جہیز کے سلسلے میں لڑکی والوں سے فرمائش کرکے کچھ نہ لیا جائے۔ خیریت ہوئی کہ آپ کا خط مشاطہ سے میں نے لے لیا تھا اور اسے دلاسہ دے کر اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ وہ پاپا جی کو اس کا علم نہ ہونے دے۔ میں نے اس سلسلہ میں ایسا پلاٹ بنایا ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرے ایک مخلص دوست نے حال ہی میں ایک اسکوٹر خریدا ہے۔ شادی کے روز میں اسے لاکر آپ کے یہاں کھڑا کردوں گا اسے آپ جہیز میں دیجئے گا۔ میں اس درمیان اسکوٹر چلانا سیکھنے کا لائسنس لے لوں گا۔ شادی کے کچھ روز بعد کہہ دوں گا کہ اسکوٹر چوری ہوگیا —— اور پھر اس اسکیم کو وہ قیامت تک سمجھ نہ سکیں گے کہ اسکوٹر جہیز میں کس طرح ملا تھا۔ چوری کے بعد اس کے سلسلہ میں کوشش کرنے والا میں ہی ہوں گا۔

رخشی کے ابو اس طرح اشفاق کی باتیں سن رہے تھے جیسے کہ وہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ ان کے تصور میں بھی اس طرح کی بات نہ آسکتی تھی۔ لیکن جب انھیں یقین ہوگیا کہ وہ عالم خواب میں نہیں تو انھوں نے اشفاق کو گلے سے لگا کر کہا بیٹے! واقعی میں اسکوٹر نہ دے سکتا تھا۔ تمہاری باتیں سن کر میں کتنا خوش ہوا ہوں، بتا نہیں سکتا، کاش تمہاری ہی طرح دوسرے نوجوان بھی اس قبیح رسم کے سدباب کے لئے قربانیاں دے سکیں۔ اللہ پاک تمہیں اسکوٹر ہی نہیں میرا خیال ہے کہ موٹر عطا فرمائے گا۔

اس کے بعد اندر جاکر جب انھوں نے بیگم سے بتایا کہ اشفاق میاں آئے ہیں تو فوراً ہی خاطر مدارات کا اہتمام ہوا اور رخشی کے ابّو اشفاق میاں کو

اندر بلا لائے اور بیگم کو ان کے سامنے لے آئے۔ رخشی اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی، اس لئے کہ اسے یہ علم ہوگیا تھا کہ کون آیا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کیوں آیا ہے۔

رات میں رخشی کے ابّا نے جب اشفاق کا پلاٹ سنایا تو رخشی کے بھی کان لگے ہوئے تھے۔ اشفاق کو اس نے چپکے سے دیکھ بھی لیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس نے اسکوٹر کے سلسلے میں کیا پلاٹ بنایا ہے۔ یہ سب کچھ سن کر اس کی مسرتوں کی انتہا نہ رہی——

اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اشفاق دولہا بنکر آگیا۔ بارات کا استقبال شاندار طریقہ پر کیا گیا۔ یہ خود اشفاق کی بھی خواہش تھی۔ جہیز حتی المقدور ہر بیٹی کا باپ دیتا ہے۔ رخشی کے باپ نے بھی دیا تھا۔ بارات آنے کے بعد نکاح سے پہلے ہی اشفاق کے باپ نے اسکوٹر کے متعلق دریافت کیا۔ اسکوٹر دھلی دھلائی بالکل نئی کنڈیشن میں جہیز کے دوسرے لوازمات کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اشفاق کے بابا کی پوپلی باچھیں کھل گئیں اور انھوں نے سمدھی کو لپٹا لیا۔ ان کی دلی تمنا پوری ہوگئی تھی۔ اور رخشی کے گھر والوں کی خوشی کی بھی انتہا نہ تھی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اشفاق نے یہ نہ کیا ہوتا تو کیا ہوتا۔

شیطان کا انتقام

شیطان ایک عرصہ سے عورتوں، مردوں اور بچوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دن اس نے ساری دنیا کی خبیث روحوں کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور پھر غرور سے اپنا سر اونچا کر کے بولا:—

"اے میرے عزیزو اور جانبازو مجھے یہ بتاؤ کہ انسان سے انتقام لینے کے لئے اسے کس چیز سے محروم کرنا چاہیئے؟"

ایک خبیث روح نے جواب دیا: "شیطان اعظم۔ دولت سے۔!"

شیطان نے کہا: "غلط۔ بالکل غلط۔ کیا انسان دولت سے محروم رہ کر مسرور اور شادمان نہیں رہ سکتا۔ میں خوب جانتا ہوں کتنی غریب عورتیں، مفلس مرد اور نادار بچے زندگی کے دن ہنسی خوشی اور قناعت سے بسر کر رہے ہیں!"

دوسری خبیث روح نے کہا: "میرے آقا! حکومت سے!"

شیطان نے کہا: "کیا حکومت سے محرومی اسرت سے محرومی کے مترادف ہے؟"

تیسری خبیث روح نے کہا: "سردار۔ شہرت اور عزت سے!"

شیطان بولا: "یہ بھی بکواس ہے۔ اس لمبی چوڑی دنیا میں کتنے ہی انسان ہیں جو مشہور اور معزز نہیں ہیں اور اس کے باوجود وہ مسرور و مطمئن ہیں۔"

یہ سن کر تمام خبیث روحیں حیران ہوگئیں اور ایک دوسرے کا منھ تکنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیطان کے مشکل سوال کا صحیح جواب کیا ہو سکتا ہے۔

بالآخر شیطان کے مکروہ ہونٹوں پر بڑی عجیب غریب مسکراہٹ آئی اور وہ بولا: "اے میرے دوستو، رفیقو! سنو! غور سے سنو میری ترکیب کیا ہے؟ انسان کو "مسرت" سے محروم کر دو، وہ ہر چیز کی تمنا مسرت ہی کی خاطر کرتا ہے۔ یقین کرو، جب اس کے دل سے مسرت غائب ہو جائے گی تو میرا انتقام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا!"

یہ سن کر خبیث روحیں اپنے چمگادڑوں جیسے پروں کو پھڑپھڑانے لگیں۔ ان کی ناکیں عقاب کی چونچ کی طرح نظر آتی تھیں اور ان کے سروں پر بال بالکل نہیں تھے اور وہ گنجی تھیں۔ اپنے سیاہ اور بدنما پروں کو ہلاتے ہوئے ان خبیث روحوں نے یہ نعرہ لگایا:

"اے نارِ جہنم کے لاڈلے! اے شیطان! تو ہمارا مالک اور رہنما ہے ہم تیرے حکم سے سرتابی نہیں کریں گے۔ ہم دنیا میں جاتے ہیں۔ تیرا موثر، تیز اور انوکھا ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں ہوگا، ہم انسان کو مسرت سے محروم کر دیں گے۔ اسے سب کچھ دے کر خوشی اس سے چھین لیں گے۔"

تربیتِ اولاد

خاتون اکرم

سہ پہر کا وقت تھا زبیدہ بھاوج اور بھتیجی کو گاڑی سے اتروا کر صدر دالان میں لے گئی۔ دونوں کو فرش پر بٹھایا۔ خود پاندان اٹھا کر پان بنانے لگی۔ ناشتہ کو پوچھا جو معلوم ہوا کہ ابھی نہیں کیا۔ زبیدہ نے اپنی پرانی ماما نسترن کو بلا کر ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ نسترن جلد لے کر حاضر ہو گئی۔ زبیدہ نے ناشتہ کا خوان بھاوج اور بھتیجی کے آگے بڑھا کر کھانے کے لیے کہا۔ بھاوج نے کہا "باجی جان! بچوں کو بھی یہیں بلا لیجئے۔ ہمارے ساتھ ہی وہ سب بھی کھالیں۔" زبیدہ نے جواب دیا "تمہیں دلھن تم کھاؤ۔ انا ان کو وہیں ناشتہ کروا دے گی۔" گو زبیدہ نے بہت ٹال مٹول کیا مگر بھاوج کے اصرار سے بچوں کو بلانا ہی پڑا۔

تینوں لڑکے دونوں لڑکیاں آئیں۔ بچوں کو دیکھ کر زبیدہ بولی: "اے ہے تم نے فوراً ہی کپڑے میلے کر لیے نا؟ (منجھلے لڑکے سے) یہ قمیص میں دھبے کہاں سے ڈالے ہیں؟"

بڑا بچہ: "شہتوت کھائے ہیں۔"

زبیدہ: "نئی قمیص ناس کر ڈالی۔ شہتوت کا داغ نہیں چھوٹتا (ایک تھپڑ مار کر) کم بخت اور کوئی چیز تجھے نہیں ملی تھی۔ جو دامن میں رکھ کر کھایا۔ ان بدبختوں کے مارے تو میرا ناک میں دم آگیا۔ میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ جاؤ سب ناشتہ ٹھونس لو۔ اور میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔"

ناشتہ کرنے سب فرش پر بیٹھے سوائے منجھلے بچے کے کہ وہ مار کھا کر روتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ چاروں ناشتے پر ایسے گرے گویا ان کو کل سے فاقہ تھا۔ سب نے بڑی بدتمیزی سے کھایا بھائی بہنوں میں مٹھائی کی ایک ڈلی پر لڑائی ہو پڑی۔ لڑکی نے شیشے کا گلاس کھینچ مارا۔ وہ تو کہو خیر ہوئی بچہ ہٹ گیا ورنہ خدا جانے کہاں چوٹ لگتی۔ وہ تو خیر بچ گیا۔ مگر گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ زبیدہ مارنے اٹھی لڑکے بھاگ گئے۔ زبیدہ نے بھتیجی سے کہا: "فاطمہ تم بھی جا کر کھیلو" مگر وہ ان بچوں کی بدتمیزی دیکھ کر نہیں گئی۔

ناشتہ ختم کر کے جب بچے چلے گئے تو دونوں نند و بھاوجیں ذرا اطمینان سے بیٹھیں۔ اور باتیں کرنے لگیں۔ ماں کے وقت کے کچھ قصے نکلے۔ کچھ دیر چھوٹی بہن کا تذکرہ ہوتا رہا۔ بھائی کا حال پوچھتی رہی۔ زبیدہ بھاوج کی باتوں میں محو تھی۔ دور گزشتہ کے تذکرے کبھی خوش کر دیتے تھے کبھی رنجیدہ۔ یہ اسی میں مشغول تھی۔ کہ یکایک چیخ کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ماما چلائی۔ "ہائے ہائے مار ڈالا بیوی دوڑنا۔"

دونوں نند بھاوجیں گھبرا کر کمرے سے نکل کر دوڑیں۔ انگنائی خالی پڑی تھی کوئی نہ تھا۔

زبیدہ چیخ کر: "اری نسترن کیا ہوا؟"

نسترن: "یہاں باغیچے میں آکر دیکھئے"

دونوں باغیچے میں گئیں۔ نسترن چھوٹے لڑکے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بچہ ایک بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ زبیدہ کے حواس جاتے رہے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مگر اختر (بھاوج) نے جلدی جلدی سر پر پانی ڈالا۔ ریشم جلا کر بچے کے زخم میں بھرا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ بارے خدا خدا کر کے بچے کو ہوش آیا۔ مگر بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی وہ دھان پان تھا اتنا خون نکل جانے سے اور بھی نحیف ہو گیا تھا۔

بچے کو ہوش میں دیکھ کر زبیدہ کے حواس بھی درست ہونے لگے۔ کہنے لگی "دلھن! ان بچوں نے تو میری زندگی وبال کر رکھی ہے۔ اس قدر شریر ہیں۔ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ باپ پرواہ نہیں کرتے بچے مانتے نہیں۔ ہر طرح میری خرابی ہے۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اسی وقت دیکھو۔ اس کی جان بچ گئی ورنہ (میرے منہ میں خاک) دم نکلنے میں کیا دیر تھی؟ بھلا اتنا سا بچہ اور اس کو اوپر سے ڈھکیل دیا۔ پختہ فرش سر پھوٹے نہیں تو کیا ہو؟ مجھے تو ناحق اللہ میاں نے اولاد دی۔ میں بے اولاد ہی رہتی تو اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اس آفت سے تو نجات رہتی جس میں اب مبتلا ہوں۔"

اختر: "باجی جان! یہ کہنے کی باتیں ہیں۔ اسی اولاد کے لئے عورتیں کیا کیا نہیں کرتیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ سینکڑوں علاج کئے جاتے ہیں۔ اگر پھر بھی اولاد

نہ ہوئی۔ تو اپنے کو بدقسمت بدنصیب کہا جاتا ہے۔ ہردم سرد آہ کھینچی جاتی ہے۔ بانجھ عورتوں کی کس قدر بے قدری ہوتی ہے صبح اس کا نام نہ لو۔ زچہ پر اس کا پرچھاواں نہ پڑنے پائے۔ یہی سبب ہے۔ کہ قیصر (اختر کی چھوٹی بہن) نے سب جگہ کا آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ سیکڑوں روپے اس نے ملّا، سیانوں کی نذر کر دیئے اس قدر دوائیں کھائیں کہ خود مریض ہو گئی۔ ہزاروں تدبیریں کر ڈالیں مگر بچہ نہ ہوا۔ ہردم اسی فکر میں پریشان۔ اسی سوچ میں سرگرداں آخر جب میں نے شاہدہ (اختر کی دوسری لڑکی) کو دے دیا۔ تو کسی قدر خوش ہے۔"

زبیدہ: "اب شاہدہ کو نہیں لوگی؟"

اختر: "نہیں۔ تمہارے بھائی لڑکیوں سے گھبراتے ہیں دو دو لڑکیاں کیا کریں گے لے کے انھیں کے اصرار سے میں نے دے دیا۔ قیصر رکھتی بھی اچھی طرح ہے۔"

زبیدہ: "میں حیران ہوں کہ یہ لڑکے کس طرح درست ہو گئے؟"

اختر: "بچوں کو آپ نے خود سر کر دیا ہے۔ ان کی تربیت آپ کے ذمہ ہے۔ اور آپ اس سے غافل ہیں۔"

زبیدہ: "میں کیا کروں میں تو پڑھا نہیں سکتی نہ یہ سب پڑھیں گے مولوی مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ کہ وہ روز صبح آ کر پڑھا جایا کریں۔"

اختر: "تعلیم تو ان کی ہر طرح ہو سکتی ہے۔ معلم کے ذریعے۔ اسکول کے ذریعے۔ کالج کے ذریعے۔ لیکن تربیت ماں سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بچے کی تربیت بہت چھوٹی عمر سے شروع ہو جانی چاہیئے۔ سب سے پہلے بچے کو اطاعت کا سبق پڑھانا چاہیئے۔ جہاں اس نے اطاعت و فرماں برداری سیکھ لی اور ماں کا ڈر اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ عدول حکمی کی جرأت چلی گئی۔ بس سمجھ لیجئے۔ کہ وہ پار ہو گیا۔ میں آپا حمیدہ (زبیدہ کی بڑی بہن) کے یہاں تین مہینے رہی ان کے تینوں بچے ایسے لائق ہیں کہ میں کیا غیر تک پیار کرتے ہیں۔ ماں کا دباؤ اتنا ہے کہ جتنا باپ اور استاد کا بھی نہ ہوگا۔ ماں اگر ایک جگہ دن بھر بیٹھنے کو کہے وہیں بیٹھے رہیں گے۔ کیا مجال کہ ذرا سرک جائیں۔ باپ کو خبر بھی نہیں۔ کہ کیا پڑھتے کیا کرتے ہیں۔ سب انتظام آپا کرتی ہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھا کہ اس نے مہینے کے عرصے میں مارنا تو درکنار کسی نے ڈانٹا بھی ہو۔ جو بات کہی سن لی۔ جو حکم دیا۔ مان لیا۔ پھر کیوں کر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے یہ سب اطاعت و فرماں برداری سکھانے کا نتیجہ ہے۔

ماں کی گود بچہ کا پہلا مدرسہ ہے۔ اگر پہلے ہی مدرسہ میں نہ پڑھا اور ہونہار نہ ثابت ہوئے تو آئندہ کیا امید ہو سکتی ہے؟ بچے کے دل میں اگر پہلے ہی بیج بدی کے پڑے۔ مثلاً جھوٹ لالچ، چغلی اور غیبت وغیرہ کے۔ تو وہ ہی آئندہ نشوونما پا کر ویسا ہی پھل لائیں گے۔ اگر اچھے تخم کی آبپاشی ہوئی اور نیکی کی ہدایت۔ راست گفتاری کی نصیحت تو وہ ویسے ہی قابلِ تقلید لڑکے ثابت ہوں گے۔

بچے قصے کہانیوں کے بہت ہی شایق ہوتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے چھوٹے موٹے نتیجہ خیز قصے بیان کئے جائیں، باتوں باتوں میں بزرگانِ دین کے حالات، خدا کی تعریف رسول کا ذکر پیغمبروں کے تذکرے سنائے جائیں۔ تو ان کے بے لوث اور معصوم دل پر ایسے بیٹھ جائیں گے۔ کہ مدۃ العمر نہیں بھول سکتے۔ بچپن میں دل و دماغ ہر طرح کے خیالات سے پاک ہوتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی فکر ہوتی ہے نہ غم۔ جو بات سنتے ہیں۔ نقش۔ جو کہانی سنتے ہیں۔ یاد۔ ماں اگر عقل مند ہو تو بچوں کو بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ ہر فرصت کے وقت تھوڑا تھوڑا بتائے۔ کبھی درخت کی نسبت کبھی چڑیوں کی بابت۔ کبھی رنگوں کی نسبت۔ اس طرح بچوں کو بہت کچھ معلومات بڑھا سکتی ہے۔

بچوں کو نظم سے بہت رغبت ہوتی ہے۔ بہت سے گھروں میں اس کی احتیاط نہیں کی جاتی۔ ہر قسم کے شعر پڑھے جاتے ہیں، مناسب ہوں یا نامناسب۔ اس کا اثر بھی بچوں پر پڑتا ہے۔ خراب شعروں کے معنی اگر بچے پوچھ بیٹھیں تو بتاتے نہ بنیں۔ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ ہمیشہ اچھے شعر ان کو پڑھنے کے لیے دیئے جائیں جس میں خدا کی تعریف۔ سچ کی تلقین ہو۔ یا قومی جذبات سے لبریز ہوں۔ تاکہ ان نونہالوں کے دل میں بھی قومی ہمدردی پیدا ہو۔ قوم کی بہتری کا بچپن سے خیال ہو۔ شعروں کے معنی ان کو بتا کر سمجھانا چاہیئے۔ ماں کو لازم ہی نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی تربیت ایسی کرے جس سے لڑکی، لڑکے آئندہ نیک اور ہونہار ثابت ہوں۔ خدا ہندوستان کی سب ماؤں کو ایسی توفیق دے۔

جہیز

قمر سلطانہ سیتاپوری

باپو جی! میں جا رہی ہوں۔ دل تو نہیں چاہتا پر کیا کروں میرا اس میٹنگ میں جانا ضروری ہے........ بہت ضروری — جلدی ہی لوٹنے کی کوشش کروں گی۔ مدھو نے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ضرور جاؤ بیٹی! میری طبیعت اب ٹھیک ہے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔

بھگوان تمہیں اپنی کوشش میں کامیاب کرے۔ اس کے سسر نے کہا۔ مدھو نے اپنے سراپے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ دودھ جیسی سفید ساری کالا بلاؤز۔ خوبصورت کلائیاں چوڑی کنگن کی قید سے آزاد — اداس ویران سی مانگ۔ سامنے کے چند بالوں میں سفیدی کی چمک لیکن پھر بھی وہ کس قدر پرکشش نظر آ رہی تھی۔

ساری کا پلو کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ ایک بار ساڑی برابر کر کے اطمینان کر لیا۔ کہیں اس کی کمر اور پیٹ کے وہ بدنما داغ تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ جنہیں ہمیشہ وہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ پھر اس کے خوبصورت چہرے پر دکھ کی لہر سی دوڑ گئی۔ سیاہ پتلیوں کے پیچھے اس کی جھیل سی آنکھیں چھلک گئیں۔

ماضی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ آج سے دس سال پہلے وہ اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ غریب باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بھاری جہیز نہ لا سکی تھی۔ اور اس کے لئے روزانہ اسے طعنے سننے پڑتے تھے۔

اس کے سسر راکیش ورما ایک فرشتہ صفت انسان اور مدھو کے باپ کے جگری دوست تھے۔ ایک بار بچپن میں انھوں نے کہدیا تھا کہ مدھو کو وہ بہو بنا کر اپنائیں گے۔

اس کے لائق فرمانبردار بیٹے نے باپ کی خوشی کے سامنے سر جھکا دیا اور گھر بھر کی مرضی کے خلاف حسب وعدہ انھوں نے مدھو کو بہو بنا لیا۔ لیکن مدھو کی ساس رات دن بہو کا کلیجہ چھلنی کرتی رہتی۔

[illegible] تھوڑی ایک [illegible] رات [illegible] آئے۔ [illegible] —

کیا میرے انیل کیلئے یہی رہ گئی تھی —؟

ہاں ماں! میں بھی تھی — میری بھابھی۔ ریڈیو۔ پنکھا — ٹیپ ریکارڈ۔ ٹی وی اور فریج وغیرہ لائیں گی۔ مگر وہ تو کچھ بھی نہ لائی۔ انیل کی بہن پریا نے کہا۔

اے بس کر پریا! وہ لیکر ہی کیا آئی پھوٹی کوڑی بھی تو نہ دی باپ نے — اور دیتے بھی کہاں سے کنگال ہیں موئے۔

راکیش نے کہا انیل کی ماں! آخر کیوں تم ہر گھڑی بہو کو طعنے دیا کرتی ہو، ذرا سوچو تو۔ گھر کا سارا کام وہی اکیلی کرتی ہے تمہاری بھی خدمت کرتی ہے۔ بھلا سوچو تو جو بہو بھاری جہیز لیکر آتی وہ یہ سب کچھ کرتی —؟ وہ تو تمہیں نوکرانی بنا کر رکھتی۔

لو اور سنو! گھر کا کام نہ کرے گی تو کون کرے گا۔ میکے سے نوکرانی لائی ہوتی ساس نے کہا۔

راکیش بولے "یہ پریا کیوں نہیں کرتی؟ میں دیکھتا ہوں جب سے بہو آئی یہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی؟" کیوں لگائے میری بیٹی کیا کسی کی نوکرانی ہے؟ ساس نے بات کاٹ کر کہا — تو تم بھی کان کھول کر سن لو۔ مدھو بھی میری بیٹی ہے۔ نوکرانی نہیں ہے۔ سمجھیں" راکیش نے قدرے ترش لہجہ میں کہا۔ کیا کمی ہے اس میں پڑھی لکھی۔ خوبصورت۔ گھر سلیقہ شعار خدمت گذار۔ کیا ہوا جو جہیز نہ ملا۔ کیا اتنی خوبیوں کے باوجود بھی جہیز کی کمی پوری نہیں ہوئی؟ وہ دیوی ہے۔ دیوی۔ راکیش نے فخر سے کہا۔ "بس تو تم ہی اس دیوی کی پوجا کرو۔ مگر یہ بھی سوچا ہے کبھی تم نے پریا کے ہاتھ کیسے پیلے کرو گے" انیل کی ماں نے کہا —

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں" راکیش نے تعجب سے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کسی بڑے گھر سے بہو آئے گی، اس کا جہیز ہماری بیٹی کے کام آجائے گا — مجھے تو وہ دلی والا رشتہ اپنی پریا کے لئے بہت پسند ہے۔ پر کیا کروں۔ ان لوگوں کا جتنے جہیز کا مطالبہ ہے وہ لسٹ دیکھنے ہی سے مجھے چکر سا آ گیا۔ ساس نے کہا —

"بس سوچ لو اسی طرح بیچارہ باپ دباؤ ڈالنے سے ہر لڑکی والا پریشان ہوتا ہے مجھے نہیں کرنا ہے ایسے لالچی لوگوں میں رشتہ"۔ راکیش نے فیصلہ کن انداز میں کہا "اچھا بس کرو انیل کے باپو جی! — وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں — اور پھر اسی طرح گھر میں روزانہ ہی نوک جھونک —

ہوتی رہتی راکیش بابو مدھو کی طرفداری میں زمین آسمان ایک کر دیتے۔

اور انیل کی ماں ـــ وہ تو نفرت کی آگ میں جل رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مدھو کی جان لینے کے منصوبے بناتی رہتی ـــ اور پھر ایک دن بیٹی کو پاس بٹھا کر چپکے سے اظہار خیال کیا۔ کیوں نہ ہم تم مل کر ایک دن اس کا گلا دبا دیں کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کیسے مرگئی۔

نہیں۔ نہیں اماں! اتنا غلط کام مت کرو۔ تم یہ بھی تو سوچو کہ تمہاری بھی کوئی بیٹی ہے۔ اور اسے بھی کسی کے گھر جانا ہوگا ـــ بابوجی بھابھی سے بڑا پریم کرتے ہیں۔ ایسا ہوا تو وہ بھی جان دے دیں گے ـــ اور ہم دونوں کو پولیس پکڑ لے جائے گی۔ پریا نے لرز کر کہا۔ تو تو بزدل ہے۔ کچھ نہ ہوگا لڑکی ـــ ماں نے کہا۔

نہیں اماں نہیں۔ میں اتنا بڑا پاپ نہ ہونے دوں گی۔ پھر بھابھی کی غلطی بھی کیا ہے۔ پریا بولی۔ ڈرتی کیوں ہے پگلی! کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ پھر۔ پھر اپنے انیل کی کسی بڑے گھر سے شادی کریں گے۔ جو لاکھوں کا جہیز اور نقد رقم سب کچھ لے کر آئے گی۔ اور تب تیری بھی شادی بڑی دھوم دھام سے کریں گے۔ ماں نے سمجھایا۔

نہیں! مجھے کچھ نہیں چاہیئے اماں! پریا نے کانوں پر ہاتھ رکھکر کہا ـــ پھر بات ختم ہوگئی۔

گھر کا ماحول رفتہ رفتہ بدلنے لگا۔ مدھو نے بھی سمجھا کر خدمات نے ساس کے دل میں جگہ کرلی ہے۔ راکیش کو بھی خیال ہوا کہ ان کی باتوں سے بیوی کے طرز عمل میں تبدیلی آگئی ہے۔ اور وہ خوش رہنے لگے۔

لیکن پھر ایک بھیانک رات آئی جو مدھو کا سب کچھ لے گئی۔ اس رات گھر کے سارے افراد صحن میں سو رہے تھے۔ مدھو کو حرارت ہونے کی وجہ سے سردی محسوس ہوئی۔ وہ جا کر کمرے میں لیٹ گئی۔

میز پر مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی سے اس کو سکون ملا اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر یکبارگی کسی چیز کے دھماکے سے اسکی آنکھ کھل گئی۔ لیمپ زمین پر گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے بستر سے شعلے نکل رہے تھے۔

اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ اماں! اس نے وہ دیکھا جو اس کے وہم گمان میں نہ تھا۔ اماں کے ہاتھ میں وہی مٹی کے تیل کا کنستر تھا جو انیل گھر کے مصرف کے لئے لایا تھا۔

مدھو نے لپک کر ساس کے ہاتھ سے چھیننا چاہا مگر لا حاصل وہ پاگلوں کی طرح مسلسل سارے کمرے میں تیل بہا رہی تھی۔

مدھو کی ساڑی میں آگ لگ چکی تھی۔ چھینا جھپٹی میں ساس کے کپڑے بھی آگ کی لپیٹ میں آگئے اور پھر سارے گھر میں چیخ پکار مچ گئی۔ بے تحاشا انیل نے آگ میں کود کر نڈھال سی مدھو کو نکالا ـــ اور بلند سے راکیش نے جلدی سے ایک کمبل لا کر اس پر ڈال دیا۔ مدھو نے رک رک کر کہا۔

ماں... کو... بچالو۔ اور وہ بیہوش ہوگئی ـــ

اماں؟ اماں وہاں کہاں؟ انیل کہتا ہوا جلتے کمرے میں کود گیا۔

اسے کچھ پتہ نہیں پھر کیا ہوا؟

جب اسے ہوش آیا اس نے اپنے کو ہاسپٹل کے بیڈ پر پایا۔

اس کے جسم کا نچلا حصہ بری طرح جل چکا تھا۔

دونوں ہاتھ اور چہرہ متاثر نہ ہوا تھا۔ پھر اسے پتہ چلا اس کا سہاگ اجڑ چکا ہے۔ انیل ماں کو بچانے کی ناکام کوشش میں خود بھی ختم ہوگیا ـــ کاش وہ بچ جاتا ـــ انیل اس کا شوہر جو فرشتہ تھا۔ جس نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی جو مدھو کے دکھ کا باعث ہوتی۔

کافی دنوں بعد مدھو کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا گیا۔

ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا۔ شکر ہے آپ بچ گئیں۔

ہاں! میں بچ گئی۔ مجھے بچنا ہی تھا ڈاکٹر۔ مجھے ان لوگوں کا سہارا بننا ہے بہت سے کام انجام دینے ہیں جنکا سہارا صرف میری وجہ سے ٹوٹ گیا۔ بابوجی کو سہارا دینا۔ پریا کے ہاتھ پیلے کرنا۔ یہ سب اب میرا ہی فرض ہے نا ـــ اور اس سے بھی بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اس دیش کے اس سماج کی برائیوں کو دور کرنا ہے۔ آج جہیز کی خاطر نجانے کتنی لڑکیاں ظلم و ستم کا نشانہ بنتی جا رہی ہیں ـــ مجھے جد و جہد کرنا ہے۔ اس لالچی سماج سے جہیز جیسی لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹانا ہے تاکہ پھر کوئی معصوم لڑکی جہیز کی بھینٹ نہ چڑھ سکے جس کی خاطر انسانی زندگی کی کوئی قدر نہیں کوئی قیمت نہیں ـــ

آیئے آیئے! بڑی دیر کردی آپ نے شریمتی مدھو مالا!

مسز کپور کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی! وہ چونک پڑی۔ وہ۔

آئی۔ ایم۔ سوری مسز کپور! مدھو نے ندامت سے کہا۔

اور اس کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا ـــ

وہ ماضی سے حال کی دنیا میں پلٹ آئی۔

قصہ ایک ٹیلیفون نمبر کا

از سیماں

تلی نے ایک خوبصورت مسکراہٹ میری طرف پھینکی اور چابی لے کر کار کی طرف بڑھ گئی۔

میں دیر تک اس مسکراہٹ کے سحر میں مبتلا رہا۔ جانے کب تک رہتا کہ پوسٹ مین کی آواز نے مجھے آزاد کر دیا۔

وہ سائیکل سے اتر کے لان کراس کرتا ہوا نزدیک آگیا اور نیلے رنگ کا ایروگرام میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ میرے ہی نام تھا اور بھیجنے والے کا نام تھا جنید عامر بیگ یو کے انگلینڈ۔ میں چونک گیا پھر مسکرا دیا۔ پوسٹ مین سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہوا گیٹ سے نکل گیا تھا۔

گزشتہ آٹھ ماہ کے دوران جنید کا یہ پہلا خط تھا۔ میں نے کھول کے پڑھا تو معلوم ہوا کہ آخری بھی ہے۔ وہ دو دن بعد انگلینڈ سے واپس پاکستان آ رہا تھا۔

ہماری دوستی اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی سے نکل کر اب تک قائم تھی۔ ہم دونوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ اس کے باوجود ہماری دوستی میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ زبانی دخل در معقولات کے علاوہ ہم نے ایک دوسرے کی ذاتیات میں زیادہ دخل نہیں دیا میں لڑکیوں کے معاملے میں ذرا سشر میلا واقع ہوا تھا۔۔۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ میرے دل میں صنف نازک کی عزت تھی جبکہ جنید پلا کا فلرٹ لڑکا تھا، بے حد کریٹ۔ اس کے نت نئی لڑکیوں سے تعلقات تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر اپنا وقت گزارتا تھا؛ جس وقت لڑکیاں جنید کے ہاتھوں بے وقوف بنتیں، مجھے جنید سے زیادہ ان پر غصہ آتا۔ جو جانتے بوجھتے اپنی تباہی مول لیتی تھیں۔ جنید کی شخصیت میں صنف مخالف کے لئے بڑی کشش تھی۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، مضبوط جسم، سانولی رنگت اور گہری آنکھیں گفتگو کا فن بھی وہ جانتا تھا اس لئے وہ اکثر کامیاب رہتا بلکہ میں نے اسے کبھی ناکام دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ خوبصورت لڑکیوں کا دیوانہ تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ میں نے اپنی پسند سے ملیحہ جیسی حسین لڑکی سے شادی کی ہے تو وہ چونک اٹھے گا کیونکہ وہ اکثر مذاق میں کہا کرتا تھا۔

"یار حسرت بھارہی کہ کبھی کوئی خوبصورت لڑکی تجھے بھی گھاس ڈالے۔" میں جواب میں کہتا: "خوبصورت لڑکیاں صرف گدھوں کو گھاس ڈالتی ہیں۔ ہم جیسے شریف لوگوں کو تو وہ مزے دار کھانے پکا کر کھلاتی ہیں، کوٹ پہناتی ہیں اور اپنے ہاتھوں سے جوتے اتارتی ہیں۔"

جنید ایک قہقہہ لگاتا: "منہ دھو رکھو۔ اس دور میں تمہیں ایسی فرماں بردار بیوی نہیں ملے گی۔" وہ میرا مطلب سمجھ جاتا "اگر کسی خوبصورت لڑکی سے خدمت کروانی ہے نا تو ابھی کروالو۔ بیوی بن کے تو خوبصورت لڑکیاں صرف اپنے ہی ناز اٹھواتی ہیں اس لئے ما بدولت صرف خدمت کروانے کے حق میں ہیں سمجھے۔"

اور میں سوچ رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ مجھے واقعی ایک خوبصورت فرماں بردار بیوی مل گئی ہے تو وہ یقیناً میری قسمت پر رشک کرے گا اور جب میں اسے بتاؤں گا کہ ملی مجھے کیسے ملی تو وہ بڑا محظوظ ہوگا۔

وہ بھی بڑا حسین اور دلچسپ اتفاق تھا۔

وہ نمبر میرے ذہن پر کئی دنوں سے دستک دے رہا تھا۔ تجسس میری طبیعت کا خاصہ نہیں ہے لیکن جانے کیوں اس سرد سی بھیگی ہوئی شام، ریشمیں رضائی میں دبکے ہوئے میں نے ٹیلی فون کھسکا کر وہ نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے فون ریسیو کر لیا۔

"ہیلو" انتہائی سبک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو" میں نے جواب میں وہ نمبر دہرایا

"جی۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"دیکھئے میں" میں نے بڑی شائستگی سے کہا: "میں کچھ عرصے سے بڑی الجھن کا شکار ہوں۔ یہ نمبر جو آپ کا ہے سیاہ روشنائی کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے میری ڈائریکٹری کے اوپر درج ہے لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آتا کہ یہ نمبر کس کا ہے۔ کس نے اور کیوں لکھا؟"

"تو میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ کون ہیں؟ کیا آپ نہیں بتائیں گی؟" میں نے ذرا جھجک کے کہا۔

[illegible] کبھی [illegible] کر لی [illegible]
[illegible] ایک بات میں نے دوبارہ وہ نمبر ملایا لیکن اس کی آواز [illegible] کی ہمت نہ پا سکا۔
تیسری بار ملایا تو ایک مردانہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔
"ہیلو ڈاکٹر رحیم اسپیکنگ"
میں نے ریسیور رکھ دیا۔ سوچتا رہا کہ میں انھیں جانتا ہوں یا نہیں [illegible] کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد میں نے ڈائریکٹری میں ڈاکٹر ان کا نمبر دیکھا۔ اس کے ساتھ ان کا ایڈریس بھی تھا اور کلینک کا نمبر بھی۔ وہ ڈینٹل سرجن تھے۔
یکایک مجھے یاد آیا۔ باجی کو خاصے عرصے سے دانت کی شکایت [illegible]۔ ہر چند کہ میں حنیفہ عام تاثر کا نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں [illegible] لڑکی کو جاننے اور دیکھنے کی خواہش مند رہنے لگا۔
ایک روز فون پر میں نے ڈاکٹر رحیم خان سے ٹائم لیا اور باجی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔
ڈاکٹر خان کافی خوش مزاج آدمی تھا۔ کچھ میری دلچسپی بھی شامل [illegible] پہلی ہی ملاقات میں خاصے مراحل طے کر لیے۔ مریض زیادہ نہیں [illegible] باتوں باتوں میں میں ان کی ذاتی زندگی تک آ گیا۔ معلوم ہوا صرف [illegible] ہیں۔ لڑکی بی۔ اے کر چکی تھی، لڑکا کسی دوسرے شہر کے میڈیکل کالج [illegible] اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دوران گفتگو میں باجی نے ان کی لڑکی کا نام پوچھ لیا۔ یوں میری مشکل آسان ہو گئی۔ اس کا نام ملیحہ رفعت تھا۔
[illegible] شام میں نے فون کیا ہلو کرن۔ ملیحہ رفعت بات کر رہی ہیں؟" میں نے [illegible] کہا۔
"جی۔ آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟" اسی کی آواز تھی۔
[illegible] "میں ہنسا۔
[illegible] وہ [illegible]
[illegible] میں نے ہنس کر کہا۔
[illegible] لیکن میں نے آخر
[illegible] ہیں؟"

[illegible] مضمون سے مناسبت نہیں کرتی۔" اس نے [illegible] کہا اور فون رکھ دیا۔ لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ پھر اسی نے اٹھایا۔
"ہیلو"
"ندیم اختر" میں نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ اس [illegible] کر دیا۔ میں نے پھر ملایا۔ وہ تنگ آ کے بولی۔
"دیکھیے مسٹر آپ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے [illegible]"
"ملیحہ پلیز" میں نے درخواست کی "ایک بار مجھ سے [illegible] میں بہت شریف لڑکا ہوں۔ آپ سے مل کر آپ کو یاد [illegible]"
"ہو سکتا ہے پھر بھی انکار کر دوں" اس نے کہا۔
"آپ ایسا نہیں کر سکیں گی" جواب میں اس نے [illegible] پر پٹخ دیا۔
باجی ایک بار اور گئیں اور میرے کہنے کے مطابق ڈاکٹر [illegible] گھر جانے کی خواہش ظاہر کر دی۔
اگلے دن ڈاکٹر صاحب نے انہیں چائے پر بلا لیا۔ ملیحہ [illegible] کی طرح حسین تھی۔ بہت اخلاق سے پیش آئی اور [illegible] دوستانہ انداز میں بات کی۔
کچھ دن بعد ہی باجی کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ [illegible] جو قبول کر لی گئی۔ اس کے بعد باجی نے باقاعدہ [illegible] کر میں ہی لے کر گیا۔ راستے بھر میں سوچتا رہا کہ ہو سکتا ہے [illegible] جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ گھر میں ڈاکٹر خان کے علاوہ [illegible] بھی تھا جو ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے اسے [illegible]
عقیقے والے روز دونوں بہن بھائی آئے۔ باجی [illegible] میری پسندیدگی کو محسوس کر رہی تھیں۔ انھوں نے باتوں [illegible] کر لیا کہ وہ کہیں انگیج نہیں ہے۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ [illegible] ساتھ کس طرح پیش آتی ہے۔
[illegible]

میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو لڑکیوں کے لئے پُرکشش ہوسکتی ہے لیکن یہ میری شرافت ہی تھی کہ میں ان چکروں سے دور رہا۔ چوں کہ عورت ذات پر اعتماد نہیں رہا تھا اس لئے امی اور باجی کی کوششوں کے باوجود میں شادی کے ذکر کو ٹال جاتا تھا لیکن آخر، اپنا گھر کبھی مجھے بسانا تھا سو اب میں ملیحہ صورت کو آزما رہا تھا۔

تقریب کے بعد باجی نے انھیں چھوڑ آنے کے لئے کہا گھر پہونچ کر ملیحہ نے چائے کی آفر کی جو میں نے قبول کرلی۔ ڈاکٹر خان سو چکے تھے۔ نوید تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھ کے کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ ہم دونوں چائے پیتے رہے۔

"دیکھا ملیحہ میں نے آپ کو تلاش کر ہی لیا نا؟"

"جی!" وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میں ندیم اختر ہوں" میں نے مسکرا کے کہا "پہچان گئیں آپ؟"

اس نے نظر جھکالی۔ باجی ابھی تک مجھے نومی کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھیں۔

"کیا آپ نے نہیں پہچانا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"جی پہچان لیا ہے" اس کی آواز میں ٹیلی فون والی سختی نہ تھی۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے نظر اٹھا کے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتا ہوں ملیحہ" میں نے اسے غور سے دیکھ کے پوچھا "کیا آپ مجھے کچھ وقت دیں گی؟"

"کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"نوید کے آنے تک شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں" میں نے مسکرا کے کہا "آپ کہیں باہر نہیں مل سکتیں؟"

"دیکھیے ندیم صاحب" یکایک اس کا لہجہ خشک ہوگیا "میں نے آپ سے فون پر کہہ دیا تھا۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں"

"آپ غلط سمجھے ندیم صاحب" وہ آہستہ سے بولی "میں کسی کو پسند نہیں کرتی۔ یہ حق میں نے اپنے پاپا کو دیا ہے" اس کا لہجہ اس کے کردار کا آئینہ تھا۔

پھر امی نے ڈاکٹر خان سے ملیحہ کو مانگ لیا۔ اس طرح ہماری شادی ہوگئی۔ ملیحہ صورت کی حسین ہونے کے ساتھ سیرت کی بھی خوب تھی۔ وہ ایک مثالی بیوی تھی جو انعام کے طور پر خدا نے مجھے بخشی تھی۔ جانے میری کون سی نیکی کام آگئی تھی۔

مجھے جنید عامر کا خیال آگیا جو بے شمار خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے باوجود ابھی تک اپنا گھر نہیں بسا سکا تھا۔ یقیناً مرد کی فطرت کے مطابق وہ بھی ایک نیک کردار بیوی چاہتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔ وہ جب یہاں آئے گا تو اچانک میری شادی کی خبر اور ملّی جیسی حسین اور نیک لڑکی کو میری بیوی کے روپ میں دیکھ کر چونک اٹھے گا۔ میرے تصور میں جنید کا فلیٹ آگیا، جہاں اسکول اور کالج کی طالبات اس کی آغوش میں ہوتیں اور ان کی کتابیں اور سینڈل کمرے میں بکھرے رہتے۔

ایک شام ہمارے گھر کی گھنٹی بجی اور وہ آگیا۔

میں نے خوشی سے اسے لپٹا لیا۔ وہ دیر تک باتیں کرتا رہا وہی عورتوں کی باتیں۔ اس نے بتایا کہ انگلینڈ میں اس نے زیادہ تر ایک ہی عورت کے ساتھ وقت گزارا جو شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس سے ملا کرتی تھی۔ مجھے یاد آیا۔ وہ شادی شدہ عورتوں کو بھی بآسانی اپنے شیشے میں اتار لیا کرتا تھا اور جانے کیوں یکایک ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ ملّی کو اس کے سامنے نہیں لاؤں گا۔ مجھے ملّی پر اعتماد تھا مگر شاید میں جنید کو ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

میں چائے کے لیے ملّی سے کہنے گیا تو اسے ادھر آنے سے روک دیا جبکہ کچھ دیر پہلے میرا پروگرام اسے اچانک سامنے لانے کا تھا۔

واپس آیا تو جنید بولا "خالہ جان کہاں ہیں؟"

"اب خالہ جان باری باری دونوں بیٹوں کے یہاں رہتی ہیں" میں نے مسکرا کے کہا۔

"کیوں؟" وہ چونک گیا۔

"اس لئے کہ اب میں بھی بیوی والا ہوں" میں نے ہنس کے کہا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر مجھے گھورنے لگا۔ میں مسکراتا رہا۔

"میرے بغیر تو نے شادی کرلی؟" آخرکار وہ پھنکارا۔

"میرے بغیر تو جانے کتنے فلرٹ کرچکا ہے" میں نے ہنس کر کہا "میں ایک شادی نہیں کرسکتا"

"اچھا یار" وہ سب کچھ بھول کے میرے نزدیک آ بیٹھا "یہ بتا بھابی کیسی ہے؟"

"حسن کا شاہکار" میں نے کہا تو وہ اچھل پڑا۔

"کیا واقعی تو اتنا لکی ہے؟ یار یقین نہیں آتا۔ کب ملوا رہے ہو پھر؟"

"وہ پردہ کرتی ہے ڈیئر" میں نے کہا تو مایوسی سے اس کا چہرہ لٹک گیا۔

"مجھ سے بھی پردہ کروائے گا؟" اس نے ایک امید کے ساتھ کہا۔

"میں کیا کروں یار؟ وہ میرے سب دوستوں سے پردہ کرتی ہے ——"

"اچھا" اس نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کے کہا پھر اٹھ کے فون کی طرف بڑھ گیا۔ باہر ٹرالی کی آواز سن کر میں دروازے پر گیا اور ملیحہ سے ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

میری طرف پشت کیے جنید فون پر نمبر ملاتا رہا اور میں ملیحہ کی لائی ہوئی چائے بنانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بات کیے بغیر فون رکھ دیا اور شانے اچکا کے میری طرف آ گیا۔

"تعجب ہے آج پھر ابا جان تھے" وہ کہتا ہوا صوفے پر پھیل کے بیٹھ گیا۔

"کوئی پرانا نمبر تھا یا نیا؟" میں نے چھیڑا۔

"نمبر تو پرانا ہی ہے یار" وہ کچھ دیر سوچنے لگا "مگر لگتا ہے محبوبۂ دل نواز کہیں پی کے گھر نہ سدھار گئی ہوں۔ کل سے دس بار فون کر چکا ہوں۔ ابا جان ہی اٹینڈ کرتے ہیں"

"اچھا" میں نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "کون خوش نصیب ہے جسے تم نے اب تک یاد رکھا"

"ملوا دیں گے یار۔ اتنے بے تاب مت ہو۔ وہ تمہاری ان کی طرح پردہ نہیں کرتی" وہ ہنسا اور چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا لی ——

پھر اس نے کئی بار وہ نمبر ملایا اور ناکام رہا۔

"لاؤ مجھے وہ نمبر بتاؤ" میں اس کے نزدیک گیا "ہو سکتا ہے میرے مبارک ہاتھوں سے تمہاری مراد بر آئے"

"ہوں" وہ مسکرایا "جی تو چاہتا ہے ابا جان سے ہی پوچھ لوں۔ کہیں ملیحہ جی کو رخصت تو نہیں کر دیا اپنے گھر"

"ملیحہ؟" میں چونک گیا۔

"ہاں۔ ملیحہ رفعت" وہ میری حالت سے بے خبر بولتا رہا ——

"ملاؤ نمبر فور۔ تھری۔ ایٹ" وہ بول رہا تھا اور میرے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے ——— میری نظروں میں اس کے فلیٹ کے وہ مناظر گھوم رہے تھے ——— جو اکثر و بیشتر وہاں جانے پر مجھے دکھائی دیتے تھے ——— ملازم دروازہ کھولتا تو ڈرائنگ روم میں کسی لڑکی کا برقع کتابیں یا جوتے بکھرے ہوتے اور جنید بیڈ روم سے جھانک کر مجھے دیکھتا تو اس کے چہرے پر بڑی کامیاب مسکراہٹ ہوتی۔

ملیحہ کی حسین اور معصوم صورت میری آنکھوں میں آ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل اندر سے کوئی کاٹ رہا ہو۔ یہی حسین اور معصوم وجود ایک گناہ گار کی طرح جنید کے فلیٹ میں بکھرا ہوا دکھائی دیا۔ جی چاہا ابھی جا کر ملیحہ کو ختم کر دوں مگر یہ سب چند لمحوں کی سوچ تھی۔ بہت جلد خود کو سنبھال لیا اور نمبر ملانے لگا۔

مجھے معلوم تھا۔ اب بھی فون ڈاکٹر خان ہی اٹینڈ کریں گے کیونکہ اب ملی میرے گھر میں تھی۔

"جاؤ یار تم بھی یوں ہی نکلے" وہ مایوسی سے بولا پھر کچھ دیر بعد اس نے شانے اچکا کے کہا "چلو جی ملیحہ رفعت تمہیں بھی خدا حافظ"

"بس ہار گئے" میں نے طنز سے کہا۔ وہ شاید میرے طنز کو نہیں سمجھا تھا یا جان بوجھ کے ٹال گیا تھا ہنس کے بولا۔

"یار آج کل ایک حسینہ بڑی لفٹ دے رہی ہے۔ روز آتے جاتے اسٹاپ پر ملتی ہے۔ ابھی تو میں بے نیازی برت رہا ہوں گاڑی نزدیک سے نکال لے جاتا ہوں لیکن چند دن بعد تم دیکھنا گاڑی تو گاڑی وہ لڑکی اپنے دل میں ہو گی۔

وہ بول رہا تھا اور میں زخمی دل کے ساتھ سوچ رہا تھا ملیحہ بھی کتنی بڑی اداکارہ نکلی۔ اپنے مکروہ وجود کو پاکیزگی کا لبادہ اوڑھا کر اس نے کتنا معصوم بنا لیا تھا اور میں کتنا نادان تھا۔ اتنا محتاط رہنے کے باوجود اس معصومیت کے ہاتھوں لٹ گیا۔ لیکن اب میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے طلاق دے دوں گا۔ اس سے پہلے کہ جنید عامر کو علم ہو کہ وہ میری بیوی ہے۔

جنید اپنے گھر لوٹ گیا۔ ملیحہ کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ اسے بغیر کچھ کہے میں بھی گھر سے نکل گیا اور یوں ہی سنسان سڑکوں پر چلتا رہا۔ ذہن و دل میں ایک لاوا سا پک رہا تھا۔ کبھی جی چاہتا اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دوں۔ کبھی جی چاہتا اسے جان سے مار دوں اور کبھی دل میں آتا اسے اتنی اذیتیں دوں کہ وہ موت مانگنے لگے۔

رات گئے گھر لوٹا تو وہ انتظار کر رہی تھی۔ بہت پریشان تھی لیکن

لوٹ آنے تک میں خود کو سنبھال چکا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے گن سے اسے واقف کرنے کے بعد اسے طلاق دوں گا۔

"کیا آپ جنید کے ساتھ ہی چلے گئے تھے؟" اس نے ناراض ہو کر پوچھا۔ اس وقت میرا دل اس کی صورت دیکھنے تک کا روادار نہ تھا مگر مجھے جواب دینا پڑا۔

"ہاں: وہ زبردستی لے گیا تھا۔" اتنا کہہ کر میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔

"کھانا نکالوں؟" اس نے پکار کے کہا

"نہیں۔ میں کھا کر آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

کپڑے بدل کے باہر آیا تو وہ سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر میں بھی لیٹ گیا۔ رات کافی گزر گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا ملیحہ سو گئی ہے۔ لیکن تمام رات میں نے اذیت کی سولی پر لٹکتے ہوئے گزاری رہ رہ کے جنید کے بیڈ روم کا منظر آنکھوں میں گھوم جاتا جہاں ملیحہ اس کے ساتھ ....

"نہیں۔" میں دونوں ہاتھوں سے سر بھینچ کر فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

صبح جب میں آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو وہ چائے لیکر کمرے میں آئی۔ میں نے اس کی طرف پشت کیے ٹائی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"تم۔ جنید عامر کو جانتی ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ ہنس کے بولی: "وہ آپ کا دوست ہے۔"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جھکی ہوئی چائے بنا رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے کچھ نہیں پوچھا اس کے حسین اور مسکراتے ہوئے معصوم چہرے کو دیکھ کے سوچ رہا تھا، وہ کس بلا کی اداکارہ ہے اگر اور کوئی لڑکی ہوتی تو اپنے آشنا کے نام پر اس کی رنگت زرد پڑ جاتی۔

آفس سے میں نے جنید کو فون کیا اور رات کو اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔

شام ہوتے ہی وہ آ گیا۔

میں نے ملیحہ سے چائے بنا کر لانے کو کہا تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی

"پہلے تو آپ اس سے میرا پردہ کروا رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ کریکٹر لیس ہے ——" وہ منہ بنا کے بولی —: "اور آج آپ مجھے اس کے سامنے لا رہے ہیں۔ کیا وہ اب شریف ہو گیا ہے؟"

میرا دل بے ساختہ چاہا کہ اس چالاک عورت کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصوم مسکراہٹ نوچ کے پھینک دوں لیکن میں ضبط کر گیا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم جلدی سے چائے بنا کے لے آؤ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ فطری طور پر اندر آتے ہوئے جھجکے گی اس لئے کہ ابھی جنید کا اور اس کا گہرا تعلق رہا ہے مگر وہ بڑے اطمینان سے چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جنید عامر اسے دیکھتے ہی اچھل کے کھڑا ہو جائے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔

اس نے بڑی پرشوق نگاہ ملیحہ پر ڈالی اور ہنستے ہوئے بولا: "ماشاءاللہ ندیم۔ بھابی تو واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔ تو واقعی لکی ہے یار۔"

میں حیران تھا۔ کیا اس طرح اطمینان کا اظہار کر کے وہ دونوں مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔ مجھ سے اور برداشت نہ ہو گا یہ جنید کی بے وقوفی تھی۔ وہ خود مجھے انجانے میں اپنی محبوبہ کی حیثیت سے ملیحہ کا نام اور فون نمبر بتا چکا تھا۔

میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا جو اب بھی خود کو انجان اور معصوم ظاہر کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا۔ وہ بہانہ تراشے گا۔ وہ کوئی اور ملیحہ رفعت تھی۔ مگر فون نمبر؟ وہ اسے کس طرح بدلے گا۔

ایک کامیاب مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی اور میں نے کہا: "جنید یہ میری بیوی ہے۔ ملیحہ رفعت۔ ڈاکٹر رحیم خاں کی بیٹی۔"

خلاف توقع جنید اپنی جگہ سے اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ ملیحہ نے حیرت سے اسے دیکھا جو آنکھیں پھیلائے ایک ٹک اسے تک رہا تھا۔

پھر شرمسار سا جنید میری طرف گھوم گیا۔

"ندیم میں معافی چاہتا ہوں۔ تم سے بھی اور بھابی سے بھی۔" اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ "دراصل آپ جیسی لڑکی کو حاصل کرنا ندیم کا ہی حق تھا میں بہت برا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اسی لئے خدا نے آپ سے مجھے محروم رکھا۔ ندیم۔" وہ میرے سامنے آ کر بولا۔ "تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ملیحہ بھابی جیسی نیک اور حسین بیوی ملی دوست بھابی پہلی عورت ہے جو میرے دام میں نہ آ سکی۔ شاید میں ٹیلی فون سے گھر تک کا راستہ طے کر لیتا اگر مجھے اچانک انگلینڈ جانے کی آفر نہ آتی لیکن وہاں جب تنہائی میسر آتی اپنے دیس کی اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہتا جو عورت کی حرمت کی پاسبان تھی۔ ورنہ دوست میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ مرد کی آواز میں

عورت کے لئے جادو ہے۔ مرد کا وجود عورت کی شکست ہے لیکن بھابی سے شکست کھا کر میں نے طے کیا تھا کہ اس نیک لڑکی کو اپنے گھر میں لے آؤں گا لیکن شاید خدا نے مجھے عورت کی بے حرمتی کی سزا دی ہے کہ ملیحہ بھابی کو میرے دوست کی بیوی بنا کر میرے سامنے لے آیا۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا ندیم۔ دنیا جہاں کے گناہ کر کے چاہتا تھا ایک نیک بیوی گھر میں لاؤں۔"

"شکر ہے جنید بھائی" ملیحہ کی معصوم پاکیزہ سی آواز ابھری۔ "آپ کو یہ احساس تو ہوا کہ آپ عورت کی بے حرمتی کرتے رہے ہیں۔ خدا سزا دے سکتا ہے تو معاف کرنے والا بھی تو وہی ہے پھر میرا ایمان ہے کہ مرد کے ساتھ عورت بھی اس کے گناہ میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔ فکر نہ کریں میں ایسی نیک اور اچھی سی لڑکی آپ کو ڈھونڈ کر دوں گی کہ آپ سب کچھ بھول جائیں گے۔"

جنید بھی جیسے ہلکا پھلکا ہو کر ہنس دیا اور ایک دم مجھ سے لپٹ گیا ——

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود کو اذیت کی سولی سے اتار لیا گیا ہو۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے خریداروں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، ساتھ ہی موزوں اور پاکیزہ ہو۔ جو اشعار چھپنے والے ماہ سے پہلے کی ۱۰ تاریخ تک دفتر میں وصول نہیں ہوتے، وہ شامل نہیں کئے جاتے۔

اکتوبر کے لئے "گلاب" اور نومبر کے لئے "قمر"

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

مرسلہ: شگفتہ (بالکا)

تیرے ملنے کی خوشی میں کوئی نغمہ چھیڑوں
یا ترے درد جدائی کا گلہ پیش کروں

مرسلہ: غوثیہ (دھارواڑ کرناٹک)

ہوں گرفتار نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مرسلہ: فرح دیبا (تاتار پور - بھاگلپور)

مجھے چپ سمجھنے والے، تجھے کیا خبر کہ کم ہے
ترے نغمۂ سحر میں، مرا نالۂ شبانہ

مرسلہ: سیدہ فرح دیبا عابدی (امراؤتی کیمپ)

مرسلہ: نصرت النساء (ترو تا طائی تامل ناڈو)

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

مرسلہ: مسز نسیمہ عزیز (اہرہ پور بھاگلپور)

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، بڑے دکھوں کی پکار ہوں

مرسلہ: فریدہ ام حلیم (اتری پتر)

فرشتوں نے نغمے مسرت کے گائے
محمد ہیں دنیا میں تشریف لائے

مرسلہ: شہناز بیگم (ایچکا پاپیٹ)

میرے آگے شاعری عرفان نغمہ ساز ہے
میری دلکش نغمہ سنجی کا یہی اک راز ہے

مرسلہ: نجمہ انصار رشا (بھٹکل)

تیری فرقت میں بھی قربت کا مزہ ہوتا ہے
تو نہیں غم تو ترا نغمہ سرا ہوتا ہے

مرسلہ: امروز جہاں (آرہ)

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مرسلہ: ہمال (جونپور)

کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

مرسلہ: قرۃ العین حیدر (مندیال)

کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے
زندگی آواز ہی آواز ہے

مرسلہ: زرتاج زاہد (حیدرآباد)

میری زباں خموش ہے نغمۂ غم سنائے کون
سارا جہاں ہے منتظر دہر سیر اسکو لائے کون

(مرسلہ: کشور سلطانہ لال باغ لکھنؤ)

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کے خریداروں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ر تاریخ سے پہلے دفتر میں پہنچ جائے خبر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی روانہ کریں۔ خبر کی اشاعت میں کسی بھی غلطی کا ذمہ دار ادارہ حریم نہ ہوگا، البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جائیگی۔

ضروری تصحیح اگست کے بزم حریم میں پیغامات نشاط کے تحت محترم ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب ہیڈ آف ناٹوی ڈپارٹمنٹ، میڈیکل کالج کی صاحبزادی عزیزی روبینہ سلمہا کی شادی کی خبر چھپی تھی۔ کاتب اور پروف ریڈر کی ختر کی غلطی سے ڈاکٹر صاحب کا نام عبدالحلیم کے بجائے عبدالحکیم چھپ گیا ہے۔ درست کر لیا جائے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• محترم مقبول احمد لاری صاحب کے فرزند دلبند عزیزی منظفر احمد لاری سلمہ کو دس سال بعد یکم رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ کو اللہ رب العزت نے ایک دختر عطا فرمائی۔ جس سے اقبال منزل میں خوشی اور شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ محترم مقبول احمد لاری صاحب اور بیگم صاحبہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ پاک بچی کو عمر طویل بخشے صاحب نصیب کرے اور فخر خاندان بنائے۔ (نسیم انجم نوی)

• نسیم تبسم نثار اور ناہیرہ، وحی (پرنام بٹ) ہماری خالہ انیسہ صاحبہ اور خالو اعجاز احمد صاحب کو اللہ پاک نے پندرہ جولائی ۱۹۸۳ء بروز جمعہ ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

• دیرسلا طاہرہ ترنم۔ شنضیرہ تبسم (آمبور) ہماری آپا احمدی ناز اور بھائی حاجی عظمت اللہ صاحب کو اللہ پاک نے ۲۰ر جون ۱۹۸۳ء [illegible]

قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

سید کمال احمد (ہزاری باغ) میرے بڑے بھائی سید سہیل احمد صاحب اور بھابی افسری ناز صاحبہ کو اللہ پاک نے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام سید ذیشان سہیل رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عنایت فرمائے اور صاحب علم بنائے۔

ثمینہ شاہین (ملکی محلہ آرہ) میں اپنی پیاری ممانی جان رشیدہ اشرف اور پیارے ماموں جان قیس اشرف جو کناڈا میں انجینیر ہیں کو انکے گلشن حیات میں پہلی بار ایک خوبصورت کلی کھلنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ اس کی خوشبو سے ساری فضا معطر ہو جائے اور اور کلی پھول بنکر فخر خاندان بنے آمین

اختر النساء بیگم و محمود النساء بیگم۔ ہم بے حد خوشی و مسرت کے ساتھ یہ خبر بھیج رہے ہیں کہ ہمارے چھوٹے بھائی وقار احمد پیرزادہ اور پیاری بھابی مجیانی نور جہاں بیگم کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۶ر مئی ۱۹۸۳ء بروز جمعہ رات کو ۹½ بجے پہلی بار ایک پیاری سی کلی کھلائی نام حنا پروین رکھا گیا خدا نیک و صالح اور صاحب نصیب بناتے ہوئے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھا کر عمر طویل عطا فرمائے۔

مس فرزانہ زاہدی (قصبہ بھٹ سہارنپور) پیاری بہن بشریٰ زیدی کو اللہ پاک نے ۱۰ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ایک بہت پیارا سا بیٹا عطا فرمایا نام محمد صیف رکھا گیا اللہ پاک میرے صیف کو عمر خضر عطا فرمائے اور والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھا کر صاحب نصیب فرمائے۔ آمین

پیغامات نشاط

• میرے دیرینہ کرم فرما جسٹس نواب سید مرتضیٰ حسین صاحب کے فرزند دلبند عزیزی امتیاز سلمہ کی شادی، عزیزہ ثمینہ سلمہا دختر سید وقار حسین صاحب نقوی (بمبئی) کے ساتھ ۱۱ر اگست ۱۹۸۳ء کو بمقام تاج محل ہوٹل بمبئی عمل میں آئی۔ اس سلسلہ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ ۱۵ر اگست کو احاطہ راج بھون میں دی گئی جس میں عمائدین۔ حکام اور دوسرے تمام حلقوں کے معززین نے شرکت فرمائی۔ افسوس کہ اس روز ہم بمبئی میں تھے، اس لئے شریک دعوت نہ ہو سکے۔ بہرحال محترم جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک امتیاز سلمہ اور ثمینہ سلمہا کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

نسیم انہونوی۔ غزالہ بیگم (مسو، وزیر النسا ناہید)

• محترم عطا کاکوی صاحب (سلطان گنج پٹنہ) کے صاحبزادے سید شاہ شکیل الرحمٰن سلمہٗ کی شادی خجستہ جمال فاطمہ سلمہا (بنت سیف الدین صاحب۔ گلستاں پٹنہ) کے ہمراہ ۵ اگست ۱۹۸۳ء کو بمقام انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• مجھے یار عاکفہ، دا صفہ تحسین (آمبور) ہماری آنٹی ذکیہ پروین صاحبہ خریدار حریم (دختر نیک اختر جناب کٹلیے عبدالخالق) کا عقد سعید ہمراہ ایم رفیق احمد صاحب، ۲۴ جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار بوقت ۴ بجے دن بمقام چھوٹی مسجد، بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• مسز کامنی بیگم جسٹس نذیر احمد صاحب، پٹنہ ہائی کورٹ (پٹنہ) بڑی مسرت سے لکھ رہی ہوں کہ میری بیٹی نور چشمی شگفتہ سلمہا بی اے کی شادی، ہمراہ محمد واصل سلمہ، ایگزیکیوٹیو افسر (پسر جناب شمس الحسن، رئیس آگرہ) ۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء کو پولو روڈ کوٹھی ۱۲ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ شگفتہ سلمہا اور واصل سلمہ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ شاد و خرم گذرے۔

• خواجہ نور الدین صاحب (مرحوم) کے فرزند خواجہ سہیل الدین احمد کی شادی کے سلسلہ میں، بیگم خواجہ نور الدین احمد صاحب نے ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کی شام کو ناردرن ریلوے آفیسرس کلب لکھنؤ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ جس میں معززین شہر نے شرکت فرمائی۔ اللہ پاک شادی مبارک کرے۔ نسیم انہونوی۔

انتقال پرملال کی خبریں

بڑے افسوس کے ساتھ یہ الفاظ لکھ رہا ہوں کہ میرے آفس کے ۲۳ سالہ قدیم شریک کار، ہیڈ کلرک محمد حسین عابدی صاحب ۱۲ اگست کی صبح ہارٹ اٹیک سے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مرحوم بڑے قابل انسان تھے پہلے بلرامپور اسٹیٹ میں تھے، ۲۳ سال قبل میرے ادارے سے منسلک ہوئے اور اب تک کام کرتے رہے۔ کئی سال سے ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ تقریباً دو ماہ سے دفتر بھی نہیں آپاتے تھے، اس لئے کہ بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا۔ افسوس کہ ان جیسا تجربہ کار کلرک اب ہمیں ملنا مشکل ہے۔ ان کی کمی دفتر میں عرصہ تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ مرحوم کی اہلیہ کا کچھ عرصہ پیشتر انتقال ہوچکا تھا۔ ایک لڑکا یو۔ پی گورنمنٹ میں آڈیٹر ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک یہ بات ہے کہ عابدی صاحب مرحوم کے ایک لڑکی بھی ہے جو پیدائشی نابینا ہے۔ اللہ پاک اس پر رحم فرمائے۔ مرحوم عابدی صاحب اپنی اس بیٹی کی وجہ سے ہمیشہ مغموم رہا کرتے تھے۔ عابدی صاحب کی سعادت مندی کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایک عید میں انھیں میں نے سوئیاں پیش کیں تو انھوں نے کہا میں سوئیاں نہیں کھاتا۔ مجھے حیرت ہوئی، میں نے پوچھا، کیوں۔ جواب میں انھوں نے کہا "والد مرحوم کو سوئیاں بہت پسند تھیں، ان کے مرنے کے بعد میں نے سوئیاں کھانا چھوڑ دیا۔ محبت پدری کا یہ جذبہ آجکل کی اولادوں کے لئے ایک سبق ہے، جو زندگی میں بھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ ان کے والدین کو کیا پسند ہے، کیا ناپسند۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین اسی روز یعنی ۱۲ اگست کو ملکہ جہاں کی کربلا میں ہوئی۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ان کے بیٹے، خصوصاً بصارت سے محروم بیٹی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• رفعت اشفاق (بریلی) افسوس میرے والد محترم حاجی محمد اسحاق صاحب، ۱۴ جولائی ۱۹۸۳ء کو حرکت قلب رک جانے سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے متقی پرہیزگار پابند صوم و صلوٰۃ اور بہت کم گو۔ بے ضرورت نہ بولتے تھے، دوسروں کو بھی ایسی ہی تلقین فرماتے تھے۔ اللہ تعالےٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سید محمد سالم حسنی (تکیہ کلاں۔ رائے بریلی) کی تحریر سے علم ہوا کہ موصوف کی والدۂ محترمہ زہرہ بتول صاحبہ (اہلیہ ڈاکٹر سید محمد محسن حسینی صاحب) پرستار حریم ۲۰ جولائی ۱۹۸۳ء کی صبح صادق کے وقت بعد اذان رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ اپنے خاندان کی ایک بزرگ ہستی تھیں ان کا انتقال سارے خاندان کے لئے ایک المیہ ہے۔ مرحومہ بہت ہی ملنسار خلیق اور سخی بی بی تھیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور ان کے بیٹوں سید محمد سالم، سید محمد حبیب، سید محمد فیصل اور صاحبزادیوں، ثریا بیگم و عذرا محمودہ اور نواسی راشدہ معین سلمہ اللہ تعالیٰ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شریک غم

(نسیم انہونوی)

• جب سے خانگی کام کرنے والوں، لونڈیوں اور کھانا پکانے والیوں کا قحط ہوا ہے، ساسوں کا طرز عمل اپنی بہوؤں کے ساتھ بدل گیا ہے اب وہ ان سے بڑی محبت سے پیش آتی ہیں اور کسی بات پر کبھی سرزنش نہیں کرتیں۔

عوامی خدمت کا خاموش سفر
جمہوریت اپنے محور کی جانب

آزادی اور ترقی کا مفہوم

جمہوریت میں اقتدار اعلا کے مالک عوام ہوتے ہیں۔ اس لئے حکومت کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ عوامی کاموں کو مستعدی اور خود کو وقف کر دینے کے جذبہ سے انجام دے۔ شخصی آزادی کا مطلب ہے جائز کام انجام دینے کی مناسب چھوٹ۔ ترقی کا مطلب ہے مقامی زندگی کو قومی اور بین اقوامی زندگی کا جز بنادینا اور اس کی شروعات ہوتی ہے فرد، گھر، گاؤں اور ضلع سے۔ اس سلسلہ میں پیش رفت کے لئے حکومت اترپردیش پرعزم ہے۔

اقتدار اور طاقت کی لامرکزیت

لامرکزیت، جمہوریت کی توسیع کرتی ہے، اسے پھیلاتی ہے۔ سرمایہ اور طاقت جتنے لامرکزی ہوں گے، بدامنی اتنی ہی کم ہوگی۔ سماج کو پتھر جیسا منجمد امن و سکون نہیں چاہیئے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے متحرک امن و سکون کی۔ طول عرصے سے معطل گاؤں سبھاؤں اور بلاک پرمکھوں کے انتخابات اس مرتبہ انتہائی پرامن ماحول میں منعقد ہوئے۔ جن میں چار کروڑ ووٹروں نے اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال کیا۔

محنت ہی پیداواری قوت ہے

آج بھی سرمائے کا سب سے بڑا وسیلہ محنت کش کی محنت ہی ہے۔ آج فرد کی بڑھتی ہوئی قوت خرید ہی خوشحالی کا پیمانہ ہے۔ صرف وسائل پیدا کرنا ہی مقصد نہیں ہے۔ حکومت اترپردیش ان صنعتوں کی سرپرستی اور فروغ و توسیع کو اولیت دیتی ہے جو سرمائے کو لامرکزیت کے ذریعہ عام آدمی تک پہنچاتی ہیں۔ ہر ضلع میں صنعتوں کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ پیداواری وسائل مواضعات کی دسترس میں رہیں۔ مقامی لوگوں کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں۔ مزدور، بے روزگار نہ ہونے پائیں اور لوگ اپنی بنیادی ضرورتیں بآسانی پوری کرسکیں۔

جاری کردہ:۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ ——— اترپردیش

لائیے۔ میں اسے دے دوں۔ کب تک چھپائے رکھیے گا!"

"محبتوں کے دروازے کھولنا چاہتی ہو۔ بہن؟"

"میں کہہ دوں گی کہ۔ میں لائی ہوں رومہ کے لیے!"

"اگر تمہاری بات پر کسی کو یقین آسکے تو لے جاؤ۔ دے دو اسے"

"بے انتہا خوش ہو جائے گی کہ آپ نے اس کا بھی اس قدر خیال رکھا" نینا بےحد خوش تھی۔

"یہ تمام باتیں تم رومہ سے کہہ مت دینا" معتصم نے اٹھ کر الماری سے کنگن نکالے اور نینا کو دے دیے۔ پھر بولے "اب یہ بتاؤ کہ میرے محسوسات نے تم پر کیا اثر کیا ہے۔؟"

"میں تو ہمیشہ ہی آپ کو فرشتہ سمجھتی رہی عصمی بھیا" نینا کی پلکیں بھیگ گئیں "لوگ آپ کو مطعون کریں گے الزام دیں۔ مگر آپ کبھی ہمت نہیں ہاریں گے!"

"تم نہیں سمجھتیں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے جو کچھ کہا ہے۔ نا مناسب ہے؟"

معتصم اپنی مخلص اور نیک دل بہن کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

"نہیں عصمی بھیا نہیں" نینا فوراً بولی "میں تو دل سے یہی چاہتی ہوں رومہ کو بہت اچھا گھر ملے۔ وہ ہمیشہ خوش رہے۔ جتنی تکلیفیں اس نے سہی ہیں وہ سب راحت و آرام سے بدل جائیں۔!" پھر وہ اداس ہو کر بولی "لیکن اسے چھا لڑکا کیسے ملے گا۔ کون تلاش کرے گا اس کے لیے اچھا گھر۔!"

"نعمانی کا سا لڑکا تو اسے یقیناً نہیں مل سکتا!" معتصم نے اسے چور نظروں سے دیکھ کر کہا۔

نینا یک لخت بپھر گئی "کیا۔ آپ نے میری جاسوسی کی ہے"

"معاف کرو بھائی۔ یوں ہی زبان پھسل گئی تھی۔!" معتصم نے گھگھیا کر کہا

"یہاں تو شاید نہیں آئے گی۔؟"

"کیوں؟"

"نکاح کے بغیر کیسے آسکتی ہے؟"

"تو کیا آپ اسے بھگا لائے ہیں" نینا اچھل پڑی۔

معتصم کو ہنسی آگئی۔ کنگن اس سے لے کر پھر لفافے میں رکھ دیے اور لفافہ سوٹ کیس کے چور خانے میں رکھتے ہوئے بولے۔

"ارے بیٹی۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ سب کیا دھرا بھی تمہارا ہے۔ نہ تم اپنی سب کی گروپ تصویر بھجواتیں نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اب دیکھو کہ اس گھر میں کیسے کیسے افسانے جنم لیتے ہیں۔!"

"قسم کھاتی ہوں عصمی بھیا کہ آپ کی آدھی بات بھی میرے سمجھ میں نہیں آئی" نینا اب اچھی طرح گھبرا گئی تھی "میں نے آپ کو تصویر بھجوائی تو کون سا گناہ کیا گناہ۔؟" معتصم نے پھر لیٹ کر بڑے اطمینان سے کہا "تم نے تو بہت بڑے ثواب کا کام کیا۔ اپنے عصمی بھیا کو اپنا ساتھی چننے سے بچا لیا"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔ یہ چیزیں سب میں بانٹ آؤ پھر بتاؤں گا مطلب۔ مگر سنو۔ خبردار۔ ان کنگنوں کا تذکرہ کسی سے مت کرنا۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔ ساری رات جاگا ہوں"

"اچھا تو اپنے کمرے میں جائیے!"

"یہاں کیا مصیبت ہے!" وہ بھی جھنجھلا گئے۔

"اوہو بھیا!" نینا بولی "یہاں میرے ساتھ رومہ بھی تو رہتی ہے۔ آپ جیسے ارے میں دھڑا دیں گے تو وہ بے چاری کہاں جائے گی!"

رومر؟" وہ اٹھتے ہوئے بولے" مولانائے روم کی سی کوئی چیز ہے کیا!"
جیسے کہ آپ جانتے ہی نہیں ہیں" نینا تنک کر بولی" وہ اپنے شیخ صاحب
کی ہے۔ اس کی تصویر کبھی تو تھی گروپ میں؟"
اچھا اچھا" معتصم نے کھنکار کر کہا اور ایک مسکراتی ہوئی نظر نینا پر ڈال
کر سے چلے گئے!۔
نینا اس بھرپور معنی خیز مسکراہٹ کا مطلب سوچنے لگی!۔
دالان میں پھر سب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ علوی صاحب انھیں پکچر ہلانے کا ارادہ
کیے تھے۔ ان کا قصور ثابت نہیں ہوتا تھا!
اپنا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے انھوں نے کہا" میں پوچھتا ہوں۔
کہاں جا رہے ہو؟"
جی۔ کچھ دیر سوؤں گا" معتصم نے کہا" راستے بھر رتا ہوا آیا ہوں نا۔ اس
ذرا سر چکرا رہا ہے"
علوی صاحب غضب ناک انداز میں خاموش ہو گئے۔
وہ منتخت کے ایک گوشے میں بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ آنکھیوں سے
سے دیکھ کر معتصم وہیں جم گئے اور ننھے منصور سے باتیں کرنے لگے۔ اس کا لکڑی
گھوڑا ایک طرف رکھا تھا۔ وہ اس پر چڑھ بیٹھا اور بولا۔
"چل میرے گھوڑے ٹک ٹک۔ ٹک ٹک!" اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ گھوڑے
سے کا زمانہ گیا یار۔ چلو ہمارے ساتھ۔ ہم تمھارے لیے چھوٹی سی سائیکل
لائیں!"
آپ۔ آپ!" وہ ان کی شکل تکنے لگا۔
بیٹے۔ ہم آپ کے چچا جان ہیں" انھوں نے کہا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر

عصمی بھیا۔ مگر۔!" نینا نے بے حد سہم کر کہا" آپ آ تو گئے۔ اس کے لیے
کیا کیجیے گا میں
بس یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا" معتصم نے سنجیدہ ہو کر اعتراف کیا" اتنے
دنوں سے دماغ پکا رہا ہے۔ سچ کہتا ہوں تم سے۔ میں کئی راتوں سے سو نہ
سکا۔ میں نہیں چاہتا نینا کہ ایک شریف، خاموش اور بے زبان لڑکی اس
طرح ضائع ہو جائے۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ذرا ابھی زبان کھولوں گا اور
طرح طرح کے بہتان ہم پر برس پڑیں گے۔ میں یہی نہیں چاہتا کہ لڑکی
یا چچا اسی سے اسے بیاہ دیا جائے۔ اس لیے کوئی شریف پڑھا لکھا لڑکا ڈھونڈ کر
میں خود دوڑ کر سہرا باندھوں گا۔ بڑے بھائی کی طرح اسے اس کے
گھر رخصت کر دوں گا!"
دفعتاً یہ سارے غلط سلط خیالات کافور ہو گئے۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں
اور معتصم اسے بہت بلندیوں پر نظر آنے لگے!
اور اگر" معتصم نے کہا" اس پر زیادتی کی گئی تو مجبوراً مجھی کو
اس کی سپر بننا پڑے گا۔ تھوڑا سا ہنگامہ ہی تو مچے گا۔ لیکن وہ تو بچ جائے گی!
بہت بڑی ہمت آ جائے گی عصمی بھیا!" نینا بولی۔
بہت بڑی!" اس بات پر نینا نے سر ہلا کر معتصم نے کہا" سنکھیا اور
زہر تک نوبت پہنچے گی لیکن خدا کرے کہ ایسا نہ ہو!"
دفعتاً نینا کچھ سوچ کر کھل سی پڑی" اب میں سمجھ گئی!"
کیا سمجھ گئیں!
وہ خوبصورت نگینے جڑے کنگن آپ اسی کے لیے لائے ہیں"
اعتراف کے طور پر وہ مسکرا دیے۔

خط چرا کر پڑھا تھا۔!

"اور تم نے یہ زہریلی باتیں رومہ سے بھی کہہ دی تھیں؟"

"عصمی بھیا۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں چاہتا" نینا نے کہا "میں نے وہ خط چپکے سے جلا دیا تھا۔ امی نے بعد کو ڈھونڈا بھی تھا۔ بھلا میں اتنی دلشکن باتیں رومہ سے کہہ دیتی؟۔ ناممکن!"

"باجی جان کو میں خوب جانتا ہوں" معتصم نے کہا "بڑی بہن ہیں۔ ان کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر انھیں دولھا بھائی کے بڑے عہدے۔ اپنی دولت اور اپنے پانچ بیٹوں پر بہت ناز ہے۔ اب دیکھو وہ تشریف لا رہی ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ میں تو بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں۔!"

"تصویر والی کیا بات تھی۔؟" نینا نے یاد دلایا۔

معتصم مسکرائے "تمھاری بھجوائی ہوئی وہ تصویر ہی مجھے مجبور کرکے یہاں لائی ہے بہن۔ رومہ کو میں کبھی بھول نہیں سکا!"

دم بخود ہو کر نینا نے پوچھا "لیکن۔ یہاں سے گیا ہوا وہ گمنام تار۔؟"

"نعمانی سے میں نے کہا تھا کہ مجھے فوراً تار دے کر بلا بھیجے" معتصم ہنسنے لگے "وہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔ تم سے بھی اچھا۔ تم سے بڑھ کے رازدار میرے یار نے گمنام ٹیلی گرام جھونک دیا۔ میں تو فوری ہی چل پڑا ہوتا۔ لیکن ذرا وہ ویزے وغیرہ کی کارروائی میں دس دن لگ گئے۔!"

"میرے اللہ۔ اتنے گہرے آدمی ہیں آپ لوگ؟" نینا ایک فضول سا جملہ بولی اور حیرت سے اپنے دونوں گال دبا لیے۔

"اب تم یہ ساری یوسف زلیخا امی کو سنا دینا۔ اچھا؟" معتصم نے اسے گھورا۔

چلے گئے۔

اپنے کمرے سے نینا نکلی۔ سوٹ کیس سنبھال رکھا تھا۔ اس نے معتصم کی حسب ہدایت سب میں چیزیں تقسیم کر دیں۔ اور جب سوٹ کیس معتصم کے کمرے میں رکھ واپس لوٹی تب بھی برابر سوچے جا رہی تھی کہ وہ کنگن کس کے لیے تھے!۔

—

اس رات علوی صاحب اپنی خواب گاہ میں آئے تو بہت زیادہ برہم نظر آ رہے تھے!۔ بیوی نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی اور بہت برا سا منہ بنایا۔ مگر پوچھا کچھ بھی نہیں۔ وہ خود کرسی پر بیٹھے۔ سگار سلگایا اور پھٹ پڑے۔

"سن رہی ہو۔ باہر کا شور۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ ان صورت حراموں کی نیند کہاں جا رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔ آخر اس گینڈے کا بچوں میں بچہ بن جانا کیا ضروری ہے۔؟"

بس پھر کیا تھا۔ بیوی نے بھی چھالیہ سروتہ ہاتھ سے رکھ دیا اور دبی آواز میں گرجیں "آپ کو تو شروع سے عادت ہے۔ ہمیشہ اچھے دل برے کرتے ہیں۔ ان بچوں پر تو کبھی محبت کی نظر نہیں ڈالی۔ اب پوتے بھی آنکھوں میں کھٹکنے لگے ہیں۔ دلھن سن لے گی یا رضا ہی کے کان میں بھنک پڑ جائے گی تو یاد رکھیے گا وہ لوگ اس گھر پر اور گھر میں رہنے والوں پر تین حرف بھیج کر اپنا بندوبست الگ کرلیں گے۔ کوئی نہیں برداشت کر سکتا کہ آپ بچوں کو صورت حرام کہیں۔ منہ پر لگام ہی نہیں ہے موئی۔!"

تمھاری بھی یہ عادت ہے کہ زبان کی ڈاک گاڑی چھوڑ دیتی ہو تو پھر

دکتی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ آپ کے امریکہ پلٹ صاحبزادے جو بچوں یا بچہ بنے ہوئے ہیں کیا انھیں کچھ خیال آرہا ہے : سن رہی ہو تم بھی — ۔ نڈنے کو سائیکل دلادی ہے۔ دن بھر گھنٹی کی ٹن ٹن ٹن ۔ زندگی حرام کر کے رکھ ا ہے میں پوچھتا ہوں۔ اب آخر یہ کرے گا کیا ؟ :

کون ؟ معتصم ؟ : بیوی نے پوچھا ۔

اور پھر کون ۔؟ " وہ جھلا گئے ۔

میں کیا جانوں : بیوی نے کہا : نجانے کس دشمن کو رنگ اٹھا تھا کہ اسے ھوٹا تار دے کر بلالیا ۔ اب وہ بے چارہ جانے پر تیار ہے ۔ مگر کرا یہ کہاں ے آئے ؟ آپ اپنے دوستوں کی آئے دن دعوتیں نہ کرتے تو آج کے دن کچھ بچا ہوتا ہ بچوں کے کام آتا ۔ مگر نہیں ۔ ایک ایک وقت میں نگوڑے فقیر دس دس بارہ رہ دسترخوان پر آمرتے ہیں ۔ اور پھر کھانے بھی پچاس طرح کے ہوں ۔ ورنہ شہر ھر میں ناک نہ کٹ جائے گی ۔ دکیں صاحب کی ۔ کوئی خوش ہو کے ہزار بارہ سو ے نہیں دیتا ۔ دو زرد پاٹنے سب آجاتے ہیں :

پرانی باتیں کھود کے مت نکالو : علوی صاحب غصے کے مارے سگار چبانے لگے فی الحال اب کی سوچو ۔ اب کیا کریں ۔ تم ہو بے وقوف ۔ تمھیں کچھ پتہ نہیں ہے س نکمے کام چور نوالے حاضر نے جھوٹا تار دے کر سب کو اُلو بنا لیا ہے ۔ ادھر چلا یا ہے ۔ مشکل پڑھائی سے جان بچا کر ۔ ! "

ہو ہی نہیں سکتا ! : بیوی نے یکلخت فیصلہ کر دیا ۔

میں نے قانون پڑھا ہے ۔ جھک نہیں مار رہا ہوں : علوی صاحب نے تلملا کر کہا : اچھا سنو ۔ میں پوچھتا ہوں ۔ تار پر بھیجنے والے کا نام کیوں نہیں لکھا ہوا ہے ۔ حالانکہ طریقہ یہ ہے کہ نام کا ہونا ضروری ہے ! :

سب کچھ بتا دیا ۔ ! "

درست ہی سمجھ کے بتا دیجیے : نینا نے کہا : اب تو مجھے اور بھی بے چینی لگ جائے گی ۔ ایسی بھی کیا بات ہے ۔ ؟ "

" نینا ۔ ؟ :

" جی ۔ ! "

" تمھیں یاد ہے کہ تم نے چھ مہینے قبل اپنی اور رومہ کی ایک تصویر بھیجی تھی ! ؟

" جی ہاں ۔ ! "

تم نے اپنے خط میں ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ برسبیل تذکرہ یہ بھی لکھا تھا کہ امی کو تمھارے ساتھ ساتھ رومہ کی بھی فکر ہے اور انھوں نے اس سلسلہ میں باجی جان کا مشورہ مانگا تھا ۔ باجی جان نے جواب دیا تھا کہ اگر امی کی مرضی ہو تو رومہ کو وہ اپنے ڈرائیور سے بیاہ دیں ۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے ۔ لیکن تمھاری زبانی یہ بات سن کر رومہ بہت پریشان ہوئی تھی ۔ بہت روئی تھی ۔ یاد آیا نینا ؟ :

جی ہاں : نینا ایک گہری سانس لے کر بولی : یاد ہے ۔ امی تو اس ناموزوں رشتے پر تیار بھی ہو گئی تھیں ۔ مگر ابا جان نے خوب شور مچایا اور لکھ دیا تھا باجی جان کو ۔ آئندہ وہ ان کی منھ بولی بیٹی کے لیے ایسے واہیات رشتے نہ بھیجیں ۔ ! "

" پھر کیا ہوا :

" پھر یہ ہوا کہ باجی جان نے امی کو الگ سے خط لکھا اور اس میں خوب خفا ہوئیں کہ آپ نے نوکر کی بچی کو سر چڑھا لیا ہے ۔ اب کیا اس کے لیے شہزادہ ڈھونڈیے گا ؟ ۔ اسے تو نوکر ، مالی ، ڈرائیور ہی ملے گا ۔ میں نے باجی جان کو

"آپ نے رہی سہی نیند اُڑا دی۔ بتائیے نا اور کیا بات ہے؟" بینا آہستہ آہستہ خود کو سنبھال رہی تھی!

"ابھی بتاتا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ۔ تم میری کتنی اچھی بہن ہو مطلب یہ کہ کس قدر چاہتی ہو مجھے۔!" معتصم نے پوچھا۔

"میں کیا بتاؤں۔ یہ تو آپ کے اندازہ لگانے کی بات ہے"۔

"ٹھیک ہے" معتصم نے چار پانچ لمبے لمبے کشوں میں سگریٹ ختم کیا۔ پھر بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ میرے راز کو تم اپنا راز سمجھو گی اور کبھی میری رسوائی اور بدنامی کا باعث نہیں ہوگی!"

"ایک بات میں بھی پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو۔!"

"سچ سچ آپ نے امریکا میں شادی کرلی ہے۔ مجھ سے کسی بات میں رازداری وعدہ لے رہے ہیں۔ اس دن بھی آپ نے عجیب عجیب سی ادھوری باتیں کر کے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔!"

"توبہ کرو بہن۔ میں نے کسی امریکی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ دم کٹی چھچھوندر۔ چھی چھی چھی۔ وہ سفید سفید بے رنگ لڑکیاں مجھے بھی قطعی پسند نہیں۔!"

"سچ سچ۔!"

"ہاں۔ مجھے خود پر فخر ہے۔ میں جیسا گیا تھا۔ ویسا ہی چلا آیا۔!"

"مگر آپ آئے ہی کیوں" بینا نے پوچھا۔ "آپ تو بڑے ارادے عزائم لے کے گئے تھے۔!"

"کیا بتاؤں۔ مجھے شرم آتی ہے۔ تم اگر بہن نہ ہوتیں۔ دوست ہوتیں تو میں

ہو گا کچھ" وہ بور ہو گئیں "آپ کو حیران ہونے کی ضرورت نہیں سبھی لڑکے امریکا سے ڈگریاں نہیں لا رہے ہیں۔ اللہ رکھے کوئی بڑی سند اس نے لے رکھی ہے۔ کل رضا کہہ رہے تھے کہ ابھی اس کی عمر سرکاری نوکری کی ہے کہیں نہ کہیں ملازمت مل جائے گی!"

"اسے بھی احساس دلاؤ۔ دن بھر تو رضا کے بچوں کے ساتھ ادھم مچاتا رہتا ہے" علوی صاحب نے سگار ایش ٹرے میں ڈالا اور کرسی سے اٹھ کر مسہری پر آلیٹے۔

"آپ کی بھی باتیں" بیوی کو سخت ناگوار گزرا "ارے تین سال بعد بھائی کے بچے دیکھے ہیں۔ پیار آ ہی جاتا ہے۔ آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے اللہ نہ کرے شراب پی رہا ہے۔ جوا کھیل رہا ہے۔ بچے خود اپنے چچا سے اتنے ہل گئے ہیں کہ پل بھر کے لیے اس سے الگ نہیں رہ سکتے"

علوی صاحب نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ذرا غصہ ور تھے اور وکالت کرتے کرتے بحث اور جرح کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان کے نزدیک معتصم کے مستقبل کا مسئلہ نہایت اہم تھا جبکہ بیگم علوی کی نگاہوں میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ ماں تھیں۔ ان کے لیے یہی بہت کافی تھا کہ ان کا بچہ ان کی نظروں کے سامنے تھا!۔ اور بس، روزی روٹی کا معاملہ کیا۔ مرد بچہ تھا۔ پتھر پھوڑ کے روٹی پیدا کر سکتا تھا!۔

پھر علوی صاحب تو سونے کی کوشش کرنے لگے اور وہ باہر کے شور سننے لگیں۔ وہ ننھی منی چہکاریں اور معتصم کے بھاری قہقہے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

معتصم نے اپنے بھتیجوں کو اپنی تحویل میں لے کر ان کے ماں باپ کو قطعی فارغ اور آزاد کر دیا تھا۔ بچے صرف ایک آدھ دن جھجکے تھے۔ مگر ان کا خون تھا۔ پھر تو چچا

کے ہو گئے۔ اور چچا بھی کیسا ساتھ کھیل رہا ہے۔ دوڑ رہا ہے۔ منصور ہلکے پھلکے گیند کو ٹھوکروں سے اڑا رہا ہے اور چچا دوڑ دوڑ کر گیند لا رہا ہے۔ کھیل سے جی اکتا گیا اور انھوں نے انصار کو گود میں لیا۔ منصور کی انگلی تھامی۔ پارک میں پہنچ گئے۔ دکان پر گئے۔ بہت سے کھلونے خرید لائے۔ ایسے چچا کو بھتیجے کیونکر نہ پیار کرتے منصور تو بڑی صفائی سے انھیں چچا جان کہنے لگا تھا۔ وہ نہال ہو جاتے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اسے دل میں چھپا لیں۔ پلکوں پر بٹھا لیں۔ بچے ماں کو بھول گئے سوتے بھی تھے تو معتصم کے پاس!۔

دیوار گیر کلاک نے بلند آواز میں گیارہ بجائے۔!

بہت رات ہو چکی ہے عصمی بھیا۔ سو جائیے اب: سلمیٰ دروازے میں کھڑی تھیں: ان کا کیا ہے۔ آپ ان کے ساتھ رہیں گے تو یہ رات بھر نہیں سوئیں گے!"

او بھابی۔ آپ جائیے آرام کیجیے۔ انھیں نیند آئے گی تو میں سلا دوں گا۔!" معتصم نے کہا۔

آپ جانیے۔ میں تو چلی! سلمیٰ نے کہا اور مڑ کر چل دیں۔ کچھ دیر اور بچے شور مچاتے رہے پھر نینا نے دالان کی لائٹ آف کر دی۔

عصمی بھیا۔ میں انھیں لیے جاتی ہوں۔ آپ بھی جائیے: وہ سمجھا کر بولی اور بچوں کو لے کر چلی گئی۔

اچھا بھائی: وہ بھی انگڑائی لے کر اٹھ گئے۔ صحن کی طرف نظر گئی۔ کیسی بے داغ چاندنی تھی۔ نجانے کون سی تاریخ کا چاند تھا۔ وہ تھکے تھکے سے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ راہداری میں کسی کا سایہ دکھائی دیا۔ اور بیکبارگی ان کا دل دھڑک اٹھا۔

یہ اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہے۔ دبے پاؤں وہ آگے بڑھے اور سایہ

ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ انسان بھی نہیں ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ تھکتی بھی نہیں۔ وہ مشین ہے۔! اچھا یہ بتائیے وہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے کہ نطقی کوری ہے!"

نینا گریجویٹ تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ یا کم از کم اتنی سمجھ نہیں تھی کہ معتصم کی سیدھی سادی باتوں کا کوئی گہرا مطلب نہ نکالتی۔ آج تو اسے اپنا منسوڑ اور کھلنڈرا بے حد سنجیدہ اور بدلا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ اتنا بدلا ہوا کہ اس کے پاس بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرتے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ چپ رہی اور معتصم نے جھجکتی رہی۔

جواب نہیں دیا تم نے۔! معتصم نے اسے چونکا دیا۔

شیخ چچا کی زندگی میں میٹرک پاس کیا تھا اس نے: نینا نے بھرائی ہوئی سی میں جواب دیا: پھر انھوں نے اسے آگے نہیں پڑھایا۔!"

"اور امی نے اسے اپنی خادمہ بنا کے کام پر لگا دیا۔! کیوں:

عصمی بھیا۔ گھر کا کام تو میں بھی کرتی ہوں۔

تم میں اور اس میں بہت بڑا فرق ہے بہن۔!

میں تو نہیں سمجھتی!۔

تمھارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے: معتصم نے کہا: دوسرے تو سمجھتے ہیں "امی اسے بہت چاہتی ہیں۔ ابا جان اسے بیٹی کہتے ہیں!:

صرف کہنے کی باتیں ہیں نینا۔!"

عصمی بھیا۔ میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھی

ابھی اور چکراؤ گی!: معتصم نے کہا! اور سگریٹ سلگا کر بے خیالی میں کش لینے لگے!۔

اس کا منگیتر تھا۔ چھ ماہ قبل منگنی ہوئی تھی اور انتظار تھا کہ نعمانی روزگار سے لگ جائے تو پھر شادی ہو۔

"عصمی بھیا۔ میرا یہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا ہے شاید۔؟" نینا بگڑ گئی "آپ کو جو باتیں کرنی تھیں وہ کیجیے۔ ورنہ میں جاتی ہوں"

"ہاں وہ باتیں" معتصم چونک پڑے "مگر میں سوچتا ہوں کہ تم وہ باتیں سن کے نجانے کیا کہو گی۔ تم لوگ رائی کا ہمالیہ بنانے میں لاثانی ہو"

"کہیے بھی تو"

"وعدہ کرو کہ کچھ اور نہیں سمجھو گی ؟"

"نہیں سمجھوں گی۔!" نینا نے خلوص سے سر ہلایا۔

"نینا۔؟"

"ہوں"

"بھئی۔ میں۔ وہ۔ تمھاری بہن محترمہ سے کچھ زرا زیادہ ہی متاثر ہو گیا ہوں" معتصم نے سر کھجاتے اور ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی۔؟" نینا کی نیند ہوا ہو گئی "کیا آپ رومہ کے بارے میں کہہ رہے ہیں"

"ہاں۔!"

"کیا کہا ہے اس نے؟" سہم کر نینا نے پوچھا۔

"وہ کیا کرتی۔ میرے سائے تک سے بھڑکتی ہے" معتصم نے جواب دیا "مگر اس کے حالات سن کر، اسے تم سب کی خدمت کرتے دیکھ کر بے حد دکھی ہو گیا ہوں۔ امی اس سے خوب محنت لیتی ہیں۔ وہ سارا دن اور رات کو دیر تک بوا جی کے ساتھ باورچی خانے میں سر کھپاتی ہے۔ نینا۔ وہ اگر چاہے تو ہم خواہ مخواہ بیٹی

کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ پھر ایک مربی ہاتھ نے بڑھ کر انگلی پر سے جانماز اٹھا تو معتصم شرمندہ سے ہو گئے۔!

رومہ پلٹی اور اپنے سامنے معتصم کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی جانماز اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

انھوں نے جھک کر جانماز اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

"لیجیے۔!" وہ مسکرا رہے تھے۔

مگر رومہ پر تو جیسے سکتہ طاری تھا۔

"کچھ کھا دوں؟" معتصم نے ہنسی ضبط کر کے پوچھا "آپ کے گھر میں تبلہ کس پر ہے؟"

وہ تب بھی چپ رہی۔

"خدا کے لیے کچھ بولیے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ آپ کوئی وظیفہ پڑھ کر مجھ پر پھونک دیں اور میں کوا بن کر اڑ جاؤں"

"آپ۔!" رومہ کے لب کانپے۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں سونے جا رہا تھا" انھوں نے بڑی عقیدت سے کہا "آپ کو عبادت کا ارادہ کرتے دیکھا تو خیال آیا کہ کوئی دعا اپنے لیے بھی منگوا لوں کیونکہ میری کوئی دعا تو قبول ہوتی نہیں۔!"

"آپ۔ یہاں سے جائیے۔!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

معتصم بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک چاند آسمان پر تھا دوسرا زمین پر۔ سفید کپڑوں میں لپٹی، ہوشربا سراپا۔ دل لوٹ لینے والا چہرہ میٹھی آواز۔

"ذرا میری طرف دیکھیے!" وہ بولے۔

مگر وہ ان کی بات کیا دیکھتی۔ یکبارگی ان کے ہاتھ سے جانماز چھینی اور دوسرے ایک کھلے دروازے میں غائب ہوگئی۔

معتصم ہنسنے لگے!۔

دوسرے لمحہ ادھر نینا آنکلی!۔ اور ہمیشہ کی طرح مشکوک نظروں سے انھیں گھورنے لگی۔

"یعصمی بھیا آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"محترمہ روحہ یہاں عبادت زمانے آئی تھیں۔ ان کی خدمت میں عرض کر رہا تھا براہ کرم ایک اچھی سی دعا میرے لیے بھی مانگ لیں۔ مگر وہ بڑی بد اخلاق نکلیں۔ جانماز پر جھپٹا مارا۔ اور یہ جا وہ جا۔ لاحول ولا قوۃ"

"ارے بھیا۔ آپ خبردار خبردار اسے برا بھلا نہیں کہہ سکتے"

"تو انھوں نے یہاں نماز کیوں نہ پڑھی؟" معتصم نے بولین سے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ کے سامنے پڑھ لیتی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ چاندنی راتوں کی دیوانی ہے۔ چاندنی میں سکون سے پڑھنے آئی ہوگی۔ آپ نے اس کا راستہ کاٹ دیا۔!"

"اچھا۔ سنو۔ یہ کیا یہیں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس کا ہے ہی کون۔ میں نے بہن بنا کر رکھ لیا ہے"

"بھائی بہن کوئی نہیں ہے؟"

"ایک چھوٹا بھائی تھا آپ کو بھی یاد ہوگا۔ احمد! احمد سب کہتے تھے"

"ہاں ہاں۔ یاد آیا مجھے"

"وہ بے چارہ پچھلے سال مر گیا۔ ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اب کیا یہیں کھڑے کھڑے سارا شجرہ پوچھ لیجیے گا!"

"نیند آگئی ہے نینا" معتصم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ساری رات کروٹیں بدلنے سے بہتر تو ہے کہ تم میرے کمرے میں چلو۔ کچھ باتیں کریں"

"چلیے!"

"اگر تم تھوڑی سی چائے بنا لاتیں تو مطلب یہ کہ۔!" کمرے میں پہنچ کر معتصم نے

"ابھی ہم سے چائے وائے تو بن نہ سکے گی" نینا جماہی لے کر بولی "یونہ آپ کے کہنے سے ترس کھا کے باتیں کرنے آگئی ہوں۔ نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے"

"اچھا اچھا بیٹھ جاؤ!"

نینا بیٹھ گئی۔ معتصم نے مونڈھے پر بیٹھ کر کشن گود میں رکھ لیا اور اس پر کہنیاں دھنسا دیں۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"ایک خوشخبری سناؤں؟"

"معلوم ہے مجھے۔ باجی جان کا خط آیا ہے۔ وہ آ رہی ہیں۔!" نینا بولی

"جی نہیں۔ باجی جان کی آمد کو میں خوشخبری نہیں کہہ سکتا!"

"ہائے اللہ۔ چار سال بعد آ رہی ہیں" نینا بولی۔ "چار ہزار سال بعد بھی آئیں تو کیا۔؟"

"تو پھر کون سی خوشخبری ہے؟" نینا حیرت سے بولی۔

"آج میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا ہے" معتصم نے شرارت سے کہا۔ "کہا: وہ کچھ عرصہ کے لیے میرے پاس قیام کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ بی اے میں داخلے کے لیے۔ بھائی جان سے انٹرویو کے سلسلے میں مدد لینی ہے"

"تو پھر۔؟" حیرت سے نینا نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید مسٹر نعمانی کی آمد آپ کسی کے لیے باعث مسرت خوشخبری کا باعث ہو۔ وہ ہنس کر بولے۔ نینا کے گال دہک اٹھے تھا

The Hareem, Lucknow September 1983 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32

THE AREEM

ct. 83

Rs. 1/40

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر آفس۔ ۴۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش۔ ۴۵۳۲۲

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ——— اور خواتین کا

ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۳) فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۸۳ء نمبر (۱۰)

اڈیٹر و نگراں نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم مرحومہ ——— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	ستائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	پچیس روپیہ
معمولی خریداری	"	بائیس روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر چار روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۴۰ پیسے

غیر ممالک سے

انھیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ ر ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

۶۸۶

لمعات

کسی بھانجی نے گمنام خط لکھا ہے۔ میرے یا زمانہ کے ڈر سے نہیں بلکہ شاید اپنے والدین کے ڈر سے۔ بہرحال خط نقل کر رہا ہوں اور جواب بھی دے رہا ہوں، اس لئے کہ ان ہی بھانجی کی طرح کے خیالات رکھنے والی ممکن ہے اور بھانجیاں بھی ہوں۔ کیوں نہ وہ بھی میرا جواب پڑھ لیں۔

جناب ماموں صاحب آداب

میں بھی آپ کا حریم پڑھتی ہوں۔ شوق سے نہ سہی امی کے ڈر ہی سے سہی جو عرصہ سے حریم کی خریدار ہیں، مگر جب سے میں اردو پڑھ لینے لگی ہوں، وہ خود نہیں پڑھتیں۔ فرصت کے اوقات میں مجھ سے پڑھوا کر سنتی ہیں، اور اس طرح مجھے آپ کے خیالات کا علم ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ محسوس کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ عورت کو ایک ایسی جنس کمزور سمجھتے ہیں جو مرد کے سہارے کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ واقعی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس تبدیل شدہ دور میں بھی آپ کے خیالات نہیں بدلے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عورت میں اب کتنی جرأت اور ہمت پیدا ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ اخبار ضرور پڑھتے ہوں گے اور یہ خبر آپ کی بھی نظروں سے گذری ہو گی کہ ایک عورت نے ایک مرد کے گلے سے سونے کی زنجیر کھینچ لی۔ یہ عورت کی جانب سے انتقامی کارروائی ہے۔ آئے دن عورتوں کے گلوں سے زنجیریں مرد کھینچ کر فرار ہو جایا کرتے تھے۔ اب پتہ چلے گا مردوں کو۔

میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اپنے انداز تحریر کو بدلئے۔ ایسے مضامین لکھئے، جن سے عورتوں میں مردانگی پیدا ہو سکے۔ فقط آپ کی ایک بھانجی

بھانجی صاحبہ دعائیں

آپ کا خط پڑھا اور بے ساختہ آخری جملہ پڑھ کر ہنسی آگئی جن سے عورتوں میں مردانگی سے آپ کی مراد غالباً یہی ہو گی کہ ان کی جیسی طاقت پیدا ہو جائے۔ گویا اس کا آپ کو بھی اعتراف ہے کہ مرد، عورت سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اور یہ طاقت اکتسابی نہیں فطری ہے، اس کا بھی آپ اعتراف کر لیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ عورتوں میں کبھی کبھی "تارہ بائی" جیسی پہلوان بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن عام عورتیں ایسی نہیں ہوتیں۔ مانا کہ چند ایسی عورتوں کے نام بھی تاریخ میں آتے ہیں، جنھوں نے میدان جنگ میں اپنی جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن انھیں بھی مستثنیات میں ہی سمجھا جائے گا۔ ورنہ ہر دور میں مردوں کے ساتھ ہی عورتوں کی بھی پلٹنیں ہوتیں، لیکن ایسا نہ ماضی میں تھا نہ حال میں ہے اور نہ شاید مستقبل میں ہو سکے گا۔ حالانکہ کالجوں وغیرہ میں ملیٹری ٹریننگ ہوتی ہے۔ جسے میں تو ہمیشہ ایک بیکار بات سمجھتا رہا۔

بہرحال عورت نے کسی مرد کے گلے سے زنجیر کھینچ لی تو آپ نے سمجھا کہ عورت جنس قوی بن گئی ہے حالانکہ یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اول تو بیزدل مردوں میں شاید کوئی ایک زنجیر پہنتا ہو، اس لئے کہ ایسی جرأت دکھانے کا موقع عورت کو شاذ ہی مل سکے گا —— ہاں جس روز عورت مردوں کا اغوا کرنے لگے گی، اس طرح آج مرد عورتوں کو زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کی آبرو لوٹ لیتے ہیں، تو البتہ میں قائل ہو جاؤں گا کہ واقعی عورت جنس قوی ہو گئی ہے۔ حالانکہ اگر خدانخواستہ اس طرح کا عمل کبھی عورتوں کی جانب سے ہونے لگا تو مرد کبھی واویلا نہ مچائیں گے۔ کوئی شکوہ حکومت سے نہ کریں گے کہ ان کی حفاظت کی جائے، جس طرح آج عورتوں کی جانب سے شکایات کی جاتی ہیں۔ مرد ایسی وارداتوں کی رپورٹ لکھانے تھانے بھی نہ جائیں گے، بلکہ وہ تو دعا مناتے رہیں گے کہ

حسینائیں ان کا اغوا کر کے لے جائیں۔

بھابھی صاحبہ! معلوم ہوتا ہے کالج یا یونی ورسٹی کی تعلیم نے آپ کا دماغ خراب کر دیا ہے، ورنہ آپ اس خبر کا حوالہ نہ دیتیں کہ کسی عورت نے مرد کے گلے سے زنجیر کھینچ لی۔ یہ کون سا ایسا فعل تھا جو قابل فخر ہو کسی عورت کے لئے۔ ویسے تو پھولن دیوی اور اس جیسی اکثر عورتیں ڈاکوؤں کے گروہ میں بھی شامل رہتی ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں یا ریلوں میں لوگوں کو فریب دے کر لوٹ لیا کرتی ہیں۔ اور اکثر اسمگلنگ کے کاروبار کرتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی کام بھی ایسا نہیں جسے فخریہ بیان کیا جائے۔ یہ تو شرمناک باتیں ہیں اور جب میں ایسی خبریں پڑھتا ہوں تو مجھے شرم آنے لگتی ہے۔

عزیز بھابھی! عورت کو خدا نے صنف نازک بنایا ہے اور اس کا صنف نازک ہی رہنا اس کی معراج ہے وہ کبھی مرد نہیں بن سکتی، نہ مرد پر جبراً قابو حاصل کر سکتی ہے، اس لئے کہ وہ خربوزے کی طرح ہے اور مرد چھری ہے، چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، کٹے گا خربوزہ ہی۔ صنف نازک بنا کر قدرت نے عورت میں ایک ایسی کمزوری رکھی ہے، جس سے اسے کبھی مفر نہ ہوگا اور اپنی اس کمزوری سے وہ ہمیشہ ہی مجبور رہے گی۔ اور یقیناً یہ فطرت کی کاریگری ہے کہ اس نے عورت میں ایسی کمزوری رکھی ہے تاکہ وہ اس خیال میں نہ آسکے کہ اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام نے عورت و مرد میں مساوات کا جو اعلان کیا ہے، اس کی وضاحت بھی کی ہے جو اکثر خطبہ نکاح کے بعد نکاح پڑھانے والے مولوی حضرات بیان فرماتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مرد کے کیا فرائض ہیں۔ عورت کے سلسلہ میں اور عورت کے کیا فرائض ہیں مرد کے سلسلہ میں۔

حکومتی اداروں کا حال زار

کون نہیں جانتا کہ شہروں میں کبھی بجلی کی قلت ہے یا پھر ایسی بد انتظامی کہ لوگ بجلی لگوا کر اس کے عادی ہو جانے سے پریشان ہیں۔

اب تو بجلی کٹوا دینے سے نہ لگانے سے اطمینان ہے۔ حالت یہ ہے کہ دیسے تو آتی جاتی رہنا اس کی گویا عادت ہی گئی ہے، لیکن اگر کوئی خرابی ہو جائے تو شکایت لکھنے کے ۵-۶ روز بعد ہی کوئی آئے گا درست کرنے۔ لیکن یہ صورت [illegible]

ہم مارشین کمپنی کے عہد کو بھولے نہیں ہیں جبکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

ڈاک کا انتظام تو ماشاء اللہ ایسا ہے کہ سارا ملک ہی پریشان ہے تفصیل لکھنے کے لئے صفحات درکار ہیں صرف ایک مثال نمونتاً لکھ رہا ہوں کہ میری سالی صاحبہ نے ایک سی۔ ڈی۔ ایف اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ چار ماہ بعد اس کی پاس بک بنکر بہ طلب و تقاضہ ملی تو اس پر نو روپیہ سود لے لیا گیا۔

ٹیلیفون تو عذاب جان بن گیا ہے۔ نرخ بڑھتے جاتے ہیں اور سروس کا یہ عالم کہ شاید مہینے میں دس پانچ روز ٹھیک رہتا ہو۔ آپ کو بمبئی سے ضروری بات کرنا ہے مگر فون خراب۔ شکایت کیجئے تو کوئی پرسان حال نہیں۔ فون جس رفتار سے بڑھ رہے ہیں، سروس اسی رفتار سے گھٹ رہی ہے۔ یہ بھی لوگوں کے لئے ایک دیہاتی مثل "گڑ بھری ہنسیا" بن کر رہ گیا ہے، جو نہ نگلتے بنے نہ اگلتے۔

بنکوں کا بھی ایسا ہی کچھ حال ہے، جب سے قومیائے گئے، پبلک کے لئے مصیبت بن گئے جو کام دس منٹ میں ہوتا تھا ایک گھنٹے میں ہوتا ہے، جو باہری چک ۸-۱۰ روز میں کیش ہو جاتے تھے ایک مہینے میں بھی نہیں ہو پاتے۔

ریل کی پابندی وقت کا تو سب ہی کو علم ہے۔ اور کس طرح فرسٹ کلاس میں بھی بے ٹکٹ اور سکنڈ کلاس کے ٹکٹ رکھنے والے بھر دیئے جاتے ہیں جانتے ہیں۔ بلا رزرویشن سکنڈ کلاس کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح انسان بھرے جاتے ہیں اور اکثر چھت پر بیٹھ کر زندگی کو داؤں پر لگا دیتے ہیں۔

بس سروس بھی جیسی ہے، اس سے کون واقف نہیں۔ بجٹ کروڑوں کا اور بسیں کھٹارا۔

تعلیم کا محکمہ تو قابل تعریف ہے۔ کروڑوں روپیہ دیہاتی مدارس کے نام پر صرف ہوتا ہے۔ لیکن تعلیم نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ بیشتر مدارس فرضی۔ نہ لڑکے آتے ہیں نہ ماسٹر۔ تعلیم بالغاں پر روپیہ گویا برباد کیا جا رہا ہے۔ نہ کوئی پڑھاتا ہے نہ کوئی پڑھتا ہے۔ ہاں اخراجات ضرور ہو جاتے ہیں۔ کیا ہم اسے ترقی کہہ سکتے ہیں اور کیا اخبارات میں ترقیاتی خبریں پڑھنے والے محض دھوکے میں نہیں رہتے۔

یونان میں عریانیت کی تجویز

ایتھنز۔ ۲۲ اگست۔ سیاحوں کو متوجہ کرنے کے نقطۂ نظر سے یونان کی پارلیمنٹ میں عریانیت کو قانونی منظوری دینے کی تجویز کی شدید مخالفت کی گئی ہے۔ اگرچہ یہاں کے چرچ اور مذہبی اداروں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی ہے۔ لیکن یونانی پارلیمنٹ میں اس تجویز کے منظور کر لئے جانے کے پورے پورے امکان ہیں۔

پیش کردہ بل کے مطابق یہاں ہوٹلوں اور سیاحتی مراکز کے نام لائسنس جاری کئے جائیں گے اور لائسنس حاصل کرنے والے ہوٹلوں اور دوسرے مراکز کو ساحل سمندر اور سوئمنگ پولوں میں لوگوں کو عریاں نہانے کی اجازت ہوگی۔

بل کی تجویز میں کہا گیا ہے کہ اقتصادی بحران کے اثرات گریس کی سیاحتی صنعت پر بھی پڑ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے سیاحت سے ہونے والی آمدنی میں ۳۵ فی صدی تخفیف ہوگئی ہے۔

یہ ہے مغربی ممالک کی ایک جھلک جہاں بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لئے عریانی کی اجازت دیکر روپیہ حاصل کیا جائے گا۔

۲۰ منٹ میں ۱۰۸ طلاقیں

ڈلاس (ٹیکساس)۔ ۲۲ اگست:۔ ایک ٹیکساس جج نے اجتماعی طلاق کا اہتمام کیا اور ۲۰ منٹ میں ۵۴ جوڑوں کو قانوناً طلاق دلوائی۔

مذکورہ تمام طلاق شدہ جوڑے مقامی وکیل مسٹر اوریل سوئیٹزر کے موکل ہیں۔ وکیل نے شکایت کی ہے کہ عدالت میں طلاق کی کارروائی بہت طویل ہوتی ہے۔

مسٹر سوئیٹزر طلاق دلانے والی ایک فرم سے منسلک ہیں جو تین وکلاء پر مشتمل ہے۔ فرم ہر سال تین ہزار کیس طلاق کے نپٹاتی ہے۔ مسٹر سوئیٹزر نے کہا کہ ہمارے وکیل صرف قانونی کارروائیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم نے شاید ہی کبھی اپنے موکلین کو دیکھا ہوگا۔

عدالت میں اجتماعی طلاق کی تقریب کے وقت جج نے کہا کہ طلاق حاصل کرنے کے خواہش مند مرد و زن اپنے ہاتھ اٹھائیں اور بیک وقت ۱۰۸ ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ فوراً ہی جج نے ۵۴ جوڑوں کی طلاق کا قانونی طور پر اعلان کر دیا۔

[illegible]

مگر یہ لقائی ہمارے یہاں بھی ہو رہی اور وہ دن دور نہیں جب آزادی نسواں ترقی کر کے یہاں بھی اسی مرحلہ پر پہنچ جائے گی اس لئے کہ مغربی تعلیم نے گھریلو زندگی کو یہاں بھی متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ زن و شو کے تعلقات میں پہلے والی بات رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی طرح کی صورتیں یہاں بھی ہونے لگیں گی۔

نقاب

بہن عفت موہانی کا ناول نقاب حریم کے سالنامہ کی حیثیت سے جنوری سنہ ۸۴ء میں شائع ہوگا۔ امید ہے یہ ناول بیحد پسند کیا جائے گا۔ آج ہی سے حریم کی سالانہ خریدار بنکر اسے جنوری کے پرچے کی حیثیت سے حاصل کرنے کا انتظام کر لیجئے۔ کتابی شکل میں جب یہ کتاب چھپے گی تو اس کی قیمت پندرہ روپیہ ہوگی — اور حریم کے خریداروں کو بلاقیمت ملے گی۔

مجبوری پھر اضافہ

حریمی بہنیں اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان میں گرانی گلڈی کی طرح بڑھ رہی ہے۔ ہر چیز کے دام روزانہ کچھ نہ کچھ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ خصوصیت سے کاغذ بنانے والوں کو حکومت نے چھوٹ دے رکھی ہے کہ جو قیمت چاہیں رکھ کر فروخت کریں، اس لئے نومبر سنہ ۸۳ء سے حریم کی سالانہ قیمت منی آرڈر سے بائیس کے بجائے تیئیس ہوگی اور وی۔پی سے ۲۸ کے بجائے ۲۹۔ جن بہنوں کی سالانہ قیمت اکتوبر کے پرچے تک ہے۔ انھیں نومبر سے نئی شرح کے مطابق ہی سالانہ قیمت دینا ہوگی۔ نوٹ فرما لیں۔

آزادیِ ماحول

شاعر کلہوی

آنکھوں کو میسّر ہے عجب عالم دیدار
ٹھہری سی نظر آتی ہے کچھ وقت کی رفتار

ہر سانس کی آہٹ میں چھلکی ہے کلی سی
جس شے پہ نظر ڈالیے لگتی ہے نئی سی

کہتا ہے نگاہوں سے کہ آ اور مجھے چوم
بکھرا ہوا تا حدِ نظر جلوۂ معصوم

ہو جائے جو فطرت کی اداؤں کا اشارا
کچھ اور مزہ دیتا ہے دریا کا کنارا

پہلے تو سلامی کو نظر کیجیے حاضر
پھر دیکھیے بنتے ہوئے خوش رنگ مناظر

اک بارش انوار ہے موسم کی جبیں سے
گویا کہ گلے ملتے ہیں افلاک زمیں سے

موسم کے اشارے پہ کلیلوں میں ہیں طائر
احساس کے بے نام جھمیلوں میں ہیں طائر

نازک ہیں مگر حوصلہ رکھتے ہیں بلا کا
کتنا یہ سمجھتے ہیں مزاج آب و ہوا کا

دریا میں اٹھاتا ہے کوئی موج تلاطم
ساحل کی چٹانوں پہ خیالوں میں کوئی گم

موسم کے تغیر میں سبھی ان کی نظر میں
رہتے ہیں خبردار قیام اور سفر میں

[illegible]
[illegible]

[illegible] سفروں کا ہے جاری
[illegible]

[illegible] کراچی

تبصرہ

سچا راستہ ۔ دینی تعلیم ۔ حیات طیبہ ۔ باغ جنت اور نار جہنم، پانچ کتابوں کا یہ سٹ اسلام کے سادہ اور مختصر تعارف کے لئے مولانا وحیدالدین خاں ایڈیٹر الرسالہ نے تصنیف فرمائی ہیں۔ ان میں تقریباً ۸۰ مضامین ہیں۔ جنھیں اسلامی مرکز دہلی نے نہایت خوبصورتی اور صحت کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے شائع کیا ہے۔ پانچوں کتب کی قیمت صرف چودہ روپیہ ہے۔ جو ان کی خوبیوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

جناب مولانا وحیدالدین خاں نہ صرف ایک متبحر عالم دین ہیں۔ بلکہ صاحب طرز ادیب و انشاپرداز بھی ہیں۔ موصوف کی تحریر نہایت سلیس اور آسان ہوتی ہے۔ جسے کم پڑھے لکھے بھی پڑھ ہی نہیں سکتے ہیں بلکہ انھیں سمجھ بھی سکتے ہیں۔ مولانا جس مبحث پر بھی لکھتے ہیں اس کی ابتدا اتنی دلچسپ ہوتی ہے کہ پڑھنے والا شروع ہی سے اس کے مطالعہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ اور انجام پر اسے ایک ایسا سبق ملتا ہے کہ وہ اس کے تاثر سے بچ نہیں سکتا۔ ان کتب کے تمام ۸۰ مضامین نہایت مختصر ہیں۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ نہایت جامع ہیں۔ مولانا موصوف نے جس عنوان پر بھی قلم اٹھایا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ طول و طویل مضامین لکھ کر قاری کو اکتانا پسند نہیں فرماتے۔ صرف چند سطروں میں وہ سب کو سب کچھ سمجھا دیتے ہیں جو بہت طویل مضمون میں بتایا جاتا ہے۔ ہر مضمون سیدھے سادھے انداز میں پڑھنے والے کو ایسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے جن کو جانتے ہوئے بھی وہ ایک طرح سے ناواقف ہوتا ہے۔

میں سفارش کروں گا تمام حریمی بہنیں ان پانچوں کتب کا سٹ منگا کر پڑھیں۔ اپنے بچوں کو پڑھائیں۔ اور اپنی ملنے والیوں کو بھی پڑھائیں یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

نادیدہ عاشق رسول صلعم

حضرت اویس قرنی

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، اس کی تعلیم پر جو صدق دل سے ایمان لے آیا اور جس کسی نے اطاعت باری تعالیٰ اور اتباع رسولؐ کو اپنا شعار بنالیا وہی بارگاہ الٰہی میں مقبول و سرفراز ہوا۔ اور نہ صرف دنیا ہی میں ملکوتی صفات کی بدولت بنی نوع انسان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا، بلکہ آخرت میں بھی اس کے لئے نوید جانفزا آئی، اسلام میں ایسے پاک باطن لوگوں کی کمی نہیں جن کی ذات ستودہ صفات پر فرشتے بھی سلام بھیجتے ہیں۔ اور یہ نفوس قدسیہ سرکار دو عالمؐ کی محبت میں مٹ گئے لیکن ان کی زندگی کا ظاہر و باطن اسلام کے نور سے منور رہا۔

سرگروہ عاشقانِ رسولؐ حضرت خواجہ اویس قرنیؓ بن عامر اسلام کے اولین دور میں ایک ایسے ہی باعظمت بزرگ گذرے ہیں، آپ آنحضرتؐ کے سچے شیدائی اور شمع رسالتؐ کے نادیدہ پروانے تھے۔ آپ نے ظاہری آنکھوں سے حسن جہاں آرا اور جمال عالمتاب کا نظارہ کیا اور نہ ہی زیارت رسولؐ سے مشرف ہو سکے۔ آپؓ تابعین کے سرتاج ہیں لیکن بہ باطن آنحضور کی ذات گرامی کے فدائی تھے۔

آپ نواح قرن کے رہنے والے تھے، اسلام کا شہرہ سن کر ابتدا ہی میں ایمان لے آئے تھے، سرورِ کائنات سے شرف ملاقات سے محروم رہنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ نابینا اور ضعیفہ تھیں ان کی خدمت کے لئے شب و روز ان کے پاس رہتے تھے، رات کو تو کسی حالت میں بھی ان سے علٰحدہ نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ خاندان میں اور کوئی نہ تھا جو ان کی عدم موجودگی میں والدہ کی نگہداشت کر سکتا۔

آپ ان برگزیدہ اور وارفتگان محبت میں سے تھے جن کی تخلیق ہی عشق و محبت کے خمیر سے ہوئی تھی جیسا کہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جاں نثاران حقیقی کے لئے قرب و بُعد کا سوال ہی پیدا [illegible] سرور نہیں ہوتا، کوئی [illegible] [illegible]

چنانچہ حضرت اویس قرنی بُعدِ مسافت کے باوجود آفتاب رسالتؐ کی [illegible] سے مستفیض تھے۔ آنحضورؐ نے فاروق اعظمؓ اور علی کرم اللہ وجہہ کو اس وارفتہ محبت کے نشانات سے آگاہ فرمادیا تھا کہ اویس کے بائیں ہاتھ میں اور [illegible] کا نشان ہے، اگر تم اس تک پہنچ سکو تو میرا اسلام علیک کہنا اور اس سے امت کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا۔

آپ کو رسول اللہ سے والہانہ محبت تھی، جب کارزار احد میں حضورؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے، رفتہ رفتہ یہ خبر اس عاشق رسولؐ تک بھی پہونچی تو اس دیوانہ محبت نے پتھر مار مار کر اپنے تمام دانت توڑ لئے اور ہر دانت توڑتے وقت خیال کرتے کہ شاید سید العالمین کا یہی دانت شہید ہوا ہے۔

رزق حلال کی فراہمی کے لئے شتربانی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ بسا اوقات محبت کی بے قراری میں صحرا کی طرف نکل جاتے، آپ کے استغراق محبت کا یہ عالم تھا کہ اکثر پرندے سر مبارک کو شاخ شجر سمجھ کر سر پر آ بیٹھتے لیکن آپ کو اس کا قطعاً احساس نہ ہوتا۔ آپ عمر بھر ایک لمحہ کے لئے ذکر محبوب سے غافل نہ رہے۔ ایک مرتبہ معمول کے مطابق اپنا نچلا دھڑ ریت میں چھپائے جنگل میں بیٹھے تھے کہ اپنے عہد خلافت میں فاروق اعظمؓ حضرت علیؓ کی معیت میں آپ کو تلاش کرتے قرن پہنچے، لوگوں سے پوچھنے پر جب تصدیق ہو گئی کہ یہی اویس ہیں تو رسول اکرم کا سلام اور ردائے مبارک پیش کی نیز دعا کے لئے بھی معروض ہوئے، جب رسول اللہ کی رحلت کی خبر ملی تو یہ روح فرسا خبر سن کر آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو قبلہ رو ہو کر سجدہ ریز ہو گئے، جب دیر تک سر نہ اٹھایا تو حضرت علی مرتضیٰؓ کو گمان گزرا کہ کہیں وصال ہی نہ ہو گیا ہو، آپ نے آواز دی، پھر جھنجھوڑا تو سر اٹھایا اور فرمایا۔

"امت محمدیہ کے لئے دعائے مغفرت کر رہا تھا۔ کاش! آپ ذرا صبر سے کام لیتے تو تمام امت کو اللہ تعالیٰ سے بخشوا کر ہی سر اٹھاتا۔"

آپ کی عظمت اور آداب محبت کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کے [illegible] نے نقل کیا ہے کہ جب آپ زیارت کے لئے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور [illegible] کے بعد جبرئیل پر پہنچے تو کسی نے کہا "سامنے رسول اللہ کا روضۂ مبارک ہے" تو آپ [illegible]

[illegible]

اور بعد مغرب واپس آتے، گھر پہنچ کر والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان کو ضروریات زندگی مہیا کرتے۔ محلہ کے بچے آپ کی خستہ حالی دیکھ کر آپ کے پیچھے بھاگتے۔ تالیاں بجاتے اور پتھر مارتے، لیکن آپ فرماتے چھوٹے چھوٹے کنکر مارو، بڑے پتھروں کی ضرب سے خون بہے گا طہارت نہیں رہے گی تو مجھے نماز ادا کرنے میں تکلیف ہوگی۔"

آپ سادہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے، روکھا سوکھا کھاتے موٹا جھوٹا پہنتے، کھجوروں کی گٹھلیاں جمع ہو جاتیں تو فروخت کر کے ضروریات زندگی خرید لاتے اور کھجوریں مل جاتیں تو راہ حق میں صدقہ کر دیتے۔ نماز کی محویت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے، رات رات بھر نوافل ادا کرتے۔ اکثر فرماتے "نماز میں اس قدر رجوع اور خشوع و خضوع ہونا چاہیئے کہ اگر تلوار کا زخم بھی آجائے تو نمازی کو خبر نہ ہو" ایک مرتبہ حضرت ربیعؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا آپ صبح کی نماز ادا کر رہے ہیں، آپ انتظار میں رہے کہ فارغ ہوں تو گفتگو ہو۔ لیکن آپ نوافل میں کھڑے رہے یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا۔ اسی طرح عشاء اور پھر رات اسی عالم میں گذر گئی۔ دوسری صبح بتقاضائے بشریت ذرا سی غنودگی ہو گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی بیدار ہو گئے اور بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے "اے مالک میں سونے والی آنکھ، زیادہ کھانے والے پیٹ سے پناہ مانگتا ہوں" حضرت ربیعؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کو اسی حال میں چھوڑ کر چلا آیا۔

آپ کو کارساز مطلق کی طرف سے طویل عمر عطا ہوئی آپ ممدوح دو جہاںؐ کے عہد مسعود میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اور تمام خلفائے راشدین کے زمانۂ خلافت تک بقید حیات رہے۔ نہج البلاغہ میں ہے کہ خواجہ اویس قرنی جنگ صفین میں شریک ہوئے اور ۳۷ھ میں جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت فاروق اعظمؓ جب ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو نصیحت کے لئے معروض ہوئے، عاشق رسولؐ نے جواب دیا: "اگر خدا کو پہچانتے ہو تو غیر اللہ کو بھول جاؤ اگر خدا انہیں جان لے تو بہتر ہے کوئی دوسرا نہ جانے۔"

امیر المومنینؓ نے کچھ اشرفیاں نذر کیں تو فرمایا: "میں نے شتربانی سے چند درہم کمائے ہیں اگر مجھے یقین دلا سکو کہ ان کے خرچ ہونے تک میں زندہ رہوں گا تو تمہاری نذر قبول کر لیتا ہوں۔"

آپ فرماتے ہیں۔

چھوٹا نہ سمجھو۔ ۸۔ لوگوں کو نیکی کی ترغیب دو۔ ۵ اللہ کو ہر حال میں یاد رکھو۔ ۶۔ قناعت و توکل اختیار کرو۔ ۷، لوگوں کے ساتھ نرمی اور خوش خلقی سے پیش آؤ۔

فین

خواجہ احمد عباس

اگر غلطی سے کبھی کسی کو میری کوئی کتاب، کوئی کہانی، کوئی فلم پسند آجائے تو میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

اس لئے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں، جب میرے دوست راج نے کہا کہ آج رات کو جو مہمان آنے والے ہیں ان میں تمہاری ایک چھوٹی سی فین بھی ہے تو بڑی مسرت ہوئی۔

وہ سچ مچ چھوٹی سی لڑکی نکلی۔ سفید انگولی فراک پہنے بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ میں اس سے تپاک سے ملا اور حیرت ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے دھرتی کے لال تک سب پرانی فلمیں دیکھ لی تھیں اور مسافر کی ڈائری تک پرانی کتابیں اس کی نظر سے گزری ہوئی تھیں۔

"بات یہ ہے عباس صاحب! مجھے آپ کی کتاب پڑھ کر یا آپ کی کوئی فلم دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میرے دل کی بات چرا کر آپ نے نہایت خوبصورتی سے بیان کردی ہو" بڑی بڑی آنکھیں [illegible] کر اس نے کہا۔

میری چھاتی چوڑی ہو گئی، سر فٹ بال بن گیا اور مجھے ایسا لگا کہ میں نے شراب کے کئی جام پئے ہیں۔

مگر میں نے پوچھا "تعجب ہوتا ہے کہ اتنی سی عمر میں تم نے یہ سب کتابیں پڑھ لیں اور پرانی فلمیں بھی دیکھ لیں۔ میری کتابیں نہ ری پرنٹ ہوتی ہیں نہ میری فلموں کا ری ایشو ہوتا ہے!"

"ہمارے شہر کی فلم سوسائٹی جو ہے، اس کی میں ممبر ہوں۔ آپ کی پرانی فلمیں وہیں دیکھیں۔ رہی آپ کی کتابیں تو ہماری لائبریری میں سب ہیں اور ہماری لائبریرین بڑی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ انہی نے آپ کا مجھ سے تعارف کرایا تھا!"

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میں نے سوچا میں خواہ مخواہ دل برداشتہ ہوتا ہوں۔ جب تک بلقیس جیسی لڑکیاں ہمارے ملک میں موجود ہیں جو میری کتابوں اور فلموں کو پسند کرتی ہیں اور ان کے بارے میں جوش اور خوشی کا اظہار کرتی ہیں، میرا لکھنا اور فلم بنانا بے کار نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لکھنؤ میں بھی میری فینز موجود ہیں۔

"بس ایک کتاب آپ کی پڑھنی رہ گئی ہے۔"

"کونسی؟"

"آپ کی خودنوشت سوانح عمری 'آئی ایم ناٹ این آئی لینڈ' مگر اسے لائبریری سے لے کر نہیں، خود خرید کر پڑھوں گی۔"

"اس کی قیمت معلوم ہے تمہیں؟"

"جو بھی ہو، دس بیس روپے بھی ہوئی تو میں اپنی چار پانچ مہینے کی پاکٹ منی سے خرید سکتی ہوں۔"

"اس کی قیمت پینتالیس روپے ہے۔"

"بڑی کتاب کی قیمت تو بڑی ہی ہوتی ہے۔ اپنی پاکٹ منی میں سے میں پانچ روپئے ماہوار آپ کو بھیج سکتی ہوں۔ اگر آپ ایک کاپی مجھے دلوا دیں۔"

میں نے کہا "نہیں، میں آپ کو یہ کتاب تحفے کے طور پر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میری کمزوری ہے۔ اس کتاب کی شاید پچاس، یا ساٹھ جلدیں تو میں اپنے دوستوں کو نذر کر چکا ہوں۔"

سو میں نے بلقیس کو بھی یہ کتاب ہدیۂ محبت کے طور پر آٹوگراف کر کے دیدی۔

اگلے دن میں لکھنؤ سے بذریعہ ٹرین دہلی آ رہا تھا۔ رات کو دس بجے کے قریب ٹرین چلتی ہے۔ چند منٹ پہلے ایک دبلی سی کالی سی چیچک رو خاتون تشریف لائیں اور انھوں نے مجھے 'آئی ایم ناٹ این آئی لینڈ' کی ایک جلد دی۔ آٹوگراف کے لئے میں نے اس کا پہلا ورق [illegible] ہوا پایا۔ "میرا نام سرتی سانیال ہے، میں لائبریرین ہوں،" انھوں نے کہا۔

میں نے پوچھا "آپ نے یہ کتاب کہاں سے خریدی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "میری ایک اسٹوڈنٹ ہے بلقیس، اس نے آج یہ کتاب کہیں سے حاصل کر کے مجھے لا کر دی ہے۔ بڑے دنوں سے میں تلاش میں تھی۔"

"اس کے کتنے روپے دیے آپ نے؟"

"بے چاری نے اصل قیمت سے کم ہی میں مجھے دے دی۔ پچیس روپے میں ملی!"

"کہیں سے حاصل کر کے — بے چاری نے!"

میرا سر گھوم رہا تھا!! اس میں سے [illegible] ہوا نکل رہی تھی، اپنے نارمل سائز کو واپس آ رہا تھا۔ میں نے آٹوگراف کر کے کتاب مس سانیال کو لوٹا دی ———

آپ کو معلوم ہے یہ کتاب میں نے کل رات طفیل کو تحفے میں دی تھی؟"

"جی ہاں! وہ بہت شریر ہے۔ کوئی بھی شرط کر لیتی ہے تو اسے پورا کر کے ہی رہتی ہے۔"

"کیا شرط کی تھی اس نے؟"

"وہ آپ سے کتاب منت سے لے کر یہ آئے گی اور لائبریری کو پچیس پیسے میں دے دے گی۔"

"کس سے شرط کی تھی؟"

"مجھ سے۔"

"مگر اسے تو بڑی واقفیت ہے میری کتابوں اور میری فلموں سے۔"

"جی ہاں، وہ میں نے ہی اسے بتایا تھا۔ اس کے علاوہ جو کتاب بھی لائبریری میں آتی ہے، اس کے گرد پوش کے اندر جو کچھ لکھا ہوتا ہے، وہ زبانی یاد رکھتی ہے۔"

میری انکوائری کا چیپٹر مکمل ہو گیا۔

گارڈ نے سیٹی دی، ہری جھنڈی دکھائی اور ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

ایک سوال اور رہ گیا تھا، میں نے چلتی ٹرین سے وہ بھی کر دیا۔

"آپ خود کیوں نہ آئیں کتاب لینے؟"

"عباس صاحب، سچ کہیے گا! میں اگر آتی تو آپ مجھے پہچان لیتے؟ پچیس کی کتاب مفت دے سکتے تھے؟"

حریمی دسترخوان

لذیذ کریلے

کریلے مختلف طریقوں سے پکائے جاتے ہیں۔ ایک بار اس ترکیب سے بھی پکا کر نوش فرمائیں۔

سامان۔ ادھا سیر کریلے۔ (نہ بہت چھوٹے نہ بہت بڑے) تین پاؤ پیاز۔ ایک پاؤ جمایا ہوا دہی۔ کلونجی۔ سونف چار کا ایک ایک چمچہ بھر کر۔ زیرہ چار کا آدھا چمچہ۔ لہسن دس جوے۔ ادرک تقریباً دو تولے ہلدی دھنیا خشک اور سرخ مرچ و نمک حسب خواہش و ضرورت۔ گڑ دو تولے۔ تیل یا ڈالڈا پاؤ بھر۔

ترکیب۔ پیاز چھیل کر اس کے لچھے کاٹ لیں۔ لہسن، ادرک ہلدی۔ دھنیا، مرچ اور ادرک پیس کر رکھ لیں۔ پیاز کے ایک تہائی لچھوں کو گل ڈالڈا یا تیل میں گلابی کرنے کے بعد پسے ہوئے مسالے ڈال کر بھونیں۔

کریلوں کو دھو کر کسی چھری سے کھرچ لیں اور لمبائی میں ایک طرف سے چاک کر کے بیج نکال کر پسا ہوا نمک مل کر انھیں کچھ دیر تک رکھ دیں ـــــ بعد ازاں انھیں دبا دبا کر ان کا پانی نکال دیں۔ اس عمل سے کریلوں کا کڑوا پانی نکل جاتا ہے اس کے بعد کریلوں کو ابال لیں۔ بھنے ہوئے مسالے میں کلونجی، سونف اور زیرہ مسالہ ڈال کر باقی پیاز بھی ڈال کر ہلکی آنچ پر رکھیں۔ جب پیاز قدرے گل جائے تو اتار کر کریلوں کے پیٹ میں بھر دیں۔ کریلوں کو باریک سلائی والے تاگے سے زرا لپیٹ دیں۔

جتنا مسالہ بچا ہوا اسے کسی پتیلی میں بچھا کر گڑ تھوڑے پانی میں گھول کر چھان کر ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر اتنی دیر تک پکائیں کہ گل جائیں۔ نمک پہلے کم ہی ڈالیں۔ چکھ کر دیکھیں کم ہو تو اور چھڑک دیں۔

(انجم السحر منصور، باندرہ)

انگور کی پڈنگ

انگور کی پڈنگ نہ صرف لذیذ بلکہ مفید بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انگور بہترین مقوی پھل ہے۔ بنانے کی ترکیب بھی آسان ہے ونیلا اسنس عمدہ دو قطرے۔

سامان۔ بڑے والے شیریں انگور ۲۵۰ گرام۔ دودھ ۵۰۰ گرام چینی ۵۰ گرام۔ انڈے چار۔ الائچی چھوٹی یعنی سبز ۵ عدد

ترکیب۔ انگوروں کو دھو کر چھلکے اور بیج نکال کر مسل ڈالیں، لیکن بالکل باریک نہ کریں۔ شکر میں انھیں ملا کر بغیر پانی ڈالے پکائیں جب وہ قوام کی شکل اختیار کر لیں تو اتار لیں۔

انڈوں کی زردی اور سفیدی کو علیحدہ علیحدہ کر کے خوب پھینٹیں۔

دودھ کو پہلے ہی اچھی طرح پکا لیں کہ کچھ گاڑھا ہو جائے۔ دودھ کو ٹھنڈا کر لیں اور سفیدی ملا کر حل کریں پھر زردی ڈال کر خوب پھینٹیں۔ انڈوں کے اس محلول میں انگور ڈال کر ونیلا اسنس بھی شامل کر دیں۔ پھر کسی بھگونے میں پانی کھولائیں اور سارے مرکب کو کسی المونیم کے سانچے یا ناشتے دان کے کسی کھلے ڈبے میں رکھ کر کھولتے میں رکھ کر پکائیں۔ کچھ دیر بعد محلول میں سے سنک نکالیں۔ اگر محلول سینک

ایک تعمیری کہانی

رضیہ فصیح احمد

وہ رنگارنگ پہاڑوں، حسین وادیوں اور نظر نواز میدانوں کے درمیان ایک چھوٹا سا پیارا مکان تھا جس کا نام کسی نے بہت سوچ سمجھ کے "پرستان" رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بلند ٹیلوں پر چیڑ کے سرو قد اور صنوبر کے بانہیں پھیلائے مہمان نواز، سدا بہار درخت کھڑے تھے۔ ایک پہاڑی نالہ ٹیلے کو کاٹتا نیچے آتا تھا جو دور سے آبشار کی طرح خوبصورت دکھائی دیتا اور بنگلے کے اطراف میں بہتا نیچے تک چلا گیا تھا۔ دو طرف بڑے بڑے میدان تھے جہاں مکئی، کپاس اور گنے وغیرہ کی کاشت ہوتی تھی۔ ایک طرف میدان کے پار بے شمار ندی نالے ایک دوسرے کو کاٹتے بہتے چلے گئے تھے۔ پہاڑ پر، وادیوں میں اور میدانوں میں ان گنت پھلوں کے درخت تھے اور جگہ جگہ سبزی کے کھیت پھیلے ہوئے تھے

اس مکان میں پانچ کمرے تھے اور یہاں مقامی اسکول میں پڑھانے والی استانیاں رہتی تھیں جو مختلف جگہوں سے آئی ہوئی تھیں۔ ان کی ایک مشترکہ بزرگ استانی نے، جس کی قدر ان کے دل میں بہت تھی، ان سب کو یہاں بلایا تھا۔ اس نے انھیں لکھا تھا:۔

"یہ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں مگر ان کی صلاحیتوں کو جلا دینے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بات کی اہمیت جان کر تم ضرور یہاں پہنچو گی۔ پیسے بھی معقول ملیں گے۔ اور ہر طرح کا آرام بھی، لیکن تمہیں معاوضے سے بلند ہو کر کام کرنا ہوگا۔ کام، کام اور زیادہ کام، یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔" جب ان استانیوں نے یہاں کام کرنا شروع کیا اور یہ گھر انھیں دیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ان کے دل میں بڑی امنگیں تھیں! وہ سارے گھر پر پینٹ روغن کروائیں گی اور پھر سارے کمروں کو اپنے اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق سجائیں گی ۔۔۔۔ رنگ و روغن کے لئے وقت درکار تھا اور وہ اس قدر پرجوش تھیں کہ پہلے ہی اپنی اپنی چیزیں نکال لائیں اور رکھنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے کھانا پکانے کے برتن اور ضروری چیزیں نکالی گئیں۔ اس کے بعد سب نے مل کر کمروں میں پردے لٹکائے۔ جس کے پاس کڑھے ہوئے کشنوں کے ڈھیر تھے، اس نے وہ نکال کر دے دیے، کسی کے پاس لکڑی کے ہلکے منقش صوفے تھے، وہ اس نے جما دیئے۔ کسی نے چینی ظروف نکالے، کسی نے قالین، اور کسی نے اونٹ کی کھال کے بنے ہوئے لیمپ اور گلدان۔ سب نے اپنے کپڑے اس خیال سے الماریوں میں لٹکا دیئے کہ ان میں کوئی تخصیص نہ ہوگی، جو لباس جس کو پسند آئے گا، اور جس کے بدن پر فٹ آئے گا، وہ پہن لے گی ۔۔۔۔ غرضیکہ چھر کھٹوں سے لے کر چوڑیوں تک سب چیزیں جگہ پر رکھ دی گئیں اور سب نے مل جل کر رہنا شروع کر دیا۔

صبح اٹھتے ہی ایک دوسرے کو سلام کرتیں، تیار ہوتیں، پھر ناشتے کے لئے پہنچتیں۔ سب مل کر منٹوں میں ناشتہ تیار کر لیتیں، ساتھ بیٹھ کر کھاتیں اور پھر اسکول کا رخ کرتیں۔ اسکول میں بھی سب کا ساتھ رہتا۔ آدھی چھٹی میں ساتھ چائے پیتیں اور شام کو اکٹھی واپس آ کر کچھ دیر آرام کرتیں یا اپنے ساتھ لائی ہوئی کاپیاں دیکھتیں۔ شام کی چائے کے بعد سیر سپاٹے کے لئے چلی جاتیں یا اپنے گھروں کو خط لکھتیں اور انھیں بتاتیں کہ وہ یہاں کتنے سکھ چین سے ہیں۔ رات کا کھانا بھی سب مل کر پکاتیں، ساتھ کھاتیں اور کچھ دیر ریڈیو سننے یا خوش گپیاں کرنے کے بعد سو جاتیں ۔۔۔۔

اس خوشی اور آرام میں رفتہ رفتہ وہ یہ بات بھول گئیں کہ انھیں اس گھر کو رنگ و روغن کروانا ہے ۔۔۔۔ کسی کو خیال کبھی آتا تو وہ دل میں سوچتی کہ یہ تو سب کے کرنے کا کام ہے، مجھ اکیلی سے کیا ہوگا۔ اگر کبھی کوئی بآواز بلند بھی اس خیال کا اظہار کرتی تو دوسری ٹال جاتی کہ کون اس جھنجھٹ میں پڑے، دیکھا جائے گا، گزارہ تو ہو ہی رہا ہے۔

رفتہ رفتہ چھت کا چونا جھڑنے لگا، سیلا سیلا چونا کبھی بستر پر کبھی کپڑوں پر، کبھی صوفوں اور کرسیوں پر گرنے لگا، پھر دیواروں سے مٹی جھڑنے لگی۔ بجائے اس کے کہ وہ چھت یا دیواروں کا بندوبست کرتیں، انھوں نے اپنی اپنی چیزیں سمیٹ سینت کر رکھنا شروع کر دیں۔ اپنے اپنے پردے ہٹا لیے۔ اپنے اپنے برتن بکس میں بند کر کے رکھ دیئے۔ سجاوٹ کی چیزیں اٹھا لیں اور کپڑے الگ الگ کر لئے تاکہ خراب ہوں تو دوسروں کے، ان کے تو محفوظ ہو جائیں۔

اور پھر یوں ہونے لگا کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بہانے دیر تک اسکول میں رہنے کی کوشش کرتی تاکہ دوسری استانیاں جا کر کھانا پکا لیں تب وہ پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ چار پانچ بجے جب تھکی ہاری گھر پہنچتیں تو دیکھتیں کہ کچھ بھی پکا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہمت کر کے کوئی پکاتی بھی تو

دوسروں کو کھلانا بھی گراں گزرتا۔ رفتہ رفتہ اس گھر میں پانچ چولہے، پانچ ہانڈیاں، پانچ طباق اور پانچ توے آگئے۔ کسی نے رائے دی کہ ایک ملازمہ رکھ لو سب برابر پیسے دے دیا کریں، مگر کوئی بھی آمادہ نہ ہوئی۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہ تھا۔ دوسری لڑکیاں یقیناً زیادہ کام کرائیں گی اور پیسے سب کو برابر دینے پڑیں گے، یہ تو سراسر بے انصافی ہوگی۔

اس بے بنیاد ناانصافی کے ڈر سے انھوں نے اپنا پکانا، ریندھنا، کپڑے دھونا، سینا پرونا، رہنا سہنا الگ الگ کرلیا۔ اب انھیں ایک دوسرے پر شک گزرنے لگا کہ کوئی ان کا آٹا چراتا ہے، کوئی ان کا صابن استعمال کرتا ہے، کوئی رات کو انھیں ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کی یوں بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ اسکول سے آکر کمرے کی صفائی، کھانا پکانے اور پانی بھرنے میں سارا وقت صرف ہوجاتا تھا، اس لئے خلیج بڑھتی گئی۔ اب سب اپنے اپنے کمروں کا کوڑا نکال کر آگے ڈھیر کردیتیں کہ ہم کیوں آس پاس کی صفائی کریں! چنانچہ بہت جلد گھر کے چاروں طرف کوڑے کے انبار لگ گئے۔ بیماریوں نے تانتا باندھ لیا۔ کبھی کسی کو ملیریا ہے تو کبھی ٹائیفائڈ، کبھی معدے میں تو کبھی پیچش۔ فارغ وقت میں ساتھ بیٹھنے کے بجائے سب الگ کرنے کے بہانے ڈھونڈتیں۔ کوئی چادر کے سامنے میں ہے، کوئی جیز کے نیچے۔ کسی نے آلو بخارے کی چھاؤں بند کی ہے تو کوئی خوبانی کے درخت تلے براجمان ہے۔ الگ الگ ٹرانسسٹروں سے جدا جدا اسٹیشن سنتیں اور ایسی کھچڑی پکتی کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ اکثر چھٹی کا دن لڑتے گزرتا اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی خونخوار ہوجاتی۔ سب ایک دوسرے کے کپڑے نوچ ڈالتیں، بال اکھیڑنے کی کوشش کرتیں۔ دنیا تماشہ دیکھتی ——

ایسے گھروں میں پردہ رکھنا ناممکن ہے۔ گزرنے والے گلیوں سے بھی آپ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں کھڑے ہوکر ان کے لڑنے کا تماشہ دیکھتے اور جب بھی موقع ملتا، انھیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے۔ جھوٹے الزام لگاتے، بہتان باندھتے کہ فلاں تمہارے خلاف یہ کہہ رہی تھی، وہ تم پر چوری کا الزام لگا رہی تھی۔ بس پھر کیا تھا، دوسرے دن سے کوئی نیا معرکہ شروع ہوجاتا۔ نہ لڑتیں تو دلوں میں غبار لئے پھرتیں اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہ ہوتیں۔

صحن پاس تو ویسے بھی تھیں، درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے، بادلوں کی جھڑی لگی تھی، چھت ٹپکنے لگی تھی، گھر کی دیواریں تشویشناک حد تک کمزور ہوگئی تھیں، مگر کسی کو فکر نہ تھی۔ فکر تھی تو یہ کہ میرے بکس پر پانی نہ ٹپکے، میری الماری محفوظ رہ جائے، میرا چولہا خراب نہ ہو اور باہر کا زیادہ سے زیادہ حصہ میرے قبضے میں آجائے —— تاکہ برف کے دنوں میں دھوپ نکلے تو میں اس سے فائدہ اٹھا سکوں۔

ایک رات سخت طوفان بادوباراں آیا اور ساتھ ہی زلزلہ بھی۔ تب وہ سب کی سب بھاگ کر ہال میں اکٹھی ہوئیں اور مل جل کر کام کیا۔ ایک نے سارے گھر کی کھڑکیاں بند کیں، دوسری باہر پڑے ہوئے کپڑے سمیٹ کر لائی، تیسری نے اندر آتے ہوئے پانی سے بچانے کے لئے دریاں اور قالین سمیٹے۔ چوتھی نے بجلی جانے کی وجہ سے لالٹین اور لیمپ روشن کئے۔ سب نے ایک کمرے کی چھت کے نیچے رات گزاری، اور مل کر دعائیں مانگیں، مگر اس رات ان کے گھر کا ڈرائنگ روم گر گیا اور سب کی کوئی نہ کوئی چیز دب کر رہ گئی —— اس وقت انھیں احساس ہوا کہ وہ پہلے سے اس کی دیکھ ریکھ کرتیں اور یوں اسے نظر انداز نہ کرتیں تو یہ نقصان نہ ہوتا۔ بڑے صدق دل سے انھوں نے سوچا کہ منہدم کمرے کو جلد از جلد دوبارہ بنوائیں گی اور نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کریں گی، مگر جلد ہی انھیں اندازہ ہوگیا کہ موجودہ حالات میں یہ ناممکن ہے۔ پیسے کم تھے، وقت کم تر اور بہت جلد وہ بھول گئیں کہ کبھی ایک کمرہ ان کے پاس تھا جو سب سے بڑا اور آرام دہ تھا، جس کی کھڑکیوں سے خوبصورت تر نظارے نظر آتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پھر اسی روزمرہ میں کھو گئیں۔ اتفاق سے ایک کا بھائی کسی باہر کے ملک سے ایک ریکارڈ پلیئر لے آیا۔ دوسری جل مریں اور انھوں نے بھی تگ ودو شروع کی کہ باہر سے کوئی نہ کوئی چیز حاصل کی جائے۔ ایک کو کسی رشتے دار کا پرانا ریفریجریٹر اونے پونے مل گیا۔ بس پھر کیا تھا، اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ غرضکہ جن کے پاس کچھ نہ تھا، وہ کچھ حاصل کرنے میں لگ گئیں اور جن کے پاس کچھ تھا، وہ کچھ اور حاصل کرنے میں جٹ گئیں۔

اس طرح اس علاقے کی خوبصورت فضا، وہاں کے موسموں کے موڈ، آسمانوں کے رنگ، ہواؤں کے رخ، راتوں کے چراغاں سب ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ ہوس اور حسد کی آگ کے آگے کسی کو کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ اب انھیں یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی پرستان میں ہیں یا ریگستان میں، بلکہ یہی جگہ جو کبھی انھیں خوابوں کی طرح حسین لگتی تھی، اب انھیں چھوٹی، غلیظ اور ویران نظر آنے لگی تھی۔ یہاں سوئی گیس نہیں ہے، بجلی روز خراب ہوتی ہے، بارش کے پہلے چھینٹے میں ٹیلیفون خراب ہوجاتا ہے، اچھے ڈاکٹر نہیں ہیں، اچھے درزی نہیں ہیں، جدید ترین ملبوسات کے فیشن تک کا پتہ نہیں چلتا —— بھلا یہ بھی کوئی شہر ہے!۔ اب

سب کسی نہ کسی دوسری جگہ جانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہے کہ گھر کمزور تر ہو رہا ہے۔ کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ انتہائی سردی کے دنوں میں جب ساری چھتیں برف سے اَٹ جاتی ہیں، کیا یہ چھت برف کا بوجھ سہار سکے گی۔ کیا یہ دیواریں بارشوں کی مسلسل بوچھار سہ سکیں گی۔ اگر اور تیل کا اختتام ہی ہوا تو ان چولہوں کا تیل کتنے دن چل سکے گا۔ دیمک لگے درخت اگر گرے تو کیا یہ گھر بچ سکے گا اور اگر خدانخواستہ یہ گھر گرا تو ان کی انمول کتابیں، ان کے ماسوں کی چوڑیاں اور ان کی جانیں محفوظ رہ سکیں گی۔ انھیں اس بات کا خیال نہیں ہے اور انھیں یہ بتانے والا کوئی بھی نہیں!

صبر

مرد اور عورت زندگی میں مبتلائے مصائب ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے، کبھی اولاد کو اور کبھی مال کو، یہاں تک کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں اس طرح حاضر ہوتے ہیں کہ ان مصائب میں صبر کی وجہ سے ان کے تمام گناہ مٹ چکے ہوتے ہیں۔ (حدیث نبوی۔ ترمذی)

حرام کاموں سے نفس کو روکنا بھی صبر کی دوسری قسم ہے (حضرت علی مرتضیٰؓ)

وہ تلخی، جس کا آخر شیریں ہو، صبر ہے۔ (حضرت معروف کرخیؒ)

دین کی اصل عقل، عقل کی اصل علم اور علم کی اصل صبر ہے۔ (حضرت غوث الاعظمؒ)

حقیقی صبر وہ ہے کہ ہم کسی آفت یا مصیبت کے آنے کو ایسا ہی سمجھیں جیسا ہم اس کے جانے کو سمجھتے ہیں۔ (ابوالحسین النوریؒ)

شکایت نہ کرنا صبر کرنے کے مترادف ہے (حضرت امام جعفر صادق)

میں نے عمدہ سے عمدہ کھانے کھائے اور لذیذ چیزوں کو پیا لیکن صبر و شکر سے زیادہ عمدہ اور لذیذ کسی چیز کو نہ پایا۔ (بزرجمہر)

"عورت" اور "صبر" یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ (عربی ادب سے)

ایسے لوگ جو صبر سے کام نہیں لیتے، خسارے میں رہتے ہیں۔ وہ کون سا زخم ہے جو ٹھیک ہونے کے لئے وقت نہیں لیتا۔؟ (شکسپیر)

جس کے پاس صبر ہے، اسے ہر وہ چیز مل جاتی ہے جس کی اسے خواہش ہے۔ (فرینکلن)

صبر، امید کا آرٹ ہے۔ (وائنرگ)

اگر آپ چاہتی ہیں کہ کسی بات کا جواب ملے تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں اور اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

دل خریدئیے۔ دل صاف کرائیے

مسز لطف الرحمٰن

میں نے ایک مضمون پڑھا تھا کہ جس میں تحریر تھا کہ مصنوعی دل بھی جذبات سے بھرپور ہوں گے۔ یہ تو خیر خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن جانے کیوں میرا دل یہ نہیں مانتا کہ وہ جذباتی بھی ہوں گے۔

دل۔ کتنا مختصر اور کتنا جامع لفظ ہے جس میں دنیا کی تمام رعنائیاں اور رنگینیاں سمٹی ہوئی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسی ایک نقطہ کے گرد دنیا گھومتی ہے۔ اگر دل نہ ہو تو دل لگی نہ ہو پھر دل کی لگی بھی نہ ہو۔ یہ دنیا ایک بے جان موت کی مانند نظر آئے گی۔ بلکہ دنیا کا کاروبار ہی ٹھپ ہو جائے۔ مثال کے طور پر (معذرت کے ساتھ) سب سے پہلے شاعر حضرات کو بحران لاحق ہوگا۔ جن کی شاعری زیادہ تر اسی موضوع پر ہوتی ہے۔

اس کے بعد فلم والوں کو زبردست نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جن کی تمام تر فلمیں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں اس وقت مرزا غالب کی شاعری کی داد دینا پڑے گی جنھوں نے اب سے بہت پہلے یہ امکان ظاہر کر دیا تھا کہ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور۔ شاید ایک وقت ایسا بھی آجائے جب بازاروں میں کچھ اس قسم کے سائن بورڈ نظر آئیں۔

ہمارے ہاں تشریف لائیے۔ جہاں صرف خوبصورت اور نوجوان دل چند منٹ میں لگائے جاتے ہیں آپ کی خدمت میں پیش پیش۔ ایلومونیم اینڈ پلاسٹک ہارٹ ورکس۔

یہ ہے آپ کی اپنی دکان، جہاں دل کی دھلائی اور مرمت کا کام بغیر کسی تکلیف کے صرف چند سکنڈ میں کیا جاتا ہے۔

"ہارٹ واشنگ اینڈ ہیمانگ شاپ"

ارشاد احمد خاں صاحب کا ارشاد ہے کہ مردوں کو دل لگوانے کے لئے شیر شاہ اور پاپا زہ جانا پڑے گا۔ میرے خیال میں تو اس کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ نئے ماڈل کے دل جا بجا دوکانوں میں شوکیسوں کی زینت ہوں گے۔ چونکہ مہنگائی کا زمانہ ہے اور آئندہ بھی مہنگائی کی توقع ہے تو گاہک اور دوکاندار میں کچھ اس قسم کی بات چیت ہوگی۔

گاہک۔ سنئیے ذرا اس دل کی قیمت بتائیے گا کتنی ہے؟

دوکاندار۔ جی صرف سو لاکھ کا ہے۔

گاہک:۔ اجی پہلے تو ہم نے یہ سنا تھا کہ صرف اچھی ہی سو لاکھ کا ہوتا ہے یہ تو پھر پلاسٹک کا ہے۔

دوکاندار۔ ذرا ایک بار لگا کر تو دیکھئے حضور، کتنا خوبصورت ہشاش بشاش اور نوجوان دل ہے۔ پھر دیکھئے گا آپ کے دل میں کیسے کیسے ارمان مچلیں گے اور کیا کیا خواہشات جنم لیں گی۔ اجی بس۔ آپ کو دیکھ کر ہی تمام حسینائیں اپنے دل نکلوا ڈالیں گی۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک تیسرے صاحب شرمنتی برس کے پیٹے میں ہوں گے تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے۔ میاں یہ سب جھنجھٹ چھوڑو۔۔۔۔ بس تم تو ہمیں ایک ایسا دل دو جوان سب باتوں سے بے نیاز ہو اور صرف نیک ہو تمہیں کیا معلوم کہ ہم کتنی محنت اور مشقت سے چل کر تم تک آئے ہیں۔۔۔۔ سانس پھولنا شروع ہو جاتا ہے۔

دوکاندار۔ جلدی سے ایک کرسی گھسیٹ کر اور بڑے میاں کو ادب سے سہارا دے کر اس پر بٹھاتا ہے، قبلہ آپ تشریف تو رکھئے۔ اب فرمائیے۔۔۔ آپ کو کیسا دل پیش کروں۔

گاہک۔ بیٹا بس نیک دل ہو۔ جو اپنے رب سے لو لگا لے۔ تم تو جانتے ہی ہو ہم عمر کے اس دور میں ہیں۔ جہاں کسی وقت بھی اس کا بلاوا آسکتا ہے۔ بس بیٹا۔

دوکاندار۔ کچھ لمحے کے لئے سوچتا ہے پھر جواب دیتا ہے حضور پھر آپ اتنا زیادہ خرچ کیوں مول لینا چاہتے ہیں۔؟

گاہک۔ ارے بیٹا تمہیں کیا معلوم میں نے اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دنیا میں کیسے کیسے کام کئے ہیں۔ بس اب تو مجھے میرا خدا معاف کر دے یہی سوچ کر ایک نیک دل کی تلاش میں چلا آیا۔ ابھی یہ الفاظ پورے طور سے ادا بھی نہ ہوپائے تھے کہ موت کا فرشتہ آپہنچا۔۔۔ ایک ہچکی آئی اور بس۔۔۔ دل کی حرکت بند ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوکاندار پر تو گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ کبھی وہ ان کو اور کبھی اپنی دکان کو دیکھتا ہے جواب خالی ہو چکی ہے تمام گاہک جا چکے ہیں۔ اس کی زبان سے صرف یہ جملہ ادا ہوا۔۔۔ اوہ۔۔۔ خدایا تو کتنا عظیم ہے۔ تیری ذات سب سے بلند و بالا ہے۔ تیرے بندے اس قابل کہاں۔ جو تیرے بنائے ہوئے قوانین میں دخل اندازی کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اب اس کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہو چکا ہے اور پھر چونکہ وہ مسلمان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ کاروبار ختم کر دے گا۔ اور کوئی دوسرا دھندا شروع کریگا۔

اب ہمیں اپنے اصلی دل کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جانا چاہئے جس کی حفاظت ہمارا فرض ہے اس کے لئے چاہئے کہ اپنی صحت اور غذا کا خاص خیال رکھیں اور ہو سکے تو اپنا بلڈ پریشر بھی چیک کرواتے رہنا چاہئے۔ ایسی تمام احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرنا چاہئیں جن سے دل کے دوروں کی روک تھام ہو سکے۔ خدا ہمارے دلوں کی حفاظت کرے آمین

شعلہ شبنم

عارفہ صبیح

"میں کہتی ہوں۔ بھیا، کاپی واپس کر دیں ۔۔۔ ورنہ مجھ سے برا ......!" وہ آنکھوں میں سارے جہان کا غضب لے کے بولی۔

"وہ تو تم سے برا کوئی ہے ہی نہیں۔ ہاں ہاں کہو" عثمان نے زور سے چوٹیاں کھینچتے ہوئے حنا کے سامنے کاپی نچائی۔

"اچھا بچو! یہ بات ہے۔ میں نے بھی کاپی لے کر نہ دکھائی تو میرا نام حنا نہیں۔ کچھ اور رکھ دیں۔"

"ٹھیک ہے منظور! تمہارا نام آج سے نصیبن ہوا ہے۔ ویسے اگر نصیبن پسند نہ ہو تو پھر ہم تمہیں آئندہ سے بلو بی بی کہا کریں گے۔"

"اونہہ! یہ اپنے پسندیدہ نام آپ اپنی ہونے والی بیگم کے لئے رکھئے۔"
"لیکن ابھی تو تم مجھ سے فرمائش کر رہی تھیں کہ میرا نام … نہیں کچھ اور رکھ دیں۔ ویسے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہماری ہونے والی بیگم کو۔ وہ بے نام تو نہیں ہوں گی اور کبھی ویسے بھی یہ ذمہ تو ہماری ساس صاحبہ کا ہے۔"

"بڑے چاؤ سے ذکر ہو رہا ہے ساس صاحبہ کا! کہیں ساس کہنے کا ارمان ہی نہ رہ جائے دل میں۔

بڑے آئے صاحب کے چہیتے۔ ہونہہ" حنا نے بالکل گنواروں کی طرح ہاتھ مٹکاتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ کالی بلی۔ میری ایک نہیں، دس ساسیں ہوں گی۔ میں ایک تو کیا دس خواتین کو ساس کا اعزاز بخشوں گا۔ چڑیل تو نے اپنے اس خوبرو بھائی کو سمجھ کیا رکھا ہے۔" عثمان نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے بہت اترا کر کہا۔

"کیا! مجھے چڑیل بلی کہا۔ او جہ ذرا گورے ریچھ کو تو دیکھو!"

"ایک بار نہیں ..... سو بار کہوں گا۔ تم کالی بلی بھی ہو اور چڑیل بھی!"

تب ہی ہمیشہ کی طرح حنا ایک دم چراغ پا ہو گئی ۔۔۔ اور عثمان کے بازو میں زور سے کاٹ لیا۔

"ہائے امی مر گیا! چڑیل نے میرے بازو سے بوٹی نوچ کر کھا لی" عثمان نے امی کو دیکھتے ہی دہائی دی۔

"توبہ ہے کمبخت لے بچے کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ کمبخت جنگلی بنے بالکل وحشی۔" امی عثمان کا بازو سہلاتے ہوئے حنا کو صلواتیں سنانے لگیں۔

حنا جو ابھی کاٹ کر عثمان سے بچنے کے لئے بھاگ گئی تھی۔ امی کی باتیں سن کر دوبارہ پلٹ آئی "امی میں تو جیسے آپ کی سوتیلی بیٹی ہوں۔ اپنے صاحبزادے کے کرتوت تو معلوم نہیں اور مجھے تو ڈانٹنا فرض کر دیا۔ مجھے ہی برا بھلا کہے جاتی ہیں۔ بس اپنے لاڈلے کو کچھ نہیں کہتیں۔"

اماں نے کہا زبان چلاتی ہے ایک تو شرم نہیں آتی۔ جو بڑے بھائی سے ادب تمیز سے بات کر لے الٹا بھائی سے ہاتھا پائی کرتی ہے۔ دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کا۔ لیکن اس نے تو شرم و حیا کو بالکل ہی اتار دیا ہے۔ دوپٹہ اول تو ہوتا نہیں اور کبھی گلے میں جھلا لے گی تو ایک پلو گلے میں پڑا جھول رہا ہوگا تو دوسرا زمین پر جھاڑو دے رہا ہوگا۔ مجال ہے جو کبھی سلیقے سے سر پر دوپٹہ اوڑھ لے اور"

"بس بس اماں! مجھے اتنی … نصیحتیں نہ کریں۔"

"کیا کہا تو نے" اماں کی تیوریوں پر بے شمار بل پڑ گئے۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ آخر ہم بھی تو تھیں۔ لاکھ فیشن ایبل سہی لیکن ہر بات قاعدے میں کرتی تھی اور آج اس ریکارڈ سے سسرال والے بھی استرا کے گن گاتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ راہ چلتوں سے لڑائی مول لے لیتی ہو۔"

"اب وہ تو سارے گونگے ہیں۔ گن ہی گا رہے ہیں" وہ پھر لپکی۔

"سارا قصور اس کے پاپا کا ہے انھوں نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔ اور سر چڑھا لیا ہے اپنی لاڈلی کو۔"

"پاپا ہی تو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ ورنہ آپ تو …"

"اے نجمہ! میرا نام کس خوشی میں جنگ نامے کی فہرست میں شریک کر رہی ہو" عثمان نے ہلکی سی چپت ماری اور حنا کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ زور زور سے بھوں بھوں کر کے اس نے بین شروع کر دی۔

تب امی سچ مچ جھلا گئیں۔ بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔ ہر وقت

لڑتے رہتے ہو۔ اس لڑکی نے تو پاگل کر دیا ہے مجھے۔ زبان تو دیکھو کتنی لمبی ہے۔"

"زیادہ نہیں صرف پانچ انچ لمبی ہے امی، میں نے پرسوں ہی تو ناپ کر دیکھی تھی۔" حنا کی [illegible] لوٹ آئی۔

ہال اس کی بے ڈھنگی باتوں سے [illegible] آ کر اپنے کام دھندوں میں لگ گئیں، دونوں [illegible] اپنے مورچے سنبھال کر جنگ شروع کر دی۔

"ہو گئے ہوش گم مجھے ڈانٹ پڑوا کر۔"

"تو سچ مچ چڑیل ہے۔ چڑیل کیسے [illegible] آنسو بہا رہی تھی۔ اور وہ تو تم نے آخر [illegible] نکالے تھے ایمان سے میرے ایک کان کا پردہ پھٹتے پھٹتے بچا۔"

"آخر وہ [illegible] نے ایجاد کیا ہے۔ وہ پھر کب ہوں گی۔"

"ظاہر ہے جب تم دنیا میں آ کر اس [illegible] بہ ہو تو [illegible] اصولاً تمہارے آ کر [illegible]۔"

"[illegible] اللہ [illegible] نے آپ کے دماغ میں [illegible] بھر دیا ہے۔ جو [illegible]"

"اچھا اتنا [illegible]۔ [illegible] ایک بار ایک بندر والا آیا۔ [illegible] تم [illegible] دنیا میں [illegible] ہو۔ تم اتنی کالی کلوٹی تھیں کہ امی نے تمہارے پیدا ہونے پر [illegible] بنا لیا۔ جب امی نے بندر کو دیکھا تو [illegible] سے تمہیں گھٹی پلوا دی تاکہ کالی سے [illegible] ہو جاؤ۔ اب ہمیں کیا خبر تھی کہ [illegible] بندر جیسی [illegible] آ جائیں گی [illegible]۔"

"یہی تو مجھے [illegible] امی نے مجھے آپ کے ہاتھ سے گھٹی پلوا دی۔ [illegible] لوگ [illegible] کہتے تھے۔"

"[illegible] تو مجھے [illegible] کہتی ہے [illegible] ہاتھ سے [illegible] چلاتی [illegible] پھر وہ [illegible] اور [illegible] ..."

عصیم [illegible] آوازیں [illegible] جھونک سکتے میں بڑا الجھا آ رہا تھا۔ عصیم آج ہی شعیب علی کے ساتھ والے بنگلے میں اپنے چھوٹے بھائی اور امی سمیت آیا تھا۔

عصیم کسی کام سے لان میں آیا تو حنا اور اس کے گھر والوں کی باتوں سے دیر تک محظوظ ہوتا رہا۔ ویسے لڑکی بہت تیز لگتی ہے اور زبان تو قینچی کی طرح [illegible] عصیم نے دل میں سوچا اور پھر کپڑے پریس کرنے لگا کیونکہ کل اُسے ہوسٹل بھی جانا تھا۔ عصیم دو سال قبل امریکہ سے ڈاکٹری کی ڈگری لایا تھا اور ایک کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے دہلی میں اپنے [illegible] حسن و خوبی انجام دے رہا تھا۔ لیکن اسے وہاں کی آب و ہوا موافق نہ تھی اس لئے اس نے یہاں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔

"ارے بھئی سنو! [illegible] نے اپنا بنگلہ فروخت کر دیا ہے اور آج شاید [illegible] کے نئے مالکان آ گئے ہیں۔ مجھے آج ہی [illegible] سے فون پر اطلاع ملی ہے" شعیب علی نے کچھ افسردہ لہجے میں آتے ہی سب کو بتایا۔

"جی ہاں! کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں تو آ رہی ہیں" [illegible] نے جواب دیا۔

"تم لوگوں نے اسے چائے پانی کے لئے پوچھا کہ نہیں۔ دو چار دن جب تک وہ سیٹ نہیں ہو جاتے [illegible] یہیں سے بھیج دینا ہمارا بھی تو کچھ فرض ہے اور ہاں عثمان تم جا کر کوئی کام وغیرہ اور چائے کے لئے پوچھ لینا ان سے۔ [illegible] کہہ رہا تھا کہ بہت اچھے لوگ ہیں یہ۔"

"پاپا، میں تو جا ہی رہا تھا کہ یہ چڑیل میرے پیچھے لگ گئی۔" عثمان نے تاویل پیش کی۔

"ارے پھر تم نے ہماری گڑیا بیٹی کو چڑیل کہا۔"

"اچھا پاپا میں تو چلا ورنہ آپ اس کلوٹی کی تعریف میں پھر زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیں گے۔" عثمان انگوٹھا دکھا کر حنا کو جلدی سے باہر نکل گیا۔

عثمان کو عصیم سے مل کر بے پناہ خوشی ہوئی۔ چند منٹوں میں دونوں کے درمیان سے تکلف کی دیوار گر گئی اور دونوں آپس میں دوست بن گئے عصیم کو بھی [illegible] عثمان بڑا پیارا لگا۔ عصیم نے اپنی امی اور بھائی سے عثمان کا تعارف کرایا۔ عثمان کو عصیم کی امی بھی بہت پُروقار لگیں۔

"اچھا عصیم اب آپ آئیے گا اب آپ کی باری ہے اب جلد [illegible] [illegible] خراب کر دے گی۔"

"تو کیا [illegible] بھی شوق ہے؟" "بلیاں تو نہیں البتہ ایک موٹی تازی منہ سیاہ بلی پال رکھی ہے اس بندے نے۔"

"رانی شرافت سے گھر آجاؤ۔ میں ابھی پاپا سے کہتی ہوں بھیا ایروں غیروں کو میری چیز بتاتے پھر رہے ہیں۔"
حنا لان میں کھڑے کھڑے غصے سے چلائی۔ حنا نے عثمان کی بات سن لی تھی۔
پھر بڑے زور سے رونے کی آواز آنے لگی تو عصیم ساری بات سمجھ کر مسکرا دیا۔
"آپ کی بہن کیا واقعی بہت کالی ہیں۔؟"
"عصیم یقین جانو! تمہارے سر کے سیاہ بال اور اس کا سیاہ چہرہ، بالکل ایک رنگ ہے دونوں کا۔ یار اب مجھے اجازت دو، ورنہ رانی کو غصہ آگیا تو سر پر سوار ہو جائے گی۔ اچھا خدا حافظ!"
"خدا حافظ!" عصیم جواباً مسکرا دیا۔ "کالے رنگ پر تو ... چڑاتی ہیں، معلوم ... رنگ ہوتا تو ... بہت ڈھاتی۔ عجیب لڑکی ہے۔" عصیم حنا کے بارے میں سوچے بنا نہ رہ سکا۔
"ہائے مرگئی! پاپا ... پاپا میں مرگئی۔"
عصیم حنا کی آواز پر چونک گیا۔ تبھی عثمان بھاگا ... اور دوبارہ عصیم کے پاس آگیا۔ "... عصیم ... اس نے غصے میں ... اپنا ہاتھ دروازے میں دے لیا ہے اور چوٹ زیادہ لگی ہے۔ کوئی دوا موجود ہو تو جلدی سے آکر لگا دو۔ اس کے ہاتھ سے خون بہت بہہ رہا ہے۔"
اس وقت جو کچھ ... موجود تھا، عصیم نے اکٹھا کیا اور عثمان کے ساتھ ہو لیا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ دونوں ... ایک جیسے ہیں۔ بنگلہ کافی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ جو مکینوں کی خوش ذوقی کی عکاسی کر رہا تھا۔ عثمان اسے حنا کے بیڈ روم میں لے گیا۔ دادی اماں، پاپا اور امی تینوں اس کے گرد بیٹھے تھے۔ عصیم کے آنے پر شعیب علی نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ مسز شعیب اور دادی اماں بھی کھڑی ہوگئیں تبھی عصیم کی نظر حنا پر پڑی۔ دلکش من موہنی صورت ..... بڑی موٹی شربتی آنکھیں ... گلنار رنگ اور گداز جسم! عصیم کا تو خیال تھا کہ کوئی سیاہ، بدشکل اور ہیبت ناک قسم کی موٹی سی لڑکی ہوگی لیکن یہاں معاملہ قطعی برعکس تھا۔ وہ کچھ لمحے مبہوت سا اسے تکتا رہا۔
"حکیم جی! چوٹ یہاں نہیں، یہاں لگی ہے۔" عصیم کو ٹکر ٹکر چہرے کو تکتا دیکھ کے حنا نے چڑ کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنکھوں سے تیر پھینکا۔
"جی بہتر! ہاتھ دکھائیے اور ..."
حنا نے بدتمیزی سے ہاتھ آگے کر دیا۔

"آپ نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ کیوں زخمی کیا۔؟"
"مرضی میری!"
"پھر بھی یہ اچھی بات تو نہیں ہے۔" عصیم نے اس کے ہاتھ پر دوا لگاتے ہوئے کہا۔
"آپ ڈاکٹر ہیں یا کوئی وکیل جو مشورہ دے رہے ہیں۔ یا میرے بزرگ جو مجھے نصیحتیں کر رہے ہیں۔" حنا نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔
"خدا کی پناہ! زبان منہ میں نہیں رہ سکتی اس کی۔ اول فول بکے جاتی ہے نہ آیا دیکھتی ہے نہ گیا۔ بس بولے جاتی ہے۔" دادی اماں نے ناگواری سے کہا۔
عصیم کو بالکل ... چہرے اور اکھڑ زبان والی حنا بہت بھلی لگی۔ جلدی سے بولا "کوئی بات نہیں، دادی اماں! ہم ان سے دوستی کر لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے تو آج سے ہماری آپ کی دوستی پکی!"
"لیکن ایک شرط ہے ... آپ لڑائی کے دوران بھیا کا ساتھ ہرگز نہ دیں گے۔ پھر تو دوستی پکی۔" وہ بچوں کی طرح بولی۔
"ہمیں یہ شرط منظور ہے۔" عصیم نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو حنا نے بھی عصیم کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ دادی اماں اس حرکت پر پیچ و تاب کھا کے رہ گئیں اور یوں عصیم کی منہ پھٹ اور کھلنڈری سی حنا سے دوستی اور بے تکلفی ہوگئی۔ عصیم کی امی کو بھی شریر سی حنا بہت پسند آئی۔

حنا دیر تک عصیم کے چھوٹے بھائی صمد کے ساتھ مل کر کھیلا کرتی۔ دھوپ میں تتلیاں پکڑاتی رہتی۔ کبھی صمد سے جھگڑ بیٹھتی اور دو چار ہاتھ بھی جڑ دیتی۔ وہ بیچارہ کوں کوں کر کے رہ جاتا اور عصیم بڑے شوق سے حنا اور صمد کی جنگ دیکھتا۔ عصیم کو عثمان اور حنا کی نوک جھونک میں بہت لطف آتا تھا۔ حنا نے عصیم کو بھی لڑائی کے معاملے میں نہیں بخشا جو دل میں آتا بے تکان بکتی جاتی اور وہ کان دبائے مسکراہٹ لئے سنتا رہتا اور اکثر شرارت سے حنا کو چھیڑ چھاڑ کر بات کو طول دے دیتا تاکہ وہ یونہی اس سے لڑتی رہے۔
ڈیڑھ دو ماہ کے عرصے میں دونوں خاندان آپس میں بالکل شیر و شکر ہوگئے۔ حنا کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ جب منہ اٹھتا، چلی جاتی نہ دن دیکھتی نہ رات۔ عصیم، حنا کے کافی آنے ... جب تک حنا نہ آجاتی سب گھر بڑا سونا اور بے رونق لگتا۔ آج بھی حسب عادت وہ اخبار پڑھ کر وقت گزاری کر رہا تھا، تب ہی کال ... بجی ... بیٹھ گیا۔ آج عثمان اور ... بھوکی طرح

لڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ دادی اماں نے کھڑے کھڑے فیصلہ دیا" دونوں کو ڈانٹ پلائی اور خفا ہو کے چلی گئیں البتہ پاپا اور امی ان میں تصفیہ کرانے آ گئے۔ پاپا نے لاڈ سے حنا کو پچکار کے ناراضگی کا سبب پوچھا تو وہ پھٹ پڑی "پاپا بھائی مجھے رات کو نہیں پڑھا سکتا۔ پتہ ہے میرے کیمسٹری، بیالوجی میں کتنے کم نمبر آئے تھے حالانکہ میں ہمیشہ [illegible] اول رہتی ہوں"

"ہاں! تم ہمیشہ [illegible] اول رہتی ہو۔ ارے کچھ تو خوف خدا کرو۔ جھوٹ مت بولو برسات میں!" "اور رہا سوال تمہارے پڑھانے کا تو مجھے تو ہی رکھو۔ اب میں نے چڑیل تیرے ہر کام کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا کہ جو تم کہو گی چھوڑ کر آ جاؤں پھر لینے جاؤں۔ اور پھر تم [illegible] کرو۔ کوڑھ مغز اور غبی لڑکی سے سر کھپاؤں جب آتا جاتا خاک نہیں تو کس حکیم نے کہا تھا کہ سائنس ضرور پڑھو دوسروں پر سائنس کا رعب ڈالو"

"جی ہاں! زلفیں سنوارنے کا وقت ہے، پڑھانے کا نہیں [illegible] اور ہو الو! زمانہ گواہ ہے میری لائقی اور ذہین مزاجی کے۔"

"شعیب صاحب دیکھ رہے ہیں کس طرح بڑے بھائی سے ہم کلام ہو کیا کیا کہہ رہی ہے"

بیگم [illegible]۔ تم ہمیشہ اپنے بیٹے کی حمایت کرکے ہماری بیٹی کا دل توڑتی ہو"

"حد ہوگئی۔ لو میں اولاد میں فرق کرنے لگی ہوں" بیگم شعیب کو غصہ آگیا تو حنا ہنسی سے بے حال ہوگئی اور ڈھٹائی سے بولی "چلو اب میاں بیوی کا جھگڑا شروع ہوگیا اور اس بہانے مفت شو دیکھنے کو مل گیا"

عثمان کو بھی امی کی بات پر ہنسی آگئی وہ بھی بتیسی نکال کر ہنسنے لگا۔

"امی! یہ آپ کس خوشی میں اپنی بتیسی کی نمائش کر رہے ہیں۔ امی پاپا کے شو کے آگے اس کی کوئی قیمت نہیں سمجھے!"

"ایک تو یہ چڑیل بیچ میں ٹانگ اڑا کر سارا مزا کرکرا کر دیتی ہے، اچھا بھلا ڈرامہ چل رہا تھا لیکن ....."

امی کو اور تاؤ چڑھ گیا وہ جھلا کے چلی گئیں اور حنا پھر اپنے پڑھنے کا مسئلہ لے کر کھڑی ہوگئی۔ پاپا نے سوچا حنا تو عثمان سے شرارتیں کیے بغیر باز نہیں آئے گی۔ اس لئے انہوں نے عصیم سے پڑھانے کے متعلق بات کرلی۔ عصیم دل ہی دل میں بڑا مسرور تھا ـــــ اسے حنا کی رفاقت میں بڑا سرور ملتا تھا ـــــ اس طرح روزانہ باقاعدگی سے عصیم سے بی ایس سی کی تیاریاں کرنے لگی لیکن آدھا وقت وہ بکتی رہتی اور آدھا وقت بمشکل تمام پڑھتی۔ عصیم کو کبھی پڑھانا دوبھر لگتا تھا کیونکہ اس کا حسن اس سے قوت گویائی چھین لیتا اور وہ اسے تکنے میں گزار دیتا اور حنا چڑ کر کہتی "آپ کو میرے چہرے پر کس ملک کا نقشہ نظر آ رہا ہے جو یوں گھور گھور کے دیکھ رہے ہیں"

"حنا تم بہت خوبصورت ہو اور تمہاری چنچل جھگڑالو عادتوں نے اسے اور چلبلا بنا دیا ہے"

"میرے اللہ! آپ ڈاکٹر ہیں یا کوئی شاعر؟ ویسے سوپا کی آنکھیں لگا کر میرا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا میری خوبصورتی کا۔ اور یہ آپ پڑھا رہے ہیں یا میرا معائنہ کرکے منظر کشی کر رہے ہیں" حنا نے ہمیشہ کی طرح اپنے دونوں پاؤں عصیم کی کرسی پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

ویسے حنا سچ بتاؤ تمہیں دل کا پتہ ہے، کسے کہتے ہیں دل....؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ دل ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اس میں کئی شریانیں ہوتی ہیں۔ دائیں بائیں آرٹیکلز اور خون کی مختلف نالیاں ہوتی ہیں۔ یہ جسم کا ایک اہم رکن ہے، دل ایک ایسا آرگن ہے جسے پمپ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یہ سکڑتا اور پھیلتا رہتا ہے۔ اس کی [illegible] دیواریں پتلی اور بعض موٹی ہوتی ہیں دل میں آرٹیکل اور وینٹریکلز [illegible] مخصوص فعل ادا کرتے ہیں، اور دل ....."

"بس بس [illegible] میں نے دل کا جغرافیہ نہیں پوچھا تھا۔ اور [illegible] مجھے پتہ ہے کہ تمہیں [illegible] کی طرح رٹا ہوا ہے" عصیم بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولا۔

"آپ مشکل سے تو ہیں انیس سال شاگرد کے [illegible] سمجھ نہیں آتے۔ ہمارا تصور [illegible] ہے [illegible] آپ کے پلے باندھ دیں"

"تمہیں معلوم ہے حنا۔ پلے باندھنے کا مطلب ہوتا ہے؟" عصیم نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے [illegible] انداز میں کہا۔ تو وہ بڑی بے باکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی ـــ ہاں: ہاتھ میں ہاتھ تھمانا یعنی شادی۔ اور خانہ بربادی! ویسے ڈاکٹر صاحب میں نے یوں ہی سمجھا ورنہ کہا تھا۔ چلیں آج اتنا ہی سبق کافی ہے۔ باقی کل!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سنو چلی کہاں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے بولا "اس محاورے کا یہی مطلب بتایا ہے نا تم نے۔ تو اب تو تم نے بھی کہہ دیا کہ تمہارے پاپا نے تمہیں میرے پلے باندھ دیا ہے۔ چلو لڑکی راضی کیا کرے گا قاضی۔ کیوں ٹھیک؟" وہ بھی اس کی بے باکی پر کئی دنوں کی بات زبان پر لے آیا۔ وہ سمجھا کہ شاید حنا اس بات پر شرما کر ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لے گی لیکن وہ بجائے شرمانے کے تیزی سے پلٹی اور استعجاب سے بولی "ڈاکٹر صاحب کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ ارے [illegible] بڑی عمر رسیدہ ہیں ..... سوچ لیں"

وقت ہے ابھی۔ ورنہ برا ہوگا۔

"سوچنے کی ضرورت نہیں، پہلے ہی سوچ لیا ہے" عصیم ایک دم جذباتی ہوگیا ــ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ بابا کے کھسکنے لگی تو عصیم نے اسے کھینچ لیا۔ "آپ پڑھ تو لو۔ ابھی اظہار رہنے دو کر لیا بی۔ ایس۔ سی"

"اف بھئی! اب کیا کرنا ہے پڑھ کر۔ شادی کے بعد پڑھا دیجئے" وہ ذو معانی سے ابرو چڑھا کے بولی اور وہ جواب میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ سر اٹھایا تو وہ غائب تھی۔

عصیم کی روح میں تو جیسے خوشیاں رقصاں تھیں وہ رات بھر مستقبل کے تانے بانے بنتا رہا۔ اسے حنا حقیقتاً دل کی گہرائیوں سے پسند تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ اس جیسے سنجیدہ مزاج انسان کو ایسی غیر سنجیدہ، شوخ و بیباک لڑکی کیسے بھا گئی۔ اور تو اور .... اس نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ حنا سے شادی کوئی مشکل کام نہیں تھا اسے حیرت تھی کہ محبت کرنے والوں کی راہ میں تو بڑی بڑی مشکلات پیش آیا کرتی ہیں جب کہ حنا ایسی گڑیا کو پانا ذرا مشکل نہیں ہوا، کیونکہ اسکی امی جب حنا کا رشتہ مانگنے گئیں تو بغیر کسی حیل و حجت کے رشتہ منظور ہوگیا۔ عصیم جلد از جلد اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر اس بندھن کو مضبوط کر دینا چاہتا تھا لیکن حنا تو نت نئے بہانے تراشتی رہتی۔ ایک دن عصیم اسے پکڑ کے بولا "حنا بس منگنی ہونی چاہئیے۔ تمہاری اب نہیں چلے گی۔ یہ ہمارا حکم ہے اور نافرمانی کی، تو سزا ملے گی"

ایک دن عصیم ایک خوبصورت کومل سی سونے کی انگوٹھی لے آیا اور اس کی انگلی میں پہنا دی۔

کئی دنوں سے عصیم ایک بات نوٹ کر رہا تھا کہ حنا نہ تو اب باقاعدگی سے کالج جاتی ہے اور نہ دلجمعی سے پڑھتی ہے اور جب اس نے وجہ پوچھی تو اس نے کورا جواب دے دیا "اب پڑھ کے کیا کرنا ہے، بس ڈاکٹر صاحب اب شادی کے بعد آپ سے پڑھ لوں گی"

عصیم لاکھ سمجھا کے تھک گیا لیکن اس کی منطق سمجھ میں نہ آئی۔ اب وہ اکثر کالج نہیں جاتی تھی۔ زیادہ تر گھر ہی میں رہتی اور گھر والوں کا ناک میں دم کئے رہتی ورنہ پھر دیوار پھاند کر اکثر اس کے گھر آجاتی اور عصیم کی امی سے سارے جہاں کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی۔ وہ اک بار سر گوشیاں رکھ کے ہنسی سے بےحال ہو جاتیں اور عصیم کسی بات پہ ڈانٹتا تو وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ چوکنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا جو منہ میں آتا۔ کہے چلی جاتی لیکن اس کی آواز اور باتوں میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی کہ عصیم کو کبھی بُرا نہیں لگتا اگر کبھی تو کبھی اور بھی اچھی لگتی۔

اور ایک دن تو اس نے عصیم کو حد سے زیادہ بیوقوف بنایا۔ پہلے اچھی بھلی باتیں کرتی رہی پھر ایک دم شرارتوں پہ اتر آئی اور ذرا ہی دیر میں اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے پہلو کو مضبوطی سے پکڑا اور ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کا چہرہ اب نیلے کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہونٹ بڑی بے دردی سے کاٹ رہی تھی۔ عصیم تو بوکھلا کے رہ گیا اور اپنے کمرے میں میڈیسن بکس لینے گیا لیکن جب واپس آیا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے بوکھلایا ہوا دیکھ کے وہ ہنس پڑی۔

"اسے اتنی جلدی میری ایکٹنگ میں آگئے اور وہ حیران سا رہ گیا۔ دیر تک وہ عصیم کا مذاق اڑاتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ اس لڑکی میں تو سارے جہاں کے شعلے بھرے ہوئے ہیں۔ سب کو بے وقوف بناتی رہتی ہے۔

لیکن ایک دن پھر اس کی یہی حالت ہوگئی۔ عصیم یونہی لاتعلق بیٹھا رہا لیکن وہ درد کی شدت سے دہری ہوتے گر پڑی تو عصیم چونکا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی ــــــ وہ پریشان ہو کر رہ گیا اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی ــــــ وہ فوراً گاڑی میں ڈال کر اسے ہوسپٹل لے گیا۔ اس کا فوراً چیک اپ کیا گیا۔ اسے انجکشن وغیرہ لگائے گئے وہ اب بھی بیہوش پڑی تھی۔ میڈیکل رپورٹ عصیم کی وجہ سے جلد تیار ہوگئی میڈیکل رپورٹ کیا تھی ایک دھماکہ تھا۔ جیسے اس کے سر میں کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اسے تو سکتہ ہوگیا۔ کئی منٹ وہ دم سادھے یونہی کھڑا رہا۔ یہ اس کی حد درجہ شوخیاں، شرارتیں اور جھگڑے بےسبب نہ تھے۔ ان کے پیچھے تو بہت بڑا محرک تھا جسے سن کر عصیم کو لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہے۔ حنا کے پہلو کے قریب کینسر تھا جس کا کسی کو علم نہ تھا

وہ ڈھائی ماہ کیسے گذرے کسی کو سر پیر کی چیز کا ہوش نہ تھا اور جب ڈھائی ماہ بعد حنا نے زرد چہرے سے آخری ہچکی لی تو وہ کئی ہفتوں تک اپنے تن من اور ہوش و خرد سے بیگانہ رہا۔ آج اس کا جہلم تھا وہ درد سے ہاتھ ملنے لگا تو وہی انگوٹھی انگلی میں پڑی تھی۔ اوہ .... تو وہ اس لئے منگنی نہیں چاہتی تھی۔ اسکی نظروں میں وہ دیوار پھاندتی اور کبھی ہوسپٹل میں بے حس پڑی حنا گھوم جاتی۔ وہ بظاہر لڑاکا سی حنا اندر سے کتنی بےبس دکھی اور زخم خوردہ تھی۔

بے چارے

شہلا پروین

بعض اوقات بعض حقائق کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انھیں کاغذ پر لکھا جائے یا کسی کو سنایا جائے تو پڑھنے اور سننے والے یوں ہی سمجھیں گے گویا یہ ساری کہانی بڑے اطمینان سے گھڑ کر پیش کی گئی ہو۔ حالانکہ بات یوں نہیں ہوتی بات سچی ہوتی ہے مگر اس میں رنگ افسانوں کا سا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شہزاد اور شازیہ کا قصّہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ آٹھ برس سے اسی رشتے میں منسلک ہیں۔ اب تو خیر سے دونوں کی عمروں پر بڑھاپا دستک دینے لگا ہے شہزاد کے بال کھچڑی ہو رہے ہیں اور مونچھوں کے بالوں پر سپیدی ابھر آئی ہے۔ شازیہ کا بدن بھی پھول گیا ہے ——— وہ بچوں کی ماں ہے۔ بچے سات آٹھ سال کے ہیں۔

مگر ذرا ٹھہریئے۔ ان کا قصّہ یوں بتانا اچھا نہ ہوگا اسے کہانی کی طرح لکھتے ہیں۔

شہزاد کی بیوی شازیہ، دھوبن کے پاس آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور اس سے کپڑوں کی چیکنگ کر رہی تھی۔

"اے۔ دیکھو۔ یہ چادر جوں کی توں ہے۔ دھبّے ذرا صاف نہیں ہوئے۔ اور تم دو روپے بگھار رہی ہو ——— کیا تم نے مجھے بالکل ہی بے وقوف سمجھا ہے؟" اس کی آواز بڑی زہریلی اور کٹیلی تھی۔ شازیہ کی آواز واقعی زہریلی اور کٹیلی تھی۔

شہزاد سامنے کے کمرے میں صوفے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا وہاں سے آنگن کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

اس نے اخبار سامنے دھری میز پر سرکا دیا۔ آنکھ سے چشمہ اتارا۔ کیونکہ وہ قریب کا تھا۔ اور سامنے دیکھا جہاں سے شازیہ نظر آرہی تھی۔

اسے اپنی بیوی کا چہرہ بڑا ہی بُرا سا محسوس ہوا۔ دھوپ میں جیسا منہ پھولا ہوا بدن۔ پسینے پسینے چہرہ۔ موٹے موٹے بازو۔ جسم میں کرخت پن واضح ——— ہونہہ یہ کوئی عورت ہے یا...یا... مگرمچھ۔ اسے جب کوئی اور تشبیہ نہ سوجھی تو اس نے مگرمچھ کہہ دیا۔

دوسری نگاہ اس کی دھوبن پر پڑی۔ یہ عورت بھی اس کی بیوی کی ہم عمر رہی ہوگی۔ خاصی سبک سی عورت تھی وہ۔

اس نے دوبارہ سوچنا شروع کر دیا۔ مجھ سے تو وہ دھوبی اچھا ہے جس کے گھر میں کم از کم ایک عورت تو ہے!

"اوہ...... یہ تکیے کا غلاف تم نے دھویا ہے؟" اسے دوبارہ اپنی بیوی کی کڑوی کسیلی آواز سنائی دی..... "اس سے بہتر تو میں دھو لیتی ہوں۔"

اس نے سوچا اب مداخلت کرنی چاہیئے۔

"ارے بھئی ـــ کیا جھک جھک لگا رکھی ہے۔ دو اسے پیسے اور جانے دو۔"

"دیکھو جی" یکایک شازیہ اس کی سمت پلٹی "تم میرے معاملے میں مت بولا کرو۔ میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں کہ پیسے لٹاتی پھروں۔"

"تمہاری طرح بے وقوف" اس نے جملے میں سے صرف چند الفاظ سنے اور کھسیا کر رہ گیا۔ اس نے دھوبن کی سمت دیکھا۔ اس کا جی چاہا اٹھ کر اس شازیہ کو دو چار لاتیں رسید کر دے ——— لیکن وہ ایک عزت دار اور شریف آدمی تھا خاموشی سے باتوں کو پی گیا ـــ "لاحول ولا قوۃ" وہ زور سے بڑبڑایا اور وہاں سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھا جہاں سے اسے لوگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ باتیں اس کے اندر پہنچ کر اس کا خون کھولا رہی تھیں۔

ان کی زندگی کا ایک منظر آپ نے دیکھا۔ یہ بہت سے منظروں میں سے ایک ہے۔ اس سے کیا بات سامنے آئی۔ یہی کہ دونوں نہ تو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں نہ ان کے مزاج میں کوئی ہم آہنگی ہے۔ اب ذرا غور کریں جہاں اس طرح کی طبیعتیں یکجا ہو جائیں وہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لڑائی جھگڑے تو خیر ضرور ہوں گے۔ گھر کے کام کاج بھی تلپٹ ہوں گے۔ بچوں کا ستیاناس بھی ہوگا..... لیکن یہاں ایک بات کا ہونا بھی ضروری ہے اور وہ ہے دن بدن ایک دوسرے کے خلاف غبار کا جمع ہوتے جانا۔ ذرا ان کے درمیان بُعد کا اندازہ ان احساسات سے کریں جو دوبارہ کہانی کے سے انداز میں لکھے جا رہے ہیں۔

ملاقاتی کمرے میں شہزاد کے چند دوست بیٹھے ہوئے ہیں، جہاں سے باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آنگن تک آرہی ہیں جہاں پلنگ پر شازیہ بیٹھی ہوئی ہے۔

"یہ شہزاد کا دوست شکیل کس قدر ہنس مکھ آدمی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے۔ اس کے کان وہ لطیفہ سن رہے ہیں جو شکیل سنا رہا ہے۔

" ایک ماہر نفسیات کو کسی پریشان حال نے خط لکھا کہ جناب مجھے ایک بہت ہی بدصورت لڑکی سے سچی محبت ہے مگر ایک خوبصورت لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے بڑی پریشانی ہے بتائیے کہ ان دونوں میں سے میں کسے اپنی بیوی بناؤں۔ ماہر نفسیات نے جواب میں لکھا۔ تم اپنی سچی محبت کا گلا مت گھونٹو اور بدصورت لڑکی سے شادی کرلو۔ رہی وہ دوسری خوبصورت لڑکی سو اس کے نام اور پتے سے مجھے آگاہ کردو۔"

اچانک اس کے کان میں اپنے شوہر کی آواز ابھرتی ہے جو کہہ رہا ہے۔ ویسے تو یہ لطیفہ اچھا ہے۔ لیکن سچی محبت ہو تو بدصورت لڑکی بھی بہتر رہتی ہے۔"

شازیہ کو لگتا ہے جیسے اس کے کان میں کسی نے زہر گھول دیا ہو۔ دراصل ان دونوں کی شادی حادثاتی تھی۔ اماں باوا کی پسند۔ اب بھگت رہے ہیں دونوں۔ بھگت کیا رہے ہیں بھگتا بھی رہے ہیں دوسروں کو۔ پچھلے دنوں ان دونوں کے درمیان جو جھگڑا ہوا وہ اس تمام قصے کا ماحصل کہا جاسکتا ہے۔

آواز آرہی تھی۔

"ہاں ہاں ——— میں نے سوچ لیا ہے کہ ایک دوسری شادی کروں گا۔" یہ شہزاد کی آواز تھی۔

"شرم نہیں آتی۔ بال کھچڑی ہوگئے ہیں۔ رات بھر کھوں کھوں کرکے کھانستے ہو۔ بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ شادی کریں گے ہیرو جی۔"

"بالکل کروں گا۔"

"ارے کرے گا کون؟"

"ہزار مل جائیں گی۔"

"ضرور مل جائیں گی۔ صورت دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔ مردے کی طرح تو آنکھیں نکلی ہوئی ہیں۔"

"مردے کی طرح ہوں یا زندوں کی طرح۔ تم میری جان چھوڑ دو اور اپنا اس دھوتر پچھلی کا سا منہ لے کر کہیں دفع ہوجاؤ۔"

"دھوتر پچھلی ہوں گی تمہاری ہوتی سوتی۔" شازیہ کی آواز آئی ———

"مجھے پتہ ہے تمہارے دماغ میں کون ہے۔ اس کلموئی کو پوچھتا کون ہے۔ پندرہ جگہ منہ جھلسا چکی ہے۔"

"تم سے بہت بہتر ہے وہ کلموئی۔"

"کبھی چھچھوندر کو دیکھا ہے۔ جوتے لگاتی ہے اپنے میاں کو۔ ہے تو یہ اسی کی بہن۔"

میرے کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہوں۔ گویا وہ دو گھر چھوڑ کر رہنے والی سائرہ کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ویسے وہ بڑی پرکشش لڑکی ہے۔ میں جانتی ہوں اُسے۔ گویا یہ شہزاد نظریں رکھے ہوئے ہے۔ میں نے ان دونوں کو جھگڑتا وہیں چھوڑ دیا اور گھر سے نکل کر سائرہ کے ہاں چل دی۔

وہاں سائرہ بڑی معروف ہے۔ اس کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکا آیا ہوا ہے جس کی بات سائرہ کے ساتھ لگ رہی ہے۔ سائرہ کچن میں مصروف ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا ہے۔ ویسے بھی وہ ایک حسین لڑکی ہے۔ میں اس ڈرائنگ روم کی طرف دیکھتی ہوں جہاں لڑکا بیٹھا ہے۔ ذرا سا دروازہ کھلا ہوا۔ اور وہ ایسی جگہ بیٹھا ہے کہ اسے دیکھا جاسکے۔ اچھا ہے۔ اچھا خاصا ہے... اور دو گھر چھوڑ کر ——— میرے گھر سے ملحق شہزاد اور شازیہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

"ہاں ہاں کرکے دکھاؤں گا"

"جاؤ ——— جاؤ کرلو۔ میری جوتی سے۔"

میں ان کی آوازیں سن سن کر ہنس رہی ہوں۔ آٹھ سال سے یہ دونوں ایک سعیٔ لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں۔ بے چارے۔

گھر میں بہت چہل پہل تھی

ممو کی صحت یابی پر ماموں نے تمام خاندان کی دعوت کی تھی۔ ان عزیزوں میں میری سسرال کے بھی بہت سے لوگ مدعو تھے ان میں بہت سے ایسے افراد بھی تھے جن سے میری قرابت تو تھی لیکن میری ملاقات نہ تھی ان کنبوں سے میرا ملنے کا پہلا اتفاق تھا۔

مہمانوں کی صف میں ویسے تو بہت سے لوگ پرکشش تھے تاہم میری توجہ ان خاتون کی طرف بار بار مبذول ہو رہی تھی جو چند دوسری بزرگ خواتین کے درمیان ساڑھی میں ملبوس بیٹھی تھیں ناک نقشہ ان کا مردانہ تھا۔ تاہم رنگ ان کا سفید تھا جو برص کی وجہ سے تھا۔ ان کے اردگرد تین بہت ہی خوبصورت بچے موجود تھے جن میں دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ لڑکا چھوٹا تھا لڑکیاں

کوئی دس بارہ سال کی تھیں۔ یہ بچے انھیں کے تھے۔

مجھے تعجب تھا کہ یہ خاتون نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ تین بہت خوبصورت بچوں کی ماں بھی ہیں۔ تعجب کی بات ہی تھی میری ایک بہن مدت سے گھر ہی میں ہے۔ آج تک اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ برائی صرف یہ تھی کہ وہ ایک مدقوق بدن کی مالک ہے اُسے کوئی ایسا عارضہ ہے جس سے اس کے بدن پر بوٹی چڑھتی ہی نہیں ہڈیو نکے اس پنجرے کوئی شادی کرنے پر تیار نہیں۔

میں بڑی حیرت سے ان خاتون کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے پاس کھڑا ہو ———

میں نے گردن گھما کر دیکھا میرے عقب میں میرے شوہر فاروقی صاحب کھڑے تھے۔ شاید وہ میرے انہماک کو تاڑ چکے تھے۔ ایک جانب لے جاکر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"تم راشدہ باجی کو جانتی ہو؟"

میں نے انھیں حیرت سے دیکھا

کون راشدہ باجی؟"

"وہی جنھیں تم بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھیں"

"آپ کا مطلب ان خاتون سے ہے . . . . وہی جس کی رنگت"

"ہاں وہی" میرے شوہر نے کہا۔

"نہیں۔ میں انھیں آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں"

"میری رشتے کی بہن ہیں۔ اتفاق سے شادی کے بعد کبھی ان سے ملنا نہ ہوا"

"کیا یہ ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں؟" نہ جانے کیوں یہ سوال میرے منھ سے نکل گیا۔

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے میں نے انھیں ایسا ہی پایا" فاروقی بولے۔

"ہوں" میں نے ہنکاری بھری۔

"لیکن میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ بچپن میں یہ بالکل ٹھیک تھیں"

"پھر ——— یہ مرض کیسے ہو گیا"

"کہتے ہیں کہ انھوں نے غلطی سے کوئی دوا پی لی تھی اس کے اثرات [illegible]

[illegible]"

"ہاں زمانہ ہوا" میرے شوہر نے کہا ——— "یہ بچے جو ان کے اردگرد ہیں انھیں کے ہیں"

"حیرت ہے" میں نے زیرِ لب کہا۔

"ہاں حیرت کی بات ضرور ہے لیکن اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے یہاں ہر طرح کی سوچیں ہوتی ہیں یہاں ہر طرح کے انسان بستے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر آدمی ہماری تمہاری طرح ہو" وہ آہستہ آہستہ بولتے رہے ان کا لہجہ خاصا خوابناک سا ہو گیا تھا۔ خودکلامی کا سا انداز تھا یہ۔

"ان کی شادی کیسے ہو گئی آخر" میں نے لٹو کی طرح بات کو گھمایا

انھوں نے کہا "آؤ میرے ساتھ ذرا کسی جگہ چل کر بیٹھتے ہیں پھر تمہیں سناؤں گا کہ ان کی شادی کیسے ہوئی"

ہم وہاں سے کھسک کر اس رہائشی کمرے میں آ گئے جو خالی پڑا ہوا تھا۔ مہمانوں کی بڑی تعداد مکان کے وسیع احاطے کے اندر موجود لان پر لگے خیموں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"راشدہ باجی کی شادی ایک معجزہ ہی کہی جا سکتی ہے۔ خصوصًا اس دور میں جب حسن اور صحت کو فوقیت دی جا رہی ہو ——— تم نے راشدہ باجی کو بارہ تیرہ سال پہلے نہیں دیکھا بڑے متناسب بدن کی لڑکی تھیں بال گھٹا ؤں جیسے تھے ابھی بھی دیکھو تو کم نہیں ہیں اور تم نے انھیں چلتے نہیں دیکھا بڑی پرکشش چال ہے ان کی یونیورسٹی پڑھنے جاتی تھیں ان کے اپنے دماغ میں یہی تھا کہ مجھ سے شادی کون کرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ایم اے کرکے کسی کالج میں لیکچرار ہو جائیں گی اس لئے انھوں نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز کر رکھی تھی۔ وہاں ان کی چال خاص طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنتی تھی۔ یوں چلتی تھیں جیسے بادِ صبا گل کتر رہی ہو پشت پر لانبے بالوں کی چوٹی ناگن کی طرح لہراتی تھی۔ ایسا ہی کوئی وقت تھا کہ کسی طرف سے جا رہی تھیں وہیں چند لڑکوں کا ایک جھتا کھڑا ہوا تھا کسی نوجوان کی نظر ان پر پڑی اس کی رگِ شرارت پھڑکی۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے آوازہ کستے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا۔

ذرا دیکھنا یار ——— ان محترمہ کو پورا بدن سپید ہو رہا ہے۔ لیکن کیا ناز اور نخرے ہیں کیا سج دھج سے چل رہی ہیں گویا اب یونیورسٹی بھر کی کوئی لڑکی ان کے سامنے ٹک نہیں سکتی"

منانا غم کا

شمشاد حسین

خیر منانا، خوشی منانا، چھٹی منانا۔ عید منانا تو منا کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ یہ سب کچھ اب کم ہی کم منایا جاتا ہے۔ بس، دو چار منٹ، گھنٹے بھر یا ایک آدھ دن البتہ غم منانے کا ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ اور اس کی لاتعداد قسمیں ہیں۔

بھٹا نہ ہونے کا غم، وی سی آر نہ ہونے کا غم، موٹے ہونے کا غم اور اس کے برعکس دبلا ہونے کا غم۔ جس طرح فیشن مہنگا پڑتا ہے۔ یقین کیجئے غم بھی مہنگا پڑتا ہے۔ خصوصاً اس کی زد صحت پر پڑتی ہے۔ مگر صحت کا غم کسے ہے۔ بس غم ہے تو معیار زندگی بلند کرنے کا، نت نئے کپڑوں کا، چمکتی، دمکتی کراکری اور فرنیچر کا، گھر میں زندگی کے بہتیرے سامان موجود، مگر کیا مجال جو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی انھیں دیکھا ہو۔ جو کچھ بازار میں آگیا، ایجاد ہو گیا۔ اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام۔ نیند عشاق کی اڑا کرتی تھی۔ چین مجنوں کا رخصت ہوتا تھا۔ اب ہر کوئی عاشق اور مجنوں نظر آتا ہے۔ آسائش اور دکھاوے کا۔ اس نے عاشق صادق کو بھی غم منانے میں کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ چلئے یہ تو غم ہوا فرمائشوں اور مطالبات کا لیکن ایسے حضرات بھی ہیں جو غالب کے اس شعر پر بڑی دلجمعی سے رضاکارانہ طور پر عمل پیرا ہیں ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ دل غم ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ عشق کا غم، اگرچہ جان لیوا ہے مگر اس سے بچ کر بھی تو خیر نہیں۔ دل اپنی فطرت اور جبلت کے اثر سے کوئی اور غم تلاش کرے گا۔ عشق کا غم نہ ہو تو زمانے بھر کے غم، دل اپنا مشغلہ تلاش کر ہی لے گا۔ غم روزگار ہی سہی چلئے ہم نے مانا کہ عشق خلل ہے دماغ کا اور غم روزگار ایک اٹل حقیقت ہے۔ لیکن زیادہ اور پھر اور زیادہ [illegible]

والا جینا بھی غم کرے کم ہے۔ ہاں غم کو مشغلہ بنانے پر ہمیں اعتراض ہے۔ اور اس پر شدید احتجاج کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ جس طرح سگریٹ کا دھواں ماحول خراب کرتا ہے۔ اسی طرح نام نہاد غم زدہ بھی پورے ماحول کو خراب کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ انتہائے غم میں تو وہ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتا۔ نفسیات دانوں نے غالباً انہی کی حالت زار دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ ہم اپنی ۹۹ فیصد پریشانیاں خود پیدا کرتے ہیں، بلکہ ۹۹ء۱ کہا جائے تو بہتر ہے۔

مثلاً لوگ مجھے کیا کہتے ہوں گے "میرے متعلق کیا سوچیں گے"۔ بڑوں کا تو ذکر ہی کیا، نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بھی غم کھائے جاتا ہے کہ وہ کیسے لگ رہے ہیں۔ کاش ایسے ہونہار قوم کے سپوتوں کو پڑھائی کا غم ستاتا۔ اچھا یہاں امتحان کا غم کھانے والوں کا ذکر بھی آ ہی جانا چاہئے یعنی امتحان کے آخری لمحوں میں محنت کرنے والوں کا حال وہی بات کہ قریب المرگ مریض کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ پھر ان کا جب نتیجہ نکلتا ہے تو یہ تھوڑا بہت غم دکھاوے کا منا ہی ڈالتے ہیں۔ تاکہ گھر والوں سے ورحمت نہ بچے ذرا دیر بعد پھر وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔

غم کی بات چلی تو کچھ بیچاری بیٹیوں کے نام بھی آتے ہیں۔ بیٹی کے جہیز کا اماں جان کو غم، مناسب بر نہیں ملتا۔ یہ تو واقعی جان لیوا غم ہے۔ لیکن مین نیچ نکالنے کی عادت سے چھٹکارا ہو تو اس غم سے نجات ملے۔ دراصل سارا قصور اماں حضور کا بھی نہیں۔ دنیا والوں نے بھی ایک معیار قائم کر رکھا ہے لہٰذا اماں جی غم نہ کھائیں تو کیا کریں۔

اچھا نئی نئی اماؤں کا بھی ایک غم ہوتا ہے۔ ہائے میرا بچہ کچھ کھاتا ہی نہیں۔ اے بہن کیا کروں۔ دنیا کی نعمتیں لا کر، پکا کر آگے رکھتی ہوں، مجال ہے جو کچھ لے لے۔

بی پڑوسن بھی دل کی بھڑاس نکالتی ہیں۔ ہاں بہن میرا بھی یہی حال، کو بھوک نہیں لگتی۔ ایک میرے ندیدے ہیں۔ صبح قیامت کی مصروفیت میں اسکول جانے کے لئے سب کے لقمے تیار کرتی ہوں۔ یہ دروازے پر بس کے انتظار ہی کھانے کی تب [illegible] کر جاتے ہیں۔ بھوکے کہیں کے۔

پھر وہ بیٹیوں [illegible] کے نام بھی آتے ہیں [illegible]

[illegible] بیاد وہی سدھار گئے، ان کے غم کا کیا کہنا، بس وہ بھی [illegible]

چلئے آگے تو [illegible] بیچوں کا غم [illegible] جنہوں نے بیٹے کو [illegible]

[illegible]

" لڑکوں نے نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور پھر گئی قہقہے فضاؤں میں بکھر گئے طنز اور تمسخر سے آلودہ زہریلے قہقہے۔ اور پھر ایک جانب قریب ہی کھڑا ہوا ایک نوجوان آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان نوجوانوں کی سمت بڑھا اور پھر فضا میں ایک زوردار چانٹے کی دوہری آواز گونج اٹھی۔

ذرا سی دیر میں اس جگہ بھگدڑ مچ گئی۔

وہ لڑکا جس کے جملوں نے فضا کو زہر آلود قہقہوں سے بھرا تھا اپنا گال سہلا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے سامنے کھڑے نوجوان پر مرکوز تھیں ان میں شدید حیرت تھی شاید وہ غصے میں آ کر جوابی کارروائی کرتا لیکن وہ اپنے سامنے کھڑے نوجوان سے بخوبی واقف تھا۔ یہ نوجوان شاہد تھا اسٹوڈنٹس یونین کا سکریٹری جنرل شاہد۔

" ارے شاہد کیا بات ہے۔ کیا یہ لڑکی تمہاری کوئی رشتے دار تھی " ان میں سے ایک نے جلدی سے شاہد سے پوچھا۔

" نہیں " شاہد نے تنفر آمیز متانت سے کہا " یہ لڑکی میری کوئی نہیں۔ لیکن مجھے تم لوگوں کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں قدرت نے اس کے ساتھ جو مذاق کیا ہے اس سے تمہارا دل بھرا نہیں جو اسے مزید کچوکے لگا رہے تھے "

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

پھر شاہد نے انھیں وہیں چھوڑا اور ادھر چل دیا جدھر وہ لڑکی گئی تھی جس پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے گئے تھے۔ راشدہ باجی اس وقت سرو کے دو تین درختوں کے کنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹ رہ رہ کر کپکپا رہے تھے۔ آج انھیں بڑی صریح زک پہنچی تھی۔ یوں کھلے بندوں کسی نے ان کے دل پر ایسی واضح چوٹ نہیں لگائی تھی۔

انھیں اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی تو انھوں نے جلدی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اٹھ گئیں۔ لیکن شاہد ان کے سامنے کھڑے رہے۔

ان کی نگاہیں۔ راشدہ باجی کی آنکھوں پر مرکوز تھیں جو ہنوز نمناک اور سرخ تھیں۔ پھر جانتی ہو شاہد صاحب نے راشدہ باجی سے کیا کہا۔

انھوں نے کہا ——— " میں اب ان آنکھوں میں ایسے آنسو کبھی نہیں آنے دوں گا ——— ان نوجوانوں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے میں اسکی [illegible] ——— یہ دنیا کو بتانا ہے کہ انسان اگر بہت چھوٹا ہوتا ہے تو [illegible] ایم۔ اے۔ کی کتابوں کے چند شاہد [illegible]

نے راشدہ باجی سے شادی کر لی تھی ——— اس جرم میں ان کے باپ نے انھیں عاق کر دیا۔ ان کی ماں اور بہنوں نے ان سے ملنا بند کر دیا۔ سب کچھ ہوا لیکن راشدہ باجی کی آنکھوں میں انھوں نے کوئی آنسو نہ ابھرنے دیا "

وہ کہانی ختم کر کے چپ ہو گئے۔

میں گم سم سی بیٹھی ہوئی تھی۔

فاروق پھر بولے " کیا اس داستان کے آگے شیریں فرہاد کی کہانی کچھ زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ذرا سوچو ان لوگوں نے تو اپنی اپنی خواہشات کے لئے سب کچھ کیا تھا۔ لیکن شاہد بھائی نے یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا کہ وہ ایک ایسی ہستی کو مسکراتی دیکھنا چاہتے تھے جس سے قدرت نے ایک ہولناک مذاق کیا تھا۔ کیا یہ انسان کے دل کی بلند تر رفعتوں کی ایک لازوال کہانی نہیں "

" میں شاہد بھائی کو دیکھنا چاہتی ہوں " یکبارگی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

" آؤ میرے ساتھ " فاروق مجھے ادھر لے گئے جدھر مرد بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے سامنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ قدرے ادھیڑ عمر کے۔ وجیہہ سے۔ شریر سے آدمی۔ یہ شاہد بھائی تھے۔

" یہ میری بیوی عالیہ ہے " فاروق نے تعارف کرایا۔

میں نے انھیں جھک کر سلام کیا۔۔۔۔ اور پیشانی کے خم کے ساتھ میرا دل بھی ان کی عظمتوں کے سامنے جھکتا چلا گیا۔

ختم شد

• جب آپ نے کسی مسئلہ کے بارے میں پورے غور و فکر سے حقائق کو پرکھنے کے بعد فیصلہ کر لیا تو پھر اس پر عمل کیجئے۔ دوبارہ سوچنے کے لئے مت ٹھہرئیے، اور پس و پیش نہ کیجئے۔ قدم آگے بڑھائیے، انھیں دوبارہ ناپنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اپنے آپ کو شکوک کی وادیوں میں نہ لے جائیے کیونکہ ان سے مزید شکوک پیدا ہوتے ہیں، اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھئے۔ (کارنیگی)

• زندگی میں واحد چیز جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ملکیت ہے، وہ " عمل " ہے (ہکسلے)

• دو آدمی دنیا میں بیکار محنت کرتے اور دکھ اٹھاتے ہیں۔ ایک وہ جس نے جمع کیا اور خرچ نہ کیا اور دوسرا وہ جس نے کوئی اچھی بات پڑھی اور اس پر عمل نہ کیا (سعدی شیرازیؒ)

• ابھی ——— ورنہ کبھی نہیں ——— ! (انگریزی مقولہ)

نہ بن سکے تو قوم کی خدمت کا ارمان دل ہی میں رہ جائے گا۔ اور خدانخواستہ دنیا کا کارخانہ رک جائے گا۔

ہاں کچھ غم ایسے ضرور ہیں۔ جن کے بیان کا یارا نہیں الفاظ انکی حقیقت کے لئے گھڑے ہی نہیں گئے اور جو ہیں وہ مکمل انصاف نہیں کرسکتے۔ اور کچھ غموں کے بیان کے لئے ابن آدم کے پاس وقت ہی نہیں اور کچھ بھول گئے۔ چلو اچھا ہوا شکر ہے اللہ کا کہ ہم کچھ غم بھول گئے۔ غم کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ جن باتوں پر ہمیں اختیار نہیں ان کی ناگواریوں کو بھلا دینا ہی عین عافیت ہے۔ رات گئی بات گئی والا فارمولا اچھا ہے۔ اس فارمولے کو استعمال کرنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

افسانہ

فرشتۂ رحمت

نفیس فاطمہ سیمیں

آخر کس چیز کی کمی ہے عروج میں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے خوبصورت ہے۔ امیر ہے شریف اور با اخلاق ہے اور پھر تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ تمہارا منگیتر ہے۔" بیگم زاہدی نے اپنی اکلوتی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

مگر ممی میں کچھ نہیں جانتی۔ عروج اور میری سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر انڈر اسٹینڈنگ ذہنی ہم آہنگی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے ممی" سارہ بولی۔

شادی کے بعد جب ساتھ رہو گی تو انڈر اسٹینڈنگ بھی ہو جائے گی۔ مجھے لے لو۔ میں نے شادی سے پہلے تمہارے پاپا کو دیکھا تک نہ تھا مگر آج ہم لوگ قابلِ رشک زندگی بسر کر رہے ہیں" بیگم زاہدی نے سمجھاتے ہوئے کہا ——

اوہ ممی یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ نوید میرا آئیڈیل ہے۔ سارہ بولی۔

سارہ بیٹی۔ آئیڈیل کبھی بنے بنائے مکمل صورت میں نہیں ملتے کسی کو پانے کے بعد اس کو اپنے آئیڈیل کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ سچی خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم اپنی محنت سے کوئی چیز تیار کرتے ہیں۔ ماں نے بیٹی کو پھر سمجھایا۔

"ممی میں کچھ نہیں جانتی آپ پاپا سے بات کریں اور انھیں میرے فیصلے سے آگاہ کر دیں" سارہ غصے میں بولی۔

ہرگز ہرگز نہیں۔ تمہارے پاپا سے اس بارے میں بات نہیں کروں گی وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور تمہیں بھی گولی مار دیں گے۔ سمجھیں۔ اگر تم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہی ہو تو خود بات کرو۔

ٹھیک ہے میں پاپا سے خود بات کروں گی" سارہ نے یہ کہا اور طنطناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بیگم زاہدی اپنی بچی کی خود سری اور بدتمیزی دیکھکر حیران رہ گئیں۔ دکھ سے ان کا چہرہ دھندلا گیا۔ سرگوشی کر بولیں۔ میرے خدا مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے میں نے کبھی اس کی پرورش میں کوئی غلطی نہیں کی ہمیشہ پاکیزہ ماحول میں اس کی پرورش کی فکر کی ہو کر یہ اتنی ہٹ دھرم نکلے گی میں نے سوچا تک نہ تھا۔

"نوید۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی نوید۔ تم میرے آئیڈیل ہو" ہوں" نوید نے ہنکارا بھرا تو "تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی" ہاں نوید لیکن ممی کسی صورت راضی نہیں اور پاپا سے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پا رہی وہ پاپا۔ خود مر جائیں گے یا مجھے گولی مار دیں گے مگر اپنی بات سے کسی صورت پیچھے نہ ہٹیں گے۔

اچھا۔ تو یہ بات ہے نوید بولا تو پھر تم مجھے بھول جاؤ اور اپنے والدین کی مرضی کے آگے سر جھکا دو۔ محبت کا ایک نام قربانی بھی ہے۔ نوید بولا۔

یہ۔ یہ تم کہہ رہے ہو نوید" تم نے ہمیشہ ایسی جلی کٹی باتیں کیں ہیں۔ تم دنیا سے ڈرتے ہو۔ مگر میں نہیں ڈرتی۔ نوید آؤ کہیں دور۔ بہت دور ایک پرسکون گھر بنائیں جہاں میرے اور تمہارے علاوہ کوئی نہ ہو۔

بھاگ سکو گی میرے ساتھ۔ اتنی ہمت ہے تم میں بدنامی نہیں ہوگی۔؟
میں بدنامی سے نہیں ڈرتی۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

اتنی بہادر ہو۔ سوچ لو۔ اگر اپنے فیصلے کو تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہو تو کل آ جانا مگر خوب سوچ سمجھ کے۔

ٹھیک ہے نوید۔ سارہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولی۔

آگئیں تم؟ تو تم نے فیصلہ کر لیا؟؟

ہاں نوید میں صرف اور صرف تمہارے ساتھ زندگی گذارنا چاہتی ہوں، میں تمہاری خاطر اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر آئی ہوں۔

خوب بہت خوب، مگر اتنا سوچ لو کہ جب ہمارے بچے ہوں گے اور ان کو پتہ چلے گا کہ ہمارے ماں باپ گھر سے بھاگے ہوئے ہیں تو کیا سوچیں گے؟

سب ٹھیک ہو جائے گا نوید، بچوں کی بات دور کی ہے۔ ہم شادی کر لیں گے تو ہمارے ماں باپ کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ اور وہ ہمیں، دوبارہ اپنا لیں گے۔

اچھا۔ آؤ بیٹھو نوید اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ سارہ بیٹھ گئی اور نوید نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد نوید بولا، تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔

کیوں، ڈر کیوں لگے گا، سارہ نوید کے شانوں پہ سر رکھ کر بولی، آخر تم میرے اپنے ہو نوید۔

گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی اور سارہ آنکھیں بند کئے مستقبل کے حسین خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ دفعتاً ایک موڑ پر جھٹکے سے سارہ کے خواب ٹوٹ گئے اور آنکھ کھل گئی۔

یہ، یہ تم میرے گھر کے رستے سے کیوں جا رہے ہو گاڑی واپس موڑ دو نوید۔ دوسرے رستے سے چلو، یہاں سب جاننے والوں کے گھر ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ تم تو کہتی تھیں کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اب کیوں ڈرنے کی بات نہیں نوید، وہ لوگ کیا سوچیں گے؟ بعد میں خبر پھیلے گی تو کیا نہیں سوچیں گے؟ نوید بولا اور پھر گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

یہ تو میرا گھر ہے۔ یہ تم کہاں لے آئے، سارہ گھبراتے ہوئے بولی،

خاموشی سے اتر جاؤ اور میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تمہیں با عزت تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔ اگر میرے دل میں شیطانی آجاتی تو آج تمہاری بہادری نکل جاتی۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو نوید۔ میں تو صرف تمہارے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر آئی تھی۔

اونہہ، نوید نفرت سے بولا۔ جو لڑکی اپنے ماں باپ کو جنہوں نے بیس برس اسے پالا پوسا اسے چھوڑ سکتی ہے وہ لڑکی چار دن کی دوستی کیسے نبا سکتی ہے۔ میں صرف تمہیں آزما رہا تھا۔ تم اپنی محبت میں اس حد تک گر سکتی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا تم پاکیزہ محبت کے نام پر بدنامی کا دھبہ لگانا چاہتی تھیں۔

تم اتنے دھوکہ باز نکلو گے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ تم نے میری انسلٹ کی ہے ——

تم چلی جاؤ میں کچھ سننا نہیں چاہتا خاموشی سے گھر کو جاؤ اور شکر کرو ابھی کسی نے دیکھا نہیں۔

سارہ غصے میں نیچے اتری اور تیزی سے گھر کی طرف چلی گئی۔

کیا ہوا بیٹے؟ کچھ بتاؤ تو روکیوں رہی ہو۔ بیگم زاہدی نے سارہ سے کہا

ممی۔ نوید نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ میں اسے نہ بخشوں گی۔ پھر آنسوؤں کے درمیان اس نے ساری باتیں ممی کو بتا دیں۔

اوہ خدایا، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہم کتنی بڑی بدنامی سے بچ گئے نوید ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوا ہے۔

ممی اس کا نام نہ لیں میرے سامنے اس نے میری انسلٹ کی ہے۔ میں نوید کو دل سے چاہتی تھی مگر اس نے میرے پیار کی توہین کی ہے۔

نہیں بیٹے۔ شکر کرو تمہارے ڈیڈی کو پتہ نہیں چلا اور تم بخیریت واپس آگئیں۔ نوید نے ہمارے خاندان کی لاج رکھ لی ہے میں آج ہی اس کا شکریہ ادا کرنے جاؤں گی۔

بیگم زاہدی کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور، وہ خوش خوش سارہ کے رونے کی پرواہ کرتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ اور سارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لطیفے

- ڈیڈی میری شادی اب ہو جانا چاہئے۔
  ابھی نہیں بیٹے۔ ابھی تمہارا دماغ پختہ نہیں ہوا ہے۔
  میرا دماغ کب پختہ ہوگا ڈیڈی
  جب اس سے شادی کرنے کا خیال نکل جائے گا۔

- عورتوں کے پیچھے بھاگنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا نقصان تو اس وقت ہوتا ہے، جب عورت آپ کی ہو جاتی ہے۔

- بیوی نے پوچھا، کیا ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی غلطیوں سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شوہر نے کہا، کیوں نہیں مثلاً وہ قاضی جس نے ہمارا نکاح پڑھا کر پندرہ روپیہ وصول کر لئے تھے۔

- ایک سہیلی نے دوسری سے پوچھا، ارے یہ تمہاری دوسری شادی کیسے ہو گئی۔

  جواب ملا۔ ارے یہ نہ پوچھو۔ بڑے ہی رومانٹک طریقہ پر ہوئی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ کار پہ جا رہی تھی کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میرے شوہر مر گئے۔ جس کار سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس کا ڈرائیور مجھے اسپتال لے گیا اور پھر ہم نے شادی کر لی۔

وہ کیسے ـ ؟؟؟

(از زرین ـ بارہ بنکوی)

قصباتی زندگی میں تعویز گنڈوں سے بہتر کوئی دھندا نہیں — ! آپ حیرت سے دریافت فرمائیں گی وہ کیسے ؟ تو آیئے میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی ۔ واقعی اگر دل میں خدا کا خوف نہ لایئے تو یقین جانیئے اس سے اچھی آمدنی اور آرام کسی تجارت میں نہیں ۔ مفت میں گھر بیٹھے پیسہ آئے اور معتقدین کا ہجوم علیٰحدہ خدمت گاری کے لئے حاضر — !!! خود ہی غور کیجئے زمانۂ حاضرہ میں خاصی تنخواہ دینے کے باوجود جلدی کوئی ملازم نہیں ملتا اور ملے گا بھی تو بجائے اس کے کہ آپ چند شرائط رکھیں وہ پہلے ہی کہہ دے گا ۔ اتنی اجرت لوں گا ۸ بجے سے بارہ بجے تک اور ۴ بجے سے ۶ بجے تک کام کروں گا مہمان آنے پر اوور ٹائم کام کا ہوگا اس کا معاوضہ الگ، بازار دور ہے تو سائیکل سے جاؤں گا وغیرہ وغیرہ ۔ کھانا ناشتہ سب کچھ وہی ہوگا جو گھر والے کھائیں گے اب اگر آپ کو ضرورت ہے تو مجبوراً ان کے مطالبات پورے کرنے ہوں گے خواہ وہ خود کھائیں یا گھر لے جائیں یا چوری کریں — !!! مگر تعویز میں یہ مصیبت نہیں یہ غریب گھر سے لے جانے کے بجائے دے جانا باعث فخر سمجھیں گے اگر حقیقتاً آپکے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہے تو پھر مزے میں دال روٹی کیا مرغ پلاؤ آرام سے نوش فرماسکتی ہیں خوب ڈکاریں لے لے کراطمینان سے گہری نیندیں سویئے مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ خدا کا خوف دلمیں ہرگز نہ لایئے گا ۔ !!!

یہ موضوع چھڑ گیا ہے تو بس خود حیران ہوں کہاں سے اور کس طرح شروع کروں سب سے پہلے تو میں ان خواتین سے معذرت خواہ ہوں جنھیں اس آئینہ میں اپنا عکس نظر آئے ۔ دراصل آج کل کے دور میں جبکہ ہمارے ایمانوں میں کمزوریاں پیدا ہوچکی ہیں یا ہورہی ہیں خود تو نماز روزہ سے غافل ہیں لیکن جب کوئی پریشانی آپڑتی ہے تو چاہتی ہیں کہ دعا تعویز سے دور ہوجائے اکثر تعلیم یافتہ خواتین بھی جو نماز روزہ بھی کرتی ہیں لیکن توہمات کی شکار ہیں آخر کیوں ؟ ... خود سوچیئے ۔ کیا وہ خدائے تعالیٰ پر اعتقاد نہیں رکھتیں کہ بچہ کو ٹھنڈ کا اثر ہوجائے تو بھنگی سے جھاڑ پھونک کروائیں گی جن کا کوئی مذہب نہیں جو مردار کھاتے ہیں جو خنزیر پالتے اور کھاتے ہیں ! بچوں کو خسرہ نکلتی ہے تو مالی کے پاس لے کے جاتی ہیں وہ پھونک ڈالکر کہتا ہے اب بھاگ گئیں دیوی جی ۔ حالانکہ سب جان سکتے ہیں اگر احتیاط رکھی جائے تو بچے کو خسرہ کی تکلیف اور بخار دو تین روز سے زیادہ نہیں رہتا یہ بدعت کتنی تکلیف دہ چیز ہے میں نے بہت غور کیا سوچتے سوچتے آخرکار یہ نتیجہ نکال سکی کہ ہم ہند و مسلم اکٹھے رہتے ہیں ۔ انسان کے رہن سہن اور ماحول کا اثر پڑ ہی جاتا ہے ۔ جاہلوں کی بات چھوڑیئے پڑھی لکھی خواتین بھی کبھی کبھی تو ہم پرست اور ضعیف الاعتقاد دکھائی دیتی ہیں کیسی پر چڑیل آگئی کسی درخت پہ برہم بابا عموماً جاہل عورتوں کے پاس واہیات خرافات کے علاوہ کام کی باتیں ذرا کم ہی ہوا کرتی ہیں مثلاً فلاں عورت ٹونے دیتی اس سے بچوں کو چھپائے رکھو فلاں تالاب کھینچ لیتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ میں اس قسم کی دعاؤں اور تعویزات کو خصوصاً جو پیسے لے کر کیئے جائیں بالکل اہمیت نہ دیتی تھی بلکہ مضحکہ اڑانے سے بھی دریغ نہ کرتی تھی یہاں اکثر لوگوں نے فیس مقرر کر رکھی ہے مثلاً فال نکلوائی، مکہ جھاڑ پھونک عہ روپیہ گنڈہ بنوائی عہ جن آسیب اتارنے کے لئے جو بھی طلب کیا جائے ۔ میرے پاس دو لڑکیاں تھیں ملازم نہ ہونے کے باوجود چونکہ بچپن سے آتی تھیں لہذا بڑے خلوص سے کام کیا کرتی تھیں مجھے ان سے بڑی راحت ملتی تھی کسی نہ کسی صورت حق المحنت میں چکا دیا کرتی تھی ۔ دونوں ہی بے حد شریر تھیں میں نے ان سے ایک دن کہا دیکھو آجکل مئی جون کی سخت دھوپیں ہیں تم دونوں شعلہ برساتی ہوئی دوپہر میں باغوں کھیتوں کی طرف جاؤ بس وہاں سے واپسی ایک تو خاک اڑاتی بال کھسوٹتی پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی ہوئی آئے اور دوسری خوب مضبوطی سے پکڑے ہوئے کوئی بھی بھولا بھٹکا راہ گیر ملے سب سے کہتی آئے یہ فلاں درخت کے نیچے بیٹھی تھی ایک لکڑی بھی توڑی تھی اسپر تو سب کوئی افریقے ہیں منع کرتی رہی لیکن یہ مانی ہی نہیں ۔ پھر میں — جھاڑ پھونک کروں گی اور یہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوجائے گی ۔ گویا یہ پروپیگنڈے کی ابتدا ہوگی اتنا سن کر زوردار قہقہے لگے کہ یہ مذاق اسی گونج میں تحلیل ہوکر رہ گیا جب ہنستے ہنستے دونوں تھک گئیں تو دلچسپی سے بولیں ٹھیک تو ہے بیگم صاحبہ بڑا مزا آئے گا پھر تو بڑی شہرت ہوجائے گی ہم دونوں

آپ کے بہترین ایجنٹ ثابت ہوں گی۔!!! خیر صاحب۔ یہ تو تھی صرف تفریح مگر اتفاق دیکھئے کہ چند ہی روز بعد مجھے ایک ایسی خالہ قدرت نے دلادی جو میرے لئے باعث دلچسپی نہیں یا باعث کوفت اس کا فیصلہ آپکے ذمہ رہا۔ ان خالہ کا باقاعدہ کاروبار تھا چونکہ لاوارث تھیں لہذا میں نے زیادہ کچھ اہمیت نہ دی حالانکہ بُرا ضرور لگتا تھا از راہ تمسخر میں نے ان سے کہا خالہ کیا اچھا ہو کہ میں آپکی پروپیگنڈہ سکریٹری بن جاؤں۔ اور آپ آنے والی رقم کا نصف مجھے عنایت فرمائیں یقین جانئے آپ گھاٹے میں نہیں رہیں گی میں زور دار پروپیگنڈہ کر کے دکھادوں گی اب انھوں نے سوچا آمدنی کے ذرائع بڑھانے چاہئیں چونکہ لکھنا جانتی تھیں لہذا یٰسین والقرآن الحکیم) ہی سیکھنے پر اکتفا کی اور ہر مرض کی دوا یہی تعویذ ہی تھا جس کی قیمت ایک روپیہ! مگر میرا مذاق ایک سنجیدہ صورت اختیار کر گیا اور لاشعوری طور پر میں سوچنے پر مجبور ہوئی یہ کہ ایک دن دو۔ گاؤں سے ایک عورت پسینہ سے تر بتر پریشان حال اپنے ۴ سالہ بچے کو لے کے آئی کہ بی بی اسے بخار تیز ہے الجھن بہت ہے، ہماری خالہ ایک شاہانہ بے نیازی سے اٹھیں جیکٹی مٹی یا ریک بارہ کاٹ کوئی پتھر سے زمین پر جو کو دکھائی اور اس سے کہا اس کے بیٹے کو لے کر بیٹھو" پھر آہستہ آہستہ کچھ پڑھ کر اس کے سر پر ... اب تو میں بالکل ان کے قریب آ کھڑی ہوئی کہ دیکھوں اب کیا کرتی ہیں اور کیا پڑھتی ہیں! ... تاج پڑھ رہی تھیں اٹک اٹک کر بھول - بھول کر بھی کوئی حصہ چھوٹ جاتا کبھی غلط پڑھ دیتیں میں منہ پر پٹی چپکا خاموش کھڑی ان کا منھ تکتی رہی اور کچھ کہہ نہ سکی حالانکہ اپنی اس کمزوری بزدلی پر مجھے افسوس رہا!!! چونکہ اس وقت جھجک کا زور تھا لہذا میں نے سوچا بچے کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے ممکن ہے چیچک اس کے نکلنے والی ہو اور خالہ محترمہ ایک روپیہ وصول بھی کر چکی ہیں اس لیئے کچھ تو اس بیچاری سے ہمدردی کرنی ہی چاہیئے" خالہ ان کو آپ سورۂ رحمٰن کا گنڈا بنادیں چیچک کا اندیشہ ہے مجھے ماں۔ ہاں ٹھیک ہے کل جمعہ ہے تم دو روپیہ اور کالا دھاگہ لیتی آنا" یہ تھا میری بات کا جواب" میری ہمدردی اس غریب کے لئے مصیبت بن گئی جانے کتنے میں نے سوچا یہی تھا ایک روپیہ تو لے لیا ہے ابھی میں بتا دیتی ہوں" اچھا رہو خالہ کی یہی نفرت آمیز نظر لاکر بظاہر چپ ہی رہی لیکن دل اُدھیڑ بن میں لگ گیا آخر کس طرح ان سادہ لوح دیہاتی عورتوں کا پیسہ بچایا جائے پریشانی و اضطراب بڑھتا ہی گیا آخر کار میں نے مسلم خواتین کو سمجھانا شروع کیا" دیکھو ہمیشہ اپنے آپ کو پاک رکھو کچھ نہ آتا ہو تو کلمہ شریف پڑھتی رہا کرو یہ فضول باتوں سے بہتر ہے، بچوں کو کلام مقدس کی تعلیم ضرور دلواؤ جس گھر میں تلاوت ہو اس گھر میں بھلا گندی شئے کیونکر رہ سکتی ہے کوئی ڈر رہے گا نہ خوف خواہ گھر ہو یا باہر۔۔۔ تھوڑے دنوں اس قسم کی نصیحت آمیز باتیں بتائیں پھر ایک سلسلہ شروع ہو گیا آپ سنائے بی بی میں بچے پر پڑھ کر پھونک دیجئے ہر چند میں کہتی میں ایک گنہگار انسان ہوں پابندی وقت سے نماز تک نہیں ہو پاتی مگر وہ پیچھا نہ چھوڑتیں آخر تھک کر ہتھیار ڈالنا پڑتا اور کہہ دیتی بھئی، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں لیکن خالق کائنات کا کلام ہے وہی شفا دینے والا ہے اگر بخار ہوا تو اول آخر درود شریف پڑھکر سورۂ مزمل بخار میں اکسیر ہے اسی طرح ضرورت کی مناسبت سے جو کچھ معلوم ہوتا تھا پڑھ کر پھونک ڈال دیتی تھی چونکہ ناچیز کی خدمت بے لوث تھی اور اللہ تعالیٰ سے بھی کبھی کبھی گڑگڑا کر التجا کرتی تھی کہ یا اللہ میری لاج رکھ لے بہرحال بھروسہ ہوا اعتقاد ہو گیا معصی تادر بظلی توجہ نہ فرمائیں۔ میری شہرت بڑھنے لگی فرصت نہ ہونے کی وجہ سے پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا ــــــ جھوٹی تسلیوں کی عادت نہیں ورنہ یہ کام آسان ہوجاتا شائد۔ اب مجھے تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی کیونکہ تنہا ہونے کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بہت تھا مگر جتنا میں سب سے کہتی مجھے کچھ نہیں آتا خود ایک گنہگار عورت ہوں اتنا ہی انکا اعتقاد بڑھتا جاتا کیسے سچے لوگ اپنے کو چھپاتے ہیں بتایئے ان حماقتوں کا کیا جواب؟ ایک روز ایک نوجوان لڑکی آئی مسلمان تھی میں نے پوچھا آنے کا سبب؟ بولی بیگم صاحبہ میری شادی کو ۴ سال ہوئے بچہ نہیں ہوتا تیسرے چوتھے مہینہ بیمار ہو جاتی ہوں میرے یہاں کھیتی باڑی کا کام ہوتا ہے میرے شوہر کہتے ہیں کوئی دو تین سو روپیہ لے کر ہی مضبوطی کر دے۔ میں نے پوچھا کلام پاک پڑھی ہے؟ ہاں" اس نے جواب دیا میں نے اس سے کہا میں بتادوں گی تم خود گنڈہ بنا کر پہن لینا لیکن پاکیزگی شرط رہے گی۔ ان دنوں خیر خیرات میں بھی حصہ لینا ضرورت مندوں کا خیال رکھنا۔ وغیرہ۔ مگر وہ بضد رہی کہ خود آپ کر دیجئے آپ کی بات ہی اور ہے۔ خیر صاحب اٹھی سیاہ دھاگہ تلاش کیا گنڈہ بنایا اور ضروری ہدایات کے ساتھ رخصت کیا وہ اس قدر مطمئن گئی کہ خاص طور سے نماز میں اس کا خیال آگیا خوب دعائیں اس کے لئے مانگیں" اے معبود حقیقی"

کتنی دکھی تھی یہ لڑکی "میں ترے حضور نادم و شرمسار ہوں گنہگار سہی لیکن تو تو غفور الرحیم ہے برتر و عظیم ہے اس پر رحم فرما اس کی گود بھر دے جس طرح میں نے اس کی خوشی پوری کی اسی طرح تو میری لاج رکھ لے۔!!! اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈیڑھ سال بعد میں نے دیکھا ایک موٹی سی گول مٹول ۶ ماہ کی بچی لئے وہ خوش خوش چلی آ رہی ہے۔ سوچیئے تو سہی اس وقت خوشی سے میرا کیا حال ہوا ہوگا؟ خدائے قدوس نے کتنی عزت رکھی تھی مجھ حقیر کی ۔۔۔ ؟ میرا آدمی کہتا تھا کچھ تحفہ لے کر جاؤ مگر سب نے بتایا کہ وہ کچھ لیتی نہیں بلکہ برا مانتی ہیں تبھی میں خالی ہاتھ آئی یہ کہکر عقیدت سے اس نے بچی کو میری گود میں ڈالدیا اور التجا آمیز لہجہ میں بولی آپ اس کی زندگی کے لئے دعا کریں اس وقت میں نے واقعی بزرگ بی بیوں کی طرح ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں پھر بچی واپس کی گود میں کھچڑی بال، اور روپیہ ڈالکر پھر ایک بار بلند آواز سے دعائیں دیں اللہ تعالیٰ ہمیشہ تمہاری گود ہری بھری رکھے اس طرح وہ خوش خوش واپس گئی ـــــــ !!! پھر تو دور دور سے لوگ آنے لگے اور میری مشکلات میں اضافہ ہوتا ہی گیا کہیں سے ایک نوجوان آگیا بیماروں جیسی شکل دہشت سی برس رہی تھی کوئی کام کرتا تھا نہ ڈھنگ سے کھاتا پیتا تھا۔ اسکے گھر والوں کا خیال تھا کہ کسی نے کچھ کر دادیا ہے اور یہی احساس اس کے لئے بلائے جان بن گیا ہوں کہ ان دنوں خود میری طبیعت ٹھیک نہ تھی لہذا باورچی سے پانی صراحی سے لے کر دے آئی کہ پڑھوا لائی ہوں ایک ہفتہ بعد پھر وہ آپہونچا کہ مجھے فائدہ ہوا ہے اور پانی پڑھوا دو" وہ ہنستی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ ایک دن یہ نوجوان آیا تھا بہت بیمار لگتا تھا آپ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی میں نے ڈر کی وجہ سے آپ کو بتائے بغیر صراحی سے پانی لے جاکر دیدیا کہ پڑھوا لائی ہوں آج وہ پھر آگیا کہ پہلے سے ٹھیک ہوں پانی اور پڑھوا دو پہلے تو میں جھوٹ بولنے پر نادم ہوئی پھر طبیعت خوش بھی ہوئی کہ اس طرح لڑکے کا وہم تو دور ہو رہا ہے۔ اس مرتبہ میں نے اسے آب زم زم بھجوا دیا کہ بہت احتیاط سے چند قطرے پانی میں ڈال کر پی لیا کرے انشاء اللہ تعالیٰ اب آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی خدا کا شکر نہ صرف اس کے بلکہ اس کے گھر والوں کے دل سے یہ وہم نکل گیا کہ اب کوئی اثر نہیں رہا وہ لڑکا پھر سے کام کاج میں لگ گیا اور سب سے کہتا ہے انھوں نے مجھے ٹھیک کر دیا۔ رفتہ رفتہ میری مصروفیات کے ساتھ ساتھ صحت بھی جواب دے رہی تھی اس لئے مجبوراً یہ سلسلہ کم کرنا بھی تھا ایک رات پھر ایک عورت اپنے بچہ کو لے کر آئی کہ اسے بخار بہت تیز ہے کچھ پڑھ کر پانی دیجئے۔ میں نے سورۂ مزمل پانی پر پڑھکر دیدیا اور اس سے کہا اگر بچہ ٹھیک ہوجائے تو میرے پاس آنا ورنہ مجھ پر بالکل اعتماد نہ کرنا میرا خیال تھا اتنا تیز بخار اترنا مشکل ہے پھر میرے پاس نہ آئے گی لیکن صدقے جاؤں اس کی شان کریمی کے کہ اپنے کلام مقدس کی برکت سے نہ صرف بچے کا بخار اتار دیا بلکہ اس کے شوہر نے جس کو بھی بخار تھا ذرا سا پی لیا دوسرے دن وہ ٹھیک ہوکر اپنے کام پر چلا گیا ـــ !!! مضمون طویل ہو رہا ہے لہذا اس راز کو بھی ظاہر کر دوں کہ ایکبار ایک صاحبہ سے میں نے اپنے موکلوں کے لئے پاؤ بھر مٹھائی لی تھی جو مزے سے کھائی در اصل وہ سن رسیدہ تھیں مطلب یہ کہ نواسی نواسوں والی مگر وہ اپنے محبوب سے ملاقات کی مشتاق تھیں مجھے شرارت سوجھی ان موکلوں کے نام سے مٹھائی اور خوشبوئیں منگوائیں اور فرضی تعویذ دیدیا کہ بازو پر باندھ لو انشاء اللہ آجائیں گے پھر یہ شکر جو پڑیا میں ہے کھلا دینا حالانکہ شکر بھی ویسی ہی تھی جیسا تعویذ مگر شامت اعمال۔ جونہی گھر پہونچیں حضرت موجود تھے۔ !!! کیا ایسا بھی کوئی بزرگ ہوسکتا ہے جو صریحاً شرارتیں کرے اور مٹھائی اڑائے ؟ مگر خدا بہتر جانتا ہے صرف پاؤ بھر مٹھائی کی گنہگار رہوں ہوسکتا نادانستہ اور بھی غلطیاں ہوئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ آمین ثم آمین

قابل غور باتیں

- دوسروں کو اکثر معاف کر دیا کرو، لیکن اپنے کو کبھی نہیں!
  (سائرس)
- دوست کی نسبت دشمن کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہے
  (میڈیم ڈلہوزی)
- غلطی کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے اور معاف کر دینا ملکوتی عمل ہے۔
  (پوپ)
- ایسا شخص جو خود کسی اچھی بات پر عمل نہیں کرتا۔ لیکن دوسروں سے کہتا ہے کہ وہ عمل کریں، اس کی مثال اس اندھے شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہو، جس کی روشنی سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں علاوہ خود محروم رہتا ہے۔
  (افلاطون)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے۔ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو خبریں ۲۰ر کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے چھپتی ہیں ـــــــــــ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• طاہرہ تبسم اعظمی (راجہ پور۔ سکرور۔ اعظم گڑھ) میری بھابی عذرا بانو کو اللہ پاک نے دوسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اس کو عمر دراز بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• منیر اقسنیم (مدراس) میری تیسری بیٹی سعیدہ منور سلطانہ کو اللہ پاک نے ۱۰ر رمضان المبارک کی شام کو ۶ بجکر ۲۰ منٹ پر ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔ حریمی بہنیں کوئی اچھا سا نام تجویز فرمائیں۔

• بہن فاطمہ ملک صاحبہ (ڈبلو مڈرس۔ انگلینڈ) کی دختر نیک اختر تسنیم اختر سلمہا اور ہونہار عزیزی محمد افضل سلمہ کو اللہ پاک نے ۹ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔ (نسیم انہونوی)

پیغامات نشاط

• عزیزی اکبر جہاں سلمہا (دختر جناب منظور الزماں صاحب جلالی مرحوم و مغفور) مجھے بیٹی ہی کی طرح عزیز تھی اور ہے، اس لئے کہ میں اور منظور صاحب ہمیشہ ایک جان دو قالب رہے تھے۔ تو جیسے کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے جب ہم نے اکبر جہاں کو دلہن بنا کر عزیز میاں کے ساتھ رخصت کیا تھا، لیکن زمانہ کیسی تیزی سے بھاگ رہا ہے کہ ۲۱ر اگست ۱۹۸۳ء کو میں اکبر جہاں کی بیٹی نوشہ سلمہا یعنی اپنی نواسی کی شادی میں شرکت کرنے بمبئی گیا۔ عزیز الداور ان کی بہن مس ناہید بھی ہمراہ تھیں۔ عقد نکاح ہمراہ عزیزی محمد نعیم سلمہ (فرزند دلبند جناب محمد رفیع صاحب) نہایت سادگی کے ساتھ نواب ایاز مسجد بھنڈی بازار میں مابین عصر و مغرب ہوا۔ اس کے بعد دولہا سے تذارت اور دلہن کی رسم رونمائی المالطیفی ہال صابو صدیق۔ شیفر روڈ بائیکلہ بمبئی میں بحسن و خوبی عمل میں آئی جس میں اعزہ اقربا کے ساتھ ہی معززین نے بھی شرکت کی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ کوثر و نعیم باہم شیر و شکر بنکر شاد و خرم زندگی گذاریں۔ عزیز میاں سلمہ اور فرزندان منظور الزماں جلالی، منظفر، مناظر، بدر الزماں سلمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے متعلقین کو شادی مبارک ہو۔ (نسیم انہونوی)

• الیس عائشہ سلطانہ (میل وشارم) ہمارے مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا حافظ محمد طیب ربانی صاحب (فرزند مولانا الحاج نیر ربانی صاحب ایم۔ اے) کی شادی شکیلہ بانو (دختر نیک اختر ایس کے ہارون رشید صاحب) کے ہمراہ ۱۴ر اگست ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ صبح ۱۱ بجے بحسن و خوبی انجام پائی۔ محفل نکاح میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔

• ام سلمیٰ خلیل (آمبور) میری سہیلی فریدہ سلطانہ (نواسی احمد باشاہ مرحوم) کی شادی ہمراہ نذیر احمد (فرزند لوالی عبد الرشید صاحب) ۹ر اگست ۱۹۸۳ء کو چوک مسجد میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• اردو کے مشہور ناول نگار جناب مجاہد لکھنوی کی دختر نیک اختر تنویر فاطمہ کا عقد نکاح سید محمد نصیر سلمہ کے ہمراہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو رونق پیلس (شمالی ناظم آباد، کراچی) میں بحسن و خوبی عمل میں آیا۔

مجاہد صاحب عرصہ تک ہمارے ادارے سے وابستہ رہے تھے اور نسیم بکڈپو سے ان کے متعدد ناول شائع ہوئے تھے۔ مجاہد صاحب کو یہ رشتہ اب تک یاد ہے، اسی لئے مجھے اس پرمسرت تقریب میں شرکت کی دعوت دی لیکن افسوس کہ میں نہ جا سکا۔ بہرحال میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک تنویر فاطمہ سلمہا اور سید محمد نصیر سلمہ کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ مجاہد صاحب اور بیگم مجاہد کو مبارکباد دیتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• ساجدا ایچ شمس (گھر نوخال) ہماری خالہ ماہ سیما بانو صاحبہ (بنت نانا محترم محمد تہذیب صاحب، دھنباد) کی شادی ہمراہ محمد یوسف صاحب (پسر محمد یونس صاحب ساکن دھنباد) ۳۱ر جولائی ۱۹۸۳ء کو بمقام کلکتہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی نئی زندگی شاد و خرم گزارے۔

• مس رضوانہ، ریحانہ، فرزانہ کے رحمٰن، ریشمان، ردمانہ ہماری آنٹی جے شکیلہ ثمین (دختر جناب جے محمد اسحٰق) کی شادی ہمراہ ایچ محمد نور اللہ باشاہ بی کام کے ہمراہ ۲۴ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار بمقام مسجد قلعہ وانم باڑی بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• ایم کاظم خاں صاحب (کسان ٹیوب کمپنی۔ کسان پائپ اسٹور۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ) نے اپنے صاحبزادے فہیم سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو جناب شعور ملیح آبادی کی صاحبزادی کے ہمراہ ہوئی) ایک شاندار دعوت ولیمہ بارہ دری قیصر باغ میں ۴ راکتوبر کی شب میں دی، جس میں کاظم صاحب کے اعزہ اقربا اور معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• شاذیہ آفریں اشرفینہ (آمبور) ہماری پھوپھی زاد بہن گلریز پروین (دختر جناب عبدالحق صاحب) کی شادی محمد یوسف (فرزند جناب عبدالحمید مرحوم) کے ہمراہ ۱۳ر جولائی ۸۳ء کو محمد پورہ مسجد میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و خرم رکھے۔

• طاہرہ ترنم سلمہا (دختر جناب ورسلا محمد باشاہ مرحوم) کا عقد نکاح ہمراہ کے سعد اللہ باشاہ سلمہٗ (فرزند ارجمند کے عبدالصمد صاحب مرحوم۔ برنام بٹ) ۲۵ر ستمبر ۸۳ء کو ۱۲ بجے دن میں بمقام آمبور انجام پایا۔ اللہ مبارک کر۔۔

(نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• اس خبر سے بیحد افسوس ہوا کہ جناب مظہرالحق علوی کے والد محترم سید غلام محی الدین علوی صاحب ایک معمولی علالت کے بعد ۲ را ور ۳ ر ستمبر کی درمیانی شب میں صبح ۵ بجے اس دار فانی سے اپنے مکان مسکونہ واقع خان پور سید واڑہ احمد آباد میں، رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مظہرالحق علوی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ انتقال کے وقت مرحوم کے تمام قریبی متعلقین پاس ہی موجود تھے۔ آخری وقت اللہ اللہ اکبر کا ورد کر رہے تھے۔

مرحوم ایک بزرگ صفت انسان تھے۔ راقم الحروف کو کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑے نیک نفس مخلص اور مہماں نواز تھے۔ میرے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے، جیسے کہ میں بھی ان کا ایک بیٹا تھا۔ (نسیم انہونوی)

• ۱۱ ستمبر کی صبح، اچانک ہی یہ خبر ملی کہ محترم قسیم الدین صاحب رٹائرڈ جج (لکھنؤ) کی اہلیہ محترمہ ۱۰ ر ۱۱ ر ستمبر ۸۳ء کی شب میں گولہ گنج اسپتال لکھنؤ میں انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی نیک، ملنسار، خلیق اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مرحومہ میرے سمدھی ڈاکٹر نورالحسن صاحب سابق ہیڈ آف اردو ڈپارٹمنٹ لکھنؤ یونی ورسٹی کی شریک حیات سرور فاطمہ صاحبہ کی قریبی عزیز تھیں۔ ماضی قریب ہی میں ان کی بیٹی کی شادی ڈاکٹر نورالحسن صاحب کے صاحبزادے ظفر سلمہ کے ساتھ ہوئی تھی نماز جنازہ لکھنؤ میں جناب شمس لکھنوی نے پڑھائی۔ میت دیوہ شریف لے جائی گئی جہاں مرحومہ کو خاندانی قبرستان میں ۱۱ر ستمبر کی شام کو سپرد خاک کیا گیا۔ (نسیم انہونوی)

بمبئی سے ۲ر ستمبر کو واپسی پر یہ دلخراش خبر اخبار میں پڑھی کہ انگریزی کے کہنہ مشق جرنلسٹ جناب دلاور حسین صاحب کا میڈیکل کالج لکھنؤ میں ۲۸ر اگست ۸۳ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم میرے مخلص ترین ملنے والوں میں تھے۔ بڑے خوش مزاج اور دوست نواز تھے۔ لکھنؤ میں انھیں بڑی ہر دل عزیزی حاصل تھی۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• [illegible] راجہ پور نرور بافسوس صد افسوس کہ میرے ابا جناب حاجی حافظ ظہیرالدین ۱۲ر جولائی ۸۳ء بروز جمعہ ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر گئے۔ مرحوم بڑے متقی، پرہیزگار تھے۔ مرحوم کے وارثین میں میری والدہ، میں اور بہن روشن جہاں سلمہا کو چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ایم۔ ایل شاہد احمد (و انمباڑی) افسوس صد افسوس کہ میری ہر دل عزیز پیاری بہن حسنی جبیں ۲۴ر جولائی ۸۳ء کو اللہ کو پیاری ہوگئی۔ مرحومہ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی ابھی شادی بھی نہ ہوئی تھی۔ ہائے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مرحومہ بڑی پابند صوم و صلوٰۃ تھی۔ چند پاروں کی حافظہ ہوگئی تھی اتنی ہنس مکھ، ملنسار اور خلیق تھی کہ اس کی موت پر اپنے تو اپنے غیر بھی رو رہے تھے۔ یہ حادثہ ہمارے گھر کے لئے بیحد المناک ہے اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں صبر کی توفیق عطا فرمائے اور میری بہن مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ بخشے۔

(خبر پڑھ کر بیحد افسوس ہوا! اس عمر میں کسی کا انتقال ایک ایسا المیہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کے دل بھی بھر آتے ہیں۔ میں بھی مرحومہ کی بخشش کے لئے دعا کروں گا۔ (نسیم انہونوی)

• منیر تسنیم (مدراس) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری والدہ محترمہ میر بدر النساء صاحبہ ۷ر اگست ۸۳ء کو شام کے چھ بجکر چالیس منٹ پر رحلت فرما گئیں، مرحومہ کی عمر ۵۷ سال تھی، کمزوری کے

سوا کوئی اور مرض نہ تھا مرحومہ بڑی صابر بڑی تھیں۔ نہ اپنوں ہی کو نہیں سوتیلوں کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آتی تھیں۔ نماز روزہ کی پابند تھیں۔ خوش اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ جو ایک بار مل لیتا، بار بار ملتا۔ اللہ سے دعا ہے ہم چار بہنوں اور دونوں بھائیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

• افسوس صد افسوس کہ میرے سسر محترم وکیل احمد صاحب ۲۳ جولائی ۱۹۸۳ء بروز سہ شنبہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ۱۷ جولائی کو قلبی دورہ پڑا۔ ۲۳ کو پیس میکر لگاتے وقت تین قلبی دورے پڑے اور ہم سب سے منہ موڑ لیا اپنی یادگار، بیوہ، تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اللہ پاک انھیں صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (نکہت رفیق کلکتہ)

• منظور، مسرور، مبرور (آمبور) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہماری نانی اماں، محترمہ اے۔ جے۔ سلمیٰ بی صاحبہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۳ء بروز جمعہ بوقت ½ ۹ بجے دن رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی نیک اطوار بزرگ تھیں۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• حریم کی آخری کاپی پریس جا رہی تھی کہ مسرار مسعود صاحب کے خط سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ حریم کی قدیم پرستار (بہن رضیہ محسن، بھوپال) کے شوہر جناب محسن صاحب کا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۳ء کو انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ چند ہی ماہ قبل میں بھوپال گیا تھا تو (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تھی۔

محسن صاحب ایک زمانے میں پالیٹکس سے وابستہ تھے۔ پھر ٹکسٹ بک بورڈ کے سکریٹری ہوئے۔ اس کے بعد اعزازی طور پر ۱۹۸۰ء سے اردو اکاڈمی کے سکریٹری کی حیثیت سے عرصہ تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ فالج کے اثر سے پریشان تھے۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بہن رضیہ اور دوسرے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (منجانب حریم ۔ سید مہر اوقی)

• ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا، کیا تمہاری بیوی کا پارہ بھی چڑھتا اترتا رہتا ہے۔

دوست نے آہ بھر کر کہا وہ چڑھتا ہی ہے، اترتا نہیں۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ پاکیزہ اور موزوں ہو۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ نومبر کے لئے عنوان ہے "قمر" اور دسمبر کے لئے "نفرت"۔ جو اشعار شائع ہونے والے ماہ کے حریم سے پہلے والے مہینے کی ۲۰ تک وصول نہیں ہوتے، شائع نہیں کئے جاتے۔

• 483، آپ نے تین شعر بھیجے، تینوں غلط تھے۔ • 9232 شعر ناموزوں تھا۔

• 726: شعر بالکل ناموزوں تھا۔

تعریف کیا لکھوں میں رسالت مآب کی
آتی تھی ان کے جسم سے خوشبو گلاب کی

مرسلہ: عصمت آرا (بالنگا)

جو تو ہنسے تو چمن میں گلاب جھوم اٹھے
ستارے رقص کریں ماہتاب جھوم اٹھے

مرسلہ: نیلوفر فردوس حکیم حافظ عزمی (جبتول)

سنگین حادثوں پہ بھی ہنستی رہی حیات
پتھر پہ اک گلاب ہمیشہ کھلا رہا

مرسلہ۔ ٹی عظمت فاروق (آمبور)

شفق کا رنگ کہوں یا کہ آفتاب کہوں
اچھوتا نور کہ کھلتا ہوا گلاب کہوں

مرسلہ: دلشاد ریحانہ (حرکھاری)

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مرسلہ: ناز (الیت محل)
مرسلہ: کشور سلطان (لال باغ۔ لکھنؤ)

اب تو ہر سمت کھلے ہیں تری یادوں کے گلاب
دل کے ویرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے

مرسلہ: امروز جہاں (آرہ)

ملے جو بس کبھی دل کو اس کے ہاتھوں کا
تو زخم زخم کو میرے گلاب کر دے گا

مرسلہ: خالدہ بلند (لہسلہ)

ہوئے ہنستی بولتی تھیں۔ میرے کام کر دیتی تھیں۔ راتوں کو میں بیٹھا پڑھتا تو چائے بنا لاتی تھیں۔ میرا کمرہ ٹھیک کرتی تھیں۔ مگر اب تو جیسے سارا ہی پلٹ گیا ہے۔ میرے سامنے تک سے ہٹ جاتی ہو۔ اگر تم نے اپنا منہ لٹکائے رکھا تو پھر دیکھنا کہ میں امی سے یقیناً تمھاری شکایت کر دوں گا۔"

اس کے بول میں بینا کی آواز گونج رہی تھی۔ اور وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ سادگی کی تہہ میں کوئی معنی خیز پُرکاری ہے۔ وہ چپ رہی۔

"ہر دل شکایت۔!" معتصم نے جھلا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"کیا جی ہاں۔!"

"آپ کے کام بھی کرنا ہیں۔ کر دیا کروں گی۔!" وہ بولی۔

"اور سنو۔ دیکھو میری طرف۔ میں اتنا برا بھی نہیں کہ تمھاری نظروں کو ٹھیس پہنچے۔ ادھر۔ سر اٹھاؤ۔!"

لیکن اسی وقت علوی صاحب کے کمرے سے فلک شگاف چھینک کی آواز سنائی دی۔ معتصم اچھل پڑے۔ ردمہ کے لبوں سے ایک بے ساختہ ہنسی نکل گئی اور پھر وہ گرتی پڑتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

علوی صاحب اپنے ملازم کو پکار رہے تھے: "ارے میاں غفور سے بیٹھے ہو کر نہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ تھوڑا سا پانی گرم کیا وضو کے لیے۔ بلا سا ہو رہا ہے۔" وہ پھر چھینکے۔

معتصم نے بے ساختہ ہنسی ضبط کی۔ ابا جان۔ واقعی اس وقت آپ نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ورنہ بڑی مشکل سے تو میں نے زبان کھلوائی تھی۔ پھر

اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔! بینا ہنس پڑی!

ردمہ نے علوی صاحب ہی کے گھر میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اسی آنگن میں گھٹنیوں چلی تھی۔ یہیں چھوٹی سے بڑی ہوئی تھی اور یہیں اپنے ابا اور چھوٹے بھائی کو کھویا تھا۔ علوی صاحب اسے اپنی بچی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے۔ اس کی چھوٹی بڑی تمام ضرورتیں بیگم علوی پوری کرتی تھیں۔ بینا سے زیادہ وہ اسے چاہتی تھی کیونکہ دونوں ایک آدھ دن کے فصل سے پیدا ہوئی تھیں۔ اور بینا کو بھی شیخ صاحب کی بیوی نے اپنی گود میں پالا تھا۔ جبکہ بیگم علوی بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ غرض یہ کہ اس سے سب اچھا سلوک کرتے تھے۔

لیکن ردمہ کا عجیب حال تھا۔ بچپن ہی سے وہ سوچتی آئی تھی۔ اگر یہ اس کے بھائی بہن ہیں تو پھر ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ وہ اپنی اماں کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں سوتی تھی۔ اور دوسرے بڑے بڑے کمروں میں آرام دہ بستروں پر۔ جیسے جیسے شعور پختہ ہوتا گیا۔ یہ فرق واضح ہو کے اسے اداس کرتا گیا۔

ان مہربانوں کا رحم و کرم لاکھ باور کراتا رہے کہ وہ خادمہ نہیں ہے وہ ہمیشہ افسردہ رہتی۔ وہ ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ بنا وہ لوگ

اسے بالکل اپنی طرف لے آئے۔ تب تو وہ اور بھی گم صم ہوگئی۔ اپنی حقیقت
اسے معلوم تھی۔ اس نے سب کی خدمت پر کمر باندھ لی۔ منہ سے کچھ نکلتا۔ کچھ
کہہ کر کسی کو دکھ پہونچانا اسے منظور نہیں تھا۔ نینا سے اسے بے حد محبت تھی۔ سب
ہی اسے پسند کرتے تھے۔ رضا کو وہ نینا کی طرح بھائی جان کہتی تھی۔ سلمیٰ کو
بھابی کہہ کے پکارتی تھی۔ اور عصمی بھیا تو اسے شروع ہی سے پسند تھے۔ ان کی
خوش مزاجی اور بذلہ سنجی اسے اپنے دکھوں کے گہرے غار سے باہر کھینچ لاتی تھی
جب وہ امریکہ گئے تب وہ چھپ چھپ کر کتنا روئی تھی۔

اسی خاندان کی ایک فرد باجی جان بھی تو تھیں۔ انھوں نے سب سے
مختلف مزاج پایا تھا۔ اپنی صورت شکل کا انھیں بڑا غرور تھا۔ وہ اپنے ہی
بہن بھائیوں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں کبھی کبھار تو ان کو بھی گستاخانہ
جواب دے نکلتیں۔ پھر جب ان کی شادی ایک معزز میجر سے ہوگئی تب
تو ان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ کسی کو منہ لگانا پسند ہی نہ کرتی تھیں۔
رومہ کو بھی ہمیشہ ایک کمترا اور حقیر خادمہ سمجھا تھا۔ اسے کبھی مارا تھا کبھی
جھڑکیاں دی تھیں۔ رومہ ہمیشہ ان سے ڈرتی رہتی تھی۔ ایسا نہ ہو کر
کہیں کسی بات پر بگڑ کر وہی چیز منہ پر دے ماریں جو ہاتھ میں ہو۔!
ان سے سبھی لوگ چوکنا رہتے تھے۔ بڑے بھی اور چھوٹے بھی۔

سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتبار اسے نینا پر تھا!۔

رومہ کو کچھ زیادہ مبہوت اور دم بخود دیکھ کر اس رات نینا نے
وجہ پوچھی۔

دونوں نیچے قالین پر دری ڈالے ترچھی ترچھی لیٹی تھیں۔ کمرے میں
خواب آور نیلگوں بلب ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اور برآمدے

"سمجھائیے مجھے کوئی بات۔ میں بالکل کودن ہوں!"

"دیکھیے۔ اس طرح باتیں کرنا کوئی اچھی چیز نہیں۔ ابھی ابا جان نماز کے
لیے اٹھتے ہوں گے۔!"

تو کیا؟ وہ کسی طرح سمجھ کے دے ہی نہیں رہے تھے۔ یا پھر رومہ کی بوکھلاہٹ
سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بس میں جاتی ہوں: وہ گھبرا گئی۔

میں آپ کو آواز دوں گا۔ اور سناٹے میں میری آواز لاؤڈ اسپیکر کی
طرح گرج اٹھے گی۔ سمجھیں آپ؟"

مگر کیوں۔!" وہ حیران حیران سی انھیں تکنے لگی۔ مگر معتصم کے لبوں پر
ایسی دلفریب اور معنی خیز مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی کہ یکبارگی سرخ ہو
کر اس نے نظریں جھکا لیں۔!

"دن کو تو آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا" معتصم نے
کہا: آپ نظر ہی نہیں آتیں۔ گھر بھر کی خاطر آپ کو عزیز ہے۔ اور میرے
ناچیز وجود کو آپ اس طرح نظر انداز کر دیتی ہیں۔ جیسے میں خدانخواستہ ابھی
پیدا بھی نہیں ہوا ہوں۔ معلوم ہے۔ اس طرح میری کتنی توہین ہوتی ہے؟
آپ تو بجانے۔!"

ہاں۔ میں نہ جانے کیا بکواس کرنے لگا ہوں: وہ بڑی معصومیت سے
خفا ہو گئے: اچھی بات ہے۔ کسی دن میں آپ کو اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ میں
میں۔!" وہ ہکلانے لگے۔

"میں بس یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے باتیں کرو۔ آخر کار وہ بولے:
تین سال کے عرصہ میں میں کوئی غیر تو نہیں ہو گیا۔ پہلے تو تم آ جاتی تھیں کے

... جیسے۔ آپ لوا ں
طرح خاموش اور حیران ہیں۔ جیسے آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہو۔"

رومہ کا دل جسم کے ہر حصے میں بج رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے۔ اور اسے وہ سب باتیں یاد آ رہی تھیں جو نینا نے اس سے کہی تھیں آخر یہ اس سے چاہتے کیا ہیں؟ مانا کہ وہ پہلی بار اسے نہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن زمانہ بدل بھی تو گیا تھا۔ تین چار سال کا وقفہ جو پوری اجنبیت اور بے خبری میں گزر رہا تھا۔ تین چار منٹ میں کیونکر سمٹ آتا؟۔

"رومہ۔" ایک پیار بھری گنگناہٹ اس کے کانوں میں گونجی۔ دوسرے لمحے انھوں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

رومہ کی ایسی کیفیت تھی جیسے وہ طوفانی سمندر کی ایک بپھری ہوئی لہر میں بہہ رہی تھی۔ اپنے گرد و پیش کا احساس اسے ایک دھندلے خواب سے بڑھ کر نہ تھا۔

معتصم بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے: "مجھ سے باتیں کیجیے۔ میں صرف آپ کو دیکھنے آیا ہوں۔ اپنا چہرہ اٹھائیے آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ میں آپ کے لیے کوئی نیا آدمی ہوں؟"

رومہ بدحواس تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بکھرتی ہوئی ہمت اکٹھا کی اور کہا: "خدا کے واسطے مجھ پر رحم کیجیے۔ یہاں سے چلے جائیے۔"

"کیوں چلا جاؤں؟" معتصم کی ہمت بڑھ گئی: "کیا آپ سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یا پھر میں اس قابل نہیں ہوں؟"

"کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟" رومہ کو ان کی جانی بوجھی پر حیرت رہی تھی۔!

کے پیچھے سے آنے والی چنبیلی کی مہک نے کمرے کا ماحول زیادہ فسوں انگیز بنا دی تھی!

"بہت گم صم رہنے لگی ہو۔" نینا بولی: "کوئی ایسی بات ہے۔ جو مجھ سے چھپانے والی ہے۔ کیوں۔؟"

نینا کے پاس معتصم کے دیے ہوئے کنگن تھے۔ مگر وہ ابھی تک رومہ کو دینے کا کوئی جواز اور موقعہ نہیں تلاش کر سکی تھی۔

"نہیں تو۔" رومہ نے کہا۔ "سر میں درد تھا صبح سے۔!"

"تو پھر بوا اماں کے ساتھ ملکر چولھے کے پاس کام کیوں کیا تھا۔؟"

"بے چاری اکیلی ہوتی ہیں نا۔ گھبرا جاتی ہیں۔ اور پھر مجھ سے بیکار نہیں بیٹھا جاتا۔" رومہ نے بہانہ بنا دیا۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں کھانا نہیں کھاتی۔ گھاس کھاتی ہوں۔ اور تم مجھے الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔" نینا بگڑنے لگی: "ادھر مڑو میری طرف۔ دیکھو مجھے۔"

رومہ نے ہنستے ہوئے اس کی طرف کروٹ لے لی۔

"یا اللہ۔ رومہ۔ اس مدھم سی روشنی میں تم کتنی پیاری لگ رہی ہو۔" نینا بولی۔ اس کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر معتصم کی گفتگو گونجی اور وہ کھو سی گئی۔

"کہو۔ کیا کہہ رہی تھیں۔" رومہ نے اسے متوجہ کیا: "میرا حسن تو تم نے دیکھ لیا۔!"

نینا مسکرائی: "میں سب سمجھتی ہوں۔ رومہ۔ تم باجی جان کی وجہ سے پریشان ہو۔ مگر تم گھبراؤ نہیں۔ کوئی تمھارے سلسلے میں بے انصافی نہیں کرے گا۔"

ایک بات کہوں ؟ ۔

ہاں ۔ !

مگر تمھاری ایک عادت بہت بری ہے ۔ تم ہماری مخلصانہ باتوں کو سن کر بھی پریشان ہو جاتی ہو ۔ اعتبار نہیں کرتیں ۔ !

ایسی کوئی بات نہیں ہے نینا ۔

تو پھر کہوں ۔ ؟

کہو !

اور تب نینا نے بڑے مدھم لہجے میں وہ سب باتیں کہہ دیں جو اس کے اور معتصم کے درمیان ہوئی تھیں ۔ یہ تک کہہ دیا کہ معتصم صرف اسی کی وجہ سے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کے واپس آ گئے تھے ۔ نینا نے اپنی طرف سے بھی کافی مرچ مصالحہ اور کلی پھندنے لگا دیے ۔۔۔ بڑے موثر لہجے میں کہا کہ عظمی بھیا کو تمھاری فکر سونے نہیں دیتی ۔

رومہ تو پہلے ہی کوئی ڈھکا چھپا روگ لگائے بیٹھی تھی معتصم نے اس کی نیندیں بھی چھین لی تھیں ۔ ان کا ہنستا ہوا چہرہ اسے لمحہ بھر بھی نہیں بھولتا تھا ۔ ان کی پیاری دلکش آواز اس کے دل میں گونجا کرتی ۔ جب تک وہ گھر میں رہتے ۔ وہ روحانی طور پر ان کے ساتھ ساتھ پھرا کرتی اور اگر وہ باہر چلے جاتے تو یوں لگتا جیسے وہ اس کا دل اپنے ساتھ لے کے چلے گئے ہوں عجیب سی بھولی بھٹکی ہو جاتی ۔ اسے خدشہ بھی رہتا کہ کہیں کوئی اس کی کیفیت بھانپ نہ لے ۔ اور خود کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ زیادہ بوکھلا گئی ۔

نینا کی باتوں نے اسے سکتہ زدہ کر دیا ۔ تو کیا معتصم بھی وہی سب کچھ

جنت مجسم رومہ کا روپ دھارے کھڑی تھی ۔ ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور ہتھیلیاں پسیجنے لگیں ۔ انھوں نے سگریٹ نیچے پھینک دیا ۔ اور سانس روکے اسے دیکھنے لگے ۔ !

پھر کیوں آئی ہے یہاں ۔ یہ کیوں نہ سوگئی ۔ ؟ انھوں نے بے چینی سے پوچھا ۔ اور پھر اس کے قرب کی ہیجان انگیز خواہش کو کچل نہ سکے ! بڑی آہستگی سے دروازہ سرکایا ۔ اور کسی قسم کی آہٹ یا آواز پیدا کیے بغیر اس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے ۔ !

کلائی کی گھڑی ڈھائی بجا رہی تھی ! ۔ قرب و جوار میں بھی کوئی آدم نہ آدم زاد ذی روح موجود نہیں تھا ۔ ہر طرف رات کے مخصوص سناٹے کی حکمرانی تھی ! ۔

ویسے علوی صاحب اکثر تہجد کی نماز کے لیے اٹھتے تھے ۔ لیکن ان کے جاگنے میں بھی دیر تھی ! ۔

معتصم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں ۔ برآمدے میں کھلنے والے سب دروازے بند تھے ۔ !

رومہ کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ۔ وہ چونک کر مڑی ، بصارت کو دھوکا نہیں ہوا تھا ۔ وہ اس کے سامنے کھڑے تھے ! ۔ دھندلی چاندنی میں ملفوف کسی ہیولے کی طرح ۔ !

اور بس وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی ۔ دماغ سن ہو گیا تھا ۔ طاقت گویائی بھی مردہ ہو چکی تھی ! ۔

وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے ۔ ہمیشہ کی طرح سفید لباس میں ملبوس ، ڈھیر بھر سیاہ ریشمی بال کندھوں پر بکھر گئے تھے ! ۔ آنکھوں میں وحشی ہرنی کا سا خوف ، اور کپکپاتے ہوئے نازک نازک سے لب

کے ساتھ گھوما کرتیں اور غالباً انھوں نے بے چارے ایک وکیل کے معمولی سے لڑکے کو کبھی بھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ یہ تو غالباً ان کی امارت و دولت پر علانیہ نہ سہی ڈھکے چھپے ہی سہی۔ بیگم علوی لٹو ہوئی تھیں۔ سنا تھا کہ الماس کے بڑے بھائی جو خلیجی ملک جا چکے تھے۔ اور وہاں ایرلائنس میں منسلک تھے وہ ہر ماہ کافی بڑی رقم والد صاحب کو بھجواتے رہتے تھے۔ اب ان کے گھر کا رہن سہن بھی بدل چکا تھا۔ الماس کے والد خود بھی ریلوے کنٹریکٹر تھے اور کافی امیر آدمی تھے۔ انھیں آزاد خیال اور منھ زور صاحبزادی کے لیے ایسا لڑکا درکار تھا جو بالکل بیل ہو۔ زبان نہ کھول سکتا ہو۔ اس کا نیاز مند بن کر رہے۔ اس مرحلہ پر ان کی نظر معتصم پر پڑی۔ بہن کا لڑکا تھا۔ جانا بوجھا۔ اس کا مستقبل غیر یقینی نہ تھا۔ اور انھیں اندازہ تھا کہ معتصم کی امی ہرگز انکار نہ کریں گی۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔ بیٹی کو خادم نما شوہر ملتا اور شوہر کو معقول دولت و ثروت۔ لہٰذا جب یونہی روا روی میں بیگم علوی نے الماس کا رشتہ مانگا۔ فوری بھائی صاحب نے حامی بھر لی۔ پھر معتصم باہر چلے گئے اور بات دب گئی۔ لیکن ان کی واپسی کے بعد پھر یہ پرانا مسئلہ بیدار ہو گیا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا۔ بیگم علوی جلدی سے الماس کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھیں انتظار تھا صرف باجی جان رضوانہ بیگم کا۔ اور وہ اپنے مقام سے غالباً چل پڑی تھیں۔

یہ سب سوچتے سوچتے معتصم بور ہو رہے تھے۔ نیندیں تو غائب ہو ہی چکی تھیں۔ دیر سے کھڑے سگریٹ پی پی کر اپنے خیالات کو دھوئیں میں تحلیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ تبھی انھوں نے آہٹ سنی۔ اور کمین کی دراز سے جھانکا۔ سامنے نظروں کی

سوچ رہے تھے۔ جو وہ سوچ رہی تھی۔!

کچھ دیر اس پر سناٹا چھایا رہا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور بے حد غیر اہم لہجے میں بولی۔

"انھوں نے تم سے مذاق کیا ہوگا نینا۔ بھلا میری وجہ سے اپنی اتنی اہم تعلیم ختم کرکے واپس آجاتے؟ وہ تو یونہی تم سے ہنستے بولتے ہیں۔ تم کو بیوقوف بنایا۔ تم بن گئیں۔!"

نینا حیران رہ گئی: "ہاں۔ ہو تو سکتا ہے۔ وہ تبھی ہنس رہے تھے۔ مگر پھر وہ کنگن۔؟"

"ہمیشہ سے میرا خیال کرتے رہے ہیں۔" رومہ بھی ہنس دی: "جیسے دوسری چیزیں تم سب کے لیے لائے ہیں۔ میرے لیے بھی لیتے آئے۔ بس۔"

"لاؤں۔ دیکھوگی!"

رومہ اپنا اشتیاق چھپا نہ سکی!۔

نینا نے اٹھ کر الماری سے کنگن نکالے اور اسے دے دیے۔ مدھم سی روشنی میں نگینے دمک اٹھے۔ رومہ کے سارے جسم سے پسینہ بہنے لگا دیر تک منھ سے آواز نہ نکل سکی۔

"اب انھیں پہن لو۔" نینا کہہ رہی تھی: "عصمی بھیا کو بھی تو معلوم ہو کہ ان کا نذرانہ سوارت ہوا... میں پہنا دوں؟"

"ابھی نہیں۔!" وہ ہولے سے بولی۔

"پھر کب؟" نینا خفا ہونے لگی۔

"تم سمجھی نہیں۔ نینا۔ اماں اور باجی جان نے اگر مجھ سے پوچھ لیا کہ یہ کہاں سے لائی ہو تو پھر میں کیا جواب دوں گی۔ ابھی ٹھہر جاؤ۔!"

عصمی بھیا نے تو کہا تھا کہ اگر امی یا کوئی اور دریافت کرے تو میں کہہ دوں کہ میں لائی ہوں۔" نینا نے کہا۔

نہیں نینا مجھے ڈر لگتا ہے۔" رومہ تو کسی اور عالم میں تھی۔ "ابھی انھیں اپنے پاس رکھو۔ اتنی قیمتی چیز میرے تمھارے خریدنے کی نہیں ہے۔ جب باجی جان آ کے واپس چلی جائیں تو پھر پہن لوں گی۔ سچ پوچھو تو مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ تمھیں یاد نہیں ہے۔ تم نے اپنا ایک نیا شرٹ مجھے پہنا دیا تھا۔ اس کا رنگ تمھیں پسند نہیں تھا۔ اور وہ۔ باجی جان نے زبردستی میرے بدن سے اترا لیا تھا۔"

ہاں۔" نینا اداس ہو گئی۔ "جب کبھی وہ واقعہ یاد آتا ہے۔ مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ پتہ نہیں۔ باجی جان کے خیالات اتنے نیچے کیسے ہو گئے۔ سچ ہے۔ آدمی کے پاس اگر حد سے زیادہ دولت آجاتی ہے تو وہ بڑا ہونے کی بجائے چھوٹا ہو جاتا ہے۔ خیر۔ پھر سہی۔ انھیں رکھ تو لو۔!"

میری بہن۔ انھیں تم ہی رکھو۔ میں پھر کبھی تم سے لے لوں گی۔" اگر عصمی بھیا نے پوچھا تو۔

جو جی چاہے کہہ دینا۔ مگر باجی جان کا تذکرہ نہ آنے پائے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میری وجہ سے وہ کہیں باجی جان سے نہ الجھ پڑیں۔!"

کہہ تو رہے تھے کہ اگر باجی جان نے کوئی زیادتی تم سے کی تو پھر وہ صبر نہ کر سکیں گے۔" نینا نے کہا۔

نہیں نہیں۔" رومہ گھبرا گئی۔ "تم ان سے کہہ دو۔ نینا۔ باجی جان سے وہ کچھ نہ کہیں۔ اس طرح میری پریشانی دونی ہو جائے گی۔!"

شاید آج ہی کل میں باجی جان تشریف لے آئیں۔" نینا براسا

نے پوچھا۔ "سچ مچ بڑی اچھی ہے۔"

"مجھے تو اس کا رنگ قدرے مدھم لگا تھا۔" رضا نے بے ساختہ کہہ دیا۔ اور فوراً نچلا لب دانتوں میں دبا لیا کیونکہ بیگم علوی بھی فوراً ہی بول پڑی تھیں۔

"میاں قسمت والے ہو کہ تمھیں عکھن سی گڑیا مل گئی ہے۔ اب تو تمھیں ساری دنیا ہی کلوٹی نظر آئے گی۔ لو اور سنو۔ رنگ مدھم ہے۔ ایسا بھی مدھم نہیں کہ برا لگے۔ شادی کے بعد رنگ یوں بھی نکھر آتا ہے۔!"

جی ہاں۔ جی ہاں۔" رضا نے فوراً تائید کی اور نظریں بچا کر سلمیٰ کو دیکھا وہ مسکرا رہی تھیں۔

"امی میں تو کہتی ہوں کہ باجی جان کے تشریف لانے کے بعد جھٹ پٹ بات پکی کر کے بس آپ دوسری بہو لے ہی آئیے۔ پھر جانے باجی جان کب آئیں گی۔ کیوں امی کسی غیر گھر کی لڑکی تو لانا ہے نہیں۔ بڑے ماموں جان فوری آپ کی بات مان لیں گے۔"

اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" بیگم بولیں۔ "پہلے رضوانہ آتو جائے۔!"

اور اس طرح معتصم کا رہا سہا چین و قرار بھی سکرات میں مبتلا ہو گیا تھا کتنا بڑا غضب ہو جائے گا اگر خدانخواستہ الماس صاحبہ سے رشتہ طے ہو جائے گا۔ الماس کو انھوں نے بارہا دیکھا تھا۔ حقیقی ماموں کی لڑکی تھی۔ لیکن معتصم نے کبھی اسے ان نظروں سے نہیں دیکھا کہ وہ ان کی بیوی بھی بنے گی۔ انھیں بے باک، ترقی پسند اور فیشن پرست لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں ایسی لڑکیاں بیوی بن کر شوہر کا گھر سجانے سے زیادہ خود کو سجانے سنوارنے زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔ اور محترمہ الماس تو چلتی پھرتی شوگرل تھیں۔ کبھی انھوں نے غرور کی اونچی کرسی سے نیچے قدم نہ اتارا تھا۔ باپ کی لمبی سی کار میں شوفر

منہ بنا کر بولیں ۔

باتیں کرتے کرتے نینا سوگئی لیکن رمعہ کی نیند اُڑ چکی تھی۔ وہ دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ اور نجانے کیسے کیسے خیالات بگولوں کی طرح دماغ میں چکرا رہے تھے ۔

اس کی دھندلی نظریں کنگنوں پر پڑیں۔ اور وہ بیک وقت ہنسنے بھی لگی رو بھی پڑی ۔

مجبور محبت سے بڑھ کر ستم انگیز چیز اور کون سی ہوتی ہے۔ وہ جذبے جو دو دھاری نشتر کی طرح دل کی رگیں اندر اندر کاٹتی چلی جائیں آدمی جس حقیقت کو قبول نہ کر سکے۔ اسے جھٹلا بھی نہ سکے۔ اسے قبول بھی نہ کر سکے۔ تو پھر کیا کرے ۔؟ ۔

رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ ہر طرف عجیب سا غیر ارضی سکوت چھایا ہوا تھا۔ جیسے درخت سو چکے ہوں۔ ہوائیں مردہ ہو چکی ہوں۔ اور اب اس گھاگھمی کی دنیا میں کوئی متحرک ذی روح باقی نہ ہو۔ صبح کبھی نہ ہوگی۔ بس یہ نکردن بھری رات سر پر مسلط رہے گی ۔

نینا ہر فکر و غم سے آزاد بے خبر سو رہی تھی۔ اور ایک بلی کی طرح چپکے چپکے خراٹے بھی لے رہی تھی ۔

محبت دل کا سب سے بڑا روگ ہے ۔

نینا نے کروٹ بدلی اور رمعہ کے تکلیف دہ خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔ وہ اٹھی اور چپکے سے برآمدے میں جھانکا۔ یہ ایک طویل گھومتا ہوا برآمدہ تھا اور تقریباً باہر کے سارے کمروں کے سامنے سے گزرتا تھا۔ بیچ میں شیڈ کھڑا کر کے اس میں ٹین کا معمولی سا دروازہ لگا دیا گیا۔ اگر کوئی

لیں: اباجان۔ کیا اس بے چاری کے لیے وقت کا کھانا ہی نہ نکلے گیا۔ مجھے تو بے حد ارمان ہے۔ میری زیورانی جلد آئے ۔"

اچانک بیگم علوی پھٹ پڑیں: "ہمیشہ مجھے طعنے دیتے ہیں۔ کیوں جی ۔ میں نے بہوؤں کے سلسلے میں کب ان کے پیسے پر نگاہ رکھی تھی۔ خدا خدا کر کے پاس ہی تو آئی ہے۔ پوچھ لیجیے سلمیٰ سے۔ ایک کانی کوڑی اگر میں نے لی ہو اس کے ابا سے۔ اب کیوں بڑے بھائی کے سامنے جھولی پھیلا کے کھڑی ہو جاؤں گی!"

علوی صاحب کچھ کھسیا گئے: "میں پوچھتا ہوں۔ تم چھوٹے سے مذاق کا اتنا برا کیوں مانتی ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔ نہ کہوں گا اب میں کچھ۔ جو چاہو کرو بھائی ایک شرمناک قانون سا چل نکلا ہے کہ لڑکی والوں سے رقم ضرور [illegible] جائے۔ سو میں نے ایک بات کہہ دی تھی۔ انھوں نے اس کا بتنگڑ بنا ڈالا۔"

"آپ اپنے قانون دفعات اور بحثیں مجھ پر نہ انڈیلا کیجیے۔" وہ خاصی خفا تھیں۔

"اچھا لو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" علوی صاحب بھی گرم ہو گئے۔ "امی کیا باجی جان نے کچھ لکھا تھا کہ ان کے آنے کے بعد عظمی بھیا سے بات چیت چلے گی؟" جلدی سے سلمیٰ نے میاں بیوی کی جھڑپ ختم کی۔

"اے بی بی لکھتی ہی رہتی ہے۔" بیگم علوی بولیں: "اسے کیا آرزو نہیں ہے۔ وہ تو نگوڑی تمہاری ہی شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی۔ اتنی دور جا بیٹھی ہے کہ جلدی جلدی آ بھی نہیں سکتی!"

"بڑے ماموں کی منجھلی لڑکی الماس ہی سے بات ہوگی نا امی۔؟" سلمیٰ

چاہتا تو چپکے سے اس طرف بھی چلا آتا۔ جدھر سے یہ برآمدہ زنانہ حصے سے گزرتا تھا! ایک دفعہ پہلے بھی معتصم سے اس کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھر کبھی ایسی صورت حال سے سامنا ہو۔

جب اسے برآمدے میں کوئی نہ دکھائی دیا تو وہ آہستہ سے باہر نکلی۔ نیند تو غائب ہی ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ باقی رات محض چاندنی کا لطف اٹھاتے گزار دی جائے۔ اور خود کو ہینڈل بھی کیا جائے۔ اپنے آپ کو دکھ دینا عقلمندی نہیں۔ اور دوسروں کی نظروں میں خود کو تماشہ بنانا تو قطعی حماقت ہے۔ اب وہ نہایت صبر و ضبط اور بدلا پر زاہی کا مظاہرہ کرے گی۔ یہ کیا لغویت ہے نانسانوی بات۔ سرمایہ دار سے غریب کی محبت سب کچھ بکواس۔ دل پر قابو رکھو تو محبت رجعت کا ڈھونگ ہی نہ ہو۔ کہاں وہ — کہاں یہ۔ عرش و فرش کی بات ہے۔

مگر پھر اس کے خیالات بکھرنے لگے۔

وہ تو خود پر یقیناً قابو حاصل کر لے گی۔ لیکن اگر معتصم نے کسی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ وہ معتصم کو کیونکر منع کرے۔ اس سے ہمدردی کے پردے میں بیدردی نہ کریں۔

او خدا۔ کیا وہ معتصم سے کچھ کہہ بھی سکے گی؟۔ پھر اس کے سارے جسم سے پسینہ بہنے لگا۔ کاش کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں وہ پناہ لیتی۔ کوئی ایسا ہوتا جو اسے پناہ دیتا۔ مانا کہ یہ سب بھی اپنے ہیں۔ مگر کیا کسی ناخوشگوار معاملہ میں اس کا ساتھ دیں گے؟۔ نہیں۔ گھٹنے پیٹ کی طرف مڑ جائیں گے!۔

وہ سسک پڑی۔ میرے پروردگار کسی کو مجھ سا بے سروسامان بھی نہ بنا۔

اس کے سامنے چھوٹے سے باغیچے پر چاندنی کی زرد پہلی چادر اب بھی بچھی تھی اور طرح طرح کے پھولوں کی ملی جلی مہک۔ اسے کسی اور جہان کی سیر کرا رہی تھی۔ وہ ماحول کی دلکشی اور سحر آفرینی سے بے نیاز ہلکے پھلکے ستون سے سر ٹیکے کھڑی بیں بکھرے چاندنی کے غبار میں دیکھتی رہی۔!

دوسری طرف سے معتصم اسے دیر سے دیکھ رہے تھے!۔ نیند انھیں بھی نہیں آ رہی تھی!۔ مختلف اندیشوں نے انھیں کئی راتوں سے جگا رکھا تھا!۔ دو ہی تین روز پہلے انھوں نے اپنے والدین کی گفتگو سنی تھی!۔

بیگم علوی نے نہایت شوق اور دلچسپی سے تذکرہ کیا تھا۔ شاید اب ہو جائے کہ باجی جان کے آنے کے بعد بڑے ماموں کی صاحبزادی کی بات بھی پکی ہو جائے۔ کہہ تو رکھا تھا کئی برسوں سے۔ اور اب بڑے ماموں چاہتے بھی تھے کہ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

علوی صاحب نے بھی بے حد توجہ سے بیوی کی بات سنی تھی اور جواب دیا تھا: میں پوچھتا ہوں۔ شادی تو تم کرو گی صاحبزادے کی بھائی ہی سے پیسہ بٹور کر۔ مگر یہ کہو کہ پھر صاحبزادے اپنی بیوی کو کھلائیں گے کیا؟ جھنجھی کوڑی کے نوکر تو وہ ہیں نہیں۔!"

رضا بھی بیٹھے تھے۔ بولے: "ابا جان۔ آپ ہمیشہ معتصم کی ملازمت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ اب میڈیسن ڈویژن کا جھگڑا تو ختم ہو گیا۔ بہرحال ایم۔ایس ہی ہے۔ اسے کہیں نہ کہیں جونیئر ڈاکٹری مل یا لیکچرر شپ مل ہی جائے گی۔ میری شادی بھی تو آپ نے کر دی۔ میں بعد کو ملازم ہوا تھا۔"

سلمیٰ نے دیور کے بیاہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لی

The Hareem, Lucknow October 1983 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32



ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۴۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش ۔ ۴۵۲۳۴

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ۔۔ اور خواتین کا
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۳) — فہرست مضامین نومبر ۸۲ء — نمبر (۱۱)

اڈیٹر و نگراں ۔ نسیم انہونوی

اوفین ۔ شوکت جہاں بیگم غزالہ ۔۔۔۔ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

...زادی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
...سوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
...لی خریداری	"	تیئیس روپیہ

...پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

غیر ممالک سے

...یس کلا مساوی غیر ملکی بنگہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک سے
لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ماہ ۵ ر کو قطعی روانہ کردیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ ر کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ ر کے بعد شکایت کریں۔ ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۳۰ ر تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ۔ دفتر نسیم بکڈپو ۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

۴۸۶

لمعات

زندگی کے رجحانات برابر بدلتے رہتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے یا جب سے انسان نے ہوش سنبھالا اس کی نشست و برخواست اس کے کھانے پینے کے طریقوں اور ستر پوشی کی حیثیتوں میں برابر تبدیلی آتی گئی۔ کبھی وہ درختوں کے پتوں اور اس کے پھلوں پر گذر بسر کرتا تھا، لیکن جیسے جیسے اسکا ذہن روشن ہوتا گیا اس نے اجناس اور ترکاریاں وغیرہ پیدا کرنے کا راز معلوم کر لیا اور ان سے فائدہ اٹھانے لگا۔ کبھی وہ برہنہ پھرتا تھا، کبھی پتوں وغیرہ سے کسی حد تک ستر پوشی کرنے لگا۔ اور پھر ہزار ہا سال کے تجربات نے اسے ایسا بنا دیا جیسا وہ آج نظر آتا ہے۔ لیکن موجودہ صورت رفتہ رفتہ ہی تبدیل ہو کر ترقی کرتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں میں سو دو سو میل کے فاصلے طے کرنے والا انسان فضائے بسیط میں اڑنے لگا اور اس اڑان کی ترقی یافتہ صورت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب وہ چاند پر پہنچ گیا۔ اور ابھی اس کی اڑان کی کوئی حد قائم نہیں ہوئی ہے۔ وہ دوسرے ستاروں میں بھی جانے کی کوششیں کر رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ سورج پر بھی پہنچ جائے جو بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

بادی النظر میں، ترقی کے یہ مدارج قابل تعریف ہیں۔ اس نے ایسی ایسی ایجادات کی ہیں جنھوں نے ابتدائی سخت ترین زندگی کو بے حد آسان بنا دیا ہے ۔ اور ان ترقیوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ہر روز سائنس ہمارے سامنے ایسی نئی ایجادات پیش کر دیتا ہے جو گذشتہ کل کے مقابلہ میں آج کی زندگی کو نئی آسانیاں فراہم کر دیتی ہیں۔ اور وہ ایک ہی کرسی پر بیٹھا رہ کر صدہا قسم کے کام کر سکتا ہے۔ ایسے کام جن کے لئے ہزاروں انسانوں کا تعاون درکار ہوا کرتا تھا۔ بظاہر یہ آسانیاں دلفریب محسوس ہوتی ہیں اور انھیں حاصل کر کے انسان بیحد خوش ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ ہر اعتبار سے اچھا کہا جا سکتا ہے۔ جنگیں پہلے بھی ہوا کرتی تھیں۔ دو حکمرانوں کی فوجوں کا ٹکراؤ ہوا کرتا تھا۔ پیدل انسان مسلح ہو کر سامان باربرداری کے ساتھ ہفتوں اور مہینوں سفر کر کے ایک دوسرے کے مقابل ہو کر لڑا کرتے تھے۔ قلعوں کے محاصرے کئے فوجیں مہینوں پڑی رہتی تھیں، اس لئے کہ قلعے والے ایسی مدافعت کرتے تھے کہ غنیم کا ان میں داخلہ آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب بم برسا کر انھیں برباد کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی آگے ایسی ایجادات ہو گئی ہیں کہ ہزاروں میل دور سے کسی جگہ کا مقام وقوع معلوم کر کے بڑے سے خطرناک قسم کے بم میزائلوں کے ذریعہ پھینکے جا سکتے ہیں۔ غرض اسی طرح کی لاتعداد ترقیوں اور ایجادات نے انسانوں کو جادوئی بنا دیا ہے۔ سو دو سو برس پہلے اس طرح کی باتوں کو مفروضہ سمجھا جاتا تھا اور ان کا ذکر دیووں، اور جناتوں کی کہانیوں میں ہوتا تھا جو بچوں کو خوش کرنے کے لئے سنائی جاتی تھیں ـــ اب ان سے کہیں زیادہ مبالغہ آمیز باتیں حقیقت بن کر سامنے آگئی ہیں۔ اور ابھی انتہا نہیں ہوئی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

لیکن کیا یہ ترقیاں انسان کے لئے سکون بخش ہیں۔ کیا یہ زندگی جو لفٹ کے ذریعہ پچاسوں یا سیکڑوں منزل کے فلیٹ میں پہنچ کر گذاری جاتی ہے اس زندگی سے بہتر ہے جو کھلے مرغزاروں میں پہاڑوں اور دریاؤں کے قریب رہ کر گذاری جاتی تھی۔ دراصل انسان نے یہ بات سیکھ اور سمجھ لی ہے کہ اسے زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے۔ لیکن۔ کیا زمانہ خود کوئی اٹل حقیقت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمانہ انسان کا محتاج ہے۔ جو بھی تبدیلی زمانہ میں ہوتی ہے وہ انسان لاتا ہے۔ خود زمانہ میں ایسی کوئی قوت نہیں کہ وہ انسان کو زبردستی بدل دے۔ یہ اونچے اونچے مکانات۔ یہ پرواز کی مشینیں۔ یہ زندگی کو آسان تر بنانے والی ایجادات کیا زمانہ بناتا ہے۔ نہیں اور یقیناً نہیں اس لئے کہ زمانہ میں کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کی تمامتر جدتیوں کا سہرا انسانوں کے سر بندھتا ہے۔ وہی روزانہ نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ نئے نئے آداب زندگی بناتے ہیں۔ پھر کیا

کہا جاتا ہے کہ انسان کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ میرے خیال سے تو یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی یہ کہے کہ دریا میں بہاؤ کے رخ بہنا چاہیئے۔ ایک ترقی یافتہ یا بہادر انسان کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بہاؤ کے رخ پر بہنے لگے۔ طاقت جرأت اور ہمت کا مظاہرہ تو اس بات میں ہے کہ بہاؤ کے خلاف چلا جائے۔ میرے خیال سے زمانے کے ساتھ آنکھیں بند کرکے چلنا بہتر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسی جملے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے باعث ہمارے معاشرے میں بہت سے مصائب بھی پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سراسر زمانہ کے خلاف ہی چلنا مفید ہوگا، لیکن آنکھیں بند کرکے بہاؤ کے رُخ پر ہی بہنا ہمیشہ اچھا نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر ایک تیز تند دریا بہتا ہوا کسی عمیق پہاڑی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اگر کوئی کشتی یا کوئی انسان اس میں بہتا ہوا چلے تو یقیناً کھڈ میں گر کر تہس نہس ہو جائے گا، اس لئے زمانے کے ساتھ چلنے کو کلیہ نہ جانا چاہیئے۔ یہ خیال ہمارے معاشرے کو برابر متاثر کرتا چلا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل رشوت کا بازار گرم ہے۔ ہر شخص اس کا [illegible] کو [illegible] سمجھ کر حاصل کر رہا ہے۔ پھر بھی جو لوگ رشوت نہیں لیتے انہیں یہ مشورہ دینا، کیا مناسب ہو سکتا ہے کہ زمانے کے ساتھ چلیں، یعنی وہ بھی رشوت لینے لگیں۔

مغربی تعلیم و تہذیب نے ہمیں گمراہ کر دیا ہے اور ہم راہ مستقیم چھوڑ کر غلط راہ پر چلنے لگے ہیں۔ اگر کسی کو پردہ کرنے کی تلقین کی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے۔ زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ وہ زمانہ گذر گیا، جب پردہ کیا جاتا تھا آج کے زمانے میں پردے کا کیا ذکر۔ گویا زمانے نے مجبور کر دیا ہے کہ پردہ نہ کیا جائے۔ حالانکہ زمانہ خود کوئی طاقت نہیں۔ ہم ہی زمانہ ساز ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ شادی کے بعد دلہنیں ایک روز سسرال میں رہتی تھیں تو دو روز میکے میں ۸ روز سسرال میں تو پندرہ روز میکے میں۔ گھروں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ بزرگوں کے سامنے بیویاں اپنے شوہروں کے سامنے نہیں آیا کرتی تھیں۔ بظاہر [illegible] ہوتا تھا لیکن ہوتا اس لئے تھا کہ مفارقت [illegible] اس لئے کہ مفارقت سے محبت بڑھتی

ہے۔ ایک دلہن جو شادی کے بعد سے برابر شوہر ہی کے پاس رہے۔ اگر میکے جائے بھی تو اس طرح کہ صبح جائے اور شام کو آ جائے تو مفارقت قائم نہیں رہتی جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔ اب تو اگر دولہا دلہن مقامی ہیں تو ان میں مفارقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دولہا میاں روز اول ہی سے اپنی دلہن کو لے کر سیر سپاٹے شروع کر دیتے ہیں۔ دلہن میکے جانا بھی چاہتی ہے تو دولہا میاں خود لے کر پہنچ جاتے ہیں اور شام کو اپنے ساتھ ہی واپس لے آتے ہیں۔ بادی النظر میں اسے محبت کہیں گے لیکن اس کے دور رس اثرات کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ یہ ہمہ وقت کا ساتھ رفتہ رفتہ محبت کو کم کرتا ہے اور اسی لئے آج کے دور میں جلد ہی شوہر اپنی بیویوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ مسلسل کوئی شے بھی خواہ وہ کتنی ہی لذیذ اور پر کیف ہو، اگر مسلسل ملتی رہے تو اس کی لذت اور اس کے کیف میں کمی واقع ہو جاتی ہے لیکن اگر وقفہ ہوتا رہے تو وہی چیزیں حسب سابق لذیذ و پرکیف محسوس ہوتی ہیں۔ بریانی ایک بہترین اور پسندیدہ غذا ہے، لیکن اگر کسی کو مسلسل دس پندرہ دن بریانی کھلائی جائے تو وہ اس کے لئے ایک بے لذت غذا بن جائے گی۔ وہ اس سے گھبرا جائے گا۔ اس لئے وقفہ یا مفارقت بھی ازدیاد لذت کے لئے اکثر بہت ضروری ہے۔ اکثر ایسا مشاہدہ ہوا ہے کہ شادی کے بعد کچھ روز تک دولہا دلہن پر صدقے ہوا کرتا ہے۔ اسکی قربت کے لئے دیوانہ وار بے قرار رہتا ہے لیکن چند ماہ بعد یہ بے چینی کم ہو جاتی ہے اور کچھ اور مدت گذرنے کے بعد اس کے التفات میں اور کمی آ جاتی ہے، اس لئے کہ دلہن ہمہ وقت ساتھ رہتے رہتے اپنی دلکشی کھو دیتی ہے۔ پہلے زمانہ میں یہ عام دستور تھا کہ ہر سال لڑکیاں کافی مدت کے لئے میکے [illegible] جاتی تھیں۔ اس مفارقت میں شوہر کو [illegible] یاد ستانے لگتی تھی، اور پھر جب وہ مہینے دو مہینے بعد آتی تھیں تو ان میں ایک نئی کشش پیدا ہو جاتی تھی —— لیکن آج جب ان باتوں کا تذکرہ نئی پود کے سامنے کیا جاتا ہے تو وہ ہنس کر کہتی ہے "آپ بھی کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ایسی دقیانوسیت نہیں چل سکتی"

بلاشبہ بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے ہم کو اپنے بنائے ہوئے زمانے کے ساتھ جانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر چراغ اور لالٹین کے بجائے بجلی کی روشنی حاصل کرنا چاہیئے۔ ہاتھوں سے کھینچے جانے والے

پنکھوں کے بجائے بجلی کے پنکھے استعمال میں لانا چاہئیں۔ بینسو ل اور بیل گاڑیوں کے بجائے کاروں، بسوں اور ٹرینوں وغیرہ سے سفر کرنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آنکھیں بند کرکے، اچھی اور بری کا امتیاز کئے بغیر ہر بات کو بدل دینا ہرگز مفید نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ نہ کہیں کہ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ زمانہ خود کوئی چیز نہیں۔ زمانہ ہم ہی بناتے ہیں۔ ہم کو زمانہ نہیں بناتا"۔

بریڈ فورڈ (انگلینڈ) کے مسلمانوں کی کامیابی

بریڈ فورڈ انگلینڈ کی ایک ایسی آبادی جہاں ہندوستان و پاکستان کے ہزارہا خاندان آباد ہیں۔ انھوں نے مشترکہ تعلیم کے سلسلہ میں حکومت برطانیہ کو راضی کرلیا ہے کہ ۱۰ سال سے ۱۸ سال تک کے بچوں کے لئے جنس کے اعتبار سے علٰحدہ علٰحدہ اسکول قائم کردئے جائیں۔ یہ خبر بڑی خوش آئند ہے اور ان حضرات کو مبارک باد دیتے ہیں جو مغرب میں رہ کر بھی اپنی مشرقیت کو یکسر بھولے نہیں ہیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ ۱۰-۱۸ سال کی درمیانی عمر میں مخلوط تعلیم مناسب نہیں۔ اس سلسلہ میں حکام بریڈ فورڈ بھی قابل داد ہیں، جنھوں نے اپنے یہاں کی اقلیتوں کے جذبات کا پاس و لحاظ رکھا۔

ہندوستان ایک جوا خانہ

ہمارا ہندوستان اس وقت ایک جوا خانہ بنا ہوا ہے۔ نہ جانے کتنی لاٹریاں حکومتوں کی جانب سے روزانہ مشتہر ہوتی رہتی ہیں اور کروڑوں روپیہ کے ٹکٹ لوگ روزانہ اس طمع میں خریدتے ہیں کہ شاید وہ بھی لکھپتی بن جائیں۔ اور اس طمع میں نہ جانے کتنے بھولے بھالے اپنی کل آمدنی لاٹریوں کے ٹکٹ میں صرف کردیتے ہیں اور ان کے بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔

حکومتوں کی جانب سے اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ لاٹریوں سے ہونے والی آمدنی اسپتالوں پر صرف کی جاتی ہے لیکن میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اسپتالوں کی حالت پہلے سے بھی زار ہے۔ وہاں وزرا، ممبران کونسل اور لیڈران قوم کو تو قیمتی سے قیمتی دوائیں مل جاتی ہیں، لیکن غریبوں کو لال پانی یا معمولی قسم کی گولیاں دے کر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ قیمتی دواؤں کے لئے کہدیا جاتا ہے کہ بازار سے خریدلیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ لاٹریوں کے ٹکٹ عموماً غریب لوگ ہی خریدتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنی غربت کو امارت میں تبدیل کرنے کے خواب دیکھا کرتے ہیں، لیکن انھیں بیمار ہونے پر اسپتالوں میں دوائیں کے بجائے مدد ملتی ہے جبکہ ایسے لوگ جو دوائیں خرید سکتے ہیں، قیمتی سے قیمتی دوائیں اسپتالوں سے مفت حاصل کرلیتے ہیں۔

میرے ایک دوست جو معموں اور لاٹریوں کے پیچھے تباہ ہیں۔ ایک روز بدیدۂ نم کہنے لگے بھیا! دونوں لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں، جو کچھ تھا سب معموں اور لاٹریوں کی نذر ہوگیا۔ مگر کبھی کوئی بڑا انعام نہ نکلا کہ ان کے ہاتھ پیلے کردیتا"۔

ان کی باتیں سنکر کچھ تو دکھ ہوا اور کچھ ہنسی آئی ان کی سادہ لوحی ہے کہ وہ اس یقین سے اپنی رقم ان مدوں پر صرف کرتے رہے کہ گویا ایک دن بڑا انعام ضرور نکلے گا۔

میری رائے ہے کہ غریبوں کا پیسہ لاٹریوں کے ذریعہ حاصل کرکے کبھی اسپتالوں میں نہیں لگانا چاہیئے ایسی رقوم کروڑپتیوں سے کسی مخصوص ٹیکس کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لاٹریوں کے ڈائرکٹریٹوں میں لاکھوں روپیہ تو ہر ماہ اسٹاف کی تنخواہ میں صرف ہوجاتا ہے۔

اپنی صحت کے متعلق

اکثر حریمی بہنوں کے خطوط اس دریافت کے لیے آتے رہتے ہیں کہ میری صحت اب کیسی رہتی ہے۔ فرداً فرداً جواب دینا میرے لیے مشکل ہے، اس لیے حریم کے ذریعہ ہی مطلع کیا جا سکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ۹۰-۸۹ء کے مقابلہ میں میری صحت بہتر ہے۔ دفتر بھی آتا ہوں۔ پورے وقت کے لئے نہ سہی کم وقت ہی کے لئے سہی، لیکن آتا ضرور ہوں۔ کچھ کام بھی کر لیتا ہوں اور دل بھی بہل جاتا ہے۔ اپنے لگائے ہوئے اس باغ میں بیٹھ کر مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔ بیماری کا احساس بھی کم ہوتا ہے، لیکن ہوں تو بیمار ہی، کوئی روز بھی ایسا نہیں ہوتا کہ دوا نہ لوں۔ اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ عمر کا بھی تو تقاضہ ہوتا ہے۔ ۷۴واں سال چل رہا ہے اب حالت اس عمارت کی سی ہے جو بہت قدیم ہو۔ ہر وقت مرمت اور لیپ پوت چاہتی ہو۔ اب صرف دمہ کی ہی تکلیف نہیں، سب ہی اعضا منہ چڑھانے لگے ہیں۔ حافظہ بھی جواب دیتا جا رہا ہے۔ اور اس سے لکھنے کے کام میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ بہرحال جب تک حریم میں آپ یہ خبر نہ پڑھیں کہ اس کے بانی، پردے کے حامی نے خود پردہ کر لیا، سمجھ لیجئے کہ اچھا ہی ہوں۔

نسیم انہونوی

"سچی باتیں" کا ایک اقتباس

یہ سچی باتیں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے قلم سے اخبار سچ مورخہ ۱۴ر جون ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھیں جنھیں حالیہ صدر صدق جدید نے پھر شائع کیا ہے اور اس کا اقتباس ہم بھی حریم میں شائع کر رہے ہیں

چاند کی سالانہ گردش ایک بار پھر اپنا دورہ تمام کر چکی اسلامی جنتری میں "قربانی" کا مبارک مہینہ اور مبارک دن گزر چکا اور "شہادت" کا مبارک مہینہ اور مبارک دن آ پہنچا۔ عید قربان کا مہینہ اگر اس لئے تھا کہ آپ اپنا سب کچھ حق کی راہ میں قربان کر دیں تو محرم کا مہینہ یہ پیام لاتا ہے کہ آپ خود اپنے کو شہادت کے لیے پیش کر دیں۔ پچھلا مہینہ آپ سے "مانگ" رہا تھا اگلا مہینہ آپ کو

"مانگ" رہا ہے۔ دنیا کی ایک نہایت زبردست متمدن اور ظالم حکومت کی کشتی حیات اسی مہینہ کی ۱۰ر تاریخ کو سمندر میں غرق ہوئی موسیٰ علیہ السلام کی مظلوم قوم کو اب موسیٰ وہارون نے اس مبارک تاریخ کو آزادی دلائی اور اللہ کے کلیم نے اس یوم آزادی کی مستقل یادگار روزۂ عاشورہ کی شکل میں قائم کر دی۔ دنیا کے سب سے بڑے ہادی سب سے بڑے معلم اور سب سے بڑے آزادی دلانے والے نے اسی پاک دن کی پاک یادگار کو یہی نہیں کہ جائز رکھا ہو بلکہ خود بھی اس کی تائید فرمائی۔

ہجرت نبوی کے نصف صدی بعد تاریخ نے پھر اپنے تئیں دوہرایا اس تاریخ کو سرزمین کربلا پر حق و باطل، ملکوتیت و حیوانیت آزادی و ملوکیت کے درمیان ایک بار پھر معرکہ آرائی ہوئی ایک طرف دولت تھی حکومت تھی سلطنت تھی مادی قوت تھی شاہی خزانہ تھا شاہی فوج تھی، ہزارہا سپاہیوں کا لشکر جرار تھا، قوت کا نشہ تھا حکومت قائم کرنے کی دھن تھی دوسری طرف غربت تھی مسکینت تھی، فقر و فاقہ تھا، ادائے فرض کا احساس تھا حق پرستی کے جوش سے بھرے ہوئے ہوئے چند دل تھے، دلوں کے اندر حق کی راہ میں مٹ جانے کا بیتاب کر دینے والا ولولہ تھا۔ باطل کے آگے نہ جھکنے والی گردنیں تھیں۔ گردنیں کٹیں لاشیں تڑپیں اور جس خون کا ایک ایک قطرہ پروردگار عالم کی نظر میں دونوں جہانوں کی موجودات سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا تھا اس کی ندیاں بہیں اللہ کے کلیم کی امت نے سب کچھ جھیل کر عاشورۂ محرم کو اپنی آزادی حاصل کی تھی، اللہ کے حبیب کے نواسہ نے خود اپنی جان نذر کر کے ابدی آزادی و سرمدی مسرت حاصل کر لی۔

تبصرہ

نقش مقبول

دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور مختلف اہل الرائے حضرات کے مضامین کا ایک حسین مجموعہ ہے، جس میں فخر لاری نہیں، فخر ہند جناب مقبول احمد لاری صاحب کی شخصیت وسیرت کے متعلق مضامین شامل ہیں، جسے اہالیان قصبہ لار نے اپنی سرزمین کے اس عظیم انسان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے موصوف کی تاریخ ولادت کی تاریخ ۱۴؍مئی ۱۹۰۳ء؟ کو قصبہ لار میں پیش کیا۔

ان مضامین کو جو اس جریدے میں شامل ہیں، خورشید احمد لاری صاحب نے مرتب کیا ہے مضامین کے ساتھ ہی کافی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں جو ایسے اجتماعات سے متعلق ہیں جو مقبول احمد لاری صاحب کے سلسلہ میں ہوئے۔

اس شاندار مجموعہ مضامین ومنظومات کی قیمت درج نہیں۔ ناشر ہیں انعام الحق لاری صاحب فتح نگر، لار، ضلع دیوریا میں۔ غالباً موصوف ہی سے بلا قیمت مل سکتی ہوگی۔

مقبول احمد لاری صاحب کا میں بھی نیاز مند ہوں، اکثر تقریبات میں اور خصوصیت سے ان دعوتوں میں موصوف سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہی رہا ہے جو وہ خود دیتے ہیں۔ اور یہ دعوتیں ایسی ہوتی ہیں، جیسی شاید شاہان اودھ کے زمانہ میں ہوتی ہوں گی۔

مقبول احمد لاری صاحب کی علم دوستی اور علم نوازی سے شاید ہی کوئی اردو داں ناواقف ہو۔ اردو کے لئے لاری صاحب کا دست فیض ہمیشہ کھلا رہا۔ لاتعداد ادارے موصوف کا تعاون حاصل کر چکے ہیں۔ لاری صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ میر اکاڈمی کا قیام ہے جو ۱۹۶۱ء؟ میں قائم ہوا اور جس کے ذریعہ صدہا ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ان کی خدمات کے سلسلہ میں "امتیاز میر" کی اسناد اور نقد انعامات تقسیم کئے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ لاری صاحب نے اس وقت شروع کیا تھا جب اردو والوں کی ہمت افزائی کی سرکاری عدالت قائم نہ ہوئی تھیں۔ اسی ضمن میں حدیث میر کے نام سے ایک عظیم کتاب بھی شائع ہوئی ہے جو ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے ایک لاثانی کتاب ہے۔

۲۰؍نومبر ۱۹۸۳ء؟ کو لاری صاحب کی گولڈن جبلی کا جشن رفاہ عام کلب کے وسیع لان میں جس شان وشوکت کے ساتھ منایا گیا تھا، اس میں شرکت کرنے والے اسے بھولے نہ ہوں گے ایسا شاندار جشن میں نے اپنی زندگی میں دوبارہ نہیں دیکھا۔

۱۹۷۱ء؟ میں حکومت ہند نے مقبول احمد لاری صاحب کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف ایک دولت مند، اشیر چشم اور فخر انسان ہی نہیں ہیں، بحر علم وادب کے غواص بھی ہیں، ورنہ حکومت انھیں یہ اعزاز نہ بخشتی۔

نقش مقبول اگر آپ کو کہیں سے حاصل ہو جائے تو اس کے مطالعے سے مقبول احمد لاری صاحب کی علمی ادبی اور شخصی خصوصیات کا مکمل علم ہو جائے گا۔ نسیم انہونوی

اقبال نامے

علامہ سر اقبال کے غیر مطبوعہ ومطبوعہ مکاتیب کا مجموعہ، مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۴۔ کتابت طباعت وغیرہ متوسط۔ قیمت پچیس روپیہ ملنے کا پتہ طارق پبلیکیشنز، صادق منزل، چوکی امام باڑہ بھوپال۔

اخلاق اثر صاحب کی یہ دسویں تالیف ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ اقبال کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اسمیں اقبال کے ۱۸ مکتوبات شامل ہیں جو ۱۳ مختلف شخصیتوں کے نام ہیں۔ ان میں سے ۹ انگریزی میں ہیں۔ بقیہ اردو میں۔ انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ کر کے شامل کیا گیا ہے (خطوط کا متن انگریزی میں بھی ہوتا تو بہتر ہوتا)

اس مجموعہ میں صرف وہی مکتوبات شامل ہیں جو اقبال نے لاہور سے بھوپال میں موجود حضرات کو، بھوپال سے ہی بھوپال میں موجود لوگوں کو یا بھوپال سے باہر کے متعلقین کو لکھے۔

اقبال کے بیشتر مکتوبات اس سے پہلے دوسری کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ۱۹۷۷ء؟ تک اقبالیات سے متعلق اکثر موضوعات اور مسائل زیر بحث رہنے کے باوجود پیچ در پیچ ہو گئے تھے (جیسا کہ اظہار اثر صاحب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے) موصوف نے اقبال نامے کو ترتیب دے کر یہ کوشش کی ہے کہ جو پیچیدگیاں سابقہ اشاعتوں سے پیدا ہوئی تھیں، صاف ہو جائیں۔

مکاتیب کا حاصل کرنا بہت ہی دشوار مسئلہ ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ

مرتب بذات خود ان حضرات سے جن کے نام مکتوبات ہوں، یا جن کے قبضے میں مکتوبات ہوں، مل کر استفادہ حاصل نہ کرے، اغلاط کا امکان رہتا ہے۔ اخلاق اثر صاحب نے اس سلسلہ میں کافی تگ و دو کر کے مکتوبات شائع کئے ہیں، اس لئے امید ہے کہ وہ نقوش اول سے بہتر ثابت ہوں گے۔

کتابت کی قیمت مولف کی جد و جہد کے پیش نظر ہو سکتا ہے کہ مناسب ہو اویسے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

حریمی دستر خوان

ٹماٹر کباب

سامان۔ قیمہ پاؤ بھر۔ پیاز بڑی آنا ڈی چار عدد چنے کی دال آدھ پاؤ۔ ادرک بڑی ایک گرہ۔ لہسن ایک آنڈی ——— نمک حسب ضرورت۔ ٹماٹر آدھ سیر۔ ہلدی دھنیا سرخ مرچ پسی ہوئی چار کے دو دو چمچے۔ سرخ مرچ زیادہ پسند نہ ہو تو صرف ایک چمچہ ڈالیں۔ انڈا ایک عدد۔ ہرا دھنیا انداز سے ڈالڈا یا تیل حسب ضرورت۔

ترکیب۔ دو آنڈی پیاز کے لچھے گھی یا تیل میں سرخ کر کے نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔

قیمہ اور چنے کی دال میں نمک، ادرک اور لہسن ڈال کر ابالیں۔ دو آنڈی پیاز کدو کش کر کے یا باریک باریک لچھے کر کے اس کا عرق نکال کر قیمہ بھی ملا دیں۔ یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ پیاز کے لچھے کاٹ کر قیمہ میں ملا کر ابال لیں ابالنے کے بعد قیمہ کو باریک پیس لیں۔

اس کے بعد انڈے کو پھینٹ کر سرخ مرچ، دھنیا ہلدی (پسی ہوئی) ایک ایک چمچہ چار کا۔ ہرا دھنیا کترا ہوا انداز سے، قیمہ میں ملا کر گلاب جامن کی طرح کی قاشیں بنا لیں اور گھی، ڈالڈا یا تیل میں تل لیں۔ باقی تیل محفوظ رکھیں۔ (اس کے بعد ان کبابوں کو ناشتہ میں اسی طرح بھی چٹنی کے ساتھ کھایا جا سکتا ہے۔ بہت لذیذ ہوتے ہیں، لیکن اس کے بعد انھیں جو شکل دی جا سکتی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

پھیلی ہوئی پتیلی یا کھگونے میں آدھ سیر کے قریب ٹماٹر کاٹ کر بچھا دیں۔ اس پر تلے ہوئے کبابوں کو بچھا دیں۔

جو پیاز کے لچھے سرخ کر کے نکال لئے تھے، ان میں بقیہ ہلدی دھنیا، سرخ مرچ (پسی ہوئی) نمک بقدر ضرورت ملا کر مل ڈالیں اور کبابوں پر چھڑک کر بقیہ گھی، تیل جو کباب تلنے کے بعد بچا ہو، بھی چھڑک کر کچھ دیر دم دیں۔ کھانے کی میز پر لگاتے وقت ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں۔ پانی قطعی نہ ڈالیں۔

- نوٹ کر لیں کہ ان کبابوں کو کھانے سے تھوڑی دیر پہلے دم کریں۔ بار بار دم کرنے سے کباب ٹوٹ جاتے ہیں۔
- یہ بھی خیال رہے کہ یہ کباب زیادہ گھی تیل میں پھلکیوں کی طرح تلے جاتے ہیں، عام کبابوں کی طرح نہیں تلے جاتے۔
- مسالے انداز سے لکھے جاتے ہیں۔ ناپ تول ایک دشوار ہے۔ دو چار بار پکانے کے بعد آپ کو خود ہی انداز ہو جائے گا۔

مسز نجم السحر منصور (باندرہ)

لذیذ کریلے پکانے کی ترکیب حریم اکتوبر میں شائع ہوئی غلطی سے اس میں دہی کا استعمال لکھنے سے رہ گیا تھا۔ حریمی اسے نوٹ فرما لیں۔

آخری پیراگراف یوں کر لیں

جتنا مسالہ بچا ہوا سے کسی پتیلی میں بچھا کر گڑ کو تھوڑے میں گھول کر چھان لیں دہی کے ساتھ ڈال دیں۔ ساتھ ہی بھرے ہوئے کریلے بھی بچھا کر ہلکی آنچ میں اتنی دیر تک پکائیں کہ گل جائیں۔ نمک چکھ کر دیکھ لیں جتنا ضروری سمجھیں ملا لیں۔

شیخ سعدیؒ نے فرمایا

- نہ اتنی سختی کرو کہ لوگ۔ تم سے بیزار ہو جائیں اور نہ اتنی نرمی کہ تم پر دلیر ہو جائیں۔
- جو شخص بروں کی صحبت میں بیٹھتا ہے کبھی سکھ نہیں پاتا۔
- استاد کی سختی باپ کے پیار سے بہتر ہے۔
- جس نے علم حاصل کیا اور عمل نہ کیا وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے ہل چلایا اور بیج نہ بکھیرے۔
- چیونٹیوں میں جب اتفاق ہو جاتا ہے تو وہ غضبناک شیر کی کھال اتار لیتی ہیں۔

- جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں

سونے کے پائے

عفت موہانی

اکلوتے ہونہار بیٹے کی شادی کوئی ویسی بات تو تھی نہیں کہ ادھر اُدھر جھانک کے لڑکی دیکھ لی اور بس دو بول پڑھوا دئے۔ صاحبزادے بھی ولایت پلٹ تھے۔ بڑی ڈگری لائے تھے۔ اور اناجی کی نظروں میں چرخ چہارم سے اترے تھے۔ ان کے لئے لڑکی بھی خاصی چاہیئے۔ اس معاملہ میں سگی ماں نے منہ نہیں کھولا۔ ابا جان بھی یہی سمجھا کئے۔ کرلیں کوشش اناجی بھی۔ آخر جب اسی بچے کی پیدائش میں ماں مرتے مرتے بچی تھیں۔ اس وقت اناجی ہی نے ننھے کو گود لیا تھا۔ ان کا اپنا بچہ جاتا رہا تھا مگر اس کا غم نہ کیا۔ ان کی گودی میں دوسرا کھلونا آیا۔ وہ بہل گئیں پھر ننھے کا یہ حال ہوا کہ خدا خدا کرکے ماں اللہ کے گھر سے پلٹی تو جانتا ہی نہ تھا کہ وہ ماں ہیں۔ بس انا ہی کا ہوکر رہ گیا۔ وہی کرتا دھرتا تھیں۔ اور ایک دن کے بچے سے لے کر تیس سال کے نوجوان ہونے تک انا ہی اس کی ماں بنی رہیں۔ گھر والے ان کا بڑا مان رکھتے تھے۔ بے چاری کے شوہر پردیس کو سدھارے۔ دو آنسو ٹپکائے ننھے کی صورت دیکھی بیوگی کا دکھ بھول گئیں۔ جوان بیٹے کو ناگ نے ڈس لیا۔ زہر ایسا پھیلا کہ جلدی ہی انا کو خبر نہ کی جا سکی۔ وحشت سے کہ لاش گھر ہی پر نہ گلنے لگے۔ فوراً اس کا انتظام کردیا۔ دوسرے دن انا کو خبر دی گئی۔ ایک ہائے کلیجے سے نکلی مگر پھر صبر کیا اور کہا کہ میرا بچہ تو یہ ہے میرے پاس۔ تو بھلا جس نے ان سب کی تن من سے خبر گیری کی ہو۔ دلھن کے نام پر ایک کانی کوڑی بھی نہ لی ہو۔ یہیں رہ کر گھورکالا سر بگلے کے پروں میں تبدیل کیا ہو۔ اس کی بات کیسے نہ مانی جاتی۔ انھیں حق تھا۔ وہ بالشت بھر کا سنھا اب ڈاکٹر شکیل احمد بن گیا تھا۔ اونچا پورا شاندار وجیہہ، با اخلاق ہنس مکھ۔ انا انھیں وہی بچہ سمجھتی تھیں۔ جسے پیدا ہوتے ہی انھوں نے اپنی ہتھیلیوں کے دونے میں جھیلا تھا۔ شکیل بھی انھیں بے حد چاہتے۔ ادب کرتے۔ اماں اماں کہتے منہ سوکھتا۔ اماں کا یہ حال کہ جیسے زلیخا نے اپنی دوسری جوانی انہی کو سونپ دی تھی۔ بیٹے کے ساتھ ساتھ ماں بھی جوان ہوگئی تھی۔

شکیل نے وطن واپس آنے کے بعد اپنا کلینک کھولا۔ پھر خوب پھلے پھولے اور تب انا کو ان کی شادی کا ارمان ہوا۔ شکیل کی چھوٹی بہن رضیہ اپنے گھر بار کی تھی۔ وہ تب تک میکے میں رہتی۔ گھر بھرا بھرا لگتا۔ اس کے سسرال جانے کے بعد پھر روح فرسا سناٹا۔ جو بہت گراں گزرتا تھا۔ تب امی اور انا نے گھر بھر میں اڑتے بہو کے رنگین آنچل دیکھنے اور پازیب کی چھن چھن سننے کی لگن میں یہاں وہاں لاسے لگا دئے!۔ اچھے لڑکے نگوڑے یوہنی عنقا ہیں۔ جو تھے انھوں نے گھر بسالئے۔ کچھ کمائی کرنے وطن سے دور چلے گئے۔ اب تو لڑکی والے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ اچھا لڑکا ملے اور وہ دبوچ لیں۔ سو شکیل میاں تو ہزار دو ہزار میں اچھے تھے۔ انھیں حسین اور دولت مند دلہن کاہے کو نہ ملتی۔!

مشاطائیں اپنی مٹھی گرم کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگیں۔

سو یہ ہوا کہ ایک اونچے گھرانے میں رشتہ بھیجا گیا۔!

لڑکی دور تک پڑھی تھی۔ ترقی پسند تھی۔ انگریزی بولتی تھی۔ اچھی طرح لندن پلٹ شوہر کے معیار پر کسی جا سکتی تھی۔ مطلب یہ کہ گھر گھسنی، جھینپو اور اوئی ہائے ا[illegible] کہنے والی آثار قدیمہ سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ اور یہ لڑکی جس کے جہیز [illegible] بیرسٹر صاحب مسہری کے پائے سونے کے دینے والے تھے، سونے کے پائے۔ واہ حد تھی۔ پتہ نہیں اور جہیز کیا کیا تھا؟۔ انا کے کانوں میں تو فقط سونے کے پائے کی بھنک پڑی تھی۔ اور وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھیں!۔

ایک ہی تو میرا اللہ آمین کا بچہ ہے" وہ کہتی تھیں "ایسی کون سی دس بہوئیں لائی ہیں مجھے۔ ایک بہو آئیں خیر سے آئے اور لاکھوں لائے۔ مجھے اور کیا چاہیئے!۔ بس گھر بھر جائے میرا۔ اور جی بھر جائے میرے بچے کا۔!"

اناجی یہ آپ نجانے کس طرح سوچنے لگی ہیں" ابا جان انھیں سمجھاتے "آپ کو نہیں معلوم آج کل جہیز لینا جرم ہے۔ سچ جانیئے۔ شکیل کی بارات کے پیچھے جہیز کی جو دم لگے گی۔ اسے پولیس کاٹ دے گی۔ اور آپ کا یہ گھر بھی خالی ہو جائے گا جسے آپ مزید بھرنے کی کوشش کر رہی ہیں!"

بس چپ بیٹھے رہو میاں" وہ تو بھڑک ہی اٹھتیں "اپنے داماد کو تم نے مارا مار جہیز دیا۔ وہ دُم نہ کاٹ لی نگوڑی پولیس نے۔ اب کیا وہ لڑکے ہی کی بارات پر دیدے لگائے بیٹھی ہوگی۔ سمجھا کرو بات۔ سونے کے پائے۔ اتنے بڑے کمرے میں جھکا جھک چمکیں گے۔ واہ پروردگار تیری شان۔ اور میں کہوں۔ لڑکی ہی کو جالے کے بیر سونا دے دیں گے۔ جبکہ پائے ــــــ!"

انا جی۔ ٹھوس سونے کے پائے نہیں ہوتے وہ۔ بس لکڑی پر پتر سا منڈھ دیتے ہیں!" امی نے بھی دخل دیا۔

بات یہ ہے بیوی کہ تم سب جالے کیوں جل اٹھے ہو" انا بگڑ گئیں "تمہیں تو مولوی فراست حسین کی بچی اچھی لگتی ہے۔ رضیہ نے کچھ پٹی پڑھا دی ہے تم لوگوں کو میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ لڑکی نہ گت کی۔ نہ گھر بار ہی ڈھنگ کا۔ امیں نے مولوی صاحب کی بیوی سے پوچھا تھا لڑکی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ انا جی ہم لڑکی دیں گے۔ بہت دیں گے۔ جہیز بس شرعی اور ضرورت بھر کا۔ اور جوڑے گھوڑے کے نام تو چھنی کوڑی بھی نہ دیں گے چاہے لڑکی کنواری بڈھی ہو جائے۔ منہ۔ لے کے چلی ہیں اس زمانے میں شرعی جہیز۔ اٹھائے رکھیں اپنی لڑکی کو۔ میں بھی دیکھوں نگوڑی کو بر کہاں سے نصیب ہوتا ہے!"

انا جی کی نہ زبان قابو میں رہی تھی نہ دماغ۔ دماغ اونچی اڑانیں بھرتا تھا اور زبان ان اڑانوں کو الفاظ سے ناپ لیتی تھی۔ کسی کو گوارہ اور ناگوارہ ہونے کی ان کو کچھ پرواہ نہ تھی۔ وہ تو یہ چاہتی تھیں کہ انھوں نے جو شکیل کو پال پوس کے اس لائق کیا تھا۔ تو ان کی شادی بھی مثالی کر کے خاندانوں بھر میں اپنی ناک اونچی رکھنے کا لوہا منوا لیں۔ بے چاری بڑی پریشان ہو رہی تھیں۔ ان کا حواس باختہ پن دیکھ کر سب چپکے چپکے ہنستے تھے مگر مجال نہ تھی کہ انا جی کے سامنے دانت چمکاتے۔ وہ تو زمین آسمان ایک کر دیتیں۔

پھر ابا جان اور امی میں یہ سازش ہوئی کہ انا جی کے معاملہ میں دخل نہ دیں۔ صاف بے رخی اختیار کر لیں۔ بیرسٹر صاحب کی ترقی پسند، فیشن ایبل، اور تیز طرار صاحبزادی سے شادی ہوتی تو قطعی ممکن ہی نہ تھی۔ شکیل باوجود لندن پلٹ اور روشن خیال ڈاکٹر ہونے کے بہت قدامت پسند اور تاریک خیال بھی تھے۔ تاریک خیال ان معنوں میں کہ وہ اپنی بیوی کو بے آستین کا بلاؤز پہنے جو تیج لال کئے کلب میں کسی غیر مرد کے گلے سے لگے ناچتے دیکھنا بالکل پسند نہ کر سکتے تھے۔ اور اُدھر بیرسٹر صاحب کی صاحبزادی کے بارے میں سنا گیا تھا وہ کسی کلب کی ممبر بھی تھیں!۔

رضیہ نے شکیل سے تنہائی میں کہہ رکھا تھا۔ مولوی صاحب کی لڑکی مینا بہت اچھی تھی۔ وہ گریجویٹ تھی۔ رضیہ نے کہا تھا۔ وہ بے حد سلیقہ شعار، سگھڑ اور شریف لڑکی تھی۔ چونکہ رضیہ کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ رضیہ نے اس کا پورا مطالعہ کیا تھا۔ اور شکیل کے سوا اپنے والدین سے بھی مینا کی سفارش کی تھی۔ اس شریف مہذب اور قدامت پرست خاندان کے لئے مینا ہی مثالی بہو اور مثالی بیوی ثابت ہو سکتی تھی۔ بلا سے جہیز اتنا نہ ملے۔ جتنا بیرسٹر صاحب دے رہے تھے۔ مگر رضیہ بضد تھی کہ آخر شکیل بھائی کو جہیز کی ضرورت ہی کیا تھی!۔

بڑی چپقلش کے بعد انا جی نے آخر کار شکیل ہی کو گھیر لیا" بیٹے۔ مجھے اب اپنی پسند اور رائے بتا۔ جو تو کہے گا میں وہی کروں گی!۔

اتفاق سے رضیہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ بڑے اشتیاق سے بھائی کو تکنے لگی۔ ابا جان اور امی اپنے منصوبے کے تحت بالکل خاموش بیٹھے رہے گویا یہ معاملہ ان سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا!۔ ابا جان اسے نہ نواسے ایثار سے کھیلتے رہے امی اسجان بنی ڈلی کاٹتی رہیں!۔

میری رائے۔! "شکیل نے کہا" ارے انا جی میں کچھ کہوں گا تو آپ جھٹ سے کہدیں گی کہ اتنے دنوں باہر رہ آیا ہے۔ شرم حیا بھون کھائی ہے۔ میں کیا رائے دوں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ میں اس سلسلے میں کچھ بولوں گا تو دولھا بنتے وقت میرے منہ پر نور نہیں اترے گا!"

شروع کر دیا نگوڑا مذاق" انا جی خفا ہونے لگیں۔ "میں بار بار تو یہاں آتی نہیں اور وہاں مجھے الجھن ہوتی رہتی" کہ جانے کیا طے ہوا!"

مجھے کچھ نہیں معلوم" شکیل نے فریادانہ احتجاج کیا" میں نہ بیرسٹر صاحب کی صاحبزادی کو جانتا ہوں نہ مولوی صاحب کی نور چشم کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔ بس انا جی جسے کہیں۔ میں رکھ بولکیا میں بیاہ کر کے گھر لے آؤں اور انا جی کے حوالے کر دوں کہ لیجئے کنیز حاضر ہے۔ ابھی

اس سے برتن منجھوایئے چاہے جھاڑو دلوایئے۔"

"آنکھوں کا نور بنا کے رکھوں گی۔" انا جی بولیں۔ "دلہن شہزادی کی خدمت کے لئے میں خود چھ سات نوکر رکھوں گی۔ وہ اللہ نہ کرے کیوں برتن مانجھے گی۔ توبہ۔ بیوی۔ تو بات پھر مذاق میں چلی گئی۔ اے تم لوگ کچھ کہو نا۔" انھوں نے امی اور ابا جان کو للکارا۔

"میں کچھ نہیں جانتا جناب۔!" ابا جان نے کہا۔ "آپ شادی وادی طے کر کے مجھے بھی ایک رقعہ بھجوا دیجئے گا۔ ولیمہ کھانے چلا آؤں گا۔ ماں بیٹے کے بیچ میں بول کر برا بننا نہیں چاہتا۔!"

اندر اندر کھول کر غبارہ ہوتی ہوئی انا جی بولیں۔ "اے لو۔ ان کی منطق سنو۔ دعوت کھانے چلے آئیں گے۔ میں کہوں۔ تم باپ نہیں ہو اس کے۔ اچھی بری کوئی تو رائے دو۔"

"آپ ایک دن اماں مرحومہ کے ساتھ گئیں۔ لڑکی دیکھ آئیں۔ میری شادی کر دی۔" ابا جان نے جواب دیا۔ "میں تب بھی آپ کی پسند پر کچھ نہیں بولا۔ آج تک نہیں بولا۔ لہذا اب آپ کے بیٹے کے بیاہ کے سلسلے میں بھی نہیں بولوں گا۔ جو آپ کی مرضی۔"

"بیوی تم کہو۔ بیرسٹر صاحب کی بچی اچھی ہے کہ مولوی صاحب کی۔" انا جی نے اب امی کی طرف رخ کیا۔

"مولوی صاحب کی بچی اپنی رضیہ کے ساتھ کی پڑھی ہے۔ رضیہ اس کی عادات اطوار دیکھے ہے۔" امی نے کہا۔ "اور بیرسٹر صاحب کی لڑکی کے بارے میں ہم آپ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ فقط مشاطہ نے ان صاحبزادی کے گن گنائے تھے۔ اس کا کیا بھروسہ۔ وہ اپنی مٹھی گرم کرنے کے لئے زمین آسمان کی طنابیں جوڑا ہی کرتی ہے!"

"انا جی آپ مینا کے لئے راضی ہو جایئے۔" رضیہ بھی۔

انا جی نے اسے پھٹکار دیا۔ "راضی کیا خاک ہو جاؤں، دیکھ آئی ہوں۔ مولوی صاحب کا گھر۔ وہاں رکھا ہی کیا ہے۔ در و دیوار سے حسرت برس رہی ہے۔ جیسے اجاڑ سی مسجد ہو کوئی۔ ان لوگوں کو کام ہی کیا ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے موٹی موٹی کتابوں میں آنکھوں کو گڑوئے ہوئے ہیں۔ بیوی سر سے تھا بہ کیسے سجدے کر رہی ہیں اور لڑکی چولھا پھونک رہی ہے۔ ایک نوکر تک نصیب نہیں موؤں کو۔"

شکیل نے آنکھ سے رضیہ کو اشارہ سے چپ رہنے کو کہا اور انا جی سے بولے: "لاحول ولا قوۃ۔ مولوی صاحب کو اٹھا کے رکھ دیجئے۔ طاق پر۔ میں ان کی صاحبزادی سے باز آیا۔

آپ اگر بیرسٹر صاحب کی لڑکی کو اچھا سمجھتی ہیں تو پھر وہیں بات چلایئے واہ۔ خوب سا جہیز۔ جوڑے گھوڑے کے نقد بیس ہزار اور کیا کہتے ہیں سنہری کے سونے کے پائے۔ واہ واہ۔ سچ مچ۔ میرا کمرہ تو جگمگا جائے گا!"

"شکیل بھائی۔۔!" رضیہ چیخی۔

"تم چپ رہو۔" شکیل نے کہا۔ "تمہیں نہیں ملے سونے کے پائے۔ تم اس رشک کے مارے یہ چاہتی ہو کہ مجھے بھی نہ ملیں۔!"

انا جی کھل اٹھیں۔ "اے ہاں۔ وہ عقلمند ہے۔ زمانے کا چلن پہچانتا ہے۔ آج کل سب ہی لڑکی والوں سے خوب گھسیٹ رہے ہیں۔ ہم کیوں نہ لیں۔ کوئی گناہ تو کر نہیں رہے۔ اور نہ اپنی طرف سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ تو خود دینے پر تلے بیٹھے ہیں!"

رضیہ کو بے حد صدمہ ہوا وہ اپنے بھائی کو بہت شریف، بلند خیال اور وسیع النظر سمجھتی تھی۔ مگر اسے بھی آج کل کے نوجوانوں کا سا لالچی، دولت کا بھوکا دیکھ کر وہ بس آہ بھر کر رہ گئی۔

رضیہ کے نزدیک مولوی صاحب کی لڑکی مثالی تھی۔ صورت و سیرت میں لاجواب، گھر گرہستی میں طاق۔ بے زبان، شریف، مگر بیرسٹر صاحب کی کثیر دولت نے اس بے چاری کو شکست دے دی۔؟

اکیلے میں شکیل نے رضیہ پر آنکھیں نکالیں: "ابھی تک مجھے سمجھ نہ سکیں۔ میں نے تمہیں آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔ مطلب یہ کہ انا جی کو دل کی حسرت نکالنے دو۔ ذمہ داری کا احساس انھیں نچلے ڈالتا ہے۔ ہو گا وہی جو تم چاہو گی۔ میں بھلا بیرسٹر صاحب کی موڈرن صاحبزادی سے اپنی چھاتی پر کودوں کیوں دلواؤں گا۔ وہ اپنے سونے کے پائے اور ہیروں جڑی سنگار میز رکھے رہیں اپنے پاس۔!"

"تو پھر بھیا۔ مطلب یہ کہ ـــ آپ انا جی سے کیوں نہیں کہہ دیتے۔" رضیہ خوش ہو گئی "میں نے تو امی جان کو بھی منع کر دیا ہے۔ کچھ نہ کہیں کوئی رائے نہ دیں۔ انا جی کو خود ہی پچھتانے کے بعد راہ راست پر آنے دو۔!"

شکیل نے کہا: "ان کے حقوق سے کوئی عہدہ برا نہیں ہو سکتا نا۔ انھوں نے دودھ پلایا ہے مجھے۔ مجھ پر ان کا احسان ہے۔ میں ان کی دل شکنی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ ان کا ہمارے سب کے سوا کون ہے۔ بیچاری۔ اپنی دانست میں میرا بھلا کر رہی ہیں۔ کر لیں وہ اپنی سی۔ ایک دن

وہ خود قائل ہوں گی ۔"

پھر انا جی نے طے کیا کہ جب تک رضیہ میکے میں ہے ۔ اسے ساتھ لے کر دونوں لڑکیوں کو دیکھ آئیں ۔ رضیہ کو شکیل کی شہ مل چکی تھی ۔ لہٰذا وہ بے حد مطمئن تھی ۔ بن ٹھن کے انا جی کے ساتھ گئی ۔ مولوی صاحب کی بیوی کے ہاں کہلوا یا تک نہ تھا ۔ مطلب یہ تھا کہ ان کے گھر کا رہن سہن اور لڑکی کو اچانک دیکھ لیں ۔ رضیہ تو اس گھر میں ہزار بار آ جا چکی تھی ۔ اسے معلوم تھا کہ مینا نے گھر جیسا ان سا بنا رکھا ہوگا ۔ مگر انا جی نے نجانے کیا سوچ رکھا تھا کہ گھر کوڑے کرکٹ کا ڈرم ہو رہا ہوگا سو ان بیچاری کو بہت مایوسی ہوئی ۔ مولوی صاحب کا چھوٹا سا خوب صورت گھر آئینہ ہو رہا تھا ۔ کیا مجال کہ ڈھونڈے سے در و دیوار پر گرد کا شائبہ اور فرش پر تنکے یا کاغذ کا معمولی سا پرزہ تو ملے ۔ انہیں سامنے ہی مینا بھی نظر آئی ۔ بیٹھی اون سے کچھ بن رہی تھی ۔ اس نے چپکے سے سر جھکا کر انا جی کو سلام کیا اور پھر رضیہ کو دیکھ کر مسکرائی ۔ رضیہ اس کے پاس جا بیٹھی ۔

کیا بن رہی ہو ۔ ؟" رضیہ نے انا جی کو اس کی آواز سنانے کے لئے پوچھا ۔ باجی کے بچے کا سویٹر ہے " مینا بولی ۔

انا جی نے کھنکھار کر حلق میں پھنسے پان کے ملغوبے پر فتح پائی ۔۔۔۔۔۔

آؤ تمہارے کمرے میں چلیں " رضیہ نے کہا اور مینا کو کھینچ لے گئی ۔ انا جی نے اس کا لچکدار بدن اور پیٹھ پر جھومتی ناگن کی سی چوٹی بھی دیکھ لی ! ۔ دل میں قائل ہوئیں کہ بال بہت خوشنما تھے ۔ ! وہ باہر ہی بیٹھی مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی بہنوں سے باتیں کرتی رہیں ۔ بھنک تک نہ دی کہ کس مقصد کے تحت آئی تھیں ۔ پوچھنے پر مکاری سے بولیں ۔ بس یونہی رضیہ مجھے ساتھ لے کر آ گئی اپنی سہیلی سے ملنے ۔ بات دل لگتی تھی ۔

رضیہ نے دیکھا کہ مینا بے حد پرکشش ہو گئی تھی ۔ وہ بے ساختہ اس پر ریجھ گئی ۔ اور بیٹھی بیٹھی باتیں کرتی رہی ۔ اس نے بھی اپنے دل کی بات اس سے نہ کی ۔

واپسی پر انا جی کچھ دلگرفتہ سی تھیں ۔ بولیں ۔

لڑکی تو اچھی ہے ۔ مگر بی بی دبلی دبلی سی ایسا لگتا ہے جیسے جسم میں رس نہیں ۔ سمجھیں !" رضیہ دل ہی دل میں آگ بگولہ ہو کر رہ گئی ۔ اس عمر میں ان پر کیا ہوس کا سوار ہوا ہے ۔ روپے پیسے کو دین ایمان سمجھنے لگی ہیں ۔ ارے اچھی لڑکی بجائے خود ایک مکمل جہیز ہے ۔ مگر وہ کچھ نہ بولی ۔

گھر آ کر انا جی نے مینا میں ہزاروں کیڑے نکال دیئے ۔ دبلی سوکھی ہے ۔ سارا خون تو نگوڑے بال ہی چوس لیتے ہیں ۔ اتنے لمبے بال لے کے کیا کرنا ہے ۔ رنگ پھیکی سیٹھی ۔ اس رنگت پر گلابی ہونٹ کیسے بُرے لگ رہے تھے ۔ !

شکیل مسکرائے ۔ انا جی نے طے کر رکھا ہے کہ کسی سفید چیز کو بھی سیاہ ثابت کر دیں گی ۔ مگر وہ خاموش رہے ! ۔

مینا لسٹ پر سے اتری تو پروگرام بنا کہ اب محترمہ شہناز صاحبہ کی زیارت سے مشرف ہوں جو بیرسٹر صاحب کی اکلوتی نور نظر تھیں ۔ ان کے ملفوظات بہت طویل تھے ۔ وہ سونے چاندی کی مورت تھیں اور انا جی کی رال ٹپک رہی تھی ۔ بری طرح مفتون تھیں اور فیصلہ کر چکی تھیں کہ بس انہی صاحبزادی کو بہو بنا کر لے آئیں گی ۔

دوسرے دن رضیہ اور انا جی حسب پروگرام اطلاع دیئے بغیر بیرسٹر صاحب کے ہاں جا دھمکیں ۔ ان سے اور ابا جان سے رسمی سی خیر صلاح تھی ۔ بیرسٹر صاحب تو منہ بنا کر رہ گئے ۔ مگر ان کی بیگم نے سلام کی سکہ اڑانے کے بعد تشریف آوری کی وجہ دریافت کی ۔ انا جی جو ایک رٹ کو ٹھی ۔ اور اب ڈرائینگ روم کی فیشن ایبل سجاوٹ دیکھ کر آدھی اور آدھی رشتہ خبطی ہو رہی تھیں ۔ جھوٹ بولنے بیٹھ گئیں ۔ ایک فرضی کا قصہ سنایا جس میں بیرسٹر صاحب کی مدد درکار تھی ۔ جب بیرسٹر صاحب نے کیس کی نوعیت پوچھی تو وہ بدحواس ہو گئیں ۔ ادھر ہنسی ضبط کرتے کرتے ادھ موئی ہو رہی تھی ! ۔ دفعتاً اللہ میاں کو انا جی کی کسمپرسی پر ترس آ گیا ۔ چنانچہ کوئی فرضی کیس سنانے کی نہ آئی ۔ کمرے میں یکبارگی بجلی سی چمکی تھی ! ۔ انا جی نے چندھیا کر محترمہ سامان لڑکی کو دیکھا ۔

شہناز بہن " بے ساختہ رضیہ کے لبوں سے نکلا ۔

ہاں ۔" وہ کچھ حیران سی نظر آئی ۔

انا جی آنکھیں پھاڑے منہ کھولے شہناز کو گھورے جا رہی تھیں ۔ غضب تھا خدا کا ۔ اتنی بڑی تو منبر سی چھوکری ۔ نہ شرم نہ حیا ۔ باپ کے آستینیں چوٹ فراک پہنے کھڑی تھی ۔ اوپر سے یہ ستم کہ دوپٹہ بھی

اوڑھے نہ تھی۔ اپنے سینے پر چادرہ برابر کرتے انا جی نے چند نظروں سے بیرسٹر صاحب کو دیکھا اور عرق عرق ہو گئیں۔

یہ میری بیٹی ہے شہناز ــــ" بیرسٹر صاحب نے تعارف کرایا۔

نوج" انا جی کے لبوں سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔ پھر اپنے حساب لوں انھوں نے بڑی ملائیت اور محبت سے کہا" بیٹی۔ اتنی سردی میں تم نے [illegible] آستین کا شرٹ (شرٹ) پہن رکھا ہے۔ آستینیں کیوں نہ [illegible] بی بی۔ [illegible] کم پڑ گیا تھا کیا۔ [illegible] بیوی تم نے تو دوپٹہ [illegible] نہیں اوڑھا۔ [illegible] لگ رہا ہے۔"

نان سنس۔ رضیہ۔ یہ کیسا جوک ہے۔" رضیہ کیا کہتی۔ بے بسی سے انا جی کو دیکھ کر [illegible] شہناز نے ہونٹ سکوڑ رکھے تھے۔

پھر اچانک پردہ سرکا اور ایک اسمارٹ نوجوان کمرے میں گھسا۔

اوئی۔ یہ مردوا کون ــــ!" انا جی نے چادرے کا نقاب منھ پر ڈال لیا۔ ارے بھئی تم ــــ اختر احمد۔ بھئی یہاں پردہ ہے" بیرسٹر صاحب بولے۔

اوہ۔ اختر۔ کم ان" شہناز چہکی" میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ تم نے کتنی دیر لگا دی۔ کیا کرنے لگے تھے۔!"

لو اور سنو" انا جی نے سوچا" موئی کے منھ سے مردانی بولی۔ ہنھ۔ انھوں نے چادرے کے کونے سے قہر آلود نگاہ شہناز پر ڈالی ــــ

اچھا۔ ڈیڈی۔ اب میں تو چلا" شہناز بولی" رات کو کلب میں ڈانس ہے اگر دیر ہو جائے تو فون پر فون کرکے بور مت کیجئے گا۔ میں اگر ہو سکا تو کلب کے کینٹین میں ڈنر لے کے آؤں گا۔ رائٹ؟!" اس نے آگے بڑھ کر اختر کا ہاتھ تھام لیا۔

تمہارے ہاں مہمان آئے ہیں" پھسپھسی آواز میں بیگم بولیں" آج کا ڈانس پھر کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ اس وقت تو تم رضیہ کو کچھ گانا سناؤ۔ ناچ دکھاؤ"

بیگم کو پورا شبہہ تھا کہ یہ محترمہ اور لڑکی پیام سلام کے سلسلے ہی میں شہناز کو دیکھنے آئی تھیں۔ چنانچہ وہ کچھ نروس ہو رہی تھیں۔

ناچ گانا۔!" انا جی بھونچکا سی ہو کر بولیں۔

ہاں۔" بیرسٹر صاحب نے سگار کا دھواں بے خیالی میں انا جی کے منھ پر چھوڑتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا" ہم نے اسے خاص کر سکھایا ہے۔ کلب میں تو کوئی بھی اس کے ڈانس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج اس کا وہاں خاص پروگرام ہے"

اب انا جی کے صبر کا مٹکا۔ (پیمانہ تو بہت مختصر سا ہوتا ہے۔) چھلک گیا۔ تڑپ کر بول ہی تو دیں" اے توبہ کرو بیوی۔ جوان جہان لونڈیا کا ناس مار رہی ہو۔ کل کلاں کو کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو رونے کو آنسو نہ ملیں گے۔ ایک تو تم نے لڑکی کو سر سے ننگا کر رکھا ہے۔ بے دوپٹہ وہ غارت گئے کلب جائے گی۔ میں کہوں۔ تم ہی لوگوں کی شرم کو کیا ہوا ہے۔!

انا جی۔ انا جی ــ" رضیہ نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سہم گئی تھی۔

اے یو شٹ اپ۔" شہناز گرجی" یہ بڈھی کیا بکواس کر رہی ہے۔ یہ ہے کون۔ اسے نکالئے کمرے سے ــــ!"

خوب۔ بڈھی بک رہی ہے" انا جی نے رضیہ کا ہاتھ جھٹک دیا" اچھا تم نے چار جماتیں (جماعتیں) پڑھ کے بڑے چھوٹے کا ادب قاعدہ بھلا دیا ہے۔ سب کی زبان انا جی انا جی کہتے سوکھے۔ اور یہ بالش بھر کی لونڈیا بڈھی کہے۔ واہ۔ کیا تمیز ہے۔!"

محترمہ۔ آپ ہی زبان کو قابو میں رکھئے۔" بیرسٹر صاحب نے بے حد ناگوار انداز میں انا جی سے کہا۔

آئی ایم سوری ڈیڈی۔؟" شہناز نے کہا" میں ایسے گنواروں سے بات کرنا اپنی انسلٹ سمجھتی ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ رات دیر سے آؤں گی۔ بائے۔؟" اور کمر مٹکاتی کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

انا جی پر غصہ، جھینپ، جھلاہٹ۔ کس جذبے کا حملہ زیادہ ہوا تھا۔ وہ تجزیہ کرنے سے قاصر تھیں۔

پھر کھنکار کر بیگم بولیں" تو پھر۔ وہ جو ڈاکٹر صاحب کا پیام آیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ شاید بات چیت ــــ!"

کہاں کی بات چیت" انا جی بھنا کر کھڑی ہو گئیں" میرا بچہ منھ مرا بے زبان ہے۔ میں کیوں اسے بلا کے گلے ڈالوں گی۔ چلو بی بی اٹھو اپنی جگہ سے" انھوں نے رضیہ سے کہا۔ حالانکہ ملازم ٹرالی کمرے میں لا رہا تھا۔ مگر انا جی اسے بچوں کے کھیلنے کی ریل گاڑی سمجھ کر رقیہ کا ہاتھ پکڑے کمرے سے نکل آئیں۔

راستے بھر وہ بڑبڑاتی رہیں۔ شیشے میں بال پڑ جائے تو پھر وہ کون سے کام کا رہتا ہے۔ نوج۔ لڑکی ہے کہ لونڈہ۔ جا رہا ہوں۔ آہا

ہوں۔ ہنہہ۔ سر پر ہاتھ رکھ کے ٹسوے بہائیں گے ایک دن اماں باوا۔
رضیہ کا حال ہنسی کے مارے ابتر تھا۔

گھر پہونچیں تو سب دالان میں کھڑے تھے۔ ابا جان نے ملاقات کے نتیجہ کا حال معلوم کیا۔ انا جی نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں ماجرا سنایا اور پھر فیصلہ کرتی ہوئی بولیں۔

"اچھا ہوا کہ بات پکی کرنے سے پہلے صاحبزادی کے رنگ دیکھ لئے۔ ہنستی کیا ہو۔ کوئی میں علامہ غیب تو تھی نہیں۔ دھوکے میں آگئی اور کیا۔!"

شکیل نے منہ سکھا کر کہا: "انا جی میں اسی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ پھر مجھے طلائی پائے کہاں سے ملیں گے۔!"

جھاڑو پھیرے ان کی مہری اور طلائی پایوں پر۔ میری عقل پر تو پتھر پڑے تھے۔ سچ ہے کہ لالچ بڑی بلا ہے۔ لوج۔ میں اپنے بچے کی قسمت پھوڑ دوں"

انا جی نے توبہ تلا کرتے ہوئے کہا: "اے میری مینا تو زمین کی حور لگتی ہے۔ ہاں ہاں۔ مجھے دیکھ کر ایسا سر نہوڑا کے بیٹھی ہے کہ جی جان سے میں اس ادا پر صدقے جاؤں" وہ لڑکی گھر میں آئے گی۔ گھر جنت کر دے گی۔ بھلا مینا اور اس نگوڑی شہناز کا کیا مقابلہ۔ ہاں سے دیں مولوی صاحب کانی کوڑی بھی۔ وہ اپنی بچی مجھے دے دیں بس۔ اے بی بی رضیہ۔ چلو۔ بات پکی کر آئیں۔ اللہ نہ کرے ایسا نہ ہو کہ کہیں مولوی صاحب کہیں اور بات طے کر دیں۔!"

ابا جان ہنس رہے تھے۔ امی خوش خوش تھیں۔ رضیہ نے سوچا کہ شکیل بھائی کا کہا سچ ہوا۔ وہ پُر مسرت لہجے میں بولی۔

"ابھی چلیں گی انا جی۔؟!"

"اے ہاں۔ اور کیا۔ مگر ذرا چھری تلے دم لے لو۔ میں حلوائی سے کہہ آؤں۔ پچیس سیر کے لڈو بنا دے۔ خالی ہاتھ کیا جائیں۔!" "سونے کے پایوں میں آگ لگے۔!"

سب ہنستے رہ گئے۔

انا جی چادر لپیٹ کر حلوائی کو آرڈر دینے چل دیں!!!

- "عورت" اور "موسیقی" کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ (گولڈ اسمتھ)
- (اخباری رپورٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے) مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتی کہ میری عمر کیا ہے۔ آپ خود ذرا سوچیں میں بتا بھی کیسے سکتی ہوں کیونکہ عمر تو ہر دم تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

(اداکارہ جی۔ کارسن)

اِدراکِ صحت

شاعر لکھا

ہو اگر ہر صبح کو سیر اور ورزش کا عمل
آ نہیں سکتا نظامِ کارِ صحت میں خلل
جسم کے اعضا کی ہوتی ہے ریاضت سے
ہاتھ پیروں میں، رگوں میں اک نئی آتی

جاگتا منظر، کھلا میدان اور تازہ ہوا
دوڑنے میں لطف آئے، سانس لینے میں مزا
تجربہ شاہد ہے جن کو ہے سحر خیزی سے
وہ کبھی خواب گراں سے ہو نہیں سکے

مستند نسخہ ہے یہ، اس میں نہیں کچھ قال و قیل
دیر تک سونا ہے خود بیمار ہونے کی دلیل
چند سطریں زندگی پڑھ لے جو اس مضمون
سست ہونے ہی نہ پائے پھر روانی خو

صبح دم اٹھنے سے خود ہی ٹوٹ جاتا ہے جمود
آدمی کو جاگتا محسوس ہوتا ہے وجود
زندگی گانے لگے خود اپنی آگاہی کا ر
ہو جو دو پل کے لئے صحت کی خاطر دوڑ کا

جسم سے بیماریوں کی دوستی ہو کیا مجال
ہم اگر رکھیں خود اپنی تن درستی کا خیال
حفظِ صحت کیا ہے حسنِ ارتقا کا سا
جس طرح اک پھول کے نشوونما کا سا

زندہ رہنا ہے تو اپنے سے محبت شرط ہے
زندگی کے واسطے ادراکِ صحت شرط ہے

بشکریہ ہمدرد ——— کراچی

- عورتوں کو اپنی عمر کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اصل جس کی اہمیت ہے وہ ان کا ذہنی رد عمل ہے۔ اگر ان کی تمنائیں، امیدیں سرد نہیں ہوئیں اور ان میں جوش اور جذبہ کی گرمی ہو تو ان کے لئے بڑھاپے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (جوانا)

سہارا

عطیہ ہدایت اللہ

باہر گلی کے پتھریلے فرش پر بارش کی چھا چھم لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے ہر سو خاموشی اور اندھیرا ہے لگتا ہے آج اتنا پانی برسے گا کہ پھر شاید برسنے کا نام نہ لے۔ کبھی کبھی تیرہ و تاریک آسمان کی وسعتوں میں بجلی کا کوندا لپک اٹھتا ہے گلی کے آخر تک روشنی کی کرن سی چمکنے لگتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہی ہولناک تاریکی اور سائیں سائیں کرتی تیز ہوا کا شور ہی رہ جاتا ہے۔ اپنے جلتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگے زرد گال کھڑکی کے ٹھنڈے یخ شیشے پر ٹکا کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر بھڑکنے والی، جھلسا دینے والی آگ لمحہ بھر کو دھیمی ہو گئی ہو۔ بجلی چمکتی ہے تو کمرے میں ایک نظر ڈال لیتی ہوں تینوں پلنگوں پر میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی، رضائیوں میں سکڑے بے خبر سوئے ہوئے ہیں بجلی کی کڑک سے کبھی کبھی بچہ بے چینی سی کروٹ بدلنے لگتا ہے تو رضائی کا کونہ نیچے لٹک آتا ہے میں آہستہ سے جا کر انھیں پھر سے ڈھانپ دیتی ہوں مجھے ان کی اتنی بے فکری کی نیند پر رشک آنے لگا ہے۔

آج جو میرے دل میں ہر سو اتنا اندھیرا ہے کراہیں ہیں، آنسو ہیں وہ بھلا نو عمری میں کہاں تھے۔ میرے سامنے تو میری ماں کی پر شفقت ڈھال کی تنی ہوئی تھی جس کی آڑ میں ہر غم، ہر دکھ، ہر پریشانی سے بے خبر سکون کے دن گزار رہی تھی۔ آج میں بھی اسی مقام پر آ کھڑی ہوئی ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ اسی کا ساتھی موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان سے چھین لیا تھا وہ بیوہ تھیں، اور میرا ساتھی میری ہی ہم جنس کے ہاتھوں مجھ سے چھن چکا تھا میرے سر کا تاج کسی اور کے سر پر جگمگا رہا تھا چھ سال ہو گئے اس نے ہمیں بے سہارا چھوڑ کر زندگی کی راہوں کو کسی دوسری ساتھی کے قہقہوں سے سجا لیا تھا۔

میری ماں کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی مادی وسیلہ نہ تھا، نہ تعلیم، نہ شوہر کی جائیداد ایسے میں ہم دونوں کو میری بیوہ نانی اور ماموں نے بڑھ کر تھام لیا۔ انھوں نے زندگی کی کڑی دھوپ میں سائبان بن کر ہمیں جھلسنے سے بچائے رکھا۔ ماموں نے جہاں معاشی تحفظ فراہم کیا وہاں ماں نے اپنی جوانی کی ہر پکار پر کانوں میں روئی ٹھونس کر صرف میری پرورش کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ انھوں نے راہ حیات میں چلنے والے تیز و تند جھکڑوں سے مجھے ہمیشہ بچائے رکھا۔ لوگوں کی باتیں سنیں۔ تنہا ہوں کا مقابلہ کر کے ہر مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑی رہیں لیکن اپنے کردار یا میری پرسکون زندگی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ لیکن آج زخموں کے سارے ٹانکے ادھڑ گئے ہیں آج تو وہ بھی میری سسکیاں سن کر بے تابانہ میرے آنسو پونچھنے آگے بڑھنے نہ آئیں۔

آج قسمت نے مجھے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے دل کے زخموں میں شیشے کی کرچیاں گھس گئی ہیں، دل سے تو اٹھارہ سال ...... سے قطرہ قطرہ خون بہہ رہا ہے بے بسی اور مہر بہ لب زندگی گزارتے ہوئے میں اندر سے بکھر گئی ہوں، ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔

دل چاہتا ہے آج اتنی بارش برسے کہ یہ سارا شہر یہ گلیاں، یہ مکان اور میں خود اس پانی میں بہہ جاؤں تاکہ تم نے جو سوال آج میرے سامنے اٹھایا ہے اس کا جواب کل تمھیں دینے سے پہلے بہہ جاؤں۔

محمود۔ بتاؤ نا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میرا دل اتنے برس و سال کی گردش کے بعد بھی کیوں ایک ہی کعبے کا طواف کر رہا ہے اسے یقین کیوں نہیں آسکا، کہ زمانہ بہت آگے جا چکا ہے میرے بچے اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ میرے چہرے پر گزرے ان گنت سالوں نے کئی نشان ڈال دیئے ہیں، پر شاید اس پاگل دل کا بھی قصور نہیں۔ اس زخمی۔ بپھرے ناگ کو میں ساری عمر سلائے رکھنے میں کامیاب رہتی۔ اگر میرے شوہر سلطان کا سلوک میرے ساتھ ٹھیک ہوتا میرے شفیق ماموں نے تو اپنی یتیم بھانجی کو راج سنگھاسن پر بٹھانے کی کوشش کی تھی، پر وہ جو کہتے ہیں کہ تخت ماں باپ دے تو دیں پر بخت تو خدا دیتا ہے سو میرا بخت کبھی نہ جاگا۔

نانی اماں کے جوڑے تمہارے میرے بندھن کو ان کی وفات کے بعد ماموں نے کوئی اہمیت نہ دی، وہ تمھیں ایک بے سہارا غریب انسان سمجھتے رہے۔ انھیں ہم دونوں کے والہانہ جذبوں کا کوئی اندازہ نہ تھا جب ماں نے مجھ سے سلطان کے بارے میں رائے مانگی تو میں زندگی میں پہلی بار تڑپ تڑپ کر روئی، اماں مجھ پر یہ ظلم نہ کرو، تمھیں تو ہے تم لوگوں ہی نے تو بچپن سے میرا دامن محمود کے دامن سے باندھ دیا تھا کیا ہوا اگر وہ غریب ہے وہ پڑھ رہا ہے دن رات ایک کر رہا ہے، وہ آئندہ زندگی میں کامیاب ہوگا۔ اسے مہلت دیں۔ میں نے اماں کی گود میں منہ چھپا کر فریاد کی لیکن ماں کی آنکھوں

سے چھپا چھپ آنسو برسنے لگے۔ وہ ماموں کے بے پناہ احسانوں کے بوجھ تلے دبی تھیں اب وہ بھائی کا حکم کیسے ٹالیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم ان کے خالہ زاد بھائی تھے تمہاری بیوہ ماں کی وفات کے بعد نانی اماں تمہیں اپنے آبائی دور دراز کے گاؤں سے ساتھ لے آئی تھیں۔ انھوں نے تمہیں تعلیم دلائی ہم ساتھ ساتھ بڑے ہوئے۔ نانی اماں ہی نے بچپن سے ہمارا رشتہ طے کر دیا تھا وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے بہو بنانے کے سہانے خواب دکھاتی رہیں۔ اب جب یہ ننھا سا پودا ہم دونوں کے دلوں میں اپنی جڑیں مضبوط کر کے تناور درخت بن چکا تھا تو ماموں اسے اکھاڑنے پر تل گئے میں نے کتنے ہی دن رو رو کر گزار دیئے، امی ماموں کو بہانے بنا کر ٹالتی رہیں۔

تم ان دنوں شہر میں پڑھ رہے تھے، میں نے تمہیں خط لکھا تم دوڑے چلے آئے۔ تمہارا چہرہ ستا ہوا تھا رنگت اڑی ہوئی تھی کتنے کمزور لگ رہے تھے تم، موقع پا کر تم باورچی خانے میں لپک کر چلے آئے، شانو! تم انکار کر دو۔ کسی کو یہ ظلم نہ کرنے دو، میں پاگل ہو جاؤں گا میرے حال پر رحم کرو شانو، میں تمہارے حصول کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے ہوں۔"

محمود میں امی سے سب کچھ کہہ کر ہار چکی ہوں، وہ بھائی کے سامنے زبان نہیں کھولنا چاہتیں تم ہی ان سے کہہ کر دیکھ لو، پھر تم نے امی سے استدعا کی، نانی اماں کا ارادہ یاد دلایا اپنی میری پسند کا دبے لفظوں میں اشارہ دیا۔ پر امی نے رو رو کر جیسے مجھے ہرا دیا تھا۔ دوسری رات نہ جانے تمہارے کانوں میں کیا کچھ پھونکا گیا کہ تم صبح ہوتے ہی مجھ سے ملے بغیر چلے گئے میں بے چین رہی، عرصے بعد تمہارا خط ملا کہ شانو حالات بدل گئے ہیں، میں نے جب تک دنیا نہیں دیکھی تھی بس ہر طرف تم ہی تم نظر آتی رہیں پر اب جبکہ یہاں کے ایک گھرانے سے میری ملاقات ہوئی تو ان کی لڑکی سے مل کر میں کچھ بچکارہ گیا ہوں اس کے باپ نے مجھے بیٹا بنا لیا ہے، نانی اماں کا طے کیا رشتہ سمجھو ان کے ساتھ ختم ہو گیا اب مجھے اس رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں ویسے بھی تمہارے ماموں اور امی کو تمہاری شادی کی جلدی ہے اور میں ابھی اس جھنجھٹ میں پڑنے کے قابل نہیں ہوں۔ تم اپنے ماموں کی بات مان لو۔"

میں سکتے میں رہ گئی دل خون خون ہو گیا۔ اب کس کے بھروسے پر احتجاج کرتی، میرا مان ٹوٹ گیا، تب میں نے چپ چاپ ماموں کی

مرضی کے آگے سر جھکا لیا پر ایک پھانس تھی جو دل کے کسی کونے میں چبھتی رہی اور درد دیتی رہی، اگر روپے پیسے، زیور، کپڑے سے کوئی خوش نصیب بن سکتا ہے تو وہ تو میں بن گئی۔ پر دل کا سکون جس چیز کو کہتے ہیں وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا۔ میں اپنے شوہر سلطان سے کہتی کہ میری طرف توجہ دو، میں ایک زندہ انسان ہوں شوپیس نہیں۔ مجھ سے باتیں کرو، میرے چھوٹے چھوٹے غم، چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹ لو، اتنے سخت پتھر جیسے نہ بنو کہ میں تمہیں چھو بھی نہ سکوں۔ سونے کے پہاڑ سے سر تو ٹکرایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کا یہ لمبا سفر گزارا نہیں جا سکتا۔ میں اس کا دامن تھام لیتی وہ طنزیہ ہنسی ہنستا۔ ارے تم خوش نہیں ہو اتنے شاندار بنگلے میں، کبھی کہاں سے نکل کر کہاں آ گئیں اور تمہارا دل مطمئن نہیں، زندگی کا انداز بدل ڈالو، ماضی کو دفن کر دو، تم محبت مانگتی ہو پر اس دنیا میں محبت سے زیادہ طاقت ور چیز پیسہ ہے، اسے مجھے اکٹھا کر لینے دو، میں کیا کہتی زبان سے خاموش رہی پر میرا رواں رواں چیخ اٹھتا، احتجاج کرتا اپنے نظر انداز ہونے پر، مجھے روپے نہیں چاہئیں سلطان لے لو یہ کوٹھی یہ کار، یہ ساز و سامان مجھ سے، مجھے تمہارے مضبوط سینے کی ضرورت ہے جس میں سر چھپا کر میں ماضی کی ہر یاد بھلا سکوں، میں نے کتنی بار سلطان سے احتجاج کیا، اپنی بے پناہ مصروفیت میں چند لمحے ہمیں بھی مستعار دے دیا کرو، دیکھو تمہارے بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کے مسائل بڑھ رہے ہیں پر وہ کچھ نہ سمجھ پاتا وہ دولت کی چکا چوند میں سب کو مسلسل نظر انداز کرتا رہا۔

کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ سلطان شہر کا ایک مشہور و معروف سوشل ورکر بھی تھا، لوگوں کے مسائل حل کرتا اخباروں میں اس کے انٹرویو چھپتے، تصویریں آتیں، اس کی غریب پروری اور دکھی انسانیت کی خدمت کے جذبے کی تعریف میں پل باندھے جاتے، وہ اپنی اور دوسروں میں اجالا پھیلاتا چلا گیا پر اس کے اپنے گھر میں اندھیرا رہا آخر میں نے ان حالات سے سمجھوتہ کر لیا دل میں اٹھنے والی چیخوں کو دبا نا سیکھ لیا،

لیکن ایک بار یہ دبی دبی لہریں زبردست سیلاب بن کر میری ہنسی میری خوشیاں، اطمینان، سکون، سب کچھ بہا لے گئیں ایک ہی ریلا دل کے ضبط کے باندھ کو بہا لے گیا اور یہ اس دن ہوا جب سلطان نے ایک آزاد خیال ماڈرن اور دولت مند تاجر کی لاڈلی بیٹی سے رشتہ جوڑ لیا۔ وہ مجھے زندگی کے ایسے موڑ پر تنہا چھوڑ گیا جہاں میں زندگی کے لق و دق صحرا میں تپتے ریت کے اوپر ننگے پاؤں منزل سے بہت دور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہاتھ

پکڑے چلی جا رہی تھی گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی سہارا، کوئی ڈھال، کوئی شفیق ہاتھ میرے آنسو پونچھنے، مجھے حوصلہ دینے والا موجود نہیں تھے سلطان نے تو اپنی بگیا میں ایک نئی زیلی اور کھلی کلی اڑس کر فخر سے سر تان لیا اور میں اس کے ہاتھوں مسلے ہوئے پھول کی طرح پتی پتی ہو کر بکھری پڑی ہوا کے دوش پر ادھر سے ادھر اڑی چلی جا رہی تھی، وہ مجھے طلاق دینا چاہتا تھا، پر میں نے اس کے پاؤں پڑ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا بچوں کی پہچان تو باپ سے ہوتی ہے نا اور میں ان سے پہچان کا یہ ذریعہ چھینے جانے کو کسی صورت تیار نہ تھی۔ ایک طلاقن کی بیٹی سے بھلا شادی کون کرتا ہے، میرے بیٹوں کو سا[ری] عمر طعنے ملتے یہ معاشرہ ناک میں دم کر دیتا۔

میں خاموشی سے اپنے معصوم بچوں کا ہاتھ پکڑے نانی اماں کے ویران خالی گھر میں اٹھ آئی۔ انھوں نے زندگی میں اسے اماں کے نام کر دیا تھا اس کا ایک حصہ ٹھیک کر کے میں نے ایک سرکاری ملازم کو کرائے پر دے دیا اور خود ایک مقامی مڈل اسکول میں پڑھانے لگی، زندگی کی گاڑی گھسٹتی رہی کبھی کبھی دل چاہتا ہے چیخ چیخ کر رو دوں اس المیے پر، پر بچوں کی وجہ سے ایسا بھی نہیں کر سکتی، اب میں ان کے لئے جذباتی سہارا ہوں، ماں بھی ہوں اور باپ بھی انھیں محرومی کے احساس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔

سلطان اپنی دنیا میں مگن ہے، میں نے ان صدمات کو زندگی کا حصہ سمجھ کر سر جھکا لیا ہے، میں اس جھیل کی طرح ساکن تھی جس کے سینے میں ہزاروں لہریں مچلتی ہیں لیکن کسی کو اندازہ نہیں ہو پاتا۔ مجھے اپنے بچوں کے لئے ڈھال بننا تھا نا۔ میرے بچے اب بڑے ہو گئے تھے، میرے دکھ کو سمجھتے تھے میرے آنسو بہانے پر بھی وہ تڑپ اٹھتے تھے وہ اپنی ضرورتوں کو محدود رکھتے تھے۔ میں انھیں اداس نہ دیکھ سکتی ہیں سلطان کے راستے میں کبھی نہ آئی، کبھی کچھ مانگا بھی نہیں محبت یا احترام کا رشتہ زبردستی تو نہیں جوڑا جاتا نا۔

میں ان کانٹوں بھری راہوں پر اپنی ماں کی طرح بہادری سے چلتی چلی جاتی اگر آج محمود اچانک میرے راستے میں نہ آ جاتے بچوں کے اسکول و کالج جانے کے بعد میں گھر کے کاموں میں جٹ گئی تھی۔

ہاں تو ایک ہی شادی کی ہو گی پر کی کہاں، یہ تو بتائیے۔

"تمھیں سب پتہ ہے پھر پوچھتی ہو۔ ہاں ٹھیک ہے۔ دنیا کی نظروں میں ابھی تک کنوارا ہوں پر میرے دل کے اندر ایک ہنستا بستا گھر آباد ہے ایک پاگل سی لڑکی بستی ہے اس کے پیارے پیارے بچے ہیں

وہ آلوچے کے پیڑ پر کھلنے والی شگفتہ کلیوں پر نظریں گاڑ کر بولنے لگا۔ اسکی بجھی بجھی آنکھوں میں کیسی روشنی سی چمکنے لگی تھی میں نے آنکھیں جھکا لیں محمود تم مرد لوگ کتنے چالاک ہو، توڑتے، جوڑتے ہو، پھر ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہو، تمہیں عورتوں سے مذاق کرنا کتنا آسان لگتا ہے میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ کر دکھ سے سوچا پھر دھیرے سے بولی محمود تمہیں اپنا وہ آخری خط بھول گیا جس میں مجھے تم نے شادی رچانے کا مشورہ دیا تھا، اس کے الفاظ مجھے ازبر ہو چکے ہیں میں نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر گہرا سانس لیا۔

خدا گواہ ہے شانو کہ میں نے وہ خط تمہاری امی کے کہنے پر لکھا تھا، انھوں نے رو رو کر مجھ سے اپنی عزت و وقار کا بھرم قائم رکھنے کی التجا کی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے حکم سے روگردانی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور میں ان کی مجبوری سمجھ کر خاموشی سے واپس چلا آیا تھا۔ پھر تمہاری شادی کا سنکر کسی نہ کسی طرح وطن چھوڑ کر لندن چلا گیا میں ہر جگہ گھوم آیا پر مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہیں بھلانے میں ناکام رہا۔ اگرچہ مجھے اب یہ باتیں کرتے ہوئے زیب نہیں دیتا پر میں تمہاری ہنستی مسکراتی آباد دنیا کو ایک نظر دیکھنے آیا تھا جانے پھر زندگی دوسری بار اپنے وطن کی خاک چھونے کی مہلت دے نہ دے پر یہاں آ کر بھابھی نے تمہارے لٹنے کی داستان سنائی تو دل تڑپ اٹھا۔ شانو میں خودغرض نہیں پر جس شخص نے اٹھارہ سال تک تمہیں دکھوں تنہائیوں کے زہر پینے اور اذیتوں کے سوا کچھ نہ دیا تم اس کا نام ابھی تک اپنے نام کے ساتھ کیوں لئے بیٹھی ہو۔ وہ اپنی دنیا میں بھول کر نہیں سوچتا، اس نے تمہیں اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکال دینا چاہا اور تم اس کے نام سے چمٹی ہوئی ہو تم اس مقام پر کھڑی ہو جہاں تمہیں سہارے کی ضرورت ہے پینتیس چھتیس سال کی عمر اتنی تو نہیں ہوتی کہ عورت جوگن بن جائے۔ زندگی کے رسیلے پھل سے اسے بھی ایک ایک قطرہ حاصل کرنے کا حق ہے ایک بے وفا شخص کے نام پر ساری زندگی بتانا دانشمندی نہیں بیوقوفی ہے تم۔ تم سلطان سے طلاق لے لو شانو، شانو میں اب بھی تمہارا منتظر ہوں میں تمہاری زندگی میں پھیلے زہر کو اپنے ہونٹوں سے چوس لوں گا اب بھی تمہارے لئے سلگ رہا ہوں میرا ساتھ دو دنیا سے اپنا حق چھین لو۔ تمہارے سامنے پہاڑ جیسی زندگی اور مصائب و مسائل کے منہ کھولے عفریت تمہیں نگل جانے کو تیار کھڑے ہیں تمہیں اب بھی سہارے کی ضرورت ہے میں تمہارے بچوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھوں گا۔ شانو میں نے کتنی راتیں سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور بہت سے حوصلوں کو جمع کر کے تم

سے یہ بات کی ہے تم آج کی رات سوچ لو کل میں تم سے تمہارا جواب سننے آؤں گا۔"

محمود یہ سب کہہ کر چلا گیا اور مجھے آزمائش اور کشمکش کی صلیب پر لٹکتا چھوڑ گیا۔ میں رات سے یہیں کھڑی سوچ رہی ہوں۔ محمود کو کل کیا جواب دوں گی۔ کاش اس نے مجھے یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ بے وفا نہیں تھا تو میں مردوں کی ساری ذات سے ہی تاعمر کی متنفر رہتی۔ سلطان اور میرا رشتہ کب کا دم توڑ چکا تھا میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ۔ بس نام کے ساتھ ہی چپکا ہوا تھا۔

باہر بارش کا زور بڑھ گیا تھا۔ کاش یہ پانی میرے دل میں اٹھنے والی آگ کو بجھا سکتا۔ میرے سارے غم بہا کر لے جا سکتا۔

محمود کل تم مقررہ وقت پر میرا جواب سننے آؤ گے۔ جانے تمہاری کھوئی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن تھے، میں کھڑکی سے ہٹ آئی۔ آہٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو میرا بڑا بیٹا بستر سے اٹھ کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ امی آج آپ پھر نہیں سوئیں لگتا ہے آج آپ [illegible] ارے آپ تو ڈر رہی ہیں چلیے بستر میں کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں آپ کے ہاتھ آئیے میں آپ کا سر دبا دوں۔ نہیں بیٹے میں ٹھیک ہوں۔ بجلی کی کڑک اور تیز بارش سے آنکھ کھل گئی ____

نہیں۔ آپ بڑی دیر سے اس کھڑکی سے لگی ہوئی کھڑی تھیں میں کب سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے آپ ابو کی بے وفائی اور ہمارے مستقبل کے لئے پریشان رہتی ہیں پیاری امی آپ ہی تو کہتی ہیں زندگی میں کبھی کبھی سخت مقامات بھی آتے ہیں وہاں بہادری سے پاؤں جمائے رکھنا چاہیئے اور آپ خود ___ خیر چھوڑیئے میری طرف دیکھئے کتنا اونچا ہو گیا ہوں آپ مجھے چھوٹی سی لگتی ہیں میرے [illegible] کھڑی ہوئی۔ امی ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ اکیلی تو نہیں۔ بس تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے پھر میں آپ سب کو سنبھال لوں گا، پھر آپ [illegible] نہیں کریں گی۔ میں آمنہ اور توفیق کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا، پھر ہم ان کے سامنے سر اٹھا کر چلیں گے۔ اگر وہ آپ کو چھوڑ گئے ہیں تو آپ [illegible] کی ہو گی۔ خدا نہ کرے۔ ذرا بھی فکر نہ کریں میں آپ کا سہارا بنوں گا۔ اپنے بہن بھائیوں کو سہارا دوں گا۔ اب آپ چلیئے۔ [illegible]

میرا سترہ سالہ بیٹا کیسی بڑوں جیسی باتیں کر رہا ہے مجھے ایسے دلاسے دے رہا ہے جیسے میں چھوٹی سی بچی ہوں۔ پر وہ چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، ہے تو ایک مرد اور عورت کتنی بھی اونچی کیوں نہ ہو جائے مرد کے سہارے کی محتاج رہتی ہے۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں سہارا ___ مرد کا سہارا۔ اگر سہارا ہی لینا ہے تو اپنے خون کا ہی کیوں نہ لوں۔ جہاں اتنے سال بے سہارا گذر گئے وہاں کچھ عرصے مزید بھی جب ان کے اسکول کے داخلہ فارم میں باپ کا اندراج سلطان کے نام سے ہوا ہے تو میں اب انھیں دوسرا نام کیوں دوں۔ اپنی خوشی کی خاطر بچوں کی انا اور خودداری کو کیوں مجروح کروں۔

کاش محمود تم اتنے طویل عرصے بعد یہ کہنے نہ آتے کہ تم بے وفا نہیں تھے۔ میرے زخموں کے منہ پھر سے کھول دیے۔ میرا بھرم ٹوٹ گیا دل کے چھالے پھوڑ ڈالے تم نے، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں بچوں کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی ان کے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگاؤں گی اپنے دل کے کواڑ سختی سے بند کر لوں گی۔ انہی کے واسطے جیئے جاؤں گی ان کے راستوں سے کانٹے چنتی چلی جاؤں گی۔

ماں اور باپ میں فرق یہی تو ہوتا ہے باپ صرف اپنی خوشی کیلئے سوچتا ہے اور عورت ماں بن کر اپنا آپ تج دیتی ہے، قربانی مسلسل قربانی اس کا مقدر بن جاتی ہے تب ہی تو جنت اسی کے پاؤں کے نیچے رکھی گئی ہے میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی ہوں۔

میرا بیٹا مجھے سوتا سمجھ کر مجھے رضائی میں اچھی طرح ڈھانپ گیا ہے وہ اپنے پلنگ پر لیٹا کروٹیں بدل رہا ہے وہ میرے لئے اس گھر کے لئے پریشان رہتا ہے میں بھی کتنی بے وقوف ہوں اپنے جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ساری رات محمود کی سوچ میں گزار دی۔ محمود دیکھو میرا بیٹا کتنا بڑا، کتنا اونچا لمبا ہو گیا ہے اسے دیکھ کر مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے میرا نگہبان تو میرے گھر میں موجود ہے۔ پر محمود یہ میری روح کراہ رہی ہے کیوں دھیمے دھیمے فریاد کناں ہے میں اکیلی ہوں، میں تنہا ہوں، میں تہی دست ہوں۔

- ماں نے بیٹے سے پوچھا "میں خوبصورت ہوں" میں کونسا فعل ہے
  لڑکے نے جواب دیا "فعل ماضی"
- استانی۔ نورین! کیا تم پردے کی اہمیت بتا سکتی ہو۔
  نورین نے کہا "جی ہاں اگر پردہ نہ ہو تو پھر فلمیں نہ دکھائی جا سکیں۔
- ڈاکٹر۔ آج تو آپ کے وزن میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے کل آپ کا وزن ۱۲۰ پونڈ تھا اور آج صرف ۱۱۰ پونڈ ہے۔
  عورت نے کہا۔ بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ آج میں میک اپ کئے بغیر ہی آ گئی ہوں۔

خودکشی

سعادت حسن منٹو

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تم خواہ مخواہ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہو۔"

"مجھ سے کوئی بات نہ کیجئے، میں بھری بیٹھی ہوں۔ خدا کی قسم آپ نے مجھے تنگ کیا تو میں شور مچانا شروع کر دوں گی۔"

"آخر کس بات پر؟"

"جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"بھئی مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"آپ کو کس بات کا پتہ چلے گا؟ میں تو کہتی ہوں کہ خدا کرے مجھے موت آجائے۔"

"اتنی جلدی کیوں؟"

"جتنی جلدی آئے اتنی ہی بہتر ہے۔ میں تو چاہتی ہوں آپ سے مجھے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے۔"

"تم طلاق لے سکتی ہو۔"

"بکواس نہ کیجئے میں شریف عورت ہوں، طلاق کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"مرنے کے متعلق البتہ سوچ سکتی ہو۔"

"ہر شریف عورت صرف سوچتی ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرتی ہے۔"

"تو آپ عمل کیوں نہیں کرتیں۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ میں خودکشی کر لوں۔"

"اگر آپ کا ارادہ ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"تو چلئے میرے ساتھ کوٹھے پر۔ میں وہاں سے چھلانگ لگا دوں گی۔"

"چلئے۔"

"اب آپ سوچ کیا رہی ہیں۔ کود جائیے تین منزلہ مکان ہے۔ نیچے پتھر کا فرش ہے۔ یقینی بات ہے آپ کی دلی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"میرے زیوروں کا کیا ہوگا؟"

"وہ میں آپ کی اچھی جان کے حوالے کر دوں گا۔"

"مجھے کیسے یقین ہو سکتا ہے؟"

"کم از کم آپ کی نظروں میں میری اتنی شرافت تو باقی رہنی چاہیئے کہ میں جو کچھ کہوں گا اس پر عمل کر دوں گا۔"

"جیسے آپ ہمیشہ اپنی بات کے پکے رہے ہیں۔"

"کوئی ایسی مثال پیش کرو، جب میں اپنی بات سے پھرا ہوں۔"

"ابھی دس روز ہوئے آپ نے کہا تھا کہ میرے لئے ہیئر سوپ لے کر آئیں گے۔ ابھی تک آیا ہے؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ صابن بازار میں نایاب ہے۔ میں کہاں سے لاتا؟"

"مجھے کیا معلوم آپ کو اپنے لئے نایاب سگریٹ تو کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتے ہیں۔ اصل میں آپ کو میری ذرہ برابر پرواہ نہیں۔ شادی کے بعد ایک دو برس آپ نے تکلفاً میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک کیا۔ اس کے بعد مجھے یکسر نظرانداز کر دیا۔ میں ضرور خودکشی کر لوں گی۔"

"بڑے شوق سے۔ میں آپ کی کسی خواہش میں حائل ہونا نہیں چاہتا۔"

"آپ مجھے دھکا دے دیجئے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں خود ہی کود جاؤں تمہیں دھکا دینے کی خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔"

"نہیں نہیں۔ مرنا تو میں چاہتی ہوں۔"

"تو آپ کے بعد یہاں کون زندہ رہنا چاہتا ہے۔"

"یہ آپ..... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"تمہاری جان کی قسم۔"

"جیسے آپ کو میری جان بڑی عزیز ہے۔"

"اس کا ثبوت لے لو، چلو میرا ہاتھ پکڑو۔ ہم دونوں اس تین منزلہ مکان سے کود تے ہیں۔ تمہیں تو پھر کیا یقین آئے گا۔ لیکن لوگوں کو اتنا تو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو اس قدر چاہتے تھے کہ انھوں نے اپنی موت کی بھی ایک ہی گھڑی مقرر کی۔"

"مرنا تو میں چاہتی ہوں۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ میں کیوں ساتھ نہ مروں؟"

"مریں آپ کے دشمن۔"

"دشمن تمہارا میں ہوں۔ دیکھو ایسا کرو، پہلے میں نیچے کودتا ہوں لیکن

تم وعدہ کرو کہ فوراً بعد تم بھی چھلانگ لگاؤ گی "
"پہلے میں گرتی ہوں "
"چلو ایسا ہی سہی "
"میں اپنے زیور امی کے ہاں بھیج نہ دوں "
"جب میں نے خود تمہارے ساتھ مر جانے کا وعدہ کیا ہے اور تم بھی مر رہی ہو تو زیوروں کا خیال بڑا بے معنی معلوم ہوتا ہے "
"میرا جڑاؤ نیکلس، کانوں کے ہیرے کے بندے اور مینا کاری کی چوڑیاں۔ میں نہیں چاہتی یہ سب بیکار جائیں۔
میں اپنی بھانجی کو دے دینا چاہتی ہوں "
"یہ کیا بہت ضروری ہے "
"کیوں نہیں؟ مجھے یہ زیور بہت عزیز ہیں اور اپنی بھانجی بھی، میں نہیں چاہتی کہ ان پر آپ کے رشتہ دار قابض ہو جائیں "
"میرے رشتہ داروں کو ڈالو چولہے میں۔ چلو نیچے چلتے ہیں تم اپنے تمام زیور کسی صندوقچی میں بند کر کے اپنی بہن کے گھر بھیج دو، اس کے بعد ہم دونوں خودکشی کر لیں گے "
"میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں "
"ٹھیک تو میں ہمیشہ کہتا ہوں۔ مگر تم غلط سمجھ رہی ہو "
"مثال کے طور پر؟"
"آج کی مار دھاڑ ہی لو۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہوئی آپ نے مجھ پر کوئی الزام تو لگا یا جیتی "
"میں آپ سے اس کے متعلق کوئی سوال کرنا نہیں چاہتی اپنے چلئے تاکہ میں اپنے زیور اپنی بھانجی کو بھیج دوں اس کے بعد جو فیصلہ ہوا ہے وہی ہوگا۔ مجھ سے اب زیادہ باتیں نہ کیجئے میرا دل رنج کھولا رہا ہے "
"یہ انگوٹھی بھی ساتھ رکھ دو تو بہتر ہے ______
"کیوں؟"
"مرنا ہے پھر رکھنے سے کیا فائدہ"
"نہیں، اسے خود پہنوں گی "
"لائیے میں پہنا دوں "
"نہیں۔ آپ کو اذیت ہوتی ہے؟"

[illegible]

"اس کو تو میں ہاتھ بھی نہ لگانے دوں گی "
"میرا مطلب غسال عورتوں سے تھا مرنے کے بعد ان کے ہاتھ آپ کے مردہ جسم پر ضرور سرتا پا پھریں گے "
"جہنم میں جائیں یہ عورتیں "
"آپ کہاں جائیں گی؟"
"جنت میں۔ فردوس بریں میں۔ میں حور بن جاؤں گی" "حور بن گئیں تو مجھ سے کسی بہتر مرد کے حوالہ کر دی جائیں گی "
"میں بھاڑ میں جھونکوں گی ایسے بہتر مرد کو۔ میں ایک ہی سے بھر پائی ہوں "
"آخر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟"
"مجھے شکایت کیا نہیں ہے۔ خدا کرے آپ ایسا مرد کسی شریف لڑکی کے پلے نہ پڑے۔ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ وہ روز سے حرام ہے جو میں نے ایک لقمہ کھایا ہو۔ پر آپ کو کیا پروا ہے آپ تو اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں "
"مجھے کچھ پتہ بھی تو چلے "
"پتے آپ کو بہت سے معلوم ہیں میں کیا بتاؤں ذرا نوکر کو بلوا لیجئے "
"نوکر!"
"نہیں ٹھہریئے میں اپنا گلوبند نکال لوں "
"کیوں؟"
"یہ میری ماں کا ہے "
"تو اسے آپ کیا کریں گی؟"
"پہن رہی ہوں دیکھتے نہیں آپ "
"یہ موت کی آرائش ہو رہی ہے "
"جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں اور آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ خدا کرے میں ابھی یہاں بیٹھی بیٹھی مر جاؤں اور آپ ساری زندگی بے چین رہیں۔ آپ کی کوئی مراد پوری ہو، وہ......"
"کہو کہو "
"میں کیا کہوں خدا آپ سے سمجھے گا۔ میں مر جاؤں گی تو آپ کے لئے مستقل طور پر ایک ڈراؤنا خواب بن جاؤں گی۔ آپ کے لئے ہمیشہ عذاب ہو جاؤں گی "
"جیسا ... "

"آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ میری زندگی کا روگ بنے ہوئے ہیں اور مجھ ہی سے کہتے ہیں کہ شرم آنی چاہیئے۔ یہ میرے باپ کی غلطی تھی جو انھوں نے آپ ایسے غلط آدمی سے مجھے بیاہ دیا۔ معلوم نہیں انھوں نے آپ میں کیا خوبی دیکھی"

مجھے خود اس پر حیرانی ہے"

"کیا آپ غلط آدمی نہیں ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں صحیح آدمی کیسا ہوتا ہے؟"

"جیسا میرا بھائی"

اوہ!"

"میں اب آپ کا بھائی تو نہیں بن سکتا"

"شریف آدمی آپ بھلا کیسے بن سکتے ہیں اور شریفوں سے آپ کو واسطہ بھی کیا ہے"

"یہ میری عزت پہ حملہ ہے"

"چلئے اوپر"

"آپ نے انگوٹھی اور گلوبند پہن لیا ہے؟"

"ہاں پہن لیا ہے۔ آپ کو اس سے کیا مطلب؟"

"مطلب تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن میں نے اس لئے پوچھ لیا ہے کہ شاید آپ بھول گئی ہوں"

"تو چلئے اوپر"

"ذرا ٹھہریئے"

"کیوں"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، میں کوئی چیز بھول گئی ہوں"

"کیا؟"

"یاد نہیں آرہا ہے"

"دیر ہو رہی ہے۔ مجھے ایک کام سے جانا تھا"

"کتنے بجے؟"

"ساڑھے سات بجے"

"ابھی تو پونے سات ہوئے ہیں"

"اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ جلدی کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت ہو جائے اور میں آپ کے ساتھ کو دجانے کا ارادہ ترک کر دوں"

"تو چلئے۔ لیکن ٹھہریئے۔ میں یہ نتھیاں بھی لے لوں"

"لے لیجئے۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ زیور اپنی بھابی کو دینا چاہتی تھیں"

سارے کیوں دوں، بس جتنے باقی ہیں کافی ہیں"

"آپ ہلاک ہیں"

چلئے"

چلئے"

"سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آپ تھک گئی ہیں"

"میں تو نہیں تھکی۔ آپ ہانپنے لگے ہیں

"تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے سانس پھولنے کا عارضہ ہے۔ میں نے صبح گولیاں ہی نہیں کھائیں"

"میں سو رہی تھی"

"تم ہمیشہ سوئی رہتی ہو"

"یہ طعنہ بڑا اوچھا ہے۔ میں صبح اپنے دو بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرتی ہوں، ناشتہ کرتی ہوں۔ اور پھر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتی ہوں۔ آپ پھر بھی سوئے ہوئے ہیں"

"خاک۔ میں کروٹیں لے رہا ہوتا ہوں..... سب کچھ سنتا ہوں"

"مگر بولتے کیوں نہیں، جب آپ کا بڑا لڑکا بات بات پہ ضد کر رہا ہوتا ہے"

مجھے اس سے پیار ہے۔ میں اس کو جھڑک نہیں سکتا"

"مجھے تو آپ ہر وقت جھڑکتے گھڑکتے رہتے ہیں"

"میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے کود جانا چاہیئے کہ یہ قصّہ ختم ہو۔

"آپ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان کیوں پھیر رہے ہیں؟"

تمہیں اس سے کیا؟"

"صرف پوچھ لیا ہے۔ تو بہ! آپ سے بات کرنا بھی گناہ ہے"

"تم نہیں جانتی ہو۔ گناہ میں بڑی مختلف قسم کی لذت ہوتی ہے جو ثواب میں نہیں ہوتی"

"میں نے پوچھا تھا آپ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان کیوں پھیر رہے ہیں؟"

"میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا"

"یہ کم بخت..... کریم..... کہاں ہے کریم ہمیشہ بد ذات بھول جاتا ہے..... کریم..... کریم!

مزاحیہ ڈرامہ

نرالا علاج

از سراج انور

کام کرنے والے: چرونجی لال (دُبلا پتلا) ورشا (چرونجی لال کی بیوی) جلیبی مل۔ چرونجی کا دوست اور ڈاکٹر

[ایک درمیانی درجے کا کمرہ ۔ سجا سجایا ــــ تمام فرنیچر دیواروں کے قریب لگا ہے۔ بیچ میں خالی جگہ ہے ۔ چند ورزش کرنے کا سامان مثلاً بل ورکر، مگدر اور ایسی ہی دوسری چیزیں نظر آ رہی ہیں ۔ چرونجی لال نکر اور بنیان میں ایک سائیکل پر چڑھا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ پیڈل چلا رہا ہے۔ سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ہے۔ چرونجی بہت کمزور نظر آ رہا ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے ۔ بہت بُری حالت ہے۔ باتیں کرتے وقت بھی آواز بہت کمزور اور ہلکی نظر آ رہی ہے۔ سامنے دروازہ ہے جس میں سے ورشا باورچی خانے میں کچھ پکاتی ہوئی نظر آ رہی ہے]

ورشا: (دروازے سے باہر سر نکال کر) ارے کیا ہو گیا۔ تمہاری آواز کیوں نہیں آ رہی ہے؟

چرونجی: (بہت کمزور لہجہ) تمہاری خوفناک آواز تو آ رہی ہے۔ بس یہی کافی ہے ۔ (سائیکل جلدی جلدی چلانے لگتا ہے، ورشا دیکھتی ہے) ڈنٹر نکال لئے۔

چرونجی: (رو دینے والا لہجہ) پہلے بھی نکالے تھے۔ اب پھر شروع ہو جاتا ہوں۔ (سائیکل سے اتر کر بیچ کمرے میں ڈگمگاتا ہوا آتا ہے) سب کس بل نکل گئے۔ اب تو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں پسلیاں سینہ توڑ کر باہر نہ آ جائیں۔ (ڈنٹر لگانے کی پوزیشن میں آ جاتا ہے۔ ورشا دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتی ہے اور چرونجی آہستہ آہستہ ڈنٹر لگانا شروع کرتا ہے) سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا چکر ہے؟ ارے کہیں اتنا وزن ہو سکتا ہے کسی کا ــ دیکھنے میں مجنوں کی اولاد لگتے ہو اور وزن اتنا زیادہ ــــ کمال ہے۔

[چرونجی ورشا کے بولنے کے درمیان میں ڈنٹر لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہے ۔ سینہ زمین سے اوپر اٹھاتا ہے لیکن ہاتھ مڑ جاتے ہیں اور فرش پر سینے کے بل گر جاتا ہے]

چرونجی: ارے باپ رے! ــ اُفوہ ــ ہائے مر گیا بھئی

ورشا: (دوبارہ جھانک کر دیکھتے ہوئے) اب کیا ہو گیا۔؟

چرونجی: (بہت کمزور آواز) کچھ نہیں ــ یہ زمین، اُچھل کر میرے سینے سے آ لگی تھی (پھر اٹھتا ہے اور ڈنٹر کے درمیان بولتا جاتا ہے) بھئی خاصی سزا بھگت رہا ہوں ــ ہائے ــ اف! ــ اس کم بخت جلیبی مل نے اچھا علاج بتایا ــ (ڈنٹر لگاتے لگاتے رُک جاتا ہے اور ندیدے پن سے کہتا ہے) جلیبی! ــ (چٹخارہ) ہائے ہائے ۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے جلیبی ۔ میں تو مٹھاس کو ترس گیا۔

(بسورتا ہے اور پھر زمین پر گر جاتا ہے)

ورشا: (باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی جاتی ہے) ترسنا پڑے گا ہی ۔ اپنے نکھٹو دوست جلیبی مل کا علاج کر دیکھے تو اور بھی ترسنا پڑے گا۔ اور سب ڈاکٹر کہیں مر گئے ہیں! ــ میں کہتی ہوں کہ جو شخص خود تپ دق کا مریض لگتا ہو ۔ وہ بھلا دوسروں کا علاج کیسے کر سکتا ہے؟

(چرونجی کا ڈنٹر لگانا وقت کے ساتھ جاری ہے)

چرونجی: بس ورشا رانی ۔ اتنا مت برسو بیچارے پر۔ برسات کا مہینہ ویسے ہی ہے ۔ اس نے سن لیا تو کیا کہے گا۔

ورشا: کہے گا کیا ۔ میں کونسی غلط بات کہہ رہی ہوں۔

(جلیبی مل دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوتا ہے)

میں غلط بات کہہ ہی نہیں سکتی ۔ اگر جلیبی بھیا تمہارا علاج نہ کرتے تو ہاتھی سے بھی موٹے ہو گئے ہوتے اب تک ۔

جلیبی: (خوش ہو کر) ۔ کہی ہے بھابھی پتے کی بات ۔ (چرونجی کو دیکھتے ہوئے) اب دیکھو کتنا سلم ہو گیا ہے یہ۔ ہیرو بننے میں اب کیا کسر رہ گئی ہے۔ (چرونجی کے بازوؤں اور رانوں کو ٹٹول کر ہاتھ لگا کر خوش ہوتا ہے۔)

چرونجی: (نقاہت سے) اب کب تک ، پڑے پیلے پڑ گئے جلیبی مل۔ (چٹخارہ لے کر) جلیبی ۔ ہائے گرم گرم جلیبی ــ!

جلیبی: (چرونجی کو اٹھا کر کرسی پر بٹھاتا ہے) اب زیادہ چٹخارے مت لو۔ ان چٹخاروں نے ہی تو تمہیں ہاتھی جتنا موٹا

کر دیا تھا۔

چرونجی (لبسور کر) بہت دُبلا ہوگیا ہوں جلیبی لل۔ اب تو بڑے لڑکے کی پتلون بھی میرے فٹ آجاتی ہے۔

ورشا: (غصیلی نظروں سے جلیبی کو دیکھتے ہوئے) کیوں نہیں۔ ان کا علاج جاری رہا تو ایک دن پالنے میں لیٹے ہوئے نظر آؤ گے۔

جلیبی: بھابی علاج تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ معمولی بیماری تو ہے نہیں۔ وزن بڑھنے والی بیماری ہے۔

[جلیبی نے چرونجی کو پکڑ رکھا تھا۔ ہاتھ ہٹاتا ہے تو وہ کمزوری کی وجہ سے کبھی دائیں، کبھی بائیں اور کبھی آگے گرنے لگتا ہے۔ ورشا اور جلیبی سنبھالتے ہیں۔ مجبوراً جلیبی لل اسے کرسی کی کمر سے ایک رسی کے ذریعے باندھ دیتا ہے]

ورشا: (رونے لگتی ہے)۔ ہائے ہائے۔ یہ ان کی کیسی حالت ہوگئی۔ خود سے بیٹھ بھی تو نہیں سکتے۔

جلیبی: فکر مت کرو بھابی، ٹھیک ہوجائے گا (چرونجی کے شانے پر تھپکی دیتا ہے تو وہ کرسی سمیت دائیں طرف گرنے لگتا ہے۔ جلدی سے اسے سنبھالتا ہے) کچھ نہیں ہوا اسے۔ وزن گھٹتا ہے تو کمزوری بھی بڑھتی ہے (دیوار پر لگی گھڑی دیکھ کر)

ارے لنچ کا ٹائم ہوگیا۔ بھابی اس کا لنچ تو لے کر آؤ۔ اسے بھوکا رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

ورشا (گھور کر دیکھتی ہے) لاتی ہوں ـــــ ابھی لاتی ہوں۔

(باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے۔)

چرونجی (آنکھیں کھولتا ہے اور جلیبی لل کو دیکھ کر کمزور آواز میں کہتا ہے۔) لنچ آرہا ہے۔ (ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے) لنچ! یعنی کھانا یعنی مرغ مسلم۔ بریانی۔ قورمہ۔ مٹر پنیر ـــ بڑی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں۔ (دیکھ کر سوچ کر ایکدم روتا ہے)۔ لیکن ـ لیکن یہ سب نعمتیں میرے لئے کہاں؟ ـــ مجھے تو وہی ملے گا جلیبی! (تدبدبے پن سے) ہائے جلیبی! کیسی گول اور بل کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ گرم گرم رس سے بھری ہوئی جلیبی۔ (چٹخارہ لیتا ہے)

[جلیبی لل تسلی دیتا ہے۔ ورشا رسوئی سے ہاتھ میں ٹرے لئے ہوئے آتی ہے۔ ٹرے میں ایک گلاس ہے اور ایک پلیٹ پر دوسری پلیٹ اوندھی رکھی ہے۔ جلیبی جلدی سے چرونجی کو رسی سے کھولتا ہے۔

ورشا ٹرے میز پر رکھ دیتی ہے]

ورشا: لو ـــ ہوشیار ہوجاؤ ـــ تمہارا لنچ آگیا۔

چرونجی: (لبسورتے ہوئے) لنچ آگیا ـ (چھت کی طرف دیکھتا ہے) بھگوان ـــ یہ کون سے کرموں کا پھل ہے؟

جلیبی: پھل ول کوئی نہیں ہے۔ یہ تو لنچ ہے۔ (چرونجی کر بچوا کی طرح پکارتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھری کانٹا دیتا ہے) شروع کرو۔

[جلیبی اوپر کی ڈھکی ہوئی اوندھی پلیٹ ہٹا دیتا ہے۔ پلیٹ کا کلوز اپ۔ اس میں مٹر کے پانچ دانے پڑے ہوئے ہیں۔

چرونجی (پلیٹ کو دیکھ کر روتا ہے) یہ لنچ ہے۔ ارے تم دونوں یمدوت آخر کیوں مجھے شمشان پہنچانے پر تلے ہوئے ہو؟

ورشا: (خود بھی پریشان نظر آتی ہے) کیوں اول جلول بک رہے ہو۔ وہاں پہنچیں تمہارے دشمن۔

چرونجی (جلیبی کو دیکھ کر) یہ کہاں جائے گا۔ یہ تو مجھے پہنچا کر ہی دم لے گا۔

جلیبی: ناراض مت ہو۔ بس شروع ہوجاؤ (چھری کانٹا ایک طرف رکھ کر) شاباش۔ لنچ کھاؤ ـــ (مٹر کا ایک دانہ چرونجی کے منہ میں رکھ دیتا ہے) اتنا مزیدار لگتا ہوگا۔ کھاؤ کھاؤ۔ (ہنس کر چرونجی کی کمر پر تھپکی دیتا ہے۔ اس کا سر میز سے ٹکرا تا ہے)

ارے! ـ میں نے تو کس قدر ہی تھپتھپایا تھا۔ میرا یار تو بالکل ہی دھان پان ہوکر رہ گیا؟

[اسے اٹھاتا ہے اور اس ڈر سے کہ وہ دوبارہ میز سے نہ ٹکرائے، گدی سے اس کی قمیض کا کالر پکڑے رہتا ہے۔ لیکن چرونجی بار بار ادھر اُدھر ڈولتا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے]

ورشا: (منھ بنا کر اور چرونجی کے منھ میں ایک مٹر دیتے ہوئے) میری سمجھ میں یہ علاج نہیں آیا۔ تم سے پہلے بھی کہا تھا جلیبی بھیا۔ کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھا دو لا کر دکھا دو (چرونجی کے منھ سے لگاتی ہے) آخر یہ پانچ مٹر اور سوپ تک پیتے رہیں؟

جلیبی: بھابی میں ڈاکٹر امرتی لال سے کچھ کہہ کر آیا ہوں۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔

چرونجی: (لبسورتے ہوئے) امرتی ـــ کیا امرتیاں لایا ہے کوئی۔

لاؤ —— لاؤ، کھلاؤ مجھے، کیوں ترسا رہے ہو،

جلیبی: افوہ، یار چرونجی تم سے بالکل صبر نہیں ہوتا —— ارے بھائی ہم سیٹھ پکوڑی مل کے لڑکے ڈاکٹر امرتی لال کی بات کر رہے ہیں وہی جو گلی پراٹھے والی میں رہتے ہیں۔

چرونجی: (اٹھنے کی کوششیں کرتا ہے لیکن پھر کرسی پر گر جاتا ہے) پراٹھے والی گلی (اندیدے پن سے چٹخارہ لیتا ہے) پراٹھے۔ ہائے گرم گرم پراٹھے۔ پکوڑی۔ چٹنی کے ساتھ کھائی جانے والی پکوڑیاں —— (ایکدم رونے لگتا ہے۔)

[ورشا بھی روتی ہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ہے جلیبی یہ کہہ کر کہ شاید ڈاکٹر صاحب آگئے چرونجی کا کالر چھوڑ دیتا ہے۔ اسکا سر پھر میز سے جا کر ٹکراتا ہے۔ ورشا سنبھالتی ہے۔ جلیبی دروازے کی طرف لپکتا ہے۔]

جلیبی: (ڈاکٹر کو ساتھ لاتے ہوئے) آئیے ڈاکٹر صاحب آئیے۔ یہ رہا آپ کا مریض۔

ڈاکٹر: (بیگ کھول کر اسٹتھسکوپ نکال لیتا ہے اور دوسری کرسی پر چرونجی کے برابر بیٹھ جاتا ہے) کیا ہوگیا ہے انھیں؟ یہ بار بار ادھر اُدھر کیوں گر رہے ہیں۔ ایک جگہ ٹک کر کیوں نہیں بیٹھ سکتے۔ (اسٹتھسکوپ سے دیکھتا ہے) —— یہ تو بہت کمزور ہیں کیا بات ہے۔ کیا انھیں کھانا نہیں ملتا۔؟

جلیبی: ۔ ابھی ابھی خوب پیٹ بھر کر کھایا ہے ڈاکٹر صاحب (ورشا گھورتی ہے، فوراً رُخ موڑ لیتا ہے)

ڈاکٹر: (حیرت زدہ ہے) سمجھ میں نہیں آتا۔ بلڈ پریشر بھی [illegible] لگتا ہے۔ جسم میں جان ہی نہیں معلوم ہوتی۔

جلیبی: ڈاکٹر صاحب ڈائٹنگ کے بعد تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

ڈاکٹر: (حیرت سے) ڈائٹنگ! [illegible]ن جیسے دُبلے پتلے آدمی کے لئے ڈائٹنگ؟ (انجکشن [illegible])

ورشا: (آنسو پونچھتے ہوئے) پہلے اتنے دُبلے پتلے کہاں تھے یہ —— یہ سب تو (جلیبی کی طرف اشارہ) ان کا کیا دھرا ہے۔

[چرونجی اِدھر اُدھر گرنے لگتا ہے۔ ورشا سنبھالتی ہے۔ چرونجی لبور رہا ہے۔]

جلیبی: میرا کیا دھرا کہاں ہے بھابی۔ (ڈاکٹر سے) بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ ایک فلم کمپنی کھلی ہے بھگدڑ موو ی ٹون!

ڈاکٹر: (حیرت سے) بھگدڑ مووی ٹون؟ —— میں نے تو نام نہیں سنا!

(چرونجی کے بازو میں انجکشن لگاتا ہے۔)

جلیبی: بس ایسی ہی بھگدڑ میں بن گئی یہ فلم کمپنی۔ بہت بڑی فلم کمپنی ہے۔ اسکی پہلی فلم ہے کالا کتا عرف چوکور جاسوس۔

ڈاکٹر: (چرونجی کو چھوڑ کر دونوں انگلیوں سے ہوا میں مزاح بناتا ہے) چوکور جاسوس! ۔ (چرونجی گرنے لگتا ہے تو لپک کر سنبھالتا ہے۔

ورشا جلدی جلدی پنکھا کرتی اور روتی ہے)۔ کالا کتا اور چوکور جاسوس! واہ

جلیبی: بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ چرونجی اس فلم کا ہیرو بننا چاہتا ہے۔ اس کی شکل کالے کتے سے کافی ملتی ہے —— ملتی ہے نا؟

ڈاکٹر: (غور سے گھورتے ہوئے چرونجی کو دیکھتے ہوئے) ملتی ہوگی —— مجھے تو معلوم نہیں۔

جلیبی: ملتی ہے ضرور ملتی ہے۔ بس تو جناب فلم کے ڈائرکٹر نے مشورہ دیا کہ ہونے والا ہیرو بہت موٹا ہے۔ اسے ڈائٹنگ کرکے اپنا وزن کم کرنا چاہیئے۔ (چرونجی رونے لگتا ہے تو آگے بڑھ کر اس کے مونھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) ورشا جھٹک دیتی ہے)

ڈاکٹر: فلم کے ڈائرکٹر نے یہ مشورہ دیا تھا (سوچنے لگتا ہے)

جلیبی: جی ہاں۔

ڈاکٹر: کیا نام ہے اس ڈائرکٹر کا۔

جلیبی: (ورشا سے نظریں چراتے ہوئے اور سینہ اکڑا کر) خری جلیبی مل فلم والا —— یعنی میں (کھسیانی ہنسی)

ورشا: (بری طرح روتی ہے) یہ سب انھوں نے ہی اُکسایا ہے میرے پتی کو۔ اگر انھیں کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گی —— ؟

[پلّو سے آنسو پونچھنے لگتی ہے تو چرونجی کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ گرنے لگتا ہے تو پھر پکڑ لیتی ہے]

ڈاکٹر: (مونھ بنا کر نسخہ لکھنے لگتا ہے)۔ لیکن ڈائٹنگ اس طرح ہوتی ہے! پہلے ان کا وزن کرایا ہوتا —— کیا کرایا تھا وزن؟

جلیبی: جی ہاں —— پورے چار سو کلو تھا۔

ڈاکٹر: (حیرت سے نظریں اٹھا کر پہلے چرونجی کو پھر جلیبی کو دیکھتا ہے) چار سو کلو؟

جلیبی: جی ہاں۔ اس کے بعد میں نے بھگدڑ مووی ٹون کے پروڈیوسر اور فلم کا لاکتا عرف چوکو، جاسوس کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آیندہ زمانے کے ہونے والے عظیم ہیرو کو ڈائٹنگ کرکے اپنا وزن کم کرنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی چرونجی لال کے جگری دوست ہونے کی وجہ سے میں نے اسے چار منٹ کے دانے اور ایک گلاس ستو کا بتایا۔ بتائیے کیا غلط بتایا؟

ڈاکٹر: (بیگ بند کرکے کھڑے ہوتے ہوئے) بالکل غلط بتایا۔ (چرونجی یہ سن کر آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھتا ہے)۔ چار منٹ کے دانوں سے کیا ہوتا ہے۔ گھی، تلی ہوئی چیزیں اور آٹے کا پرہیز ہونا چاہیئے تھا۔

ورشا: (روتے ہوئے) یہی میں کہتی تھی ڈاکٹر صاحب۔ لیکن نہ جانے انھوں نے کب کا بدلہ لیا ہے ان سے۔

ڈاکٹر: خیر کوئی بات نہیں۔ اب انجکشن سے ان میں طاقت آئیگی. یہ کھڑے ہو جائیں گے (چرونجی یہ سنکر ڈگمگاتا ہوا کھڑا ہوتا ہے)

چرونجی (گھورتے ہوئے) تمہارے مونہہ میں گھی اور شکر ڈاکٹر امرتی لال۔ امرتی۔ امرتی۔ (روتا ہے) گلی پر اٹھے والی

امرتی۔ (ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے)۔ امرتیاں۔ پکوڑیاں۔

ڈاکٹر: (کندھا تھپتھپا کر) تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ فکر مت کرو سب کھا پی سکو گے۔ بس تمہارا وزن۔ تھوڑا گیا تھا اور ......

ورشا: لیکن ڈاکٹر صاحب ان کا وزن اتنا زیادہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آگے بڑھ کر چرونجی کو سنبھالتی ہے)

ڈاکٹر: یہی میں بھی سوچ رہا ہوں (جلیبی کی طرف دیکھتا ہے)۔ کیوں مسٹر جلیبی مل۔ کون سی مشین پر کرایا تھا وزن؟

جلیبی: اجی اسی مشین پر جو بلا ٹاکیز کے باہر لگی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر (حیرت سے) بلا ٹاکیز کے باہر۔ لیکن وہ مشین تو خراب ہے۔ (سب چونک کر ڈاکٹر کو دیکھتے ہیں)

جلیبی } خراب ہے۔؟
ورشا } خراب ہے۔؟

ڈاکٹر: ہاں۔ اس کی سوئی تو ہمیشہ چار سو کلو پر رہتی ہے۔

ورشا: ہے رام۔ (بے ہوش ہو کر صوفے پر گر جاتی ہے۔ چرونجی لڑکھڑا کر کرسی پر گرتا ہے، بیہوش ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر: (گھبرا کر) کیا ہوا آپ دونوں کو۔ (جلدی سے بیگ میز پر رکھ کر کھولنے لگتا ہے)

جلیبی (آنکھیں پھر جاتی ہیں) مجھے بھی کچھ کچھ ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔ بکرا نا مجھے ایں گیا۔

[گرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر جلدی سے پکڑ کر صوفے پر لٹا دیتا ہے۔ اور باری باری سب کو اسٹیتھسکوپ سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیمرہ پر فاسٹ موومینٹ لیتا ہے۔] فیڈ آوٹ

(دہلی دوردرشن کے شکریے کے ساتھ)

لطیفے

- بیوی: آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ خدانخواستہ ہمارے یہاں چور آگیا تو کیا کروگے۔
شوہر نے کہا" جو چور کہیں گے وہی کروں گا! اس لئے کہ شادی بعد سے مجھے اپنی مرضی سے کچھ کرنا نصیب ہی کہاں ہوا۔

- ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ تعزیت کے لئے ان کی بیوی کی ایک سہیلی نے آکر کہا" مرحومہ مجھے بہت چاہتی تھیں" یہ بات کچھ معلوم ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ان کی کوئی عزیز شے نشانی کے طور پر آپ مجھے عنایت فرمائیں۔
جواب ملا" کیا مجھ سے کام چل جائے گا۔ مرحومہ مجھے سب سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

- ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا" سر! سنا ہے چوری پکڑنے کا کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے۔ کیا آپ نے اسے دیکھا ہے۔
پروفیسر صاحب نے کہا" دیکھا ہی نہیں ہے اس سے میں نے شادی کرلی ہے۔

- سیاح نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔
"کیا تمہارے گاؤں میں آج تک کوئی عظیم آدمی پیدا ہوا ہے؟"
اس نے جواب دیا" ہمارے گاؤں میں صرف چھوٹے بچے پیدا ہوتے ہیں"! (مارگریٹ گرسٹ)

- ہر تحریر میں اپنا نمبر خریداری لکھنا کبھی نہ بھولیں۔
- حریم کی قیمت منی آرڈر سے روانہ کریں اور کوپن پر تفصیل ضرور لکھیں۔

پک نک

از ——— وجاہت علی سندیلوی

"تو آپ اگلے اتوار کو پک نک پر چل رہے ہیں؟"
"پک نک پر جانے سے ماحول تبدیل اور آب و ہوا تازہ ہو جاتی ہے۔"
"آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آ جاتا ہے۔"
"مہذب ممالک کے لوگ بلا ناغہ پکنک پر جاتے ہیں اور اس وجہ سے مہذب کہلاتے ہیں۔"
"پکنک پر جانے سے انسان قدرت سے با الفاظ دیگر خدا سے قریب ہو جاتا ہے۔"
"معدے میں کشادگی اور دماغ میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔"
وغیرہ وغیرہ۔

ہر سوموار کو میرے دفتر پہونچتے ہی مرزا صاحب گراموفون کے کسی گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح اپنے اس پک نک مینی فسٹو سے میرے کان پکانا شروع کر دیتے اور یہ سلسلہ سنیچر کی شام تک جاری رہتا البتہ کان پکانے کے لئے جو لہجہ وہ استعمال کرتے اس کی آنچ کبھی صرف گرم ہوتی اور کبھی بہت گرم۔ پکنک کے نئے نئے فضائل اور فوائد وہ آئے دن تصنیف کرکے ہمیشہ کسی نئے مورچے سے ایسا حملہ کرتے کہ مخاطب کی قوت مدافعت مفلوج ہو کر رہ جاتی اور اس میں یہ جرأت ہی باقی نہ رہتی کہ وہ ان سے دریافت کر سکے کہ معدے کی کشادگی اور خدا کی قربت سے کیا تعلق اور آنکھوں میں نور اور دل میں سرور کے بعد کون سر پھرا مہذب بننے کی خواہش کرے گا۔ بہرکیف اس خاص موضوع کے متعلق ان کی زبان کے آگے کوئی کھائی تھی اور نہ خندق۔ ان کی رائے میں کسی انسان کے لئے پیدا ہونے سے بھی اہم کام پک نک پر جانا تھا اور چونکہ عدم سے وجود میں آنا ایک طرح کی پک نک ہی ہوتی ہے لہٰذا ہر پیدا ہونے والے کی زندگی کا پہلا اور غالباً آخری مقصد پک نک پر جانا ہی ہونا چاہئے۔ ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

پکنک کے متعلق مرزا صاحب جب اپنی داستان چھیڑتے ——— تو پہلے پہل میں اس کو ان کی کسی وقتی بد حواسی پر محمول کر کے ہمدردی سے ان کا منھ تکا کرتا۔ لیکن پھر جب یہ سلسلہ دنوں، ہفتوں، مہینوں، ختم ہی ہونے کو نہیں آیا اور ان کی پک نک کی دعوت میں عداوت کے آثار نمایاں ہونے لگے تو پاس مروّت سے میری ہمت نہ پڑتی کہ میں ان سے آنکھیں چار کر سکوں لہٰذا میں کبھی اپنے ہاتھ کے ناخونوں کو دیکھتا، کبھی نظریں جھکا کر اپنے پالش سے بے نیاز جوتوں کا جائزہ لیتا اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو چھت کے روشن دان کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا اور دبی زبان سے عرض کرتا:

"اب کی اتوار کو راشن لینے جانا ہے۔"
"اب کی اتوار کو منّے کے بال کٹوانا ہیں۔"
"اب کی اتوار کو میری سالی کے لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔"
"اب کی اتوار کو ایک جوتشی نے گھر سے باہر قدم نکالنا منع کیا ہے۔"
وغیرہ وغیرہ

مرزا صاحب کسی بہت بھوکے ایسپین کی طرح میری بہانہ سازی کی نرم و نازک ہڈیوں پر جھپٹ کر ان کو چُرمُرا کر بلکہ ان کا سُرمہ کیا حریرا بنا کر پی جاتے۔ میں بہت دنوں منّے کی ایک ہی ٹانگ بنا رہا لیکن آخر کب تک؟

ایک روز جب مرزا صاحب کی سمع خراشی زیادہ بڑھی اور میرے کان پک، کیا گل گئے تو میں نے دائرۂ ادب سے کچھ آگے بڑھ کر وہی بات کہہ دی جو اس سے قبل اپنے ایک بزرگ سے کہہ چکا تھا جو آئے دن مجھے اپنے ساتھ جنّت لے جانے کی تلقین فرمایا بلکہ دھمکی دے کر مجھے اس جیتی جاگتی دنیا سے بیزار کرنے پر تلے ہوئے تھے "قصور معاف، اگر آپ مجھ جیسے بد ذوق کو اپنے ساتھ لئے بغیر وہاں چلے جائیں تو آپ پر کون سی آفت آ جائے گی۔"

اثر الٹا ہوا۔ اپنی کرسی کو میری کرسی کے اور قریب گھسیٹ کر اس لہجے میں جیسے ان کے ٹاپ کے نیچے آ گیا ہوں، بولے "اجی میں تو یہی چاہتا ہوں کہ صرف میں ہوں اور مس ڈر ورتھی۔ آؤٹ ڈور پکنک کے لئے صرف اچھے موسم اور خراب لڑکی کی ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن اب اس کو کیا کروں کہ وہ ڈر ورتھی کی بچی کہتی ہے کہ وہ میرے ساتھ تنہا نہیں جا سکتی۔ اس کو ممّی ایک دفعہ اکیلے لیکن ——— خیر ہٹاؤ اس قصے کو بلکہ قصہ مختصر پکنک تو اس کی رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ لیکن وہ اپنی ممّی والی غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی۔"

"تو پھر مسٹر ماکو ساتھ لے لیجئے۔"

"شرما، کملا کے بغیر نہیں جا سکتے۔ وہ دونوں ہی جانے پر تیار ہیں لیکن

ڈورو تھی کہتی ہے کہ وہ دونوں جائیں گے تو کہیں روپوش ہو جائیں گے اور وہ پھر میرے ساتھ اکیلی رہ جائے گی۔ وہی بات ہوئی کہ کبوتر کو گھڑے میں بند کر دو گے اور مجھے چھوڑ دو گے۔"

"تو آپ مجھے کباب کی ہڈی بنانا چاہتے ہیں؟"

ہم لوگ چوروں کی طرح بہت دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے اور مس ڈورو تھی کی میز ہم سے کافی فاصلے پر تھی۔ لیکن شاید اس کے خیال میں جب دو آدمی رازداری سے گفتگو کرتے ہیں تو اس کا موضوع وہ اور صرف وہ ہوتی ہے، اپنی جگہ سے چیخی "تم بابو لوگ ہماری بات کرنا مانگتا ہے شیم لس!"

مس ڈورو تھی نہیں معلوم کس قسم کے حادثۂ پیدائش کی بنا پر اپنے آپ کو اینگلو انڈین کہتی اور اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے زبردستی اوٹ پٹانگ ہندوستانی انگریزی الفاظ کے ساتھ بکتی لیکن چونکہ وہ تھی سخی اور دل چسپ لہذا ایسے کئی خون معاف تھے۔

"یہ تمہارے آنر کو بچانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔" مرزا صاحب بولے۔ دو من وزن اور چار فٹ قد کی گول مٹول لڑکی بے ساختہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی "ہم اس پر ٹرسٹ کرنا نہیں سکتا —— سائیلنٹ آدمی بہوت ڈینجرس ہوتا ہے۔ لیکن ٹرائل کے لئے یہ چل جائے گا۔"

میں اپنی اس اہانت پر تلملا اٹھا لیکن مرزا یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے "تو بس طے رہی اب کی اتوار کو؟"

ڈورو تھی نے مجھے مخاطب کر کے مرزا صاحب پر پھبتی کسی "مرزا ہم کو بے ڈھنگ سوٹ میں گبارا (غبارہ) معافک (موافق) دیکھ کر ایک دم فینٹ ہونا مانگتا" اور پھر مارے خوشی کے اپنی ہی بات پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

بڑی جھک جھک کے بعد طے کئے ہوئے پروگرام کے ماتحت اتوار کو میں کچی نیند جاگ کر تاروں کی چھاؤں میں مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ وہ خواب خرگوش میں پڑے عجب والہانہ انداز میں خراٹے لے رہے تھے۔ خراٹوں کے تال و سر کچھ اس قسم کے تھے کہ شبہ ہوتا کہ کسی بگڑے ہوئے ٹرانسسٹر پر دھیمی آواز میں قوالی ہو رہی ہو۔ پتا چلا کہ رات بھر پکنک کا انتظام کر چکے ہو "ٹھک" سو گئے ہیں۔ انتظام کے ثبوت میں ایک ٹرنک، دو چھابے، کئی ٹوکریاں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان۔ کیرم بورڈ اور کئی دوسری چیزیں ان کے پلنگ کے پاس ہی رخت سفر بنی ہوئی تیار رکھی تھیں۔ گمان گزرا کہ وہ چند گھنٹوں کے

لئے پکنک پر نہیں بلکہ مستقل طور سے ترک سکونت کر رہے ہیں اور پکنک ہی پر سے سیاحت عالم کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا لیکن جب صبح کا آخری ستارا ابھی ڈوب چکا تو میں نے ان کی توند کو اس انداز سے جیسے ملائی کی قلفی والا اپنا ہنڈا ہلاتا ہے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ خون خراب کر کے بیدار ہوئے تو مجھے فوراً نادر شاہی حکم دیا "شرما ابھی اپنے چچا کی موٹر لے کر نہیں آئے ہیں۔ ذرا لمبے قدموں ان کے یہاں چلے جاؤ، میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔"

میں شرما کے یہاں پہنچا تو پتا چلا کہ وہ کملا کے یہاں گئے ہیں۔ میں رکشے پر کملا کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ شرما اور کملا میں کچھ نوک جھونک چل رہی ہے اور ایک میکانک —— ایک اس قسم کی سواری کو جسے دیکھ کر ہی شاید موجد کے ذہن میں موٹر کار ایجاد کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا بڑی بے دردی سے ٹھونک پیٹ رہا تھا۔ اس سواری کی بوسیدگی دیکھ کر خود اپنے اوپر بوسیدگی چھا گئی اور اس عالم فانی سے جلد از جلد کوچ کر جانے کو جی چاہنے لگا۔ یہ سواری جب بنی تھی تب تک پالش جیسی نمائشی چیزیں غالباً ایجاد ہی نہیں ہوئی تھیں۔ تکلف سے بری ہے حسن ذاتی۔ کئی دھاتوں کی آمیزش سے اس سواری کا ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا اور وہ اپنا اپنا رنگ الگ الگ ظاہر کر رہی تھیں البتہ کہیں کہیں کیچڑ اور تیل کے دھبوں نے خلط بحث پیدا کر دیا تھا۔ اس کی چھت شاید بنائی ہی نہیں گئی تھی۔ پیچھے کی نشستیں غائب تھیں اور ان کی جگہ پیال بچھا کر دری ڈال دی گئی تھی تاکہ اس میں بیٹھے ہوئے خوش قسمت مسافر ایک ہی ٹکٹ میں دو تماشے دیکھ سکیں۔ یعنی بیٹھیں موٹر میں اور لطف حاصل کریں بیل گاڑی کا۔

اس کے دو دروازے غیر ضروری سمجھ کر مستقل طور پر بند کر دیئے تھے کیونکہ شرما جی کے چچا نے اس ضعیفہ سے اس کی پیرانہ سالی کے باوجود بالکل قطع تعلق نہیں کر لیا تھا بلکہ کبھی کبھی اپنے فارم پر اس سے بھوسا اور کنڈے ڈھونے کا کام اب بھی لے لیا کرتے اور اس مقصد کے لئے دروازے کے زنگ آلود ہینڈل کھانچوں کا تسمہ باندھنے کے کام آتے۔

میکانک جب اس کو ٹھونکتے پیٹتے تھک چکا تو اس نے عاجز آ کر اعلان کر دیا کہ موٹر ٹھیک ہو گئی ہے اپنی ریشمی عنابی ساڑی پہن کر کملا اس قسم کی غیر مہذب سواری میں بیٹھنے سے صدور جہ بدک رہی تھیں لیکن پھر وہ کسی طرح میری مروت اور شرما کی محبت میں خاموش ہو گئیں اور

موٹر کے اگلے حصے میں شرما کے پاس بٹھا دی گئیں۔ میکانک نے ہینڈل گھمایا، پھر دوڑ کر میرے ساتھ دھکا لگایا اور شرما کے ہاتھوں مردہ زندہ ہو گیا یعنی موٹر چل پڑی اور میں بھی ہائی جمپ کر کے اس پر چڑھ گیا۔

مرزا صاحب کے گھر پہنچے تو شاید اس خیال سے کہ انتظار کی گھڑیاں بیکار کیوں جائیں اپنی پڑوسن سے چار چوٹ کی لڑائی ایک بلی اور کچھ دودھ کے متعلق لڑ رہے تھے لیکن موٹر کی کھڑکھڑاہٹ اور پھڑپھڑاہٹ سے وہ کیا سارا محلہ گھروں سے باہر نکل آیا اور یہ تو تو میں میں خود بخود بند ہو گئی۔ جلدی جلدی سامان اور مرزا صاحب لادے گئے۔ محلے کے لڑکوں نے بڑے جوش اور زور سے دھکا لگایا۔ "بم چخ کی پوں پوں کی ہائے ہائے۔" یہ اس محلے کے ہونہار سپوتوں کا مخصوص مقامی نعرہ تھا اور موٹر چل پڑی۔

مس ڈروتھی کے یہاں پہنچے تو پتا چلا کہ وہ ابھی تیار ہو رہی ہے۔ آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد مرزا صاحب نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا تو کی میں" قسم کا ایک ساز بجا۔ مرزا صاحب اسے "کم ان" سمجھے اور فوراً ہینڈل گھما کر دروازے کے اندر ہو گئے لیکن پھر ایک نسوانی چیخ اور چند امپورٹڈ قسم کی گالیوں کے ساتھ فوراً ہی باہر آ گئے اور اپنے اس طرح غروب اور طلوع ہونے کی یہ تاویل پیش کی "اس نے کمنگ کہا تھا یعنی آ رہی ہے اور میں سمجھا کہ ان یعنی اندر چلے آؤ۔"

شرما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اچھا جان بوجھ کر اس نے آپ کو اندر بلایا تھا گھر میں آنے کو کہا اور کہہ کے کیسی مکر گئی۔"

چند ہی لمحوں میں مس ڈروتھی منی اسکرٹ اور اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے جن میں وہ صرف ٹانگ ہی ٹانگ دکھائی پڑتی۔ اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی اور مرزا صاحب سے مصنوعی غصے سے کہا "شیم لیس پی پنگ ٹام۔ لیڈیز کے کمرے میں ایک دم گھسنا مانگتا تم؟"

مرزا صاحب بولے "اجی نہ وہاں لیڈی تھی نہ یہاں، جو ٹانگیں وہاں تھیں وہی یہاں ہیں۔"

مس ڈروتھی نے ہم لوگوں کا رسمی خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "اب نو بجنا چاہتا اور مرزا بولا تھا کہ ساڑھے سات بجے ہم پکنک کے ٹھکانے میں ڈیکی لگا نا سکتا۔"

"نو بجے تک تو آپ خود ہی تیار نہیں تھیں" کملا بولی۔

"ہم جانتا کہ مرزا انڈین ٹائم بولتا ہے ورنہ ہم پہلے سے تیار ہو نا سکتا۔"

اس گفتگو کے وقت مرزا صاحب مس ڈروتھی کے سامنے آڑے ایسے کھڑے تھے تاکہ اس کی نظر کگر گدھا قسم کی موٹر پر نہ پڑے ورنہ پہلے پرسے ہی نہ اکھڑ جائے۔ اتنے میں ڈروتھی کا فاکس ٹیریر بھی آ گیا۔ اسے مرزا صاحب سے پرانی رقابت یا مخاصمت تھی۔ اس نے ہم لوگوں کو تو قابلِ اعتنا سمجھا نہیں البتہ مرزا صاحب کی طرف منہ کر کے "تخ تخ" کی۔ "دیوانہ را آہوئے بس است" کے مصداق مرزا بھاگے کتے نے تعاقب کیا اور جس طرح بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق، اسی طرح مرزا صاحب ایک ہی ہائی جمپ میں موٹر کے پچھلے حصے میں غرق ہو گئے۔ اب مس ڈروتھی نے ہمارا موٹر نما عجوبہ دیکھا۔ وہ مارے خوشی کے اچھلتی کودتی اس کی طرف بڑھی "ونڈر فل" بالکل انٹیک، ایک دم دینٹج کار! مرزا ڈارلنگ تم پرفکٹ لور ہے۔ لیوزارک NOAVS کی چھوٹی سسٹر کو پکڑ لایا۔ ARC اس کو ہم ڈرائیو کرنا مانگتا اور یہ کہتے ہوئے وہ اچک کر ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

کملا موٹر کے پچھلے حصے میں بٹھائی گئی جہاں سامان کے درمیان مرزا دبکے بیٹھے تھے۔ ہینڈل گھمانے اور دھکا دینے کے بعد میں اور شرما آگے بیٹھ گئے اور ایک دفعہ پھر موٹر چلی۔ اس کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں تھی البتہ اس کی کھڑکھڑاہٹ اور پھڑپھڑاہٹ سن کر چونکہ سڑک کی سواریاں اور راہ گیر دور ہی سے بھاگ نکلتے لہٰذا اس کو صاف اور کھلا ہوا راستہ مل رہا تھا اور اس جلوے میں کسی خرگوش کے کان کاٹنے کے دم خم ظاہر ہوتے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مرزا صاحب مجھے مس ڈروتھی کے پاس بیٹھنے کے جرم میں قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا غالب کا یہ مصرع دہرا رہے تھے۔

ذکر بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

میں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا اور اسی وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے اور مس ڈروتھی کے درمیان اس کا فاکس ٹیریر لیٹا ہوا ہے۔ مس ڈروتھی شاید اس بوسیدہ موٹر کے رنگ ڈھنگ کو دیر زدل سے واقف نہیں تھی اور میں موت کو برحق سمجھتے ہوئے انتہائی تشویش اور خوف سے دیکھ رہا تھا کہ موٹر کبھی دائیں جاتی اور کبھی بائیں اور جہاں کوئی گڑھا نظر آ جاتا تو اس میں یہ ٹھوکا ضرور کھاتی جس سے اس کا سارا وجود

بڑی طرح جھنجھنا اٹھتا۔ میں ایسے ہی ایک دھچکے کا منتظر رہا۔ اور جیسے ہی وہ در پیش آیا میں نے بڑی سرعت سے ڈرورتھی کے فاکس ٹیریر کو موٹر کے پیچھے والے حصے میں منتقل کر دیا۔

اور پھر ایک بھونچال سا آ گیا۔ مرزا صاحب موٹر میں کھڑے ہو لئے یا موٹر سے باہر پھاند جانے کی کوشش میں پھڑپھڑانے لگے۔ لیکن موٹر کے اطوار اور رفتار ان کو موقع ہی نہیں دے رہی تھی اور وہ گر گر کر موٹر کے چوکھٹے اور اسباب سے ٹکرا رہے تھے اور جمی ان کے اوپر بیٹھا تھا۔ کملا رشک کو ڈھال بنائے مارے ہنسی کے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ مرزا صاحب اس رقص بسمل کے دوران اپنے سینے اور حلق کی پوری قوت سے چیخ رہے تھے۔ "روکو، روکو! فار گاڈس سیک موٹر روکو!" اور ساتھ ہی ساتھ کملا کی خوشامد بھی کر رہے تھے "اس کتّے کے بچے کو موٹر سے باہر پھینک دو! کملا میری کملا!"

موٹر اس قدر کھڑ کھڑ بھڑ بھڑ کر رہی تھی کہ بیچارے مرزا صاحب کی کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اور یوں بھی ہم سنی ان سنی کر رہے تھے لیکن جب مرزا صاحب کی داد و فریاد زیادہ بڑھی تو ڈرورتھی چیخی "یو فلرٹ کملا کو پریشان کرنا مانگتا۔ جمی کی بات مت کرو۔ تم اسے تنگ کرے گا تو ہم تم کو ایک دم شوٹ کرنا مانگتا مرزا!"

موٹر کی کھڑکھڑاہٹ اور بھڑبھڑاہٹ میں اب کچھ پھٹ پھٹا پھٹ بھی شامل ہو گئی تھی۔ ہم لوگ اس وقت شہر کی سڑک چھوڑ کر ایک تالاب کے کنارے بالکل سپاٹ چڑھائی پر جا رہے تھے دفعتاً موٹر کے انجن کے اندر ایک زور کا بم جیسا پٹاخہ دغا اور وہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ جس سے اگر مس ڈرورتھی مجھ پر گر کر پیپر ویٹ کا کام نہ دیتی تو یقیناً میں اچھل کر اس کے باہر ہوتا، وہ ایسی رکی بلکہ بیٹھ گئی جیسے کسی عاشق نامراد کا دل۔ ہم میں سے کسی کے بھی ہوش و حواس ٹھیک نہیں تھے اور کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔ پھر اس قبرستان جیسی فضا میں زندگی کا پہلا آثار یہ نمودار ہوا کہ موٹر کے اندر سے مرزا صاحب پھاندے اور ان کے پیچھے جمی۔ لیکن اب شاید دونوں میں دوستی ہو گئی تھی کیونکہ وہ مرزا صاحب کو دوڑا ضرور لیکن بھونک نہیں رہا تھا۔

ہم لوگ اس حادثے سے ششدر ہو کر کچھ دیر یہ کیفیت گم سم دیکھتے رہے۔ پھر مس ڈرورتھی کی تحکمانہ آواز گونجی: "مرزا تم ایک دم ڈنگی ہے۔ ایسی کنڈم موٹر لایا اور پھر اس میں بم رکھ کر ہم کو مرڈر کرنے کی اٹمپٹ کی۔ ہم تمہارے اگینسٹ رپورٹ لاج کر کے تم کو جیل بھیجنا مانگتا۔"

مرزا صاحب جو دوڑ دوڑ کر بری طرح ہانپ رہے تھے، بولے "اور جمی الّو سے پٹھے کو ہمارے پیچھے چھوڑ کر تم ہمارا ایک دم مرڈر کر رہا ہے۔"

"جمی ڈارلنگ کم ہیر۔ ڈونٹ ویسٹ یور ٹائم وِد دِس ڈنگا باؤنڈ۔" ڈرورتھی بولی اور جمی بھاگتا ہوا آیا۔ اور کود کر اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

مرزا صاحب بھی جامۂ انسانیت میں آ گئے۔ سب لوگ موٹر سے اتر آئے اور اس کو اس طرح ٹٹولنے لگے جیسے سات اندھوں نے ہاتھی کو ٹٹولا تھا لیکن مرحومہ قید حیات و بند غم سے پوری طرح نجات پا چکی تھیں اور ان سے کسی جنبش کی توقع کسی مُردے پر اتہام لگانے ہاتھی کو ٹٹولا تھا لیکن مرحومہ قید حیات و بند غم سے پوری طرح نجات پا چکی تھیں اور ان سے کسی جنبش کی توقع کسی مُردے پر اتہام لگانے کے مترادف تھی۔

اتفاق سے بدلی تھی ورنہ دھوپ کی شدت سے ہم لوگوں کا اور بھی برا حال ہو جاتا۔ کافی رد و قدح کے بعد طے پایا کہ کملا اور مس ڈرورتھی اور شرما کو موٹر کے پاس چھوڑ دیا جائے اور مرزا صاحب اور میں چڑھائی کے اوپر گاؤں ہے اور جس کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں دور سے کھڑے ہمارا تماشہ بھی دیکھ رہے ہیں، جا کر چند ایسے آدمیوں کو بلا لائیں جو موٹر کو دھکیل کر گاؤں تک پہنچا دیں اور وہیں گاؤں کے قریب کہیں پکنک کی حسرت نکال لی جائے یعنی کھانا کھا لیا جائے اور پھر کرائے کی بیل گاڑی پر شہر کے لئے روانہ ہو جایا کرے۔

مرزا صاحب اور میں چلا تو مرزا صاحب کے تعاقب میں جمی بھی چل پڑا اور اس کو واپس لانے کے لئے ڈرورتھی۔ بھی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی "ڈارلنگ مرزا! میں کملا اور شرما کے رومانس میں کلِ جوا سے KI1124 نہیں بننا مانگتا۔" اور ڈرورتھی ہنسنے لگی۔

ہم لوگوں افتاں و خیزاں مرزا صاحب اور مس ڈرورتھی کی ڈِک بھونک کے درمیان اوپر پہنچے تو گاؤں تک پہنچنے میں ایک کافی چوڑی نالی پڑی، جس سے ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں پانی جا رہا تھا۔ مس ڈرورتھی نے کچھ فاصلے دوڑ کر اسے پھاندنا چاہا تو غالباً اس کے اونچی ایڑی کے جوتے نے ساتھ نہیں دیا اور وہ ایک جھپاکے کے ساتھ بیچ نالی میں گری۔ پاس کھڑے دیہاتیوں کو غالباً منی اسکرٹ کی زیادہ اور مصرف کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ انھوں نے پرزور اور پرجوش قہقہوں سے اظہار تحسین کیا۔ میں نے اور مرزا صاحب نے ڈرورتھی کو اتنی مشکل سے نکالا کہ خود بھی کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ مس ڈرورتھی کے پیر میں موچ آ گئی تھی اور یہ مرزا صاحب کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ اب وہ مرزا صاحب پر اپنا پورا بوجھ ڈھکیلے ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی۔ وہ اس نئے ساتھ سے مبہوت ہو کر بولی "مرزا ڈارلنگ تمہارا پکنک ہمارا فیونرل ہو گیا۔ ہم جلدی ایک دم ہاسپٹل میں بھرتی ہونا مانگتا۔" لیکن ابھی وہ پوری بات کہہ بھی نہیں پائی تھی کہ جبھی پر ایک دیہاتی کتا حملہ آور ہوا اور اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے موٹے کتوں نے بھی آ کر اس پر اور اس کے ساتھ ہم لوگوں پر بے تحاشا بھونکنا شروع کر دیا۔ جبھی مارے ڈر کے ڈرورتھی کے پیروں سے چمٹا جا رہا تھا اور حملہ آور کتے ہم لوگوں سے خوفناک حد تک قریب سے قریب تر ہوتے جاتے تھے ڈرورتھی چیخ مار کر مرزا کے بجائے مجھ سے چمٹ گئی۔ اب کاموں کی یہ تقسیم ہو گئی کہ مس ڈرورتھی کو ایک گرتی ہوئی دیوار کے مانند میں سنبھالے کھڑا تھا اور بیچارے مرزا صاحب جبھی کو گود میں لئے تن تنہا دیہات کے نصف درجن مسٹنڈے کتوں سے جنگ مغلوبی لڑ رہے تھے اور وہ بھی محض زبانی "دھت! دھت! ابے ہٹ تیری کی" "ایں چھوڑ دو بھی جان۔"

کچھ بھلے دیہاتیوں کو رحم آ گیا اور لاٹھیاں لے کر آ گئے اور انھوں نے ان بے ہودہ کتوں کو دور بھگا دیا اور ایک پیڑ کے نیچے ہم لوگوں کے لئے چارپائی ڈال دی۔ ہم لوگوں کو دیکھنے کے لئے گاؤں کے آدھے مرد اور قریب قریب سب عورتیں اور بچے جمع ہو چکے تھے۔

مرزا صاحب نے گاؤں کے پردھان کو طلب کیا اور وہ بیچارہ بہت شریف ثابت ہوا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم لوگ ایک بیل گاڑی پر لدے شہر واپس جا رہے تھے۔ گاؤں کے نیچے چڑھائی پر کالا سیک [illegible]

یہ خوش خبری سنائی کہ چند گاؤں والوں نے موٹر کو چڑھائی کے اوپر دھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے تھوڑی دور آگے بڑھ کر پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ گاؤں والے اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے اور وہ غالباً مرنے کے بعد کی رسوائی سے بچنے کی غرض سے الٹی دوڑتی ہوئی سیدھی تالاب میں جا ڈوبی۔ اب وہ بالکل محفوظ تھی اور حسب ضرورت مناسب طریقے سے باہر نکالی جا سکتی ہے۔ "اور سامان اور کھانا؟" مرزا صاحب نے بوکھلا کر پوچھا

مس ڈرورتھی نے لقمہ دیا "ہم بہوت بھوکا ہے پورا لنچ مانگتا۔"

شرما نے ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کیا سازو سامان کسی بھیگے ہوئے چوہے کی طرح سکڑا پڑا تھا ایک خود غرض لڑکے نے بڑی مشکل سے یہ نکالا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنا لنچ کھا سکتی ہیں مس ڈرورتھی۔ اس کے ساتھ آپ کو پانی بھی نہیں پینا پڑے گا۔ وہ اس میں پہلے ہی سے موجود ہے۔"

بیل گاڑی سے شہر تک کا سفر کچھ زیادہ پھیکا اور بے مزا نہیں رہا۔ راستے میں آندھی اور پانی کے طوفان نے ہماری خود ساختہ پکنک کو بالکل ہی بے ساختہ قدرتی بنا دیا۔ اور یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہم قدرت سے بالفاظ دیگر خدا سے قریب ہونے سے بال بال بچ گئے۔ معدے میں کشادگی اور دماغ میں بالیدگی، ہم بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ آنکھوں میں وہ نور تھا کہ ساری دنیا تاریک نظر آ رہی تھی اور دل میں ایسا سرور سوز زن تھا کہ چلتی بیل گاڑی ہی پر کھڑے ہو کر رقص کرنے کو جی چاہتا تھا۔ پانی میں بھیگے اور کیچڑ سے لت پت ہم ایسے مہذب نظر آتے کہ معلوم ہوتا کہ تہذیب کا جنازہ ہمارے ہی کاندھوں پر رکھا ہوا ہے۔ ہمارا ماحول لاحول پڑھتا تبدیل ہو چکا تھا اور آب و ہوا کی تازگی کا ہم ایسا سبق سیکھے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنے گرد و پیش کی ہر چیز باسی اور بوسیدہ نظر آتی۔

دفتر میں مرزا صاحب اور مس ڈرورتھی جواب مسز مرزا ہیں اور شرما اور کملا جواب مسز شرما ہیں جب مجھے کچھ بے تعلق سے نظر آتے ہیں تو میں حلق صاف اور اپنا منہ چھت کی طرف کر کے بلند آواز سے پوچھتا ہوں "تو آپ اگلے اتوار کو پکنک پر چل رہے ہیں؟"

فضا میں فوراً چار قہقہے بلند ہو جاتے ہیں اور میں شرما کے چچا کی موٹر کا تصور کر کے خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔

ڈرورتھی چہکتی ہے "ہم ٹھیک بولتا ہے کہ سائیلنٹ آدمی بہوت ڈینجرس ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کی [illegible] کو سپیڈ پوسٹ کرنا مانگتا۔"

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال کے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ ر تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر میں کتابت وغیرہ کی غلطی کا ذمہ دار ادارہ نہیں ہوتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر غلطی کی اصلاح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• رفعیہ یاسمین (بیلا۔ سیتامڑھی) میری پھوپھی زاد بہن شاہینہ پروین اور دولہا بھائی شوکت علی (ہرخہ) کو اللہ پاک نے پہلی بار ۸ ر ستمبر ۸۳ء بروز جمعرات بوقت صبح ۵ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام رفعت علی قرار پایا۔ اللہ پاک اسے فخر خاندان بنائے۔

• میرے بھتیجے عزیزی نسیم اشرفی سلمہ اور عزیزی فیروزی سلمہا کو تین لڑکیوں کے بعد اللہ پاک نے ۱۴ ر اکتوبر ۸۳ء بروز جمعہ بوقت ۶ بجکر ۲۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ جس سے سارے خاندان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اسے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنائے بچے کے دادا نعیم اشرفی صاحب اور نانا جان صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نسیم امہولوی

• صواتی صبیحہ عائشی، فریدہ شفیق صواتی (آمبور) میری بھابی گلزار صواتی کو اللہ پاک نے ۱۳ ر ستمبر ۸۳ء کی دوپہر میں ایک بجکر ۵۵ منٹ پر دوسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فاروق صواتی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نومولود عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• تبسم و تسنیم، نسرین و فرحین (کمبی پور بنگلور) ہمارے ماموں انیس احمد اور مامی دلروز شمیم (مدراس) کو اللہ پاک پہلی مرتبہ ۲۰ ر ستمبر ۸۳ء بروز منگل بوقت شب ایک بچی عطا فرمائی۔ نام زہرہ انجم عرف روبی رکھا گیا اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور صاحب نصیب ہو۔

• قدسیہ شاہین، شبانہ یاسمین (درگاہ بہار بیلا۔ ویشالی) میرے خالہ زاد بھائی شبیر احمد اور بھابی رضیہ شبیر کو اللہ پاک نے ۱۰ ر ستمبر کو ۲ بجے شب میں تیسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• شبنم سمیع، عرفانہ سمیع (آکولہ) ہماری باجی ماہ طلعت ... محفوظ احمد صاحب کو اللہ پاک نے ۳ ر اکتوبر ۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔

• پروین فاطمہ (اری) ۔ آپ نے نمبر خریداری نہیں لکھا اور رسیدی ٹکٹ روانہ کئے اس لئے خبر نہ چھپ سکی۔

پیغامات نشاط

• حریم اکتوبر میں ذیل کی خبر ساحر عباد صاحب کے بجائے ساجد ایچ شمسی صاحب کے نام سے چھپ گئی تھی۔ اس لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ساحر عباد (نگیر انوخال۔ آکولہ) "ہماری خالہ محترمہ سیمی (ماہ سیما بانو صاحبہ) (بنت جناب محترم محمد تہذیب صاحب، مرحوم) کی شادی انکل محمد یوسف صاحب (پسر جناب محمد یونس، ساکن دھنباد) کے ساتھ ۳۱ ر جولائی ۸۳ء کو بمقام کلکتہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ہمارے انکل و خالہ کی اس نئی زندگی کو شاد و خرم رکھے۔

• رفعیہ یاسمین (بیلا۔ سیتامڑھی) میری دوست غزالہ یاسمین عرف گڑیا (دختر نیک اختر شمس الضحیٰ صاحب) کی شادی محمد حسان صاحب ایم۔ ایس۔ سی (پسر ساجد حسین صاحب) کے ہمراہ ۲۰ ر اگست ۸۳ء کو بمقام نندرا۔ مدھوبنی۔ بہار، بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ میری سہیلی کی نئی زندگی پر بہار گذرے۔

• عائشہ تسنیم (گرگیشوری) میری خالہ زاد بہن شمشاد بیگم (بنت آر عبد القادر صاحب۔ ایڈوکیٹ میسور) کی شادی (بنت آر عبد القادر صاحب۔ ایڈوکیٹ۔ میسور) کی شادی اے فیاض احمد (ابن جناب جی وی۔ عبد العزیز، وائس چیرمین مرحوم۔ گرگیشوری) کے ہمراہ ۲۰ ر اکتوبر ۸۳ء بمقام گرگیشوری بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• حذیفہ راحت سلمہا (آمبور) کے بھائی عبد الغفور عابد سلمہ بی۔ ایس۔ سی (پسر جناب محمد امان اللہ مدیکار) کا عقد نکاح مسنون جناب

حاجی ڈی محمد اسمٰعیل صاحب بنگلور کی دختر نیک اختر سلمہا کے ہمراہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء نیا مدلیار شادی محل بنگلور گیٹ میں ساڑھے ۱۲ بجے دن میں بحسن و خوبی انجام پایا اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اجہونوی)

• بیگم معین الدین (سیتاپور) میرے بھائی ریاض الدین کی شادی خانہ آبادی ہمراہ روشن جہاں سلمہا یکم مئی ۱۹۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ان کی ازدواجی زندگی کو ہمیشہ خوشگوار رکھے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور پاکیزہ ہو اور دفتر میں ۲۰ تاریخ تک پہنچ جائے۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری کا لکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔

دسمبر کے لئے عنوان ہے "نفرت" "جنوری کے لئے ہمسفر"

مناتے ہیں بہت ہی دھوم سے ہم جشن بربادی
لٹا دے اے قمر تو آج جنکر چاندنی اپنی

مرسلہ: نجم السحر حکیم حافظ عزمی (بتول)

بہتر دکھائی دیں کہیں شمس و قمر سے آپ
دیکھیں جو آئینہ کو ہماری نظر سے آپ

مرسلہ: مسز نسیمہ عزیز (بھاگلپور)

تیری یادوں کا دیا، دل میں جلایا تھا کبھی
بس اسی نور کو اب شمس و قمر ہونے دے

مرسلہ: نورجبیں (نوادہ)

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجم سیماب بار فتار پر مجبور ہیں

مرسلہ: عصمت آرا (بانکا)

منور کر دیا ہے داغ دل کو راہ منزل کو
کبھی مانگی نہیں شمس و قمر سے روشنی میں نے

مرسلہ: طاہرہ تبسم نعظمی (سکرور)

قمر کا خوف کہ ہے خطرہ سحر اس کو
[illegible] سیا [illegible] عروس کو

مرسلہ: قرۃ العین (نینی تال)

قمر اپنے باغیچہ کی وہ کہانی میں نے چھیڑی
کہ سنا گئے ستارے مرا رات بھر فسانہ

مرسلہ: کشور سلطانہ (لال باغ۔ لکھنؤ)

قمر بھی فلک پر ہوا ہے دو پارہ
کیا کبریائی نے ہے جب دم اشارہ

مرسلہ: شہناز بیگم (بنگار اپیٹ)

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمیں قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر

مرسلہ: افشاں جبیں (کرنول)

کہی ہے قمر نے یہ کیا خوب تاریخ
"کلام گل افشاں ہے گلبانگ فطرت"

مرسلہ: نجمہ انصار (بھٹکل)

زخم کو دیتے ہیں تشبیہ گل خنداں سے
دل کے ہر داغ کو ہم رشک قمر کہتے ہیں

مرسلہ: امروز جہاں (آرہ)

معجزہ شق القمر کا ہے "مدینہ" سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

مرسلہ: ناز (ابوت محل)

تمہاری صبح حسین ہو رخ سحر کی طرح
تمہاری شب ہو منور شب قمر کی طرح

مرسلہ: شموئہ روحی (حیدر آباد)

• نمبر خریداری 6373 آپ کے دونوں شعر قابل اشاعت نہیں۔

دو نئے ناول

• بھیگے ہوئے رخسار	نجمہ طالب	40/-
• جھوٹے سچے لوگ	سعیدہ افضل	25/-
(نیا اڈیشن) بھنورد	سلمیٰ کنول	25/-

انتظار کیجئے

باجرہ نازلی ۔ ۔ ۔ کی صاحبزادی شہناز کنول کے جدید دلچسپ ناول بادل کا سایہ کا

... بچے بڑے کمرے میں آرام کریں گے ۔ جب تک یہ سو کر اٹھ نہ ... پنکھا چلتی رہیو ۔ خبردار ۔ ہاتھ اگر رکا تو پنکھے ہی کی ... اتار دوں گی ۔!"

... جلدی سے کھانا کھا کے چلی آ بیٹی ۔!" بیگم علوی نے رد مہ سے کہا ... ارے امی ۔ ایک روز دیر سے کھائے گی تو مر نہ جائے گی ۔" باجی ... بولیں ۔ "آپ دیکھتی نہیں ہیں ۔ بچے نیند اور گرمی کے مارے ... رہے ہیں ۔ آپ نے اس نیقرن کو بہت سر چڑھا لیا ہے ۔ دیکھو کیسی صورت بنا رہی ہے جیسے اتنا سا کام اس کے دم پر بنا جا ... ہے ۔!"

"نہیں ۔ باجی جان ۔ میں تو ۔" رد مہ ہکلائی ۔

... لو ۔ وہ چنگھاڑیں ۔ "باجی جان ۔ ہنہ ۔ انہی سے بہنایا جوڑا ... تھا ۔ سن لے کان کھول کے مردار ۔ خبردار جو مجھے باجی جان کہا ہے ... کوئی سن لے گا تو کیا سوچے گا ۔ میجر صاحب کے بچوں کی یہ بھی ایک ... بہن ۔"

"چلو ۔ میں چل کے پنکھا جھل دوں ۔" بیگم علوی بولیں ۔ وہ تو ... شور تھیں ۔

"ارے امی رہنے دیجئے ۔" باجی جان کو غصہ آ گیا ۔ "ابھی میرے ہاتھ ... نہیں گئے ۔ آپ جائیے اپنی لاڈلی کو کھانا کھلائیے ۔ بھوکی نہ رہ ... رہی ہیں ۔ دیکھ لیجئے گا ایک دن یہی آپ کے سر پر چڑھی ...

"میں سمجھا کہ غفور ہے ۔ تم کیسے اٹھ آئے ؟"

"غفور میاں تک آپ کی آواز نہیں پہونچی شاید ۔" معتصم نے کہا ۔ "کیا گرم پانی چاہیئے ۔؟"

"ہاں میاں ۔ وہ کچھ زکام ہونے لگا ہے ۔!"

"میں لے آتا ہوں ۔ گرم پانی ۔" معتصم نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے آئے ۔ بے ساختہ ہنسے دیتے تھے ۔ فرط مسرت سے چیزیں ہاتھ سے چھوٹ رہی تھیں ۔ رد مہ سے چند لمحوں کی ہم کلامی نے انھیں جنت بخش دی تھی ۔ انھوں نے علوی صاحب کو گرم پانی دیا ۔ ان کے لیے چھوٹی چوکی بچھائی ۔ اور پھر جب اپنے کمرے میں آئے تب بے حد خوش تھے ۔ ساری ... ہی آنکھوں میں کٹ گئی تھی لیکن انھیں نہ تو تھکن کا احساس تھا ... گا ۔ وہ جب اپنے بستر پر لیٹے تب بھی دل میں ایک جہان آرزو کو ... ہوئے تھے ۔! انھوں نے آنکھیں بند کیں اور ملگجی تاریکی میں ایک چہرہ جگمگا اٹھا ۔ دل کی دھک دھک میں ایک مترنم آواز مدغم ہو ...

"رد مہ رد مہ ۔ خدا کرے کہ میں تمھیں اپنا سکوں ۔"

آخر شب ان کی آنکھ ذرا دیر کو لگی تھی کہ غیر معمولی غل غپاڑے سے کھل گئی ۔ گھر بھر کی ملی جلی بولیاں برآمدے میں گونج رہی تھیں ۔ اور بھاری چیزیں دھر پٹخنے کی سامعہ پاش آوازیں ان بولیوں پر ... تھیں ۔

"کیا مصیبت آ گئی ہے ۔" آنکھیں ملتے ہوئے وہ پلنگ سے کود ... جھپٹ کر دروازہ کھولا ۔ یکبارگی جھماکے سے ہو گیا ...

چھکے سے پیچھے ہٹے۔ اور آہستہ سے دروازہ بند کرکے بولٹ سرکا دیا۔ اب صبح ہونے میں دیر کتنی ہے۔ پھر جناب وہ ہیں اور باجی جان ہیں۔ کس کی پرسش ہوگی۔ وہ گم صم سے بستر پر آلیٹے اور معقول بہانے سوچنے لگے۔!

"ارے بھئی اچھی طرح دیکھ لیا تھا ٹیکسی میں کچھ رہ تو نہیں گیا!" ایک بھاری گونجدار مردانہ آواز معتصم کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور سارا جسم جھنجھنا گیا۔

"اچھا تو دولھا بھائی بھی ہیں۔ یا شمس بخیر۔"

سب کے سب اندر چلے گئے۔ دالانوں میں روشنیاں ہوئیں۔ دولھا بھائی کے دونوں ننھے گونجنے لگے! بھیسیوں آوازیں تھیں۔ ان کا تجزیہ کرنا مشکل تھا۔ چھوٹی بڑی پتلی اور موٹی آوازیں کس کس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ انجانے کیا بات تھی۔ انھیں اپنی قابلِ تعظیم بڑی بہن کی یہ آمد کچھ اچھی نہ لگی۔ اپنے احساس کو وہ کوئی نام نہ دے سکے۔ بس یوں ہی پیچتے رہے۔ انھیں کچھ دنوں اور نہ آنا تھا!۔

پھر معتصم کو نیند نہیں آئی۔ اب پچھلا کیف و خمار باقی نہ رہا تھا۔ اب تو سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ منھ میں کڑواہٹ سی بھری تھی۔ عجیب سا حال ہو رہا تھا۔

دور سے اذان کی آواز سنائی دی۔ بیماروں کی طرح وہ اٹھے وضو کیا اور جانماز پر آکھڑے ہوئے۔!!

بول دیا تھا۔ ایک صاحبزادے نے پلاؤ میں سے جھانکتی ہوئی بڑی سی بوٹی کھینچ لی تھی اور اسے نوچ رہے تھے۔ دوسروں میں انڈے کی غیر منصفانہ تقسیم پر چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ صاحبزادی کرسی پر کھڑے جھکے میز کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بیگم علوی کچھ منمنا رہی تھیں مگر ان کی سنتا کون تھا!۔

توبہ توبہ کس قدر بدتمیز بچے تھے! نینا تو حیران تھی۔

معتصم نے زبردستی سلمیٰ اور نینا کو بٹھا لیا۔ اور پھر پردے کی طرف دیکھا لیکن اتنی ہمت ان میں نہیں تھی کہ وہ اسے بھی سب کے ساتھ بٹھا سکتے۔!

طعام خانے میں ایک شور بے ہنگام مچا ہوا تھا۔

پھر صاحب جلدی جلدی کھانا کھا کر رخصت ہوئے گئے۔ معتصم بھی اٹھ کر بھاگ کر کمرے سے نکل آئے۔ ان کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ پندرہ دن کیونکر گذریں گے۔!

بڑی دیر بعد وہ سب دالان میں آئے۔ معتصم نے سنا باجی جان غالباً نینا سے کہہ رہی تھیں۔

"بڑے کمرے میں چھت کا پنکھا لگا ہے کہ نہیں؟"

"جی ہاں نہیں ہے باجی جان" نینا ڈرتی ڈرتی بولی "ایک پنکھا بس دالان میں ہے اور دوسرا ابا جان کے کمرے میں۔!"

"روحہ۔!" انھوں نے دہاڑ کر آواز دی۔

اس کا جواب معتصم کو سنائی نہ دیا۔ جواب میں اس نے تو دعا مانگی ہوگی۔ بہرحال معتصم باجی جان کا حکم سننے کے لیے سراپا گوش

جائے کہ باجی جان پٹنہ بھاگ جائیں۔ لیکن انھیں اپنی دعا کی
قبولیت میں شک تھا۔!
چلتے چلتے میجر صاحب نے اپنی اکلوتی صاحبزادی نازنینہ کے لیے
بیش قیمت طلائی ہار اس طرح خرید لیا۔ جیسے بچے کھلونا خرید
تے ہیں۔ تب معتصم نے اندازہ لگایا کہ پیسہ ان کے نزدیک بڑی
ہلکی چیز ہے۔ پھر انھیں بڑا تکلیف دہ خیال آیا کہ باجی جان
نے بھتیجی بھتیجے کے لیے کوئی چیز نہیں لائیں۔ نہ کھلونے نہ ملبوسات
نازک دلی کا یہ پہلو بھی خرید دیکھا تھا!۔
گھر پران کا انتظار ہو رہا تھا۔ بیگم سلوی نے اپنے واقعے کے
مطابق انتظام کیا تھا۔ طعام خانے میں بڑی میز پوری بھری
ہوئی تھی۔ معتصم نے دیکھا کہ بیک وقت سلمی، نینا اور رومہ
رومال کے لیے موجود تھیں۔ اور نہ جانے ہی کے معصوم چہروں پر
منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ معتصم کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ آخر
لوگ اتنے احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہیں۔ ؟ کیا سمجھتی
ہیں کہ کوئی ملکہ غریب خانہ پر تشریف لائی ہیں؟۔ انھوں نے باجی
جان کو قطعی نظر انداز کر کے کہا۔
"ارے بھابی۔ آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ سب کے ساتھ بیٹھ جائیے
۔ اور نینا، رومہ۔ تم بھی بیٹھ جاؤ۔ ہمیشہ کی طرح پرانا ہی کھانا
دیں گی"
رومہ سمٹ گئی۔ نینا نے چور نظروں سے باجی جان کو دیکھا
تو کچھ نہ بول سکی۔ باجی جان کے بچوں نے میز پر دھاوا

گھر کا ماحول یکسر بدل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی غریبانہ جھونپڑے
میں شہنشاہ کے قدم آئے ہوں۔ گویا گھمی، مرعوب کن لوگ، احکام کی
بھرمار، بڑے متکبرانہ انداز کی گفتگو، تمول اور امارات کا مظاہرہ۔
ہنسنے کا انداز بھی مصنوعی، اپنوں کے درمیان بھی اداکاری عجیب
تھیں وہ باجی جان بھی۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا بھر میں اگر کوئی
دولت مند ہے تو وہ ہیں۔ میجر صاحب اتفاق سے بالکل تنہا تھے
ان کی ایک سوتیلی بہن تھیں۔ بے چاری بیوہ تھیں۔ پہلے پہل انھوں
نے سوچا تھا کہ بھائی کا گھر بسے گا تو انھیں بھی سہارا نصیب ہوگا۔ بہت
خوش خوش بھاوج کو بیاہ کر لے گئی تھیں۔ اور اپنی بھاوج کے صدقے
قربان جاتی تھیں۔ لیکن نک چڑھی بھابی نے ان کی خدمتوں کے عوض انھیں
ذرہ برابر بھی نہ سدھارا۔ الٹی شکایتیں کیں، تھوڑے ہی دنوں بعد بیچاری
پناہ مانگ کر اپنی کسی سہیلی کے پاس چلی گئیں۔ لیکن میجر صاحب ان کا
خیال کرتے تھے۔ بیوی کو بتائے بغیر ہر ماہ دو سو روپے انھیں بھجوا دیا
کرتے اور کسی مذہبی تہوار پر کپڑوں کا بندوبست بھی کر دیتے۔! بیوہ نند
کے گھر سے چلے جانے کے بعد رضوانہ بیگم مطلق العنان ملکہ بن گئیں۔ میجر صاحب
نے نجانے کہاں کہاں گھوم پھر کر بیش قیمت آرائشی سامان اکٹھا کیا تھا
ان کا بینک بیلنس بھی خاصہ تھا۔ سجا بنا گھر اور گھر کا مالک انھیں بلا شرکت
غیرے مل گیا۔ اور ان کی حکومت پسند طبیعت کو سکون ملا۔ مزاج میں تکبر اور

ہو گیا۔ پھر ایک ایک کر کے خدا نے انھیں پانچ بیٹے دیے۔ بیٹی صرف ایک تھی! اولاد پر بھی وہ نہایت نازاں تھیں۔ رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ چڑچڑاپن غصہ، بدمزاجی اور زباں درازی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ میجر صاحب اس مزاج کے نہ تھے۔ وہ ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ لیکن بیوی کا مزاج بھی نہ بدل سکے۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

بچے عجیب تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شریر۔ باپ کی دولت اور عہدے پر مغرور، اپنے آگے سب کو حقیر اور کمتر سمجھتے! لڑکی صرف دس سال کی تھی لیکن بڑی خاموش، محتاط، ابھی اتنی ہی سی عمر میں وہ سب پر نہایت تحقیر آمیز نظریں ڈالتی۔ سیدھے منھ نہ بولتی۔ نہ اپنے ہم سن بچوں میں کھیلتی تھی! باجی جان اس پر جان چھڑکتیں!

گھر بھر ان کی راہ میں پلکیں بچھا رہا تھا! علوی صاحب گنگ تھے بیگم علوی کچھ مرعوب کچھ متحیر بے چاری سلمیٰ مہر بلب۔ ایسا انسان اس نے پہلی بار دیکھے تھے! رضا نے اسے خوب سمجھا دیا تھا کہ ہمشیرہ محترمہ کس فطرت کی مالک ہیں۔ اگر وہ کچھ کہہ دیں تو یہ برا نہ مانے۔ لیکن اسے نہ جانتے ہوئے بھی برا لگ ہی گیا تھا۔ کیونکہ باجی جان نے سب کے سامنے اس کے بارے میں کہا تھا۔

"ارے امی آپ چھانٹ کے بہو لائی ہیں۔ سفید شلجم، معلوم ہوتا ہے کہ بدن میں خون کی بوند بھی نہیں ہے۔ رضا۔ کیا بیوی کو کھانا پیٹ بھر نہیں دیتا۔ ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں!"

حالانکہ وہ اپنی چھوٹی بھاوج سے پہلی مرتبہ ملی تھیں۔ لیکن انھوں نے بے چاری سلمیٰ کا دل نہ رکھا۔

میں جا بیٹھیں گی۔!؟"

"ہرگز نہیں:" میجر صاحب نے کہا: "میں کسی ہوٹل میں جا بیٹھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ ان کا میکہ ہے۔ وہ اپنی ماں سے ملنے آئی ہیں۔ دوسرے پر نہیں آئیں۔ انھیں یہیں رہنا پڑے گا:"

"آپ کو بھی ہمارا ماحول پسند نہیں؟:"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔؟"

"آپ بھی ہمارے ہی پاس رہیں گے؟:"

"نہیں میاں۔ میں تو صرف چار دن کی چھٹی پر آیا ہوں:" میجر صاحب نے جواب دیا: "اب کی اتوار کو واپس چلا جاؤں گا۔ تمھاری ہمشیرہ البتہ کہہ رہی تھیں کہ چار سال بعد والدین سے ملنے آ رہی ہوں۔ کم سے کم چھ مہینے رہ کر آؤں گی۔ میں نے کہا کہ تمھاری مرضی۔ میں منع کر کے خواہ مخواہ سب کا برا کیوں بنوں۔ اب پتہ نہیں کہ ان کا ارادہ کیا ہوتا ہے۔؟"

معتصم کا دل بیٹھ گیا۔ چھ مہینے۔ گویا آدھا سال۔ اور اتنا طویل عرصہ میں وہ اچھی طرح سب کا کچومر نکالیں گی۔ بیٹا۔ سلمیٰ اور بے چاری روحمہ۔ ان سب کا کیا حشر ہوگا؟ ... اللہ۔ رحم۔ رحم۔!

دو تین بجے تک وہ میوزیم اور زو دیکھتے پھرے۔ علاوہ لگتا تھا کہ وہ سب طوعاً و کرہاً ایک دوسرے کے ساتھ گھسٹے پھر رہے ہیں۔ دل چسپی کسی کو بھی نہ تھی! معتصم کو چپ لگ گئی تھی! دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے: کوئی بات ایسی

بن گیا۔ وہ بھی ہے ۔۔ صرف دال روٹی ۔۔!"
معتصم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کو مرغ و ماہی کھلا بھی نہیں سکتے"۔

دونوں بچوں سمیت باہر نکل آئے۔
"میاں تمھاری بہن کی بات ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں"۔ میجر صاحب نے کہا۔
"شکایت آپ سے بھی ہے۔ معاف کیجئے گا۔ یہ سب آپ کے بے جا ناز اٹھانے کا نتیجہ ہے"۔
ہاں۔ اور کس کا بھی انداز فکر یہی ہے۔ ورنہ میں تو صرف ایک بہنے والا شوہر کہلانا چاہتا تھا!"
"ڈیڈی"۔ دوسرے نمبر کے صاحبزادے نے فرمایا۔ "انگریزی میں میں بولیے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے!"
انھوں نے اسے بھی پھٹکار دیا۔ "خاموش رہو۔ ہماری باتیں تم کیوں سمجھنا چاہتے ہو۔!"
"ایڈیٹ۔!" اعراف نے کہا۔
"شٹ اپ"۔ دوسرے نے بھی ڈپٹ پڑے
معتصم نے بوکھلا کر میجر صاحب کو دیکھا۔ انھوں نے برا سا منہ بنالیا۔ "روز بروز کی جنگ زرگری سے تنگ آکر انھیں ہوسٹل بھجوا دیا تھا۔ وہاں سے بھی شکایتیں آنے لگیں۔ مجبوراً پھر گھر لے آیا۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ وہاں کا ماحول اچھا تھا نہ گھر کا اچھا ہے!"
معتصم نے جلدی سے موضوع بدلا۔ "تو کیا باجی جان واقعی کسی ہوٹل

رضانے ناگواری چھپا کر کہا۔ "شکریہ باجی جان۔ آپ کو ان کا دبلا پن نظر تو آیا۔ ورنہ امی نے تو کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اب آپ آئی ہیں۔ اپنے سامنے کھلا پلا کر کچھ موٹی کر جائیے انھیں۔!"
انھوں نے خوامخواہ قہقہہ لگا دیا۔
"معلوم ہوتا ہے کہ باجی جان کو کلوٹے ہی پسند ہیں"۔ معتصم نے ہنستے ہوئے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ ہم تو اپنی ہزاروں میں ایک بھابی پر فخر کرتے ہیں۔ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے"۔ میجر صاحب نے بات سنبھالی "میں تو صاحب حیران رہ گیا۔ جب دیکھا کہ ان کے ننھے ننھے دو بچے بھی ہیں"۔
سلمٰی کو چپ لگ گئی۔ معتصم نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔ ایک گیا۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ سب اطمینان سے بیٹھے گپ ہانک رہے تھے!۔ دفعتاً وہ معتصم کی طرف مڑیں۔
"یہ کیا سودا اچھلا تھا۔ اچھے بھلے گئے تھے۔ بھاگ کیوں آئے۔ مفت میں ابا جان کا روپیہ برباد کرایا۔ یونہی کسی پر کشش بسکٹ رہی ہوگی۔ دیکھو تو ہی بالوں میں بھی۔ بیٹھ کی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ ابھی چار سال پہلے تک اتنے بڈھے نہیں لگتے تھے۔ تو بھلا۔ باپ کو اس عمر میں سہارا دینے کے بجائے تم نے ان کے لیے اور مصیبت کھڑی کر دی۔ آخر سوچا کیا ہے۔ اب کیا کرو گے۔ باپ کے پاس کوئی خزانہ تو دبا نہیں ہے کہ موج اڑایا کرو۔!"
معتصم کے کان گرم ہونے لگے۔ ان کے جواب دینے سے پہلے ہی بیگم علوی بول پڑیں۔
"ارے بیٹی۔ تمھاری بھی باتیں۔ کیا یہ خود سے آیا ہے۔ ؟ نوج۔ پتہ نہیں کون موت کھایا تھا جس نے جھوٹا تار دے کر اسے بلوا لیا۔ یہ تو خود آکر پچھتا رہا

ہے۔ یونہی بھاگ آنے کے لیے تو گیا نہیں تھا۔ اب اتفاقات کو کوئی کیا کرے
باجی جان دوسرے موضوع پر کود گئیں۔ "خیر ہوگا۔ نینا کا کہیں پیام
سلام ہوا۔ ماشاءاللہ خوب نکلی ہے۔ کچھ جوڑ کے رکھا ہے اس کے لیے؟"
بیگم علوی نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "پیام کا کیا۔ وہ تو نعمانی
سے لگا ہی ہوا ہے۔ صدیقہ بہن انگوٹھی تک پہنا گئی تھیں۔ نعمانی روزگار سے
لگے تو پھر۔ اللہ چاہے گا شادی بھی۔!"
"انتظام کا کیا۔" میجر صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ہماری ایک ہی تو
سالی ہے۔ اس کے لیے انتظام ہم کر دیں گے۔ نعمانی کیا کر رہے ہیں۔" امی
نے رضا کی طرف دیکھا۔ وہ بیدلی سے بولے:
"انجینیرنگ۔!"
"ٹھیک ہے۔ صدیقی چچی کے صاحبزادے ہیں۔ غالباً تیسرا نمبر ہے۔"
میجر صاحب مسکرائے۔
"ہاں۔ بہت نیک لڑکا ہے۔" علوی صاحب نے کہا۔ "عنقریب وہ بھی
یہاں آرہا ہے۔ رضا سے کچھ مدد لینی ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تم لوگ
بھی انہی دنوں میں آگئے۔ دیکھ لوگے اسے۔!"
نینا اٹھ کر چلی گئی۔ اسے تو یہ ساری گفتگو ہی سخت ناگوار ہو رہی تھی
تھوڑی دیر بیٹھ کر علوی صاحب بھی کچہری جانے کا بہانہ کرکے اٹھ گئے۔
رضا بھی کانٹوں پر بیٹھے تھے۔ جب صبر نہ ہوا تو بولے۔
"اچھا باجی جان۔ اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔ شاید میں ہفتہ بھر کے
لیے سروے پر جاؤں گا۔ انشاءاللہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔" وہ اٹھ کھڑے
ہوئے اور سب کی نظریں بچا کر سلمیٰ کو اشارہ کیا اور کہا۔ "بھئی وہ

"حمام تیار کر دے۔ اور سن۔ بٹیا کو لے جا۔ سرل کے اچھی طرح نہ
"جی۔!" رومہ کے لب ہلے اور وہ بے بی کی طرف دیکھنے لگی۔
رومہ سے اس لہجے میں کوئی نہیں بولتا تھا۔ بیگم علوی کے چہرے
سے ناگواری برس رہی تھی۔ معتصم کا چہرہ سرخ تھا۔ بے بی اس کے
ساتھ چلی گئی۔ تب میجر صاحب نے دبی زبان سے کہا۔ "کم از کم اس
غریب لڑکی سے تو اچھی طرح بولو۔ تم نے تو اسے بھی [illegible]۔"
"میں نوکرانیوں کو سر نہیں چڑھاتی۔" وہ بگڑ گئیں۔ "دو کوڑی کی
کی اوقات۔ ہمارے ہی ٹکڑوں پر پلی بڑھی ہے۔ میں اسے بیگم صاحب
تو کہوں گی نہیں۔ آپ اس نوکرانی کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔"
"لاحول ولاقوۃ۔" میجر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنے لڑکو
سے بولے۔ "اٹھو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں شہر کی سیر کرا لاؤں
"اگر آپ اجازت دیں تو بطور راہبر کے میں بھی ساتھ چلوں۔" معتصم
نے کہا۔ میجر صاحب ہنس دیے۔
"ضرور۔ ضرور۔!"
"دوپہر کے کھانے میں مرغ کھائیے گا کہ بریانی۔" باجی جان نے
اپنے میاں سے پوچھا۔
میجر صاحب شاید کچھ جل گئے تھے۔ بیوی کی بجائے بیگم علوی سے
بولے۔ "میرے لیے آپ اپنے ہاتھ سے ماش کی دال اور چاول
پکا رکھیے گا۔!"
بے چاری بیگم علوی خوش ہو گئیں۔ "اچھا بیٹے۔ مگر یہ بھی کوئی
ہوا۔ تم اگر کہو تو۔ میں مرغ مسلّم۔!"

اعراف۔! منیجر صاحب نے اسے ڈانٹا۔
"تمھارے نانا غریب آدمی ہیں بیٹا" بیگم علوی نے افسردہ لہجے میں کہا "کوٹھی نہیں بنوا سکے۔ اسی ڈربے میں خوش ہیں۔ مگر تمھیں یہاں رہنا ہی ہے نا۔ تم تھوڑے دنوں کے لیے مہمان آئے ہو۔ پھر واپس اپنے محل میں چلے جاؤ گے"

"ادی امی۔ آپ کبھی بچوں کی بات کا برا مانتی ہیں" باجی جان تنک کر کہا۔

"تو پھر کوئی ہوٹل دیکھ آؤں۔ جو آپ کے شایان شان ہو" معتصم کو ماماں کا سوگوار لہجہ بڑا دکھ پہنچا گیا تھا۔

مگر باجی جان نے معتصم کو کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی بیٹی نازنین کو آواز دی۔

"بے بی نہا ڈالو۔ اور ہلکے کپڑے پہن لو۔ میں تمھارے لیے غسل خانہ درست کروا دوں۔ ٹھہرو۔" انھوں نے نہایت تحکمانہ لب و لہجہ میں روما کو آواز دی معتصم جو ابھی تک کچھ مبہوت سے بنے بیٹھے تھے۔ یکبارگی خواب سے جاگے!۔ اور بظاہر لاپرواہی سے اس طرف دیکھنے لگے۔ جدھر سے روما آ رہی تھی۔

"جلدی جلدی قدم بڑھا۔ مردار" وہ گرجیں "دلھن کی چال چل رہی ہے۔ پیروں میں مہندی لگا رکھی ہے کیا۔؟"

روما آئی اور کھمبے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ معتصم نے دیکھا اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ کاغذ کا سا سفید۔

[illegible]
تمھاری الماری میں ہے۔!"

سلمی کمرے میں آئی تو بہت چپ چپ تھی۔ چہرہ دھواں دھواں، اور یوں لگتا تھا کہ بھری ہوئی تھی۔ رضا نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ دبا کر اونچا کیا اور فوراً اس کی آنکھوں سے آنسو برس گئے۔

"یہ کیا۔؟" رضا کا دل خواہ مخواہ بھر آیا۔ شاید یہ پہلی مرتبہ تھی جو سلمی یکبارگی رو پڑی تھی۔ انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا سلمی۔ دل کو قابو میں رکھنا" رضا نے اس کی مانگ پر اپنے لب رکھ دیے "وہ ایسی ہی ہیں۔ تم یقین کرو کہ جب وہ بیاہ کر چلی گئیں تو ہم سب نے سکھ کی سانس لی تھی۔ بس نو۔ رو۔ نہیں۔ پونچھ لو آنسو۔ دل بھاری نہ کرو۔ ورنہ پھر۔ میرا دل آفس میں نہیں لگے گا!"

سلمی کی ہچکیاں لگ گئیں "آپ کا دل۔" انھوں نے برا کر دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں۔ وہ آپ کی دوسری شادی ___!"

رضا نے قہقہہ لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا "یہ تو باجی جان نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ تم واقعی بچی لگتی ہو اور دو بچوں کی ماں نہیں لگتی ہو۔ کیسی حماقت انگیز باتیں سوچتی ہو۔ مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ میں اپنی پیاری سلمی کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھوں گا ارے بھائی۔ اب خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ اچھا چلو۔ تم بھی تیار ہو جاؤ میں تمھیں اپنے گھر چھوڑ دوں۔؟"

کیا آپ سچ مچ ہفتہ بھر کے لیے جا رہے ہیں؟" سلمیٰ آنسو پونچھ کر الگ ہو گئی۔

"ہاں"

"خدا کے لیے نہ جایئے۔ آپ سے اتنی ہمت بندھی رہتی ہے۔"

اچھی بات ہے۔ تم کہتی ہو تو نہیں جاؤں گا۔ اب تو خوش ہو۔ کہو تو آج بھی نہ جاؤں۔۔!"

وہ روتے روتے ہنسنے لگی!۔ رضا۔! رضا نے پیار سے اس کے گال پر دو انگلیوں کا طمانچہ رسید کیا اور ہنستے ہوئے چلے گئے!۔

دالان میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔

باجی جان مُصر تھیں کہ آج ہی ماموں جان کے یہاں چل کر ملک کو دیکھ آئیں۔ مگر بیگم علوی کا خیال تھا کہ ابھی نہیں۔ معتصم پہلے کہیں روزگار سے تو لگ جائیں! میجر صاحب ان کی تائید کر رہے تھے

وہاں ان کا بڑا لڑکا اعراف آیا۔ نہایت نفیس اور قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ معتصم اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ چودہ پندرہ برس کے لڑکے کے تیوروں سے نخوت برس رہی تھی!۔

ممی۔!" اس نے جھڑکنے کے انداز سے ماں کو مخاطب کیا۔ وہ بڑے پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔ لڑکے نے بڑی بیزاری اور بے رخی سے کہا۔ "ممی آپ ہمیں یہاں کیوں لائی ہیں۔ ہم بیٹھے بیٹھے بور ہو رہے ہیں! دراصل ممی، ہمیں اس گھر ہی سے وحشت ہو رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دالان، نیچے نیچے سے کمرے اور وہ۔ دھواں بھرا کچن۔ ممی ہم تو ڈیڈی کے ساتھ چلے جائیں گے!"

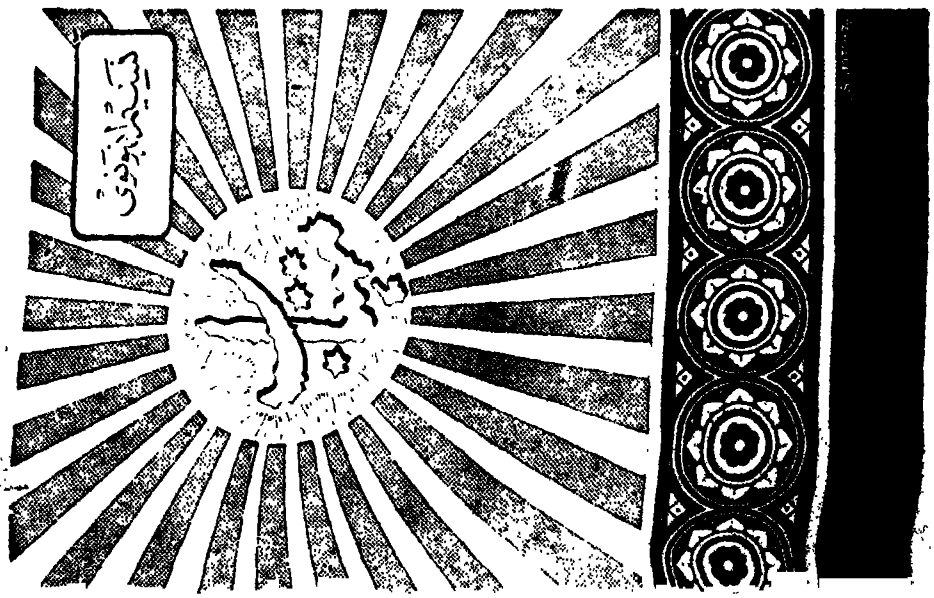
باجی جان بڑے پیار سے ہنس دیں:" ارے۔ یہ نانی اماں کا ہے بیٹے اب وہ تمہاری کوٹھی کی سی کوٹھی کہاں سے لائیں۔ کچھ یہاں رہو۔ پھر ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں چلے جائیں گے۔ جہاں بڑے بڑے ہوادار کمرے ہوں گے۔ چھت کے پنکھے اور تمہارا کھانا۔!" پھر وہ بڑی بیزاری سے بیگم علوی سے بولیں۔

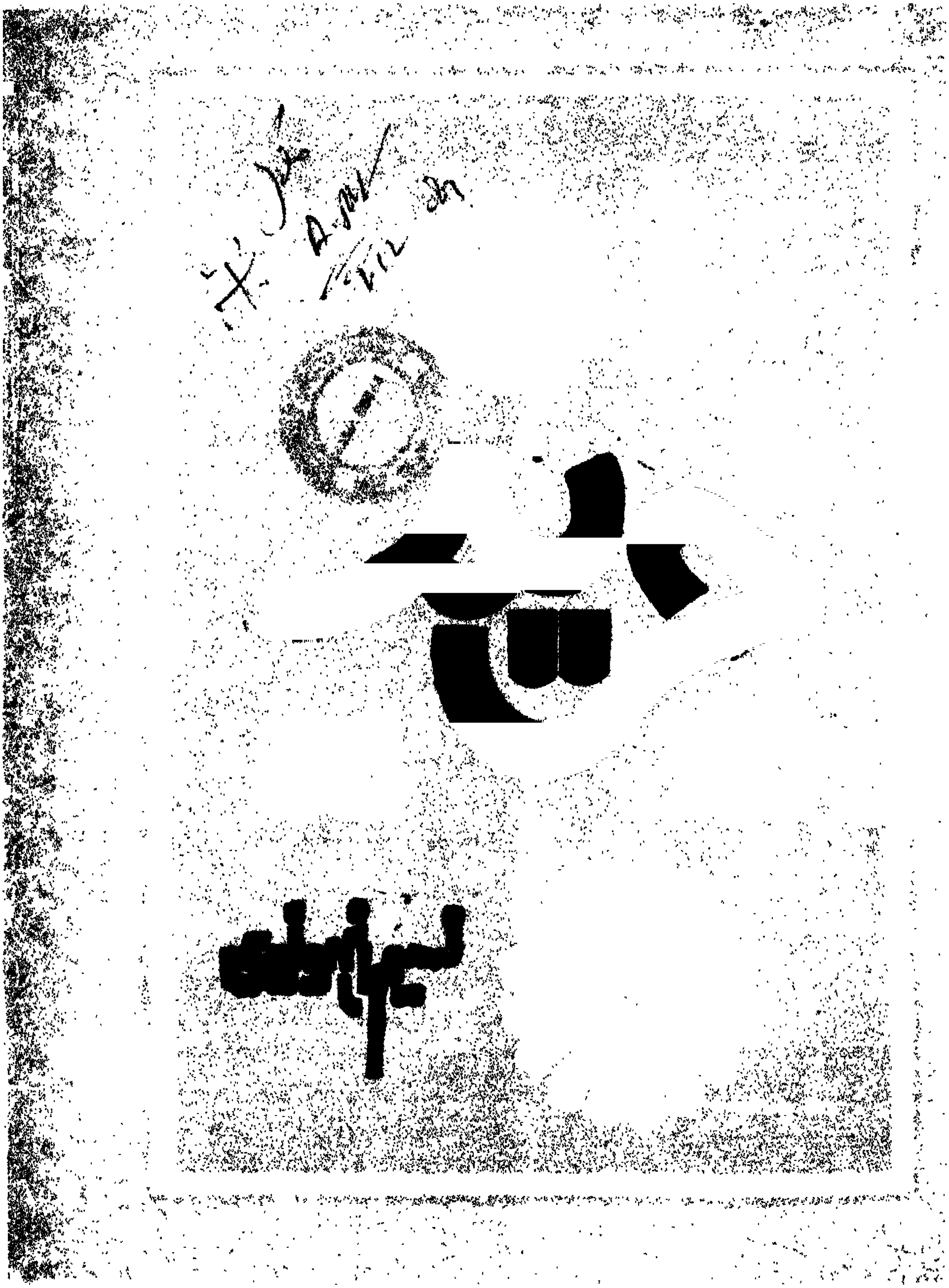
میں تو شروع ہی سے ان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ نہ چلئے اور بچوں کو بھی نہ لے چلیے۔ یہاں ان لوگوں کا دل نہ لگے گا۔ مگر یہ کہنے لگے بہت دنوں سے تمہاری امی سے ملا نہیں ہوں۔ اب یہ چلے آئے تو مجھے بھی آنا پڑا۔"

وہ صرف مسکرائیں۔ مگر معتصم نے ماں پہلے ہو کر کہا۔ "اسی گھر میں تو آپ بھی پیدا ہوئی ہیں۔ بڑی ہوئیں۔ آپ کو کبھی گھٹن اور کچن دھواں دار نہ لگا۔ پھر اب کیا ہو گیا ہے۔ آپ مغربی ملک کی خاتون نہیں ہیں۔ اگر آپ کو دولہا بھائی کا ساتھ نہ ملتا تو ساری عمر آپ کی اس سے بدتر گھر میں گزر جاتی۔!"

باجی جان نے آنکھیں پھاڑ کر معتصم کو دیکھا اور چیخ کر بولیں "ہاں۔ اب تو تمہارا ہی تو رہ گیا ہے مجھے ہوش دلانے والا۔ لو صاحب۔ بڑے زبان ہو گئی ہے۔ ارے میرا زمانہ اور تھا۔ آج اور ہے۔ سنا، میرے بچے اس ڈربے میں نہیں رہ سکتے۔ یہ کوئی گھر ہے؟ چھت سر پر چلی آ رہی ہے۔ ہوا کا گزر نہیں۔ میں تو خود بولا تا جا رہا ابا جان نے ساری کمائی دوستوں پر اڑا دی۔ گھر تک ایک بنا سکے۔"

The Hareem, Lucknow November 1983 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32





طهران

ٹیلیفون نمبر آفس - ۴۴۳۵۵۹   (اس جگہ سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپکی سالانہ قیمت ختم ہوگئی ہے)   ٹیلیفون نمبر رہائش - ۴۵۳۳۴

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور خواتین کا

ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۳   فہرست مضامین دسمبر ۸۳ء   نمبر ۱۲

ایڈیٹر و نگراں نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ —— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

امدادی خریداری	مئی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری		تیئیس روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۔۔۔ روپیہ یا اسی کے مساوی ۔۔۔ رجسٹری اور ایئر کے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

- حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
- حریم ہر انگریزی ۵ رپورٹ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ہر تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں اسکے ساتھ اور ترسیل زر کا پتہ دفتر حریم نسیم بک ڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

ایک حیدرآبادی بہن شمیمہ رضی صاحبہ نے پوچھا ہے کہ ساڑی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا مسلم خواتین کو ساڑی پہننا چاہیئے؟

جواباً لکھ رہا ہوں کہ لباس کے سلسلہ میں ایسی کوئی حدیث میری نظر سے نہیں گذری جس میں لباس کے متعلق ایسی کوئی تفصیل ہو کہ مسلمان کیا پہنا کریں۔ بس ہدایتیں ایسی نظر سے گذری ہیں، جن میں سترپوشی اور اس کے مفاہیم کا ذکر ہے یہ ہدایتیں، مردوں اور عورتوں کے متعلق مختلف ہیں، لیکن میں انھیں بیان کرنا نہیں چاہتا؛ اس لئے کہ سوال صرف ساڑی کا کیا گیا ہے اور مجھے اسی کے متعلق لکھنا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنا ضرور لکھوں گا کہ لباس ملکوں کی آب و ہوا اور معاشرے سے متعلق ہوا کرتا ہے۔ مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں لیکن ان کا لباس ایک نہیں۔ یورپ میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور ان میں کے ۹۹ فی صدی سوٹ پہنتے ہیں۔

ساڑی کی ابتدا میرے خیال سے اس وقت ہوئی ہوگی، جب انسانی ذہن نے کپڑوں کی بنائی کا علم حاصل کر لیا ہوگا اور اس نے اپنی سترپوشی کے لئے پیڑوں کے پتوں اور چھالوں سے بنے ہوئے ملبوس کی جگہ کپڑوں سے سترپوشی کا عمل شروع کیا ہوگا۔ اس میں کسی طرح کی تراش خراش اور سلائی وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ آج بھی غیر متمدن ہندوستانی آدی باسی عورتیں ایک مسلم کپڑے سے، جسے ساڑی ہی کہا جا سکتا ہے، اپنی سترپوشی کرتی ہیں۔ وہ ساڑیوں کے ساتھ بلاؤز وغیرہ کا استعمال نہیں کرتیں۔ بہرحال ساڑی کا رواج سب سے زیادہ ہندوستان ہی میں ہوتا آیا ہے۔ لیکن سارے ہندوستان کی عورتیں کبھی زمانے میں بھی صرف ساڑیوں ہی کا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اور وہ آج بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ گذشتہ ۵۰ برسوں میں ساڑی نے بہت ہی زیادہ مقبولیت حاصل کی اس لئے کہ ساڑی بنانے والے طول لمبے بناوٹ اور چھپائی وغیرہ سے ساڑی میں ایسا نکھار پیدا کیا کہ خواتین انھیں دیکھ دیکھ کر للچانے لگیں۔

پچاس سال یا ایسے ہی کچھ عرصہ قبل مسلمانوں میں ساڑیوں کا کوئی رواج نہ تھا، بلکہ اسے ایک معیوب لباس سمجھا جاتا تھا اور جب تعلیم کے زیر اثر مسلم خواتین میں بھی ساڑی رواج پانے لگی تو وہ عورتیں ہدف ملامت بنتی تھیں جو ساڑی پہن کر کسی محفل میں چلی جاتی تھیں۔

میرا خیال ہے کہ ایسا صرف بربنائے تعصب ہوا کرتا تھا۔ صدیاں برسوں سے غرارے، شلوار اور چوڑی دار پائجامے کو انھوں نے مسلم ملبوس اور ساڑی کو ہندوانہ لباس سمجھ لیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ساڑیوں کا استعمال مسلم خواتین میں بھی ہونے لگا اور یہی نہیں اس کے جواب میں شلوار، چوڑی دار اور غراروں کا رواج ہندو خواتین میں بھی ہونے لگا اور اب ایک اندازے کے مطابق غرارے کا بیشتر رواج محفلوں تک محدود رہ گیا۔ لیکن محفلوں میں بھی میرا خیال ہے کہ پچاس فی صدی خواتین ساڑیوں میں ملبوس نظر آتی ہیں۔

اس طرح یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ ساڑی پہننا کوئی گناہ نہیں۔ لباس کی حیثیت سے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دلکش لباس بھی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ کیا اس سے اسلامی احکامات کے تحت سترپوشی بھی ہوتی ہے۔ اگر نہیں تو میں یہی کہوں گا کہ یہ لباس مسلم خواتین کے لئے مناسب نہیں۔

میں اپنے بچپن سے ہندو خواتین کو ساڑی پہنتے دیکھتا آرہا ہوں اور اس وقت اس لباس میں ہندو خواتین مجھے دیویاں نظر آتی تھیں، اس لئے کہ ساڑیوں کے پلو سروں پر رہتے تھے، انھیں ماتھے پر گھونگھٹ کی اس طرح ڈالا جاتا تھا کہ چہرہ بڑی حد تک چھپ جاتا۔ سر جھکائے وہ اس طرح چلتیں کہ راستہ برابر نظر آتا۔ ان کے ساتھ جو بلاؤز پہنے جاتے تھے وہ نصف آستین کے ہوتے تھے اور ان کی لمبائی کمر تک ہوتی تھی۔ اس کے بعد ایک بالشت سی کھلی ہوتی تھی جو ساڑی سے دب جایا کرتی تھی۔ بلاؤز کے گلے ایسے گہرے ہوتے تھے، جیسے کرتوں کے ہوتے ہیں۔ ان سے کسی طرح کی عریانی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب رفتہ رفتہ بلاؤز ہر طرف سے سمٹتے سمٹتے ایسی شکل میں ڈھل گئے ہیں، جیسی خواتین لباس کے نیچے کمر میں

استعمال کیا کرتی تھیں۔ ان آستینوں کا نمونہ سے صرف چند انچ نیچے ہوتی ہیں اور ایسے بلاؤز بھی ہوتے ہیں۔ جن میں آستینیں ہوتی ہی نہیں مونڈھوں پر دو تین انچ چوڑا کپڑا ہوتا ہے۔ سامنے گلا اتنا بڑا اور نیچا ہوتا ہے کہ سینہ جھانکتا رہتا ہے اور یہ کرتے ۸-۱۰ انچ اونچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح پشت پر اس کا گلا کافی چوڑا اور نصف دائرہ کی شکل میں گردن سے تقریباً ۸-۱۰ انچ نیچے تک کٹا رہتا ہے۔ لمبائی پشت پر بھی اگلے حصے ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ساڑی کا پلو علیحدہ کر دیا جائے تو عورت نصف ننگی نظر آئے گی اور بلاؤز محرم ہی کی طرح نظر آئے گا۔ ساڑی اگر ایسے بلاؤز کے ساتھ پہنی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ نہایت ہی نامعقول لباس ہے، لیکن اگر ایسے بلاؤز کے ساتھ پہنی جائے جیسے پہلے استعمال ہوتے تھے تو نہایت ہی دلکش اچھا اور حسین لباس ہے اور اسے بلاتفریق مذہب و ملت پہننا چاہیے۔

لیکن موجودہ بلاؤز کے ساتھ کم از کم میں اسے پسند نہیں کرتا البتہ اگر ساڑی کو احتیاط کے ساتھ اس طرح پہنا جائے کہ پیٹ، پیٹھ اور بازو وغیرہ پوشیدہ رہ سکیں (جو بہت دشوار ہے) تو ٹھیک ہے ــــ بہرحال مذہبی طور پر اس کے استعمال کے سلسلہ میں اسلام میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ ستر پوشی کے لئے جو احکام ہیں ان کا خیال رکھ کر ہر لباس پہنا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اب تو خواتین کو عریانی و نمائش کرنے کا مرض ہو گیا ہے۔ لباس ایسے چست بنوائے جانے لگے ہیں کہ جسم کے ہر نشیب و فراز کو نمایاں کر سکیں۔ دوپٹہ رسمی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے استعمال کا جو مقصد تھا وہ شاذ ہی نظر آتا ہے۔ نہ تو اس سے سر ڈھانکا جاتا ہے [illegible] ہماری بہنوں کو نیک توفیق عطا فرمائے اور وہ سمجھ سکیں کہ یہ جسمانی نمائش کیا معنی رکھتی ہے اور اس نمائش کو دیکھنے کا حق کسے حاصل ہے۔

اکتوبر کا حریم

بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اکتوبر کا حریم جو ۲ اکتوبر کو روانہ ہوا تھا صرف جنوبی ہندوستان میں تقریباً ڈھائی سو تک صرف خریداروں کو نہیں ملے ــــ شکایات کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ہم صرف ڈیڑھ سو پرچے فاضل چھپواتے ہیں۔ اس حد تک شکایتیں آنے پر پرچے بھجوا دیئے گئے۔ اب متعدد بہنوں کے خطوط ملے ہیں کہ انھیں پرچہ مل گیا۔ دوسرا نہ بھیجا جائے، لیکن یہ اطلاعات دوسرا پرچہ جانے کے بعد ملی ہیں۔ اس طرح ممکن ہے اور بہنوں کو بھی پہلی ترسیل والے پرچے مل جائیں، لیکن واپس تو کوئی بہن شاید ہی کبھی کرتی ہوں، اس لئے کہ واپسی بہنوں کے لئے دشوار ہوتی ہے۔ بہرحال ڈاک کی یہ بدنظمی شرمناک ہے کہ ۲۲-۲۴ روز میں بھی پرچے خریداروں تک نہ پہنچ سکیں۔ حکومت قیمت بڑھا دیتی ہے لیکن نظام درست نہیں کرتی۔ حریمی بہنوں کو خط لکھنا پڑتے ہیں اور زحمت انتظار برداشت کرنا پڑتی ہے اور ہمیں صدہا روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جن بہنوں کو ہم حریم اکتوبر دوبارہ نہیں بھجوا سکے، انھیں ناول کے صفحات بھجوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مکمل حریم دوبارہ چھپوانا ممکن نہیں۔ یہ نوٹ آج ۸ نومبر کو لکھ رہا ہوں۔ ابھی تک شکایتی خطوط وصول ہو رہے ہیں جن بہنوں کو ناول کے صفحات روانہ کئے جائیں گے۔ ان کی مدت خریداری میں ایک مہینہ کا اضافہ کر کے سارا نقصان میں برداشت کروں گا۔ حریمی بہنوں سے معذرت خواہ ہوں۔ خدا کرے انھیں ڈاک کی بدنظمی اور ہماری مجبوری کا یقین آ جائے۔ (نسیم انہونوی)

حریم کا سالنامہ ۸۴ء

انشاء اللہ تعالیٰ آخر دسمبر ۸۳ء سے ۱۰ جنوری ۸۴ء کے درمیان اس کی ترسیل ہو سکے گی۔ سالنامہ میں عفت بہن کا ناول نقاب پیش کیا جا رہا ہے۔ جن بہنوں کی سالانہ قیمت دسمبر ۸۳ء میں ختم ہو رہی ہے انھیں سالنامہ انتیس روپیہ کا وی۔ پی کر کے بھیجا جائے گا۔ جو بہنیں اپنی سالانہ قیمت منی آرڈر سے تئیس روپیہ اس طرح بھجوا دیں گی کہ ۲۴-۲۵ دسمبر تک ہمیں مل جائے، انھیں وی۔ پی نہیں کیا جائے گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ سالانہ قیمت منی آرڈر سے ہی بھیجی جائے اس میں چھ روپیہ محصول ڈاک کا فائدہ ہوگا۔

جن بہنوں کی سالانہ قیمت دسمبر ۸۳ء کے بعد کسی ماہ میں ختم ہوتی ہے وہ اگر حفاظت سے سالنامہ حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں اجازت دیں کہ ایک روپیہ اسی پیسہ کا وی۔ پی کر کے بھیج دیا جائے۔

جو بہنیں آئندہ خریداری جاری رکھنا چاہتی ہوں وہ اپنے بھائی پر رحم فرما کر ایک کارڈ جلد لکھ دیں کہ انہیں رسالہ بھیجا جائے [illegible] جانے کے بعد واپسی پر دفتر کو چھ روپیہ [illegible] نقصان ہوتا ہے۔ پوسٹ کارڈ بھی نہ لکھنا چاہیں تو بغیر ٹکٹ کا بیرنگ [illegible] شکر گزار ہوں گا۔ (نسیم انہونوی)

"زیست کا مفہوم"

از ۔ اُمِّ ہانی

شکر کر اے بشر! کہ یہ میں تیرا فرش ہے
سایہ جو کر رہا ہے تیرے سر پہ عرش ہے

نورِ سحر جہاں کا ہے ہالہ کئے ہوئے
ضوءِ قمر ہے حلقہ میں سب کو لئے ہوئے

غافل بشر! پرند کی تسبیح کو تو سُن
احسان اگر نہیں ہے تو پھر کیا ہے گلہ گُنا

گُل مسکرا کے زیست کا پیغام دے گئے
خار اپنے ساتھ تلخ حقائق کو لے گئے

گھبرا کے زندگی کو نہ دے غمکدہ کا نام
آنے ہی کو ہے جوش میں پھر رحمتِ تمام

مفہومِ زندگانی کا ہانی یہ جان لے
حاکم خدا ہے اور تو محکوم، مان لے

ارشاداتِ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ

- معافی بہترین انتقام ہے۔
- صبر ایسی سواری ہے جو ٹھوکر نہیں کھاتی۔
- اطاعت ہمیشہ باقی رہنے والی عزت ہے۔
- خاموشی غصہ کا بہترین علاج ہے۔
- مصیبت پڑنے پر گھبرانا خود ایک مصیبت ہے
- علم کا مقصود خدا کا خوف ہے۔
- انتقام میں جلدی کریموں کا شیوہ نہیں
- جو علم کو زندگی بخشتا ہے، اسے کبھی موت نہیں آتی۔

مرسلہ:۔ سیدہ رفعت پروین (شکور)

بادل کا سایہ

- کہانی ہے ایک ایسی لڑکی کی جو ماں باپ کی محبت اور سرپرستی اور بھائی کی نگہبانی سے محروم رہ کر بھی ایک پاکیزہ سلجھی ہوئی نیک طبیعت اور خود مختار خاتون بنتی ہے۔
- یہ کہانی ہے کاشمیر کے ایک لڑکے پرے کی جو رفیق کا بچپن کا دوست اور ساتھی ہے۔ جو اس کے دکھ درد کو سمجھتا ہے۔ بے لوث دوستی نبھاتا ہے۔ اور شاید اس سے محبت بھی کرتا ہے۔
- یہ کہانی ہے سنجیدہ اور بردبار ذیشان کی جو رفیق سے خاموش محبت کرتا ہے اور اس کی آگ میں جھلس جانے کو تیار ہو جاتا ہے حالانکہ رفیق اس سے نفرت کرتی ہے
- یہ کہانی ہے ایک ایسی ماں کی جو شاندار اور رنگین زندگی گزارنے کی ہوس میں بچوں اور شوہر سے بے نیاز ہو کر بے وفا ہو جاتی ہے۔
- یہ کہانی ہے ایک ایسے باپ کی جو بیوی سے تنگ آکر بچوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔
- اور یہ کہانی ہے ہمارے آج کے معاشرے کی غلط قدروں کی جن کا ظاہرہ جتنا چمکیلا ہے اتنا ہی باطن کھوکھلا ہے۔
- یہ کہانی ہے اس حقیقت کے متعلق کہ آج کے دور میں بھی عورت اپنی خودداری اور پاکدامنی کی قوت سے اپنے کو نہ صرف پاک اور محفوظ رکھ سکتی ہے بلکہ اس وجہ سے عزت اور محبت حاصل کر سکتی ہے۔

یہ ایک نئے قسم کی کہانی ہے جو اردو رومانی ناولوں میں ایک نیا رجحان ایک نیا انداز لائے گی۔

حجرِ اَسوَد

مؤلف۔ مشتاق حکیم پوری

ذیل کا مضمون سیرت حلبیہ اور دیگر مستند کتب کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔

مؤلف

میں آج صفحۂ ہستی پر ایک سیاہ پتھر ہوں اور دنیا کے مسلمان مجھے حجر اسود کے نام سے پکارتے ہیں۔ میری عمر کتنی ہے میں کب اور کہاں پیدا ہوا۔ کن کن انقلابات سے دوچار ہوا یہ ایک طویل کہانی ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی اس طویل زندگی کی داستان سفر بیان کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان چیزوں یا شخصیتوں سے پہلے متعارف کرادوں جن کی زندگیوں سے میرا وجود منسلک رہا ہے۔

پروردگار عالم نے جب اس دنیائے آب وگل کی تخلیق فرمادی اور حضرت آدم علیہ السلام کو وجود بخشنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ تو فرشتوں سے کہا۔

میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں

فرشتوں نے عرض کیا "کیا آپ اس کو خلیفہ بنارہے ہیں جو زمین پر فساد پھیلائے گا"

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس جواب پر غضب ظاہر فرمایا اور فرشتے ہیبت الٰہی سے لرز گئے اور عرش کو پکڑ کر گڑگڑانے و معافی مانگنے لگے پھر انھوں نے عرش کے گرد سات مرتبہ طواف کیا۔ تب حق تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔ زمین پر میرے نام کا ایک گھر بناؤ تاکہ اولاد آدم میں سے جس پر میں ناراض ہوں وہ اس کے ذریعہ پناہ مانگے اور اسی طرح اس کے گرد طواف کرے جس طرح تم نے میرے عرش کے گرد کیا تاکہ میں اس سے راضی ہو جاؤں۔

فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اس طرح سے بیت اللہ کی بنیاد پڑی ——— ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو وجود بخش دیا اور جنت میں رہنے اور اس کے ہر تحفے سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دیدی ماسوا ایک درخت کے پھل کے جس کے لئے شجر ممنوعہ قرار دیدیا گیا تھا۔

میں حجر اسود، اس وقت ایک فرشتہ تھا اور میرے ذمہ یہ فرض سونپا گیا تھا کہ میں اس بات کا خیال رکھوں کہ وہ شجر ممنوعہ تک نہ پہونچ سکیں۔ لیکن شائد قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا ——— اب میرا رب ہی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ یہ سب کچھ کیسے میری نظروں سے اوجھل ہوگیا اور آدمؑ نے کب اس شجر کے پھل کو کھالیا جس کی انہیں ممانعت کی گئی تھی بہرحال اس کا خمیازہ مجھے یوں بھگتنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک پرہیبت نظر نے مجھے پتھر میں تبدیل کردیا۔

حضرت آدم و حوا علیہما السلام بھی اس حکم عدولی کی سزا میں جنت سے نکال دئیے گئے۔ ساتھ ہی مجھے اور مقام ابراہیم کو بھی بہشت کی فضاؤں سے دور کرکے دنیا میں بھیجدیا گیا۔ کیونکہ شاید یہی میرے رب کی مصلحت تھی۔

آدم وحوا کی دنیا میں آمد دو مختلف مقامات پر ہوئی۔ حوا علیہا السلام کو تو جدہ میں اتارا گیا لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو ہندستان میں سرا ندیپ کے ایک بلند پہاڑ پر پہونچایا گیا جہاں آج بھی ان کے قدموں کا نشان موجود ہے۔

کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑ پر روزانہ رات کو ایک بجلی سی کوندتی ہے جبکہ بادل کا نام و نشان تک نہیں ہوتا——— ساتھ ہی ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی گئی کہ یہاں بارش روزانہ ہوتی ہے جو آدم علیہ السلام کے پیروں کے نشانوں کو دھوتی ہے۔

چونکہ میری زندگی کا حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے اس لئے اپنے حالات کے ساتھ ان کی حیات و شخصیت کے ہر گوشہ کو اجاگر کرنے کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے سر لے رکھی ہے تاکہ آپ پورے طور پر حالات سے واقف ہوسکیں۔

مصدقہ روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں اتارا گیا تو ان کا قد خود ان کے [illegible] کے برابر تھا اور چوڑائی سات ہاتھ تھی (یقیناً ان کے ہاتھ کی لمبائی)

کے قدر کے حساب سے ہوگی)۔

بہرحال ہندوستان کے اس حصہ میں رہتے رہتے جب وہ وحشت زدہ ہونے لگے تو اللہ تعالٰی نے ان کو حکم دیا۔

اے آدم حج کو جاؤ۔

چنانچہ وہ وہاں سے بیت اللہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اثنائے سفر ان کا قدم جہاں جہاں پڑا وہاں بستیاں آباد ہوگئیں اور درمیانی حصہ بیابان و صحرا بن گیا۔ کہا جاتا ہے ان کا ایک قدم تین دن کے سفر کی مسافت یعنی ۴۸ میل کا ہوتا تھا۔

جب وہ مکہ میں داخل ہوئے تو حکم خدا کے مطابق جبریل علیہ السلام نے آکر انھیں پیغام دیا کہ حق تعالٰی کا فرمان ہے کہ آپ اس کے لئے ایک گھر تعمیر کریں۔

اس درمیان چونکہ عرفات کے میدان میں ان کا حضرت حوّا سے تعارف ہو چکا تھا اس لئے دونوں تعمیل حکم رب میں آگے بڑھے۔ جبریل علیہ السلام نے بنیاد کا نشان لگایا، آدم علیہ السلام نے کھدائی شروع کی اور حوّا علیہا السلام مٹی ہٹانے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک آواز آئی "بس کافی ہے اے آدم" حضرت آدم علیہ السلام اسی جگہ رک گئے۔ پھر فرشتوں نے پتھر ڈالکر کعبہ کی بنیاد بھرنی شروع کی جب بنیاد بھر گئی تو آسمان سے بیت اللہ کو جو سرخ سونے (یا قوت) کا تھا اتارا گیا اور اسی بنیاد پر نصب کر دیا گیا۔ ساتھ ہی مجھے اور مقام ابراہیم کو بھی اسی جگہ اور اسی سمت جہاں آپ اب بھی دیکھتے ہیں پہونچا دیا گیا۔ اس کے بعد جیسا کہ اللہ تعالٰی کا حکم تھا آدم علیہ السلام نے طواف کیا اور اپنا پہلا حج مکمل فرمایا۔

میرے مالک نے مجھے یہ عزت بخشی کہ ہر شخص کے لئے مجھے بوسہ دینا فرض ہو گیا۔ اور ———— اس طرح ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ کئی انبیا آئے اور اس خالق کائنات کا پیغام دیکر چلے گئے۔ حضرت شیث علیہ السلام کا زمانہ گذرا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا اور ان کی امت پر طوفان قہر نکر لازم ہوا۔ پانی کی طغیانی سے بچانے کے لئے مجھے اور مقام ابراہیم کو اللہ تعالٰی نے اس جگہ سے ہٹا دیا۔ اور میں

ابو قبیس ... [illegible]

لمبے دور میں پھر لاکر مجھے اسی مقام پر نصب کر دیا۔

بات بڑھتی جا رہی ہے لیکن میں کروں بھی کیا۔ میری زندگی کا سفر اتنا طویل ہے کہ اس کو اختصار دینے کے باوجود میں مختصر نہیں کر پاتا۔ اس طویل راہ سفر میں مجھ سے کتنے لوگ ملے۔ اور میں نے کیا کچھ دیکھا اس کو بیان کرنے اگر بیٹھا جائے تو شاید آپ اکتا جائیں گے اسی لئے میں دیگر باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف خاص خاص واقعات کا ہی تذکرہ کروں گا۔ ہاں ایک بات جو ابتدا میں بتانا میں بھول گیا تھا اب بتا دوں کہ اس قدر قابل تعظیم پتھر جو مجھے سمجھا گیا ہے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں عہد نامہ الست کا امین ہوں۔

اس سلسلہ میں حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی یہ روایت میرے قول کی صحت کا ثبوت ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالٰی نے جب مخلوق اولاد آدم سے فرمایا۔

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔؟

انھوں نے کہا۔ بے شک ہیں۔

پس قلم نے ان کا یہ اقرار لکھ لیا اور پھر اس اقرار نامہ کو میرے سینہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے بوسہ دیتے ہوئے ہر شخص کہتا ہے۔

"اے اللہ میں اسکو بوسہ دیتا ہوں تیری ذات اور ایمان کے ساتھ اور تیرے سامنے کئے ہوئے اقرار کے ساتھ۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی اس لئے اس بات کو چھوڑئیے۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور بھی گذر گیا۔ انبیاء کرام کی آمد اور میری تعظیم جاری رہی۔ یہاں تک کہ نبی آخر الزماں کا دور آ پہونچا۔ کعبہ کی تعمیر نو شروع ہوئی۔ میری تنصیب کے سوال پر قریش میں جھگڑا اٹھا، مگر اللہ کے پیارے حبیب کے صدقے خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ وقت کے پہیوں کی گردش جاری رہی۔ سال پر سال بیتتے چلے گئے یہاں تک کہ خلفائے راشدین کا دور بھی گذر گیا اور پھر وہ بدبخت دور آگیا جس میں دیار مکہ مدینہ پر خود مسلمانوں نے یورش کی۔ یہ دور یزید ابن معاویہ کا تھا جس میں عبداللہ ...

پر مکہ میں حملہ کیا گیا۔ منجنیقوں سے شدید آتشباری کی گئی۔ نتیجہ میں غلافِ کعبہ میں آگ لگی اور پوری عمارت آتش زنی کا شکار ہو گئی۔ میں اپنی آب و تاب کھو بیٹھا۔ میرا چہرہ جھلس کر سیاہ پڑ گیا۔ اور میرے سینے میں تین شگاف ہو گئے ——— آخر یزید نے بھی دنیا سے کوچ کیا اور اب ابن زبیرؓ نے کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنا شروع کیا میرے سینے کے شگافوں کو چاندی کا بھرواکر بند کرا یا گیا اور پھر اسی مقام پر نصب کر دیا گیا۔

عروج و زوال اور انقلابات کا نام ہی شاید زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ ان سے ٹکراتا رہا ہوں۔ ابھی میرے پچھلے زخم بھرے ہی تھے کہ دسیلانوں میں ہی ایک اور فرقہ قرامطہ ابھرا۔ اور اس کے سردار ابو طاہر نے ایک نئی شریعت نافذ کی۔ مسجد حرام میں حاجیوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں سے چاہ زمزم کو پاٹ دیا اور پھر اپنا گرز مار کر میرے جسم کے ٹکڑے کر دیے۔

زندگی کا یہ دور میرے لئے سب سے بڑا المیہ تھا۔ ظالم ابو طاہر نے یہی نہیں کہ کعبہ کے دروازے کو توڑا غلافِ کعبہ کو پھاڑا اور زمزم پر سے قبہ کو ڈھایا بلکہ اس نے مجھکو بھی اپنے گھر سے بدر کر دیا۔ اور مکہ سے لیکر نکل گیا۔

میں بیس سال تک اپنے مسکن سے جدا رہا اور بیس سال تک لوگ میری جگہ پر صرف ہاتھ اٹھا کر طواف کرتے رہے۔ آخر خلیفہ مطیع نے مجھے دوبارہ حاصل کیا اور میرے گرد چاندی کا گھیرا اور آنکڑے ڈلوا کر مضبوطی کے ساتھ مجھ کو اپنے گھر میں رہنے کی آسانی فراہم کی۔

اس کے بعد کچھ عرصہ میں اطمینان اور سکون سے رہا لیکن ۳۱۷ھ میں پھر ایک ملحد نے مجھے تاراج کیا اس نے آہنی گرز سے مجھ پر تین ضربیں لگائیں جس سے میری کرچیاں بکھر گئیں ——— مگر جلد ہی خوش قسمتی نے اس کا تدارک کیا اور میرے اس چورے کو جمع کر کے مشک اور لاکھ کے ساتھ گوندھ کر اس خلا میں بھر دیا جو اس ٹوٹ پھوٹ سے پیدا ہو گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے اب میں اپنے گھر میں آرام ... سے قیام پذیر ہوں۔ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ

جا رہا ہے اور اللہ کے پیارے محبوب کی یہ بات مسلمانوں کے دل میں بیٹھ گئی ہے۔

"اس پتھر کو زیادہ سے زیادہ چومو کہ وہ وقت قریب ہے جب تم اس کو نہیں پاؤ گے کیونکہ جنت کی جو چیز بھی زمین پر ہے اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے اسے اٹھا لے گا۔

(واضح رہے کہ حدیث کے مطابق حجر اسود اور مقام ابراہیم کے علاوہ کوئی چیز زمین پر ایسی نہیں ہے جو جنت کا تحفہ ہو۔)

ارشاداتِ حضرت عمر فاروقؓ

- ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم ہے۔
- زیادہ ہنسنا موت سے غفلت کی نشانی ہے۔
- عدل مظلوم کی جنت اور ظالم کا جہنم ہے۔
- ہر شے کا ایک حسن ہوتا ہے اور نیکی کا حسن یہ ہے کہ فوراً کی جائے۔
- گناہ کو ترک کر دینا توبہ کی تکلیف سے زیادہ آسان ہے۔
- اوروں کی فکر میں اپنے آپ کو مت بھول جاؤ۔
- جو شخص میرے عیب مجھے بتاتا رہتا ہے وہ مجھے عزیز ہے۔
- نصیحت کے لئے موت بھی کافی ہے۔

——— بشارت بٹ ــ کراچی

- میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو خوش طبع ہو۔ باتونی نہ ہو۔ خوبصورت ہو اور میری مرضی کے مطابق چلے۔
  تو پھر تم کو چار شادیاں کرنا ہوں گی
- ڈاکٹر۔ کبھی آپ نے اپنا وزن لیا ہے
  جی ہاں۔ میں ۱۳۰ پونڈ کی ہوں۔
  ڈاکٹر۔ یہ میک اپ سے پہلے کا وزن ہے یا بعد کا

مرسلہ۔ فاخرہ ندیم۔ بریلی

- دو سہیلیاں کسی دعوت میں شریک تھیں۔ ایک نے کہا تمہارے شوہر کو نئے سوٹ میں دیکھ کر میں پہچان ہی نہ سکی۔
  سہیلی نے ہنس کر کہا "ارے پگلی سوٹ ہی نہیں شوہر بھی

... آباد

سوکھے ہوئے پھول

بشریٰ رحمٰن

"سارہ! تم نے جنید کے ساتھ شادی نہ کر کے بڑی حماقت کی۔" میری بہن مجھ سے کہتی ہے۔ میں آنکھیں اٹھا کر اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں اور پھر سر جھکا لیتی ہوں۔

"تمہیں بہر حال شادی کر لینی چاہیئے تھی۔" وہ پھر کہتی ہے "مجھے تو اب احساس ہوتا ہے، شادی عورت کے لئے کتنی ضروری ہے اور پھر شادی اسے اسی مرد سے کرنی چاہیئے جو اس کا سب سے زیادہ غم آشنا ہو"

اب کے میں سر اٹھا کر اپنی بہن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہوں اور وہ میری نظروں کے طنز کو نظر انداز کر کے کہے جاتی ہے۔

"درحقیقت عورت کی زندگی کی تکمیل ننھے منے بچوں سے ہوتی ہے۔ سچ کہتی ہوں سارہ جب عورت چند ننھے منے بچوں کی ماں بن جاتی ہے تو وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ اسے اپنے غم، اپنی حسرتیں اور اپنی محرومیاں بھول جاتی ہیں۔ اس کا وجود چھوٹے چھوٹے وجودوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ وہ انہی کے لئے جیتی ہے، انہی کے لئے مرتی ہے اور انہی کے لئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتی ہے.....:" میں چپ چاپ اپنی بہن کا منہ تکے جاتی ہوں۔ وہ پھر کہتی ہے۔

"اب دیکھو میرا اگو نو سال کا ہو رہا ہے۔ شانی چھ سال کی ہے اور ابو تین سال کا ہے۔ میں دنیا سے اتنی آگے نکل آئی ہوں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کبھی مجھے ماضی کا غم نہیں ستاتا۔ میں سمجھتی ہوں یہی میری دنیا ہے۔ یہی کچھ میں نے چاہا تھا۔ بچوں کے بغیر ایک عورت ادھوری ہے۔ نامکمل ہے۔ ایا سچ ہے؟" وہ پھر میری طرف ہمدردی سے دیکھتی ہے۔

"تم جو پوری زندگی تنہا بسر کرنے کا تہیہ کئے بیٹھی ہو، تمہیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مجھے بتاؤ سارہ! تم نے یہ دس طویل سال کیونکر بسر کئے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو مر چکی ہوتی۔"

میں اب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر نظریں جھکا لیتی ہوں۔

"سارہ میں سچ کہتی ہوں اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم کہیں شادی کر لو اور اگر تم جنید سے ہی شادی کرنا چاہتی ہو تو اب ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟؟"

اب ضبط کی قوت جواب دے جاتی ہے اور میرے اندر الاؤ سے سلگ اٹھتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کو کوئی زہر بھرا فقرہ کہوں۔ لیکن میں آنسو پی جاتی ہوں، اور زہریلی مسکراہٹ سے اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں۔

"اب تمہارا بچہ بھی اگو کے لگ بھگ ہوتا۔ پگلی تم نے ایک ہی ضد پر اپنی زندگی قربان کر دی اور وہ جنید کا بچہ پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں اور کہوں اس خود غرض زبان سے جنید کا نام بار بار مت لو۔ لیکن پھر میرے اندر ہزاروں درد انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور میں اس موضوع پر بولنا سراسر حماقت سمجھتی ہوں۔ ان کے پچھتاووں میں، میں اضافہ کرنے کے لئے مکمل خاموشی سادھ لیتی ہوں اور میز پر پڑے ہوئے میگزین الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ہوں۔

"ارے! تم تو بالکل سنگی بن گئی ہو۔ پتھر سی پتھر۔ تنہائی کی زندگی نے تم سے سارے جذبات چھین لئے ہیں.... تم ذرا سی کوشش کرو تو جنید کا پتا لگ سکتا ہے۔" اب میں بہت تیز نظروں سے بہن کی طرف دیکھتی ہوں۔ میرے ماتھے پر بل پڑے ہیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے میری بہن میرے تیور جان جاتی ہے اور اٹھ کر باہر جانے لگتی ہے۔

"ہم تو تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ ہم سے تیری ویران سنسان زندگی نہیں دیکھی جاتی۔" اور وہ باہر چلی جاتی ہے میں ان بھلا چاہنے والوں کی منطق پر غور کرنے لگتی ہوں۔ میری بہن باہر جا کر میری امی کو نہ جانے کیا کچھ کہنے لگتی ہے کہ میری بوڑھی ماں رونے لگتی ہے اور رات کو جب میں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر تاروں بھری چھت تلے لیٹتی ہوں تو میری ماں اپنا جھریوں سے بھرا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہے اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

"تیری بربادی کی ذمہ دار میں ہوں سارہ! میں خدا کو کیا جواب دوں گی؟"

ان آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور میں سپاٹ سے لہجے میں کہتی ہوں "کسی کی تباہی کا کوئی ذمے دار نہیں ہوتا

میری ماں! یہ سب نصیبوں کا لکھا ہوتا ہے۔" مجھے کیا معلوم تھا کہ تو اتنی ضدی ثابت ہو گی۔ اس وقت میں سائرہ کی باتوں میں تلخی اور میرے ہونٹوں پر زہر پھیل جاتا ہے اور میں اپنے ذہن میں ماں کے فقرے دہراتی چلی۔ ہاں ماں تو کر بھی کیا سکتی ہے معاشرے کی چکی میں پسی ہوئی مائیں رسم و رواج کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتیں لیکن بیٹیوں کی بہار اُجڑتی دیکھ لیتی ہیں۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں کہتی۔ اب کچھ کہنا بے وقت اور بے معنی ہے۔۔۔۔ میں نے تو اس وقت بھی کچھ نہیں کہا تھا جب کہنے کا وقت تھا۔ اور اب کچھ کہہ کر ان پشیمان دلوں کو اور دکھ دینا نہیں چاہتی۔ "بیٹی تو کسی طرح جنید کا پتا لگا لے اور اسی سے شادی کر لے۔ لیکن خدا کے لئے اپنی زندگی یوں نہ اُجاڑ۔" میری ماں پھر کہتی ہے۔

لیکن میں چاندنی کی سمت نظریں جمائے رکھتی ہوں۔ میرا دل خون ہو جاتا ہے۔ میرے اعصاب میں چنگاریاں دہک اٹھتی ہیں اور میرا دل چاہتا ہے، میں کہوں "میری ماں! وقت تیرے فیصلے کے انتظار میں رک نہیں سکتا تھا۔ یہ وقت مجھے کلیوں سے پھولوں کے دیس میں لایا اور پھول مرجھانے لگے۔ اب میں ننگی شاخوں کے جھنڈ میں آن پہنچی ہوں۔ ان پر کوئی پھول نہ کھلے گا۔ میں باغباں کو پکاروں بھی تو کس طرح؟" لیکن میں پھر بھی چپ رہتی ہوں، ایسا نہ ہو میری ماں کو اور صدمہ پہنچے حالانکہ میں جانتی ہوں۔ ستر سال کی اس بوڑھی عورت کی جان مجھ میں اٹکی ہوئی ہے اور اس کا پچھتاوا ایک مسلسل عذاب ہے اس کے لئے۔۔۔۔ پر میں کیا کروں ایک قطرے کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر کے تلاش کرنا دیوانگی ہے، حماقت ہے۔ اس قطرے کو کون تلاش کر کے لائے جو گہر ہونے کے لئے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں کود گیا اور پھر اس وقت کو کون منا کر لائے جو زندگی کا نقیب تھا۔ جو کلیوں، پھولوں کا امین تھا۔ جو محبت کا ضامن تھا۔ اب تو وقت بھی مفلوج ہو کر لنگڑا رہا ہے۔ اور میں چاند کی سمت تکے جا رہی ہوں۔ جیسے میرا گھر بھی چاند میں آباد ہو گیا ہے اور میں اس گھر کو چاند کی آنکھوں میں تلاش کرتی ہوں اور یہ چاند میرے سامنے آجاتا ہے اور میری پلکوں پر حجاب کرتا ہے۔

"میں وہ نہیں جس کی کھوج میں تو مجھے دیکھے جاتی ہے۔ میں تو گم گشتہ خیالات اور تشنگی ماندی آنکھوں کی آخری پناہ گاہ ہوں میں خود بھی ان متجسّس نگاہوں کی گرمی اور کراہتے ہونٹوں کے سوز سے تھک گیا ہوں ــــ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، انسان اپنی گمشدہ خوشیوں، امیدوں کو کھو کر جب بے آسرا ہو جاتے ہیں اور ان چہروں کو تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں جو چہرے کبھی حاصلِ زندگی تھے تو اپنی فریب خوردہ نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیتے ہیں۔ میں بیک وقت ان سب کو ان کا محبوب نظر آتا ہوں۔ ان کے پراگندہ خیالات کی آخری منزل بن جاتا ہوں۔ ان کی خوشیوں اور محبتوں کا آئینہ بن جاتا ہوں۔

میں کیا کروں۔ میں خود بھی صدیوں سے یہ کھیل رچاتا رچاتا تھک گیا ہوں اور اب تیری تلاش کرتی ہوئی نظریں مجھ پر کیوں رک گئی ہیں۔"

"نہیں ــ" میں ایک سوگوار تبسّم سے اپنا سر اپنے ریشمیں تکیوں میں چھپا لیتی ہوں۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے تیرے داغدار جگر تک نہیں اترتی پگلے! وہ تجھ سے بھی کہیں بلند تھا۔ تجھ سے بھی کہیں روشن تھا۔ میں نے کبھی اسے چاند نہیں کہا تھا۔ میں تو اس کے لئے چاند سے بھی بلند کوئی نام ڈھونڈتی رہی اور وہ قطرہ بن کر سمندر کی گہرائیوں میں کود گیا وہ گہر بننا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بھول تھی۔ ورنہ وہ تو ایسا گہر آبدار تھا جسے اپنے اندر چھپانے کے لئے سمندروں کے سینے مدّت سے اچھل رہے تھے۔ اور اے چاند!

تو میرے خیالات کی اڑان نہیں ہے۔ تو ایک حد ہو سکتا ہے۔ اس طرح اداس نہ ہو کہ میری آنکھوں نے تیری اداسی اور بلندی ایک پیکر میں سموئی تھی اور زندگی منزل بننے کی بجائے طویل راہ گزر بن گئی تھی۔ ہاں میں اس روز جب سب سے آخر میں، وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ اپنے کالے سوٹ میں، اداس سی صورت اور پژمردہ آنکھوں کے ساتھ۔ مجھے عرش سے اترا ہوا کوئی خاکی ہی معلوم ہوا اور جب وہ کمرے کے وسط میں آ کر کھڑا ہو گیا تو میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ کوئی یوسف ثانی نہیں تھا لیکن مردانہ وجاہت کا ایک دلنواز نمونہ تھا۔ اس کے چہرے پر سوز تھا۔ ایسا سوز جو چاند کے داغ میں ہوتا ہے۔ چاند کا داغ نظر آجاتا ہے اس کا داغ اس کے دل میں تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے سوز کو میں نے ضرور پا لیا اور اس کی طرف دیکھ کر میرا دل اداس ہو گیا۔ میں نے اس کا غم آپ ہی آپ اپنے دل میں منتقل کر لیا اور جب سالگرہ کا کیک کٹ چکا تو میں اپنی

پلیٹ اٹھا کر دور، دریچے میں جا کھڑی ہوئی جہاں مجھے کوئی نہ دیکھے لیکن میں سب کو دیکھ سکوں مسز ارشد کی نظر اس پر پڑی اور وہ پیشوائی کو اسکی طرف بڑھیں۔ اس نے ایک سپاٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ مسز ارشد کے سلام کا جواب دیا اور پھر چاروں کونوں میں متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری ہی طرح شاید وہ بھی کسی کنج عزلت کا متمنائی تھا میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ سالگرہ کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچتا جا رہا تھا لیکن میں الگ تھلگ کھڑی مسرور ہو رہی تھی۔ اس شب میری روح مطمئن تھی۔ جیسے اس کا کوئی بچھڑا ہوا حصہ اس سے آن ملا ہو۔ جیسے آج شب اس کی تشنگی مٹ گئی ہو۔

اللہ ــــ روح کا اطمینان بھی کیسا کیف آگیں ہوتا ہے۔

میں ابھی اپنے اندر سرور و کیف کے شادیانے بجتے سن رہی تھی کہ رابعہ میرے قریب آ گئی۔

"یہاں کیوں چھپی کھڑی ہو۔؟"

"نہیں تو ــ!"

"کیا اپنے بہنوئی کا سامنا کرنا نہیں چاہتیں؟"

"کون سا بہنوئی ــ؟" میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"بھئی وہی جنید ترمذی!"

"تو کیا جنید اس محفل میں آیا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ تو نے نہیں دیکھا!" میں نے اپنا چہرہ محفل کی طرف گھما لیا وہ دیکھو۔ سیاہ کوٹ میں وہ سب سے الگ مغموم سا کھڑا ہے!"

"اوہ! میں نے اب پہچانا ہے۔ میں مینار سے نیچے پھسلنے لگی۔ میری روح کے سارے تقاضے رونے لگے۔ کتنی بے وقوف ہوں، میں نے جنید کو پہچانا ہی نہیں۔ ہاں اور پہچانتی بھی کیسے ــ؟ میں نے اسے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ اس کی تصویر میرے ذہن میں اتر چکی تھی اور اب یہ کتنا بدل گیا ہے۔

مجھے آج سے پانچ سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔

ہم دونوں بہنوں کی پرورش ماں نے بڑے شاہانہ انداز میں کی تھی۔ بیوہ ہونے کے باوجود ہمیں شہزادیاں بنائے رکھا اور ہم دونوں بہنیں لاشعوری طور پر یہ سمجھنے لگ گئی تھیں کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ہمیں اپنا بنا سکے اس لئے ہمارے لئے عرش سے خاص طور پر کوئی خاکی اُترے گا اور یہ خیال عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہونے لگا۔

ان دنوں میں ایف ایس سی کر رہی تھی جس کے لئے مجھے لاہور کے ایک کالج میں داخلہ لینا پڑ گیا اور سائرہ میری بڑی بہن بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بنوں میں رہتی تھی۔ مجھے سائنس میں خاصی محنت درکار تھی۔ اُدھر ایک دم سائرہ باجی کا خط آیا کہ اسے وہ عرش سے اترا ہوا خاکی زمین پر نظر آ گیا ہے اور وہ اس سے شادی کر رہی ہے۔ شادی کی تیاری اس طرح آناً فاناً ہوئی کہ میں کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ شادی کی جو تاریخ رکھی گئی تھی اس سے دوسرے دن میرے فائنل امتحان تھے امی نے مجھے لکھا تھا کہ میں چاہے ایک دن کے لئے آؤں لیکن ضرور آؤں۔ سو میں ایک دن پہلے چلی گئی۔ شادی کے روز میں نے بھیڑ میں جنید کو دیکھا نہ جانے مجھے کیسا لگا۔ کیونکہ میرے اعصاب پر تو امتحان کا بھوت سوار تھا۔ بارات رخصت ہو گئی اور اسی رات میں لاہور کے لئے روانہ ہو گئی۔ میرا ذہن پریشان رہا۔ میرے امتحان شروع ہو گئے۔

اور ایک دن سائرہ باجی میرے ہوسٹل آ گئیں۔ میں حیران رہ گئی۔

"سارہ! میں اور جنید ہنی مون کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں!"

"سچ ــ!"

"ہاں!"

"کہاں ہیں جنید بھائی ــ؟" ان سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔

"وہ ایک ضروری کام سے گئے ہیں۔ کیونکہ پرسوں ہم روانہ ہو رہے ہیں!" باجی شام تک میرے پاس بیٹھی رہیں۔ لیکن جنید بھائی نہ آ سکے۔ ان کا ٹیلیفون آ گیا۔ کچھ پاسپورٹ کا جھگڑا تھا۔ باجی مجھ سے یہ وعدہ کر کے چلی گئیں کہ سوئٹزرلینڈ جانے سے پہلے وہ جنید کو مجھ سے ضرور ملائیں گی۔ لیکن پھر کتنے ہی دن گزر گئے نہ باجی آئیں نہ جنید بھائی۔ ایک مہینے بعد سوئٹزرلینڈ سے باجی کا خط آیا انھوں نے مجھ سے نہ ملنے پر معذرت کی تھی اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ باجی بے حد خوش ہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وقت گزرتا رہا۔ میرا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ میں ایف ایس سی میں فیل ہو گئی۔ دکھ تو مجھے بہت ہوا۔ لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں سائنس میں نہ چل سکوں گی۔ اگلے سال میں نے آرٹس لے لیا۔ باجی کو سوئٹزرلینڈ گئے ایک سال ہو گیا تھا۔ جنید بھائی نے وہاں نوکری کر لی تھی اور وہ دونوں بہت خوش تھے۔ پھر انھوں نے اپنی آمد کے متعلق لکھا۔ ان دنوں بھی میرے امتحان ہو رہے تھے۔ میں انھیں لینے کراچی نہ جا سکی۔ صرف امی گئیں اور انھیں لے آئیں۔ جنید بھائی نے مکان وغیرہ کا انتظام

کرلیا تو باجی بھی کراچی چلی گئیں۔ پھر کچھ عرصے بعد میں نے ایک اور خبر سنی۔ سائرہ باجی نے جنید بھائی سے طلاق لے لی۔ کیوں؟ کس لئے؟ کس طرح۔؟

کسی نے ان باتوں کا جواب نہیں دیا۔ بس سائرہ باجی ہمیشہ کے لئے امی کے پاس آگئیں۔ کبھی کبھی مجھے باجی کا دکھ بھرا خط مل جاتا اور مجھے لاشعوری طور پر ہی جنید بھائی سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔ یہ مرد جس عورت کو اتنے پیار محبت سے اپناتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی قربانی نہیں کرسکتے۔ وقت آگے کو سرکتا رہا۔ میں نے بی۔ اے کرلیا۔ ایم اے کیا لیکن مجھے عرش سے اترا ہوا وہ خاکی نظر نہیں آیا۔ میں نے مقامی کالج میں لیکچررشپ قبول کرلی۔ ابھی مجھے ایک مہینہ ہوا تھا کالج جاتے ہوئے۔ مسز ارشد میرے ساتھ ہی پڑھاتی تھی۔ آج ان کی لڑکی طیبہ کی سالگرہ تھی اور میں سالگرہ میں آئی تھی۔

اور اچانک کالے سوٹ میں ملبوس عرش سے اترا ہوا ایک خاکی کمرے کے وسط میں نمودار ہوا جسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں... نہیں میں تو اسے جنم جنم سے جانتی ہوں۔

اور اب رابعہ نے بتایا یہ جنید ہے۔

میرا خون کھول اٹھا۔ تو اس نے میری بہن کو طلاق دی ہے۔ اور وہ ساری عقیدت ایک نفرت میں بدل گئی۔

"لو! وہ اسی طرف آرہا ہے" رابعہ نے مجھے بتایا۔

"میرا اس سے تعارف مت کرانا رابعہ۔ میرا خیال ہے وہ مجھے نہیں پہچانے گا"

"اچھا۔!"

میں بے نیاز سی بن کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رابعہ وہاں سے ٹل گئی اور وہ میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے کا سوز کچھ اور پرنور ہوگیا اور وہ اپنی گہری دلکش آواز میں بولا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں، آپ کون ہیں؟"

مجھے ایکدم طیش آگیا۔

"جی۔ نہیں.... میں آپ کو نہ جانتی ہوں۔ نہ پہچانتی ہوں اور آپ کون ہیں؟ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں"

"یہ آپ کے دل کی زبان نہیں آپ کی اپنی زبان ہے"

"کیا مطلب۔؟"

"آپ نے پہچانا تو مجھے اسی وقت تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ "جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے تو اب تک نہیں پہچانا۔ یہاں تک کہ میں آپ کا نام بھی نہیں جانتی"

اس نے کہا "نام اور حسب و نسب سے کچھ فرق نہیں پڑتا اصل چیز روح کی پہچان ہے۔ کیا آپ کی روح مجھے دیکھ کر مطمئن نہیں ہوگئی تھی؟" میرا دل کانپ گیا۔

"آپ کو اس کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے؟"

"میں نے آپ کا چہرہ پڑھ لیا تھا"

"بالکل غلط۔!"

"میرے دل نے مجھے اس کی آگاہی دی تھی"

"کیسے۔؟"

"آپ کو دیکھ کر میری روح یوں ٹھٹک گئی تھی جیسے ایک بھٹکے ہوئے پرندے کو اچانک اپنا دشمن نظر آجائے"

یہ کون ہے۔ یہ کون ہے۔ یہ کون ہے۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ لیکن پھر نفرت کا ایک طوفان میرے ہونٹوں تک آگیا۔ ایسی ہی مکاری کی باتیں کرکے اس نے سائرہ کا دل موہ لیا تھا اور اب میں اسے کچھ کہنے والی تھی کہ مسز ارشد قریب آگئیں۔

"یہ سارہ زبیری ہے جنید! تم شاید اسے جانتے ہوگے۔ ابھی ابھی کالج میں آئی ہے۔ بہت اچھی بچی ہے" مسز ارشد کے اس بزرگانہ انداز پہ مجھے ہنسی آگئی۔

"کیا آپ سائرہ زبیری کی بہن ہیں؟" اچانک جنید نے اپنی بھاری گمبھیر آواز میں کہا اور میرے سامنے نفرتوں کے پہاڑ کھڑے ہوگئے۔

"جی ہاں!" میں نے بڑی تندہی سے کہا۔

"اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں ابراہیم اور آذر بھی جنم لے سکتے ہیں۔ بہرحال آپ وہ ہیں جن کی ذرا سی جھلک میں نے سائرہ میں پائی اور ___ بھٹک گیا"

"لیکن میں سائرہ جیسی سادہ لوح اور عاقبت نااندیش نہیں ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے" یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ کر آگئی۔ پھر آکر بھی سارا وقت سلگتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا لیکن دیکھ۔ یہ وہی شخص ہے پاگل

دہی۔ جسے تو پانچ سال سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔" لیکن عقل کہہ رہی ہے۔ اس نے تیری بہن کی زندگی برباد کی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ایک عورت کو طلاق دے چکا ہے اور ہمارا سماج جہاں طلاق شدہ عورت کو اس کا اصلی مقام نہیں دے سکتا۔ طلاق دینے والے مرد کی طرف سے بھی بدگمان ہو جاتا ہے۔ اس لئے میری بدگمانی حق بجانب تھی لیکن اس رات۔ جب بھی میں آنکھیں بند کرتی مجھے جنید اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیتا۔ کالے سوٹ میں ملبوس۔ ایک مغموم اداس۔ پُرسوز چہرے اور پُرنم آنکھوں والا نوجوان! اس کی سرگوشیاں مجھے اپنے کانوں میں سنائی دیتیں۔ تم میری روح کی پہچان ہو۔ لیکن تم جو کچھ بھی ہو میری بہن کو طلاق دے چکے ہو اب تم میرے لئے کچھ بھی نہیں ہو — اب میں کسی اور خاکی کا انتظار کروں گی۔ اور خاکی ڈھونڈوں گی۔ پھر کتنے دن یوں ہی بیت گئے۔

میرا خیال تھا میں اسے بھول جاؤں گی۔ لیکن اس سے ملنے کی طلب شاید پیاس کی مانند بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک روز سرِراہ اس سے ملاقات ہو گئی وہ ہلکے رنگ کا سوٹ پہنے بے جان بے جان سے قدم اٹھاتا آ رہا تھا۔ میں بھی ہلکے رنگ کا سوٹ پہنے تھکی تھکی سی جا رہی تھی۔ اس دن صبح بہت چمکیلی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بت بن گئے۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے کپڑوں کو دیکھا اور حیرانی سے مسکرا دیئے۔

"میں جس وقت سے چلا ہوں آپ کے متعلق سوچ رہا ہوں۔" میں بھی تو اسی کے متعلق سوچ رہی تھی، مگر میں خاموش رہی۔

"اس وقت ہمارا ملاپ یوں ہوا جیسے نیلے آسمان پر دو سرمئی بادل مخالف سمتوں سے آ کر مل جائیں۔"

"اچھی تشبیہ ہے۔" میں ہنس پڑی۔

"میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اس کی آواز میں التجا تھی

"زندگی بھر کے لئے!" میرا دل پکارا۔ لیکن میں نے صرف نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شکریہ!" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"لیکن میں نے آپ کو اجازت نہیں دی!" میں نے شوخی سے کہا۔

"آپ کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ آپ زندگی بھر کے لئے میرے ساتھ چل سکتی ہیں!"

میرا دل سجدہ ریز ہو گیا۔ اسی کو روح کی پہچان کہتے ہیں۔ اور میں خاموش ہو گئی۔

"تو کیا میں نے غلط سمجھا تھا۔؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا جواب دینا مشکل ہے!"

"کیوں۔؟"

"مجھے ہمیشہ سچ بولنے کی عادت ہے۔"

"میں سچ کی تلخی سہنے کا عادی ہوں۔"

"لیکن سچ کبھی کبھی اتنا میٹھا بن جاتا ہے کہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے....!"

"ایسی مٹھاس سے اب تک میں محروم رہا ہوں۔" اس کی آواز میں تحریریوں کی لرزش تھی۔ میرا دل خون ہو نے لگا۔

"آپ نے بالکل صحیح سمجھا تھا۔"

"جو آپ کی نظروں نے کہا تھا؟"

"جی —!"

"سارہ!!"

"ہاں جنید —" میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ کوئی روح کے تقاضے تھے۔ یہ کوئی آسمانی ملن تھا جو آپ ہی آپ ہو گیا تھا۔ پھر ہم دونوں سڑک پر خاموش چلتے رہے۔ اس سنسان اور ویران سڑک پر ہمارے لئے زندگی کی تمام تر بہاریں جاگ اٹھی تھیں۔ پھر میرے کالج کا گیٹ آ گیا۔ میں نے جنید کی طرف دیکھا۔

"میں کل آپ سے پھر ملوں گا!"

"کہاں؟"

"اسی سڑک پر جس نے ہمیں منزل کا پتا بتایا ہے۔"

"اچھا —!" ہم دونوں جدا ہو گئے۔

اگلے دن میں نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا۔ قرینے سے دوپٹہ اوڑھا اور اپنا کالا بیگ لے کر باہر آ گئی۔ دوسری طرف سے جنید آ رہا تھا اس نے بھی ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور کالی ٹائی باندھے ہوئے تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لباسوں کو دیکھا اور خاموشی سے چل دیئے۔

اس سے اگلے دن میں نے کریم کلر کا سوٹ پہنا اور سرخ دوپٹہ اوڑھا اور باہر آ گئی۔ دوسری طرف سے جنید کریم کلر کے سوٹ کے ساتھ سرخ ٹائی لگائے

آ رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔

"تم کب تک اس آزمائش میں پڑی رہوگی سارہ"۔ اس نے ہنس کر کہا۔

"مجھے آزمائش کی ضرورت نہیں ہے جنید۔ یہ سب تو اپنے آپ ہو رہا ہے۔ قدرت کے کام بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں"

اور کتنے پیارے بھی"

"جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے محسوس ہوا تم مجھ سے نفرت کروگی"

"ہاں میں نے تم سے نفرت کرنے کی پوری کوشش کی"

"لیکن میرا دل کہتا رہا تم مجھ سے ضرور محبت کروگی"

"میں ایسا کرنے پر مجبور ہوگئی"

"اور تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری بہن کو طلاق دی"

"یا خود انہوں نے طلاق لی"

"لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے"

"تالی بجانے کی ابتدا تو ایک ہاتھ ہی کرتا ہے"

"میں تمہاری نظر میں نہ سہی۔ دنیا کی نظر میں مجرم ہوں۔"

"مجھے دنیا سے کیا لینا"

"زمانہ تمہیں ستائے گا سارہ"

"میں زمانہ سے مشورہ لینے نہیں جاؤں گی"

"تم ابھی سماج کے اصولوں کو نہیں جانتی ہو"

"جنید تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

یہی کہ میں نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے"

"اچھا۔ تو میرے دل پر منوں برف گر پڑی" محبت نہ کرنے کا تہیہ تو نہیں کیا نا؟"

"نہیں میں محبت کروں گا۔ یہاں تک کہ مر جاؤں گا"

"پھر ایسی باتیں نہ کیا کرو"

"کیا تم نے گھر میں میرے متعلق بتایا ہے؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت فی الحال نہیں"

تم نے کبھی مجھ سے طلاق کی وجہ نہیں پوچھی؟"

"کیا ضروری ہے۔ جو بندھن ٹوٹنا ہوتا ہے ٹوٹ جاتا ہے"

"میں جانتی ہوں وہ بڑی خود پرست اور خود پسند ہے"

"اور سارہ میں آخر وقت تک اس کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ ایک دم فیصلے صادر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک ہی رات میں طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر عدالت کے ذریعہ زبردستی طلاق لے لی"

"آج سے پانچ سال پہلے میں بھی ایسی تھی۔ خود پرست اور خود پسند"

"پھر"

"پھر میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کی۔ جب سرتا پا بدل گئی تو تم مجھے مل گئے"

"میرا دل چاہتا ہے کہ اب زندگی ٹھہر جائے بس!"

"بڑے خود غرض ہو دوسروں کو بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دینا چاہتے ہو"

"یہ جوان دنوں میری کیفیت ہے۔ اسی میں موت آ جائے تو شاید ان دکھوں کا کفارہ ادا ہو جائے جو تقدیر نے اب تک مجھے دیئے ہیں"

"پاگل نہ بنو۔ اب زندگی کوئی کروٹ لے گی"

اور وہ عرش سے اترا ہوا خاکی میری روح میں سماتا ہی چلا گیا۔ دو سال اور بیت گئے۔ پھر اچانک سائرہ باجی کی زندگی میں کہیں سے امجد بھائی آ گئے۔ سائرہ باجی نے ان سے شادی کر لی۔ میری راہ کا ایک بوجھ ہٹ گیا۔

اس شام میں کشتی چلا رہی تھی اور جنید سفید کپڑے پہنے میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

"جنید، میں نے فیصلہ کر لیا ہے"

"کیا۔!"

"کہ میں شادی کروں گی"

"اچھا۔!"

"اور تم اپنا فیصلہ بدل دوگے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے اور صرف میرے لئے"

"سارہ ۔ ۔ ۔" میں نے دیکھا جنید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جنید — میں نے اس کے رخساروں پر انگلی رکھی یہ بہت حد تک آنسو میں آنکھیں بہنے نہ دیتا۔ اس نے کمال ضبط سے آنسو پی لیے اور اسی وقت میری پلکیں جھک گئیں۔

"نظریں اٹھاؤ سارہ" جنید نے کہا۔

"اب میری آنکھوں میں تمہارے آنسو آگئے ہیں"

میری طرف دیکھو" میں نے نظریں اٹھائیں۔ اب میرے آنسو جنید کے ہونٹوں پہ تھے اور ہم دونوں کھلکھلا کر مسکرا دیے۔

اسی لمحے میرے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں اور میرا دل سہاگ کے گیت گانے لگا۔ مجھے ساری دنیا پھولوں کی سیج معلوم ہونے لگی۔

اور جب میں نے اپنی اماں سے کہا کہ میں جنید سے شادی کروں گی تو ان کے سر پر آسمان آن گرا۔ انھیں دنیا کا ڈر اور خاندان کی ناک کٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انھیں میرا یہ فعل گردن زدنی معلوم ہوا اور جب سائرہ باجی کو معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے بے غیرت، بد قماش، نافرمان، احسان فراموش اور ڈائن کے خطابات سے نوازا اور یہ بھی کہا اگر میں نے جنید سے شادی کر لی تو وہ زہر کھا لیں گی۔ میری ماں نے مجھ سے بول چال بند کر دی۔ میری سوچ کے سارے دروازے مقفل ہو گئے۔ زمانہ بھر درمیان میں حائل ہو گیا اور میں تن تنہا جلتے ہوئے جنید کا سہارا نہ بن سکی۔

"جنید!"

"ہاں! میں یہ سب کچھ جانتا تھا سارہ"

"مگر یہ سب نامناسب ہے جنید اس میں گناہ کیا ہے؟"

"گناہ یہ ہے کہ میں تمہاری بہن سے نباہ نہ کر سکا"

"اب کیا ہوگا؟"

"شادی ہی کرنی ہے تو اس کے کئی راستے ہیں سارہ۔ ہم کورٹ میں جا کر بیاہ کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جا سکتا ہوں تم گستاخ بن کر اپنی ماں کی نافرمانی کر سکتی ہو۔ لیکن میں ان میں سے کوئی بات نہیں چاہتا۔ میں تمہیں تمہاری نظر میں نہ گراؤں گا۔ اپنی بلندیوں سے گر کر تم کبھی سکون نہ پا سکو گی۔ مجھے تو زندگی بھر بے چین رہنا ہی ہے"

"جنید! جنید.... میرا دل رونے لگا" مجھے ترغیب دلاؤ خدا کے لئے مجھے ترغیب دلاؤ۔ تاکہ میں ساری دنیا کو ٹھکرا کر تمہاری بن جاؤں۔ یہ مجھے تم کون سا راستہ دکھا رہے ہو" میں.... روتی رہی۔

"اور پھر میں تمہاری اماں کا دل اور دکھانا نہیں چاہتا۔ سارہ وہ یہ بالکل نہیں جانتیں کہ طلاق میں سراسر ان کی بیٹی کا قصور ہے۔ لیکن ان کی نظروں میں، میں مجرم ہوں"

"پھر اب میں کیا کروں جنید؟"

"تم مجھ سے ایک وعدہ کرو"

"کیا —؟"

"کہ تم ضرور کسی اور سے شادی کر لو گی"

"نہیں، نہیں، نہیں!!!۔ میں ہرگز ایسا وعدہ نہیں کر سکتی"

"تمہیں میری خاطر ایسا کرنا پڑے گا"

"میں جھوٹا وعدہ نہ کر سکوں گی"

"تم وعدہ نہ کرو گی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا"

"کہاں؟"

"بہت دور ——— تاکہ تم میری پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکو"

"ایسا نہ کرنا جنید"

"کیوں۔؟"

"مجھے یقین ہے میں ایک دن اپنی ماں اور سنگ دل بہن کو منا لوں گی"

"ایسا کبھی نہ ہو سکے گا سارہ اور جب تک میں تمہارے پاس رہوں گا تم اپنے مستقبل کے متعلق صحیح فیصلہ نہ کر سکو گی"

"جنید خدا کے لئے کہیں جانے کی نہ سوچنا"

"میرے ماتھے پر جو داغ لگا ہے وہ کیسے دھو سکوں گا سارہ..."

"میں اسے اپنے آنسوؤں سے دھو لوں گی جنید"

"میں اس کا وعدہ نہیں کرتا"

"تم اب مجھے کب ملو گے....؟" میں نے ہزاروں تمناؤں کے ساتھ پوچھا۔

"اب کے بچھڑے ہوئے شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں"

جنید خاموشی سے باہر چلا گیا۔ پھر میرے آنسو تھم گئے آنکھیں خشک ہو گئیں۔ تھک گئیں۔ دل میں سرخ قطرے گرتے رہے لیکن اب زندگی اس مقام پر آ گئی ہے۔ جہاں حصول و ناکامی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ لوگ جو دلوں کے قریب رہتے ہوں جن کی خوشبو سانسوں میں بسی ہو۔ وہ اس دنیا میں سمندر میں قطرہ بن کر کھو جائیں تو کبھی کبھار آنکھ سے نہ چھلک سکتے ہیں۔

سرمایہ

روحی کرن

شہذیب تقریباً دس گیارہ دن سے یہاں ٹیوشن پڑھانے آرہی تھی زوبی اور گڈی بہت پیارے اور گول مٹول سے بچے تھے زوبی نو سال کا تھا اور گڈی زوبی سے چھوٹی ہی ہوگی شہذیب کو مجبوراً پڑھانا پڑ گیا تھا ایک بڑی بہن عندلیب اور ایک چھوٹا بھائی آذر تھا۔ ماں آذر کی پیدائش پر ہی وفات پا گئی تھیں والد بھی جو ایک اسکول ماسٹر تھے ریٹائر ہوگئے تھے عندلیب بیچاری کی پڑھائی تو ماں کے مرتے ہی ختم ہوگئی تھی کیونکہ گھربار کون سنبھالتا اور ماں کے مرتے وقت وہ صرف دس سال کی تھی اور پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی، عندلیب دسویں میں تھی مگر ماں کے انتقال کے بعد وہ دسویں کا امتحان بھی نہ دے سکی تھی اور شہذیب اسکی پڑھائی تو قسمت سے جاری رہی ورنہ بڑے ابا اور تائی جان نے تو کہہ دیا تھا میاں لڑکیوں کو زیادہ پڑھا کر کیا کروگے ویسے بھی اب گھر ان لڑکیوں کے علاوہ کون سنبھالے گا

مگر اس کے ابو نے کہا عندلیب کی تو خیر مجبوری ہے مگر شہذیب کی پڑھائی نہیں رکوں گا اس طرح شہذیب بی اے میں آگئی۔ آذر ابھی چھٹی کلاس میں تھا۔ شہذیب کا ارادہ تھا آگے پڑھنے کا مگر گھر کے حالات کے لئے اسے اپنی سوچ بدلنی پڑی اور پھر عندلیب کی فکر نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ عندلیب گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر سلائی لے کر بیٹھ جاتی۔ کیونکہ جب سے ابو ریٹائرڈ ہوئے تھے پنشن میں گزارہ ناممکن تھا۔ وہ سوا دو سو پلے کیا ہوتے ہیں عندلیب سلائی کا کام کرنے لگی جب بھی شہذیب بہن کو مشین پر جھکے دیکھتی اس کی آنکھیں نم ہوجاتیں مگر وہ کتاب پر جھک جاتی شاید وہ [illegible]

باجی میں پڑھائی نہیں کرنا چاہتی اب میں نہیں پڑھوں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

کیوں؟" عندلیب کے ہاتھ مشین پر سے رک گئے۔

باجی جب گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تو وہ پھر الجھی ہوا اور رہتے دیکھا نہیں، باجی میں اب نہیں پڑھوں گی وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔ آذر نے پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر بہنوں کو دیکھا اور پھر کتاب پر جھک گیا۔

پگلی اتنی جلدی ہمت ہار دی ابھی تو تیری بہن زندہ ہے عندلیب نے اپنا سفید نرم و نازک ہاتھ روتی ہوئی شہذیب کے سر پر رکھ دیا۔ کیا تو بھی میری طرح رہنا چاہتی ہے شہذی تو پڑھ لے گی تو شاید ہمارے یہ دلدر دور ہوجائیں۔ ابھی تو بھیا کو پڑھانا ہے کیا تو اسے بڑا آدمی نہیں بنائے گی۔

اور شہذیب نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

میری طرف دیکھ میں تو اس آس پر جی رہی ہوں کہ تم دونوں کو کچھ دیکھ سکوں، تم ہنسی خوشی زندگی گزارو" عندلیب ایک ماں کی طرح کہہ رہی تھی اور شہذیب اپنی بہن کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو دی جیسے واقعی وہ ماں کی گود میں ہو۔

مگر مالی حالت کی پریشانی نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا اور پھر ابو اور عندلیب کے منع کرنے کے باوجود اس نے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ گھر پر بچوں کو پڑھاتی اور پھر یہاں پڑھانے آجاتی تھی۔

شہذی کیا حالت بنالی ہے بیمار ہوجائے گی ایک تو کالج میں پڑھنا اپنی پڑھائی اوپر سے دماغی محنت بس وہاں جانا بند کرو" عندلیب کہتی

نہیں باجی کچھ نہیں ہوتا دیکھئے آپ بھی محنت کرتی ہیں نا ———

پگلی بہنیں کی مجھے تو ڈر ہے کہ اتنی محنت سے کہیں بیمار نہ ہوجائے، شہذیب فقرہ کاٹ کر ہنس دی اور تیار ہوکر گھر سے باہر آگئی۔

بس اسٹاپ پہنچی تو بس میں بیٹھ کر وہ ناظم آباد اتر گئی بس اسٹاپ سے ان کا گھر کافی دور تھا وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی جارہی تھی اور جب ہی وہ ایک کار سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔

محترمہ دیکھ کے چلا کیجئے۔ چلنا بھی نہیں آتا" ایک خوبصورت نوجوان [illegible] شہذیب کی گھبراہٹ دیکھ کر [illegible]

جی ... وہ [illegible] اپنے سانس پر قابو پا سکی تھی۔

جی کبھی خدا دیکھ کر چلا کیجئے ورنہ اس طرح آپ کے ایکسیڈنٹ ہوتا رہے گا اور وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

بدتمیز" شہذیب گھبرا کر آگے بڑھ گئی۔ "معقول کہیں کا" [illegible] جو تیرا میرا کیا [illegible] وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی ابھی [illegible] کرنی ہے بھیا کو پڑھانا ہے اور آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دس منٹ بعد وہ دروازے پر کھڑی کال بیل بجا رہی تھی۔

ارے ! وہی لڑکا دروازہ کھولے حیرت سے دیکھ رہا تھا اور شہذیب بھی گھبرا گئی تھی۔

اوہ ! اچھا وہ مسکرایا اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

دیکھئے محترمہ میں شریف آدمی ہوں اور کسی شریف آدمی کا پیچھا کرنا بے ہودگی ہے۔

جی ! شہذیب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

جی جی کیا آپ میرے پیچھے چلی آئیں یہ بیہودگی نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا جوان لڑکیاں اس طرح جوان لڑکوں کا پیچھا کرتی ہیں کہ لڑکا کار میں اور لڑکی پیدل۔۔۔۔

شٹ اپ ! وہ تلملا کر رہ گئی۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

ارے ندیم ! اندر سے مسز جمیل کی آواز آئی تو وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مسکراتا ہوا تو دو گیارہ ہو گیا اور شہذیب کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

کس قدر ڈھیٹ اور بے شرم ہے نجانے کون ہے میں ابھی شکایت کروں گی۔

ارے آج دیر کیوں ہو گئی۔ مسز جمیل نے آتے ہوئے پوچھا۔

"جی جی کچھ نہیں" وہ بوکھلا گئی۔ اور پھر وہ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ کون ہے جو ابھی اس کی بے عزتی کر کے چلا گیا ہے۔

آنٹی ہمارے انکل آئے ہیں، "گڈی نے پڑھنے کے بعد کہا۔ اسنے شہذیب کو آنٹی بنا لیا تھا

انکل کون ؟ شہذیب نے پوچھا۔

" انھوں نے میری گڑیا کی ٹانگ توڑ دی۔ بڑے شریر ہیں وہ"

گڈی نے شہذیب کا جواب دینے کے بجائے شکایت سنائی اور تب وہ سمجھی تھی کہ وہی صاحب ان کے انکل ہوں گے۔ جنھیں ذرا بھی تمیز نہیں ہے۔ اسے غصہ تو بہت آیا تھا مگر وہ خاموش ہو گئی تھی اور جب وہ دوسرے دن وہاں جا رہی تھی تو عجیب کشمکش میں گرفتار تھی۔ کہیں وہ ذلیل انسان پھر نہ ٹکرا جائے۔

ہاں میں کیوں گھبراؤں اگر آج کچھ گڑبڑ کی تو وہ سناؤں گی کہ یاد رکھے گا۔ اور یہ سوچتی ہوئی وہ جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوئی۔

محترمہ ٹیچر صاحبہ کیا مذاق ہے راستہ میں ہی ٹکرا گئیں۔ وہ

کار سے سر نکالے کھڑا تھا۔ شہذیب کا دل چاہا کہ وہ صلواتیں سنائے کہ وہ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ گیٹ کے درمیان میں کار پھنسا کر آگے آ گیا وہ ابھی گیٹ کے باہر ہی تھی۔

دیکھئے ٹیچر صاحبہ آپ سب کو پڑھاتی ہیں مگر ذرا اپنی پڑھائی کی طرف غور کریں خاصی کمزور ہیں آپ۔"

جی ؟ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

دیکھئے نا ابھی آپ کو سڑک کراس کرنا بھی نہیں آتی۔ وہ غالباً کل کی بات دہرا رہا تھا اور شہذیب کے ضبط کے باوجود ناچارگی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارے شہذیب تم۔۔۔۔ دور سے مسز جمیل گڈی کے ساتھ آتی دکھائی دیں ان کی آواز سنتے ہی وہ کار لے کر باہر نکل گیا۔

اور شہذیب آنکھیں صاف کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

کیا ہوا کہیں ندیم نے تو تنگ نہیں کیا۔

شہذیب کا دل چاہا کہ وہ بتا دے کہ جس کے متعلق پوچھ رہی ہیں کس قدر ذلیل اور بدتمیز ہے۔

وہ میرا چھوٹا دیور ہے بہت شریر ہے کل ہی یونیورسٹی کی چھٹیاں ہوئیں تو آیا ہے، مسز جمیل ہنستے ہوئے بولیں اور شہذیب گم سم رہی۔

آج اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اندر جائے نجانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو کتنی بے عزتی کی تھی اس کی خود تو بہت پڑھا لکھا ہے نا۔ یوں بات کرنے کی تمیز نہیں کیا مذاق اڑا رہا تھا میرا۔ وہ سوچ رہی تھی کاش کہ ہم اسی مجبور نہ ہوتے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک آنسو ہی تو اس کے ساتھی تھے اور پھر بہن کی آغوش تھی جس میں سر رکھ کر وہ ماں کو بھول جایا کرتی تھی مگر اسے پھر جانا ہی پڑا مجبوری تھی نا۔

وہ ابھی گڈی اور نومی کو پڑھا رہی تھی کہ وہ جھٹ سے اندر آ گیا اور شہذیب بوکھلا گئی کہ نجانے اب کیا کیا بکے گا۔

دیکھئے محترمہ ٹیچر صاحبہ اگر آپ مجھے بھی پڑھا دیں تو بہتر ہو گا۔ وہ ایک کتاب پکڑے سامنے صوفے پر دراز ہو گیا اور پھر شہذیب کو دیکھ کر بولا۔ کیا خیال ہے آپ کا، شہذیب نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو اس نے کہا جواب نہیں دیا آپ نے"

"جی!" وہ گھبرا کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔
جی جی وہ نقل اتار کر بولا ارے نومی یہ کیا تمہیں جی جی پڑھاتی ہیں وہ نومی سے مخاطب ہوا۔

اس وقت وہ ہلکے گہرے رنگ کے نہایت قیمتی سوٹ میں بہت اسمارٹ لگ رہا تھا خوبصورت سفید چہرے پر بلا کی معصومیت تھی ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ بڑی بے ترتیبی سے پڑی تھی۔

شہذیب ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

غیر مردوں کو ایسے نہیں دیکھا کرتے" وہ بولا اور شہذیب اس کے فقرے پر تلملا کر رہ گئی۔

ارے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ مسز جمیل کمرے میں داخل ہوئیں۔

جی... جی میں... بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ وہ ایک دم گھبرا گیا۔

شہذیب نے تنگ تو نہیں کیا اس نے مسز جمیل نے پوچھا۔

نہیں بالکل نہیں پوچھ لو ان بچوں سے وہ شہذیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

اچھا چل یہاں سے مسز جمیل نے پیار سے ڈانٹا بہت شریر ہے۔

اور شہذیب تو غصے میں بیٹھی قالین پر پاؤں ملتی رہی تھی دل تو اسے اتنی صلواتیں سنا رہا تھا کہ اگر وہ اس وقت مسز جمیل کے سامنے سنا دیتی تو وہ آئندہ اسے یہاں نہ آنے دیتیں اور اب تو وہ یہاں آنا بھی نہیں چاہتی تھی روزانہ کی بے عزتی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اب وہ پڑھانے نہیں آئے گی اور واقعی وہ پڑھانے نہیں گئی عندلیب بہت خوش ہوئی تو شہذیب نے ہنس کر کہا بھلا میں اپنی باجی کی بات کیسے ٹال دیتی اس نے پیار سے عندلیب کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

مگر اگلے ہی دن مسز جمیل اس کے گھر آموجود ہوئیں اور شہذیب کے لاکھ انکار کے باوجود انھوں نے اسے راضی کر لیا وہ عندلیب اور آذر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور عندلیب... سے بولیں میں نے شہذیب کو بہن بنایا ہے تم بھی میری بہن ہو۔ دیکھو میں نے بہن کو منا ہی لیا اور شہذیب ان کی محبت دیکھ کر موم کی طرح پگھل گئی۔

وہ بادل نخواستہ پھر پڑھانے لگی۔ اور جب تک وہ گڈی، نومی کو پڑھاتی رہی اس کا دل ہر آہٹ پر دھڑک اٹھتا کہ وہ اب آیا۔ اب آیا۔ مگر وہ خیریت سے رہی اور جب وہ گڈی، نومی کو پڑھا چکی تو اس نے تھک کر اطمینان سے ٹھنڈی سانس لی وہ دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ چلو آج کا دن خیریت سے گزرا ورنہ پڑھانا دشوار ہو جاتا تھا شاید باجی صفیہ نے اسے منع کر دیا ہو۔ اس نے سوچا اور ابھی وہ سیڑھی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ گیا کمرے میں وہ تنہا تھی اسے دیکھتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئی.......

ارے پڑھا چکیں روز گھنٹے سے اندر بیٹھی ہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

" ارے وہ" بازو پھیلاتا ہوا بولا۔ باہر بارش ہو رہی ہے کیسے جائیں گی؟"

"جی کیا؟" وہ واقعی سب کچھ بھول بیٹھی اسے تو وہ کچھ نہ کہہ سکی البتہ اسے گھر جانے کی فکر ہو گئی۔

مجھے صاحبہ آپ نے شاید نہ پڑھا ہو بارش میں بھیگنے سے انفلوئنزا نزلہ بخار اور...... ابھی نجانے وہ کیا بکتا کہ مسز جمیل آ گئیں۔

" تو نجانے کیا بکتا رہتا ہے" وہ بڑبڑائیں

جی باجی میں بک نہیں رہا تھا بلکہ انھیں صحت کے مشورے دے رہا تھا وہ کن انکھیوں سے شہذیب کو دیکھتا ہوا بولا۔

اچھا آیا بڑا مشورہ دینے والا باہر بارش ہو رہی ہے یہی تو میں کہہ رہا تھا ندیم ان کی بات کاٹ کر بولا۔

چپ رہو ہاں تو شہذیب ایسا کرو تم کار میں چلی جاؤ۔ خواہ مخواہ بھیگ جاؤ گی۔ وہ شہذیب سے مخاطب ہو کر بولیں۔

جی نہیں میں چلی جاؤں گی وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

میں چھوڑ آؤں گا وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے بولا۔ اور شہذیب جل ہی تو گئی ہاں ہاں تم چھوڑ آؤ مگر راستے میں کوئی شرارت نہ کرنا۔ صفیہ نے کہا۔

نہیں صفیہ باجی میں چلی جاؤں گی وہ مسز جمیل کی بات پر لرز گئی بھلا میں اس بدتمیز کے ساتھ جاؤں گی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

کیا سوچ رہی ہو۔ مسز جمیل نے کہا۔

ہوں، کچھ نہیں۔ بس میں جا رہی ہوں شہذیب صفیہ کی بات پر چونک کر بولی۔

ندیم بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اور شہذیب اس کی نگاہوں سے بچتی باہر نکل آئی اور جب وہ گیٹ کے قریب پہنچی تو دیکھا ندیم سر جھکائے اندر وہ سائیکل پر سے پہلے تو وہ کترائی کہ چلتے کہ نہ جائے مگر پھر وہ ہمت کر کے گیٹ پار کر گئی مگر اسے حیرت ہوئی کہ ندیم نے کوئی فقرہ کیوں نہیں کسا بلکہ تو وہ کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔..

اگلے روز جب وہ پہنچی تو اسے وہاں بالکل خاموشی کا راج دکھائی دیا اور اس اداس دہ لان پار کرکے دروازے پر آئی کال بیل بجائی تو معاً وہ چونک گئی کہیں وہ شریر آج پہلی مرتبہ اس کے ذہن میں لفظ شریر ابھرا اتفاقاً ہی دروازہ کھلا صفیہ کے شوہر جمیل دروازے پر موجود تھے۔

آداب بھائی جان اس نے کہا۔

آؤ وہ سب اندر ہیں شہذیب کمرے میں آگئی۔ آنٹی ہمارے انکل جا رہے ہیں۔

شکر ہے۔ وہ گڈی کا فقرہ سن کر بولی اور آنکھیں بند کرکے ہاتھ جوڑنے لگی جیسے واقعی شکر بھیج رہی تھی۔

سفید لباس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی لانبے سیاہ بالوں کی ایک چوٹی پیچھے کمر پر پڑی تھی۔ اس نے سفید باریک دوپٹہ بڑی نفاست سے اوڑھ رکھا تھا اس وقت وہ بہت اچھی لگ رہی تھی گڈی اور نومی کو پڑھاتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

تب ہی ندیم ہلکے سرمئی سوٹ میں ملبوس اداس سا کمرے میں داخل ہوا اور شہذیب اس کے اس روپ کو دیکھ کر ششدر رہ گئی کس قدر افسردہ لگ رہا تھا وہ

آپ سے میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ ندیم نے کہا

"جی مجھ سے" وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں اپنے گذشتہ رویئے کی" وہ ہلکے لہجے میں گویا ہوا

"کیا معاف کردیا آپ نے" اس نے نگاہ اٹھا کر شہذیب کی طرف دیکھا۔

تب ہی شہذیب کو اس کی تمام باتیں یاد آگئیں اس کا دل نفرت سے سلگ اٹھا۔

بتائیے۔۔۔ وہ پھر بولا۔

یہ آج آپ پوچھ رہے ہیں۔۔۔ میں تو آپ سے بات تک کرنا گوارہ نہیں کرتی" وہ تیزی سے پلٹ آئی مگر گھر پہنچتے ہی وہ بستر پر گر پڑی۔ نجانے کیوں اسے اپنے الفاظ پر ندامت ہو رہی تھی اسے کیوں جھڑک دیا وہ سوچتی رہی۔

ہوں اس نے بھی تو مجھے ایسا ہی بے عزت کیا تھا۔ اسنے دل کو تسلی دی مگر ایک نامعلوم خلش اس کے ذہن کو مسمار کرتی رہی۔

اور پھر وہ اپنے آپ ہی چونک اٹھتی تنہائی میں دو شریر نگاہیں اس کا تعاقب کرتی نظر آتیں بار بار اس کا افسردہ چہرہ سامنے آجاتا مگر ہر مرتبہ اس کا خیال نکال دیتی۔

اسی طرح چار مہینے گزر گئے جب بھی ندیم کا کوئی خط آتا مسز جمیل شہذیب کو ضرور بتاتیں۔ اور کہتیں کہ وہ تمہیں ہمیشہ سلام لکھتا ہے تو شہذیب دھیرے سے مسکرا دیتی۔

اس کا بی۔ اے کا رزلٹ آؤٹ ہوا شہذیب اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئی تو عندلیب نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ ابو نے خوش ہوکر دعائیں دیں۔ مگر جلد ہی ان کی بوڑھی نگاہیں جوان بیٹیوں کے سامنے جھک گئیں جسے شہذیب نے محسوس کیا کاش باجی کے ہاتھ پیلے ہوجائیں اس نے دکھ سے سوچا تھا مگر اب وہ ضرور باجی کا سہارا بنے گی اب وہ اس گھر کی بڑی بن کر دکھائے گی اس نے ایک عزم سے سوچا اور پھر وہ اپنے آپ کو واقعی بڑا سمجھنے لگی۔ چند دن بعد اسے ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری معقول تنخواہ پر مل گئی وہ بہت خوش ہوئی مگر مسز جمیل افسردہ ہوگئیں۔

باجی میں یہاں ضرور آؤں گی آپ فکر نہ کریں وہ ہنس کر بولی۔

شکریہ شہذیب اب نومی کی سالگرہ پر میں تمہاری کامیابی پر ایک شاندار پارٹی دوں گی اور اس موقع پر ایک خوشخبری بھی سناؤں گی مسز جمیل نے کہا تو شہذیب حیرانی سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔

کیا سوچ رہی ہے شہذیب (آنکھیں بند کرکے) وہ نہ جانے کس سوچ میں غرق تھی کہ عندلیب چائے کی پیالی لے آئی۔ اور شہذیب نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

میں اپنی پیاری باجی کے متعلق سوچ رہی تھی بس اب میرے دولہا بھائی آجائیں" اس نے بانہیں عندلیب کے گلے میں ڈال دیں۔

چل ہٹ پگلی، عندلیب شرما گئی لے چائے پی۔

بھیا کہاں ہے۔ اس نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے پوچھا۔

یہ رہا میاں۔ آذر کپڑوں کی الماری میں گھسا بیٹھا تھا

ارے یہاں کیا کر رہا ہے۔ شہذیب بولی۔

باجی کا سرخ دوپٹہ رکھا تھا نا وہ ڈھونڈ رہا تھا۔

کیوں؟ شہذیب مسکرائی۔

کو اب آپ نوکر ہو گئی ہیں باجی کے دولہا جو آئیں گے آذر نے کہا۔
چل بے وقوف کہیں کا، عندلیب مصنوعی غصے سے اسکی طرف دوڑی مگر وہ جلدی سے سارے کپڑے پھینک کر بھاگ گیا۔
" کل نومی کی سالگرہ ہے میں نے ایک پارٹی کا انتظام کیا ہے اور ساتھ ہی تمہاری کامیابی پر جشن کا" مسز جمیل نے مسکرا کر شہذیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
بیکار تکلیف کی آپ نے شہذیب مسکرا کر بولی
تم تو میری بہن ہو اور اب تو میں تم سے ایک نیا رشتہ جوڑوں گی وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔
جی !! شہذیب حیران رہ گئی۔
شہذی، تمنا تھی کہ تمہیں اپنے بھائی سے منسوب کرتی جسے آج تک تم نے دیکھا ہے مگر وہ بھی میری اولاد ہی کی طرح ہے میں اس کی بات کیسے ٹال سکتی تھی" مسز جمیل نے پیالی میز پر رکھ دی اور شہذیب منہ پھاڑے سنتی رہی۔

ندیم بڑی مشکل سے راضی ہوا ہے سالگرہ پر آنے کے لئے اور پتہ ہے وہ کب راضی ہوا جب تک اس نے اپنی بات نہ منوا لی۔ خیر میرے لئے تو ندیم اور ناصر دونوں برابر ہیں اور ادھر تم اور عندلیب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عندلیب کو ناصر کے لئے اگر مانگوں تو تمہیں اعتراض تو نہ ہوگا" مسز جمیل نے شہذیب سے سوال کیا۔
شہذیب اس غیر متوقع سوال پر گھبرا گئی مگر وہ صفیہ کی ہمدردی اور محبت پر دم بخود رہ گئی تھی۔ کتنی چاہت تھی ان کے الفاظ میں۔
باجی تم میری بڑی بہن ہو جو چاہو فیصلہ کر سکتی ہو" شہذیب صرف اتنا کہہ پائی تھی کہ صفیہ نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ شہذیب کی آنکھیں پرنم ہو گئیں آج وہ کس قدر خوش تھی اس کی باجی کی قسمت کھل گئی تھی وہ بہت مسرور تھی۔
کوٹھی کو شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا اور خوب گہما گہمی ہو رہی تھی شہذیب ہلکی پیازی رنگ کا سوٹ پہنے آذر کے ساتھ آئی ہوئی تھی جمیل صاحب نومی کی انگلی تھامے گیٹ پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے
اللہ ابھی تک ندیم کیوں نہیں آیا، صفیہ بولیں تب ہی ندیم سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ایک بڑا سا ڈبہ تھامے اندر داخل ہوا شہذیب نے ایک نظر ندیم پر ڈالی اور پھر وہ ایک طرف گڈی کے ساتھ بیٹھ گئی وہ کافی دیر کھڑا صفیہ سے باتیں کرتا رہا۔ کیونکہ شہذیب دور بیٹھی تھی اس لئے وہ سن نہ سکی البتہ ندیم کی مسکراہٹ اسے دکھائی دے رہی تھی مگر اس نے جلدی نگاہیں جھکا لیں ندیم ہلکے ہلکے چلتا ہوا شہذیب کے قریب آکر رک گیا۔ شہذیب گھبرا گئی۔
گڈی کیا تم نے نہیں معاف نہیں کیا۔ وہ گڈی پر جھک گیا۔
شہذیب اس کے طنز پر جھلا گئی۔
دیکھو بھئی گستاخی معاف کر دیتے ہیں نا وہ کن انکھیوں سے سرخ ہوتی ہوئی شہذیب کو دیکھ کر بولا۔
" ہاں انکل" ڈیڈی کہتے ہیں کہ خطائیں معاف کر دینی چاہئیں" گڈی مسکرا کر بولی۔
تو شہذیب تڑپ کر کھڑی ہو گئی اتنے میں صفیہ باہر جا چکی تھیں اور کمرے میں اب وہ اور ندیم رہ گئے تھے۔
" شہذیب کیا بہت ناراض ہو" ندیم نے پہلی بار اسے مخاطب کیا اور وہ بھی نام لے کر شہذیب نے اپنی جھالر سی پلکیں اٹھا کر دیکھا
" بہت غصہ کرتی ہو" ندیم مسکرایا شہذیب نے جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ندیم نے راستہ روک لیا۔
پہلے کہو معاف کیا ورنہ ابھی سب کو بتا دوں گا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔
جی !! شہذیب ہکلا کر رہ گئی۔
" بدتمیز کہیں کے" وہ غرائی۔
اجی چھوڑو لڑائی صلح کر لو نا اب ندیم شوخی سے مسکرایا۔
شہذیب ندیم کا راستہ کاٹ کر باہر جانے لگی مگر ندیم نے راستہ روک لیا۔
معاف نہیں کیا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آنے لگا تو شہذیب مسکرا دی
کہو کر دیا نا معاف ؟" وہ پھر اداس ہو کر بولا
" کر تو دیا۔"...... شہذیب باوجود ضبط کے ہنسی روک نہ سکی
سچ...... ندیم نے ایک دم خوش ہو کر کہا
" شریر کہیں کے" شہذیب جلدی سے باہر نکل گئی۔

بڑی آپا

عذرا اصغر

جوہر بھائی سے بڑی آپا کا گہرا پردہ تھا۔

جونہی جوہر بھائی گھر میں داخل ہوتے، آپا چشم زدن میں غائب ہو جاتیں اور بھاگم بھاگ کمرے میں جا چھپتیں۔ تب شگفتہ حیرانی سے جوہر بھائی کا جائزہ لینے لگتی۔ مگر بھیا میں کوئی بھی خوفناک چیز اسے نظر نہ آتی۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد، گندمی رنگت والے چہرے پر بڑی بڑی مسکراتی شریری دو آنکھیں جو بھاگتی ہوئی آپا کے تعاقب میں دالان کے محرابی در پر جم جاتیں۔ جہاں بڑی آپا لال بیر بہوٹی جیسے سرخ گال لئے پلنگ پر اوندھی پڑی شرم سے ہانپ رہی ہوتیں۔ بھیا کی پرشوق آنکھیں دیر تک دالان کے در پر جمی رہتیں اور پھر دوسروں کے دیکھنے کے خیال سے جھک جاتیں۔

"ارے شگفتو بیٹا! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟" وہ بات ٹالنے کو اُسے گود میں اٹھا لیتے۔

"بھیا! یہ آپا آپ سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟" ایک دن ایسے ہی موقع پر اس نے جوہر بھائی سے آخر پوچھ ہی ڈالا۔

"بھئی، یہ تو تم اپنی بڑی آپا سے پوچھو نا؟" انھوں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"آپا سے تو ہم نے پوچھا تھا۔ اس نے انگلی سے بھیا کی پتلی، باریک مونچھوں کو چھیڑتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر انھوں نے کیا کہا؟" بھیا نے گہری دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ کہتی ہیں بچے ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔" اس نے بدستور بھیا کی مونچھوں سے کھیلتے ہوئے بتایا

نہیں بھئی! آخر کیوں نہیں پوچھتے؟"

"پھر آپ ہی بتا دیجئے نا۔ . . ." اس نے اصرار کیا۔

"آپ کی آپا ہماری مونچھوں سے ڈرتی ہیں۔" بھیا کو بروقت کوئی جواب نہ سوجھا۔

واہ! یہ بھی کوئی ڈر کی بات ہے؟" وہ مچلی۔

"ڈر ہی کی تو بات ہے۔"

"کیسے بھلا؟"

"بھئی دیکھو نا۔ مونچھوں سے انسان کتنا خوفناک لگتا ہے لگتا ہے نا؟" بھیا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اور بابا کی مونچھیں، اتنی لمبی لمبی ہیں۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر لمبائی کا اشارہ کیا۔ "مگر آپا ان سے تو نہیں ڈرتیں۔"

"ڈرتی ہی تو ہیں، تبھی تو سر دوپٹے سے ڈھانپ کر بس چپکے چپکے ان کے کام کیسے کر جاتی ہیں۔" بھیا نے آپا کو دیکھا تو نہ تھا بس یونہی تکا لگا گئے۔

"مگر آپ کو دیکھ کر تو بھاگ جاتی ہیں۔" شگفتو آج کھوج لگانے پر اڑ گئی تھی۔

بھیا لاجواب سے ہو کر چپ ہو گئے تو وہ اصرار کرنے لگی۔

"بولیے نا، بھیا! بتائیے نا آپا آپ سے . . ."

"اُفوہ لڑکی! بولے چلی جاتی ہے بیکار۔" پھوپھی بی گرجیں۔

"ناطقہ بند کر دیا اس غریب کا۔ اتر دگود سے نیچے!" انھوں نے ڈانٹ پلائی۔ جوہر بھائی کی گود سے نکل کر وہ سرپٹ صحن کی طرف بھاگی۔ امرود کی لچکیلی ڈال پر بیٹھ کر گدرایا۔ سا امرود کھاتے ہوئے بھی وہ لبا اوقات بڑی آپا اور جوہر بھائی کا معمہ حل کرنے میں جٹی رہتی مگر بھیا جیسے پیارے، نرمی سے بولنے والے سیدھے سادے انسان سے آپا کے ڈرنے کی معقول وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی۔

محرّم کے دنوں میں بڑا ہنگامہ ہوتا۔ بھیا چھٹی لے کر آتے، بڑی آپا کا سارا خاندان جمع ہوتا، پھپھیوں چچیوں اور ہر سائز کے چچیرے، پھپھیرے بہن بھائیوں سے گھر بھر جاتا۔ صفین بچھنے لگتیں۔ حلوائی بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھا دیتے۔ نقل، بتاشے اور الائچی دانے بنتے، منوں کے حساب سے۔ علم کے پٹکے پر گوٹا کناری ٹانکا جاتا۔ موتیوں کے سہرے تیار ہوتے۔ تب اسے محرّم ایک خوب صورت تہوار لگتا۔ عید سے کہیں مزے دار۔ بڑے نانا ابا کے گھر حلوا بٹتا۔ پتہ نہیں اس حلوے میں کیسی لذت ہوتی کہ سارا سال ویسا مزے دار حلوہ کھانے کو نہ ملتا۔ مغرب کی اذان سے کچھ پہلے جب ان کی حویلی سے حسینؓ حسینؓ کی صدائیں بلند ہوتیں تو خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بھی نالے کا پتا توڑ کر

بھاگتی۔ ننھو فقیر سے ہاتھوں پر گرم گرم حلوے کی پرات اٹھائی ہوتی اور وہ ڈا میراثی تبرک بانٹتے بچوں کو جھڑکتے رہتے، بے شمار ننھے منے ہاتھ اس کا فاصلے کا پتا بھی آگے بڑھتا اور حلوے کا کفگیر تیتے پر جھٹک دیا جاتا۔

جب لا لکتا تو حمیدہ خاتون روتے روتے بے ہوش ہو جاتیں۔ بجیا کی آوازیں سن کر وہ عورتوں کے پیروں میں گھس کر جا تکتی۔

فاطمہ کی لاش حمیدہ خاتون، سیاہ مالیدے کی شال اپنے گرد لپیٹے، فرش پر چت پڑی ہوتیں۔ اس دن شفو اور دردانہ بجیا کو خوب ڈانٹ پڑتی۔

"ارے حمیدہ بھی تو ابھی کی عمروں ہے۔ دیکھو کیسی تمیز سے بیٹھ کر مجلس سنتی ہے اور کیسی بلک بلک کے روتی ہے۔" چھوٹی چچی قہر آلود نظروں سے انھیں گھور کر کہتیں۔

چھوٹی چچی سے اُسے بڑی چڑ تھی۔ ہمیشہ ہی جلی کٹی سنایا کرتی تھیں۔ آج اُس نے ترا خ سے چچی کو جواب ٹکا ہی دیا۔

"آپ کیوں ہمیں کچھ کہتی ہیں؟ آپ کا تو ہم سے کمر بندی رشتہ ہے۔" تبھی اماں بی کا زناٹے دار تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا۔

"اللہ کی مار تجھ پر!" اماں بی اسی قسم کے کوسنے دانت پیس پیس کر دیا کرتی تھیں۔

"آپ ہی نے تو چھوٹی چچی کو اس دن کہا تھا۔" وہ روتے ہوئے احتجاج کرنے لگی اور اماں سمیت سب چپکے چپکے ہنسنے لگے۔

اور اس دن مجلس سے پہلے بہت ہی کچھ اہتمام کیا گیا تھا۔ پتہ چلا جوہر بھائی کی خالہ زاد بہنیں آرہی ہیں۔ اس نے بہت غور سے سب کا جائزہ لیا۔ ایک بھی تو دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ یونہی موٹی موٹی بھدی سی۔

مگر بڑی آپا نے سب کے ساتھ بہت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ منجھلی والی شنو باجی نے بڑی آپا سے خط لکھتے رہنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ شفو کو بہت کوفت ہوئی۔ کوئی ایک بھی تو لفٹ دینے کے قابل نہ تھی۔ عجیب ہیں یہ بڑی آپا بی!

"جوہر بھائی سے تو محرم کی جان جاتی ہے اور ان کی خلیریوں سے کیا چپکے ہو رہے تھے!" اس نے آخر دردانہ بجیا سے شکایت کر ہی ڈالی۔

یوں تو دردانہ اس سے صرف ڈیڑھ برس ہی بڑی تھی، مگر عقل میں کہیں آگے۔

"بے وقوف! بڑی آپا کی شادی ہوگی نا جوہر بھائی سے۔" دردانہ کے انکشاف پر وہ گھبرا اٹھی۔

"آپا کو تو بجیا سے ڈر لگتا ہے بجیا....." وہ حیرانی سے دُردانہ کا منہ تکنے لگی۔

"ارے بھئی۔ ڈر ور کچھ نہیں لگتا....." دُردانہ اُچک اُچک کر بیر توڑنے لگی۔

"پھر.....؟"

"بس یونہی ایکٹنگ کرتی ہیں، شرمانے کی بجیا سے۔" دردانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیوں کرتی ہیں شرمانے کی ایکٹنگ؟....." وہ اُلجھنے لگی۔

"ارے پاگل! بجیا ان کے منگیتر جو ہیں۔"

"تو منگیتر سے شرمانا ضروری ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں تو، اور کیا! منگیتر ہی سے تو شرمایا کرتے ہیں۔ ٹھیکرے کی مانگ ہے بجیا کی آپا سے۔" دُردانہ نے مزید انکشاف کیا۔

"ٹھیکرے کی مانگ کیا ہوتی ہے؟ بجیا!"

"تم بھی..... احمق ہو بس۔ دُردانہ اس کی باتوں پر تنک کر جواب دیتی۔

"بھئی دائی جس ٹھیکرے میں آپا کو لے کر آئی تھی نا؟"

"ہاں!"

"جوہر بھائی کی اماں نے اس میں روپیہ ڈال کر آپا کو بجیا کے لیے مانگ لیا تھا۔" دُردانہ بڑے ناصحانہ انداز میں سمجھاتی۔

"تو آپا کو پھوپھی بی نے بیچ دیا تھا؟" وہ حیران ہو کر دُردانہ کو تکنے لگی۔

زچ ہو کر ایسے موقع پر دُردانہ اس کے سر پر چپت رسید کر کے چپت ہوتی۔ بہن ہونے کے باوجود شفو دردانہ کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھی۔

کئی محرم آئے اور اپنے معمولات کے ساتھ گزر گئے اور اب شفو اس عمر میں تھی جس میں اشارے سے بھی پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے معصوم بچپن کا دروازہ بند کر بیٹھی تھی۔ تبھی وہ چھلکا خیز خبر اس نے سنی اور باقی گھر والوں کے ساتھ گنگ ہو کر رہ گئی۔ کیسی انہونی اور قیامت خیز خبر تھی۔

"جوہر بھائی نے نشو باجی سے شادی کر لی تھی"

بھرے پُرے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ بڑی آپا کتنے ہی دن تک مارے شرم کے کمرے سے باہر نہ نکلیں اور سب سے چھپ کر روتی رہیں۔ پھر جیسے

صدیاں بیت گئیں۔ حویلیاں، محرابی دروں والے دالان جمن سب چھن گئے، جوہر بھائی کی طرح۔ سب کچھ پرایا ہو گیا۔ بوڑھے مر کھپ گئے یا بہت ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ جوانوں کی عمریں ڈھل گئیں اور بچے جوان ہو گئے، اور ان کی جگہ نئے پیدا ہونے والے بچوں نے لے لی۔ تب بڑی آپا کی خوبصورت، ماڈرن سی کوٹھی کے لان میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ اُن کی بڑی بیٹی نجمہ نے بی، اے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس تقریب میں جانے کہاں سے جوہر بھائی اور فنشو باجی بھی شرکت کرنے چلے آئے تھے۔ رشتے داروں کا جمگھٹا سا لگا ہوا تھا۔ پختہ عمر کی شفو نے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا کہ وہ چھریرا خوبصورت جسم بے حد بھدّا ہو گیا ہے۔ مونچھیں چہرے پر سے غائب تھیں، مگر انداز وہی تھا۔ کہنے لگے۔

"بٹیا! مونچھوں میں سفید بال بہت آ گئے تھے۔ اس لئے صاف کر دیں۔"

"تبھی بڑی آپا کو آپ سے ڈر نہیں لگا۔" اس کا دل چاہا کہہ دے، مگر وقت کی نزاکت اور اپنی عمر کی پختگی اس کے آڑے آ گئی۔

بھیا اپنے بیٹے صفدر کا رشتہ نجمہ کے لئے لائے تھے اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ آپا اور ان کا آمنا سامنا ہوا تھا، ورنہ بچپن سے لے کر بھیا کی شادی تک تو آپا ان سے چھپتی ہی رہی تھیں اور اب وہ آپا کے سامنے بڑے مؤدب بیٹھے کہہ رہے تھے؛

"جو فاصلہ ہمارے درمیان پیدا ہو گیا تھا، آصفہ بی بی! میں اُسے پاٹنے آیا ہوں۔ نجمہ کو میرے گھر کی زینت بنا دو!"

"اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جوہر بھائی! کچھ فاصلے اتنے شدید ہوتے ہیں جنھیں ہم پاٹنا بھی چاہیں تو وہ پاٹے نہیں جا سکتے۔ میں نجمہ کی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ قمر الزماں سے آپ ملے ہیں نا؟ آتے جاڑوں میں بس نجمہ کے ہاتھ پیلے کر دوں گی!"

بڑی آپا نے بڑی مستعدی اور کڑکتی ہوئی آواز کے ساتھ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا اور کسی کا جواب سُنے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے میں جا چھپیں۔

شفو نے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر حیرانی سے دیکھا۔ آپا میں برس پہلے کی طرح پلنگ پر اوندھی پڑی سسک رہی تھیں

(بقیہ افسانہ سوکھے ہوئے پھول)

بس من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ خواب و خیال ایک ہو جاتے ہیں اور پھر نگری نگری صدا لگانے والا جب ایک در پر بیٹھ جائے تو حرص و ہوس سے بلند و بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دل ایک گداگر تھا۔ اس کا کاسہ بھر کر کبھی خالی نہ ہوا۔

اور میری تو اب بھی یہی عادت ہے کہ کہیں کوئی خوشنما پھول دیکھ لیتی ہوں تو توڑ کر کتاب میں رکھ لیتی ہوں۔

ہائے لوگ سوکھے ہوئے پھولوں کو ناکارہ کیوں کہتے ہیں، وہ پھول جو مسلے نہیں گئے۔ پامال نہیں ہوئے۔ گلے کی زینت نہیں بنے۔ جن کی کنواری خوشبو ہاتھوں کے لمس سے نہیں گہنائی۔ وہ تو بہت مقدس پھول ہیں۔ ایک اور اونچے کیا ان پھولوں کے سہارے حیات کے ویران دن بسر ہو سکیں گے۔

کچھ حقیقتیں

- ہم جوں جوں بوڑھے ہوتے ہیں، ہماری خوبصورتی ہمارے اندر منتقل ہوتی جاتی ہے۔
- وقت بہتا دریا ہے جو ہر رُکی ہوئی شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔
- عورت رازوں کا راز ہے جس کا اسرار ہی اس کا حسن ہے۔
- نیکی اور بدی انسان کے دو ایسے ہم سفر ہیں جو اس کو مطمئن اور بے چین کرنے کا سبب بنتے ہیں۔
- غلطی کرنا انسانی فطرت ہے۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنا کہیں زیادہ انسانی فطرت ہے۔
- آنکھوں کی روشنی جانا، بصیرت کی محرومی سے بہتر ہے۔
- عاقل کا گمان، جاہل کے یقین سے زیادہ صحیح ہے۔
- دو چیزوں کی انتہا تک نہیں پہنچا جا سکتا ـــ علم اور عقل۔
- مذہب طرزِ حیات کا نام ہے، محض عقیدے کا نہیں۔
- بچوں کی وجہ سے گھروں میں روشنی ہوتی ہے ـــ کیونکہ وہ کبھی سوئچ آف نہیں کرتے۔
- "اعمال"، "الفاظ" سے بہتر ہیں۔ (درخشاں زور رکھا)
- مجھے اپنے آپ کو عمل میں غرق کر دینا چاہیئے تاکہ مایوسی کی وجہ سے تباہی کے سمندر میں غرق ہونے سے بچ سکوں۔ (طلعت حسن)

انجامِ کار

امروز جہاں

اندھیروں نے میرا مقدر تاریک کر دیا۔ سیاہی نے میری تقدیر پر چھاپہ مارا اور زندگی سے خوشیاں چھین کر غموں کا بیڑا بٹھا دیا۔ ہنستے مسکراتے دلوں کو آہوں اور آنسوؤں میں ڈبو دیا۔ اب میں ہوں اور میرا خدا۔ اٹھتے بیٹھتے یہ باتیں سوچ سوچ کر میں ذہنی طور پر بیمار رہنے لگی۔ الٹے سیدھے کام کرنے لگتی اور جب دماغ بالکل ہی ماؤف ہو جاتا تو ایسے میں امی کی ایک اور ڈانٹ سننی پڑتی۔ دو چار طعنے اور برداشت کرنے پڑتے، جس کی اب دل میں جگہ نہیں جو پہلے ہی سے زخم خوردہ ہے۔ جگر میں اتنی تاب نہیں رہ گئی کہ امی کی کچھ اور کڑوی کسیلی سن سکوں۔ اسطرح سوچتے سوچتے تو مر جاؤں گی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے میری امی تین سال تک ٹی۔ بی کے اذیت ناک مرض کو جھیلتے ہوئے مر گئی تھیں، میں جب یہ باتیں سوچتی تو خوف سے کانپ کانپ جاتی اور پھر سفید لباس میں لپٹا مجھے اپنی امی کا چہرہ یاد آنے لگتا۔

جب سے میری اپٹوڈیٹ اور فیشن ایبل سوتیلی ماں آئیں میرا یہی حال تھا جو میں بتا چکی ہوں۔ پاس ادب سے میں نے انھیں امی کہکر مخاطب کیا تو وہ مجھ پر برس پڑیں "شرم نہیں آتی تجھے، امی کہتے ہوئے، کیا میں تجھ سے عمر میں بڑی ہوں"۔

بات ٹھیک بھی تھی۔ میری سوتیلی ماں میرے ابو جان کے فرم میں ان کی پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ پر کام کرنے آئی تھیں ابو کی عمر ایسی بھی نہ تھی کہ وہ دوسری شادی کا خیال دل میں نہ لاتے۔ اور پھر جہاں دولت کی فراوانی ہو وہاں مردوں کے لئے عمر کا بھی سوال نہیں رہتا۔ ابو ایک لکھوپتی تاجر تھے۔ میری امی ان کی کاروباری مشغولیت ہی کا شکار رہی تھیں۔ وہ مغرب پرست تھے، بس اتنا ہی تھا کہ خاندانی شرافت نے امی کی زندگی ہی میں انھیں دوسری شادی نہ کرنے دی تھی۔ لیکن امی ان کی بے التفاتی سے کڑھ کڑھ کر آخر کار ٹی۔ بی میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور ابو شاید چاہتے بھی یہی تھے۔ انھوں نے اپنی پرائیوٹ سکریٹری کو بیوی بنالیا۔ یہ بیحد آزاد خیال۔ مغرب پرست لڑکی تھی، ابو خوش تھے کہ ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اب وہ کلب وغیرہ تنہا نہیں جاتے تھے۔

امی کے سوا میں انھیں کیا کہتی، بہرحال میں کسی رشتہ کا اظہار کئے بغیر ہی، ضرورت پڑتی تو انھیں مخاطب کرلیتیں۔ وہ نہ چاہتی تھیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ اسوقت میں فرسٹ ایر میں تھی۔ انھوں نے میرے جینے کی آرزو کو کچل ڈالا۔ ابو سے کہہ کر میرا کالج جانا بند کرا دیا اس لئے میں اب گھر میں قید رہتی۔ ابو کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، لیکن سوتیلی ماں نے ان کی زندگی میں آکر انھیں نوجوان بنا دیا تھا۔ انھیں اب میرا کوئی خیال نہ رہ گیا تھا وہ کلب سے آتے تو میں روپوش ہو جاتی میری سوتیلی ماں کا منشا بھی تھا اور حکم بھی۔ حیرت ہے کہ مجھے نہ دیکھ کر بھی ابو نہ پوچھتے کہ میں کہاں ہوں۔ میری یہ ماں انھیں اس کا موقع ہی نہ دیتی تھی کہ وہ میرا خیال دل میں لاسکیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے ابو سے یہ ہرزہ سرائی کی تھی کہ میں نے ان کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا تھا کہ انھوں نے بڑھاپے میں دوسری شادی کرلی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میں ان سے (سوتیلی ماں سے) جلتی ہوں۔ ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتی ہوں۔

کاش ابو جان اپنی سکریٹری اور بیوی کے فریب میں نہ پھنس گئے ہوتے، کاش انھوں نے سوچا ہوتا کہ مجھ جیسی بیٹی ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ انھیں تو میری حالت پر رحم آنا چاہیئے تھا۔ میں تو ہمیشہ ان پر فدا ہوتی رہی تھی۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی کہ کیا یہ باتیں سچ ہیں جو ان سے کہی گئی ہیں۔

اور اسی طرح میں ایک طرح سے خانہ قید ہو کر اپنی پیاری امی ہی کی طرح کڑھتی اور سلگتی رہی پھر ایک دن مجھے خون کی قے ہوئی تو میری سوتیلی ماں کو بیحد ناگوار ہوا۔ انھوں نے ابو کے کان بھرے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں کیا گیا۔ میری سوتیلی ماں نے ابو جان کو سمجھایا کہ میرا گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ چھوت کا یہ مرض ان کو بھی لگ سکتا تھا۔ بہرحال انھوں نے مجھے بھوالی سنی ٹوریم میں داخل کرا دیا اور میں سنی ٹوریم میں زندگی گزارنے لگی۔ اور یہ زندگی میرے لئے گھر کی زندگی سے کہیں پرسکون اور بہتر تھی۔

میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آج میں چھ ماہ سے یہاں پھر رہی ہوں لیکن ابو بھول کر بھی مجھے دیکھنے نہ آئے۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی۔ میرے دل نے ایک اور زبردست چوٹ کھائی لیکن تعجب ہے دل دکھا نہیں۔ میں بہت سکون سے ہوں۔ یہاں امی کے طعنے سے بجائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے شفیق چہرے نظر آتے ہیں ان کی میٹھی میٹھی باتوں اور ان کی تسلیوں نے بڑی حد تک زندگی سے تلخی کم کر دی ہے اور میں کچھ کچھ زندگی کے قریب آنے لگی ہوں پھر ایک روز اخبار پڑھتے ہوئے یہ خبر میری نظر سے گذری۔

لکھ پتی تاجر مسٹر حارث علی اپنی بیوی کے پستول سے زخمی ہو کر نرسنگ ہوم میں زیر علاج ہیں۔ ان کی بیوی جو ان کی پرائیویٹ سکریٹری تھی، لاکھوں روپیہ نقد اور زیورات کی شکل میں لے کر فرار ہو گئی۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔"

یہ خبر پڑھ کر مجھے خوش ہونا چاہئیے تھا، لیکن میں بے چین ہو گئی۔ ابو نے کیا میرے ساتھ کیا تھا، لیکن تھے تو وہ میرے باپ ہی ان کی تکلیف کی خبر سن کر میں خوش کیسے ہو سکتی تھی۔ انھوں نے ہی تو مجھے خاک سے پاک کیا تھا — اسی وقت میں نے ڈاکٹر سے بتایا اور اجازت چاہی۔ میں پہلے سے بہتر تھی، پھر بھی ڈاکٹر نے مجھے اسپتال چھوڑنے کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن میرا دل نہ مانا۔ میں نے سینیٹوریم کو خیرباد کہہ دیا۔ میرے ابو کی زندگی، میری زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔

نرسنگ ہوم میں بڑی توجہ سے ابو جان کا علاج ہو رہا تھا۔ وہ خطرے سے باہر تھے، لیکن اس دنیا میں یکہ و تنہا تھے کوئی اپنا ان کے پاس نہ تھا کہ میں پریشان سی ان کے کمرے میں جا کر ان سے لپٹ گئی — وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اس طرح میں ان کے سینے سے لگ جاؤں گی۔ انھیں یقین تھا کہ یہ خبر سن کر بھی میں ان کے پاس نہ آؤں گی۔

ذرا محبت سے انھوں نے مجھے لپٹا کر گریہ آمیز لہجہ میں کہا "بیٹی مجھے معاف کر دو۔ اس ناگن نے مجھے اندھا کر دیا تھا میرا قصور ناقابل معافی —"

اور میں نے ابو جان کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا "ابو جان! ایسی بات کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ میں کسی کی بیٹی ہوں — اور بیٹیاں اپنے باپوں کو کتنا چاہتی ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں۔

بیٹی! باپ نے بیٹی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر کہا "مجھے تمہاری جانب سے گمراہ کیا گیا تھا۔ کاش میں نے تم سے بات کر لی ہوتی۔ کاش اسی وقت میری آنکھیں کھل گئی ہوتیں — جب سے میں زخمی ہوا ہوں، تمہاری امی کی اور تمہاری یاد مجھے ستا رہی تھی۔ میں نے تمہاری امی کے ساتھ بھی زیادتی کی تھی۔ اور تمہارے ساتھ بھی میں نے ظلم کیا ہے۔ پھر نہ جانے کیوں، میں زندہ ہوں کیوں مر نہیں گیا۔

"ایسا نہ کہئیے" میں نے کہا۔ آپ میرے لئے زندہ ہیں۔ خدا نہ کرے آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی آپ کے سوا اس دنیا میں میرا اور ہے ہی کون۔ اللہ پاک نے آپ کو میرے لئے بچا لیا ہے۔

ابو جان نرسنگ ہوم سے گھر آ گئے۔ مجھے گھر کے سارے اختیارات سونپ دئیے گئے۔ گھر ہی میرے لئے سینیٹوریم بن گیا ہے۔ میری سوتیلی ماں آخر کار گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچ گئیں۔ انھیں عدالت سے عمر قید کی سزا ہو گئی ہے۔

اتفاق

نسیم اختر یوسف (لکھنؤ)

رخسانہ کی ملاقات شاہد سے اسی طرح ہوئی تھی جس طرح اکثر فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ رخسانہ ایک ڈرنگ قسم کی لڑکی تھی۔ آزادانہ کالج جاتی اور کبھی اس کی پرواہ کرتی کہ بداخلاق نوجوان کیسے کیسے آوازے کستے ہیں۔ وہ ان کی ہرزہ سرائیاں سنتی اور چلتی رہتی لیکن ایکدن غنڈے کی بدتمیزی پر غصہ آہی گیا۔ اس نے سینڈل اتار کر اس کی مرمت کر دی۔ ایسے موقعوں پر لڑکیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سب ہی دوڑ پڑتے ہیں۔ دو مردوں نے بھی رخسانہ کا ساتھ دیا۔ اور غنڈہ مار کھا کر بھاگ گیا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیں لیکن رخسانہ نے اسے پسند نہیں کیا۔

مار کھا کر غنڈہ رخسانہ سے انتقام لینے کی فکر میں لگا رہا اور ایک شام جبکہ اندھیرا اتر آیا تھا، رخسانہ اپنی ایک سہیلی کے گھر سے اسٹڈی کر کے واپس آرہی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ غنڈے نے رخسانہ کو اچانک اپنی گرفت میں لے لیا۔ رخسانہ بے تحاشہ چیخی۔ اتفاق سے شاہد اسکوٹر پہ ادھر سے گذرا

اس کی چیخ اور بچاؤ بچاؤ کی آواز شاہد کے کانوں میں پہونچی تو اسکی رگ شرافت پھڑکی۔ اسکوٹر روک کر اس نے غنڈے پر حملہ کر دیا—— ممکن تھا کہ غنڈہ شاہد سے مقابلہ کرتا، لیکن اسی وقت چند اور لوگ بھی آگئے۔ غنڈہ فرار ہوگیا۔ رخسانہ بری طرح خوفزدہ تھی، اس کی آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

شاہد نے اس سے پوچھا "کون تھا یہ"

رخسانہ نے کہا۔ یہ روزانہ کالج جاتے وقت مجھے چھیڑا کرتا تھا۔ تنگ آکر ایک روز میں نے اپنی سینڈل اتار کر اس کی مرمت کر دی تھی۔ شاید اسی کا انتقام لینے کے لئے اس نے آج اتنی سنسان جگہ پر پکڑ لیا تھا۔

شاہد نے کہا لیکن آپ تنہا ایسی سنسان جگہ پر آئی ہی کیوں تھیں؟

میں اپنی ایک سہیلی کے یہاں اسٹڈی کرنے گئی تھی۔ دیر ہوگئی واپسی میں۔

شاہد نے کہا دیر سویر کی بات نہیں ہے۔ اس طرح آپ جیسی حسین لڑکیوں کو تنہا نہ نکلنا چاہئے۔ رخسانہ نے کہا "میں سمجھتی تھی کہ عورت کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، اس کا کردار اچھا ہو تو کوئی اس کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

یہ آپ کی غلط فہمی ہے، عورت بہرحال عورت ہے۔ کردار کی پختگی اسے بوالہوس مردوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں عین وقت پر یہاں آگیا۔ آئندہ آپ احتیاط کیا کریں۔ کہاں رہتی ہیں آپ۔ چلئے میں آپ کو گھر تک پہنچادوں آپ پسند کریں تو میرے اسکوٹر پر بیٹھ جائیے۔

"شکریہ" رخسانہ نے کہا "میں گھر چلی جاؤں گی گھر زیادہ دور نہیں ہے۔

شاہد نے کہا آپ کے کردار کی پختگی کا طلسم شاید آج ٹوٹ گیا ہے۔ آپ مجھ سے بھی خوف کھا رہی ہیں۔ اور آپ کے اس خیال کی میں داد دیتا ہوں۔ میں بھی تو ایک غنڈہ ہو سکتا ہوں۔ عورت کے لئے"

رخسانہ نے شاہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں نہیں۔ آپ میرے محسن ہیں آپ نے میری عزت بچائی ہے۔ نہ جانے وہ غنڈہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا—— لیکن آپ کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھے دیکھ کر نہ جانے لوگ کیا سمجھیں، میری کسی سہیلی نے دیکھ لیا تو مذاق اڑائیں گی۔ اور کہاں تک میں آپ کے اسکوٹر پر بیٹھ کر روزانہ آیا کروں۔ اس دنیا میں ایک بوڑھے اور بیمار باپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ بھی میری تعلیم کی وجہ سے یہاں

شاہد کو رخسانہ سے اتنی ہی دیر میں ہمدردی پیدا ہوگئی اس کی معصوم صورت اور دلکش حسن نے اسے بیحد متاثر کیا تھا۔ اس نے کہا" بہرحال آپ گھر جائیں۔ میں کچھ فاصلے سے آپ کے ساتھ چلوں گا تاکہ آپ اپنے گھر پہنچ جائیں۔

" اور آپ میرا گھر دیکھ لیں" رخسانہ نے کہا "شاید یہی مطلب ہے آپ کا۔

مسکرا کر شاہد بولا "دنیا میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ ہوتے

ہیں۔ آپ مجھ پر شک نہ کریں۔"

رخسانہ کے جملہ ... [illegible] ... ہو گیا تھا اس ... [illegible]

[illegible]

سڑک اور بھی سنسان و تاریک ہو چلی تھی اس لئے شاہد اس سے کافی دور دور اپنا ... لئے ہوئے چلتا رہا ... [illegible] نے مڑ مڑ کر دیکھا، اس ... وقت اس کی حالت اس خوفزدہ ہرنی جیسی ہو رہی تھی ... شکاری کے تعاقب کا خطرہ ہو۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی ہے، شاہد نے اسکوٹر اسٹارٹ کی اور چلا۔ اس کے بعد اس نے کبھی رخسانہ کے گھر کا رخ نہیں کیا کہ کہیں وہ کسی طرح کی بدگمانی میں مبتلا نہ ہو جائے، حالانکہ وہ رخسانہ کو پسند کرتا تھا۔ بلکہ اس پر وارفتہ تھا۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ایک روز شاہد کسی کپڑے کی دوکان میں سوٹ کا کپڑا دیکھ رہا تھا کہ اچانک رخسانہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس دوکان میں داخل ہوئی۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو رخسانہ نے اسے سلام ... کیا۔

شاہد اس حسن اتفاق پر ... تھا۔ اس نے جواب سلام دیتے ہوئے ... "آپ اچھی ہیں"۔ رخسانہ نے کہا "شکریہ" اس کے خیالات اب شاہد کی جانب سے بہت اچھے ہو گئے تھے ——— اس کا خیال تھا کہ شاہد اس کے گھر کے چکر لگائے گا۔ اس سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ایسا نہ کرنے سے اس کی شرافت کا سکہ اس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ شاہد کو پسند کرنے لگی تھی اور چاہتی تھی کہ اس سے پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔ جب بھی وہ باہر نکلتی غور سے لوگوں کو دیکھتی رہتی کہ شاید کبھی شاہد اسے نظر آ جائے۔ اس کو افسوس تھا کہ اس نے اس کا نام و پتہ بھی دریافت نہ کیا تھا۔ اس ملاقات کو غنیمت جان کر اس نے کہا "معاف فرمائیے گا آپ کی وجہ سے اس روز مجھ سے ابو جان بہت ناراض ہوئے تھے۔"

شاہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن کیوں میری وجہ سے ان کے ناراض ہونے کی بات سمجھ میں نہ آسکی۔"

رخسانہ نے کہا میں نے اس روز کے واقعہ کی تفصیل ابو جان سے بیان کی تو انھوں نے کہا میں آپ کو گھر کیوں نہیں لے گئی تھی ... آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

"لاحول ولا قوۃ" شاہد نے کہا۔ میں تو گھبرا گیا تھا کہ میری وجہ سے آپ کو اپنے ابو جان کی ناراضگی کیوں برداشت کرنا پڑی۔ بہرحال وہ ایسی بات تو نہ تھی جس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ وہ تو انسانیت ... تھا۔"

امتحان کا زمانہ قریب تھا اس لئے شاہد اپنی تعلیمی مصروفیات میں پھنسا رہا۔ رخسانہ کی یاد اسے برابر آتی رہی، لیکن وہ اسکی یاد کو دل میں بٹھانا نہ چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کی شادی کی بات پکی ہو چکی ہے اور تعطیلات گرما میں انجام پائے گی۔ اس کو علم تھا کہ اس کی شادی دور کے کسی رشتہ دار کی بیٹی سے ہونے کی بات اس کی والدہ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی اور اس کی سعادتمندی اس کی متقاضی نہ تھی کہ وہ اپنی مرحوم ماں کی طے کی ہوئی نسبت کو توڑ دیتا۔ پھر محبت کرنے سے حاصل بھی کیا ہوتا۔

لکھنؤ میں وہ اپنے ایک عزیز کی کوٹھی میں رہتا تھا جو سول لائن میں تھی۔ امتحان سے فراغت کے بعد ہی اس کو وطن جانا تھا اس کا سامان سفر بندھ گیا۔ روانگی سے پہلے شاہد نے سوچا کہ رخسانہ سے جا کر رخصت ہولے، وہ اس کے گھر گیا لیکن گھر کے باہری دروازے میں قفل پڑا ہوا تھا۔ رخسانہ سے ملاقات نہ ہونے کا اسے افسوس ہوا۔ وہ یہ سوچ کر آیا کہ اسے اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دے گا لیکن پاس پڑوس والوں نے بتایا کہ وہ لوگ اپنا سامان لے کر گئے ہیں۔

شاہد اپنے ملازم کے ساتھ اسٹیشن گیا۔ سامان رکھوا کر وہ اسٹال پہنچ گیا کہ راستے کے لئے کچھ کتابیں خرید لے۔ اسٹال پر ایک برقعہ پوش خاتون بھی رسالے دیکھ رہی تھیں۔ شاہد نے ان کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن خود خاتون ہی نے برقعے کا نقاب ہٹاتے ہوئے کہا "ارے آپ"

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ رخسانہ سے اس کی یہاں بھی ملاقات ہو گئی۔ پہلے تو اس نے برقعے کی وجہ سے اسے پہچانا ...

نہیں تھا، لیکن "ارے آپ" کے الفاظ کو سنکر اس نے چونکتے ہوئے رخسانہ کی طرف دیکھا، جس کا منور چہرہ کالے نقاب کی اوٹ سے اس طرح نظر آیا جیسے بادلوں سے جھانکتا ہوا چاند۔۔۔ آج رخسانہ اسے زیادہ ہی حسین نظر آئی۔ اس نے کہا "میں اپنے وطن جا رہا تھا۔ سوچا تم سے ملتا چلوں ۔۔۔ لیکن تمہارا گھر مقفل تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں مل گئیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے، ورنہ میں تو نا امید ہو گیا تھا۔ میں پنجاب میل سے وطن جا رہا ہوں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ سوچا تھا تمہیں بھی دعوت دوں گا ۔۔۔ اور ہاں یہ تم نے اس وقت برقع کیوں پہن رکھا ہے؟

یہ سنکر کہ شاہد وطن شادی کرنے جا رہا ہے۔ رخسانہ کا چہرہ جیسے کمھلا گیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ کاش میں اس کی شریک زندگی بن سکتی۔ چند لمحے وہ سکتے کے سے عالم میں رہی پھر اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "مبارک ہو، کاش میں آپ کی دعوت قبول کر سکتی ۔۔۔ اور ہاں، میں ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں، وہاں میں سخت قسم کا پردہ کرتی ہوں۔ لکھنؤ میں مجبوراً میں نے پردہ ترک کر دیا تھا۔

اور پھر اچانک ہی ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی آ گئی۔ رخسانہ بے تحاشہ گھبرا کر بھاگی۔ اسے اپنے ضعیف باپ کا خیال تھا کہ کہیں پریشان نہ ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ شاہد نے بھی تیز قدموں سے رخسانہ کا تعاقب کرنا چاہا، لیکن اس کا سامان تھا۔ مجبور تھا اس لئے وہ چند قدم چل کر واپس اپنے سامان کے پاس چلا گیا۔ بہرحال اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ رخسانہ بھی اسی ٹرین سے سفر کرے گی اور اس طرح امید بندھی کہ وہ پھر اس سے ملاقات کر سکے گا۔

شاہد کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ رخسانہ سکنڈ کلاس میں سفر کرنے والی تھی۔ اپنا سامان نوکر سے رکھوا کر شاہد کمپارٹمنٹ سے باہر آیا تاکہ نوکر کو بھی بٹھا دے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ جس بوگی میں شاہد کے نوکر کی سیٹ تھی اسی میں رخسانہ کی سیٹیں بھی تھیں۔ شاہد نے رخسانہ کو دیکھا، لیکن وہ کمپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہوا، سمجھا رخسانہ کے والد سے پہچان کر کسی شک میں مبتلا

ہو جائیں۔

شاہد کو شاہجہاں پور میں اترنا تھا۔ ٹرین رکتے ہی وہ کمپارٹمنٹ سے باہر آ گیا تاکہ اپنے ملازم کو بلا کر سامان اتروا لے۔ نوکر خود ہی آ جاتا لیکن شاہد اس کے پاس اس لئے جا رہا تھا کہ ایک بار پھر وہ رخسانہ کو دیکھ لے۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ رخسانہ بھی اپنے باپ کو سہارا دیتی ہوئی اتر رہی تھی۔

شاہد کا نوکر اترا تو وہ اس جگہ سے ہٹ گیا، لیکن اس کی نگاہیں رخسانہ کا تعاقب کرتی رہیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جا کر یہ تو معلوم ہی کر لے کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں بڑے میاں اسے پہچان کر یہ نہ سوچنے لگیں کہ وہ رخسانہ کا تعاقب کر رہا ہے۔ اسی وقت شاہد کو لینے کے لئے اس کے والد آ گئے، انھوں نے شاہد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور پھر وہ دونوں باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئے۔

رخسانہ کہاں چلی گئی تھی، شاہد کو معلوم نہ ہو سکا، لیکن اس کے تصور میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اس نے گھر والوں کی خیریت باپ سے نہیں پوچھی۔ رات میں سکون سے سو بھی نہ سکا۔ ہمہ وقت اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کی حالت بالکل عاشقوں جیسی ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے پھر کبھی ایسا اتفاق ہو سکے گا کہ وہ اس سے مل سکے۔

شاہد کی شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ گھر میں تمام اعزہ جمع ہو گئے تھے۔ بری کے جوڑے تیار ہو رہے تھے۔ باورچی کھانے تیار کر رہے تھے۔ کئی روز پہلے سے رشتے کی لڑکیوں نے ڈھولک پر مبارک گانا شروع کر دئے تھے۔۔۔ اور پھر شادی کی تاریخ آ گئی۔ بارات موٹروں پر قریب کے ایک قصبے میں جانے والی تھی۔ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہد دولہا بن کر ایک سجی ہوئی کار میں بیٹھا۔ بارات روانہ ہو گئی۔ لڑکی والوں کا گھر چند میل کے فاصلے پر ہی تھا، اس لئے جلد ہی منزل پر پہنچ گئی۔ لڑکی والے زیادہ امیر نہ تھے۔ پھر بھی بارات کا استقبال کافی شاندار طریقے پر کیا گیا تھا۔ نکاح کے وقت شاہد رخسانہ کے تصور میں کھویا ہوا تھا

شادی کی کوئی خوشی نہ تھی بلکہ ایک طرح سے وہ ملول و مغموم تھا۔ صرف والدین کی بات رکھنے کے لئے ہی شادی کر رہا تھا، اس لئے کہ انھوں نے کئی سال پہلے یہ رشتہ طے کر لیا تھا۔

قاضی نے ایجاب و قبول کراتے ہوئے اس سے کہلایا کہ اس نے پچاس ہزار مہر موجل پر رخسانہ کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔

دلہن رخصت ہو کر شاہد کی کوٹھی پر آ گئی۔ شاہانہ طریقہ پر اس کا استقبال ہوا اور پھر رات میں شاہد کی ایک بھاوج اسے حجلۂ عروسی میں لے گئیں، جو دلہن ہی کی طرح سجایا گیا تھا۔

اور خوشبوؤں میں بسا معلوم ہوتا تھا۔ یہ وقت ہوتا ہے جب ایک دولھا ہزاروں ارمانوں اور تمناؤں کا ہجوم لئے اندر داخل ہوتا ہے، لیکن شاہد پر ایسی کوئی کیفیت طاری نہ تھی۔ وہ بادلِ حزیں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ دلہن روایتی انداز میں ایک ریشمی گٹھری بنی مسہری پر بیٹھی تھی۔ شاہد نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے تصور میں رخسانہ ابھر آئی۔

اس نے سوچا، کاش اس شب عروسی میں رخسانہ اس کے پاس ہوتی۔ حالانکہ اس کے اور رخسانہ کے مابین محبت کا کوئی اظہار کسی جانب سے نہ ہوا تھا، پھر دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن اسمیں اس بیچاری کا کیا قصور تھا اس کی شرافت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا اور مسہری پر پڑی ہوئی معطر پھولوں کی لڑیاں ہٹا کر دلہن کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی شریک حیات کو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا خاندانی تہذیب و روایت میں یہ دستور نہ تھا۔ دلہن نے بھی اپنے ہونے والے محرم راز کی جھلک تک کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا لیکن وہ دونوں گھٹنوں میں سر دبائے آنکھیں بھینچے بیٹھی تھی۔ آخر شاہد ہی نے اس کا گھونگھٹ ہٹایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا جس کو اس نے زندگی بھر کے لئے قبول کر لیا ہے، اسے کسی طرح کا دکھ ہو۔ گھونگھٹ کھسکا تو دلہن کے پیارے پیارے نازک حنائی ہاتھوں نے چاند کو چھپا لیا۔ شاہد نے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی شریک زندگی کی صورت دیکھی اور بیساختہ اسکے منھ سے نکل گیا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ میرا تصور ہے۔ تم۔ کیا تم ہی ہو، کانوں میں رچی بسی شاہد کی آواز پر دلہن کی پلکیں ابھریں۔ اور شرم و حیا کے باوجود وہ شیریں آواز شاہد کے کانوں سے ٹکرائی جو اس کی سماعت میں بسی ہوئی تھی "آپ۔ یا خدایا۔ کیا یہ حقیقت ہے"

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ رخسانہ ہی شاہد کی منگیتر تھی۔ لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو اس طرح سے دجانتے تھے۔

چٹکلے

• اگر آپ کی کہنیوں کی جلد سخت، خشک۔ اور کھردری ہے یا کھردرا ہوتا ہے تو آپ بڑا لیموں لے کر دو ٹکڑے کر لیں۔ رس نچوڑ کر کسی کام میں لے آئیں۔ اس نکلے لیموں کے دونوں خولوں میں اپنی کہنیاں رکھکر دبائیں۔ پندرہ منٹ تک یہ عمل کئی روز تک جاری رکھیں۔

• غسل کے بعد بڑے تولئے سے جسم کو رگڑ رگڑ کر پونچھنا بیحد مفید ہوتا ہے۔ اس عمل سے دوران خون بہتر ہو جاتا ہے اور جلد میں نرمی آجاتی ہے۔

شوہر کے متعلق اقوال

• اے عورت! تیرا شوہر تیرا مالک ہے۔ وہ تیرا خیال رکھتا ہے اور تیری پرورش کی خاطر خشکی اور تری میں سخت تکلیفیں جھیلتا ہے۔ وہ اس کارگزاری کا تجھ سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، البتہ وہ تیری "مسکراہٹ"، "محبت" اور "اطاعت" کا خواستگار ہے۔ (شیکسپیر)

• اچھا شوہر وہ ہوتا ہے جو نہ رات میں سب سے پہلے سوتا ہے اور نہ صبح سب سے آخر میں بیدار ہوتا ہے۔ (بالزاک)

• تمام شوہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف ان کے چہرے بدلے ہوتے ہیں (رانس)

• ایسا شوہر جو اپنی بیوی سے یہ کہتا ہے "میں سب کچھ جانتا ہوں" وہ کچھ نہیں جانتا۔ (فرانی)

• اے عورت، میں تجھے یہی نصیحت کروں گا کہ تو اپنے اس شوہر پر بھروسہ کر جو تجھ سے بہت دور ہے اور نہ کہ اس کنوارے پر جو تجھ سے بہت قریب ہے (والفر)

بزم حرم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریداروں کی ہر ماہ ایک ایسی خبر شائع کی جا سکتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر روانہ کی جائے۔ ساتھ ہی نمبر خریداری ضرور لکھیں اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی روانہ کریں۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ بعد شائع کی جاتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• فرزانہ زیدی (بہٹ۔ سہارنپور) میری بہن نجمہ زیدی کو اللہ پاک نے ۴ راگست ۸۳ء کی صبح ایک فرزند عطا فرمایا نام عاطف مصطفےٰ رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• نگار سلطانہ جلیلی، قمر لطیف، رضیہ سعدی، منور اکبر (آمبور) ہمارے بھیا احمد پاشاہ صاحب ایم ٹیک اور بھابی شبنم صاحبہ ایم۔ ایس۔ سی کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۵ ستمبر ۸۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی نام ہم نے اجرہ عرف خارجہ فاروقی نشین رکھا۔ دعا ہے کہ یہ ننھی عکس فاطمہ زہرہؓ بنے۔

• توحید الحق صاحب سب پوسٹ ماسٹر اگور کیمپ لکھنؤ کی بڑی صاحبزادی تنویر عذرا کو اللہ پاک نے ۲۲ راکتوبر ۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اس کی عمر میں برکت دے۔ (نسیم انہونوی)

• راضیہ انجم، شفیہ ناز، روحینہ قمر نیز (آمبور) ہماری دیدی راحیلہ اسد و بھیا اسد اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۶ راگست ۸۳ء بروز ہفتہ ایک فرزند عطا فرمایا نام سعادت وسیم قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• نشاط سلیم (دربھنگہ) میری چھوٹی بہن یاسمین اختر اور بہنوئی ابرار الیقین کو اللہ پاک نے ۱۸ راگست ۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام یاسر ابرار قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے فخر خاندان بنائے۔

• صوالی صبیحہ عاشی، رضیہ اصغر، اجلی، اخگر حنا، نسیم (آمبور) ہماری بہن رفیعہ علی مکی کو اللہ پاک نے ایک ... کے بعد ۱۴ راپریل ۸۳ء بروز ہفتہ بمقام مکہ معظمہ ایک د... عطا فرمائی۔ نام صائمہ علی قرار پایا۔ پروردگار عالم اسے ... دے اور صاحب نصیب بنائے۔

پیغامات نشاط

• صحافتی دنیا کی نامور شخصیت جناب یوسف دہلوی ایڈیٹر شمع دہلی کے پوتے محمد محسن سلمہ (فرزند عزیزی محمد الیاس سلمہ و بیگم امینہ دہلوی) کی شادی حنا سلمہا (دختر نیک اختر ممتاز الدین مرحوم و بیگم فہمیدہ۔ بھوپال) کے ہمراہ ۴ نومبر کی شام کو ۵ بجے ممتاز کلب روڈ سول لائنز دہلی میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اسی سلسلہ میں یوسف صاحب نے ایک شاندار دعوت ولیمہ ۵ دسمبر ۸۳ء کو دی۔ دونوں تقاریب میں یوسف صاحب کے اعزہ، اقربا، معززین و عمائدین نے شرکت کی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک محسن اور حنا سلمہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ (نسیم انہونوی)

• مرحوم جناب اسلام صاحب (انڈیا لیدر کارپوریشن کانپور) کی سب سے چھوٹی صاحبزادی عشرت سلمہا کی عزیزی اقبال سلمہ (پسر چودھری احسان کریم صاحب) کے ہمراہ ۶ نومبر ۸۳ء بمقام یونائیٹڈ سروس کلب لائن کانپور میں ۱۲ بجے دن میں نہایت سادگی کے ساتھ عمل آئی میں سانس کی سخت تکلیف کے باوجود نکاح میں شرکت کے لئے کانپور گیا۔

• روشن جبیں فاطمہ (بھاگلپور) میری بیٹی نور یاسمین جبیں سلمہا کی شادی ہمراہ شہزاد شاہ سلمہ آئی۔ اے۔ ایس (فرزند جناب سید عنایت حسین شاہ صاحب چیف افسر فائنانشیل ایڈوائزر، ویسٹرن ریلوے) بتاریخ ۲۳ ستمبر بروز جمعہ بحسن و خوبی انجام پائی۔

• رابعہ ممتاز (انگول۔ اڑیسہ) میرے بڑے ... عبدالخالق سلمہ کی شادی خانہ آبادی بہادر خاں صاحب ... صاحبزادی اکبری بیگم (تلسی پور) کے ہمراہ ۱۵ ستمبر ...

بحسن وخوبی انجام پائی اس سلسلہ میں ۱۹ر ستمبر کو شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ پاک میرے بیٹے اور بہو کو ہمیشہ شاد وخرم رکھے۔

• فریدہ واجد (ہنسور) میرے سب سے چھوٹے بھائی سید شفیع احمد اسسٹنٹ انجینئر کی شادی عبداللہ شریف صاحب (میسور) کی صاحبزادی شاہین بیگم ایم۔اے کے ہمراہ ۱۲ر اگست ۸۳ء کو بمقام میسور بحسن وخوبی انجام پائی۔ دوسرے روز ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔

• سجاد حسین صاحب (ملک گیتی کا سچا ملک۔ لکھنؤ) کی صاحبزادی ممتاز فاطمہ سلمہا کا عقد نکاح ہمراہ محمد عقیل سلمہ لکچرر ممتاز کالج لکھنؤ فرزند محمد احمد خاں صاحب ساکن جونپور، ۳۰ر نومبر ۸۳ء کی شب میں بحسن وخوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پر ملال کی خبریں

• مقتدر سیاست داں۔ ممتاز مجاہد آزادی اور لکھنوی تہذیب و تمدن کے علمبردار سید علی ظہیر صاحب سابق وزیر عدل و انصاف یو۔پی ۶ر نومبر کی صبح ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر بلرام اسپتال میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ مرحوم بڑے خوش اخلاق ہمدرد عوام اور ہر دلعزیز تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی منسٹر سے ملاقات کی تو وہ سید علی ظہیر مرحوم ہی تھے، ملنے کا سبب یہ تھا کہ حکومت نے ڈی۔آئی آر کے تحت حریم پر ناحق ایک مقدمہ قائم کردیا تھا۔ اس وقت سید علی ظہیر صاحب کے پاس عدل و انصاف کا قلمدان تھا۔ مرحوم نے یو۔پی ہمدردی کے ساتھ میری عرض داشت سنکر مقدمہ ختم کرا دیا تھا۔ اللہ پاک ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے تمام پس ماندگان خصوصاً بیگم صاحبہ علی ظہیر صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے

• حسن زبیری صاحب (شاہجہانپور) کی والدہ محترمہ ۱۱ر نومبر ۸۳ء کو ایک طویل علالت کے بعد انتقال فرماگئیں اللہ پاک انھیں اپنے دیار رحمت میں جگہ دے اور حسن زبیری اور دیگر تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (نسیم انہونوی)

عزالہ بیگم نسیم انہونوی۔ حسن زبیدہ ایم اے)

• شاہدہ تبسم اہلیہ تسنیم (کبھی پور۔ بنگلور) بڑے ہی رنج والم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے ماموں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب (بہ نام بٹ) ۱۴ر ستمبر ۸۳ء کی شب میں ایک مختصر علالت کے بعد انتقال فرماگئے مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• بیگم معین الدین (سیتاپور) بڑے غم والم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے خسر محترم حکیم مولوی نظام الدین صاحب ۱۰ر اپریل ۸۳ء بروز اتوار تقریباً ۱ بجے دوپہر میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرماگئے۔ مرحوم کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ بہت پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ اللہ پاک اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

• جلال نور النساء۔ نور الہدیٰ (آمبور) افسوس صد افسوس کہ ہمارے چچازاد بھیا جلال حبیب الرحمٰن عرف بابو، ۱۰ر جولائی ۸۳ء بروز جمعرات اس دار فانی سے سفر آخرت اختیار کرگئے۔ مرحوم کی عمر صرف سترہ سال تھی بہت خوش مزاج، ملنسار اور سعید تھے۔ یہ حادثہ ہمارے خاندان کے لئے بڑا ہی المناک ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انہیں بخشے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

• اردو کے مشہور ادیب نجم الحسن صاحب ادیب (کولار) کا دو سالہ بچہ ابن الحسن ۴ر ستمبر ۸۳ء کو چند دن کی علالت کے بعد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اللہ پاک انھیں اور ان کی شریک حیات کو صبر جمیل عطا فرمائے اس المناک حادثے سے متاثر ہوکر منور شاہ وار بیگم نجم الحسن صاحب نے چند اشعار کہے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

میرا وہ بچہ مرگیا ہیہات ۔ فرحت افزا تھی جھلک ہر ایک بات
موت سے آج اس کی سرتاسر ۔ یاد آتی ہے صرف اس کی ذات
اس کی باتیں ہیں دل پہ نقش دوام ۔ ہے تصور اسی کا دن اور رات
دل میں چبھتی ہے تیر و نشتر سی ۔ توتلی اور پیاری اس کی بات
دیدی دمبیں کے گھر میں ۔ وہ تھا فرشتہ اور تھا عبارات
پڑھ کے غالب کا مرثیہ میں نے ۔ عجب کیا فکر سال مرگ وفات
"وائی" کے ساتھ [illegible]

حریمی دسترخوان

ایرانی پلاؤ

اسے یخنی بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک بار پکا کر نوش فرمایئے۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کھانوں کی تبدیلی بھی ضروری ہوا کرتی ہے۔

مسالے:۔ پلاؤ والے پرانے چاول ۲۰۰ گرام۔ دہی ۲۵۰ گرام۔ پیاز ایک آدھی۔ لونگ ۵۔ کالی مرچ ۱۰۔ بڑی الائچی ایک۔ چھوٹی الائچی دو۔ جاوتری دو گرام۔ ہرا دھنیا اندازے سے ہری مرچ نمک حسب ضرورت و خواہش۔ شکر ۲۵ گرام،

ترکیب۔ چاولوں کو ایک گھنٹے تک بھیگا رہنے دیں۔ پیاز کاٹ کر مسلم کالی مرچ۔ لونگ، الائچی بڑی و چھوٹی اور جاوتری کسی باریک کپڑے میں پوٹلی بنا کر تقریباً آدھا لیٹر پانی میں جوش دیں۔ نمک بھی ڈالدیں اچھی طرح ابالنے کے بعد پوٹلی نکال لیں اور چاول چھان کر ڈالدیں۔ جب چاول گل جائیں تو اتار لیں۔ پانی اتنا ہی ڈالیں کہ چاول گلنے کے بعد نہ بچے۔ لیکن بچ جائے تو اسے پسا کر نکال دیں۔ دہی میں شکر ملائیں۔ ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر اچھی طرح پھینٹ کر رکھ لیں۔ چاول ٹھنڈے ہو جانے پر دہی ملا دیں۔ یخنی تیار ہوگئی۔

(مرسلہ:۔ نصیرہ ملاحم۔ بمبئی)

• ایک کنجوس گھر سے رات کو کہیں جارہے تھے تو راستے میں انھیں خیال آیا کہ وہ اپنے کمرے کا چراغ بجھانا بھول گئے ہیں۔ فوراً واپس گھر آئے، آواز دی۔ بیوی دروازے کے پاس آئیں تو کنجوس نے کہا۔ دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں، بیکار چول گھسے گی۔ تم میرے کمرے کا چراغ بجھا دو۔ مجھے راستے میں یاد آیا۔ اسی لئے واپس آیا ہوں۔

بیوی نے کہا۔ مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اتنی دور سے آنے میں جوتے کا تلا کتنا گھسا ہوگا۔

کنجوس نے کہا۔ بیگم کیا تم مجھے ایسا غیر محتاط سمجھتی ہو۔ جوتے تو میں نے ہاتھ میں لے لئے تھے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے عنوان کے تحت ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ جنوری کے لئے عنوان ہے "ہم سفر" اور فروری کے لئے "بہار" جس ماہ کے پرچے میں شعر شائع ہوتا ہو، اس سے پہلے ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شعر کا وصول ہو جانا ضروری ہوا کرتا ہے۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

مرسلہ:۔ بی عظمت فاروق آمبور

الفت نہ سہی نفرت ہی سہی، ہم یہ بھی گوارہ کرلیں گے
اک یاد کسی کی دل میں لئے جینے کا سہارا کرلیں گے

مرسلہ:۔ ماجدہ نسرین قاری (اشوک نگر بمبئی)

گذرے ہیں عشق میں ہم اس مقام سے
نفرت سی ہوگئی ہے محبت کے نام سے

مرسلہ:۔ طاہرہ تبسم اعظمی (راجہ پور سکرور)

مرسلہ:۔ ریحانہ تبسم (وانمباڑی)

یہ دور ترقی کی اک خاص علامت ہے
انسان کے ہاتھوں میں نفرت کا پھریرا ہے

مرسلہ:۔ نجمہ انصار مٹلا (کلکتہ)

اوروں کے لئے چھوڑ یہ تاریک مقامات
نفرت سے، عداوت سے، شقاوت سے گذر جا

مرسلہ:۔ زیبا ہری (دھنباد)

کئے جاؤ نفرت کا اظہار ہنس کر
کبھی تو کروگے ہمیں پیار ہنس کر

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لالباغ لکھنؤ)

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گذرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے

مرسلہ:۔ مس روبینہ شمس (آگرہ)

معتصم نے ایک گہری سانس لے کر سر جھکا لیا۔ نینا بھی خاموش بیٹھی تھی۔
ملازم نے معتصم کو آواز دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ اور اسے
[illegible] پھر نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا: کوئی صاحب آئے ہیں۔ آپ کو
پوچھ رہے ہیں:
معتصم نے منڈیر پر سے جھانکا اور بے ساختہ چلا اٹھے: نعمانی۔ ابے
وہیں کیوں جم گیا ہے۔! فوراً بھاگ کے آ۔ میں تو تیرا منتظر ہی تھا:
نعمانی کا نام سن کر نینا اٹھی اور برآمدے میں بھاگ نکلی۔ نعمانی ہنستا
ہوا زینے پھلانگنے لگا!

نعمانی معتصم کے گہرے دوست تھے۔ بچپن سے لے کر کلاس کی آخری سیڑھی
تک دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے رہے۔ نعمانی سے معتصم نے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی
تھی۔ اور نعمانی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اچھے دوست تھے کیونکہ طرح ہنس مکھ اور خوش مزاج
تھے لیکن معتصم کے سے جذباتی اور سطحی نہیں۔ ذرا کوئی بات گہرائی تک سوچتے تھے!
اور کسی بات کا فیصلہ جذباتی بن کر نہیں کرتے تھے!۔
ان کے والد علوی صاحب کے کوئی سے بھائی ہوتے تھے۔ دونوں گھرانوں
میں عزیزداری تھی! متوسط حیثیت کے لوگ تھے۔ شریف خاندان تھا۔ سب
بھائی مل جل کر رہتے تھے۔ اس خاندان کے متعلق مشہور تھا کہ کبھی دو تین افراد
میں ناچاقی، تنازعہ یا جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ کہیں کوئی نہ کوئی فتنہ فساد ہو
[illegible]

وہ یونہی کسی نیک مرد کا انتظار کر کے گزار دے گا! میں پوچھتا ہوں۔ اسے
خود بھی کچھ خیال ہے کہ نہیں۔؟"
بیگم علوی بھی چپ تھیں۔ اور ان دنوں وہ بھی کچھ پریشان تھیں کیونکہ ان
کی صاحبزادی نے ان کی جان لے رکھی تھی۔ ان کے دوران قیام میں ہی نینا
اور ساتھ ہی معتصم کی شادیاں ہو جائیں۔ ان کو لالچ دیا تھا کہ [illegible]
مدد کریں گی۔ نینا کے لیے چند زیوروں کی ضرورت تھی۔ بیگم کا دل چاہتا تھا کہ
اسے طلائی کنگن دیں۔ اور فی الحال علوی صاحب کی مالی پوزیشن اتنی مضبوط
نہ تھی کہ وہ کئی ہزار کے کنگن خرید سکیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ اپنی مجبوری [illegible]
صاحبزادی کے سامنے رکھیں گی۔ مگر لاکھ چاہنے پر بھی ان کی زبان نہیں کھل
رہی تھی۔
علوی صاحب کی تقریر سن کر انھوں نے بھی رضا کی طرف پرامید نظروں
سے دیکھا۔ رضا نے کہا۔
"میں نے ان سے تذکرہ کیا تھا کہ اگر وہ پسند کریں تو میں سائنس جونیئر
کالج میں کوشش کروں انھیں لیکچررشپ مل جائے۔ وہاں ایک صاحب
میرے پاس اسی سلسلے میں آئے بھی تھے کہ کسی سائنس لیکچرر کی ضرورت ہے
لیکن ۔۔۔!"
کیا کہا معتصم نے۔!" بے صبرانہ انداز میں علوی صاحب نے پوچھا۔
رضا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا: میں نے معتصم سے کہا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ
بڑے طوطے ان سے نہ پڑھائے جائیں گے!۔
میں پوچھتا ہوں۔ کیا یہ گدھا بالکل ہی پاگل ہے: علوی صاحب بے قابو
ہو کر [illegible] بڑے طوطوں کو نہیں پڑھائے گا۔ [illegible]

رخ پھیر کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

معتصم کچھ دیر تک بیٹھے انگریزی ڈائجسٹ پڑھتے رہے۔ انھیں مطالعہ کے بغیر نیند نہیں آتی تھی! پھر تھوڑی دیر بعد وہ بھی بستر پر کیا لیٹے۔!

علوی صاحب کو ابھی تک معتصم کی خاص فکر نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ معتصم میڈیسن کر کے آئیں گے اور اپنے ساتھ کم از کم اتنا سرمایہ تو لائیں گے کہ خود اپنا ذاتی کلینک کھول سکیں۔ انھوں نے اس پروگرام کی تفصیل بارہا علوی صاحب کو خطوں میں بھی لکھ بھیجی تھی۔ لیکن ان کے اس طرح اچانک چلے آنے سے سارا پروگرام ہی درہم برہم ہو گیا۔ ویسے معتصم نے ایم۔ ایس سی کر لیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ ان کا مستقبل محفوظ تھا۔

ان کا دن بھر آوارہ پھرنا علوی صاحب کو قطعی پسند نہ تھا۔ وہ تو اپنے ننھے منے پوتوں کے ساتھ ان کا مل جل کے کھیلنا اور قہقہے لگانا ہی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ پھر اس پر مستزاد یہ ہوا کہ نعمانی نے ان کی پریشانیوں کو ہوا دے دی۔ انھوں نے بی۔ اے کیا تھا۔ نعمانی کو بڑی جلدی انٹرویو میں کامیابی ہو گئی اور اب جلد ہی انھیں سروس ملنے والی تھی۔ وہ اس گھر کے ہونے والے داماد تھے۔ رضا نے اپنے اثرات سے بھی کام لیا اور نعمانی کو بھی شروع ہی سے سرویئر کا پوسٹ مل گیا!۔

علوی صاحب نے ایک دن رضا سے شکایت کی: "تم نے معتصم کی طرف سے بالکل لاپرواہی اختیار کر لی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہیں سوچتے۔ ساری زندگی

نذر کرا دیتے!۔"

نعمانی کے سلسلے میں معتصم نے سفارش کی تھی۔ اور علوی صاحب نے بھی بڑی خندہ پیشانی سے ان کا رشتہ نینا کے لیے قبول کر لیا تھا۔ نعمانی بھی رضا کی طرح انجینئرنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گویا ان کا مستقبل غیر یقینی نہیں تھا!۔

معتصم نے ملازم کو آواز دی۔ اور اسے چائے کا آرڈر دے کر نعمانی کے پاس آ بیٹھے۔

"میں تمھیں بڑی شدت سے یاد کر رہا تھا:" معتصم نے کہا۔

"اور میں تو دنیا کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ تم بے چارے وہاں تک کیسے آتے:" نعمانی نے طعن کیا: "لیکن مجھے جو ہچکیاں شروع ہوئیں تو بھاگ کر مجھی کو آنا پڑا:"

ملازم چائے لے آیا اور ساتھ ہی حکم سنایا کہ نعمانی صاحب کو اندر بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔! معتصم نے ہنس کر کہا: "بہتر یہی ہے کہ واپس آ کر کھاؤ۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ باجی جان سارا کھایا پیا اُگلوا لیں:"

"آئی ہوئی ہیں؟" نعمانی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں۔!"

نعمانی نے ملازم سے کہا: "بیگم صاحبہ سے جا کر کہہ دو۔ ابھی آتا ہوں:"

معتصم نے بسکٹوں کی طشتری نعمانی کے سامنے سرکا دی۔ اور چائے بنانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے گھریلو حالات کی کمنٹری بھی سناتے جا رہے تھے! نعمانی ان کے پیرائے بیان پر مشکل سے ہنسی ضبط کر رہے تھے۔ پھر معتصم نے جلدی جلدی اپنی اور رومر کی باتیں سنائیں۔

"تو یوں کہو کہ لیلیٰ مجنوں کی کوئی روایت تم بھی دہرا رہے ہو:"

نعمانی نے گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

تم نے کب سے رومہ کو نہیں دیکھا؟ ۔ معتصم نے پوچھا۔

ابھی پچھلی بقرعید پر خالہ اماں کی خدمت میں سلام عرض کرنے حاضر ہوا تھا۔ تب دیکھا تھا۔ کوئی تین ماہ قبل : نعمانی نے جواب دیا۔

تمھیں وہ کیسی لگی ؟ : بے حد اشتیاق سے دانت نکال کر معتصم نے کہا۔ میری وائف بیکار پوچھتے ہو : نعمانی مسکرا کر بولے ۔ تمھیں اگر اچھی لگتی ہے تو نسبت کا ذکر مجھے تو ۔! معتصم کچھ کہنے چلے تھے کہ نعمانی نے روک دیا : باقی الف لیلیٰ اندر سے واپس آکے سنوں گا ۔ خدا حافظ : وہ رومال سے منہ پوچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے !۔

تم بھی چلو : انھوں نے کہا۔

جی بس آپ تشریف لے جائیے : معتصم برا سا منہ بنا کر بولے : میں یہیں بیٹھا آپ کی زندہ سلامت واپسی کی دعا کرتا رہوں گا ۔!

وہ ہنستے ہوئے چلے گئے ۔!

باجی جان نے چھوٹتے ہی کہا : اے بیٹے ۔ احمد میاں ۔ ایسی بھی کیا عجز نیت [?] کہ تم پہلے بڑوں سے ملنے کے بجائے معتصم کے کلیجے میں گھس کے بیٹھ رہے۔ کہاں رہے ۔ اللہ رکھے ۔ موٹے ہو گئے ہو ۔!"

آپ نے مجھے سلام بھی نہیں کرنے دیا : نعمانی نے مسمسی شکل بنا کر کہا۔ باجی جان ہنسنے لگیں : جیتے رہو ۔ بڑی خالہ اور چھوٹی خالہ تو اچھی ہیں :

" جی ۔!"

اتنے دنوں بعد تم سے ملی ہوں ۔ عجیب سا لگ رہا ہے !:

اور یہ ۔ یہ سب آپ کے بچے ہیں : نعمانی نے نت نئے چہروں کی فوج کی طرف

چلو غنیمت ہے ۔ یہاں تو شروع ہی سے سوکھا پڑا ہے :

تم نے اپنے لیے کیا سوچا ہے ۔ خوا مخواہ چلے آئے ۔ ڈاکٹر بن گئے ہوتے

میری تعلیم ایک مظلوم زندگی سے زیادہ اہم نہیں بھائی ۔ اگر میں کسی طور سے رومہ کو بھیانک مستقبل سے بچا سکا تو سمجھوں گا کہ اپنی زندگی کا مقصد حاصل [?] کر لیا ۔!"

معتصم ۔؟

ہوں ۔!

فرض کرو کہ اسے اچھا گھر اچھا شوہر ملتا ہے ۔ تب ۔ ؟ : نعمانی نے کہا۔

تب کیا ؟ : ایک اداس مسکراہٹ معتصم کے لبوں پر ابھری : میں تو صرف یہی چاہتا ہوں کہ وہ مالی یا چپراسی قسم کے شوہر کے ساتھ برباد نہ ہو ۔ اسے اچھا ساتھی ملے اور وہ ہمیشہ خوش رہے ۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس وہ مجھی کو ملے ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر مجبوراً مجھے اپنی مرضی واضح کرنی پڑے گی ۔! اور وہ شاید کسی کو اچھی نہ لگے گی !۔"

بس میں یہی پوچھ رہا تھا ! : نعمانی بولے : مگر یہ تمھاری منگیتر صاحبہ ہیں ۔ ان کا کیا ہو گا ؟ ! سچ پوچھو تو مجھے بڑے ماموں جان کی صاحبزادی کچھ اچھی نہیں لگیں ۔ تم ۔ کچھ بے وقوف ۔ مطلب یہ کہ بڑے سادہ لوح ہو اور وہ اچھی خاصی دو اور دو چار والی ہیں ۔ اگر کہیں خدانخواستہ ---!"

"ہو ہی نہیں سکتا ۔ میں کوئی فلاں فلاں نہیں کہ بس کسی نے زبان پر رکھا اور غٹ سے نگل گیا ۔!"

خیر جب سر پر پڑے گی تب سوچ لیں گے ۔ گیارہ بج رہے ہیں ۔ اب میں سوؤں گا ! : نعمانی نے ٹیبل لیمپ کا رخ اپنی طرف کر لیا ! اور دیوار کی طرف

" تو پھر آرڈر کچھ بھی کیوں ہو گئے : نعمانی بولے ۔ صبر کرو اور دیکھو کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ۔

ہاں ۔ یہ تو ہے ۔ میں ذرا دور تک نہیں سوچتا ۔ ایسی خرابی ہے مجھ میں" معتصم نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا ۔ پھر بولے : مگر ایک بات تم بتاؤ ۔ بس اپنی تمنا میں کوئی آک ورڈ تو نہیں لگ رہا ۔!؟"

" بالکل نہیں ۔ جب ساری زندگی ایک ہی ڈھول گلے میں لٹکانی ہے تو پھر ڈھول ذرا اچھی اور عمدہ بجنے والی چاہیے ۔!"

" اچھا اب سو رہو ۔ بعض وقت انسانیت سے باتیں کرتے کرتے عجب سے بے تکے ہو کر رہ جاتے ہو ۔ ہاں ۔ بھائی جان نے تمہارے پرابلم کے سلسلے میں کیا کیا ؟ "

" وعدہ کیا کہ انٹرویو ہوگا تو میرا خاص خیال کروائیں گے ۔ اور اب کل سے میں اس گروپ کے ساتھ سروے پر جاؤں گا جو بھائی جان کے ساتھ جا رہا ہے ۔

واقعی ؟

جی ۔!

تنخواہ ۔ ؟" بے حد خوش ہو کر معتصم نے پوچھا ۔

نعمانی کو ہنسی آگئی : تنخواہ ۔ اماں ابھی مجھے کوئی جاب ہی کہاں ملا ہے ۔ پہلے انٹرویو میں تو پاس ہو جاؤں ۔ یہ تو مجھے بھائی جان نے مشورہ دیا ہے سو ادھر ادھر پھر کر کام دیکھنے سے تجربہ آجائے گا ۔ انٹرویو کے بعد کہیں نوکری ملے گی تو پھر تنخواہ بھی ملا کرے گی ۔ کوئی پانچ دس ہزار کی آس نہ لگا لینا ۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ شروع میں صرف پانچ سو ہی مقرر ہوگی :"

دیکھ کر کہا : میں نے صرف اعتراف اور توصیف کو دیکھا تھا ۔ اتنے سے تھے ۔ آپ کی بچی بہت پیاری ہے ۔!"

" ہاں ۔ وہ ابھی بلند آواز میں ہنس دیں : بعض تو اس کے کندھوں پر پر تلاش کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ اس پری میں بس پروں ہی کی کمی رہ گئی ہے ۔

نعمانی نے پھر ان کی لڑکی پر نظر ڈالی ۔ قطعی وہ پری دری نہیں لگ رہی تھی ۔ اموٹی تھی ۔ اور صورت سے نہایت گھٹی لگ رہی تھی ۔ مگر نعمانی نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ کر باجی جان کے دل میں کم از کم اپنے لیے تو ہر قسم کی گنجائش پیدا کر لی ۔ نعمانی بھی اتنے بے وقوف نہ تھے جو ان کی کمزوری نہ سمجھتے ۔ یہ دنیا ہے بھائی ۔ نجانے کل کلاں کو انہی سے کوئی کام آ پڑے ۔ ان کی پیار کے سمندر سے چھلکتی نظریں بے بی پر پڑتی رہیں اور باجی جان کے ہونٹ مسکراتے مسکراتے دکھ گئے ۔

" تم لوگ میرے ساتھ چلنا ۔ پورا شہر گھما لاؤں گا : ابھی انھوں نے لڑکوں سے کہا : یہ تمہارے ماموں قطعی واہیات ہیں ۔ انھیں تمہاری دلچسپی سے مطلب ہی نہیں ۔ ارے کوئی تم بار بار آتے ہو ۔ کیا ارشاد فرماتی ہیں باجی جان آپ بس ۔ وہ ذرا میرا مطلب ہے کہ کچھ کرائے بھاڑے کی ضرورت پڑے گی ۔ سو اس کا کیا ۔ میں آپ سے ادھار لے لوں گا !"

چلو ہٹو نکھٹو کہیں کے : باجی جان خوش دلی سے ہنس دیں : ادھار لو گے ۔ اور بھلا واپس کب کرو گے ؟"

" اپنے حکیم نے نسخے میں واپس کرنا لکھا ہی نہیں : نعمانی نے کہا ۔ اور جو قہقہہ لگایا تو ان کا ساتھ کسی نے نہیں دیا ۔

اب کل تو ہم اور امی جا رہے ہیں ۔ بڑے ماموں جان کے ہاں ۔ ایک ذرا

الماس کو پھر سے دیکھ آئیں۔" باجی جان بولیں۔ "اب میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ اپنے رہتے تک دونوں شادیاں کر جاؤں۔ پھر میں بار بار تو آتی نہیں۔ امی آخر کب تک گرہستی میں الجھی رہیں گی۔ ان کے آرام کے دن ہیں۔ گھر میں بہو آئے تو امی کو آرام ملے۔ ہے کہ نہیں؟"

"بے شک بے شک" نعمانی بولے۔ "لیکن کیا میں نہ چلوں آپ کے ساتھ۔ محترمہ الماس کے درشن کرنے کا جی میرا بھی بہت چاہتا ہے۔ اب پتہ نہیں کیسی نکلی ہیں وہ۔ اپنی بھابھی ہونے کے ناطے انھیں پسند کرنے کا حق مجھے بھی ہے!"

"اب پسند کر کے کیا کرو گے۔ وہ تو پہلے ہی پسند کر کے نسبت لگ گئی۔" وہ بولیں۔ "ویسے میں چھوٹی خالہ سے ملوں گی۔ اور ان سے کہوں گی کہ تمھارے سر بھی سہرا لپیٹ دیں یہیں ہیں کہ خالو کے پاس چلی گئی ہیں۔؟"

"یہاں ہوتیں تو میں آپ کے پاس رہنے کو کیوں آتا؟" نعمانی نے جواب دیا۔ "میں تو چھ ماہ یہاں رہوں گا۔ بھائی صاحب سے بہت کام پڑا ہے۔ اچھا باجی جان۔ یہ تو سوچئے کہ جبکہ میں کہیں ملازم نہیں ہوا ہوں۔ بھلا اپنی کھوپڑی پر سہرا لپٹواتا کیا اچھا لگوں گا۔ یہی پرابلم تو معتصم کا بھی ہے۔ اب کیا آپ بے روزگاروں کے سر پر بیویوں کے پہاڑ توڑیں گی؟"

"اے عجیب بات ہے۔" انھوں نے ہاتھ نچایا۔ "تم لوگوں کے لیے اگر کچھ نہ سوچو تو شور مچاتے ہو کہ بڑوں نے ہماری فکروں سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اور اگر ہزاروں روپے قرض ادھار کر کے باہر پڑھنے بھجواؤ تو پھر آن مرتے ہو باپ کی چھاتی پر۔ آخر یہ معتصم کیوں اچھی بھلی پڑھائی چھوڑ کر بھاگ آیا۔ کوئی تک ہے؟"

"قطعی احمق ہے وہ۔ کہہ رہا تھا کہ مُردے چیرتے ڈر لگ رہا تھا۔"

سے عمر میں بھی بڑا ہوں۔ تم مجھے آپ جناب سے مخاطب نہ کرو۔ نہ سہی۔ مگر اتنا ادب تو کم سے کم کرو کہ سامنے سگریٹ نہ پیو۔ اس طرح ٹانگیں پھیلائے بے ادبی سے لیٹے نہ رہو۔"

"بزرگ صاحب آپ سالے ہیں۔ اتنا نہ بھولیے۔" نعمانی نے کہا۔

"خاموش رہو اور مجھے تدبیر سوچنے دو۔!"

"ایک بات اور سنو۔" نعمانی نے دفعتہً کہا۔ "باجی جان کہہ رہی تھیں کہ کل وہ اور تمھاری امی صاحبہ مل کر بڑے ماموں جان کے یہاں جا رہی ہیں۔ تمھاری منگیتر کو ایک بار پھر سے اچھی طرح دیکھنے کے لیے۔ اور میں تو میاں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ دونوں خواتین پختہ ہی کر کے آئیں گی۔ اس کے بعد تمھاری ہیر رانجھا دہیں کی دہیں ختم بالخیر ہو جائے گی۔"

"کیوں بے کار کی زبان نکال رہے ہو۔"

"سچ مچ مجھے ڈر لگ رہا ہے معتصم۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر نعمانی نے باجی جان کی ساری گفتگو معتصم کو سنا دی۔

"مجھے پرواہ کس کی ہے۔" معتصم نے لاپرواہی سے کندھے سکوڑ لیے۔ "ایک دن چپکے سے اسے لے کے اڑنچھو ہو جاؤں گا۔ باجی جان کوئی ساری عمر رہنے کا پٹہ لکھا لائی ہیں۔"

"ہائیں۔" سگریٹ فرش پر اچھال کر نعمانی اٹھ بیٹھے۔ "تو کیا ان کے رہنے کی مدت کے اندر اندر تم اڑنچھو ہو جاؤ گے۔ یعنی کہ کل ہی پرسوں...!"

"اتنی بھی میری گاڑی چھوٹی نہیں جا رہی ہے۔" معتصم نے برا مانا۔

پھنسے کہا۔

"تین سو میں تو ٹیکسی کا کرایہ بھی نہ ہوگا" معتصم نے جواب دیا "کم سے کم ایک ہزار ہوں ۔!"

"ایک ہزار ۔ چلنا کہاں ہے؟" نعمانی نے پوچھا۔

"ہوشربا کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر وہاں سے ہوٹل تاکر جنا چلتے۔ مزے میں دن بھر انجوائے کرتے اور شام کو گھر واپس۔ اب تمہارا قارون کا خزانہ اس پروگرام کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔!"

"ہوں ۔ واقعی" نعمانی سوچنے لگے۔ اور معتصم بھی خاموش ہو گئے پھر انھوں نے مغموم لہجے میں کہا۔

"اس کے لیے کسی عزیز ترین دوست کو فی الفور نیچے سے اوپر ٹرانسفر کرنا پڑے گا۔ آج کل کفن دفن تک ہزار سے کم میں نہیں ہوتا"

نعمانی کو ہنسی آگئی "چندہ کرو گے کیا؟"

"سچ بتاؤ۔ دل تمہارا ابھی چاہ رہا ہے کہ سب مل بیٹھیں؟"

"اکیلے نہیں" نعمانی نے بڑی شرافت سے کہا "سب کے ساتھ میں لڑکیوں سے شرماتا ہوں ۔!"

"تمہاری یہی باتیں مجھے بے حد پسند ہیں" معتصم نے کہا "واقعی بہت شریف ہو۔"

"شکریہ!" نعمانی نے بڑی عقیدت سے کہا اور شاعروں کی طرح سلام عرض کیا۔

"کچھ بھی ہو۔ رشتہ تو بڑا ہے" وہ بڑبڑائے۔

"ہنھ!" معتصم نے برا سا منہ بنایا "صرف رشتہ بڑا ہے۔ ابے میں تم

مُردے ۔؟" ایک صاحبزادے چونک کر بولے۔

"ہاں اور کیا" نعمانی نے کہا "ڈاکٹری کی پڑھائی میں مُردے تو چیرنا پڑتے ہیں۔ ایک دن معتصم کے ساتھ عجیب حادثہ پیش آیا۔ وہ ایک مردہ چیرنے جا رہا تھا۔ بس یہ سمجھو کہ تیز نشتر سے اس کا آدھا پیٹ چیر ہی دیا تھا کہ وہ مردہ کلمہ پڑھتا ہوا زندہ ہو گیا۔ میز پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور معتصم کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے زندہ کر دیا۔ بس جناب۔ یہ اپنے معتصم صاحب جو ڈر کے مارے بے تحاشہ کالج سے نکل کے بھاگے ہیں تو اپنے گھر ہی جا کے دم لیا۔

"مگر مردہ زندہ کیسے ہو گیا؟" دوسرے صاحبزادے نے پوچھا۔ "وہ مُردہ نہیں تھا" نعمانی نے قہقہہ لگایا "سکتہ ہو گیا تھا اسے"

"اچھا اچھا"

"تو اس لیے وہ بزدل چلا آیا" باجی جان نے آنکھیں پھاڑیں "مگر کسی سے کبھی نہیں اس نے یہ بات؟"

"کیا کہتے" نعمانی نے کہا "لوگوں میں ڈرپوک بننا انھیں پسند نہ تھا۔ میں چونکہ دوست ہوں۔ لہٰذا مجھ سے کہہ دیا تھا۔ بڑی رازداری سے ۔!"

دفعتہً نعمانی کی نظریں سامنے اٹھ گئیں۔ وہ ردمہ کو فوراً پہچان گئے چائے کی کشتی لیے آ رہی تھی۔ ڈری ڈری سی خاموش۔ اس کے پیچھے سلمٰی بھی تھی۔!

نعمانی نے ان سے بھی پرانے عزیزوں کی طرح علیک سلیک کی اور ردمہ کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میز پر رکھ دی۔! اچانک ان کی ساری بذلہ سنجی کافور ہو گئی تھی۔ معتصم نے آگ سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ ناممکن ہے کہ دامن نہ جلے ردمہ بہت حسین تھی۔ دل ہی دل میں نعمانی نے معتصم کی پسند کی داد دی۔ اور

سوچنے لگے کہ آخر معتصم کی محبت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ باجی تو اپنی بھاوج کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ اگر انھوں نے معتصم کی شادی پکی کر دی تو پھر۔!

ان کے خیالات رومہ کی نسبت کیسے خراب تھے۔ یہ ساری داستان معتصم نے نعمانی کو لکھ بھی بھیجی تھی۔! ان سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ کسی ڈرائیور یا چپراسی سے اسے بیاہ دیتیں۔ معتصم کی مداخلت یا بے جگری اس گھر میں کہیں قیامت نہ برپا کر دے گی۔ وہ سوچتے رہے۔ پھر سلمیٰ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا لیکن وہ بیدلی سے ہوں ہاں کرتے رہے۔ اور پھر چائے کے بعد لڑکوں کے ساتھ باہر چلے گئے۔

رات کو رعنا سے ملاقات ہوئی۔! ان سے سارے معاملات نپٹا کر نعمانی پھر معتصم کے پاس آ گئے۔!

تمھارا سوٹ کیس میں نے اپنے کمرے میں منگوا لیا ہے: معتصم نے کہا۔ "الگ کمرے میں رہنا تو پسند نہیں کرتے؟"

محبت ایک راز دار ضرور چاہتی ہے: نعمانی اپنے بستر پر لیٹ کر بوڑھوں کی طرح منہ بنا کر کراہے اور پھر اس طرح مشفقانہ انداز میں مسکرا کر معتصم کو دیکھا کہ انھیں آگ سی لگ گئی۔ جل کر بولے۔

"بیٹا تمھارا معاملہ پکا نہ ہو گیا ہوتا تو پھر میں بھی مزاج پوچھتا۔ اب میرے اگر ٹھیکی ہو گئے تو دیکھنا کہ باجی جان کو بھڑکا کے کیسی گت بنواتا ہوں۔ ڈرتے رہا کرو مجھ سے!"

نسبت تڑوا دو گے کیا؟: بے حد سہم کر نعمانی نے کہا۔ معتصم کو یکبارگی ہنسی آ گئی: اتنا تو مجھے یقین ہے کہ تم سے عمدہ کاٹھ کا اُلّو نینا کو نہیں مل سکتا۔ [illegible] وقت مجھ سے نہیں ہوگی۔ اطمینان رکھو"

ارے ہاں۔ نینا کہاں تھی۔ مجھ سے ملی بھی نہیں۔ میں نے گھر میں کبھی اسے نہیں دیکھا: وہ پھر لیٹ گئے۔ معتصم بھی صوفہ پر نیم دراز ہو گئے تھے۔

"ہمارا مطلب ہے کہ نینا تم کو دیکھتی تو لپک کر تمھارا استقبال کرتی اور پہلو کہتی۔ ایکیوں؟"

ہٹاؤ: نعمانی بولے "ہاں۔ میں نے رومہ کو البتہ دیکھا ہے یار۔ واقعی بہت اچھی لگی مجھے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ خدانخواستہ وہ ایک ایسی بیل ہے جو نزدیک کے درخت پر بھی نہیں چڑھ سکتی۔! بخدا معتصم تمھاری اگر وہ ہو جائے تو تمھارے نصیب جاگ جائیں۔ تم نے کبھی باتیں کیں اس سے؟"

"میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہ ہم سب کہیں اکیلے میں ایک جگہ اکٹھا ہوں" معتصم نے آہ بھر کر کہا: کہیں تفریحی جگہ پر۔ اور پھر ایک دوسرے سے کچھ کہیں سنیں۔ لیکن میری خواہش بس خواہش ہی رہ جائے گی۔ ایسا موقعہ کبھی نہیں ملے گا!"

"کیوں۔؟"

ارے میاں۔ لڑکیوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت ہی کون دے گا۔ اور پھر میری جیب میں تو ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے۔ سگریٹ تک کے لیے روز دو روپے نینا سے ادھار لیتا ہوں"

اس قدر گھٹیا سگریٹ پیتے ہو۔

وہی غنیمت جانو میاں۔!

میرے پاس اللہ کے فضل سے پورے تین سو روپے ہیں۔ ہاں جتنے چلتے رہے گی تھیں۔ وہ تم لے لو: نعمانی نے حاتم کی روح کو شرمندہ [illegible]

